امام برحق

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

﴿کی زندگی کے روشن نقوش﴾

مرتبہ
ڈاکٹر ظل ہما

مکتبۃ الاقصی
سعیدآباد، حیدرآباد

حضرت محترم مولانا عبدالعلیم صاحب مرحوم اس زمانۂ فتنہ وآزمائش میں اُمّت مسلمہ کے لئے خصوصاً اور پوری انسانیت کے لئے عموماً ایک مینارۂ نور تھے۔ محترم مولانا نے اسلام کے ابدی، آفاقی اصولوں کی ہر بڑی سے بڑی قربانی دے کر اور قیمت چکا کر تبلیغ کی اور کسی خوف واندیشہ ولالچ کا شکار نہیں ہوئے۔ سلطان جابر کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ اسلام کی ابدی، آفاقی فکر کو حکمتِ عملی کے تابع کرنے کے بجائے حکمتِ عملی کو شریعت کے تابع اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نمونہ پر چلانے کے داعی تھے۔ اس زمانۂ اِبتلاء وآزمائش میں علماء میں یہ عزیمت، شجاعت، سادگی اور بے خوفی مکمل عنقاء ہے۔

ایم اجمل

رکن مرکزی مجلس شوریٰ وحدتِ اسلامی ہند

مولانا علیہ الرحمہ اس لحاظ سے خوش قسمت اور عظیم تھے کہ آپ نے اپنے شعور کی عمر سے وفات تک ہر لمحہ شعور کے ساتھ بامقصد رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ رب کے حصول میں گزارا۔ آپ کی زندگی کا ایک واضح نصب العین تھا۔ حق کا غلبہ اور باطل کی شکست ...... اس نصب العین کے حصول کے لئے آپ نے اپنی پوری زندگی لگادی۔ آپ کی زندگی آزمائشوں سے بھرپور رہی۔ آپ نے راہِ حق کی ہر آزمائش کو خندہ پیشانی اور صبر عظیم کے ساتھ قبول کیا۔ آپ راہِ حق میں کامیابی کا محکم یقین رکھتے تھے۔ وقت کے فرعون آپ کو کبھی ڈرا نہ سکے اور آپ کے پایۂ استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ ثابت قدم رہے، رواں دواں رہے اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

ڈاکٹر انیس احمد فلاحی

اپنی زندگی میں بڑے لوگ دیکھے لیکن عزیمت، استقلال، تقشّف، بے نفسی، دنیا سے ''غری غیری'' دو بے نفسوں میں ہی دیکھ سکا۔ ایک مولانا اصلاحی مرحوم اور دوسرے میرے استاد مولانا شہباز اصلاحی مرحوم۔ دونوں کا پہناوا یکساں، مزاج ایک اور دنیائے دوں کی غلامی سے دوری ایک جیسی۔ غربت کی معراج میں کئی بے سہاروں کا سہارا۔ بلال حبشیؓ کا والی اُمّت کا والی تھا، اس کی اتباع میں مولانا کئی بلالوں کے والی تھے۔ کسی سرپرستی کے بغیر وہ اپنی رائے پر عزیمت رکھتے تھے۔ مولانا آج سے چالیس سال پہلے ہندوستان میں ''فقہ مزاحمت'' کے بانی تھے اور ساری عمر بے خوف اس کے مبلغ رہے۔

مولانا خورشید انور ندوی

بلاشبہ تحریکِ اسلامی ہند کی سب سے زیادہ بلند قامت ہستی تھی آپ کی ...... آپ ہند میں فکر مودودیؒ کے تنہا امین اور مجاہد تھے۔ آج کے فکری بلنڈرس کے دور میں کوئی آئینہ دکھانے والا نہیں رہا۔ انحرافات کی خبر اب کون لے گا؟ یہ ہے اصل حادثہ جو مولانا کے انتقال کی وجہ سے رونما ہوا۔

خلیل عابدی

امامِ برحق
مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

(کی زندگی کے روشن نقوش)

مکتبۃ الاقصیٰ

سعید آباد، حیدر آباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ایک جیدالاستعداد معلم، علمی، فکری، تحقیقی اور تحریکی ذہن ومزاج رکھنے والے بے باک عالم تھے۔ مسلم مخالف تحریکوں، ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کے گرد تنگ ہوتے دائرے پر اُن کی گہری نظر تھی۔ ان کی بیشتر تصانیف کا محرک یہی صورتِ حال تھی۔ مولانا کا مدرسۃ الاصلاح سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کے فارغ التحصیل تھے بلکہ وہ یہاں مدرس اور صدر مدرس بھی رہے ہیں۔ وہ اس سلسلۃ الذہب کی روشن کڑی تھے جس نے مدرسۃ الاصلاح کو ایک خاص امتیاز وشناخت عطا کیا اور اس کا نام روشن کیا۔

مفتی سیف الاسلام اصلاحی قاسمی

صدر مدرس مدرسۃ الاصلاح

آپ تجربہ کار مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، آپ میں بڑی ملّی اور دینی غیرت تھی، کسی بھی خلافِ شرع بات پر فوراً نکیر کرتے تھے اور اپنی بے باک مگر سوچی سمجھی رائے کے اظہار میں تأمل نہیں کرتے تھے، جوان بیٹے کی شہادت کا غم اُٹھایا، لیکن حق گوئی کے معاملے میں کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جنرل سیکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ تحریکِ اسلامی ہند کے عظیم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ مختلف امور میں ان کی علمی تحقیق اور اُن کے ذریعہ پیش کردہ رائے ومشورے ہمیشہ ہی صائب ہوتے تھے۔ علمی وفکری حلقوں میں ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔ تحریک اسلامی کی نئی نسل کی فکری واخلاقی تربیت میں ان کا رول بہت ہی اہم رہا ہے۔ بابری مسجد کی بازیابی کے سلسلہ میں ان کی کتابیں بطور خاص ''مساجد اللہ'' کو ایک اہم علمی مقام حاصل ہے۔ دفاع، خلافت، سیکولرزم وغیرہ امور پر ان کی تحقیق ورہنمائی ریفرنس کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم، اپنی پوری زندگی تحریکِ اسلامی کے نصب العین اور اس کی بنیادی فکر کی ترویج واشاعت کے لئے ہمیشہ ہی سرگرم رہے۔ ان کی شخصیت نئی نسل کے لئے حوصلہ اور اُمید کا باعث تھی۔

ضیاء الدین صدیقی، امیر وحدتِ اسلامی ہند

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے نازک وقتوں میں ایک مجاہد کی طرح ملّت کی رہنمائی کی اور ظلم کے آگے ہمیشہ ڈٹے رہے۔ انہوں نے نازک وقتوں میں گجرات پولیس کے ہاتھوں اپنے جواں سال بیٹے کو کھویا ہے، اس کے باوجود ان کے عزم واستقلال میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ ناسازیٔ صحت کے باوجود ملّت کے اہم مسائل پر اپنا بے باکانہ ردِّ عمل پیش کرتے رہے۔

محمد عبدالجلیل

ایڈیٹر انچیف روزنامہ ''منصف''

امام برحق

مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

(کی زندگی کے روشن نقوش)

مرتبہ

ڈاکٹر ظلِّ ہما

مکتبۃ الاقصیٰ

سعید آباد، حیدر آباد

تفصیلاتِ کتاب

نام کتاب : امام برحق: مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ : ڈاکٹر ظلِّ ہما

ناشر : مکتبۃ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدر آباد

اشاعتِ اول : ۲۰۲۴ء

صفحات : 716

قیمت : Rs. 500/-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ أَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِأَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ

وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾ (سورۃ السجدہ)

’’کچھ لوگوں کو جب انہوں نے صبر کیا ہم نے ایسے امام بنادیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھےاوروہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے‘‘۔

امامت

تُو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اَسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دِکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے اِمامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(علّامہ اِقبالؒ)

آئینۂ ترتیب

پیاماتِ تعزیت و خراج عقیدت

عکس جمیل

اِظہارِ محبت و گواہیاں از درونِ خانہ

نقش ہائے سنگ میل

احساسات وابستگان جامعہ

سرودِ رفتہ

ذکریات شاگردانِ عزیزان

نقوشِ تاباں

تاثرات برادرانِ اصلاح

بازگشت

آراء واقوال علمائے کرام ودانشورانِ عظام

سرگزشت جادہ و منزل

انعکاسات حلقۂ یاراں

گنج ھائے گراں مایہ

تعارف وتجزیۂ تصانیف

آہ وزاریـــاں

حکایات عنادلِ گلستان اصلاحیؒ

جذبِ دروں

منظوم تاثرات

سخنِ اوّلیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. اَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ چند صدیوں سے اُمّتِ مسلمہ پر طلوع ہونے والا ہر سورج ہر گزشتہ روز کی بہ نسبت مزید تاریکی لے کر ہی طلوع ہورہا ہے۔ خلافتِ اِسلامیہ کی ڈھال ٹوٹے پوری ایک صدی ہوچکی ہے، عالمی استعمار کا شکنجہ مسلم ممالک پر روز بروز کستا ہی جارہا ہے۔ پوری دنیا میں ملّتِ اِسلامیہ کی کشتی بیچ منجدھار میں ہچکولے لے رہی ہے۔ سرزمین ہند جو آج روئے زمین پر شرک کا سب سے بڑا گہوارا بن چکی ہے، اس میں نوبت بہ ایں جارسید کہ آٹھ سو سال تک معزز اور حاکم مانی جانے والی قوم مسلم پچھلے پچھتّر سالوں سے اس دھرتی کی سب سے مظلوم و مقہور قوم بن کر ڈر، خوف، مایوسی، بے بسی، دل شکستگی اور ذلّت کے ساتھ زندگی بسر کررہی ہے، اس قوم کے نوجوانوں کو سڑکوں پر لنچ کردیا جاتا ہے، کھلے عام اس کے قتلِ عام کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اس کی بیٹیوں کے نقاب نوچے جاتے ہیں، اس کے گھر بلڈوزر چلا کر گرائے جاتے ہیں، اس کی مسجدوں کو بت خانوں میں تبدیل کردیا جاتا ہے، اس کی شریعت میں مداخلت کی جاتی ہے، اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کی جاتی ہے، اس کے دین وایمان کو خطرات لاحق ہوجاتے ہیں، ہر طرف سے فتنے اسے گھیر لیتے ہیں، دس فیصد شریعت کے حصہ پر عمل کرنا بھی اس کے لیے دشوار بنا دیا جاتا ہے، ان حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے خیرِ اُمّت کہی جانے والی یہ قوم اس سرزمین پر بے حسی و بزدلی کی آخری حدوں پر پہنچ جاتی ہے، زوال ہی کو اپنا مقدر، ظلم سہنے کو صبر اور کفر کی غلامی کو عذر سمجھ کر قبول کرلیتی ہے، حتیٰ کہ اِسلام کی حقیقی تعلیمات سے اپنی نظریں پھیرنے لگتی ہے، اسلام کی اصل

تعلیمات، توحید حاکمیت کی حقیقت اور اسلام کے حقیقی مشن اور مقصد سے پہلوتہی کرنے لگتی ہے، مصلحت اور حکمت کی آڑ لے کر عافیت کے گوشے تلاش کرنے لگتی ہے، اپنے لیے تحفظات کی بھیک مانگتی پھرتی ہے، نظام اسلامی کو چھوڑ کر غیر اسلامی نظام میں اپنی دنیوی نجات ڈھونڈنے لگتی ہے، جس کے نتیجہ میں ۲۲ رکروڑ مسلمانوں کی موجودگی کے باوجود بھی اس سرزمین میں اسلام غربت اور اجنبیت کے دور میں داخل ہوجاتا ہے اور یہ واقعہ اس صدی کا سب سے بڑا المیہ بن جاتا ہے۔

دوسری طرف سقوطِ خلافتِ اسلامیہ کے بعد پوری دنیا میں مسلمان لگ بھگ اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ ان دل شکن حالات میں پوری دنیا میں ایسے علمائے حق، مفکرین و دعاۃ اور مجاہدین اسلام کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو میدانِ عمل میں نکل کرامت کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کریں اور اُمّتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے کوشاں ہوں اور باطل کا زور توڑیں۔ لہٰذا اللہ نے اپنی سنت کے مطابق پوری دنیا میں "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی راہ پر چلتے ہوئے اپنی زندگیاں جھونک دینے والی ایسی عظیم شخصیتوں کو پیدا کیا جنھوں نے وقت کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی اپنی سکت سے زیادہ کوشش کی۔ جن کی تاریخ ایسی اجلی ہے کہ انھیں کے دم سے اس تاریک دنیا میں اُجالا باقی ہے۔ یہ لوگ مصائب و آزمائشوں سے پُران حالات میں بھی اپنے خونِ جگر سے مسلسل چراغ جلاتے رہے جبکہ منہ زور طوفانوں کے سامنے کوئی ٹھہرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

زمین و آسمان گواہ ہیں کہ آندھی و طوفان اور اندھیری کالی گھٹاؤں کے باوجود ان کے چراغوں کی لو مدھم نہ ہوئی اور ان کے چراغوں کے اجالے اس دور کی تاریکیوں کو شکست دینے کی بھرپور کوشش کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنی حدی خوانی سے قافلوں کا حوصلہ بڑھاتے اور انھیں جادۂ حق پر گامزن کرتے رہے اور بلاخوف لومۃ لائم اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لیے قربانیوں کی لازوال اور حسین داستان رقم کرتے رہے۔ یہ عظیم لوگ حقیقی معنوں میں محبانِ خدا، عاشقانِ مصطفیٰ اور فدائیانِ دین تھے۔

ان ہی برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک والد محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ بھی تھے۔ جو برصغیر کی عظیم اسلامی درسگاہ "مدرسۃ الاصلاح" کے نمایاں فارغ التحصیل اور تحریکِ اسلامی ہند کے ہراول دستے کے سپاہی تھے، آپ تحریکِ اسلامی کی بنیادی فکر کے امین، ترجمان، محافظ اور علمبردار تھے، آپ ایک عظیم مفکر، مزکّی، معلم، مجتہد، مجاہد اور فکرِ اسلامی کے نقیب و مرابط تھے، آپ علم و تقویٰ کا بہترین امتزاج تھے، آپ اخلاص و للّٰہیت کے پیکر، صدق و صداقت کے خوگر اور صبر و استقامت کی بے نظیر مثال تھے، بغیر کسی مداہنت کے حق گوئی و بے باکی آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپ کی زندگی جہدِ مسلسل، انتھک محنت، جان توڑ کوشش اور مقصد کی راہ میں حائل چٹانوں کو عزم ایمانی کے ذریعہ ہٹانے سے عبارت تھی۔

آپ جانتے تھے کہ آپ جس مشن کے علمبردار ہیں اس کے لیے چند سال نہیں بلکہ پوری زندگی غیر مشروط طور پر اللہ کو بیچ دینی پڑے گی، لہٰذا آپ اپنی آخری سانس تک اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے، آپ نے تقریباً ستر سال اسلام کے شجرِ طیب کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور صبح تمنا کی منتظر، غموں کی ماری اس اُمّت کی زندگی کی دھندلی صبح درخشاں کرنے میں اپنی عمر بتادی۔

آپ نے اپنی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سچے پرستار اور اعلائے کلمۃ اللہ کے علمبردار تیار کرنے میں لگادی، آپ کی تعلیمی وتحریکی جہد مسلسل اس پر گواہ ہے کہ آپ نے طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور ان کی کردار سازی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ آپ نے قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس، اسلامی تعلیمات کی تشریح وتفہیم، غلبۂ دین کی جدوجہد، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل اور مسلمانانِ ہند کی فکری رہنمائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں اپنے آپ کو کھپادیا۔

آپ نے زبان وقلم اور اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ امت میں صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے اور دینِ اسلام کی حقیقی بنیادوں سے ان کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ فکری، اعتقادی اور نظریاتی انحرافات کی نشاندہی اور اصلاح کی۔ عصرِ حاضر کے فتنوں سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی کی فریب کاریوں کو طشت از بام کیا۔ اُمّت کے اندر شعائر اور شریعت سے محبت اور ان کے تحفظ کا داعیہ پیدا کیا، کئی دہائیوں پر مشتمل دورِ غلامی کی لعنتوں نے ان کے اندر جو وھن پیدا کردیا تھا اُس وھن کو ان سے دور کرنے کی کوشش کی اور انھیں مزاحمت اور استقامت کا درس دیا۔ آپ نے خوف کی غلامی سے آزاد ضمیر ودل سے جینے کی روش عام کی۔ آپ نے جمہوریت اور سیکولرزم کی بھول بھلیوں میں راہِ حق تلاش کرنے والوں کو منزل کا راستہ دِکھایا اور اپنے کردار وعمل، ایثار وقربانی اور یقین وروحانیت کے ذریعہ ان کے دلوں اور ذہنوں میں اسلام کے حقیقی نقوش کو زندہ کیا۔ آپ سچائی اور حقانیت پر چلنے والے لوگوں کے امام اور پیشوا تھے۔ آپ کی ذات ان کے لیے حوصلہ اور امید کا باعث تھی۔ آپ اپنے ایمان کے نور، فکر ونظر کی گہرائی اور مشاہدہ اور تجربہ کی گیرائی سے مستقبل کے حالات کو بھانپ لیتے تھے۔ آپ نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کئی کتابیں تحریر کیں جو نہ صرف مسلمانانِ ہند کی فکری، نظری اور عملی رہنمائی کرتی ہیں بلکہ موجودہ مسائل کا ادراک اور ان کا حل قرآن وسنّت کی روشنی میں پیش بھی کرتی ہیں۔ فرمانِ باری ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ○ (السجدۃ:۲۴)

ترجمہ: کچھ لوگوں کو جب انھوں نے صبر کیا ہم نے ایسے امام بنادیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

اللہ کی آیات پر یقین کے جتنے پہلو ہیں، آپ کی زندگی اس یقین کو آگے بڑھانے کا کام کرتی تھی۔ لوگ تھک جاتے تھے آپ تھکتے نہیں تھے، لوگ مایوس ہو جاتے تھے آپ مایوسوں کو تھام کر دوبارہ تروتازہ کر دیتے تھے، لوگ آزمائشوں سے گھبرا جاتے تھے آزمائشیں آپ کو مہمیز کرتی تھیں کہ اسی راستے پر چل کر اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ آپ کا اللہ پر یقین کبھی نہیں ٹوٹا۔ آپ کو اللہ کے دین کی سربلندی اور کفریہ نظاموں کے انہدام کا یقین تھا، اہلِ اسلام کی عزت اور باطل قوتوں کی ذلت کا یقین تھا یہ وہی یقین تھا جس کو دو صدیوں کی محنت سے کفریہ طاقتیں مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس یقین کے ساتھ صبر کی دولت سے بھی آپ مالا مال تھے۔ صبر کے جتنے بھی زاویے ڈھونڈ کرلائے جائیں اور اس میں آپ کو پرکھتے جائیں تو آپ اس باب میں بھی سب سے آگے نظر آئیں گے۔ راستے کی مشکلات پر صبر، راستے کے طویل ہونے پر صبر اور منزل کے دور ہونے پر صبر، آپ اسی صبر و یقین سے مسلمانانِ ہند کو سرشار کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے دین کی امامت کے قابل بن سکیں۔ یہ کام بالکل آسان نہ تھا اور نہ اس کے لیے حالات سازگار تھے لیکن اس کے باوجود بھی آپ نے بڑے عزم و حوصلہ اور ولولہ کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا، پورے استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور کبھی منزل کو نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔

مولانا محترم اپنا فرض بحسن و خوبی ادا کر کے اپنی محنت کا انعام اور صلہ پانے اپنے رب کے حضور پہنچ گئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی جدائی کا صدمہ صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہند کے لیے ایک عظیم صدمہ ہے۔ اُمّت کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جامعہ کا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ جامعہ کے در و دیوار آپ کے بچھڑنے پر نوحہ خواں ہیں۔ آپ کے فراق میں بہت سے دل تڑپ رہے ہیں اور آنکھیں اشکبار ہیں۔ یقینا ہم سب آپ کی جدائی کے درد کی کسک ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔

اس ناقابلِ تلافی نقصان کے باوجود ہمارے لیے اطمینان کی بات کچھ ہے تو صرف یہی کہ ہم تہی دامن نہیں ہیں۔ آپ کی زندگی اور اس زندگی سے ملنے والا واضح پیغام ہمارے سامنے موجود ہے، آپ کی ہدایات آپ کی کتابوں، تحریروں اور تقریروں کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، ہمارے سامنے مقصد کی لگن ہے، منزل کی آگہی ہے، راستہ طے کرنے کے لیے نقوش قدم اور نشانات ہیں، صبر و استقامت، توکل و اخلاص کا ترکہ ہے اور عزم و ہمت اور ایمان و یقین کا زادِ راہ ہے، جس کے ذریعہ انشاء اللہ ہم دنیا و آخرت کی فوز و فلاح حاصل کرنے کی جستجو کر سکتے ہیں۔

آج ہم مولانا محترم کے شاگردوں، عقیدت مندوں، علمائے کرام و دانشورانِ عظام اور ان کے ہمرکاب ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان کی زندگی، جہادِ زندگی اور مقصدِ زندگی کو یاد کررہے ہیں، یہ ایسا وقت ہے جب ان جیسے عظیم رہنماؤں اور سرپرستوں کی کمی شدت سے محسوس ہورہی ہے۔ ان کی یادوں کو تازہ کرنے کا مقصد بس یہی ہے کہ انھوں نے جس مقصد کے حصول کے لیے اپنی عمر کی ساری پونجی لگادی اور جس کی طرف تمام عمر دعوت دیتے رہے وہ مقصد اجاگر ہوکر سامنے آجائے، ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کا مقصد بس یہی ہے کہ وہ سارے نقوش روشن ہوجائیں جو جادۂ حق کے مسافروں کو منزلوں کا پتہ بتاتے ہیں تاکہ وہ منزلوں کی طرف گامزن ہوتے رہیں، ان کے فکر اور نظریہ، عمل اور جذبہ کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ قافلے ان کے راستے پر چل کر، ان کے افکار و عزائم اور جذبوں کے ساتھ میدانِ عمل میں اترنے کی کوشش کرتے رہیں۔

ہم ان تمام حضرات و خواتین اور محسنین و محبین کے شکرگزار ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مولانا کو خراجِ عقیدت و محبت پیش کرکے ان سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا، اپنی یادوں اور اپنے تاثرات کے اظہار کے ذریعہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا، ان کے افکار و نظریات، جہد و عمل اور پیغام کو اپنے اپنے انداز میں محسوس کرکے اپنے جذبات و احساسات اور آراء کو سپردِ قلم کرکے دوسروں تک منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ یقیناً تمام حضرات کے لیے یہ کاوش صدقۂ جاریہ کی ایک بہترین شکل بنے گی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

زیرِنظــر کتاب ''امامِ برحق'' انھیں اصحاب اور احباب کے مضامین کا بیش قیمت مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں موجود تحریریں ایک نوّے سالہ مردِ مجاہد کی جدوجہد کی ایمان افروز داستان کی کچھ جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب مولانا کی خصوصیات اور کردار کے خوبیوں کی وہ مالا ہے جو مختلف رنگوں اور منفرد اسالیب کے سچے موتیوں سے پروئی گئی ہے جو آپ کی زندگی اور سیرت و کردار اور فکر و نظر کے کسی نہ کسی گوشے کو اجاگر، کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں اور کسی نہ کسی نقش کو روشن کررہی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک خراجِ عقیدت ہے اللہ کے اس جانباز سپاہی کے لیے، جس نے ایک لحظہ بھی اپنے مقصد اور نصب العین سے سرِ مُو انحراف گوارا نہیں کیا اور آخری دم تک ہمت و حوصلہ کے ساتھ ڈٹا رہا۔ یہ کتاب اک روداد ہے ایسے صحرانورد کی، جسے صحرا پار نخلستان کا یقین تھا اور باعزو باوقار تھا جس کا ہر اک گام۔ یہ کتاب ''گواہیاں'' پیش کرتی ہے اس مردِ حق کی جانفشانیوں اور جانثاریوں کی، جو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اقامتِ دین کے لیے سرگرداں رہا، جس کی زندگی میں ناامیدی، مایوسی اور کسی ڈر و خوف کا گزر نہ تھا کہ جسے کسی چیز کا خوف بھی شرک لگتا تھا اور جس نے سیدالانبیاء ﷺ کے اس رمز کو عام کرنے کی کوشش کی۔

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یہ کتاب دراصل داستان ابتلاء ہے اس رہروشوق کی، جس نے اپنا خاندان، قبیلہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راستے میں آئی ہر مشکل اور آزمائش کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور کسی پڑاؤ کو کبھی منزل نہ جانا بلکہ ستانا تک گوارانہیں کیا۔ یہ کتاب ایک تذکرہ ہے اس مرد درویش کی جسارت کا، جس نے گھنے اور تاریک جنگل میں اپنی کٹیا کے چراغ کو تندوتیز آندھیوں میں صرف اس لیے جلائے رکھنے کی سعی کی کہ گم کردۂ راہ مسافر اس کی روشنی میں اپنی راہ پاتے رہیں۔ یہ کتاب روشن یادوں کی ایک کہکشاں ہے اس امام برحق کی، جس نے ملّتِ اسلامیہ ہند میں احساسِ زیاں کو عام کرکے، حاضر وموجود سے انھیں بیزار کرکے، فقر کی سان چڑھا کر انھیں تلوار کرکے، موت کے آئینہ میں رخ دوست دکھلا کر زندگی ان کے لیے دشوار کرکے اوران کے لہو کو گرما کر انھیں اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے تیار کیا۔ یہ کتاب دراصل ایک کہانی ہے ایک ایسے 'ولی اللہ' کی، جس کی صحبت میں ایمان کو تازگی، روح کو بالیدگی، قلب کو سکینت اور عمل کو جلا ملتی تھی ''ہر دو جہاں سے غنی جس کا دل بے نیاز''۔

یہ کتاب ایک حکایت ہے قافلۂ غرباء ''هُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ'' کے ایک ایسے معزز شریک کی، جو اپنے فکرونظر، جہد وعمل اور مقصد اور نصب العین کی وجہ سے اپنوں کے درمیان بھی اجنبی بن گئے۔ یہ کتاب ایک مصفی بیان ہے ایسے علم ویقین کے ایک چشمہ کا، جس کا فیض گھر گھر اور قریہ قریہ پہنچا اور جس کے پاس ہر خاص وعام اپنی پیاس بجھانے آتے تھے اور سیراب ہوکر لوٹ جاتے تھے۔ یہ کتاب ایک سرگزشت ہے اس شمع کی، جو اپنے جسم وجان، آرام وسکون کو گھلا گھلا کر سحر کے انتظار میں ظلمت شب سے الجھتی رہی اور ہر رنگ میں جلتی رہی۔ یہ کتاب ایک بیان ہے ایسے مضبوط قلعہ کا، جو ہر خاص وعام کو پناہ دیتا تھا، اجنبی مسافر جس کی فصیلوں میں پناہ لیتے تھے اور تازہ دم ہوکر ایک نئے عزم کے ساتھ رختِ سفر باندھتے تھے۔

سعدی نے ایسی ہی پُرنور شخصیت کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا۔

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

اس کتاب کی تحریروں کی نمایاں خوبی اور حسن یہ ہے کہ کسی بھی چیز کو بیان کرنے اور ثابت کرنے کے لیے کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کے بجائے عملی شہادتیں پیش کی گئی ہیں جس کی وجہ سے تحریریں جاندار اور مؤثر

ہوگئی ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ ''امامِ برحق'' کے مطالعہ کے دوران قاری، فرد سے زیادہ مقصد، قافلہ، منزل، صبر ویقین کے مراحل، جہد وعمل کے راستوں اور رضائے الٰہی کے حصول کی چاہت سے آشنا ہوجائے گا کہ اس کتاب سے یہی مطلوب ہے۔ان شاءاللہ مولانا محترم کے افکار ونظریات اور سیرت وکردار کے وہ پہلو جو ابھی ضبط تحریر میں نہیں آسکے وقت کے ساتھ ساتھ مزید نمایاں ہوکر منظر عام پر آئیں گے۔

ان شاءاللہ! مولانا محترم کی زندگی کے روشن نقوش مسلمانانِ ہند کو جو ''عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ'' کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں راستہ دکھاتے رہیں گے، اقامتِ دین کی روح کو تازہ رکھنے کا باعث بنتے رہیں گے اور احساس دلاتے رہیں گے کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

اَے رب! والدِمحترم کی جانفشانیوں، محنتوں اور قربانیوں کو قبول فرمایئے!
اپنی رضا کے اِنعام سے انھیں نوازیئے!
اپنے فضل سے ان کی مغفرت فرمایئے!
جنّتُ الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کیجیے!
ان کی جہدِ مسلسل کو غلبۂ اِسلام کی تمہید بنادیجئے! اور
ہمیں صبر واستقامت کے ساتھ ان کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمایئے۔
رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ

۲۰ راگست ۲۰۲۳ء

ڈاکٹر ظل ہما
بنت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
حیدرآباد

تعزیتی نِشست

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
فکرِ ابنِ تیمیہؒ۔اور۔فکرِ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حامل تھے

جامعۃ البنات الاصلاحیہ ملک پیٹ، حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ناظم و بانی جامعہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو خراجِ عقیدت ومحبت پیش کرنے اور مولانا کے عظیم مشن کو جاری رکھنے کا عہد کرنے کے لیے ایک تعزیتی نشست زیرِصدارت محترم ضیاء الدین صدیقی صاحب امیر وحدت اِسلامی ہند بمقام مہاراجہ فنکشن ہال سعید آباد، بتاریخ یکم اکتوبر ۲۰۲۲ء بروز ہفتہ منعقد کی گئی۔

اس تعزیتی نشست میں سینکڑوں عقیدت مندوں، شاگردوں، تحریکی احباب کے علاوہ طالبات وفارغاتِ جامعہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا اوصاف احمد صاحب فلاحی، ناظم ضلع تھانے جماعت اسلامی، مولانا مفتی امان اللہ قاسمی صاحب استاد جامعہ عائشہ نسواں، مولانا معین الدین صاحب ندوی سابق استاد جامعۃ البنات، پروفیسر مولانا ایاز احمد اصلاحی صاحب لکھنوٴ، مولانا مفتی جاوید اختر قاسمی صاحب استاذ جامعہ ہذا، مولانا عبدالصمد صاحب عمری، مولانا شوکت قاسمی صاحب استاذ جامعۃ الشیخ المودودیؒ اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی دختران کے علاوہ فارغاتِ جامعہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال قاسمی صاحب خطیب مسجد عالیہ ومدیر ماہنامہ شبلی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

محترم ضیاء الدین صدیقی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا: یہ مجلس تعزیت کی مجلس ہے اور کہتے ہوئے دل اور کلیجہ منہ کو آرہا ہے کہ یہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کی تعزیت کی مجلس ہے۔ اسلامی فکر کا اگر آپ تجزیہ کریں گے تو ایک فکر امام ابن تیمیہؒ سے لے کر ہندوستان میں مولانا مودودیؒ پر ختم ہوتی ہے اور

دوسری فکر کا جائزہ لیں تو امام غزالیؒ سے لے کر ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ دونوں ہی فکر کا اپنا ایک امتیاز ہے اور دونوں نے اپنی رائے کو بڑی مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ دونوں ہی فکر کے حامل تھے، لیکن امام ابنِ تیمیہؒ کی فکر کے حامل زیادہ نظر آتے ہیں۔ ہم نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مولانا کی زندگی ہم نے بہت سادہ پائی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے ستر سال قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس میں گزارے اور اپنی آخری سانس تک اللہ کے دین کی خدمت کا فریضہ ادا کرتے رہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مولانا ایک بہترین معلم، مربی، مجتہد اور مجاہد تھے۔ ہر مربی معلّم ہوتا ہے لیکن ہر معلم مربی نہیں ہوتا، ہر مجاہد مجتہد نہیں ہوتا اور نہ ہر مجتہد مجاہد ہوتا ہے۔ آپ یہ ساری صفات بیسویں صدی کے اندر کسی ایک شخص میں دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت ہمیں نظر آتی ہے۔ ہم نے آپ سے خوب استفادہ کیا ہے۔ جب مسائل میں گھرے رہتے تو ہم آپ کے پاس پہنچتے، گفتگو کرتے، رائے لیتے، آپ اپنی رائے دوٹوک انداز میں بیان کرتے، کسی مصلحت، کسی مجبوری یا کسی خوف کی وجہ سے انھوں نے اپنی رائے پر کبھی کمپرومائز نہیں کیا۔ مولانا کی شخصیت نہ صرف انفرادی بلکہ گھر کے حوالے سے دیکھا جائے تو اجتماعی طور پر عزیمت کے راستے پر تھی۔ علمی لحاظ سے مولانا کا جو مقام ومرتبہ تھا، ہمارے حلقہ میں شاید ہی کوئی اس مقام پر فائز ہو، جو علم کے ساتھ فقیہانہ شان رکھتا ہو اور اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتا ہو۔

مولانا عام مفتی کی طرح فتویٰ نہیں دیتے تھے لیکن کروشیل ایشوز کے اندر اپنی ایک رائے رکھتے تھے جو نہایت مضبوط اور نپی تلی ہوتی تھی۔ افغانستان میں مجسموں کے انہدام کو ساری دنیا کنڈم کر رہی تھی، مذمت کر رہی تھی، لیکن مولانا نے ایک منفرد کتاب لکھ کر اپنی مضبوط رائے کا اظہار کیا۔ بابری مسجد کے مسئلہ پر جب کہ بہت گمبھیر حالات کا امت سامنا کر رہی تھی، مولانا نے پوری مضبوطی سے شریعت کے دلائل کی روشنی میں ایک رائے پیش کی کہ ہم کسی بھی حال، کسی بھی مصلحت کے تحت بابری مسجد سے کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے دفاع کے مسئلہ میں جو کہ شروع دن سے آج تک کھڑا ہے فسادات، موب لنچنگ اور انکاؤنٹرس کے حوالے سے، مولانا نے اس معاملہ میں بھی اجتہاد کے ذریعہ ایک صائب رائے پیش کی ہے۔ مولانا فکر کی صلابت اور اس کی سلامتی پر زور دیا کرتے تھے۔ ایک بار ہم نے پوچھا کہ موجودہ حالات میں ہم کیا کریں تو آپ نے سمپل سا ایک جواب دیا کہ جسے صحیح سمجھتے ہو اس پر کھپ جاؤ۔ جس کو حق سمجھتے ہو اس کے لیے اپنے آپ کو کھپا دو۔ جو اپنے آپ کو کھپا دے گا وہ کامیاب ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا کی فکر کے حاملین موجود ہیں ایسا نہیں ہے کہ مولانا کی فکر مولانا کے ساتھ ہی جا چکی ہے، ان شاء اللہ وہ اس فکر کی آبیاری کریں گے، اسے زندہ رکھیں گے اور مولانا کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ مولانا کے جانے کے نتیجہ میں جو فکری اور علمی خلا پیدا ہو گیا ہے اللہ اس کو پورا کرے، مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور مولانا کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا اوصاف احمد فلاحی صاحب نے فرمایا: آپ اس شخص کی کیفیت محسوس کر سکتے ہیں جو اپنے اس محسن سے جدا ہو گیا ہو جس کی انگلی پکڑ کر اس نے چلنا سیکھا تھا، جس کا ہاتھ پکڑ کر مسجد تک گیا تھا اور جس کے آگے فلاحی کی نسبت اس کی مرہونِ منت ہو۔ آج یہ محسن مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ آج لوگ میرے خالو مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے علم، تدبر اور عزم کی گواہیاں پیش کر رہے ہیں، ان شاء اللہ یہ علم و تدبر اور عزم ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ مولانا اس عزم اور ثبات کا پیکر تھے کہ مضبوط سے مضبوط دل والوں کے پیر میں جب لرزش آجاتی تھی تو اس وقت بھی مولانا ثبات کے ساتھ کھڑے رہتے تھے۔ ابھی ضیاء الدین صدیقی صاحب کو دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آ گیا ہے جب اورنگ آباد میں ایک احتجاج کے دوران لاٹھی چارج ہوا تھا۔ میں اتفاق سے حیدر آباد میں تھا۔ مولانا نے کہا اورنگ آباد چلنا ہے۔ ہم لوگ وہاں گئے، اس میدان کو بھی دیکھا جہاں لاٹھی چارج ہوا تھا۔ لوگوں سے ملاقات کی۔ پتہ چلا کہ ضیاء الدین صاحب زخموں کا علاج کرانے ممبئی گئے ہیں۔ آپ سیدھا اورنگ آباد سے ممبئی روانہ ہوئے اور ان سے ملاقات کی۔ یہ وہ تڑپ تھی جو ہم میں سے بہت سے لوگوں نے بار بار دیکھی ہوگی کہ ملت پر کسی بھی وقت کسی بھی طرح کی کوئی آفت کی گھڑی آتی تو مولانا تڑپ اٹھتے تھے۔ جہاں تک ان کی تحریکی فکر کا معاملہ ہے ہمیشہ عزیمت کی راہ خود بھی اختیار کرتے تھے اور اسی کی تلقین بھی کرتے تھے۔ اور جب تحریک میں تھوڑا سا بھی فکری انحراف محسوس کرتے تو اس پر نہ صرف برہم ہو جاتے بلکہ سراپا احتجاج بن جاتے تھے۔ اور کسی قیمت پر بھی اس انحراف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

ان شاء اللہ مولانا کا شمار "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" میں ہوگا، جنھوں نے اپنے مالک سے کیے ہوئے وعدہ کو نہ صرف پورا کیا بلکہ اپنی تمام ذمہ داریاں ادا کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مژدہ اللہ نے آپ کو ضرور سنایا ہوگا:

"يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ".

مولانا مفتی امان اللہ قاسمی صاحب کے تاثرات: مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو ایسے مشفق ماں باپ، مربّیین اور مخلصین ملے جنھوں نے ان کی بہترین تعلیم و تربیت کی اور جب انھوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کی کہ اب مجھے خود کھڑا ہونا ہے تو پھر وہ خود کھڑے ہوئے اور عالم بافیض بن کر جہاں بیٹھے قرآن و سنت کی خوشبو کو

پھیلا کر رکھ دیا اور پوری امت شہد کی مکھی کی طرح چمٹ چمٹ کر ان کے پاس آنے لگی۔ آپ جہاں بیٹھ گئے اس جنگل کو گلزار اور ان صحراؤں کو نخلستان بنا دیا۔ آپ سے ملاقات کے لیے علماء، طلباء، قرّاء اور حفاظ کی ایک لائن لگی رہتی تھی۔ آپ تفسیر، فقہ، حدیث، صرف، نحو اور ادب کے امام تھے۔ اللہ نے آپ کو ایسی صلاحیت عطا فرمائی تھی کہ آپ ایک کمزور مدرس کو بھی چند دنوں میں تجربہ کار مدرس بنا دیتے تھے۔ مولانا کا ایک عزم تھا، ایک فکر تھی کہ ہم جہاں بھی رہیں گے، حالات جیسے بھی ہوں گے ساز گار یا ناساز گار، ہر حالت میں اپنے مشن کو آگے بڑھانا ہے اور پیچھے نہیں ہٹنا اور وہ مشن تھا دعوت الی اللہ۔ اس لیے آپ جہاں بھی گئے اپنے مشن کو آگے بڑھاتے رہے اور ایک امت ان سے فیض یاب ہوتی رہی۔

آپ علماء ساز اور افراد ساز تھے۔ انسان کو کیسے بنایا جاتا ہے یہ گن، یہ ہنر آپ کے اندر تھا۔ اس لیے ہر جگہ آپ ایک گلشن تیار کر لیتے تھے۔ مولانا صادق قاسمی صاحبؒ سابق استاذ جامعہ، مولانا سے بہت قریب تھے، وہ بتاتے تھے کہ ''مولانا اصلاحیؒ علم کے پہاڑ تھے، بڑے سے بڑا مفکر یا دانشور آ جائے، وہ ذرہ برابر جھجکتے نہیں تھے۔'' مولانا اس قدر سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات رکھتے تھے کہ سامنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اللہ نے مولانا محترم کے اندر یہ صلاحیت رکھی تھی کہ جس ادارہ پر انھوں نے ہاتھ رکھا اس ادارہ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ خوش قسمت ہیں مولانا محترم جنھوں نے اپنی ذات سے ایک نہیں کئی ادارے قائم کیے اور آج وہ سارے ادارے امت کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ مولانا محترم صرف ایک فرد نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کا مشن، ان کی تعلیم، ان کے قائم کیے ادارے ان شاء اللہ کبھی مرجھائیں گے نہیں۔ آج آپ اللہ کی رحمت میں چلے گئے ہیں، ہم دعا گو ہیں کہ حضرت نے اپنی زندگی میں جتنے ادارے، جتنی تنظیمیں، خدمتِ خلق اور دین کی خدمت کے لیے قائم کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو ان کے حق میں قبول فرمائے۔ آمین!

پروفیسر مولانا ایاز احمد اصلاحی صاحب: مولانا کی زندگی کو بیان کرنے کے لیے جب میں نے سوچا کہ کونسی آیت منتخب کروں جس میں میرے لیے، آپ کے لیے، مولانا کے گھر والوں، طلباء و طالبات اور ان ہزاروں سوگواروں کے لیے تذکیر ہو جو ویسے ہی سسک رہے ہیں جیسے لوگ اپنے والدین کے گزرنے کے بعد سسکتے ہیں تو نظرِ انتخاب سورۃ الاحزاب آیت نمبر: ۲۳ پر پڑتی ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

مولانا ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر کے چلے گئے۔ اور اب اس راستے پر وہی لوگ رہیں گے جو اس عہد کو پورا کریں گے اور اس میں کوئی تبدیلی وقت کے ساتھ نہیں کریں گے۔ ورنہ قضا تو سب کو آتی ہے لیکن نقش قدم آسمان اور زمین ان کے چومتے ہیں جو موت سے پہلے زندگی کا سبق اور درس دے کر کے جاتے ہیں۔

مولانا جماعت اسلامی میں رہے اور پھر حالات کی وجہ سے یا یوں کہیے کہ احقاق حق اور ابطال باطل کا ان کا جو معیار تھا اس معیار پر دوسرے نہیں اتر پائے تو ان کا اور دوسروں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ مولانا ایک پارس تھے آپ نے اپنی شخصیت کو ایک پارس بنا دیا تھا، کوئی بھی بچہ یا بچی اور نوجوان ان کے قریب گیا وہ ایک فکر، ایک عزم، ایک حوصلہ، ایک ہمت اور ایک مسلمان اور مومن کے طور پر جینے کا درس لے کر اٹھا۔ اگر مولانا تصنیف کی دنیا میں آتے تو شاید وہ اتنا بڑا کام نہ کر پاتے جو انھوں نے تربیت، ذہن سازی اور فکر سازی کر کے کیا۔ ایک شخص نے پورا کارواں بنا دیا یہ ایک ایسی نیکی ہے جو شاید ان کی تمام نیکیوں پر بھاری ہوگی۔ مولانا نے جو کام بھی کیا، ایک جری اور جانباز مسلمان کے طور پر کیا۔ تاریخ جانتی ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کھوئی، اپنی تحریک کھوئی اور اپنے دوست احباب کھوئے صرف اس لیے کہ جس حق کے راستے پر وہ چل رہے تھے وہ آسان نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ انھیں کبھی اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرے گا اور جس فکر کے لیے انھوں نے قربانی دی ہے اسے قائم رکھے گا۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلتے رہیں جن کے نقش قدم کو چومنے کا دل چاہتا ہے۔

مولانا جاوید اختر قاسمی صاحب: ہمارے ناظم صاحب تمام اعلیٰ صفات، اخلاق اور خوبیوں کے مالک تھے۔ جن میں نمایاں ترین اوصاف وہ ہیں جنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: ''يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ''... مولانا اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچانے میں کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے کسی سے ڈرتے نہیں تھے اور نہ کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ کرتے تھے۔ مولانا اخلاق و مروت کے پیکر اور اخلاص کے خوگر تھے اور ہمیشہ اسی بات کی نصیحت کرتے تھے۔ مولانا ہمیشہ شریعت پر کاربند رہے۔ ان کے سامنے کبھی کوئی خلافِ شرع بات آتی تو فوراً نکیر فرماتے تھے۔ سنتوں پر عمل کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

آخری مرتبہ جب مدرسہ تشریف لائے تو آپ کچھ ہی دیر بعد بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ ہم نے آپ کو لٹانا چاہا۔ کسی طرح پیر قبلہ کی طرف ہو گئے۔ آپ بول نہیں پا رہے تھے، آپ کی آنکھیں بند تھیں لیکن جب آپ کو محسوس ہوا کہ پیر قبلہ کی طرف ہو رہے ہیں تو فوراً آپ نے نکیر فرمائی اور خود ہی اپنے پیر سمیٹ لیے۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی وہ بے نظیر مثال ہے جو ہم نے صرف آپ کے اندر ہی دیکھی۔ **اللہ** سے دعا ہے کہ اے اللہ! مولانا

کے تمام حسنات کو شرف قبول عطا فرما اور آپ کو فردوسِ اعلیٰ میں بہترین مقام عطا فرما۔ آمین!

مولانا عبدالصمد عمری صاحب: مولانا کی جدائی ہمارے لیے ایک بڑا سانحہ اور ہم سب کے لیے رنج و الم کا باعث ہے۔ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے اپنی پوری زندگی بڑی سادگی، تقویٰ، پرہیزگاری اور خلوص وللّٰہیت سے گزاری۔ آپ کے بڑے علمی کارنامے ہیں، آپ نے جو کتابیں لکھیں وہ ملت کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور پوری امت کے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مولانا کے حق میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا شوکت قاسمی صاحب: حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اللہ کی سنّت کے مطابق اپنا مقررہ وقت پورا کیا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر ان کی جو خدمات ہیں وہ ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہیں گی۔ مولانا جیسے ایک عالم باعمل کا اس دنیا سے چلا جانا بہت بڑا خسارہ ہے۔ مولانا کے اندر توکّل علی اللہ، اخلاص اور للّٰہیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ تینوں صفات آپ کے خون اور آپ کی رگوں میں پیوست تھیں۔ توکّل علی اللہ کا مطلب مَیں نے مولانا کی شخصیت کو دیکھ کر ہی جانا اور سمجھا ہے۔ مولانا کے کام میں وسعت اور بلندی آپ کے اخلاص کی برکت کا ہی ثمرہ تھی۔ مولانا نے زمانہ کے تمام آلام ومصائب میں ایک مردِ مجاہد کی طرح زندگی گزاری اور تمام مسائل ومشکلات کا پامردی سے سامنا کیا۔ مولانا کم گوئی میں سلف صالحین کا پرَتو تھے۔ صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی جھلک حضرت مولانا کی زندگی میں بالکل نمایاں تھی۔ امید ہے کہ مولانا کے جانشین مولانا کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

شرکاء میں سے ایک حضرت کے تاثرات: ''وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ'' بار بار یہ آیت پڑھنے کے بعد ذہن میں مختلف سوالات گردش کرتے رہتے تھے کہ وہ نیک عمل کیا ہوسکتا ہے وہ ایک دفعہ کیا جاتا ہے یا بہت دفعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان سوالات کے جوابات حضرت کی سیرت دیکھ کر مل گئے۔ جنھیں دیکھ کر حوصلہ بھی ملتا تھا، عزیمت کی راہ بھی سوجھتی تھی، نگاہیں بھی تر ہوتی تھیں اور عمل کی تحریک بھی ملتی تھی۔ جب بھی اُمّت کے اندر بابری مسجد کو لے کر سودے بازی کی بات چلتی تو مولانا ببانگ دہل کہتے کہ ''بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں۔'' جدید جاہلیت سے مولانا جنگ کی بات کرتے تھے۔ جن عناوین پر ہمارے بڑے بڑے لوگ بولنے کے لیے سوچتے ہیں ان عناوین کو مولانا بحث عام کا موضوع بنادیتے تھے اور اپنے ملنے والوں سے اس پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ مولانا سے ہماری آخری

ملاقات اس وقت ہوئی جب ہماری صورتحال انتہائی پریشان کن تھی۔ ایسے میں مولانا نے عزم، حوصلہ اور عزیمت کی ایسی بات کی جسے ہم نے اپنی زندگی کا زادِراہ بنالیا۔ مولانا فکری اعتبار سے انتہائی مضبوط آدمی تھے۔ مداہنت آپ کی فکر میں کسی بھی اعتبار سے داخل نہیں ہوئی تھی۔ اپنے بعد آنے والوں کو بھی آپ نے اسی فکر سے سرشار کیا اور اپنے ملنے والوں کو بھی اسی کا درس دیا۔ اُمّت کی پژمُردگی اور فتنہ وفساد کے اس دور میں مولانا جیسے لوگوں کے عمل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ بہتر عمل یہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ! مولانا کی قبر کو نور سے بھر دے اور مولانا کا پیغام امت میں عام کردے تاکہ وہ اپنے عقیدہ کے ساتھ اور پورے حوصلہ کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ آمین!

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال قاسمی صاحب: ہماری طرف سے مولانا کے لیے سب سے بڑا اخراجِ عقیدت یہی ہوگا کہ مولانا نے علم وفکر کا جو شجر لگایا ہے، اس کی تن، من، دھن: دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے آبیاری کرنے کے لیے تیار رہیں۔ مولانا سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل رہا، جب بھی ملا مسکراتا ہوا چہرہ ہی تھا۔ جب بھی ملا حوصلہ کی باتیں ہی تھیں، ہمیشہ مولانا کو عزم و ہمت کا ایک پہاڑ پایا۔ مصائب وآلام کی چکی میں پستے ہوئے بھی آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو پھیلانے اور ان کی نشر واشاعت کی فکر دامن گیر ہوتی تھی۔ سورج اگر ڈوب بھی جاتا ہے تو اپنی شفق چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح مولانا بھی ہمارے درمیان اپنے فکر، علم اور کردار واخلاق کی شفق چھوڑ گئے ہیں۔ ان شاء اللہ مولانا ان سب چیزوں کے ساتھ ہمارے درمیان موجود رہیں گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ مولانا کی تمام حسنات کو قبول فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر ظل ھما بنت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ: ابا مرحوم کی جدائی سے ہمارے دل بے حد مغموم ہیں، کچھ کہنے کا یارا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی کچھ باتیں امانت سمجھ کر آپ کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔ پیارے رسول ﷺ نے جو صادق المصدوق ہیں اس باپ کو جنّت اور اپنے قرب کی بشارت سنائی جس نے دو بیٹیوں کی اچھی پرورش کی اور ان کی بہترین تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ والد محترم نے اپنی پانچ حقیقی بیٹیوں کے ساتھ ملّت کی سینکڑوں، ہزاروں بیٹیوں کی بہترین پرورش اور تعلیم وتربیت کا انتظام فرمایا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہم تمام بیٹیوں کی تعلیم وتربیت کے اجر سے اَبّا مرحوم کو نوازے اور پیارے رسول ﷺ کے سچے فرمان کو ان کے حق میں قبول فرمالے۔ اَبّا کی آواز بڑی دھیمی تھی لیکن اس میں اک سوز تھا، ایک للکار تھی جس نے باطل کے ایوانوں پر ہمیشہ لرزہ طاری کیے رکھا۔ میں نے اپنے شعور سے ابا کو دو چیزوں کے متعلق بہت فکرمند دیکھا۔ ایک بابری مسجد کی بازیابی کے حوالے سے اور دوسری روحِ جہاد کو مسخ ہونے سے

بچانے اوراسے پروان چڑھانے کے لیے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے بھی آپ بڑے فکر مند تھے۔آپ نے تیس سال پہلے اپنی دوراندیشی اورفراست ایمانی سے اس بات کاادراک کرلیا تھا کہ امت کی بیٹیوں کوصحیح اِسلامی فکر سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان بخارا اورسمرقند اوراندلس کی تاریخ نہ دہرانے لگے،آپ کواندازہ تھا کہ ہندوستان میں عنقریب وہ دورآنے والا ہے، جب اِسلام کا نام لینا جرم بنادیا جائے گا،لہٰذا اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی ایک ایسی نسل کی تیاری ضروری ہے جوان مشکل حالات میں بھی اپنی نسلوں کے اندر اِسلام اورایمان کو پروان چڑھاتی رہے،لہٰذا آپ نے لڑکیوں کے ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ کرلیا اوراپنی آخری سانس تک لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا۔

آپ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نجات اوران کی فلاح استقامت اورمزاحمت کے فارمولہ پرعمل کرنے میں ہے ورنہ شریعت کا جودس فیصد حصہ ہمارے پاس باقی بچ رہا ہے اس سے بھی محروم ہوجائیں گے۔آپ محروس نوجوانوں کے متعلق بھی ہمیشہ فکرمندرہتے تھے۔اَبّا نام ونموداورشہرت سے کوسوں دور رہتے تھے۔آپ انبیاء وصلحاء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرف اللہ سے اپنے اجر کے طلبگار تھے۔''اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ''۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ! آپ اَبّا کے ہرعمل صالح کا اپنے پاس سے بھرپور صلہ عطافرمائیے۔اَبّا نے ہمیشہ سادہ زندگی بسر کی،سادہ لباس زیب تن کیا،آپ اپنے پاس انھیں جنّت کا قیمتی لباس پہنا دیجیے اورجنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کیجیے،آمین یارب العالمین!

آخر میں مولانا کی طالبات اورفارغات نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اورمولانا سے اپنے والہانہ تعلق اورمولانا کی شفقتوں،محبتوں اورطالبات کی تعلیم وتربیت کے تئیں مولانا کی فکرمندی کواپنے اپنے انداز میں بیان کیا؛جوطالبات وفارغات اس نشست میں موجودنہیں تھیں اُن کے اِرسال کردہ تاثرات اورمختلف لوگوں کے تعزیتی بیانات بھی پڑھ کرسنائے گئے۔

پُرسوز اور پُررقّت دعا پراس نشست کا اختتام ہوا۔

پیاماتِ تعزیت و خراجِ عقیدت

اک عزیز و مہرباں جاتا رہا
ہم خیال و ہم زباں جاتا رہا

اٹھ گئی رسم و رہِ مہر وفا
افتخارِ دوستاں جاتا رہا

حلقۂ یاراں کی رونق ختم ہے
نازش پیر و جواں جاتا رہا

ہم کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں اسے
دردِ دل کا ترجماں جاتا رہا

اس کی تربت پر خدا کی رحمتیں
استقامت کا نشاں جاتا رہا

تعزیت نامہ

مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

مکرمی ومحترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ عالی!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا سانحۂ ارتحال ہم سب کے لیے انتہائی باعثِ رنج وغم ہے۔ مولانا کا مدرسۃ الاصلاح سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کے فارغ التحصیل تھے، بلکہ وہ یہاں مدرس اور صدر مدرس بھی رہے ہیں۔ وہ اس سلسلۃ الذہب کی روشن کڑی تھے، جس نے مدرسۃ الاصلاح کو ایک خاص امتیاز و شناخت عطا کیا اور اس کا نام روشن کیا۔ ان کی وفات کی خبر سے یہاں عام تأثر یہی ابھر کر سامنے آیا کہ مدرسۃ الاصلاح کا ایک اور روشن ستارہ غروب ہوگیا۔

اللہ خیر کا معاملہ فرمائے! مدرسۃ الاصلاح اس وقت اپنے کئی لائق سپوتوں کی جدائی کا غم جھیل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کی خدمات وحسنات کو شرفِ قبول بخشے اور ان کی سیئات کو حسنات سے مبدل فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام عطا کرے۔

محترم! مولاناؒ کی وفات صرف آپ کا ذاتی نقصان نہیں ہے، بلکہ قوم وملت اور مدرسۃ الاصلاح کا بھی بڑا نقصان ہے۔ اللہ اس کی تلافی فرمائے آپ اور آپ کے جملہ اعزہ و متعلقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

مولانا کی یاد میں آج یہاں اساتذۂ کرام کی ایک تعزیتی نشست ہوئی، جس میں مولانا کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ ان کے ذاتی اوصاف واحوال کے ساتھ ان کی علمی، دینی، تعلیمی، تحریری اور تحریکی

خدمات بھی یاد کی گئیں اور حسب ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی:

''مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ایک جید الاستعداد معلم، علمی، فکری، تحقیقی اور تحریکی ذہن و مزاج رکھنے والے بے باک عالم تھے۔ مسلم مخالف تحریکوں، ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کے گرد تنگ ہوتے دائرے پر اُن کی گہری نظر تھی۔ ان کی بیشتر تصانیف کا محرّک یہی صورتحال تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان و کردار میں بڑی کشش رکھی تھی۔ اس لیے جہاں بھی رہے ان کے گرد معتقدین و متاثرین کا ایک ہالہ بن جاتا۔ چند برس مدرسۃ الاصلاح کی بھی خدمت کی؛ سادگی، تواضع اور انکساری اُن کا شیوہ تھا، اس کے باوجود زندگی بڑی مجاہدانہ گزاری؛ بڑی قربانیاں دیں؛ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں، مگر دین کے معاملہ میں ذرا بھی مداہنت گوارہ نہیں کی۔

اللہ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کا نعم البدل عطا کرے۔''

والسلام

خیراندیش

مفتی سیف الاسلام اصلاحی قاسمی

صدر مدرس، مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

۲۸/۹/۲۲ء

تعزیت نامہ

انجمن طلبہ قدیم
مدرسۃ الاصلاح

محترمہ ظلِ ہُما صاحبہ!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے بخیر ہوں گی۔

اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، ملک پیٹ، حیدرآباد۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی حیات وخدمات پر ایک وقیع مجلہ شائع کرنے جارہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ مجلہ مولانا کی شخصیت کے شایانِ شان ہو۔ آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی وفات مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ کے تمام وابستگان کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ مولانا نے مادرِ علمی مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک مدت تک وہاں تدریسی ذمہ داریاں بھی انجام دی تھیں۔ وہ فکرفراہیؒ کے حقیقی نمائندہ اور ترجمان تھے۔ اُن کی زندگی اسلاف کا نمونہ تھی۔ ابتدا ہی سے انھوں نے جس مشن کو منتخب کیا پوری زندگی اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دی مگر کبھی ان کے پائے استقامت میں معمولی لغزش بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ سادگی، علم، اخلاق، اخلاص، شجاعت، عزیمت اور تقویٰ کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ان کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی۔

اُن کی ہمیشہ ہی یہ کوشش رہی کہ مرد وخواتین کی ایک معتد بہ تعداد کی ایسی ذہن سازی کی جائے کہ وہ

فکرِ اسلامی کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کرسکیں۔ جامعۃ البنات اور جامعۃ البنات الاصلاحیہ کے ذریعہ انھوں نے طالبات کی تعلیم وتربیت اور کردار سازی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کی زیرِتربیت خواتین الحمدللہ پورے ملک میں دعوت واصلاح کے مشن سے جڑی ہوئی ہیں جوان شاء اللہ مولانا کے لیے عظیم صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی۔

مولانا نے ملک میں ملی مسائل پر جوموقف اوررائے اختیار کی وہ ان کی عزیمت اورمومنانہ فراست پر دال ہے۔ اللہ انھیں اس کا بہترین بدلہ دے۔ آمین!

ہم انجمن طلبہ قدیم مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی جانب سے مولانا کی خدمات کوخراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ مولانا کے شاگردان اوران کے اہلِ خانہ مولانا کے مشن کواسی جوش وجذبہ اورسرگرمی سے جاری رکھیں گے جومولانا کا خاصہ تھا۔

اللہ اُن کی جدوجہداور خدمات کوقبول کرے،کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرے، جنت الفردوس کواُن کا مسکن بنائے اوراُن کے اہلِ خانہ کوصبرِجمیل عطافرمائے۔ آمین!

والسلام

محمد جاوید اصلاحی

صدرانجمن طلباءقدیم مدرستہ الاصلاح

سرائےمیر، اعظم گڑھ، یوپی

۲۶رنومبر ۲۰۲۲ء

تعزیت

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

ہمیشہ یاد آئیں گے

وحدتِ اِسلامی ہند

امیر وحدت اسلامی ہند، جناب ضیاء الدین صدیقی نے مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے انتقال پر اپنی انتہائی تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ، تحریکِ اسلامی ہند کے ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ مختلف امور میں ان کی علمی تحقیق اور ان کے ذریعے پیش کردہ رائے ومشورے ہمیشہ ہی صائب ہوتے تھے۔ علمی وفکری حلقوں میں ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔ تحریکِ اسلامی کی نئی نسل کی فکری واَخلاقی تربیت میں اُن کا رول بہت ہی اہم رہا ہے۔

امیر وحدتِ اِسلامی ہند نے اُن کے تعاون اور اُن کی کوششوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ بابری مسجد کی بازیابی کے سلسلے میں ان کی کتابیں بطور خاص ''مساجد اللہ'' کو ایک اہم علمی مقام حاصل ہے۔ دفاع، خلافت، سیکولرزم وغیرہ امور پر ان کی تحقیق ورہنمائی ریفرنس کا درجہ رکھتی ہے۔

امیر وحدتِ اِسلامی ہند نے کہا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم، اپنی پوری زندگی تحریکِ اسلامی کے نصب العین اور اس کی بنیادی فکر کی ترویج واشاعت کے لیے ہمیشہ ہی سرگرم رہے۔ ان کی شخصیت نئی نسل کے لیے حوصلہ اور امید کا باعث تھی۔

امیر وحدتِ اِسلامی ہند نے تحریکِ اِسلامی کے تمام وابستگان کی جانب سے تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رب تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، اُن کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ **اللہ تعالیٰ** سے دعا ہے کہ اُن کے تمام متعلقین کو صبرِ جمیل اور تحریکِ اِسلامی کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

پریس سکریٹری

ایم فلاحی

وحدتِ اِسلامی ہند

نزد ایک مینارہ مسجد، کیلاش وہار، بیہٹ روڈ، سہارنپور، یوپی

۲۷ر ستمبر ۲۰۲۲ء

تعزیتی پیغام

المعہد العالی الاسلامی
حیدرآباد

حیدرآباد فرخندہ بنیاد علماء، صوفیاء اور بزرگوں کا شہر رہا ہے، آزادی کے بعد حیدرآباد نے تیزی سے ترقی کی، ترقی کی اس دوڑ بھاگ میں دین کا سرشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے، ملت اِسلامیہ کا اِسلام سے اَٹوٹ رشتہ قائم رہے، اس کے لیے جن بزرگوں اور علماء نے حیدرآباد میں دین کی محنت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، ان میں سے ایک نمایاں نام مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا ہے۔

آپ جید عالم، تجربہ کار مدرس اور حاضر العلم عالم تھے۔ دینی حمیت اور ملی غیرت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بڑھاپے میں جوان بیٹے کی شہادت کا غم اٹھایا لیکن حق پر استقامت کا جذبہ فروزاں ہی رہا؛ بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوا۔ خلافِ شرع باتوں پر نکیر کرنے میں آپ مخاطب کی وجاہت اور امارت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اور اپنی بے باک مگر سوچی سمجھی رائے کے اِظہار میں تامل نہیں کرتے تھے۔ یہی دینی حمیت آپ نے اپنی اولاد میں اور اپنے شاگردوں میں بھی منتقل کی۔ حیدرآباد میں آپ نے ملّت کی نصف آبادی کی دینی وعصری تعلیم کے لیے ”**جامعۃ البنات الاصلاحیۃ**“ قائم کیا، جو تقریباً چار دہوں سے اس میدان میں تسلسل کے ساتھ بڑی خدمت انجام دے رہا ہے، جو اِن شاء اللہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا۔

ملّت کو دین وایمان پر قائم رکھنے کے لیے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی خدمات کو تحریری نقوش کے ذریعہ اگلی نسلوں تک منتقل اور محفوظ کر دیا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے میں محبین اور مخلصین نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ”**الاصلاحیۃ**“ رسالہ کا خاص نمبر نکالا ہے، جس میں آپ کی خدمات کے مختلف گوشوں اور جہتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

خدا کرے یہ رسالہ عنداللہ وعندالناس مقبول ہو اور آپ کی خدمات سے واقفیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔

والسلام

خالد سیف اللہ رحمانی

جنرل سکریٹری اِسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا
وناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

تعزیتی بیان

ملّتِ اِسلامیہ دوعظیم اور مخلص شخصیتوں سے محروم

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا تعزیتی بیان

حیدرآباد (پریس ریلیز) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جناب مولوی رحیم الدین انصاریؒ اور حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے انتقال کو بڑا ملّی خسارہ قرار دیا۔ آپ نے کہا: جناب مولوی رحیم الدین انصاریؒ متعدد دینی و علمی اداروں کے ذمہ دار تھے، جن میں یونائٹیڈ مسلم فورم تلنگانہ، رکن تاسیسی کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل، کل ہند مسلم مجلس مشاورت شامل ہیں۔ انھوں نے ان تمام اداروں میں نمایاں خدمت انجام دی ہے، وہ آندھرا پردیش کے آخری اور تلنگانہ اردو اکیڈمی کے پہلے صدر بھی رہے اور اردو زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامیؒ کے زیرِ سایہ دارالعلوم حیدرآباد کی بنیاد رکھی اور اس کو تعلیمی و تعمیری اعتبار سے بامِ عروج پر پہنچایا۔ آپؒ کی یہ تعلیمی خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور ان شاء اللہ آخرت کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوگی۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ طویل عرصہ سے علیل تھے، لیکن ملی خدمت کا جذبہ آخر تک قائم رہا، آپؒ تجربہ کار مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، آپ میں بڑی ملی اور دینی غیرت تھی، کسی بھی خلافِ شرع بات پر فوراً نکیر کرتے تھے اور اپنی بے باک مگر سوچی سمجھی رائے کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے، جوان بیٹے کی شہادت کا غم اٹھایا، لیکن حق گوئی کے معاملے میں کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کا معتبر ادارہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ آپ کے لیے ان شاء اللہ صدقہ جاریہ ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ ان دونوں کی قبروں کو نور سے بھر دے، پسماندگان کو صبرِ جمیل اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

اِظہارِ تعزیت

مولانا عبدالعلیم اِصلاحیؒ
اور مولانا رحیم الدین انصاری کا سانحۂ اِرتحال
جماعتِ اسلامی ہند، امیرِ حلقہ تلنگانہ مولانا حامد محمد خان کا اظہارِ تعزیت

امیر حلقہ جماعتِ اِسلامی ہند، حلقہ تلنگانہ مولانا حامد محمد خان نے اپنے تعزیتی صحافتی بیان میں کہا کہ شہر حیدرآباد کی دو معتبر، معزّز و معروف دینی وملّی شخصیات ایک ہی دن میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئیں اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملیں۔ دونوں شخصیات گذشتہ طویل عرصہ سے علالت کا شکار تھیں۔ ان حالات کے باوجود ملّت کے لئے ان کا جذبہ و درد قابلِ قدر تھا۔ اور آخر وقت تک انہوں نے ملّتِ اِسلامیہ کی علمی وفکری رہنمائی کا کام انجام دیا۔ ملت کے لئے ان کی خدمات بے لوث تھیں۔ اِسی وجہ سے ملت کے لئے ان کی شخصیات ہمیشہ سے ہی پر کشش رہیں۔ امیر حلقہ نے کہا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے گذشتہ چار دہوں سے ملّتِ اِسلامیہ کی دختران کی دینی واخلاقی تعلیم کیلئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اُنہوں نے کہا کہ مولانا اصلاحیؒ ایک بے باک، حق گو اور باعمل عالمِ دین تھے اور ہمیشہ دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اِسی طرح مولانا رحیم الدین انصاری بھی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے ایک دینی مدرسہ کے سرپرست اور ساتھ ہی اردو اکیڈمی کے صدرنشین کے طور پر نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اردو زبان کے فروغ کے لئے بھی مولانا انصاری کی خدمات مثالی رہیں۔ ملّت کا درد وتڑپ رکھنے والے ان بزرگوں کی رحلت سے حیدرآباد کے مسلمانوں میں شدید غم ورنج پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ملّتِ اِسلامیہ اور شہر حیدرآباد کو ان حضرات کا نعم البدل عطا فرمائے، ان کی کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

خراجِ عقیدت

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
حیدرآباد دکن کی غیر معمولی شخصیت

صفابیت المال، حیدرآباد

دنیا میں انسان آتا ہے اور گنتی کے چند دن گزار کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ جب چلے جاتے ہیں تو ان کی موت کے ساتھ ان سے متعلقہ ساری ہی چیزیں اوجھل ہو جاتی ہیں۔ مگر دنیا میں چند برگزیدہ اور ممتاز ایسی شخصیات بھی ہوتی ہیں جو ظاہری اعتبار سے ہم سے دُور اور رَب سے قریب ہو جاتی ہیں مگر وہ ایسے مضبوط اور دیر پا نقوش چھوڑ جاتی ہیں، جنہیں نہ تاریخ فراموش کر پاتی ہے اور نہ ہی لوگ اپنے دماغوں سے نکال سکتے ہیں۔

ان ہی حساس، فکرمند، دردمند اور خاموش مزاج شخصیات میں سے ایک دُرِّ نایاب اور دُرِّ یکتا شخصیت حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی ہے، جن کی زندگی کی تعبیر اگر معتکف اور اعتکاف سے کی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس شخصیت کو آپ زیادہ تر نہ جلسوں اور مجالس میں پا سکتے تھے اور نہ بازاروں اور مارکٹ میں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی معروف مقامات پر ان کا وجود نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گوشہ میں گوشہ نشین ہیں اور کسی گم شدہ مکان میں مکین ہیں۔ شہرت کی طلب سے دور، سیاسی مکاریوں سے الگ تھلگ، شعبدہ بازی سے کنارہ کش، تصنع اور بناوٹ سے ماورئی، سازشوں اور چالبازیوں سے رشتہ توڑے اپنی مفید و نتیجہ خیز فکر میں گم، حقائق کے سمندر میں غوطہ زن، اللہ سے مضبوط رشتہ قائم رکھنے میں مگن اور اپنی علمی صلاحیتوں کو اِسلام کی نشر و اشاعت اور اقامتِ دین میں صرف کرنے میں مصروف و مشغول رہنا آپ کا پسندیدہ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ناموافق حالات میں صبر وتحمل کی راہ اختیار کرنا، مخالفتوں کے ماحول میں اعراض کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا، اپنوں یا غیروں سے پہنچی رنجشوں کو خلوت کے آنسوؤں کے ذریعہ ازالہ کرتے ہوئے دوسروں کے تسلی بخش کلمات سے بے نیاز اپنے آپ کو تسلی دے کر اپنے ہی بوجھ کو خاموش انداز میں ہلکا کر لینا، مخالفت کے ماحول میں اپنے

قیمتی ہدف سے بال برابر ہٹنے کے بجائے اپنی علمی اور روحانی توانائی کو صد فیصد حصولِ مقاصد میں لگا کر منزل پر قدم رکھنے کی جستجو کرنا، یہی سب کچھ تھا اس بزرگ شخصیت کی زندگی کا وہ سرمایہ اور اثاثہ جو آج بھی زندہ ہے اور صدیوں تک زندہ رہے گا۔ ہمیشہ اچھے لوگ تعداد میں کم رہے ہیں اور اصول اور دستور یہ ہے کہ جو چیز تعداد میں کم ہوتی ہے یعنی جس چیز کا شارٹیج ہوتا ہے اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی ہے کہ مولانا مرحوم ایک قیمتی شخصیت تھے جن کی قیمت لگائی نہیں جاسکتی۔

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ایک عالم باعمل تھے، پابندِ شریعت اور سنّتِ مطہرہ کے متبع اور مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ استقامت کا پہاڑ، علم کا سمندر، خشوع وخضوع کے حامل، تقویٰ اور پرہیز گاری کے منبع اور اخلاقِ حسنہ کے پیکر، معاملات کے صاف اور معاشرتی زندگی میں اوروں کے لیے نمونہ اور زندگی کے اپنے مکمل سفر کے بے داغ ہیرہ اور نتیجۃً زندگی کے اعتبار سے ایک سایہ دار درخت، مفید ومؤثر اور انجامِ حیات کے اعتبار سے قوم کے لیے ایک قیمتی اور تاریخی شخصیت تھے۔ وہ پیکرِ رضا وتسلیم تھے، سادگی اور تواضع ان کی فطرت میں پیوست تھی، ریاکاری سے زندگی بھر نا آشنا رہے۔ میں مولانا کی حیاتِ بے داغ اور اخلاقِ اعلیٰ و بالا سے ذاتی طور پر بیحد متاثر تھا اور ہوں اور رہوں گا، ان شاء اللہ۔

وہ ذخیرۂ آخرت لے کر دنیا سے اچانک ہی رخصت ہوگئے۔ لوگ جانے والوں کو کبھی کبھی یاد کر لیتے ہیں مگر مولانا مرحوم کی شخصیت یاد کرنے کے قابل نہیں بلکہ یاد رکھنے کے لائق شخصیت تھی۔ مرحوم نے جو کام ادھورے چھوڑے ہیں امید بلکہ یقین ہے کہ ان کے وفادار اور مخلص اخلاف ان کی تکمیل میں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتے رہیں گے اور ان کے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے ان کے مشن کو پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچائیں گے۔

احقر نے حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کو ہمیشہ ملنسار اور خوش مزاج پایا۔

مَیں 1994ء سے حضرت سے واقف ہوں۔ جن دنوں 'مسجد شاہ معظم شہیدؒ' میں امامت کے فرائض انجام دے رہا تھا، اُن دنوں مرحوم کی نمازیں اُس مسجد میں بھی ہوتی تھیں۔ حضرت کا ادارہ اور مکان اس مسجد سے قریب تھا۔ موقع بموقع حضرت سے میری ملاقات ہوتی تھی اور اس سعادت کا برسوں سلسلہ جاری تھا، مگر حضرت نے کبھی اپنی اعلیٰ شخصیت ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ بڑوں کا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ انداز ہم چھوٹوں کو بڑا سبق دیتا ہے۔

مولانا غیاث احمد رشادی

صدر صفا بیت المال، حیدرآباد

۲۰۲۲/۱۱/۱۲ء

اِظہارِ تعزیت

جامعہ عائشہ نسواں، حیدرآباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے میری ملاقات بہت پرانی ہے مولانا بہت ہی سیدھے سادے منکسرالمزاج تھے۔ ملّت کے دفاع کے سلسلے میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، جس میں بہت سی تجاویز رکھی تھیں۔ مرحوم کے انتقال کی وجہ سے پُرخلوص علماء میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے قائم کردہ ادارہ کو عافیت کے ساتھ ترقی عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

حافظ محمد خواجہ نذیرالدین سبیلی
ناظم جامعہ عائشہ نسواں
مادنا پیٹ، حیدرآباد

اِظہارِتعزیت

ایڈیٹر اِن چیف روزنامہ ’منصف‘

محمد عبدالجلیل کا اظہارِتعزیت

ایڈیٹر ان چیف روزنامہ منصف جناب محمد عبدالجلیل نے ملّتِ اِسلامیہ کی دو اہم شخصیات مجاہد ملت مولانا عبدالعلیم اصلاحی ناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ سعید آباد، حیدرآباد اور جناب محمد رحیم الدین انصاری رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد، شیورام پلی، حیدرآباد کے سانحۂ ارتحال پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایک ہی دن شہر کی دو معروف شخصیتوں کی رحلت سے ملّت کا عظیم نقصان ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے نازک وقتوں میں ایک مجاہد کی طرح ملّت کی رہنمائی کی ہے اور وہ ظلم کے آگے ہمیشہ ڈٹے رہے۔ انھوں نے نازک وقتوں میں گجرات پولیس کے ہاتھوں اپنے جواں سال بیٹے کو کھویا ہے، اس کے باوجود اُن کے عزم واستقلال میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ ناسازیٔ صحت کے باوجود ملّت کے اہم مسائل پر اپنا بے باکانہ ردِعمل پیش کرتے رہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی کا سارا گھرانہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے وقف رہا ہے۔

جناب محمد عبدالجلیل نے کہا کہ جناب محمد رحیم الدین انصاری مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن کی حیثیت سے اپنے مفوضہ فرائض بخوبی انجام دیتے رہے اور انہوں نے مولانا محمد حمیدالدین عاقل حسامیؒ کے دستِ راست بن کر دارالعلوم حیدرآباد کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے اے پی اُردو اکیڈیمی اور تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے صدر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں اور اردو کی ترقی کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔

جناب محمد عبدالجلیل نے مرحومین کے درجات کی بلندی اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کی۔

روزنامہ ’منصف‘ حیدرآباد
۲۸ ستمبر ۲۰۲۲ء

تعزیت نامہ

اہلیہ قاری صاحب بنارس

محترمہ رویدا صاحبہ زوجہ مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحی!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ خیر وعافیت سے ہوں گی۔

حضرت مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا سانحۂ ارتحال بلاشبہ آپ کے لیے اور آپ کے بچوں کے لیے نہایت رنج وغم کا باعث ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ ہمارے گھر کے تمام افراد بھی غمزدہ ہیں۔ آپ لوگوں کا ہمارے یہاں سے جو تعلق ہے وہ بیان کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن ہر آدمی کا ایک وقت متعین ہے اور جب وہ متعین وقت آجاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی۔ مولانا اپنا عرصۂ حیات پورا کر کے اللہ کے حضور چلے گئے۔ دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کی باغ و بہار اور وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے، ان شاء اللہ! مولانا مرحوم ایک بہترین واعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے جس کی وجہ سے وہ ایک اچھے استاد مانے جاتے تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اپنی روحانی اولادیں شاگردوں کی شکل میں چھوڑی ہیں جن کی تعداد بے شمار ہے جو مولانا کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔ مولانا ایک جری اور باہمت ہستی تھے جن کے اندر مصلحت پسندی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کسی معاملہ میں ان کا جو موقف ہوتا اس کا بلا کسی خوف کے برملا اظہار کرتے۔ دینی غیرت وحمیت میں پیش پیش تھے۔ ''مجسّموں کی مِسماری کا مسئلہ'' ان کی غیرت وحمیت دینی کی واضح مثال کی شکل میں اہلِ علم کے سامنے موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کی مغفرت کاملہ فرمائے، برزخ کی زندگی خوشگوار بنائے، اُن کے حسنات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگزر فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین!

آپ حضرات صبر سے کام لیجیے کیونکہ صبر کا اجر وثواب اللہ کے یہاں بے حساب ہے۔

والسلام

اہلیہ قاری نورالحق مرحوم
بنارس، ۲۹ ستمبر ۲۰۲۲ء

خراجِ تحسین

مولانا عبدالعلیم اِصلاحیؒ
اپنی خصوصیات وامتیازات کے آئینہ میں

حالیہ دنوں میں دکن کا علاقہ دو عظیم شخصیات سے محروم ہو گیا، ایک جناب مولانا محمد رحیم الدین انصاری صاحبؒ ناظم جامعہ اِسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد اور دوسرے حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ہیں، جنھوں نے دعوت واصلاح، صبر وعزیمت اور دینی خدمات سے بھر پور زندگی گزار کر پیرانہ سالی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا اصلاحیؒ کی شخصیت عزیمت کا پہاڑ اور صبر کا پیکر تھی، ظلم وجبر کی طاقتوں کے خلاف حق وانصاف کی آواز بلند کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا۔ دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر ظلم ہوتا دیکھتے، بے چین و بےقرار ہو جاتے بالخصوص ملک میں مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کے لیے نہ صرف متفکر رہتے تھے؛ بلکہ ظالم فرقہ پرستوں کے خلاف زبان وقلم کے ذریعہ حتی المقدور برسر پیکار رہتے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک حیدرآباد میں قائم ادارہ جامعۃ البنات کا انتظام وانصرام سنبھالا۔ ان کے دورِ اہتمام میں اس ادارہ نے دخترانِ ملت کو دینی وعصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے حوالہ سے غیر معمولی خدمات انجام دیں، پھر بعض معاملات میں اختلاف کے باعث ادارہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کا قیام عمل میں لایا اور اسے خوب پروان چڑھایا۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی مولانا نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کے قلم سے متعدد قیمتی علمی شاہکار تصانیف وجود میں آئیں اور انہیں عوام وخواص میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اللہ مولانا کی خدمات قبول فرمائے۔ آمین

مولانا سید احمد ومیض ندوی
استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

اے ہم نفسانِ محفلِ ما

رفتید ولے نہ از دلِ ما

تم بھول نہیں جانا

اس خاک کی بستی میں، جتنے بھی نبی اترے
افلاک کے دفتر سے، اک نور وحی لائے
سمجھاتے چلے آئے
اللہ کی عبادت ہی، ہر شے پہ مقدم ہے
اوراس کے ہاں بندہ، تقویٰ سے مکرم ہے
اک بار حضوراس کے، توبہ تو کرو دل سے
پھر ابر وہ رحمت کے، برسا کر لائے گا
نہریں بھی بھری ہوں گی، فصلیں بھی اگائے گا
گودیں بھی ہری ہوں گی، گلشن بھی سجائے گا
سو بار پھسل جاؤ، ہر بار پلٹ آنا
بس یاد اسے رکھنا
اور بھول نہیں جانا

اصلاح کی نیت سے، اخلاص ومحبت سے
ہر خیر کو پھیلانا
معروف کی دعوت سے، ایمان کی گرمی سے
لہجے کی نرمی سے،
منکر کی حقیقت بھی
ہر اک کو سجھا دینا، پھر مل کے مٹا دینا
مشکل ہو اگر کوئی
ہجرت کو نکل آنا
بطحا کے غاروں سے، تاریخ کے دھاروں سے
گلزار جنت کی، خوشبو کا پتہ لینا
تم انؐ کے نقش پا، آنکھوں میں بسا لینا
چلتے ہی چلے آنا، ہرگز نہیں گھبرانا
طائف سے گزر ہوگا، مجروح خودی ہوگی

احزاب بھی آئیں گے، خندق بھی کھدی ہوگی
تم سب سے گزر جانا

راحت کے عذابوں سے، کاغذ کے گلابوں سے
دامن کو بچا رکھنا، جذبوں کو جواں رکھنا
احساسِ زیاں رکھنا، مضبوط قویٰ رکھنا
اخلاص ووفا رکھنا، آنکھوں میں حیا رکھنا
پہرا بھی کڑا رکھنا، ہاں! ظرف بڑا رکھنا
اس راہ کا ہر کانٹا، جنت کا ثمر ہوگا
زخموں پہ جزا لینا، ہر اک سے دعا لینا
کمزوروں، بوڑھوں کی، بچوں کی، ماؤں کی
آواز پہ 'جی' کہنا، خاموش نہیں رہنا
اللھم انصرھم، اللھم انصرھم
یوں ڈیڑھ ارب امت، جب تم کو دعائیں دے
کیا اس کا بھلا کہنا

ہاں—ایک تجارت ہے
جو سارے خسارے سے
واں تم کو بچا لے گی
دامن میں چھپا لے گی
اللہ کے رستے میں
یہ جان لگا دینا
یہ مال کھپا دینا
بس یاد اسے رکھنا
اور بھول نہیں جانا

میرے بھیا!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ڈاکٹر اجمل خان، ممبئی

موت برحق ہے۔ "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" یہ اللہ کا فرمان ہے۔ ہر ایک کو ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے۔

میرا ددھیال بلیا، کلیا نپور اور ننھیال موضع بمہور، اعظم گڑھ یوپی ہے۔ بچپن کے ہلکے سے نقوش باقی ہیں۔ میں نے اَمّاں سے پوچھا "یہ جو سفید کپڑوں میں آتے ہیں، کون ہیں؟" تو اماں نے بتایا: "آپ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔" اس طرح عبدالعلیم بھائی سے میں پہلی دفعہ متعارف ہوا۔ پھر وہ جب بھی ہم سے ملنے آتے ہم ندی کی طرف نکل جاتے، باغات اور کھیتوں میں چہل قدمی کرتے۔ اگر آموں کا موسم ہوتا تو پھلوں کا لطف بھی اٹھاتے۔ یہ باتیں میں اپنے ننھیال کی بتا رہا ہوں۔ اَمّاں کی زبانی معلوم ہوا کہ خالہ کا انتقال اس وقت ہوا جب بھیّا کی عمر تین چار سال کے لگ بھگ تھی۔ نانی بھیّا کو دیکھ بھال کے لیے بمہور لے آئیں۔ اس وقت اَمّاں کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ بھائی تقریباً نو سال کی عمر تک یہیں رہے اور نانی اور اَمّاں کی دیکھ ریکھ میں رہے۔ اَمّاں بتاتی تھیں کہ وہ جہاں بھی جاتیں بھائی ساتھ ہی رہتے۔ کھانا پینا، کھیلنا کودنا سب ساتھ ہی ہوتا۔ اس دوران خالو کئی دفعہ بندی گھاٹ سے ملنے کے لیے آئے اور بھیّا کو بندی گھاٹ لے جانے کی ہر دفعہ کوشش کی، لیکن ہر دفعہ نانی منت سماجت کرنے لگتیں اور رونا دھونا مچا دیتیں، کہتیں کہ "بابو ابھی بہت چھوٹا ہے کچھ دن بعد لے جانا۔" خالو جلد آنے کا کہہ کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔

اس وقت گاؤں میں باقاعدہ کسی مدرسہ یا اسکول کا انتظام نہیں تھا۔ گھروں اور بیٹھکوں میں چھوٹے چھوٹے

مکتب ہوتے، وہیں ابتدائی دینی تعلیم دی جاتی اور اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا۔ اَمّاں بھی ایسے ہی مدرسوں میں جاتیں اور بھائی کو بھی ساتھ لے جاتیں۔ اَمّاں بتاتی تھیں کہ: ''بچے فارغ اوقات میں کھیلتے اور شور وغل کرتے لیکن بھیّا خاموش ایک جگہ بیٹھے رہتے تھے۔''

بھیّا بچپن سے ہی کم گو تھے زیادہ بات نہ کرتے۔ کام کی کوئی بات کی اور پھر خاموش۔ ہاں ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر ہمیشہ رہتی جو کہ تقریباً آخری وقت تک موجود رہی۔

تھوڑے بڑے ہوئے تو باقاعدہ بھیّا کو بھی عربی اور قرآن کی تعلیم کے لیے ایسے ہی ایک مکتب میں داخل کروادیا گیا۔ پڑھائی میں ماشاء اللہ بہت تیز تھے۔ اسی دوران ایک دفعہ پھر خالو آئے اور پکے ارادے کے ساتھ آئے تھے کہ بھیّا کو لے کر ہی جائیں گے۔ بہت بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ فلاں مہینہ میں آکر لے جائیں۔ اور پھر کئی دفعہ دن اور تاریخ طے ہوتی رہی لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی بہانے نانی روک لیا کرتیں۔ نانی دراصل بھیّا سے بے انتہا محبت کرتی تھیں اور اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھیں اور بھیّا بھی نانی سے بے حد محبت کرتے تھے اور خود بھی جانا نہیں چاہتے تھے۔ اَمّاں بتاتی تھیں کہ ہر دفعہ خالو کے جانے کے بعد اَمّاں، بھیّا اور نانی بیٹھ کر خوب روتے تھے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے تھے کہ بندی نہیں بھیجنا ہے۔ یہیں سب ساتھ ہی رہیں گے اور پھر بات آئی گئی ہو جاتی۔

ایک سال گرمی بہت تھی، چلچلاتی دھوپ میں ظہر کے وقت خالو اچانک آگئے۔ سب کا گرمی سے بُرا حال تھا۔ نانی کی طبیعت خراب تھی۔ خالو کو دیکھ کر نانی بہت ناراض ہوئیں کہ یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔ صبح آئے ہوتے، دوپہر میں 'لو' لگنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت بھائی آٹھ نو سال کے تھے وہ جاکر چھپ گئے۔ بڑی مشکل سے شام میں سلام کرنے باہر آئے۔ رات میں خالو نے کھانے سے فارغ ہوکر بھیّا کو لے جانے کی ضد کی اور دوسری صبح تقریباً نانی سے لڑ جھگڑ کر بھیّا کو بندی لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ گاؤں کے باہر تک نانی اور اَمّاں بھیّا کو چھوڑنے گئے۔ بھیّا بار بار پلٹ کر آتے اور نانی اور اَمّاں سے روتے ہوئے لپٹ جاتے اور نہ جانے کی ضد کرتے۔ نانی اور اَمّاں کی تو روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ بہرحال سب نے روتی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کو وداع کیا۔ بھیّا کے جانے کے بعد نانی اور اَمّاں نے کئی دنوں تک صحیح سے کھانا پینا نہیں کیا تھا۔ نانی ہر وقت بھیّا کو یاد کرتیں اور ان کی چیزیں دیکھ دیکھ کر روتی رہتیں۔ نانی، نواسے اور خالہ بھانجے کی اس محبت کی کہانی گاؤں میں ابھی تک سنائی جاتی ہے۔

بھیا کو خالو نے ایک دو سال تو پڑوسی گاؤں غالب پور میں مکتب میں پڑھایا۔ پھر جب بھیّا گیارہ سال کے

ہوئے تو مدرسۃ الاصلاح میں داخل کروادیا۔ بھیّا مدرسہ کی چھٹیوں میں وقت نکال کر نانی اور اَمّاں سے ملنے ضرور آتے۔ اور یہ سلسلہ اَمّاں کی شادی کے بعد بھی چلتا رہا۔ بھیّا، اَمّاں سے ملنے 'بلیا کلیا نپور' سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے اور مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی ماموں بھی ساتھ ہوتے۔

اَمّاں ایک واقعہ بتاتی تھیں کہ بھیّا ایک دفعہ آئے تو آموں کا موسم تھا، گھر میں آم پکنے کے لیے رکھے ہوئے تھے، نانی آم لے آتیں۔ جو آم خراب ہونے لگتے وہ خود کھاتیں اور اچھے آم بچوں کو دیتیں۔ ایک دن صبح یہ مشغلہ چل رہا تھا کہ بھیّا نے نانی سے کہا کہ: ''نانی ایک دن یہ خراب آم آپ پھینک دیں اور صبح کے بجائے شام میں آم دے دیا کریں تو آپ کو بھی اچھے آم کھانے کو ملیں گے۔'' پھر ہونے یہ لگا کہ نانی کے آم لانے سے پہلے ہی بھیّا چپکے سے جا کر زیادہ پکے اور خراب آم لے آتے اور بیلوں کو کھلا دیتے اور نانی ڈھونڈتی رہ جاتیں، پھر بالآخر سب کے ساتھ پکے، اچھے آم کھاتیں اور افسوس کرتیں کہ آج آم خراب نہیں ہوئے اور ان کو وہ آم کھانے پڑ رہے ہیں جو بچوں نے کھانا تھا۔ بھیّا کے جانے کے بعد اَمّاں نے یہ عقدہ کھول دیا کہ عبدالعلیم نے ایسا کیا تھا تاکہ آپ بھی اچھے آم کھا سکیں۔ اس پر وہ بھیّا پر اُن کی غیر موجودگی میں ناراض بھی ہوتیں اور خوش بھی کہ: ''اُس کو دیکھو میرا کتنا خیال رکھتا ہے جبکہ دوسرے میرا خیال نہیں رکھتے۔''

بمہور ہمارا مشترکہ ننھیال ہے وہیں پر بھائی کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور پھر کئی ملاقاتوں کے بعد مانوسیت ہوئی تھی۔ مشرقی یو پی کے سرما کے دن تھے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ سردی اور گرمی دونوں موسم شدید ہوتے ہیں اور موسم باراں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اچانک ایک روز اَمّاں نے گھریلو پریشانیوں سے تنگ آکر بھیّا اور خالو کے پاس ''بندی گھاٹ'' جانے کا ارادہ کرلیا۔ ماموں کو پیغام پہنچایا کہ مجھے ''بندی'' لے چلو۔ وہ فصل کی بوائی کٹوائی کے سبب نہ آسکے۔ پھر بھیّا کو پیغام پہنچایا۔ بھیّا فوراً چھٹی لے کر آگئے، ان کے ساتھ ماموں بھی تھے۔ دونوں نے والدہ کو سمجھایا لیکن والدہ نہ مانیں اور ''بندی'' آگئیں۔

اُس وقت والد صاحب بمبئی میں برسرِ روزگار تھے، سال چھ ماہ میں گاؤں کا سفر کرتے تھے۔ میری عمر سات آٹھ سال کے قریب تھی یعنی اتنی سمجھ تھی کہ مدرسہ کے بعد کبھی کبھی گھر کی بکریاں چرانے لے جاتا تھا۔ بہر حال بندی میں شگفتہ اور شگوفہ سے ملاقات ہوئی، دونوں بہت چھوٹی تھیں۔ پھر وہاں ہم کچھ مہینے رہے۔ پھر چھٹیوں میں بھیّا آئے اور ہمیں بمبئی والد صاحب کے پاس لے آئے۔ یہ بمبئی کا ہمارا بھی اور بھیّا کا بھی پہلا سفر تھا۔ اس دفعہ ''بندی'' اور پھر بمبئی میں بھیّا کے ساتھ ہمارا کافی وقت گزرا۔ ہر صبح بھیّا ناشتہ کے بعد یا پہلے قرآن لے کر بیٹھتے، میرا سبق ناظرہ سنتے، حفظ کا سبق دیتے اور تجوید درست کرتے۔ اَبّا بھیّا کی بہت عزت کرتے اور ان کا بہت خیال رکھتے۔ ہر وقت مولوی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے۔ بھیّا کی چھٹیاں ختم ہوئیں۔ پُرنم آنکھوں سے ہم

سب نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

اس کے بعد ہم گاہے بگاہے ملتے رہے۔ دوری ہوجانے سے جلدی جلدی ملاقاتیں تو نہیں ہوتی تھیں لیکن بھیّا امّاں سے ملنے سال میں ایک مرتبہ ضرور بمبئی چلے آتے۔ کئی بار بھابھی بھی ساتھ ہوتیں۔ ہم لوگ بھی جب کبھی گاؤں جاتے تو ''بندی'' بھی ضرور جاتے اور سب سے ملاقات کرتے۔ سالوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر خبر آئی کہ بھیّا کریم نگر چلے گئے ہیں۔ پھر کچھ سال بعد حیدرآباد آئے تو دوبارہ ملاقاتوں کا سلسلہ بحال ہوگیا۔

تلاشِ معاش میں میرا سعودی عرب ریاض جانا ہوا۔ والدہ تقریباً ساتھ ہی رہتیں۔ دو یا تین بار بھیّا بھی ریاض آئے۔ آتے وہ جدّہ تھے لیکن کسی نہ کسی طرح ریاض ملاقات کرنے ضرور آجاتے۔ ریاض میں ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب اور دوسرے دوست واحباب سے ملاقات ہوتی۔ جماعتِ اسلامی سے منسلک ارکان سے بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ لوگ بھیّا کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور مدرسہ کا تعاون بھی کرتے۔ بھیّا جب بھی کوئی کتاب لکھتے اس کے نسخے ضرور بھیجتے اور پھر بحث ومباحثہ اور تبصرہ ہوتا۔

یادوں کا ایک ہجوم ہے جو ذہن ودل کے گوشوں سے امڈا آرہا ہے۔ بہت سارے قابلِ ذکر واقعات اور حالات ہیں جو کہنا چاہ رہا ہوں لیکن کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ سارے خیالات آپس میں گڈمڈ ہورہے ہیں۔ ماضی کے ان لمحات کو میں کبھی بھلا نہ پاؤں گا جو میں نے عزیزم بھیّا کے ساتھ گزارے ہیں۔ جب بھی کسی موضوع پر بات ہوتی تو کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوتا کہ میں اکیلا ہی مسلسل بول رہا ہوں اور بولے جارہا ہوں۔ بھیّا خاموشی سے سنتے رہتے اور جب میں استفسار کرتا تو چند الفاظ میں جامع جواب دے دیتے۔ ہاں بھابھی ضرور اس میں کوئی نہ کوئی مزاح کا پہلو تلاش لیتیں اور لقمہ لگاتیں۔ بھیّا کی مسکراہٹ تھوڑی اور گہری ہوجاتی اور بس یہی ان کا جواب ہوتا۔ اور یہ سلسلہ گھنٹوں چلتا رہتا۔

جب ہم پہلی بار بمبئی جارہے تھے اس وقت کا واقعہ امّاں بتاتی تھیں کہ اس وقت گاؤں سے بمبئی تک کا سفر تقریباً ۴۵ سے ۵۰ گھنٹوں کا ہوتا تھا۔ ریل کا سفر تقریباً ۳۸۔۴۰ گھنٹوں کا تھا۔ بھیّا نے اپنی سیٹ کسی عورت کو دے دی اور اٹھتے بیٹھتے بمبئی کا سفر پورا کیا۔ امّاں کے بہت اصرار پر بھی وہ سیٹ پر سونے یا بیٹھنے پر راضی نہ ہوئے۔ بھیّا کی ہمدرد فطرت کا ذکر امّاں اکثر کیا کرتی تھیں۔

بھیّا کی اعتدال پسندی، صبر اور اسلام کے تئیں سنجیدگی اور ثابت قدمی نے ہمیشہ انھیں مثبت اور سنجیدہ بنائے رکھا۔ انھیں میں نے کبھی مزاح یا لطیفہ گوئی کرتے نہ دیکھا۔ وہ باشعور، محنتی اور قابلِ اعتبار شخص تھے۔ ہر امتحان کو قبول کرتے اور کامیابی ملنے تک ڈٹے رہتے۔ ان کا دل ہمیشہ دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ خاص کر غریب اور لاچار لوگوں کی مدد ضرور کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہتے۔ خاندانی معاملات کو بھی بحسن وخوبی

سلجھاتے اور دوسرے کو زیادہ دے کر معاملات کو رفع دفع کرتے۔ خاندان میں آپ مرکزی حیثیت کی حامل شخصیت تھے آپ کے جانے کے بعد اس خلا کو پُر کرنا بہت مشکل ہے۔

آہ! آج وہ خادم قوم وملت نہ رہے، جنھوں نے ملّتِ اِسلامیہ کی فلاح و بہبود کو اپنی زندگی کا منشور و دستور بنالیا تھا اور آخری دم تک اس پر قائم رہے۔ آج وہ ہستی نہ رہی جس نے قوم کی بچیوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس کے لیے سخت سے سخت امتحان میں بھی ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ آج وہ ہستی نہ رہی جس نے دشمن سے کبھی بدلہ نہ لیا۔ خندہ پیشانی سے سب کو معاف کیا۔ چھوٹے بڑے سب ان کے گرویدہ تھے۔

آخری دفعہ جب طبیعت ناساز ہوئی، آنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا مگر اسی دن پاک روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مَیں پُرنم آنکھوں اور غمزدہ دل کے ساتھ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور ان کی ایک ایک صفت کے متعلق تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں لیکن ان کی صفات کے بارے میں لکھنا سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے اور یہ فن مجھے نہیں آتا۔

بس میں دعا کرتا ہوں کہ اے رب العالمین میرے بھیّا کی مغفرت فرما دیجیے، اُنھیں اُن کے پیاروں، نانی، اَمّاں، خالہ، خالو، مجاہد اور سبھی عزیزوں سے ملا دیجیے۔

ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلاتے ہوئے نیکیوں کے راستے پر ثابت قدمی سے گامزن کر دیجیے اور ہم سب سے راضی ہو جایئے۔ آمین یارب العالمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
ایک فرد، ایک سیلِ رواں

ڈاکٹر انیس احمد فلاحی، دہلی

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بیسویں اور اکیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ آپ 31/جنوری 1934ء کو اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے ایک گاؤں بندی گھاٹ میں پیدا ہوئے اور 27/ستمبر 2022ء کو شہرِ حیدرآباد (تلنگانہ) کے ایک ہاسپٹل میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

اللہ رب العزت ہر انسان کو ایک مہلتِ عمل عطا کرتا ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس مہلتِ عمل کا ادراک و استحضار رکھتے ہیں۔ مولانا اس لحاظ سے خوش قسمت اور عظیم تھے کہ آپ نے اپنے شعور کی عمر سے وفات تک ہر لمحہ کو شعور کے ساتھ با مقصد رضائے الٰہی اور خوشنودئ رب کے حصول میں گزارا۔ آپ کی زندگی کا ایک واضح نصب العین تھا۔ حق کا غلبہ اور باطل کی شکست۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے آپ نے اپنی پوری زندگی لگا دی۔ آپ کی زندگی آزمائشوں سے بھرپور رہی لیکن آپ نے راہِ حق کی ہر آزمائش کو خندہ پیشانی اور صبرِ عظیم کے ساتھ قبول کیا۔ مولانا ان تمام اوصافِ حمیدہ کے پیکر تھے جو ایک داعی، مصلح اور مجاہد کے لیے ضروری ہیں اور جو اللہ کے محبوب بندوں کے شایانِ شان ہیں۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ مولانا نے مجھے اپنی فرزندی میں قبول کیا اور میں تقریباً ستائیس سال آپ کی پدرانہ شفقتوں سے فیض اٹھاتا رہا۔ اس دوران میں نے آپ میں جن نمایاں خوبیوں کا مشاہدہ کیا ان کا تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

سادگی کا پیکر

سادگی یا سادہ طرزِ زندگی اِسلام کا امتیاز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ، بندۂ مومن کی میراث اور اِسلامی ثقافت کی شان ہے۔ سادگی حرص و طمع کے دلدل اور مال ومتاع کی خواہش سے انسان کو بچالیتی ہے۔ سادگی درحقیقت راہِ عزیمت کا پہلا پڑاؤ ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ سادگی کا پیکر اور سادگی کا مجسمہ تھے، سادگی مولانا کے ظاہر میں بھی تھی اور باطن میں بھی، سادگی مولانا کی گفتگو میں بھی تھی اور سیرت و کردار میں بھی، مولانا نے اپنی پوری زندگی سادگی سے گزاری اور اسی سادگی کے ساتھ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

درویشی کی علامت

مولانا صوفی نہیں تھے اور شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے مدارج سے نہ گزرے ہوں گے، لیکن ایک مردِ درویش ضرور تھے۔ ان کی زندگی گہرے علم شرعی اور اس علم کے مطابق عمل پیہم، ادراک حقیقت کونین اور معرفتِ الٰہی کی غماز تھی۔ اسی علم و معرفت کا نتیجہ تھا کہ وہ اُمّتِ اِسلامیہ ہند کو پیش آنے والے ہر مسئلہ پر اپنی ایک مدلل، مضبوط اور جرأتمندانہ رائے رکھتے تھے۔ آنے والے کل کا ادراک رکھتے تھے۔ بے نیاز طرزِ زندگی کے مالک تھے۔

شفقت اور محبت کا سایہ دار درخت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن کی گواہی ہے:

> ''اے مومنو! تمہارے پاس تمہاری ہی قوم کا ایک فرد رسول ہوکر آیا ہے، تمہارا تکلیف میں پڑنا اس پر شاق گزرتا ہے اور وہ تمہارے لیے خیر کا بھوکا ہے، اور مومنوں کے ساتھ محبت کرنے والا اور بہت ہی کرم کرنے والا ہے۔'' (التوبہ: ۱۲۸)

مولانا علیہ الرحمہ اس آیت پر سراپا عامل تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اسوہ کو اپنی زندگی میں خوب بسایا تھا۔ اپنے ماتحتوں، ملنے جلنے والوں، متعلقین اور قرابت داروں کے لیے شفقت و محبت کا پیکر تھے۔ تمام ہی لوگوں کے ساتھ جو آپ سے ربط میں آتے انتہائی شفقت کا معاملہ فرماتے۔ ایسی محبت فرماتے جو لوگوں کا دل جیت لیتی، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ ''محبت فاتح عالم'' کی زندہ تصویر تھے۔ حضرت عائشہؓ کے مشاہدے ''واللّٰہ ماضرب رسول اللّٰہ خادمًا'' سے ملنے والا اسوہ آپ کی زندگی کی شان تھا۔

انتہائی مہمان نواز

اِسلام نے مہمان نوازی کو بے انتہا اہمیت دی ہے اور اپنے متبعین کو مہمانوں کے بھرپور اکرام، خدمت اور

تواضع کی طرف متوجہ کیا ہے بلکہ حکم دیا ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ اپنے مہمانوں کی بھرپور ضیافت فرماتے، اپنی وسعت اور کشادگی سے زیادہ ان کا دل وسیع ہوجاتا اور ان کے ہاتھ کھل جاتے۔ مہمانوں کی ضیافت کرکے مولانا بے اِنتہا سرور محسوس کرتے، یہ سرور درحقیقت اس اتباع حکم و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سرور تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''

رقیق القلب

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

رقّتِ قلب ایک اعلیٰ انسانی و ایمانی وصف ہے۔ ہمارے دین میں دلوں کو رقیق اور نرم بنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے:

''یہ اللہ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے نرم دل ہوئے، اور اگر آپ تندمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔'' (آل عمران:۱۵۹)

مولانا علیہ الرحمۃ رقیق القلب تھے اور یہ رقت آپ کے اندر شدت کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ جو بھی آپ کے قریب آتا وہ آپ سے متاثر ہوتا۔ آپ کی رقّتِ قلب نے آپ کو حسنات کا سرچشمہ بنادیا اور آپ سے ان نیکیوں کا صدور ہوا جن کا تصور ایک رقیق دل سے ہی معنون کیا جاسکتا ہے۔

حق گوئی اور بیباکی کی مضبوط آواز

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حق گوئی مالک کونین کی صفت ہے: وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ (الاحزاب:۴)۔ حق گوئی انبیاء کا اسوہ ہے۔ حق گوئی نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف ہے۔ حق گوئی اہلِ اسلام کا امتیاز ہے۔ حق گوئی اِسلامی تعلیمات کا لب لباب ہے۔ حق گوئی و بیباکی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بغیر بیباکی کے حق گوئی کا تصور محال ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ میں یہ وصف بخوبی پایا جاتا تھا۔ آپ بے انتہا حق گو اور بیباک تھے۔ آپ کی شخصیت اس حقیقت کا برملا اظہار تھی:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سَو بار کرچکا ہے تُو اِمتحاں ہمارا

مولانا کی پوری زندگی حق گوئی کا ایک شہ پارہ تھی۔ آپ نے ہمیشہ باطل اور ناحق کے مقابلے میں اعلان حق کیا اور درست رائے، موقف اور طرزِ عمل کو پوری قوت اور بیبا کی سے پیش کیا۔ اس حق گوئی اور بیبا کی کی وجہ سے آپ کو ان حالات سے بھی گزرنا پڑا کہ ''اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش''، لیکن آپ نے 'حکمِ ربی' کے آگے کسی اور خواہش اور فرمان کو اہمیت نہ دی۔ ''میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند''۔

گہرائی و گیرائی ''گرم دم جستجو'' کی ایک روشن مثال

علم کی اِبتداء ہے ہنگامہ
علم کی اِنتہاء ہے خاموشی

اِسلام نے حصولِ علم پر بہت زیادہ زور دیا۔ قرآن مجید میں "تَفَقُّهٌ فِي الدِّيْنِ" پر ابھارا گیا اور حصولِ علم پر رفع درجات کی خوشخبری سنائی گئی۔ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (المجادلۃ: ۱۱)۔ احادیثِ مبارکہ میں حصولِ علم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمت افزائی کی گئی اور خوشخبریاں سنائی گئیں۔ اصحابِ علم کی اہمیت کو بیان کیا گیا۔ علماء کو وارث انبیاء تک قرار دیا گیا۔ ''اِنَّ الْعُلَمَاءِ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ''۔

مولانا علیہ الرحمۃ اس حکم کی تعمیل پر پورے اترے۔ آپ نے حصولِ علم کے بعد اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔ تدبر اور تفقہ کے وصف سے اپنے آپ کو مزین کیا۔ علم الشریعۃ کے نشر اور تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ آپ نے بے شمار علم کے پودے لگائے، آپ نے پورے ستر برس ان کی آبیاری کی، ان کو تراشا خراشا اور ان کو مضبوط تناور درخت بنادیا۔ مولانا کی ایسی بے شمار طالبات ہیں جو انتہائی ذی علم اور باعمل ہیں اور جنھوں نے علم کے فروغ کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے جو یقیناً مولانا کے لیے ایک صدقہ جاریہ ہیں۔

عزم مصمم کا زندہ نقش

ہو اگر عزم مصمم خواہش منزل کے ساتھ
راہ کا پتھر بھی اک دن رہ نما ہوجائے گا

قرآن مجید میں اولوالعزم کا لفظ خصوصاً ان انبیائے کرام کے لیے استعمال کیا گیا جو نئی شریعت یا نئی کتاب لے کر آئے تھے کیونکہ ان انبیاء کرام کو آزمائشوں کی پر پیچ اور خطرناک وادیوں سے گزرنا تھا۔ انبیاء کرام نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے اس مرحلہ کو سر کیا۔

جن افراد کی زندگی کا ایک واضح نصب العین اور مشن ہوتا ہے ان میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ اپنی گونا گوں خوبیوں کے ساتھ اس وصف کبیر کے بھی مالک تھے۔ راستے کی دشواریاں اور پیچیدگیاں

ان کی عظیم جدو جہد کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ انھوں نے دختران ملت کے لیے ایک عظیم تعلیمی اور تربیتی ادارے کا خواب دیکھا اور اس کو عملی جامہ پہنایا۔ بچیوں کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام فرمایا۔ آزادی کے بعد سے ہی آزاد ہندوستان میں مسلمان مختلف طرح کی آزمائشوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار رہے، مولانا نے اس کے خلاف واضح اور جرأت مندانہ مؤقف اختیار کیا اور اس پر قائم رہے۔ 6/دسمبر 1992ء میں بابری مسجد کی شہادت اور 9/نومبر 2019ء میں کورٹ کے فیصلہ کی درمیانی مدت میں امت کی قیادت نے اپنے موقف کو کافی تبدیل کیا لیکن مولانا علیہ الرحمۃ ہمیشہ اس موقف پر قائم رہے کہ بابری مسجد مسجد تھی، مسجد ہے اور مسجد رہے گی۔ مولانا کا نقطۂ نظر اربابِ اقتدار کو کھٹکا اور مولانا پر کافی دباؤ بنانے کی کوشش کی گئی لیکن مولانا اپنے موقف سے ذرہ بھر بھی پیچھے نہ ہٹے۔

جن کے ارادے ہوں اٹل اور یقین ہو غیر متزلزل
وہ بحر بیکراں میں طوفانوں سے گھبرایا نہیں کرتے

جہدِ مسلسل کی کھلی تعبیر

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اِسلام نام ہے جہدِ مسلسل کا اور اسی راستے میں اپنی زندگی کھپا دینے کا۔ ارشاد باری ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

(العنکبوت:۶۹)

''جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔''

اِسلامی تاریخ ایسے جیالوں سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی تعارف، نشر اور غلبۂ اِسلام میں لگادی۔ کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کبھی اپنے آرام وسکون کی پرواہ نہ کی۔ مولانا علیہ الرحمۃ اِسلامی تاریخ کے ان جیالوں میں سے ایک تھے۔ آپ کی زندگی ایسے ہی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ مالکِ حقیقی نے حق کی جو شاہراہ آپ کے سامنے منکشف کی آپ شرح صدر کے ساتھ اس پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ کبھی رکے اور نہ ٹھہرے، کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ متوکل علی اللہ دنیا سے بے فکر ہو کر اپنے مشن کو انجام دیا۔ آپ کے روز وشب ''میری ہر منزل

نشانِ راہ ہے منزل نہیں'' کی کھلی تعبیر تھے۔

''یقین محکم'' کا مظہر

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

''یقین محکم'' خالق و ربِ کائنات پر ایمان کامل اور انتہائی توکل کی ایک تعبیر ہے۔قرآن واحادیث میں اللہ پر کامل ایمان اور ذاتِ باری پر انتہائی توکل کی تعلیم دی گئی ہے۔ارشاد باری ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (النساء:۱۳۶)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔''

نیز فرمایا: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (الطلاق:۳)

''جو اللہ پر بھروسہ کرے گا اس کے لیے وہ کافی ہے۔''

مومن درحقیقت اسی ایمان کامل اور توکل جامع کا نمونہ ہوتا ہے۔اس وصف کے بغیر راہِ حق میں دو قدم چلنا بھی دشوار ہے۔مولانا علیہ الرحمۃ اس یقین محکم کا چلتا پھرتا مظہر تھے۔آپ ہندوستان کے نامساعد اور دشوار گزار حالات میں بھی جبکہ امت کی قیادت کا ایک بڑا طبقہ بے یقینی کی کیفیت سے دو چار ہے، یقین محکم کی ایک تشریح تھے۔امید اور یقین کا ایک سمندر تھے۔

علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی مکمل تصدیق تھے:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

ایک بہترین معلّم اور مدرّس

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

علم کی فضیلت واہمیت تمام ادیان اور ہر انسانی معاشرے میں پائی جاتی ہے لیکن اسلام نے اس فضیلت و

عظمت کو جس انداز سے بیان فرمایا ہے اور جس طرح سے اس کی ترغیب اور تاکید فرمائی ہے وہ بے نظیر ہے۔کلامِ الٰہی کی پہلی وحی کا آغاز ہی ''اِقْرَاْ'' سے ہے۔نیز ارشادِ باری ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر:۹)

''کیا اصحابِ علم اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔''

ابوامامۃ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''علم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ادنیٰ آدمی پر۔''

نیز آپ نے ارشاد فرمایا:

''یقیناً اللہ، اس کے ملائکہ، آسمانوں اور زمین کی مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹی جو اپنے بل میں ہیں اور مچھلیاں عامۃ الناس کو علم خیر سکھانے والوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک فقیہ (فی الدین) شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ گراں ہے۔''

مولانا علیہ الرحمۃ اسی علم کے امین اور معلم تھے، انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس میں گزارا، خاص طور سے اس صنف نازک کی تعلیم و تربیت میں جو آنے والی نسل کی اصل معلم، مربی و معمار ہوتی ہے۔جس کی گود میں اصحابِ علم و کمال پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا علیہ الرحمۃ کا علم سے تعلق پیشہ وارانہ نہیں تھا بلکہ وہ فنافی العلم تھے۔علم کے دریا میں غوطہ زن ہونا ان کا مزاج تھا۔تفسیر و حدیث، زبان و ادب اور فقہ و فلسفہ میں ان کی دسترس غیر معمولی تھی۔علم کے تئیں ان کا یہ مزاج اور ولولہ ان کی بہت سی طالبات کو بھی حاصل ہوا۔ان شاء اللہ علم و عمل سے مسلح یہ طالبات مولانا کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی۔

مولانا کے عظیم علمی شغف اور تدریسی صفت کے اظہار کے لیے یہ شعر بہت مناسب ہوگا:

تم نے سنوارا گل کو شگوفوں کو خار کو
تم نے حیات بخشی ہے فصلِ بہار کو

ایک عظیم مربی

تربیت فرد کی سانس اور قوم کی حیات ہے۔اچھی تربیت عام انسان کو بلند اور مطلوب انسان بناتی ہے۔

تربیت کا تعلق مربی کے اپنے کردار و سیرت سے بہت گہرا ہے۔ وہ لوگ تربیت کے اہل نہیں ہو سکتے جن کا مطمحِ نظـــر دنیا اور اس کی رنگینیاں ہیں، اس مقدس راستے کے سوار تو وہی ہو سکتے ہیں جنھوں نے رضائے رَب اور فلاحِ آخرت کو اپنی زندگی کا توشہ بنایا ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے اس آخر الذکر راستے کو ہی اختیار کیا۔ مولانا نے اپنے پورے میدان کار میں، چاہے وہ آپ کا گھر ہو، آپ کا خاندان ہو یا آپ کے تلامذہ اور طالبات ہوں بہترین مثالی تربیت فرمائی۔ آپ کی تربیت کا یہ پہلو بہت ابھرا ہوا ہے کہ آپ نے ان کے اندر فنا فی اللہ کا جذبہ اور حصولِ آخرت کی تڑپ پیدا کر دی، دنیا اور اس کی رنگینیوں سے ان کو متنفر کر دیا، ان کے اندر اُمّتِ اِسلامیہ عالمیہ کے جسد واحد ہونے کے تصور کو پروان چڑھایا اور اس کی آبیاری کی۔ مظلومین، مستضعفین اور مستحقین کی ہر طرح سے مدد کرنے اور ان کی خاطر قربانی دینے کے جذبے کو پروان چڑھایا اور ہمت افزائی کی۔

الغرض مولانا نہ صرف ایک مربی تھے بلکہ ایک عظیم مربی، ایک مثالی مربی تھے۔

اُمّت کی فلاح اور بہتری کی تڑپ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مولانا علیہ الرحمۃ امت کو دینی، اخلاقی، علمی اور سیاسی اعتبار سے مقام بلند پر، اغیار کے مقابلے میں سرخرو اور دن بدن پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ امت کے ہر فرد کو متاعِ بیش بہا اور اس کے مقدر کا ستارہ سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ اُمّت خوابِ غفلت سے بیدار ہو، خوش فہمیوں و خوش گمانیوں کے دلدل سے باہر نکلے اور نوشتۂ دیوار کو پڑھنا اور حقیقت کی زمین پر چلنا سیکھے۔ وہ اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ اُمّت میں یہ فہم عام ہو کہ بھارت کی اس بدتر ہوتی ہوئی صورتحال میں ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ اُمّتِ اِسلامیہ ہند کے تحفظ کے کیا اقدامات کرنے ہیں، اپنے شعائر اور شناخت کی حفاظت کے لیے کیا کرنا ہے۔ آپ عام طور سے اس نکتہ کو بیان فرمایا کرتے تھے:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

آپ ہمیشہ اس بات کے آرزومند رہے کہ اُمّت اپنی پوری آب و تاب اور اوصاف کے ساتھ زندہ رہے۔

سراپا رواں دواں مجسمۂ خیر

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

سچی معرفت الٰہی اور مضبوط قلبی ایمان مومن کو خیر کا پیکر بنا دیتا ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ سراپا خیر تھے، خیر ہی آپ سے صادر ہوتا اور خیر ہی فروغ پاتا۔ آپ نے ہمیشہ سب کے لیے خیر ہی کی آرزو کی، آپ کے اس جذبۂ خیر سے سب نے فائدہ اٹھایا، آپ کے اعزہ بھی محظوظ ہوئے، آپ کے متعلقین، ملنے جلنے والے اور شناسا بھی، نیز آپ کے طلبہ و طالبات بھی۔ مولانا علیہ الرحمۃ خود بھی مجسمۂ خیر تھے اور دوسروں کو بھی اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے، آپ کا یہ عکس آپ کے بچوں اور تلامذہ و طالبات میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

جرأت، بہادری اور ہمت کے پیکر، راہِ حق کے مجاہد

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جرأت، بہادری، ہمت اور حوصلہ مومن کا وصف لازم اور اس کی شان ہے۔ اس صفت کے بغیر راہِ حق پر چند قدم چلنا بھی دشوار ہے۔ ارشادِ باری ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْأَدْبَارَ (الانفال:۱۵)

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ، تو ان سے پیٹھ مت پھیرنا۔''

نیز ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (الانفال:۴۵)

''اے ایمان والو! جب تم کسی مخالف فوج سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو اور بکثرت اللہ کو یاد کرو تا کہ تمھیں کامیابی حاصل ہو۔''

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''اشجع الناس''، یعنی سب سے زیادہ بہادر کہا گیا ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ راہِ حق کے مجاہد تھے۔ جرأت، حوصلہ اور شجاعت کے پیکر تھے۔ کبھی ڈرے نہیں، کبھی اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدم رہے۔ یہ مصرعہ آپ پر پوری طرح صادق آتا ہے: ع

''رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن''

جواں سال بیٹے کی شہادت کے بعد بھی آپ دبے نہیں، جھکے نہیں، دل شکستہ نہیں ہوئے، بلکہ اپنے موقف پر

پہلے سے زیادہ مضبوطی سے قائم رہے، جری اور باحوصلہ رہے۔

''آیتِ اشتریٰ'' کے سچے مصداق

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

شعوری طور سے اِسلام میں داخل ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ نکتہ ہمیشہ مردمومن کے قلب و نگاہ اور اعضاو جوارح میں مستحضر رہے کہ میں نے اللہ رب العزت کی جنت کے عوض اپنے جان و مال اور تمام صلاحیتوں کا سودا کرلیا ہے اور اس حقیقت اور پہچان کو کبھی اپنے فکر و خیال سے ہٹنے نہ دے۔

مولانا علیہ الرحمۃ کے قلب و ذہن میں یہ خیال بسا ہوا تھا جو کبھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوا۔ مولانا باطل سے ڈرے نہ اس کے آگے جھکے بلکہ سینہ سپر رہے۔ حق کو دلائل سے ثابت کیا اور باطل سوچ اور فکر کی دھجیاں اڑائیں، اس راستے میں آنے والی ہر قربانی کو خوش آمدید کہا۔ ہمیشہ رضائے رب اور اس کی جنت آپ کا مطمحِ نظر رہی۔ مضطر خیرآبادی کا یہ شعر مولانا علیہ الرحمۃ پر پوری طرح صادق آتا ہے:

ترے کوچے میں کیوں بیٹھے فقط اس واسطے بیٹھے
کہ جب اٹھیں گے اس دنیا سے جنت لے کے اٹھیں گے

نرم دمِ گفتگو

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

قول لین مومن کی صفت بھی ہے اور مومن کا ہتھیار بھی۔ ایک داعی کے لیے تو یہ حکم ربی ہے۔

موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو حکم کے ذیل میں ارشاد باری ہے:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ:۴۴)

''اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نرم ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور جو اس کے سوا کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔'' (مسلم)

عربی کا مقولہ ہے: ''التلطف فی الحدیث یزرع المحبة فی القلوب''

''گفتگو میں نرمی دلوں میں محبت کو انڈیل دیتی ہے۔''

مولانا علیہ الرحمۃ اپنی عام زندگی میں بے انتہا نرم واقع ہوئے تھے۔ انتہائی نرمی اور لینت کے ساتھ گفتگو فرماتے، 'نرم دمِ گفتگو' کی بہترین مثال تھے۔ آپ کے اس وصف نے بہتوں کو آپ کا گرویدہ بنادیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا ایک اشارہ بہت سے تعمیری کاموں کے لیے مہمیز ثابت ہوتا۔

نفاق، چاپلوسی اور مداہنت سے کوسوں دور

نفاق سے خدا بچائے روگ یہ شدید ہے
بلائے جان آدمی، نشان بزدلی ہے یہ

زوال آدمی ہے یہ وبال آدمی ہے یہ
اگر کہوں درست ہے کہ مرگ آدمی ہے یہ

نفاق، چاپلوسی اور مداہنت انسانی سماج کے خوفناک امراض ہیں۔ اِسلام اپنے ماننے والوں کو حق گو، بے باک اور آئینہ کی طرح شفاف دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں اہلِ نفاق کا تذکرہ ان اوصاف کے ساتھ کیا گیا ہے:

① اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء:۱۴۵)

② اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (التوبۃ:۶۷)

③ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون:۱)

④ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (النساء:۱۴۲)

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کے دنیا میں دو چہرے ہوں گے، اس کے لیے قیامت کے دن آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔'' (ابوداؤد)

یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ آج امتِ مسلمہ میں یہ بیماری نہ صرف عام ہے بلکہ بہت شدید ہے اور ناسور کی شکل اختیار

کر گئی ہے۔ نہ صرف عامۃ الناس بلکہ خاصۃ الناس اور قیادۃ الناس اس میں مبتلا ہیں۔ اُمّت کی قیادت نے اپنے اس وصف کی وجہ سے امت کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اس کو لاچار، مجبور اور بے سہارا بنا کر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ نفاق کی اس بیماری سے پوری طرح پاک اور محفوظ تھے۔ جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی زبان پر تھا۔ جس کو انھوں نے قرآن وسنت سے حق اور درست سمجھا اس کا برملا اظہار کیا۔ انھوں نے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ آزمائش کے کس راستے سے گزرنا پڑے گا، اور ابتلاء کی کس بھٹّی میں تپنا پڑے گا۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے کبھی کسی عہدیدار یا صاحبِ منصب کی چاپلوسی نہیں کی۔ حق کے معاملے میں کبھی مداہنت اور سودے بازی نہیں کی۔ ہمیشہ حق گو، صاف دل اور پاکباز رہے اور اسی حال میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

صابر وشاکر

صبر وشکر زندگی کی شاہ کلید اور مومن کی معراج ہیں۔ ان چابیوں سے دنیا وآخرت کی کامیابی وسرخروئی کے وہ راستے کھلتے ہیں جو کسی اور شکل سے ممکن نہیں۔ ارشاد باری ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوریٰ: ۴۳)

''البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔''

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ

(ابراہیم: ۷)

''اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار رہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔''

مولانا علیہ الرحمۃ بڑے صابر وشاکر تھے۔ آپ کی زندگی میں بہت سی آزمائشیں اور اتار چڑھاؤ آئے، اسی اثناء میں جواں سال بیٹے کی شہادت کا واقعہ بھی رونما ہوا لیکن آپ نے اپنے مقصودِ عظیم ''حصولِ رضائے رب'' کی خاطر ان سب حادثات کو انتہائی خندہ پیشانی اور صبر وشکر کے ساتھ قبول کیا۔ آپ کی شخصیت صبر وشکر کا ایک بہترین امتزاج تھی۔ ''والصبر ضیاء'' کی تعبیر آپ کی شخصیت میں دیکھی جا سکتی تھی۔

خدمتِ خلق کا ایک بہترین اُسوہ اور نمونہ

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اِسلام میں خدمتِ خلق کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔قرآنِ مجید میں بیشتر مقامات پرحقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا تذکرہ ہے۔اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے۔ارشاد باری ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدھر:۸)

''اور وہ مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ اس وقت تک اپنے بندے کا مددگار رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے۔''(مسلم)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیوہ اور مسکین کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔یا رات میں تہجد گزار اور دن میں روزہ دار کی طرح ہے۔'' (بخاری ومسلم)

مولانا علیہ الرحمۃ کی زندگی میں خدمت کا عنصر بہت نمایاں تھا۔جو بھی آپ کے تعلق میں آتا آپ اس کے کام آتے۔لوگوں کی ضروریات کا اندازہ لگا کر ان ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش آپ کی خاص خوبی تھی۔اس معاملہ میں مولانا کی اہلیہ محترمہ اور ان کے بچوں کا بھی بڑا تعاون رہتا،جس سے مولانا کے لیے ہر کارِ خیر کو کرنا آسان ہوجاتا۔مولانا بچوں اور بچیوں کا الگ الگ مدرسہ چلاتے تھے، بچوں کے مدرسہ میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، کیونکہ اس میں دارالاقامہ نہیں تھا۔بچیوں کے مدرسہ میں کچھ فیس لی جاتی تھی کیونکہ اس میں دارالاقامہ بھی تھا،جس میں طعام کے کافی اخراجات ہوتے ہیں۔اگر کوئی والدین اس معمولی فیس کے بھی متحمل نہیں ہوتے تو مولانا فیس کی وجہ سے کسی بچی کو واپس نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا داخلہ لے لیتے تھے۔بے شمار یتیم اور بے سہارا بچے اور بچیاں آپ کی درس گاہوں سے فیضیاب ہوئے۔

منزلِ مقصود کا مکمل ادراک واستحضار

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

اِسلام اپنے ماننے والوں کو ایک ہی منزل کا راستہ بتاتا ہے اور وہ ہے''رضا اور خوشنودیٔ رب کی منزل''۔جس

نے اس منزل کا ادراک کرلیا اور اس کے راستے میں اپنے آپ کو کھپا دیا وہ سرخرو اور کامیاب ہوگیا۔ ایسے ہی بامقصد لوگوں کے تعلق سے ارشاد باری ہے:

يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۙ اِرۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ۚ فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۙ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ ○ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

''اے نفس مطمئن، تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے خوش، پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور داخل ہوجا میری بہشت میں۔''

مولانا علیہ الرحمۃ نے اس منزلِ مقصود کی تیاری کی، سامانِ سفر باندھا، نکل پڑے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس راستے کی تکالیف، دشواریاں اور رکاوٹیں آپ کا سامان لطف بن گئیں، آپ کا جذبہ پروان چڑھتا رہا، آپ کی امنگ فروزاں رہی، آپ کے قدم رواں دواں رہے، اور بالآخر اسی حال میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی ایسے افراد کار تیار کرنے کی کوشش کی جو اس مقصود زندگی کو روح حیات بنالیں اور کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔

دور بین نگاہ

کوئی چلے تمام عمر کوئی صرف دو قدم
کہاں ہے منزلوں کی حد، نظر نظر کی بات ہے

دور بین نگاہ اور فراستِ مومن عطیۂ الٰہی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اپنے مومن مقرب بندوں کو نوازتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا (الانعام: ۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟''

یہ اثر کہ ''مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے'' بہت بامعنیٰ ہے۔ یہ روشنی اللہ کے ان بندوں کو حاصل ہوتی ہے جنھوں نے پورے خلوص اور حنفیت کے ساتھ اس کے راستے میں چلنے کا عزم کیا ہے۔ ایک مرد مومن کی نگاہ نوشتۂ دیوار کو پڑھ لیتی ہے، ماوراء دیوار کو سمجھ لیتی ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ دور بیں نگاہ رکھتے تھے۔ حالات کا فہم و بصیرت غیر معمولی تھی، مستقبل کے ہندوستان کے تعلق سے آج سے تیس سال پہلے آپ نے جو پیشین گوئی کی وہ پوری ہوئی اور جو نقشہ کھینچا وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ آج ہمارا ملک اس راستے پر جا رہا ہے جس کا تصور ہر انصاف پسند اور امن پسند ہندوستانی کے لیے محال اور خوفناک ہے۔

دل آویز شخصیت

جس کی ادا ادا پہ ہو انسانیت کو ناز
مل جائے کاش ایسا بشر ڈھونڈتے ہیں ہم

قول و عمل کی مطابقت، فکر کی بلندی اور اخلاق و کردار کی عظمت ایک انسان کو دل آویز شخصیت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہر دل اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہر نگاہ اس سے فیضیاب ہونے کی متمنی ہوتی ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ مذکورہ تمام خصوصیات کے مالک تھے، کتنے ہی دل آپ سے فیضیاب ہوئے اور نہ جانے کتنے نفوس آپ کے گرویدہ ہوئے اور زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آپ نے جس دینی ادارے کو اپنے خون جگر سے سینچا اس کا ایک ایک فرد آپ کی دل آویز شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات پر بہت سے دل روئے اور بہت سی آنکھیں اشکبار ہوئیں۔ بہت سے لوگوں نے آپ کے چھوڑے ہوئے کام اور مشن کو جاری رکھنے اور پورا کرنے کا عزم مصمم کیا۔

کم سخن اور بلند سخن

ترے سخن نے کہاں سے یہ دلکشی پائی
سکوت میں بھی ترے ہم نے نغمگی پائی

دین حنیف نے اپنے ماننے والوں کو گفتگو اور کلام کے آداب سکھائے ہیں۔ فضول گفتگو کے مقابلے میں خاموشی کو پسند فرمایا ہے اور خاموشی کے مقابلے میں اعلیٰ اور بامقصد گفتگو کو سراہا ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کم سخن تھے، بہت زیادہ کلام نہیں فرماتے تھے۔ لیکن جب گفتگو فرماتے تو علم و معرفت کے موتی جھڑتے اور فکر و تدبر کا دریا رواں ہوتا۔ ملت کے مسائل پر جب گفتگو فرماتے تو مختصر لیکن انتہائی عمیق اور مدلل گفتگو فرماتے۔ آپ نے فضول گوئی اور طوالتِ سخن سے اپنے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سچے عاشق

مومن از عشق است، عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ماممکن است

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفی
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کے مضراب سے نغمۂ کار حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے پناہ عشق و محبت ایمان کا لازمی جزء ہے۔ ارشادی باری ہے:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ:۱۶۵)

''اہلِ ایمان اللہ (اور اس کے رسول) سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔''

نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میری محبت اپنے بچوں، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہوجائے۔'' (مسلم)

مولانا علیہ الرحمۃ عشق رسول اور عشق الٰہی کے دیوانہ تھے۔ آپ کے روز و شب، آپ کا سفر و حضر، آپ کی سوچ وفکر اور آپ کا طرزِ عمل اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ آپ کی تحریریں اسی سوچ کا مظہر ہیں۔ مولانا کا یہ عشق جذبۂ اطاعت و سپردگی سے بھرپور تھا۔ عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ مزاج مولانا نے اپنے تلامذہ اور طالبات میں بھی پروان چڑھایا۔ مولانا کی نگاہ میں اس عشقِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ اپنی پوری شخصیت کو اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں عظیم الٰہی مشن کی تکمیل کے لیے کھپا دیا جائے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

آفاقی سوچ

عروج آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

اِسلام اپنے ماننے والوں کی سوچ کو آفاقی اوران کے عمل کو ہمہ گیر بنانا چاہتا ہے۔قرآن کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مقصد انسانوں میں ایک عالم گیر نقطۂ نظر پیدا کرنا ہے۔جغرافیائی، نسلی یا لسانی حد بندی کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں۔اس خوبی کی مثالیں ہمیں قرآن مجید میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔یہ ہمیں اس طرح مخاطب کرتا ہے، اے انسان، اے بنی نوع انسان۔

قرآن مجید کی پہلی آیت ''الحمدللہ رب العالمین'' میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے نہ کہ مسلمانوں کا رب یا عربوں کا رب۔اسی طرح سورۃ المزمل میں مشرق اور مغرب کا رب اور سورۃ الرحمٰن میں مشرقین اور مغربین کا رب کہا گیا ہے جو کلامِ الٰہی اور اس دین کی آفاقیت کی دلیل ہے۔اسی طرح قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اِسلام کو تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک رسول کے طور پر بھیجا ہے نہ کہ صرف عربوں کے لیے۔ارشاد باری ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:۱۰۷)

حقیقت یہ ہے کہ آفاقیت قرآنی فکر کا ایک لازم وملزوم حصہ ہے جو قرآنی طریقہ اختیار کرے گا وہ عالمگیر سطح پر سوچنے لگے گا۔

مولانا علیہ الرحمۃ بھی آفاقی سوچ کے حامل تھے۔وہ جغرافیائی لسانی یا نسلی حدود کے قائل نہیں تھے۔وہ ساری انسانیت کو اللہ کا کنبہ سمجھتے تھے اور یہ نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ سب کو اپنے خالق، مالک اور پروردگار کے آگے ہی اپنے سر کو جھکانا چاہیے۔اس زمین پر قانون اور حکم صرف اس کا چلنا چاہیے جس نے اس کو بنایا ہے اور چلا رہا ہے۔مولانا ہر ظلم اور ناانصافی پر بے چین ہوجاتے تھے، چاہے وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو، ہر ظالم کے خلاف مظلوم اور مستضعف کی مدد کرنا وہ توحید کے علمبرداروں کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔اس منہج پر وہ خود بھی چلے اور اپنے تلامذہ کی تربیت بھی فرمائی۔یہی وجہ ہے کہ اس سوچ کے مثبت اثرات ان کے تربیت یافتہ افراد میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا کا مطلوب ومقصود نوجوان

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

انسانی زندگی جن تین حصوں میں منقسم ہے: بچپن، جوانی اور بڑھاپا، اس میں جوانی درمیان میں آتی ہے جو وسط اور اعتدال کی علامت ہے۔ بچپن میں شعور نہیں ہوتا اور بڑھاپے میں قوت نہیں ہوتی، جبکہ جوانی شعور اور قوت کا حسین امتزاج ہے۔ شعور اور قوت مل کر علم و عمل اور تبدیلی و انقلاب کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

ہر قوم کا سرمایہ نوجوان ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اللہ کے حکم کے مطابق دین اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو نوجوان طبقے کو اس کی طرف بلایا اور نوجوانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس پر لبیک کہا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیثِ مبارکہ میں جوانی کو بڑھاپے سے قبل غنیمت جاننے اور اہمیت دینے کا حکم فرمایا۔ قیامت کے دن جن لوگوں کو اللہ کا خصوصی سایہ حاصل ہوگا اس میں سے ایک وہ نوجوان بھی ہے جس کی نشو و نما اللہ کی عبادت اور اطاعت میں ہوئی ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ کو صالح فکر و سیرت رکھنے والے امت کے نوجوانوں سے بڑی امیدیں تھیں، آپ نوجوانوں کی تربیت بھی فرماتے اور ہمت افزائی بھی۔ بے شمار نوجوان ہیں جو آپ سے تربیت پا کر امت کا بیش قیمت اثاثہ بنے۔ اللہ کے دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ آپ کے زیرِ تربیت نوجوانوں کی خاص خوبی ہے۔ آپ نے اُمّت کی بچیوں کی بھی اعلیٰ خطوط پر تربیت فرمائی اور ان کے اندر بھی ایمان و عمل کی روشنی اور ایثار و قربانی کا جذبہ اُنڈیل دیا۔ مولانا ایک فرد نہیں ایک کارواں تھے، جنھیں اُمّت کے ساتھ اس خیر خواہی کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ایک حق گو مصنف

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

جبن، کسل، خوف، نفاق، حبِ دنیا، کتمانِ حق اور فرار من الحق کے ملغوبہ نے اُمّتِ اِسلامیہ کے افراد اور جماعتوں کو اپنے شکنجہ میں کس لیا ہے۔ ہر ظلم کو برداشت کرنے اور ہر مظلوم اور مستضعف کو بے سہارا اور بے یار و مددگار چھوڑنے کی ہر فرد اور گروہ کی اپنی تاویل ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ اس طرزِ فکر و نگاہ اور اس طرزِ عمل کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ وہ یہ بات برداشت نہیں کرتے تھے کہ افراد یا جماعتیں اپنی کوتاہ بینی، کوتاہ فکری اور کوتاہ عملی کو قرآن و حدیث کی من گھڑت تاویلات کے ذریعہ درست ٹھہرانے کی کوشش کریں۔ مولانا کی بیشتر کتابیں اسی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے انتہائی جامع اور مدلل انداز میں لکھی گئی ہیں۔ مولانا کی کتابوں کا معروضی مطالعہ بہ بانگ دہل اس بات کی گواہی دے گا۔

اب بجھا سکتی نہیں جس کو ہوائے روزگار
تو نے سینے میں لگا دی زندگی کی وہ لگن

اختتامی تأثر

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اسکی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اسکی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

مولانا علیہ الرحمۃ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ علامہ اقبال کے مطلوب ''بندۂ مولا صفات'' کے مکمل ترجمان تھے۔ ایک پختہ ایمان، مضبوطِ قوتِ ارادی اور دوررس نگاہ کے مالک تھے۔ راہِ حق میں کامیابی کا محکم یقین رکھتے تھے۔ مرددرویش بھی تھے اور روحانیت کے پیکر بھی، لذتِ دنیا سے بے نیاز بھی تھے اور منیب الی اللہ بھی۔ انسانوں کے غم خوار و غم گسار بھی تھے اور معین و مددگار بھی۔ ایک عظیم مقصد زندگی رکھتے تھے، جو آپ کے تعلق میں آتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ بے انتہا جری اور بہادر تھے۔ وقت کے فرعون ان کو کبھی ڈرا نہ سکے اور ان کے پایۂ استقامت میں کبھی لغزش نہ آئی۔ ثابت قدم رہے، رواں دواں رہے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

آغاز کسی شئ کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

تحریکِ اِسلامی کے رمز شناس اور اصولوں کے محافظ

مولانا اوصاف احمد فلاحی
ناظم ضلع تھانہ جماعتِ اِسلامی ہند (ممبئی)

مولانا مرحوم اصلاح کے ابتدائی دور کے فارغین میں سے ہیں قرآن کے چند ماہرین میں آپ کا شمار تھا۔ عربی ادب پر گہری نظر تھی جب مولانا شہباز اصلاحی صاحب جامعۃ الفلاح سے لکھنؤ چلے گئے تو آپ کو قرآن وغیرہ پڑھانے کے لیے فلاح کے لوگوں نے بلایا۔ آپ تقریباً چھ ماہ تک فلاح میں رہے۔ جب تک کہ متبادل انتظام نہ ہوگیا۔ مولانا میرے خالو تھے ہم ان کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ جب چھوٹے تھے اور ہمیں کوئی سمجھ نہیں تھی اس وقت بھی ہم خالو کا انتظار کرتے تھے اس وقت خالو بنارس مظہر العلوم میں پڑھاتے تھے۔ ہمیں انتظار اس لیے رہتا کہ خالو جب آتے تو ہم لوگوں کو چار آنہ پیسہ دیتے۔ اس وقت کے چار آنہ کی اہمیت کوئی ہم لوگوں سے پوچھے! جب عید کی تیوہاری زیادہ سے زیادہ چار آنہ یا تیس پیسے جمع ہوتی تھی اور اسی میں پورا میلہ خریدنے کے بعد بھی آٹھ دس پیسے بچ رہتے تھے، جو اَب صرف ایک کہانی معلوم ہوتی ہے تو اس چار آنے کے لیے خالو کا انتظار رہتا تھا جب دن زیادہ گزر جاتے تو نانی سے پوچھتے کہ خالو کب آئیں گے؟

ہمارے علاقے میں جامعۃ الفلاح کی وجہ سے جماعت اسلامی کے اثرات تھے۔ اس وقت اکثر فلاح سے کوئی نہ کوئی استاد خطبہ دینے آیا کرتے تھے مجھے یاد ہے جب چیف جسٹس اقبال صاحب کا انتقال ہوا تھا تو ان کے ایصال ثواب کے لیے سات دن تک رات میں مغرب بعد بندول عیدگاہ میں جلسے ہوئے تھے اور اس میں اکثر مقررین فلاح ہی سے آئے تھے۔ میں بہت چھوٹا تھا ابا کے ساتھ امرتی مٹھائی لینے کے لیے جایا کرتا تھا اس لئے کہ ایک تھیلی میں پانچ امرتی پیک کرکے ہر چھوٹے بڑے کو تقسیم کی جاتی تھی۔ ان ہی سات دنوں میں ایک

رات مولانا شہباز اصلاحی صاحب ہمارے گھر پر ٹھہرے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اطراف میں اس وقت فلاح اور جماعتِ اسلامی کا کتنا اثر تھا۔ خالو کی وجہ سے گھر میں بھی کچھ تحریکی لٹریچر موجود تھا۔ جب میں مکتب بھی نہیں جاتا تھا اس وقت بھی کھیت وغیرہ کے کاغذات جہاں رکھے جاتے تھے، اس پیٹی میں خطبات کے کچھ حصے محفوظ رکھے ہوئے تھے حقیقتِ ایمان، حقیقتِ نماز، حقیقتِ زکوٰۃ یہ نام اب بھی یاد ہیں۔

خالو کو تحریکِ اسلامی سے بہت انسیت تھی، جماعت کا کوئی بھی پروگرام ہوتا اس میں حاضر رہتے، ہم لوگ جب گاؤں کے مکتب میں پڑھتے تھے، تو اس وقت گاؤں میں جماعت کا ضلعی پروگرام تھا۔ خالو بنارس سے اس پروگرام میں شریک ہونے کے لیے آئے۔ حالانکہ اس پروگرام میں خالو کی تقریر بھی نہیں تھی۔ مگر جب خالو آ گئے تو گاؤں کے لوگوں نے اصرار کر کے تقریر کروائی اور سسرال ہونے کی وجہ سے خالو انکار بھی نہ کر سکے۔

مولانا صرف میرے خالو نہیں تھے بلکہ میرے مربی و سرپرست بھی تھے۔ گاؤں کے مکتب سے پڑھنے کے بعد میرا داخلہ گاؤں کے مڈل اسکول میں کروایا جارہا تھا۔ اس دوران خالو بنارس سے آئے ہوئے تھے، انھوں نے والد صاحب سے کہا ''میں اس کو فلاح میں پڑھاؤں گا۔'' والد صاحب نے کہا ''مرضی آپ کی۔'' خالو دوسرے دن مجھے لے کر ''جامعۃ الفلاح'' پہنچ گئے۔ وہاں خالو کو دیکھتے ہی مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم، مولانا شہباز اصلاحی مرحوم، مولانا عبدالحسیب اصلاحی مرحوم اور مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم جمع ہو گئے اور خالو سے خیریت وغیرہ دریافت کرنے کے بعد پوچھا ''کیسے آنا ہوا''؟ تو خالو نے میری طرف اشارہ کر کے جواب دیا ''اس کا داخلہ کروانا ہے''۔ مولانا شبیر صاحب نے فوراً کسی سے فارم منگوایا اور خود ہی فارم پُر کیا اور خالو کی دستخط لی اور داخلہ ہو گیا۔ پھر یہ حضرات دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایسی بہت سی بچپن کی یادیں ہیں اگر ایک ایک یادداشت لکھوں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی۔

خالو ہم لوگوں سے رخصت ہو گئے یقین نہیں آرہا ہے۔ قاضیٔ اجل نے اتنی ہی زندگی عطا کی تھی۔ آپ کی جدائی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے لیکن تقدیرِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ خالو آپ کے جانے کے بعد میرے پاس ؎

قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدہ تر کے سوا کچھ بھی نہیں
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دار اشک عنابی نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ یہ تر دید میری حکمت محکم کی ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنج آبِ دود سے معمور ہے دامن مرا

خالوان چند اصلاحیوں میں سے تھے جو فکرِ فراہی اور تحریکی فکر کے نقیب کی حیثیت سے معروف تھے۔ آپ کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی تھیں۔ فکرِ مودودیؒ کے امین تھے۔ مولانا مودودیؒ سے والہانہ عشق تھا۔ مجاہد شہید کے نام پر ٹرسٹ سے منسوب مدرسہ کا نام جامعۃ الشیخ المودودیؒ رکھا۔

خالو تحریک کے بنیادی اصولوں میں کسی طرح کی لچک اور مداہنت بالکل برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں کہیں انھیں محسوس ہوتا کہ کہیں کچھ مداہنت یا کجی یا اصل موقف میں کچھ بدلاؤ ہو رہا ہے تو فوراً اس کے خلاف کھڑے ہو جاتے اور پورے دلائل کے ساتھ اس کا خلافِ حق ہونا ثابت کرتے اور دلائل اتنے وزنی ہوتے کہ خالو کو قائل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ ہو یا افغانستان کے مجسمہ توڑنے پر مجسّموں کا مسئلہ ہو یا بابری مسجد پر مولانا وحیدالدین خان صاحب کا تین نکاتی فارمولہ ہو یا ہندوستان میں مسلم سیاست کا مسئلہ ہو، ہر ایک مسئلے پر مضبوط دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کیا۔ مثلاً اُوپر کے مذکورہ مسئلوں پر خالو کے یہ کتابچے دیکھیں۔ مساجد اللہ، مجسّموں کا مسئلہ شریعت کی روشنی میں، بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو وغیرہ۔

مَیں بھی چونکہ جماعتِ اِسلامی کا ناظم ضلع تھانہ ہوں اس لیے خاص طور سے میں خالو کے جماعتِ اِسلامی کی الیکشن پالیسی کے سخت مخالف ہونے کی بابت کچھ روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

جماعتِ اِسلامی میں الیکشن میں حصہ لینے کا مسئلہ ہمیشہ اختلافی ہی نہیں بلکہ اضطرابی رہا ہے۔ ہم لوگ جب فلاح میں زیرِ تعلیم تھے ہمارے اساتذہ کے درمیان اکثر گفتگو ہوتی اور کبھی کبھی یہ گفتگو مباحثہ کا رخ اختیار کر لیتی۔ تمام اساتذہ کسی بھی حیثیت میں حصہ لینے کے مخالف تھے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب مرحوم حمایتی ہیں، اسی لئے اس پر گفتگو مباحثہ میں تبدیل ہو جاتی لیکن چونکہ دستور میں عقیدے کی تشریح سے لے کر تمام بنیادی لٹریچر میں اسے عقیدے کے منافی اور حرام قرار دیا گیا ہے، اس لئے مولانا نظام الدین صاحب زیادہ گفتگو نہیں کر پاتے۔ میں نے جو ’’عقیدے کے منافی اور حرام‘‘ کے الفاظ لکھے ہیں یہ میرے نہیں بلکہ ابتدائی لٹریچر اور مرکزی شوریٰ میں بحثوں کے دوران جماعت کے مقتدر علماء نے لکھے اور استعمال کئے ہیں، مثلاً

مولانا صدرالدین اصلاحی علیہ الرحمہ ''فریضۂ اقامتِ دین'' میں لکھتے ہیں:

''مگر اِسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے توکسی غیر اِسلامی نظامِ زندگی سے مصالحت یامداہنت کا تصور بھی حرام ہے۔'' (صفحہ۲۰)

مولانا مودودی علیہ الرحمہ ''مسئلہ قومیت'' میں مولانا حسین مدنی علیہ الرحمہ کا جواب دیتے ہوئے "بناءالفاسد علی الفاسد" کے تحت لکھتے ہیں:

''علماءکرام مجھے معاف فرمائیں میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے...... اِسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا آج بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا۔''

اسی طرح رسائل ومسائل حصہ اول میں غیر اسلامی اسمبلیوں کی رکنیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں اور پارلیمنٹ موجودہ زمانے کے جمہوری اصولوں پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔''

مولانا ابواللیث اصلاحی علیہ الرحمہ مسئلہ انتخابات میں مشاہیر علماء کے فتوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے تمام مشاہیر علماء کے دستخطوں سے ایک متفقہ فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں متعدد شرعی دلائل کی بنا پر کونسلوں میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز اور حرام قرار دیا گیا تھا۔''

'مقالات اجتماع بھوپال' میں مولانا سید عروج احمد قادری، مولانا عبدالحئ، مولانا سید حامد علی رحمہم اللہ نے بھی لکھا ہے اس کے علاوہ مرکزی شوریٰ کی بحثوں میں بھی ان علماء کرام نے ان الفاظ کا استعمال کیا ہے ان کا حوالہ باعث طوالت ہوگا۔

یہی وہ بنیادی فکر تھی جس کی بنا پر ابتدائی دور کے ارکان الیکشنی مسئلہ کو صحیح راہ سے انحراف سمجھتے تھے۔ میرے خالو مولانا عبدالعلیم اصلاحی علیہ الرحمہ اس معاملے میں بہت حساس تھے اور کسی بھی معاملہ کو اگر بنیادی فکر سے ذرا بھی ہٹا ہوا محسوس کرتے تو فوراً اس کے خلاف آواز بلند کرتے۔ مجھے یاد ہے جماعت پر پابندی کے بعد غالباً ۱۹۸۵ء میں جماعت نے جمہوری فورم کی بنا ڈالی تھی جس کا نام بعد میں 'فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل ایمیونٹی' رکھا گیا۔ مولانا نے اس کے خلاف ایک تحریر تیار کی اور اجتماع ارکان حیدرآباد ۱۹۸۸ء کے وقت مولانا نے اس تحریر پر ارکان علماء کرام سے دستخط لی تھی۔ یوپی اور مدھیہ پردیش کے ارکان ایک دن پہلے آ گئے تھے اور چھتہ بازار کے

آفس کے سامنے ایک ہوٹل میں رکے تھے۔ خالو مجھ کو ساتھ لے کر وہاں گئے اور کچھ لوگوں سے اس تحریر پر دستخط لی۔ اس میں سے کچھ نام جو مجھے یاد رہ گئے ہیں ان میں مولانا خلیل رحمانی صاحب ضلع بستی یوپی، مولانا اشفاق صاحب، محمد محسن صاحب بھوپال مدھیہ پردیش، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب، مولانا طاہر مدنی صاحب، مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب، مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب اور کچھ گفتگو کے بعد مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب وغیرہ کی دستخط لی تھی۔ دوسرے دن ارکان کا اجتماع شروع ہوگیا تو تحریر ساتھ لے گئے میں اس وقت رکن نہیں تھا، اس لیے ساتھ نہیں جا سکا۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کے تحت الیکشن میں کسی لحاظ سے بھی حصہ لینا جماعت میں نہایت اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ''زندگی نو'' میں تین مضامین الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں اس مسئلہ کی وکالت کرتے ہوئے شائع ہوئے۔ خالو نے ان مضامین کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ایک کتابچہ ''سیکولر جمہوری نظام، انتخابات اور اِسلام'' کے نام سے شائع کیا۔

اس کتابچہ میں اپریل ۱۹۹۸ء میں پروفیسر عمر حیات خاں غوری کے شائع مضمون کا جائزہ ''انقلاب امامت کا طریقہ کیا ہو'' کے نام سے لیا ہے۔ جون ۱۹۹۸ء میں پروفیسر عبدالحق انصاری کے شائع مضمون کا جائزہ ''بنیادی فکر اور عقیدہ توحید کے خلاف عمل'' کے نام سے اور جولائی ۱۹۹۸ء میں مولانا ریاض خان کے شائع مضمون کا جائزہ ''تحریک اسلامی کا مرکزی نکتہ کیا ہے'' کے نام سے لیا ہے۔ مولانا نے اس کتابچہ میں تینوں مضامین کا قرآن وسنت کی روشنی میں ایسا جائزہ لیا ہے کہ وہ تینوں مضامین دلائل سے خالی اور بے وزن محسوس ہوتے ہیں۔ ان تینوں حضرات میں سے کسی نے بھی خالو کا جواب دینے کی ہمت نہ کی۔ اور نہ جماعت میں سے کوئی ان دلائل کا ابھی تک رد کر سکا ہے۔ تینوں مضامین کے اقتباسات اس تحریر میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے لیکن ایک ایک دو دو جملے میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب کے مضمون کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انقلاب لانے کے چند ہی طریقے ہیں:

① ۔ زیر زمین سازشیں۔ ② ۔ لاقانونیت۔

③ ۔ مسلح بغاوت۔ ④ ۔ جمہوری دستوری طریقے۔

ان چار طریقوں میں سے تین تو تحریک اپنے آغاز ہی سے مسترد کر چکی ہے۔ چوتھی کو اس لیے نہیں اپنا سکتی کہ اس سے عقیدۂ توحید پر ضرب پڑتی ہے پھر آخر وہ کون سا طریقہ ہوگا جس کے ذریعے انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا؟!''

خالو غوری صاحب کے اس اقتباس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''غوری صاحب نے گویا انقلاب

امامت کو جمہوری اور دستوری طریقے کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح محصور کر دیا ہے ان کے خیال میں اس طریقہ کو چھوڑنے کے بعد دوسرا کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ موصوف اگر یہ کہتے کہ جمہوری طریقہ بھی ایک طریقہ ہے تو بات آسان ہوتی ...... ایسا معلوم ہوتا ہے غوری صاحب نے اپنی اس بات پر غور کیے بغیر رواروی میں قلم چلا دیا کیونکہ اس بات کے کہنے کا مطلب سابق میں انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین کے اختیار کردہ طریقوں کی نفی ہے یا ان کو منسوخ قرار دینے کا دعویٰ ہے......شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بذات خود الیکشن غلط اور حرام نہیں ہے بلکہ اس کو حرام بنانے والی بات یہ ہے کہ ایک آدمی ووٹ دے کر کسی کو کتاب وسنت سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کا حق دیتا ہے اور...... جبکہ ہمارے عقیدہ میں یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے۔'' (دستور جماعت اسلامی)

خالو نے اس مضمون کا ۳۵ صفحات میں جواب دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق انصاری علیہ الرحمہ کے مضمون کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقامتِ دین اور نظامِ اسلامی کے داعی کے بجائے مولانا مودودیؒ کو لادینی جمہوری نظام کا مؤید ثابت کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے اور مولانا پر بڑا ظلم ہے۔

اس بے انصافی کا دوسرا نمونہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب کے یہ جملے بھی ہیں:

> ''مولانا مودودیؒ کی بعض تحریروں سے یہ تأثر ملتا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کے بارے میں ہمارا جو اصولی موقف ہے اس کی روشنی میں اس نظام کے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے الیکشن میں کسی طرح کا حصہ لینا جائز نہیں خواہ اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے کتنے ہی مفادات متأثر ہوں یا کتنے ہی غیر معمولی نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہو''۔

اس کا جواب مولانا دیتے ہیں ''تأثر ملتا ہے'' کے الفاظ ذہن میں رکھئے اور مولانا مودودیؒ کے یہ صریح الفاظ پڑھئے۔

> ''دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم اور ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارہ کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔''

رسائل ومسائل اول کا یہ پورا اقتباس نقل کرتے ہیں جس کے آخر میں مولانا مودودیؒ کے یہ الفاظ ہیں:

''ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہئے جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔''

خالو مولانا ریاض احمد خان کے مضمون کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں تحریکِ اِسلامی کے دو فیصلوں کے لئے دلیل فراہم کی جائے۔

ایک موجودہ الیکشن میں اس فارمولہ کے ساتھ شریک ہونا کہ سیکولر گروپوں کو ووٹ دیا جائے اور عام ہندوستانی باشندوں کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستان کے لئے سیکولر جمہوریت انتہائی ضروری ہے ورنہ ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔

دوسرا فیصلہ فورم برائے جمہوریت کا قیام ہے''۔

یہ دونوں فیصلے اس بات کی بڑی علامت بن گئے ہیں کہ تحریکِ اِسلامی ہندوستان میں اپنے محور سے ہٹ چکی ہے اور کتاب وسنت اور خود اپنے دستور سے انحراف کر رہی ہے۔ ریاض احمد صاحب کا مضمون دراصل اسی تاثر کو ختم کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے کئی لوگوں نے نت نئی دور دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی کوڑی اور کوئی گوٹی جمتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ ایک ہی بات کو ثابت کرنے کے لیے لکھنے والے ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں...... ہمارے بعض انتہائی مخلص حضرات نے سیکولر جمہوریت کی اصلیت اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے نئے انداز سے بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے، انھیں میں برادر محترم ریاض احمد صاحب ہیں۔ ریاض احمد صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اور دعوت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کو یوں واضح کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ...(النحل:۳۶)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا ہے اور اس کے ذریعے سب کو خبردار کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو......''

اور کئی آیات کا ذکر کرنے کے بعد ریاض صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن کے درج بالا احکام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا پسندیدہ دین اسلام عملاً اس دنیا میں نافذ و

جاری ہو... اعتقاداًاوراصولاً اللہ کی عبادت واطاعت کا اقراراورطاغوت کی عبادت واطاعت سے انکار تو ہر وقت ہر جگہ اور ہر حالت میں ممکن ہے لیکن عملی دنیا میں طاغوت کی اطاعت سے مکمل آزادی اورنجات، اقامت دین اور غلبۂ دین کے بغیر ممکن نہیں.....سرزمین دعوت پر کوئی نہ کوئی باطل یا غیراسلام کا غلبہ ہوتا ہےاور داعی کوغلبۂ دین کی جدوجہد کا آغاز نظام باطل کے غلبہ کے تحت اوراس کی دی ہوئی رعایتوں اورسہولتوں میں رہ کرہی کرنا پڑتا ہے۔لیکن حق کے مقابلے میں باطل کی ہزاروں شکلیں صرف ممکن نہیں بلکہ عملاً یا بالفعل دنیامیں پائی بھی جاتی ہیں۔نظری اوراصولی حیثیت سے باطل کی یہ تمام قسمیں داعی کی نظر میں طاغوت اور باطل کے حکم میں داخل وشامل ہیں، ان سب کو مٹانا اوران کی جگہ پر دین اسلام کا قیام ہی اس دنیامیں داعی کا مقصداورنصب العین ہے اس پوری عبارت پرغور کیجئے۔''

اس اقتباس پرخالو لکھتے ہیں: ''پہلی آیت ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا'' میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم فرمائے ہیں۔

اول: یہ کہ اللہ کی عبادت کرواور..... **دوسرا حکم** ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرو۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ حکم ایک ہی ہے جسے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ طاغوت سے اجتناب عبادت الٰہی کا ایک جزء ہے۔جیسے کلمۂ توحید منفی اور مثبت دو باتوں سے مکمل ہوتا ہےاور لا الہ الا اللہ میں سے کسی ایک جزء کا بھی انکار کرنے والا توحید پرست نہیں کہا جائے گا۔

اسی طرح عبادتِ الٰہی اوراجتناب طاغوت میں سے کسی ایک جزءکوبھی نظر انداز کرنے والا شخص فرمانِ الٰہی کا ماننے والا اورانبیائی دعوت کا علمبردار نہیں کہا جاسکتا۔کوئی فرد یا گروہ عبادتِ الٰہی کا دعویٰ کرے اور ساتھ ہی طاغوت سے وابستہ ہواور نظامِ طاغوت کا حامی، مؤیداورشریک ہوتواس کی عبادت میں نقص ہوگا اوراسے خالص نہیں کہا جاسکے گا بلکہ دودو چار کی طرح یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے انبیائی مشن اور مقصد کے بنیادی اورمرکزی نکتہ سے اپنی نظر ہٹالی ہے۔طاغوت کیا ہےاور کیا نہیں اس میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس امر میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ کا ایک اہم حکم ہےاورانبیائی دعوت کا ایک جزء نہیں بلکہ نصف جزء ہے حکمتِ عملی اور طریقۂ کار کا حصہ نہیں ہے کہ کوئی کہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنے کے بجائے حکمت عملی کے تحت طاغوت سے وابستہ ہونا خاص حالات کے پیش نظر ضروری ہے۔طاغوت سے اجتناب کا حکم قرآن یعنی دلیل قطعی سے ثابت ہے۔اس لئے اس کا تعلق حکمتِ عملی سے نہیں عقیدہ سے ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ خالو نے کتنی قطعیت اور مدلل انداز میں ان کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ان حضرات کے دلائل کو رد کیا ہے۔یہ کتاب بھی ان اسباب میں سے ہے جس کی وجہ سے خالو کا جماعت سے اخراج ہوا۔جو

کچھ تفصیل مجھے معلوم ہے اس کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھ رہا ہوں۔ یہ کتابچہ ''سیکولر جمہوری نظام، انتخابات اور اسلام'' خالو تحریر کر رہے تھے۔ غالباً اکتوبر کے اوائل میں میں بھیونڈی سے حیدرآباد آیا تھا۔ خالو نے کمپیوٹر والے کو ڈی ٹی پی کرنے کے لیے دیا تھا مجھے ساتھ لے کر روزانہ تین بجے اس کے پاس جاتے جو کچھ وہ کمپیوٹر پر لکھ لیا ہوتا اس کی کاپی لیتے۔ گھر لاکر پروف ریڈنگ کرتے اور دوسرے دن اس کو دے کر تصحیح کراتے اور پروف ریڈنگ کی نئی کاپی ساتھ لاتے۔ خالو چاہ رہے تھے کہ یہ کتاب جلدی تیار ہو جائے تاکہ اس کو شائع کرا کر ممبرا کے تین صوبوں کے اجتماع کے موقع پر منظرِ عام پر لایا جائے۔ یہ اجتماع ۱۹۹۸ء میں اکتوبر کے آخر میں ہونے والا تھا...... لیکن کتاب تیار نہیں ہوسکی۔ اتفاق سے اجتماع گاہ کے وقت پر تیار نہ ہونے کی وجہ سے وہ اجتماع نومبر کے وسط تک مؤخر ہو گیا۔ لہٰذا خالو کو مزید وقت مل گیا۔ مسودہ کسی طرح تیار کرا کے اجتماع سے تین دن پہلے بمبئی آگئے اور کسی سے کہا کہ کم سے کم دو سو کاپی اجتماع سے ایک دن پہلے مل جائے، باقی کاپیاں بعد میں بھی ملیں گی تو کوئی بات نہیں۔ بہر حال اجتماع کے دوسرے دن دوپہر تک دو سو کاپیاں آگئیں۔ ڈیڑھ سو کاپی ایک بک اسٹال پر رکھیں اور پچاس کاپی اپنے پاس رکھیں تاکہ مرکزی ذمہ داروں اور دوسرے مخصوص لوگوں میں تقسیم کریں۔ بعد میں مجھے خالو نے بتایا کہ اجتماع کے کچھ دنوں کے بعد مرکز سے اس کتاب پر استفسار آیا اور کچھ دنوں کے بعد مرکز کے ذمہ داران ملاقات کے لیے آئے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ تحریک تحفظ شعائر اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے تین ارکان جماعت کو اپنا فکری سرپرست بنایا مولانا عطاء الرحمن وجدی صاحب، مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اور مولانا طاہر مدنی صاحب۔ ان لوگوں سے مرکز نے وضاحت طلب کی اور ان لوگوں سے کہا گیا کہ آپ لوگ اس سرپرستی سے استعفیٰ دے کر علاحدہ ہو جائیں۔ خالو نے مجھے بتایا کہ میں نے ذمہ داران سے کہا یہ کوئی اس سے قانونی وابستگی تو ہے نہیں۔ میں کس چیز سے استعفیٰ دوں، اس کے بعد مولانا جلال الدین عمری صاحب کی خالو سے گفتگو ہوتی رہی لیکن وہ بھی خالو کو قائل نہیں کر سکے۔ خالو نے بتایا کہ کچھ وقفے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ آپ جماعت سے استعفیٰ دیدیں تو میں نے کہا:

> ''میں خود سے جماعت سے علاحدہ نہیں ہوں گا اور اگر آپ لوگ نکالنا چاہتے ہیں تو نکال دیں لیکن میں قیامت کے دن آپ لوگوں کا دامن ضرور پکڑوں گا۔''

اس کے بعد خالو کا اخراج ہو گیا اس کے باوجود خالو کی انسیت جماعت سے بدستور برقرار رہی۔ اس کا ثبوت یہ ہے خالو اکثر چھتّہ بازار جماعت کے آفس جاتے تھے۔ میں جب حیدرآباد جاتا تو مجھ کو ساتھ لے کر چھتّہ بازار کے آفس جاتے۔ میں اس وقت تک رکن نہیں بنا تھا۔ بھیونڈی کے لوگ مجھ سے اصرار کر رہے تھے رکنیت کا فارم بھرنے کے لیے، میں نے کہا کہ میں خالو سے پوچھ لوں۔ غالباً ۲۰۰۲ء مئی یا جون میں خالو بھیونڈی آئے تو

میں نے خالو سے کہا یہاں کے لوگ رکنیت کا فارم بھرنے کے لیے ضد کر رہے ہیں۔ میرا گمان تھا خالو منع کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس خالو نے کہا تو تم نے فارم بھرا کیوں نہیں تم فارم بھر دو۔ مجھے تعجب ہوا...... پھر میں نے ان کے سامنے ہی فارم بھر دیا۔

جماعت سے خالو کے قلبی لگاؤ کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ دہلی کے دونوں اجتماع ارکان کے موقع پر حیدرآباد سے دہلی آئے اور ارکان جماعت سے مل کر جماعت کی غیر اسلامی پالیسیوں پر گفتگو کرتے رہے اور سخت تنقید کرتے رہے۔ اور یہ جو آخری اجتماع ارکان ۲۰۱۶ء میں حیدرآباد میں ہوا اس موقع پر میں اسٹیشن سے سعید آباد گیا کہ وہاں سے تیار ہو کر اجتماع گاہ آؤں گا۔ جب میں نکلنے لگا تو خالو نے مجھ سے کہا تم رکو میں بھی ساتھ چلوں گا پھر میرے ساتھ وادیٔ ہدیٰ آئے، گیٹ پر جو بچے موجود تھے انھوں نے خالو کو روک لیا۔ میں نے کہا میرے پاس کارڈ ہے، مولانا کو میرے ساتھ جانے دیں۔ ان لوگوں نے کہا بغیر کارڈ کے اجازت نہیں۔ خالو نے مجھ سے کہا تم جاؤ میں واپس جاتا ہوں۔ ابھی ہم گیٹ پر ہی تھے کہ امیر حلقہ حامد محمد خان صاحب کسی کام سے گیٹ پر آ گئے تو خالو کو اپنے ساتھ لے گئے اور مجھ سے کہا آپ اپنے کیمپ میں جایئے۔ خالو تینوں دن آتے رہے اور ارکان اور مہمانوں سے ملاقات کرتے رہے۔ یہ طویل گفتگو میں نے صرف اس لیے کی کہ میں یہ بتا سکوں کہ خالو کتنے وسیع الظرف تھے اور جماعت اور مولانا مودودی علیہ الرحمہ سے کتنا قلبی لگاؤ تھا۔ اور جماعت کے انحراف پر کس قدر متفکر تھے اور کوئی موقع نہ چھوڑتے تھے لوگوں کو جماعت کے بنیادی اور اصولی موقف سے آگاہ کرنے کا، ان کی صحیح راہ کی طرف رہنمائی کا، جماعت سے باہر رہ کر بھی جماعت کے اصحاب کی خیر خواہی کرنے کا، اسی فکر کو لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں پروان چڑھانے کے لیے جب مجاہد کی شہادت کے بعد ایک ٹرسٹ بنایا گیا اور پہاڑی شریف میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تو خالو نے اس کا نام جامعۃ الشیخ المودودیؒ رکھا۔ میں نے کہا کہ اس نام کی وجہ سے لوگ چھٹ جائیں گے اور بچے بھی کم آئیں گے تو کہا ''کیا ہوا'' اور مدرسہ کا یہی نام رکھا گیا۔

اللہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزم و حوصلہ کا کچھ حصہ ہم لوگوں کو بھی مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

اللہ جی! تمام عمرِ سفر کا ثمر عطا کرنا

ڈاکٹر مثل الرّبیٰ بنت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
معلّمہ جامعۃ البنات الاصلاحیہ، حیدرآباد

آہ ابا! میرے پیارے ابا!...... آپ باحیات ہوتے تو اچھا تھا!...... آپ ہمارے ساتھ اور کچھ وقت گزارتے تو اچھا تھا!...... آپ کا نہ ہونا ہمارا دل...... ہمارا دماغ قبول نہیں کر رہا ہے۔ آہ! ہم یتیم ہو گئے ہیں...... یہ یتیمی کا دکھ اتنا بڑا ہوگا اندازہ نہ تھا...... یہ کرب ہر کرب سے سوا ہوگا پتہ نہ تھا...... آپ چلے گئے...... ہماری دنیا ختم ہوگئی۔ کائنات ہمارے لیے تھم گئی ہے۔ اور زندگی ٹھہر سی گئی ہے۔

سب کا تقاضا ہے کہ آپ کی حیات و خدمات پر جو کتاب شائع ہو رہی ہے اس کے لیے کچھ لکھوں...... آپ کی زندگی کے روشن نقوش نمایاں کروں۔ آپ کی زندگی کے نگاہوں سے اوجھل گوشوں پر روشنی ڈالوں...... کیا لکھوں...... کیسے لکھوں؟...... کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے...... آپ کی زندگی کے اتنے پہلو...... اتنے مراحل ہیں کہ...... کونسا پہلو اجاگر کروں...... کن مراحل کا ذکر کروں......؟ زندگی اَن گنت آزمائشوں...... مصائب...... اور تکالیف سے پُر رہی ہے...... کن کن کا تذکرہ کروں......؟ زندگی کے شب و روز میں اتنے نشیب و فراز ہیں کہ کن کن کو بیان کروں......؟!! آپ زندگی بھر اپنی منزل اور نصب العین کو پانے کے لیے سفر کرتے رہے...... اس سفر کی روداد کو...... تکان کو...... صعوبت کو...... جستجو کو...... لگن کو...... دھن کو...... کیسے بیان کروں؟!! کسی پڑاؤ کو کبھی منزل نہ جانا...... اس عزم کو...... حوصلہ کو...... جرأت کو...... استقامت کو...... بیان کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں......!! آپ کی زندگی جہدِ مسلسل کی ایک طویل داستان ہے...... میں اس داستان کو رقم کرنے کی طاقت کہاں سے لاؤں......؟ ہماری ساری طاقت اور قوت آپ سے تھی ابا......! آپ صرف ہمارے پیارے باپ نہ تھے بلکہ...... آپ ہی ہمارا سائبان تھے...... آپ ہی ہمارے پشتیبان تھے...... آپ ہی ہمارا بادبان تھے......

آپ ہی ہمارے ساربان تھے......آپ ہی ہمارے پاسبان تھے......آپ ہی ہماری زمین اور آسمان تھے...... ہماری دنیا...... ہماری زندگی آپ کے بغیر ویران ہوگئی ہے......آپ کا کمرہ ''دیوان خانہ'' سونا ہوگیا ہے...... آپ کا تخت آپ کا بستر خالی پڑا دیکھ کر دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہوجاتی ہے......ہر طرف ایک خالی پن محسوس ہوتا ہے......لگتا ہے کہ اتنی وسیع وعریض دنیا میں......لوگوں کے اس بے پناہ ہجوم میں......ہم بالکل تنہا رہ گئے ہیں......اکیلے ہوگئے ہیں......جیسے اب سوچنے اور بات کرنے کو کچھ نہیں ہے......جب بھی کوئی مسئلہ ہوتا تو ہمیں اطمینان ہوتا کہ ابا حل کرلیں گے......کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال لیں گے......اور آپ اس مسئلہ کا بہترین حل نکال لیتے......ہم آپ کی موجودگی میں کتنی آسان......کتنی آرام دہ......کتنی مطمئن......اور کتنی بےفکری کی زندگی گزار رہے تھے......!!اس کا اندازہ اب ہورہا ہے......ہم آپ کی موجودگی میں ہر بوجھ اور فکر سے آزاد تھے......ہم بچپن والی زندگی گزار رہے تھے......لیکن اب لگتا ہے جیسے ہم اچانک بڑے ہوگئے ہوں......یکا یک ہم پر بڑی بھاری ذمہ داریاں آن پڑی ہوں......الجھنوں کو کیسے سلجھائیں گے......مسائل کو کیسے حل کریں گے......مشکلات سے کیسے نمٹیں گے......آپ کے ادھورے کاموں کی تکمیل کیسے کریں گے......آپ کے خوابوں کی تعبیریں کیسے ڈھونڈیں گے......آپ کے بھــروسہ اور آپ کی امیدوں پر کیسے پورا اتریں گے......؟؟ مجھے کچھ پتہ نہیں......کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ اب ہم کیا کریں گے......؟......ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی کشتی بیچ منجدھار میں پھنس گئی ہے......

ابا! ایک باپ کی اہمیت اولاد کی زندگی میں کیا ہوتی ہے ہر بچہ جانتا ہے......ہم بھی جانتے تھے۔مگر اب لگتا ہے کہ ہم کچھ نہ جانتے تھے اور کوئی اولاد نہیں جان سکتی......باپ کی اہمیت کا حقیقی اندازہ ہمیں اب ہورہا ہے...... ابا! آپ جیسے عظیم مشن کے حامل عظیم باپوں کی ضرورت اولاد کو صرف گھریلو زندگیوں میں ہی نہیں......انفرادی زندگیوں میں ہی نہیں......بلکہ اجتماعی وتحریکی زندگی کے لیے بھی درکار رہوتی ہے......ہمیں اپنی نجی زندگی سے ہٹ کر اجتماعی زندگی کے لیے بھی آپ کی ضرورت تھی۔

ابا! ہم گواہ ہیں کہ اس دنیائے فانی میں آپ ایک مسافر تھے......ابا! آپ ساری عمر رضائے الٰہی کی منزل پانے کے لیے مسافر بنے رہے......آپ جادۂ حق کے رہرو تھے......آپ نے ساری عمر دنیا میں ایک مسافر بن کر ہی گزاری...... ''کن فی الدنیا کأنک غریب او عابر سبیل'' کے سچے مصداق تھے......ہم گواہ ہیں کہ آپ کا زادِ راہ اس سفر میں ایثار......قربانی......توکل......صبر......طاعت......محبت رب ومحبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......اور تقویٰ تھا......آپ کا قطب تارہ......قرآن وسنت تھے......آپ کے رہبر ورہنما محمد مصطفیٰؐ تھے......آپ کے نشانِ راہ......صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا کردار تھا......آپ کا راستہ جہاد فی سبیل اللہ تھا

......اور آپ کی آرزو شہادت کا حصول تھی۔

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ سادگی کا پیکر تھے......آپ کی زندگی بہت سادہ تھی......آپ کی زندگی میں تعیش نام کی کوئی چیز نہیں تھی......آپ کا لباس بہت معمولی ہوتا تھا......زندگی بھر ہم نے آپ کو اجلے لباس میں دیکھا اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی اجلا لباس ہی زیب تن کیے رکھا......آپ کے ظاہر کی طرح آپ کا باطن بھی اجلا تھا......آپ کا ظاہر و باطن ایک تھا......آپ کا کھانا بہت روکھا سوکھا ہوا کرتا تھا......آپ کسی دعوت میں بھی جاتے تو اپنی روٹی جیب میں اپنے ساتھ لے جاتے......کبھی سوکھا سالن پسند نہیں کیا......تاکید کرتے تھے کہ شوربے والا سالن بنایا کرو......کہتے کہ ''روکھا سوکھا کھانے سے دل نرم رہتا ہے''......آپ کا بستر بغیر گدے کے بہت سخت ہوتا تھا......حتیٰ کہ بیماری کے زمانے میں بھی کبھی نرم کرنے نہ دیا......سخت گرمی میں بغیر پنکھا چلائے سوتے تھے......آنے جانے والے کہتے کہ اتنی گرمی ہے مولانا کے کمرے میں کولر ہونا چاہیے......لیکن ہمارا بس نہ چلتا تھا......ہمیشہ پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے......جب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے تو اکثر سعید آباد سے چھتہ بازار کا راستہ پیدل طئے کرتے تھے......مدرسہ جب گھر سے دور تھا تب بھی اکثر پیدل ہی مدرسہ کے لیے نکل جاتے تھے......کسی سواری کا انتظار نہیں کرتے تھے......جوتا چپل اس وقت تک تبدیل نہ کرتے جب تک کہ وہ پہننے کے قابل ہوتے......ہم نیا جوتا یا چپل لاتے تو بہانے کی تلاش میں رہتے کہ کس طرح پرانا جوتا چپل تبدیل کروائیں......ہمیشہ آپ نے اسی انداز سے زندگی گزاری......اور سادگی کے اسی انداز کو اپنا فخر بنائے رکھا...... ''الفقر فخری''......اور سچ ہے کہ یہ سادگی آپ پر بہت جچتی تھی......''بآب و رنگ و خال و خط، چہ حاجت روئے زیبارا''......فقر بوذرؓ کا گویا جیتا جاگتا نمونہ تھے آپ......سلف صالحین و مجاہدین کی روایات کے امین تھے آپ ......اس فقر کی روایت کو آخری دم تک برقرار رکھا......ایک دفعہ کہنے لگے کہ میرے بعد میرا کمرہ ایسے ہی رکھنا......اس میں صوفے اور قالین نہ بچھنے دینا......حقیقی معنوں میں ایک صوفی بزرگ تھے آپ......اہل تصوف جن چیزوں کو روحانیت اور تصوف کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں وہ آپ میں بطورِ عادت موجود تھیں۔ ''قلت کلام......قلت طعام......قلت منام......قلت اختلاط مع الانام......'' دنیا اور اس کی آلائشوں سے اسی طرح بچتے جیسے لوگ سانپ اور بچھو سے......

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ کا اپنے رب سے تعلق اور رشتہ بہت گہرا اور مضبوط تھا......آپ کا دل ہمیشہ مسجد میں اٹکا رہتا تھا......ہم نے سوائے بیماری کے دنوں کے ابا کو فرض نمازیں گھر میں ادا کرتے نہیں دیکھا......ہمیشہ نماز باجماعت کا اہتمام کیا کرتے......اذان کے ساتھ ہی گھر سے یا مدرسہ سے نکل جاتے......اور اس مسجد کا رخ

کرتے جہاں اول وقت میں نماز کی ادائیگی ہوتی ہے۔ بیماری کے دنوں میں بھی اذان سے پہلے وضو کر کے کرسی پر بیٹھے رہتے تھے...... بچوں سے مسجد میں جماعت کا وقت معلوم کرتے رہتے...... اندازہ لگاتے کہ جماعت اب ٹھہر گئی ہوگی تو نماز شروع کرتے......

سویرے اٹھنا اور سب کو اٹھانا یہ آپ کا روز کا معمول تھا...... مجال نہ تھی کہ فجر کے بعد کوئی سوجائے...... فجر بعد گھر آتے تو دیر تک قرآن کی تلاوت کرتے...... پھر چہل قدمی کے لیے روانہ ہوجاتے...... ہمیں مدرسہ وقت پر پہنچنے کی تاکید کرتے...... نہ کبھی خود ناغہ کرتے نہ ہمیں کرنے دیتے...... سب سے پہلے مدرسہ پہنچنے والے ابا ہوتے...... اسمبلی ہونے تک ٹہلتے رہتے...... اور دوپہر میں مدرسہ سے گھر اس وقت آتے جب یہ یقین ہوجاتا کہ تمام لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئی ہوں گی......

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے نہ صرف اپنے بیٹے بیٹیوں کی بلکہ ملت کے ہزاروں بیٹوں اور بیٹیوں کی بہترین تعلیم وتربیت فرمائی...... افراد سازی کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے...... دلوں کو تسخیر کرلینے کا فن کوئی آپ سے سیکھے...... یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں...... یہ وہی کرسکتے ہیں جو اپنے آرام کو تج کر...... اپنی نیندوں کو قربان کر کے ......ملت کے غم میں گھل کر...... اپنے خون دل سے رخ برگ گلاب نکھارنے کا عزم کرلیتے ہیں۔ اور پھر گلشن کے تحفظ کی خاطر اپنا تن من دھن وقف کردیتے ہیں۔ آپ کی ان ہی شبانہ روز محنتوں کے نتیجہ میں ایک ایسی صالح ٹیم تیار ہوگئی جو آپ کے مقصد اور نصب العین کو حرزِ جاں بنائے...... آپ کے نظریہ اور فکر سے مشام جاں معطر کیے...... قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامے...... اپنے اپنے دائرۂ کار میں...... اپنی اپنی استطاعت کے مطابق...... اپنی اپنی سکت وقوت کے بقدر...... زندگی کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہے۔ یقینا یہ طلبہ و طالبات آپ کا زندہ کارنامہ ہیں...... اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: ”فو اللّٰه لأن یهدی اللّٰه بک رجلا واحدا خیر لک من أن یکون لک حمر النعم“ ......”اللہ کی قسم! اگر اللہ تمہارے ذریعہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔“ یقینا آپ قیامت کے دن بے شمار سرخ اونٹوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوں گے۔

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ انفاق کرنے والے...... عفوودرگزر کرنے والے...... معاف کرنے والے...... غصہ کو پی جانے والے...... اور لوگوں پر احسان کرنے والے تھے...... متقین کے اس خاکہ پر آپ بالکل فٹ بیٹھتے تھے جسے اللہ رب العزت نے سورہ آل عمران کی آیت: ۱۳۴ میں کھینچا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ (سورۂ آل عمران)

ترجمہ: ''جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

لوگ کبھی آپ سے زیادتی کر جاتے ہمیں غصہ آجاتا...... مگر آپ یہ کہہ کر ہمیں ٹھنڈا کر دیتے کہ جانے دو جی...... وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی زیادتی کا احساس ہو جائے گا۔ اس طرح لوگوں کو اپنی اصلاح کا موقع دیتے...... ہم اگر کہتے...... ابا! حاسدین اپنے حسد سے اور کینہ پرور اپنی کینہ پروری سے باز نہیں آئیں گے...... کہتے کہ جانے دو...... ہمارا کیا بگاڑ لیں گے...... ہمیں کیا نقصان پہنچا لیں گے...... اگر اللہ نہ چاہے تو...... ہمیشہ اس کوشش میں ہوتے کہ بات نہ بڑھے...... جامعۃ البنات کی ۲۴ سالہ نظامت کے دوران بہت سے مخلصین کے ساتھ ساتھ کئی قسم کے لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑا...... سب کے ساتھ تحمل سے کام کرنا...... غلط رویوں کو برداشت کرنا...... تکلیف دہ باتوں کو سن کر خاموش رہنا اور ماتھے پر شکن نہ آنے دینا...... نہ کسی کا برا چاہنا...... نہ کسی کو برا کہنا...... نہ کسی تکلیف دہ بات پر اپنی تکلیف کا اظہار کرنا...... خاموشی سے ہر قسم کے زہریلے گھونٹوں کو پینا...... یقیناً یہ ظرف صرف متقین کا ہی ہوتا ہوگا!!...... اگر ہم لوگوں کی باتوں کا برا مانتے تو کہتے کہ ''اگر کوئی برائی کر رہا ہے تو وہ اس کا جوابدہ خود ہوگا...... ہم کسی کے برے عمل کے ذمہ دار نہ ہوں گے...... البتہ ہم اپنے عمل کے ضرور ذمہ دار ہوں گے......'' ہمیشہ برائی کو اچھائی کے ذریعہ رفع کرنے کی کوشش کرتے...... کہتے کہ ''اپنی ذات کو کبھی اتنا بڑا نہ سمجھو کہ اس کی خاطر لوگوں سے جھگڑتے پھرو۔''...... اگر ہم کبھی کہہ دیتے کہ ابا! فلاں صاحب آپ کے ساتھ مخلص دکھائی نہیں دیتے...... تو کہتے کہ ''جب تک کوئی ساتھ چلے گا اگرچہ کہ وہ پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے موقع کی تلاش میں ہی ہو میں اسے ساتھ لے کر چلوں گا...... اس لیے کہ یہ کام اللہ کے لیے ہے اور میں کسی کو کیسے اس کام سے روک سکتا ہوں۔'' یہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی...... ہم ہزار ہا اندیشوں...... سینکڑوں وسوسوں...... کا شکار رہتے۔ مگر ابا مطمئن انداز سے اپنے کام میں لگے رہتے...... قدموں کی رفتار کہیں سست نہ پڑ جائے...... منزل کہیں دور نہ ہو جائے...... اس خیال سے آپ کبھی کسی سے نہ الجھے...... اگر کوئی الجھنا بھی چاہتا تو اس سے الجھے بغیر دور ہٹ جاتے۔

یقیناً حضرت عثمانؓ کا پرتو تھے آپ...... اپنوں کی اذیتوں کو چپ چاپ سہہ جانے والے...... تکلیف دہ باتوں کو چپ چاپ جھیل جانے والے...... صبر و تحمل کی آخری حدوں سے بھی گزر جانے والے...... بہت سے نزاعات اور مسائل کو اپنے تحمل و برداشت سے حل کرنے والے...... بہت سی رنجشوں کو اپنی مسکراہٹ سے ختم

کرنے والے...... بہت سی رکاوٹوں کو اپنے فہم وفراست سے دور کرنے والے......اور بہت سی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو اپنی بالغ نظری سے بھانپ لینے والے......ابا! ہم گواہ ہیں آپ کے حسن ظن کے......آپ کے تحمل و برداشت کے......آپ کے صبر وضبط کے......آپ نے ہمارے سامنے ہی اپنوں کے ہاتھوں اپنے دل پر اتنے زخم کھائے ہیں کہ ہم شمار نہیں کر سکتے ......ہمیں یقین ہے کہ اللہ آپ کے دل کے ان زخموں پر اجر وثواب کے پھاہے ضرور رکھ رہا ہوگا۔

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔آپ سے ملنے والا ہر شخص آپ کے اخلاق کریمانہ کا معترف ہوتا......ساتھ کام کرنے والوں سے آپ کا رویہ مشفقانہ ہوتا......آپ مدرسہ کے ناظم تھے......لیکن کبھی کسی نے آپ کی اونچی آواز نہیں سنی...... ہمیشہ اپنے ماتحتین سے نرم لہجہ میں گفتگو کرتے...... مدرسہ کے اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے......ان کے وقار وعظمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ان کی عزت کبھی مجروح نہ ہونے دیتے...... کسی کی عزتِ نفس کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاتے......کسی سے بھی اونچی آواز سے گفتگو نہ کرتے......کبھی کسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرتے...... مدرسہ میں ہر مکتبۂ فکر کے اساتذہ ہوتے......اس کے باوجود ایک خوشگوار بھائی چارہ والا ماحول بنائے رکھتے......وقتاً فوقتاً ان سے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے......علمی،تحریکی،فکری،تحقیقی وفقہی موضوعات کو زیرِ بحث لاتے......ان میں وسیع النظری ووسیع الظرفی پیدا کرنے کی کوشش کرتے......کسی سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد ہوتی تو اسے عیاں نہ کرتے......اکثر نظر انداز کر دیتے...... یا اکیلے میں سمجھا بجھا دیتے......لوگوں کو اصلاح کا موقع دیتے......کئی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ لوگ گھر آ کر چپکے سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں......لیکن کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کرتے......

نگہ بلند ، سخن دلنواز ،جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ حق و باطل کے ہر معرکہ میں ثابت قدم رہے...... ہر حال میں شہادت حق کا فریضہ انجام دیا...... جہاد وشہادت کے علم کو بلند کیا......شعائر وشریعت کے تحفظ کی خاطر ڈٹ گئے......لادینیت، دین بیزاری اور الحاد کے ماحول میں فکر اسلامی کو پروان چڑھانے کی خاطر......اپنوں اور بیگانوں سبھی کو ناخوش اور خفا کیا......لیکن کبھی زہر ہلاہل کو قند نہ کہا......غیر اسلامی تاویلات،تعبیرات،تشریحات،نظریات کے مقابل ہمیشہ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کو پیش کیا......قرآن وسنت کو ہمیشہ دلیل ورہنما بنائے رکھا......انھی کی روشنی میں اپنی سمت سفر متعین کی......رخصت کے بجائے عزیمت......مصالحت کے بجائے مزاحمت......اور مداہنت کے

بجائے استقامت کا راستہ اختیار کیا...... جواز...... گنجائش...... بہانہ بازی......عذر...... ہر بیڑی سے اپنے کو آزاد رکھا......کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ لوگ سمجھتے کہ مولانا اب کی بار نہیں بچیں گے......''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' تحریر کیا ......لوگ سمجھے کہ مولانا نے اپنے آپ کو''تباہی'' کے گڑھے میں ڈال لیا ہے......مولانا اب زد میں آئیں گے ......حتیٰ کہ جماعت بھی اخراج کے درپہ ہوگئی...... پھر''جاہلیت کے خلاف جنگ'' لکھی......لوگ سمجھے کہ اب بس مولانا کی آزادی کے دن گنے جا چکے ہیں...... بابری مسجد کے مسئلہ پر کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ اب گرفتار کہ جب گرفتار ......جب بھی کوئی نئی کتاب لکھتے......لوگوں کے اندیشے بڑھ جاتے......تحریک تحفظ شعائر اسلام کی بنا ڈالی...... اس کی سرپرستی کی......لوگ سمجھے کہ اب کی بار بات پکی ہے...... جماعت نے ڈر کر اخراج کی کارروائی تک کر ڈالی...... بہت بار حالات بنے بگڑے...... ہر بار لوگوں نے سمجھا کہ اب بس پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے...... جب بھی تقریر کرتے......لوگوں کے دل کانپ جاتے...... کسی پروگرام میں حصہ لیتے......لوگ وسوسوں کا شکار ہو جاتے......جمہوریت، سیکولرزم، نیشنلزم اور الیکشن پر بحث چھیڑتے......لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے...... جہاد کی مخالفت کرنے والوں پر تیشہ چلاتے......لوگ چیخ اٹھتے...... بالآخر لوگ کہنے لگے کہ مولانا 'آ بیل مجھے مار' والے محاورے کے مانند آزمائشوں کو خود دعوت دیتے ہیں۔

ابا کہتے کہ ہر نبی نے یہی کیا ہے...... ہر نبی کے جاں نثاروں نے یہی کیا ہے...... یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ......شرک کے گڑھ میں...... جہاں ایک دو نہیں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوں......''لا الٰہ الا اللہ'' کی پکار لگانا...... ''آ بیل مجھے مار'' والا عمل نہیں تھا؟!......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو خانۂ کعبہ بھیج کر......''لا الٰہ الا اللہ'' کی صدا لگوانا...... یہ''آ بیل مجھے مار'' والا عمل نہیں تھا؟! فرعون......''انا ربکم الاعلٰی''کا دعویٰ کرنے والے ظالم کے دربار میں ''اللّٰہ ربنا''کا اعلان کرنا......آزمائشوں کو دعوت دینے کے علاوہ اور کیا تھا؟!......نمرود......خدائی کا دعویٰ کرنے والے...... کے شہر میں......سب سے بڑے بت کدے میں...... بتوں کو توڑنے کی جرأت کرنا ......شرک اور مشرکین سے علی الاعلان...... إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ کہہ کر بیزاری کا اظہار کرنا......آزمائشوں کو دعوت دینا نہیں تھا؟!......تاریخ بھری پڑی ہے ان اولوالعزم انبیاء وصلحاء کے کارناموں سے......جنھوں نے طاغوت وقت کو للکارا ہے......غیر اللہ کی خدائی کا انکار......اور اللہ کی کبریائی کا اعلان کیا ہے......وقت کے تمام طاغوتی نظاموں کو دھتکارا ہے......اور سخت آزمائشوں اور مصائب کا شکار ہوئے ہیں......آج کا طاغوت ماضی کے طواغیت سے بڑھ کر تو نہیں ہے کہ ہم اس کے ڈر سے اللہ کی کبریائی کے اعلان ......اور حق گوئی کے جرم سے باز رہیں...... کشمکش کا آغاز ہمیشہ توحید کے متوالوں کی طرف سے ہوا ہے......اس لیے ابا اس شعر کو ہمیشہ یوں پڑھتے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
شرارِ بولہبی سے چراغِ مصطفوی

اسی ایمان راسخ اور ایقان کامل کی وجہ سے کسی بھی آزمائش کا تھپیڑا کبھی آپ کی کشتیٔ حیات کا رخ جادۂ حق سے نہ پھیر سکا..... خطرات کا کوئی تلاطم آپ کو ساحل مراد سے دور نہ کر سکا۔ ڈر اور خوف کا کوئی بھنور آپ کے مقصد کی نیا ڈبو نہ سکا ...... واہموں کا کوئی منجدھار آپ کے جذبوں کی موجوں کی روانی کو روک نہ سکا ...... مصائب کا کوئی طوفان آپ کے عزم وحوصلہ کے بادبانوں کو شکستہ نہ کر سکا...... رنج وغم کی کوئی لہر...... آپ کے مضبوط موقف کو ڈانواڈول نہ کر سکی...... کوئی بادِ مخالف آپ کی عقابی اڑان کی بلندی میں حائل نہ ہو سکی...... یاس وحرمان کی کوئی بجلی آپ کے خرمن آس کو جلا نہ سکی...... آفات وبلاؤں کی کوئی آندھی آپ کے امیدوں کے دیے بجھا نہ سکی...... کفر والحاد کی کوئی تیرہ وتار گھٹا آپ کے افکار کی کرنوں کو چھپا نہ سکی...... ظلم وستم کی کوئی سیاہ رات سپیدۂ سحر کی چاہ مٹا نہ سکی...... کوئی زنجیر گراں کبھی آپ کے سچے جذبوں کو جکڑ نہ سکی...... ہر ستمگر کے تیروں کے سامنے جگر آزمانے کو ہمیشہ تیار رہتے...... ابا! آپ کی یہ استقامت ...... یہ ثابت قدمی ...... ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے...... اور ''دم نہ لیں گے کہیں تکمیل سفر ہونے تک''......ان شاء اللہ!

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے ہماری پرورش اور تربیت میں اپنا حق ادا کر دیا...... آپ اپنی جماعتی وتحریکی...... تعلیمی وتدریسی...... تصنیفی وتحقیقی...... سرگرمیوں کے باوجود کبھی ہم سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوئے...... ہر بیٹی بیٹے کی خبر ہوتی آپ کو...... کس نے کھانا کھایا اور کون بھوکا سو گیا...... کس نے پڑھائی کی...... کس نے تلاوت کی...... کس کا وقت کیسے گزرا......؟ ہماری ضروریات کی فکر کرتے...... نہ صرف ہمارا بھرپور خیال رکھا زندگی بھر ...... بلکہ ہمارے بچوں کی خبر بھی رکھتے...... ان کے متعلق بھی فکرمند ہوتے...... غانم کی بے حد فکر تھی...... وہ بھی اسکول وکالج سے سیدھا نانی کے گھر ہی آتا تھا...... دن میں کئی چکر لگاتا تھا...... اسے دن میں دو چار مرتبہ نہیں دیکھتے تو فکرمند ہو جاتے کہ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہے...... کبھی بچوں کو ڈانٹتے نہیں تھے...... ہم اگر شکایت کرتے کہ ابا! بچے ٹھیک سے پڑھائی نہیں کر رہے ہیں...... ہماری شکایت پر کبھی دھیان نہ دیتے...... ہنس کر ٹال دیتے ...... کہتے کہ اب سے اچھا پڑھیں گے ...... معتصم سے روزانہ اس کے کاروبار کے متعلق دریافت کرتے...... آمد وخرچ کا حساب رکھتے...... اسے کاروبار کی نزاکتیں سمجھاتے...... معاملات کس طرح اونچ نیچ کا شکار ہوتے ہیں اس سے آگاہ کرتے ...... حلال وحرام کی تمیز سکھاتے...... مشورے دیتے...... اسے بھی کوئی معاملہ پیش آتا وہ ابا سے مشورہ لیتا...... اس کے معاملات کی نگرانی کرتے...... غرض ہر طرح سے اس کی رہنمائی

کرتے ......اسے یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ تنہا ہے......ہم میں سے کوئی بھی بیمار پڑتا......اس کے صحت مند ہونے تک بے چین رہتے ......ہم نے اکثر دیکھا......سنا......اور...... پڑھا ہے کہ بڑے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو وقت دے سکیں......لیکن آپ اپنا بہت سارا وقت ہمارے ساتھ گزارتے...... آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ اپنے کاموں میں لگائے رکھتے......کچھ لکھنا ہوتا تو ہم میں سے کسی کو املا کراتے......کسی کتاب کا ترجمہ کرنا ہے تو ہم میں سے کسی نہ کسی کو ضرور ساتھ لیتے...... مدرسہ میں ہم آپ کے ساتھ ہوتے...... مجاہد معتصم جب چھوٹے تھے......مجاہد کا تو چھٹی کا سارا دن ابا کے ساتھ گزرتا......کہیں بھی جاتے......کسی اجتماع میں ......کسی سے ملاقات کے لیے......مجاہد کو ساتھ ضرور لے جاتے...... ہر رات ...... رات کے کھانے کے وقت...... یا سونے سے پہلے ہمیشہ ہماری محفل آپ کے اور امی کے ساتھ جمتی تھی......جس میں ہر قسم کی باتیں ہوتیں...... جماعتی سرگرمیوں کی داستانیں ہوتیں......خاندانی باتیں ہوتیں......کسی سفر سے......کسی اجتماع سے واپس آتے تو ہم اس محفل میں آپ کی روداد سننے کے مشتاق ہوتے......اپنے سفر کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہمیں بتاتے......لیکن امانت والی باتوں کا تذکرہ نہ کرتے......اگر کوئی بات بعد میں ہمیں پتہ چلتی تو ہم کہتے کہ ابا! آپ نے تو اس موقع پر ہمیں یہ بات بتائی ہی نہیں تھی تو کہتے کہ بتانا مناسب نہیں تھا...... بات امانت تھی......اس لیے میں نے نہیں بتائی......

ہماری محفلیں کبھی خوشگوار ہوتیں......تو کبھی سوگوار......تو کبھی زعفران زار......آپ ہنستے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہنستے تھے......آپ جب اداس ہوتے تو ہم بھی اداس ہوجاتے تھے......کبھی آپ کو کوئی پرانی یاد رلا دیتی تو ہم بھی آپ کے ساتھ رو لیتے تھے......کبھی ہماری محفل کا رنگ ادبی ہوجاتا تو ہم بھی ادبی نکتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے......کبھی محفل کا رنگ شاعرانہ ہوجاتا تو اچھے اشعار سنتے......کبھی محفل کا رنگ مزاحیہ ہوجاتا تو ہر ایک کے بچپن کے قصے دہرائے جاتے......انھیں محفلوں کے ذریعے ہم آپ کی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ سے واقف ہوئے......آپ کے تجربات و مشاہدات سے مستفید ہوئے......انھیں محفلوں کے ذریعہ ہمیں اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات معلوم ہوئے......انھیں محفلوں میں ہم نے اپنے اسلاف کے کارنامے یاد کیے......انھیں محفلوں میں ہم اپنے گاؤں والوں، رشتہ داروں، اور دوست احباب سے واقف ہوئے......آپ کبھی کسی کا نام بھول جاتے تو ہم آپ کو یاد دلاتے کہ ابا! آپ شاید منشی سہیل چچا کی بات کررہے ہیں......آپ شاید متو چچا کے متعلق پوچھ رہے ہیں ......شمیم بڑے ابا......قدیر چچا، ملو چا، قدوس چا، لڈن چا، وہاب چا، جواد بڑے ابا کا تذکرہ اکثر ہوتا......آپ کے بچپن کی بہت سی باتیں، آپ کی خالہ اور نانی کی محبتوں کے واقعات، دادا کی تربیت

کے نرالے انداز کئی کئی بار دہرائے جاچکے ہوتے پھر بھی ہمیں ان قصوں اور باتوں کو سن کر بڑا مزہ آتا تھا......آپ کے دوستوں، محسنوں، اساتذہ اور طالب علموں کو بھی اکثر آپ ان محفلوں میں یاد کرتے رہتے تھے......

مجاہد کو ہم سے بچھڑے بہت دن ہو چکے تھے......لیکن ہماری ہر محفل میں وہ موجود ہوتا تھا......اس کی باتیں ...... اس کی یادیں ...... اس کی شرارتیں ...... اس کی شوخیاں و بذلہ سنجیاں ...... اس کی کہانیاں ...... اس کی آزمائشیں ......اس کی صعوبتیں ......اس کی جرأتیں ......اس کی ہمتیں ......اس کی بیباکیاں ......اس کی حاضر جوابیاں ......اس کی تلاوتیں ......اس کے ترانے ......اس کی لڑائیاں ......سب کچھ ان محفلوں میں دہرائی جاتی تھیں ......ہم اس کی جدائی کے غم کو ان محفلوں میں انگیز کرنے کی کوشش کرتے تھے ......اپنے آنسوؤں کو پینا...... اپنے کرب کو سمیٹنا......اپنے درد کو سہنا......اپنی تکلیف کو چھپانا......انھیں محفلوں میں ہم نے آپ سے سیکھا تھا ...... کتنے رنگ تھے ہماری اس محفل کے ابا......!! جس کے رنگ آپ کے جانے سے پھیکے پڑ گئے ہیں......کتنی رونق تھی ہمارے آشیانہ میں......!! جو آپ کے نا ہونے سے ماند پڑ گئی ہے......آج یہ ساری محفل سونی ہوگئی ہے ......آپ کے نا ہونے نے ہمارے دلوں کو حسرت و یاس سے بھر دیا ہے۔

ابا! ہم ایک مضبوط خاندان تھے ......جس کے سربراہ آپ تھے ......جس خاندان کا سربراہ آپ جیسا شفقت کا پیکر ہو......محبتوں اور اخلاص کا خوگر ہو......اس کی خوش بختی اور مضبوطی کے کیا کہنے!! واقعی ہم بڑے خوش قسمت تھے!......ہم کو آپ کی گھنی چھاؤں میسر تھی......جس میں ہم تمام آفات اور مشکلات سے بچتے تھے ......تمازتوں سے سکون پاتے تھے ...... ہنستے ......کھیلتے اور چہچہاتے تھے ......آپ نے ہمیں ایک لڑی میں پروئے رکھا تھا......ہم ایک جسم اور ایک جان تھے......کسی کا کوئی مسئلہ بھی انفرادی مسئلہ نہیں ہوتا......وہ سب کا مسئلہ بن جاتا تھا...... ہمارے دکھ سکھ مشترک تھے......ہماری خوشی اور غم سانجھے تھے......آپ کی تربیت کے انداز نرالے اور انوکھے تھے......جو نقش آپ ہمارے دلوں میں بٹھانا چاہتے وہ غیر محسوس طریقہ پر ہمارے دل میں بیٹھ جاتے تھے......ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ جذبہ...... یہ جوش...... ہمارے دل میں کب پیدا ہوگیا...... آپ کے افکار و نظریات ہمارے دل میں کب پروان چڑھے......؟؟ کہ ہم نے آپ کے مشن اور نصب العین کو حرزِ جان بنالیا......حق کے راستے میں آپ کے ساتھی بن گئے ......کب ہم آپ کی تحریک کے نظریاتی کارکن بن گئے......؟ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا......ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ہم آپ کی انگلی تھام کر......آپ کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے آپ کے قدم بہ قدم چلنے لگے......کب ہم آپ کی منزل کے مسافر بن گئے......؟ جب لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہم آپ کے ساتھ چلتے......جب لوگ مایوس کرتے ہم آپ کی امید بن جاتے

......جب آزمائشیں آتیں ہم آپ کی قوت بن جاتے......جب جماعت سے آپ کی علیحدگی ہوئی......ہم آپ کی تسلی کا سامان کرتے......جب جامعہ کو آپ نے چھوڑا......ہم آپ کا حوصلہ بن گئے......ہم ہر وقت......ہر جگہ ......آپ کا سایہ بنے رہتے......

ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ ایک مثالی باپ تھے......آپ نے خوشگوار اور پرسکون ماحول ہمیں عطا کیا......آپ نے ہماری بہترین تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا...... ہماری زندگی کو بہترین بنانے کے لیے عمدہ فیصلے کیے......آپ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر ہمارے آرام وخوشی کا خیال رکھا......آپ نہ صرف ایک مثالی باپ تھے...... بلکہ آپ ہر رشتہ میں بہترین تھے......آپ ایک بہترین بھائی...... بیٹے......شوہر تھے......خالو...... پھوپھا...... ماموں......بڑے ابا......اور چچا تھے......نانا......اور دادا تھے......سارا خاندان......گاؤں......دوست احباب ......تحریکی وتدریسی حلقے......سب آپ کے جانے سے غمزدہ ہیں......اور اس بات کے گواہ......کہ آپ نے ایک بہترین زندگی گزاری......بامقصد زندگی گزاری......اور ہر رشتہ کا حق ادا کر دیا۔

ابا! ہمیں سکون ہے اس بات کا کہ آپ ہم سے زندگی بھر راضی رہے......ہم سے آخری وقت تک خوش رہے......ہمیں الوداع کہنے سے چند دن قبل آپ نے سب کا شکریہ ادا کیا......سب سے پہلے جب چچا جا رہے تھے......آپ نے کہا: اجمل!......آپ کا بے حد شکریہ! آپ نے ہماری بڑی خدمت کی...... چچا کہنے لگے: بھائی!......آپ نے جتنا کچھ ہمارے لیے کیا ہے ہم اس کا حق ادا نہیں کر سکتے......ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں......آپ کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں......آپ ہمارے لیے دعا کیجیے...... پھر دوسرے دن خالد بھیا آئے تو ان سے کہا خالد! تمہارا بہت شکریہ! تم نے ہمارا بہترین علاج کیا...... ہماری بڑی دیکھ بھال کی...... خالد بھیا کہنے لگے: ابا! میں کل نہیں آسکا تھا کیا آپ اسی بات کا شکوہ کر رہے ہیں؟ کہا: نہیں......! ہم اپنے دل سے آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں......خالد بھیا رونے لگے......کہا......ابا! میں آج جو کچھ بھی ہوں آپ کی محنت، تربیت اور دعاؤں کے نتیجے میں ہوں...... پھر معتصم سے کہنے لگے...... بیٹے! تمہارا بے حد شکریہ! تم نے ہماری بڑی خدمت کی......تم نے حق ادا کر دیا......اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے...... ہمیشہ تمہارا حامی ومددگار رہے......پھر اسی طرح وقفہ وقفہ سے کئی دن سب کا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں......اور کہا کہ میں تم سب سے راضی ہوں......خوش ہوں......اپنے انتقال سے چار دن پہلے جب عزہ، حنون اور جبرئیل کو مولوی صاحب قرآن پڑھانے آئے تو انھوں نے کہا کہ میں جتنی دیر بچوں کو قرآن پڑھاتا رہا......مولانا جبرئیل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے اور دعائیں دیتے رہے...... ہر ایک سے آپ کی محبت کا ایک خاص انداز تھا...... ہر بچہ

سمجھتا تھا کہ نانا ابو...... دادا ابو...... کی محبت کا یہ انداز صرف میرے لیے مخصوص ہے...... حتی کہ تین سالہ جبرئیل کو بھی یہ احساس تھا کہ دادا ابو مجھے زیادہ چاہتے ہیں...... مجھے تو 'جمن میاں'...... 'حاجی صاحب'...... کہہ کر بلاتے ہیں...... عزہ، حنون! تم کو تو دادا ابو صرف نام سے بلاتے ہیں۔ خوشگوار یادوں کا ایک ہجوم ہے...... خوشیوں اور مسرتوں کی ایک کہکشاں ہے...... جہد مسلسل کی ایک طویل داستان ہے...... محبتوں اور شفقتوں کا ایک سیل رواں ہے!!!

کووِڈ کے بعد ابا جب سے بیمار پڑے تھے...... مدرسہ بہت کم آنے لگے تھے...... جب ہم مدرسہ سے گھر آتے ہمیں ابا کی کیفیت دریافت کرنے کی فکر ہوتی...... اور ابا ہمارے منتظر ہوتے...... ہمارے کچھ پوچھنے سے پہلے خود ہی پوچھتے کہ...... آج مدرسہ میں کیا ہوا ہے...... کتنی حاضری تھی...... کون کون غیر حاضر تھا...... کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ...... اپنی بیماری کی کوئی فکر نہیں تھی...... اپنی طبیعت کی مسلسل خرابی کی کچھ پرواہ نہیں تھی...... اتنا اطمینان اور سکون ہوتا آپ کے چہرہ پر کہ ہمیں ڈھونڈنے پر بھی آپ کی تکلیف نظر نہیں آتی...... بار بار پوچھنا پڑتا کہ ابا! آپ کو کہیں تکلیف تو نہیں...... کبھی نہ کہا کہ ''ہاں! تکلیف ہے۔'' ابا! ہم گواہ ہیں کہ آپ ہر حال میں اللہ سے راضی رہنے والے تھے...... صحت اور بیماری...... ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے والے تھے...... ذکر کرنے والے تھے...... صبر کرنے والے تھے...... ابا! آپ کمزوری والی عمر کو پہنچ گئے تھے...... لیکن ہم گواہ ہیں کہ آپ کے ارادے...... آپ کے عزائم...... کبھی کمزور نہ پڑے...... آپ کا جسم بوڑھا ہو گیا تھا...... مگر آپ نے اپنے دل کو ہمیشہ جوان رکھا...... تجربوں کی بھٹی...... میں آپ کے بال سفید ہو گئے تھے...... مگر زمانے کی تمازتیں آپ کا چہرہ کمھلا نہ سکیں...... آپ کے چہرے پر ایمان ویقین کا نور ہر لحہ جھلملاتا رہا...... آپ کے پیر راہِ خدا میں چلتے چلتے تھک گئے تھے اور آخری عمر میں جواب دے گئے تھے...... مگر آپ نہیں تھکے تھے...... آپ دعا کرتے کہ ''اے اللہ! جب تک مجھے زندہ رکھ کم از کم بیٹھ کر کام کرنے کے قابل رکھ......'' ایک مرتبہ آپ رونے لگے اور کہنے لگے کہ ''اللہ میری دعا نہیں سن رہا ہے...... کام کرنے کا تو اب بہترین وقت آیا ہے اور اپنا حال یہ ہے کہ آج ہم کسی قابل نہیں......'' ہم نے کہا ابا! آپ نے اپنی زندگی میں بہت کام کیا ہے...... آپ نے بہت محنت کی ہے...... اب ہماری باری ہے...... آپ ہمیں کام کرتا ہوا دیکھیں...... اصلاح کریں...... اور خوش ہوں......

ابا! ہمیں احساس ہے کہ آپ اپنی نوے سالہ زندگی میں بہت تھک گئے تھے...... مگر آپ نے ایک لمحہ کے لیے بھی آرام کرنا...... دم لینا...... ستانا...... گوارا نہیں کیا...... بالآخر اللہ کو آپ پر رحم آ گیا...... پسِ افق ہی کہیں اس نے آپ کے آرام کا انتظام کر دیا...... اے اللہ! ہم آپ کے اس فیصلے سے راضی ہیں...... ہمارے ابا کا خوب خیال رکھنا...... انھیں آرام اور راحت نصیب کرنا...... مجاہد کو آپ کی خدمت پر مامور کر دینا...... تمام عمر کے

سفر کا بہترین ثمر عطا کرنا......

ہم اس جدائی کو جدائی نہیں سمجھتے ابا!......ہمیں پتہ ہے کہ اگر یہ جدائی ہے بھی، تو عارضی ہے......ہمیں پتہ ہے ......جبھی تو ہمیں اطمینان ہے......

الفراق لیس السفر	:	جدائی نہ تو سفر سے ہے
ولا فراق الحب	:	اور نہ ہی محبوب کے الگ ہونے سے ہے
حتی الموت لیس فراقا	:	یہاں تک کہ موت بھی جدائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی
سنجتمع فی الاٰخرۃ	:	عنقریب ہم سب آخرت میں جمع ہوں گے
اللّٰھم اجمعنافی جنۃ الفردوس	:	اے اللہ ہمیں جنت الفردوس میں اکٹھا کرنا۔

انشاءاللہ! ہم وہاں ضرور اکٹھے ہوں گے......وہاں بھی دوبارہ ہماری محفلیں سجیں گی......ہم اسی امید پر...... اسی کی چاہت میں...... یہاں اپنی زندگی کے باقی دن گزاریں گے......آپ جو ذمہ داریاں ہمیں سونپ گئے ہیں ......حتیٰ الوسع پوری کرنے کی کوشش کریں گے......ہم اپنا تن من دھن سب اس راہ میں لگائیں گے......اس طرح ہم آپ کی محبتوں کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں گے...... آپ کی تربیت کی لاج رکھیں گے......اور آپ کے لیے بہترین صدقۂ جاریہ بننے کی کوشش کریں گے......آپ کے جلائے ہوئے دیے کو جلائے رکھیں گے...... آپ کی چلائی ہوئی ریت کو چلائے رکھیں گے......

یہ ہمارا، آپ سے وعدہ ہے اَبّا !!

بڑے ابّا گاؤں میں

ندیم احمد فلاحی، بندی گھاٹ
تاسیسی رکن اے۔ایچ۔این۔وی۔کالج، محمد آباد، یوپی

میری پیدائش سے پہلے ہی بڑے ابا حیدرآباد میں مقیم ہو چکے تھے، گھر میں جب بھی آپ کا تذکرہ ہوتا تو سبھی لوگ آپ کا نام بڑے ادب واحترام سے لیتے تھے، جس سے بچپن ہی سے یہ احساس ہوتا تھا کہ گھر میں کوئی بڑی اور دینی شخصیت موجود ہے، گھر کے باہر گاؤں میں بھی آپ کی بہادری اور شرافت کا چرچا آپ کے ہم عمر لوگوں کی زبان پر ہوتا تھا، گاؤں کے لوگ آپ کو عام لوگوں سے ہٹ کر ایک خاص مقام دیا کرتے تھے، اور یہ جملہ بہت ہی عام تھا: ''ارے چھوڑیئے ان کی کیا بات وہ تو اللہ والے ہیں۔''

ایک بار کی بات ہے میں عربی کے ابتدائی درجہ میں تھا اور ٹوپی پہن کر گاؤں میں گھوم رہا تھا، گاؤں کے ایک بہت با اثر شخص (افتخار احمد عرف ملّو چچا مرحوم) جو کئی بار گاؤں میں پردھان بھی رہ چکے تھے، انھوں نے مجھے پاس بلایا اور پوچھا: ''ٹوپی کیوں لگائے ہو؟'' میں نے جواب دیا: ''میں مدرسہ میں پڑھتا ہوں۔'' اس پر انھوں نے کہا: ''کیا مولوی بننے کا ارادہ ہے؟'' میں نے کہا: ''ہاں''، اس پر وہ سیدھے بیٹھ گئے اور کہا کہ ''دیکھو مولوی بننا ہو تو مولوی عبدالعلیم صاحب کی طرح بننا ورنہ اس گاؤں کو مولوی وُلوی کی کوئی ضرورت نہیں ہے''، پھر انھوں نے مزید کہا کہ ''اگر میں اپنی چھت پر ہوں اور مولوی صاحب کہیں کہ ملّو تم چھت سے کود جاؤ تو میں چھت سے کود جاؤں گا، اور اپنے اندر انکار کی ہمت نہ پاؤں گا۔''

گاؤں میں جب بھی کوئی بڑا تنازعہ ہوتا تو سبھی لوگ یہ کہتے ''آج مولوی صاحب ہوتے تو یہ مسئلہ حل ہو گیا ہوتا''، گاؤں کے ایک صاحب نے بتایا کہ ایک بار گاؤں میں شادی کے موقع پر کسی گھر میں گانا بج رہا تھا، جس کی وجہ سے بڑے ابّا اس شادی میں کھانا کھانے نہیں گئے جب لوگوں کو معلوم ہوا تو لوگ بڑے ابّا کو وہاں لے گئے،

وہاں بڑے ابّا نے ایک تقریر کی، جس سے گانے کا سلسلہ شادی کے موقع پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، گاؤں کے ایک اور بااثر شخص جناب عمیر صاحب مرحوم جو ایک وکیل تھے اور بہت صاف گو آدمی تھے، وہ برابر کہا کرتے تھے کہ ''میں بہت سے عالموں اور مولویوں سے ملا ہوں، لیکن میری نگاہ میں اللہ والے صرف دو ہی لوگ ہیں: ایک مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب اور دوسرے ہمارے بھائی عبدالعلیم اصلاحی صاحب۔'' ایک بار علی گڑھ میں میری ملاقات پروفیسر راشد صاحب مرحوم (جو ہمارے گاؤں بندی گھاٹ کے ہی تھے) سے ہوئی، انھوں نے بڑے ابا کے بارے میں بتایا کہ ''مولانا بہت جنگجو فطرت کے تھے لیکن شرافت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ گاؤں میں ان کی بہت عزت ہے، اور لوگ آپ کے کہنے پر جان دینے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔'' بقول ڈاکٹر عفان صاحب (بندی گھاٹ) کے ''ایک بار کی بات ہے، گاؤں کے ایک غیر مسلم جن کا نام سونر راج بھر تھا، شدید بیمار پڑ گئے، ان کے دوا علاج کے لیے مولانا نے گاؤں میں چندہ کروایا اور ایک ایسی مثال قائم کی، جس کا اثر آج بھی گاؤں میں پایا جاتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کے ہی بقول: ''مولانا نکاح بہت کم پڑھاتے تھے، ایک بار کی بات ہے کہ آپ نے ایک نکاح پڑھایا اور اس نکاح میں آپ کو سو روپیہ ملا (اس وقت سو روپئے کی بہت قیمت تھی) مولانا نے مجھ کو بلا کر کہا: یہ سو روپیہ چپکے سے گاؤں کے فلاں آدمی کو دے دو جو بیچارے بہت غریب تھے۔''

ڈاکٹر صاحب نے ایک اور واقعہ بتایا کہ ''گاؤں کے لوگ مرے ہوئے جانور کا چمڑا فروخت کر کے اس کا پیسہ استعمال کر لیا کرتے تھے۔ مولانا نے لوگوں کو سمجھایا کہ مرے ہوئے جانور کا ہر حصہ ناپاک ہے۔ ان کے کہنے پر گاؤں کے لوگوں نے اس پرانی پرمپرا کو ختم کر دیا۔'' ایک اور واقعہ ماسٹر نوشاد صاحب (بندی گھاٹ) نے اپنے والد کے حوالے سے بتایا کہ ''ہمارا گھر بہت پرانا اور کمزور تھا، ایک رات بارش بہت ہو رہی تھی، مولانا رات بھر نہیں سوئے، بار بار آ کر خیریت لیتے رہے اور خیر و عافیت کی دعا کرتے رہے۔'' بقول لوگوں کے ایک بار گاؤں کے دو خاندان آپس میں دست و گریباں تھے، ہر وقت کسی بڑے حادثہ کا خطرہ تھا۔ مولانا دونوں طرف کے لوگوں کو ایک کھلے میدان میں لے گئے اور بھائی چارگی پر ایک بہت مؤثر تقریر کی۔ اس تقریر کے بعد سبھی لوگ رو پڑے اور اپنی پرانی دشمنی ختم کر کے آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔

بڑے ابا کے بارے میں جتنا لکھا جائے کم ہے، نہایت بہادر، نہایت سادہ، نہایت صبر کرنے والے، دوسروں کے غم میں شریک ہونے کا حال یہ تھا کہ ابھی کرونا کے دوران جب کہ آپ بستر پر تھے، ایک دن مجھے فون کر کے گاؤں کے لوگوں کے حالات کی جانکاری لی۔ خاص طور پر غریب اور کمزور لوگوں کی اور کہا کہ ''جنید

(بھائی) کی چکی پر جن غریب لوگوں کا بقایا ہے میری طرف سے اسے ادا کردو۔'' سادگی اس قدر تھی کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے بڑے بڑے مضمون بیان کیا کرتے تھے، جیسے ان کا یہ کہنا کہ ''سفر میں لوگ تکلیف اس وجہ سے اٹھاتے ہیں کیوں کہ وہ اپنا کپڑا بچانا چاہتے ہیں۔''

اور یہ کہ ''بڑے لوگوں سے کبھی اپنی حاجت کے لیے سوال نہ کرنا ان کی نگاہ میں آپ کو بڑا بنادیتا ہے۔''

اس طرح کے اقوال ان کی زندگی میں بھرے پڑے تھے۔ آج آپ ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن آپ کے کارنامے اور آپ کی شخصیت کے اثرات گاؤں کے لوگوں کے ذہن و دماغ میں بہت دنوں تک قائم رہیں گے۔ ان شاء اللہ! اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہمارے خاندان اور گاؤں کو آپ جیسا کوئی نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

میرے پیارے اَبّا...... رحمۃُ اللہ علیہ

ڈاکٹر ظل ھما
بنت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ، حیدرآباد

شام در شام جلیں گے تیری یادوں کے چراغ
نسل در نسل ترا درد نمایاں ہوگا

اس دنیا کے عارضی اور فانی ہونے کے بارے میں سنتے رہے ہیں اور بعض بعض موقعوں پر اس کا شدت سے احساس بھی ہوتا رہا ہے لیکن اب یہ احساس مستقلاً دل و دماغ پر چھا گیا ہے کہ اس دنیا میں جس نے بھی آنکھ کھولی ہے اسے بہر حال موت آنی ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر نہیں۔ عقل مند تھے وہ لوگ جنھیں اس دنیائے فانی کا حقیقی شعور تھا اور جنھوں نے اس فانی زندگی کے آرام وسکون کو ابدی واخروی زندگی کے آرام کو پانے کی خاطر تج دیا۔

ابا مرحوم کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو صرف یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو لعلِ بدخشاں سے بھی زیادہ قیمتی اور نایاب جان کر رضائے الٰہی کو کشید کرنے میں صرف کیا اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے حصہ کو بھی ضائع نہیں کیا۔ یا ربی! ابا کی اس زندگی کو جسے انھوں نے **إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ** کے مصداق آپ کو سونپ دی تھی، قبول فرمالیجیے۔

ابا سے جدائی کا سانحہ ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہے۔ جتنی محبت، توجہ، پیار اور شفقت ابا اور امی نے ہمیں دی ہے شاید بہت ہی نصیب والی اولاد کو ملتی ہوگی۔ ہم (کل پانچ بہنیں اور دو بھائی) اپنے ابا کی کل میراث تھے، آپ کی تمام دولت اور سرمایہ، ہمیں اپنی اہمیت کا اندازہ ابا کی محبت دیکھ کر ہوتا تھا۔ ابا نے ہمیں ایک قیمتی اثاثے کی طرح ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ ہماری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے۔ ہماری

دوری آپ کو بڑی شاق گزرتی تھی......اللہ نے چھ بیٹیوں کے بعد آپ کو بیٹے سے نوازا تھا لیکن دو دن بعد ہی اللہ نے اپنی یہ امانت واپس لے لی۔ آپ نے اس صدمہ کو صبر سے جھیل لیا۔ پھر جب میں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو کئی لوگ غمزدہ ہو گئے مگر آپ نے یہ کہتے ہوئے مجھے سینے سے لگا لیا کہ

"أخبروهم أن الأنبياء آباءُ بنات۔"

پھر اللہ نے ہمارے گھر مجاہد اور معتصم کی شکل میں انعامات کی بارش کر دی۔ ابا نے ہم بھائی بہنوں کی بھرپور توجہ اور محنت کے ساتھ بہترین تعلیم و تربیت فرمائی۔ میں روزِ اول سے آپ کی آخری سانس تک آپ کی آنکھوں کا تارا اور دل کا سکون بنی رہی۔ مجھے تھوڑی دیر نہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے، حتیٰ کہ آپ نے اپنی زندگی کے بچے کھچے دن بھی مجھے سونپ دیئے۔ آپ کے انتقال سے بیس دن قبل جب میں بیمار پڑی تو میرے لیے دعا کی کہ "اللہ! میری زندگی کے بچے کھچے دن میری بیٹی کو دے دیجیے"۔ اگر میں ہزار زندگیاں بھی پالوں تو اس محبت کا قرض اتار نہیں سکوں گی۔ اپنے کرچی کرچی دل کے ساتھ اس محبت کو سنبھالنا اور آپ کے سونپے گئے دنوں کی امانت کا حق ادا کرنا ہی اب میری زندگی کا مقصدِ اولیں ہے۔

آنسوؤں سے لبریز آنکھوں، بوجھل دل اور لرزتے ہاتھوں سے یہ تحریر قلمبند کرنا میرے لیے بہت صبر آزما رہا ہے۔ میرے اطراف ابا مرحوم کی مشک بو یادوں کے اتنے جگنو اڑ رہے ہیں کہ میرا قلم انھیں اپنی مٹھی میں قید کرنے سے قاصر ہے۔ دل میں آپ کی محبتوں اور خوش کن باتوں کے اتنے طائر ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں کہ اگر دریچۂ دل وا کر دوں تو اڑتے طائروں سے افق چھپ جائے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ میں ان کو الفاظ کے جال میں پھنسا سکوں۔

لوگوں سے ابا کے متعلق تحریر کا تقاضہ کرنا مشکل تھا تو اپنے آپ سے تقاضہ کرنا مشکل تر ہو گیا۔ مجھے احساس ہے کہ میں ابا کی زندگی اور اپنے احساسات و جذبات کی ایک ہلکی سی جھلک بھی پیش نہیں کر سکی ہوں حق ادا کرنا تو دور کی بات ہے۔

ابا ہمارے لیے کل کائنات تھے۔ ہماری صبح و شام ابا کو دیکھ کر ہوتی تھی، آپ ہمارے رہنما، مربی، مزکی اور معلّم تھے۔ ہمارے لیے شجر سایہ دار تھے، جن کی چھاؤں میں ہم آرام کر کے اپنی ساری تھکن اتار لیتے تھے۔ جن کے چھایہ تلے زمانے کے سارے موسموں کی سختیوں کو جھیل جاتے تھے۔ جن کی ٹہنیوں پہ ہم خوشیوں کے جھولے جھولتے تھے۔ جن کی ایک نرم نظر ہمارے لیے اطمینان و خوشی اور ہمت افزائی کا باعث ہوتی تھی اور جن کی ایک کڑی نگاہ ہمارے لیے سخت وارننگ کا درجہ رکھتی تھی۔ جن کی ایک مسکراہٹ ہمیں دنیا و مافیہا سے زیادہ

قیمتی لگتی تھی، جن کی باتیں ہمیں دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ جن کے ایک اشارہ پر ہم قربان ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ جن کی خدمت ہمارے لیے فرحت و انبساط اور سعادت کا باعث تھی۔ جن کی خوشبو سے ہمارا چمن ہمہ وقت معطر رہتا تھا، جن کا نحیف و نزار وجود ہمارے لیے ایک پہاڑ کے مانند تھا، ہمارے لیے ایک بڑا سہارا تھا۔ جن کے کمزور بازو ہماری مضبوط پناہ گاہ تھے۔ جن کی ذات ہمارا سرمایۂ افتخار تھی۔ جن کی رضا اور خوشنودی ہمارا حاصل زیست تھا۔ آپ کی جدائی سے یہ سب چیزیں ہم سے چھن گئی ہیں۔ ہم اپنے ابا کی محبتوں، شفقتوں، سہاروں اور رہنمائی سے محروم ہوگئے ہیں۔ آج آپ کی باتیں، آپ کی محبتیں، آپ کی مسکراہٹیں ہمارے آس پاس چمکتی ہیں اور معدوم ہوجاتی ہیں اور پھر محرومی کی اذیت کا سورج سوا نیزے پر چمکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ ایسی محرومی ہے جس کا کوئی مداوا نہیں ہے...... یہ ایسی اذیت ہے جس میں کوئی راحت نہیں ہے...... یہ ایسی کسک ہے جس میں کوئی سکون نہیں ہے...... یہ ایسا زخم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں ہے...... یہ ایسا درد ہے جس کی کوئی مسیحائی نہیں ہے...... یہ ایسا کرب ہے جس میں کوئی قرار نہیں ہے...... یہ ایسا غم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے...... یہ ایسی بے کلی ہے جس میں کوئی سکون نہیں ہے...... یہ ایسا زیاں ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے...... یہ ایسا خسارہ ہے جس کی کوئی بھرپائی نہیں ہے...... اب ہمیں ساری زندگی اس دکھ اور کرب کے ساتھ بسر کرنی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ احساس کتنا جان لیوا ہے جو ہمارے رگ و پے میں دوڑ رہا ہے اور ہر لمحہ ہمیں موت سے قریب کررہا ہے!!

کہہ رہے ہیں درد میں ڈوبے ہوئے دیوار و در
ڈھونڈتے پھرتے ہو جن کو تم یہاں سے جا چکے

تونس ندی کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں بندی گھاٹ سے ہمارا تعلق ہے۔ ابا کے بچپن میں یہاں کی آبادی صرف چند سو افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔ ہمارا گاؤں ہر دور میں زمانے کی ترقیوں سے بہت پیچھے لیکن تعلیمی و تہذیبی لحاظ سے بہت آگے تھا۔ بیک وقت کئی کئی عالم یہاں موجود ہوتے تھے حتیٰ کہ شمس العلماء کے لقب سے ملقب عالم دین بھی۔ ہمارے دادا کا عزم تھا کہ وہ اپنے پہلے بیٹے کو ضرور ایک عالم حق بنائیں گے۔ ہمارا خاندان امانت داری، ایمان داری اور دینداری میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ دادا کی حیثیت گاؤں میں ایک سردار کی سی تھی، آپ اپنی دینداری، امانت داری، معاملہ فہمی اور انصاف پسندی میں بڑے مشہور تھے، آپ ایک معزز، پُروقار اور بااثر شخصیت کے مالک تھے، آپ تقریباً تیس بیگھہ سے زائد زمین کے تنہا مالک تھے، اس وقت اتنی بڑی جائیداد کے مالکوں کو انگلیوں پر گنا جاتا تھا، لوگ اپنے تنازعات میں آپ کو حکَم

مانتے تھے، اپنے اطراف کے علاقوں میں آپ معروف ومقبول تھے اور آپ کی بہادری کے چرچے تھے، سارا گاؤں آپ کی عزت وتکریم کرتا اور ''بابا'' کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کے علاوہ دادا اپنے منفرد انداز تربیت کے لیے مشہور تھے یہی وجہ ہے کہ ابھی تک یہ کہا جاتا ہے کہ ''بابا کے گھر کے بچے اس طرح نہیں کر سکتے۔'' ابا کی تربیت میں دادا کے ساتھ ابا کی دادی، نانی اور خالہ کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ یہ خواتین اپنی عبادت گزاری اور دینداری میں بے مثال تھیں، انھیں اللہ والیوں کا درجہ دیا جاتا تھا۔ دادا کو ابا پر بڑا ناز تھا۔ ابا دادا کا فخر تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی دادا نے ابا کو کبھی کھیتی باڑی کے کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیا۔ اسے ابا کی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے تھے۔

دادا کی محبتوں اور محنتوں نے ابا کو اس بلند علمی مقام تک پہنچایا۔ اصلاح سے فراغت کے بعد بھی اَبّا اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہش مند تھے۔ اس زمانے میں فضیلت کے بعد تخصص کے لیے ملک بھر میں کہیں کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ لوگ یا تو کسی مشہور عالم دین کی صحبت میں وقت گزار کر تفقہ حاصل کرتے تھے یا ملک سے باہر خصوصاً جامعہ از ہر مصر چلے جاتے تھے۔ لیکن دادا، ابا کو ملک سے باہر بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوئے پھر نہایت غور وخوض کے بعد ابا نے دارالمصنّفین سے استفادہ کا ارادہ کر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال ابا وہاں مصروف تحقیق ومطالعہ رہے، اس دوران دادا پریشان ہوتے تھے کہ کہیں ابا کا وقت نہ ضائع ہو رہا ہو۔ پتہ نہیں ابا کو اس سے فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ دادا کی تشویش دیکھ کر اَبّا کے پھوپھی زاد بھائی وہاب بڑے ابا دادا کو تسلی دیتے اور کہتے کہ

''آپ پریشان نہ ہوئیے مولوی صاحب بہت بڑے کام میں مصروف ہیں۔''

دادا کو ابا کے ہر حال کی خبر ہوتی تھی، ابا جہاں بھی رہے دادا آپ کے لیے ہمیشہ فکر مند رہے، دادا نے ابا کو کبھی کسی کام سے منع نہیں کیا ہمیشہ دادا کا تعاون ابا کو حاصل رہا۔ ابا کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے دادا کو ضرور مطلع کرتے اور مشورہ لیتے۔ دادا ابا کے علمی مقام ومرتبہ سے بہت خوش ہوتے تھے۔ دادا کبھی ابا کو نام سے نہیں بلاتے تھے ہمیشہ ''مولوی'' کہا کرتے تھے۔ دادا اور ابا جب کبھی اکٹھا ہوتے ہمیں ان دونوں کی باہمی محبتوں، عزتوں اور احترام کے عجیب وغریب نظارے دیکھنے کو ملتے۔ ایک مرتبہ گاؤں میں مسجد میں کسی دینی مسئلہ پر بحث ہوگئی سامنے والے نے دادا کو خاموش کرانے کے لیے کہا کہ ''میرے باپ ایک بڑے عالم ہیں۔'' اس پر دادا نے برجستہ کہا کہ ''تمہارے باپ عالم ہوں گے مگر میں تو عالم کا باپ ہوں۔'' دادا کے اس انداز اور بات سے سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

ابا نے تمام فکروں سے آزاد ہو کر جس طرح دین کی خدمت میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا یہ کام دادا کے

ساتھ اور تعاون کے بغیر شاید اتنا آسان نہ ہوتا۔ دونوں چچاؤں کا بھی ابا کو بہت سپورٹ حاصل رہا۔ امی بتاتی ہیں کہ حیدرآباد سے گاؤں اور گاؤں سے حیدرآباد لانے لے جانے کی تقریباً ذمہ داری چچاؤں کی ہوتی تھی۔ ہر مشکل وقت میں آ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ جب ایمرجنسی لگی، امی وغیرہ کو کریم نگر آئے بمشکل چند ماہ ہوئے تھے کریم نگر سے بھی جماعت کے ارکان کی گرفتاریاں ہورہی تھیں، ہر لمحہ خوف تھا کہ ابا گرفتار کر لیے جائیں گے اس موقع پر بڑے چچا فوراً کریم نگر پہنچ گئے اور ابا کے حکم پر سب کو لے کر گاؤں آ گئے۔ ہم نے ہر اہم اور نازک موقع پر اپنے چچاؤں کو اپنے پاس حاضر پایا ہے۔ ان کے علاوہ اَبّا کے خالہ زاد بھائی اجمل چچا نے اَبّا کا اور ہمارا ہمیشہ خیال رکھا اور اپنا دست تعاون ہمیشہ دراز رکھا۔ امی نے بھی اپنی صابرانہ رفاقت کے ذریعہ ابا کا ساتھ خوب نبھایا۔ کبھی ابا کی کسی بات کی مخالفت نہیں کی۔ اپنی جفاکشی اور محنت سے ہمیشہ ابا کو آسانی فراہم کرتی رہیں۔ حالات کیسے بھی رہے کبھی کسی قسم کا شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ ابا کے ساتھ ابا کے کاموں میں تعاون کرتی رہیں۔ ہمیشہ صابر اور شاکر بنی رہیں۔ ابا کے ساتھ ابا کے مقصد کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے خود کو ہمہ تن مصروف کرلیا۔ ہمیں بھی ابا کے رنگ میں رنگنے کی پوری کوشش کی۔ کسی ایک فرد کا اپنے آپ کو مکمل طور پر کسی مقصد کے لیے وقف کر دینا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب افراد خاندان کا اسے بھرپور سپورٹ اور پشت پناہی حاصل ہو۔ الحمدللہ! ابا کو ایسے تعاون کرنے والے میسر آئے۔ اللہ دادا سمیت تمام بہی خواہوں کے حق میں ابا کو صدقۂ جاریہ بنا دیجیے۔ آمین!

مرے اجداد کی شیبان یہی ہے تعلیم
ہو جہاں دھوپ کی شدت وہاں سائے رکھنا

اَبّا ایک بہت سادہ شخصیت تھے آپ کے ہر انداز سے سادگی جھلکتی تھی، آپ کے لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے سب میں بڑی سادگی تھی۔ یہی سادگی آپ کے حسن کو بڑھاتی تھی اور سادہ لباس کے باوجود آپ کی شخصیت ہمیشہ جگمگاتی تھی۔ آپ ایک درویش صفت عالم دین تھے، آپ کا بس ایک رنگ تھا، ''صبغة الله'' آپ جہاں رہے اسی کے دائرے میں رہے، یہی رنگ آپ کی پہچان بنا اور اسی پر آپ نازاں رہے۔ آپ تصنع وتکلف سے مبرا اور بناوٹ وظاہرداری سے سراسر پاک تھے اور یہ چیزیں آپ کو سخت ناپسند تھیں۔

لوگ پہلی ہی ملاقات میں آپ سے بے تکلفی سے بات کرنے لگتے لیکن رعب ایسا ہوتا کہ کوئی بات خلاف ادب نہ ہوتی۔ بات لمبی چوڑی کرنے کے عادی نہیں تھے مگر بات ایسی کرتے کہ مخاطب کے دل پر اثر انداز ہوجاتی۔ سامنے والے کو بولنے کا پورا موقع دیتے اور جب وہ اپنی بات مکمل کرلیتا تو آپ اپنی بات کہتے۔ ہر ملاقاتی پر اپنا ایک نقش ضرور چھوڑتے۔ آپ دن بھر میں سینکڑوں لوگوں سے ملتے لیکن کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں

ہوتے، ہر ایک سے خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ ''ناپ تول کر بول بولو'' اور ''جو بولو سوچ سمجھ کر بولو'' اس طرح کے اقوال ابا سے ملاقات کرنے والے ہر شخص کو اچھی طرح سمجھ میں آجاتے۔ ابا کم گو تھے مگر جہاں بولنا ضروری ہوتا وہاں ضرور بولتے تھے، خاموش نہیں رہتے تھے۔ نرم خوئی، خنک بیزی، شائستگی، متانت اور اعلیٰ ظرفی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تنقید کرتے وقت بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

آپ نہایت بے ضرر انسان تھے کسی کو آپ کی زبان اور ہاتھ سے کوئی خوف نہ تھا، آپ کی مخالفت کرنے والے لوگ بھی بلا کسی خوف وخطر اپنی ذاتی زندگیوں کے فیصلوں کے لیے آپ سے مشورہ لینے آجاتے، یا کسی مجبوری سے مجبور ہو کر آپ سے مدد مانگنے آجاتے۔ انھیں رتی بھر بھی یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ مولانا ہماری مدد نہیں کریں گے۔ آپ بلاتفریق سب کی تسلی کا سامان تھے۔ ہمیشہ لوگوں کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ ہمیں بھی اس کی ترغیب دیتے اور کہتے کہ تکلیفوں میں مبتلا ہونے والا انسان اللہ کے بہت قریب ہوتا ہے، ایسا کوئی انسان نظر آئے تو اس کی ہر ممکن مدد کرنے اور اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کیا کرو۔

آپ نے دنیا، دنیا کی آسائشوں، دلفریبیوں اور رنگینیوں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ دنیا کو کبھی ایک متاعِ غرور سے بڑھ کر نہ جانا۔ پوری زندگی ''غریب'' اور ''عابر سبیل'' بن کر رہے۔ آپ نے دنیا کو ہمیشہ ''پل صراط'' سمجھا۔ آپ نے اپنی سعادت مند زندگی اس طور گزاری جیسے آپ ''پل صراط'' پر چل رہے ہوں کہ ذرا سا بھی قدم ادھر اُدھر ہو جائے تو منزل مقصود کھوٹی ہو جائے گی۔ دنیا میں رہے مگر کبھی دنیا کی فکر نہیں کی ہمیشہ آخرت کی فکر کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سود و زیاں کا کبھی حساب نہ لگایا ہمیشہ آخرت کا سود و زیاں پیش نظر رکھا۔ کسی عمل پر دنیا کا لاکھ فائدہ بھی نظر آتا تو اس سے دور رہتے اور کسی عمل پر دنیا کا نقصان بھی سامنے نظر آ رہا ہوتا تب بھی اسے کر گزرتے۔ اس دنیا میں میں نے آپ جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔ جو ملا کھالیا، کبھی کوئی فرمائش نہیں کی، نہ کبھی کہا کہ فلاں چیز کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔ جبکہ انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ پوری زندگی کا کیا ذکر صرف دن بھر میں ہی اسے کئی چیزیں کھانے کا دل کرتا ہے۔ ایسی بے رغبتی اور بے نیازی کی توقع آج کی دنیا کے کسی انسان سے نہیں کی جاسکتی!! ابا آج کی دنیا میں آج کے نہیں بلکہ اصحاب کہف جیسے ماضی کے کوئی انسان لگتے تھے۔ کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی کسی چیز کی طلب ظاہر کی۔ آپ واقعی اپنی صفات اور کردار کی خوبیوں کے لحاظ سے ''بقیۃ السلف'' تھے آپ کو دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ آپ کے اخلاص کا عالم یہ تھا کہ اپنی نیکیوں کو ریا کے ڈر سے ایسے چھپاتے جیسے لوگ اپنی برائیاں چھپاتے ہیں۔

چہرہ سے عیاں عشق صحابہ کی تب و تاب
سینہ میں نہاں جذبۂ تسلیم و رضا ہے

چہرے پہ شریفانہ تہور کی تب و تاب
فکر اس کی درخشاں ہے تو ذہن اس کا رسا ہے

وہ اوصافِ فاضلہ جو صلحاء واتقیا کا نشانِ عظمت ہوتے ہیں، آپ ان کا پیکر مجسم تھے، آپ کی امتیازی صفت حق پر استقامت تھی، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت و محبت تھی، قرآن وسنت سے قربت تھی، فکر کی سالمیت تھی، عمل پر مداومت تھی، قول وفعل میں یکسانیت تھی، ایثار وقربانی سے الفت تھی، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی وقعت تھی، خلق خدا کی خدمت تھی، نعمتوں کی عظمت تھی، دل میں سخاوت تھی، صدقات میں لذت تھی، عبادات میں ریاضت وخشیت تھی، معاملات میں دیانت وامانت تھی، کردار میں رفعت تھی، انداز میں متانت تھی، دل میں ایمانی غیرت وحمیت تھی، غایت درجہ کی جرأت وہمت تھی، باطل سے مزاحمت ومقاومت تھی، مداہنت و مصالحت سے نفرت تھی، کفار سے عداوت ومومنوں سے محبت تھی، نظامِ منکرات سے بغاوت تھی، جہاد وشہادت کی آرزو وچاہت تھی، اعمال میں مقصدیت تھی، قلب ونظر میں وسعت تھی، کدورت سے مسافت تھی، طبیعت میں نفاست تھی، گناہوں پر ندامت تھی، اسلوب میں ندرت تھی، فکر میں صلابت تھی، نگاہوں میں بصیرت تھی، چہرے پر بشاشت تھی، تحریر میں روانی وسلاست تھی، تقریر میں تاثیر وافادیت تھی، باتوں میں ملاحت وصداقت تھی، حسب ونسب میں شرافت ونجابت تھی، اوقات میں برکت تھی، آنکھوں میں ذکاوت وذہانت تھی، مزاج میں اپنائیت ومروت تھی۔

ابا سراپا روشنی تھے، تمام عمر تاریکیوں سے لڑتے رہے، آپ نے کبھی ظلمت شب کا شکوہ نہیں کیا بلکہ اپنے حصہ کی شمع جلا کر اندھیروں کے لیے چیلنج بنے رہے۔ آپ جرأت واستقامت کا اک استعارہ تھے۔ آپ کی گفتگو ہمیشہ پُرعزم، منزل کو پانے کے یقین سے لبریز ہوتی تھی، آپ "فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ" کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ جس چیز پر یکسو ہو جاتے دنیا کی کوئی طاقت اس سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ آپ کی ذات سفاک ظلمتوں میں حوصلہ اور امید کی نقیب تھی، آپ اپنے نظریہ اور فکر کے اعتبار سے جتنی بڑی شخصیت تھے، سیرت و کردار کے لحاظ سے اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ آپ نے اپنی شخصیت کی تعمیر اخلاص وللّٰہیت، تقویٰ وتوکل، ایثار وقربانی، احسان وصبر، ہمدردی ودلجوئی اور خدا کے حضور جوابدہی کے احساس سے کی۔ آپ کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو ان ساری باتوں کی گواہی دیتے ہیں۔

۞ - ۲۰۱۳ء میں ابا کی کتاب ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' کے ملیالی ترجمہ پر مترجم، پبلشر، ڈسٹری بیوٹر اور مصنف کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ کتاب پر پابندی لگا دی گئی، سارے نسخے ضبط کر لیے گئے اور مصنف کے

علاوہ سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ جب یہ خبر عام ہوئی تب ہمیں بھی پتہ چلا کہ اس کتاب کا ملیالم زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ کسی نے ابا کو فون کیا اور کہا کہ ''مولانا آپ پر بھی کیس بنایا گیا ہے ہوسکتا ہے کہ گرفتاری ہو اور پوچھ تاچھ ہو۔ یہ ترجمہ آپ کی اجازت کے بغیر کیا گیا ہے حتیٰ کہ آپ کو اطلاع بھی نہیں دی گئی۔ اس پر آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟''

ابا نے فوراً اس شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ

> ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری کتابوں کے ترجمہ کے لیے کسی کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، جو چاہے کرسکتا ہے۔ ہماری طرف سے یہ ایک عام اجازت تھی۔ آپ لوگ گھبرائیں نہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمت سے سامنا کریں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا، ہم ہر قسم کے حالات کے لیے تیار ہیں۔''

ایسی نازک صورتحال میں اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنا اور دوسروں کو راحت پہنچانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوسکتی۔ ؎ کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

۞-ہم نے ہمیشہ ابا کو مدرسہ کے پیسوں کے معاملہ میں بہت محتاط رویہ اختیار کرتے دیکھا۔ ابا سے ملاقات کے لیے اکثر لوگ آتے رہتے تھے اور مدرسہ کا تعاون بھی کیا کرتے تھے۔ ابا فوراً ان اصحاب کی موجودگی میں منشی جی کو بلاتے اور رقم ان کے حوالے کردیتے اور کہتے کہ رسید بنادیں۔ اگر تعاون کرنے والے رسید نہ بنوانا چاہتے تب بھی آپ صاحبِ خیر کے نام سے رسید بنواتے۔ اگر رقم ہاسٹل کے مد کی ہوتی تو منشی جی کے ہاتھوں ہی سامان وغیرہ منگواتے اور انھیں کے ذریعے خرچ کرواتے۔ ایک پیسہ بھی اپنے ہاتھ سے خرچ نہ کرتے۔ اس معاملے میں آپ بے حد احتیاط کرتے تھے۔ آپ تعاون کی وصولی کے لیے اندرون و بیرونِ ملک تشریف لے جاتے۔ مدارس سے وصول کنندگان کو فیصدی محنتانہ دیا جاتا ہے۔ لیکن ابا نے کبھی اپنے لیے اسے گوارا نہ کیا اور نہ کبھی کسی پر اس بات کو ظاہر کیا۔

۞-ابا پردہ کے سخت قائل تھے۔ مدرسہ میں بھی سختی کے ساتھ پردہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ مدرسہ میں مرد اساتذہ بھی ہوتے ہیں۔ کلاسوں میں استاد اور طالبات کے درمیان پردہ پڑا ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ لوگوں نے اعتراض کیا کہ پردے کے پیچھے سے اساتذہ کے پڑھانے کا رواج قدامت پسندی کا ثبوت ہے۔ پردہ کے اس رواج کو ختم کیا جائے کیونکہ طالبات خود بھی نقاب میں ہوتی ہیں۔ لیکن ابا نے کبھی اس بات پر کمپرومائز نہیں کیا۔ ہمیشہ تدریس کا یہی انداز قائم رکھا۔ حتیٰ کہ طالبات مرد اساتذہ کے اسٹاف روم تک نہیں جاسکتی تھیں۔ انھیں باقاعدہ اجازت لے کر آیا کے ساتھ جانا ہوتا تھا۔ اساتذہ اور معلمات کی میٹنگ بھی ہوتی تو

باقاعدہ درمیان میں پردہ لگا ہوتا۔ روبرو بات کرنے کے مواقع بہت کم پیش آتے تھے۔ مہمان وفود کے دورہ کے موقع پر جامعہ میں پروگرامس ہوتے تو درمیان میں پردہ لگا ہوتا بہت کم ایسا ہوتا کہ درمیان میں پردہ نہ ہو، جب تک طالبات کا پروگرام چلتا تب تک تو ضرور پردہ لگا ہوتا، اسی طرح اسنادوغیرہ بھی کبھی مردمہمانوں سے نہیں دلوائے گئے، ہمیشہ پروگرام الگ الگ ہال میں ہی ہوتا۔

۞-ابا غیرت وحمیت کے معاملے میں جاں سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اور کسی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

ہم چھوٹے ہی تھے کہ ہاسٹل میں ایک نومسلم عائشہ باجی آئی تھیں وہ کٹر مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، اور سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ ان کے ایک بھائی نے بھی اسلام قبول کیا تھا، انھیں بڑی آزمائشوں کا سامنا رہا۔ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ جب ہاسٹل آئیں تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر اللہ کو شاید انھیں مزید آزمائش میں ڈالنا منظور نہ تھا، اس لیے انھیں اپنے پاس بلانے کا انتظام کرلیا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ انھیں برین ٹی بی ہے۔ انھیں ہاسپٹل میں شریک کردیا گیا جب طبیعت زیادہ سیریس ہوگئی تو ان کے نومسلم بھائی نے اپنے گھر والوں کو اطلاع دے دی۔ پھر ان کے دوسرے بھائی ان کا علاج کرانے لگے اور اپنے گھر لے گئے۔ چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ نومسلم بھائی کے ذریعے پتہ چلا کہ ''تدفین ہندودھرم کے مطابق انجام دینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے اور پورے ماحول میں ایک تناؤ کی کیفیت ہے''۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ ابا نے کہا کیا ہوگا یہ بعد کی بات ہے پہلے مدرسہ کی سب لڑکیاں عائشہ کے گھر جائیں گی اور آخری دیدار کریں گی۔ لہٰذا چھ بسیں بھر کر ساری لڑکیاں ان کے گھر گئیں، اتنی بڑی تعداد دیکھ کر اُن کے گھر والے دنگ رہ گئے۔ ان کی ماں نے کہا کہ ''میری بچی ان لوگوں کے ساتھ رہی اور بڑی خوش رہی لہٰذا اس کی خوشی کے لیے ہی ان لوگوں کو آخری رسومات کر لینے دو''۔ ان کے لوگوں نے بڑی مخالفت کی مگر ان کی ماں اڑ گئیں کہ لاش مسلمانوں کو دے دو۔ ان کے والد وقارآباد کی درگاہ کے پیلے شملے والے مرشد کے مرید تھے۔ بھائیوں نے یہ شرط رکھی کہ اسی درگاہ میں لے جا کر تدفین کی جائے۔

لہٰذا ایک بس میں ابا، مدرسہ کے دو اساتذہ (مولانا صفی احمد مدنی صاحب اور جناب احمد الدین سر)، واچ مین، ہم بہنیں اور نومسلم بھائی کی سسرالی دوعورتیں اور کئی کاروں اور ٹرکوں میں ان کے لوگ، قافلہ روانہ ہوا۔ رات کا اندھیرا، وقارآباد کا ویرانہ اور گنتی کے ہم چند لوگ۔ ڈر اور خوف کا ماحول تھا ساتھ ہی یہ اندیشہ کہ کہیں ہمارے ساتھ دھوکہ نہ کیا جارہا ہو۔ کسی کو زندہ واپس آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بہرحال رات دو بجے تدفین عمل

میں آئی اور ہم زندہ سلامت واپس آ گئے۔اس موقع پر لوگوں نے بہت روکا تھا کہ مولانا رسک نہ لیں لیکن ابا نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور کہا کہ ’’جس لڑکی نے اسلام قبول کیا، ہر مشکل اور پریشانی کو برداشت کیا اور آخری سانس تک ثابت قدم رہی ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ہم ڈر اور خوف کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں اور اسے غیروں کے حوالے کر دیں‘‘۔

۞-۱۹۹۶ء میں بازیابی بابری مسجد کے نام سے ایک کل جماعتی احتجاجی ریلی مکہ مسجد تا دارالشفا منعقد کی گئی۔اس کا مرکزی جلسہ مسجد دارالشفا میں ہونا تھا۔ابا ایک دوسرے پروگرام میں مصروف تھے،لہٰذا یہ طے پایا تھا کہ ابا جلسہ میں شرکت کریں گے۔ریلی کے آغاز سے قبل ہی پولیس فائرنگ میں دو لوگ شہید ہو گئے۔پھر بھی لوگ مکہ مسجد سے کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور دارالشفاء کی سمت چل پڑے۔راستہ میں کئی جگہوں پر لاٹھی چارج اور فائرنگ ہوئی، بہرحال ایک بڑی تعداد دارالشفا پہنچ گئی۔ادھر ابا اپنے پروگرام کے مطابق دارالشفاء کے لیے روانہ ہوئے۔دبیر پورہ برج جیسے ہی پار کیا دارالشفاء کی سمت سے ایک زبردست ہجوم بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔پتہ چلا کہ جلسہ گاہ میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ابا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ بائیک پر تھے۔انھوں نے اپنی بائیک روک دی اور مشورہ دیا کہ مولانا اس صورتحال میں آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔ابا ان کی بائیک سے اتر گئے اور کہا کہ ’’آپ جائیے،ہم اکیلے ہی جاتے ہیں‘‘۔ابا جلسہ گاہ عین اس وقت پہنچے جب شدید فائرنگ اور لاٹھی چارج کیا جا رہا تھا۔جب تک مسجد میں پھنسے لوگوں اور خواتین کو باہر نہ نکال لیا گیا آپ مستقل وہاں ڈٹے رہے۔

۞-آپ کی ایک بڑی خوبی اعمال پر مداومت تھی، جو عمل بھی کرتے پورے ذوق وشوق سے کرتے اور اس کو ہمیشہ وقت پر انجام دینے کی کوشش کرتے۔کاموں کو ٹالتے نہیں تھے۔ہر حال میں اپنے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے۔آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوتے، چاہے کتنے ہی ملاقاتی آپ کے منتظر ہوتے، یا آپ کسی اہم میٹنگ میں ہوتے،لیکن جب آپ کی گھنٹی ہوتی تو کچھ دیر کے لیے ہی سہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کلاس میں آ جاتے۔اور تھوڑا ہی سہی مگر پڑھاتے ضرور تھے۔آپ کہتے تھے کہ مداومت سے کام میں برکت ہوتی ہے۔

۞-ابا کی بڑی خواہش تھی کہ حج کر لیں۔بہت پہلے ایک دو دفعہ ارادہ بھی کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آ گئی۔پھر ۲۰۱۰ء میں جب ابا کا پاسپورٹ ایکسپائر ہوا تو وہ رینول نہ ہو سکا۔کئی دفعہ کوشش کی گئی کہ صرف حج کے لیے ہی پاسپورٹ مل جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔فریضۂ حج کی ادائیگی کی حسرت لیے ابا اس دنیا سے رخصت ہو گئے جس کا ہمیں بے حد دکھ ہے۔

۞-آپ کی ان گنت صفات عالیہ میں سے ایک اعلیٰ صفت وخوبی یہ بھی تھی کہ آپ کا دل ہمیشہ مسجد میں لگا ہوتا تھا۔ اس مسجد میں نماز کی ادائیگی کو ترجیح دیتے تھے جہاں اول وقت پر جماعت ٹھہرتی تھی۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تلاوت قرآن کریم کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ آپ کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ آپ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرتے تھے اور وضو بڑے اہتمام سے اور دیر تک کرتے تھے۔ ابا کو وضو کرتے ہوئے دیکھ کر سمجھ آتی تھی کہ وضو بھی کتنی بڑی عبادت ہے۔

۞-اَبّا چھوٹی چھوٹی نیکی کے کام بھی بڑے اہتمام، اہمیت اور سلیقہ سے کرتے تھے۔ دروازے پر کوئی سائل آجاتا تو خود اٹھ کر جاتے اور اسے اپنے ہاتھوں سے پیسہ دیتے۔ اگر کوئی دوسرا کہہ دے کہ ابا دیجیے ہم دے دیتے ہیں تو منع کر دیتے اور خود ہی دیتے۔ ابا ہمیں چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے مواقع ضائع نہ کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے ہی نامۂ اعمال بھرتا ہے، کیونکہ بڑا کارنامہ تو انسان اپنی پوری زندگی میں کوئی ایک آدھ ہی انجام دے پاتا ہے یا بسا اوقات وہ بھی نہیں۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ چھوٹی نیکیوں کے موقعوں کی تلاش میں رہے۔

۞-آپ کی سیرت کے سارے رنگ حسین، سارے پہلو خوبصورت اور سارے اطوار من موہ لینے والے تھے۔ آپ دوسروں کے لیے تتبع وتقلید کی علامت ونشان تھے۔ میری ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ میں ابا کی تقلید کروں۔ ہمارے مدرسہ کے ایک استاذ مولانا اعظمی صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ آخری درس انھوں نے ہماری کلاس میں ہی دیا تھا۔ کلاس میں ہی ان کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ ان کے انتقال کا ہم طالبات پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ پورا مدرسہ شدید صدمہ سے دوچار ہوا۔ ایک دن ابا نے مجھ سے پوچھا ''بیٹی نماز کے بعد اپنے استاد کے لیے دعا کرتی ہو؟'' میں نے کہا ''اکثر کرتی ہوں، کبھی جلدی میں ہوتی ہوں تو نہیں کرتی۔'' ابا نے کہا کہ ''میری ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب میں دو سال کا بھی نہیں تھا، لیکن جب سے میں نے دعا کرنا سیکھا ہے تب سے لے کر آج تک کوئی نماز ایسی نہیں ہے جس کے بعد میں نے ان کے لیے دعا نہ مانگی ہو۔ اسی طرح تمام اساتذہ اور اپنے مرحومین کے لیے جب تک دعا نہ کر لوں مصلی سے نہیں اٹھتا۔'' میں حیرت میں پڑ گئی کیونکہ وہ استاد جن کی موت کے صدمہ سے میں نکلی ہی نہیں تھی ان کے لیے دعاؤں میں کوتاہی شروع کر دی تھی اور ابا!! میں جو ابا کو ہمیشہ کاپی کرنے کی فکر میں ہوتی تھی مجھے لگا کہ میں کبھی ابا کو فالو نہیں کر سکتی۔ ابا غیر محسوس طریقے سے دل ودماغ میں اس طرح سے کئی باتیں نقش کر جاتے تھے۔

۞-فجر اور عصر کے بعد ابا اور امی کو چائے پینے کی عادت تھی، میں جب بھی چائے بنا کر لے جاتی پہلے ابا کو

چائے کا کپ پکڑاتی پھر امی کو۔ ایک روز ابا نے کہا: ''پہلے اپنی اماں کو چائے دو، ماں کا درجہ بڑا ہے نا جی!'' حقوق و مراتب کا لحاظ خود بھی رکھتے تھے اور ہمیں بھی اس کا احساس کرواتے تھے۔

ابا ہماری تمام سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر بھی خوش ہوجاتے تھے، تعلیمی میدان میں ہماری تمام ترقیاں ابا کی مرہونِ منت ہیں۔ کبھی کسی چیز کے لیے آپ نے ہمیں منع نہیں کیا۔ .Ph.D کے دوران کئی موقعوں پر میں نے ہمت ہار دی۔ لگتا تھا کہ .Ph.D کی تکمیل میرے بس کی بات نہیں ہے، ہر بار ابا نے میری ہمت بندھائی، کہتے کہ ''ہمارے گھر میں اتنے کم ہمت تو کوئی نہیں ہیں۔'' میری عادت تھی کہ میں جو کچھ لکھتی ابا کو ضرور پڑھ کر سناتی۔ مضمون بھی اس وقت تک کہیں ارسال نہ کرتی جب تک کہ ابا کو پڑھ کر نہ سنا لیتی۔ ابا جب سن لیتے تو مجھے اطمینان ہوجاتا کہ ہاں اب اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ ابا میرے مضامین سنتے اصلاح کرتے اور خوش ہوتے۔

علم و عرفاں کے ستاروں سے سجایا ہم کو
ہم تھے خوابیدہ زمانے میں جگایا ہم کو
ان کی ہر جہد مسلسل کے گراں بار ہیں ہم
ان کی ہر فکر سے معمور ہیں سرشار ہیں ہم

۲۰۱۵ء میں سالار جنگ میوزیم کی جانب سے سیرت النبیؐ کے موضوع پر ایک سیمینار تھا، جس میں پہلے دن مجھے بھی مقالہ پیش کرنا تھا۔ میں نے مقالہ کی تیاری کر لی تھی لیکن ابا کو پڑھ کر سنایا نہیں تھا کہ اچانک سیمینار سے ایک دن قبل ابا کی طبیعت بگڑ گئی۔ دل کا درد بڑھ گیا۔ آپ کو ICU میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ دوسرے دن سیمینار شروع ہوا لیکن میں نے شرکت نہیں کی اور ذمہ داران سے معذرت کر لی۔ ICU میں جب میں ابا سے ملنے گئی تو سب سے پہلے یہی پوچھا کہ ''سیمینار میں شرکت کیوں نہیں کی۔'' میں رو پڑی کہ ''آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی ہوں۔'' کہا کہ ''کل ضرور جانا'' رات تک ہم نے ابا کو ICU سے ملحق ایک اسپیشل روم میں شفٹ کروالیا تھا۔ ابا نے کہا کہ ''گھر سے مقالہ منگواؤ اور جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔'' میں رات بھر آپ کے ساتھ ہاسپٹل میں رہی۔ صرف ابا کا دل رکھنے کے لیے میں نے دوسرے دن سیمینار میں شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔ ہماری سیرت و کردار، تعلیم و تربیت اور شخصیت سازی میں ابا کی محنتوں اور محبتوں کو ہم شمار نہیں کر سکتے۔ میری تو ہر سانس ہی ابا سے جڑی ہوئی تھی۔

اپنی تکمیل کے عناصر سے
آپ کو گر نکال دوں ابّا
زندگی کی کتاب کے سارے
حرف و معنی بکھرنے لگتے ہیں
ہر کہانی اجڑنے لگتی ہے
کچھ بھی رہتا نہیں ہے پھر باقی
سب کے سب رنگ اُڑنے لگتے ہیں

مجاہد پر ابا کی تربیت کا نقش بہت گہرا تھا۔ حق گوئی، بے باکی اور بے خوفی اسے گویا ورثہ میں ملی تھی۔ ابا مجاہد کو بہت وقت دیتے تھے، کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ اسے اپنے ساتھ رکھیں کیونکہ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ وہ ذرا سا نظروں سے غائب ہوتا امی دہل جاتیں۔ ہم سب کی کوشش ہوتی کہ ہم اسے کسی نہ کسی کام میں مصروف کردیں۔ ہمارے گھر میں بے شمار کتابیں تھیں۔ مجاہد کبھی کبھی کچھ پڑھ لیتا تھا، اسے مطالعہ کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ ایک دن ابا نے اسے مصروف کرنے کے لیے اس سے پوچھا کہ ''مجاہد! تم نے فلاں کتاب پڑھی ہے۔'' وہ کہنے لگا ''ابا یہ سارا لٹریچر بے فائدہ ہے۔ لٹریچر پڑھنے والے میدان میں نہیں آتے بلکہ انٹلیکچول بنے آفسوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے ان انٹلیکچولس کی صورتیں دیکھ دیکھ کر الرجی ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کتابیں پڑھ کر کتنے لوگ میدان میں نکلے ہوں گے؟'' اس نے یہ سب کچھ اس انداز سے منہ بسور کر کہا تھا کہ ابا ہنس پڑے اور کہا: ''تم نے تو بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ عموماً ہوتا یہی ہے۔''

ایک مرتبہ ۶/دسمبر کے موقع پر ایک کل جماعتی اجلاس تھا۔ مجاہد چھوٹا ہونے کے باوجود بھی ابا کے ساتھ اس اجلاس میں شریک تھا، سب لوگ اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ آخر میں کسی نے کہا کہ مجاہد! تم بتاؤ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ اس نے اٹھ کر تمام حاضرین کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''کل قیامت کے دن جب مجھ سے بابری مسجد کے تعلق سے اللہ باز پرس کرے گا تو میں آپ تمام قائدین کی طرف اشارہ کر کے کہوں گا کہ یہی لوگ امت کے نوجوانوں کو روکنے والے تھے۔'' اس کی بات سن کر مجلس پر دیر تک سکتہ طاری رہا۔ ہم نے کہا مجاہد! تمھیں ڈر نہیں لگا کہ ابا ڈانٹیں گے؟ اس نے کہا کہ ''ابا کیوں ڈانٹیں گے؟ ابا ہی تو کہتے ہیں کہ ہمیشہ حق بات کہا کرو۔''

اپنی شہادت سے کچھ دن پہلے اس نے مولانا وحیدالدین خاں سے ملاقات کی تھی، وہ بڑے خوش ہوئے۔

بڑی محبت سے دیر تک اس سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے رہے۔ پھر کہا کہ ''مجاہد! تم نے اپنے ابا کے اعمال کا بھگتان بہت بھگت لیا ہے۔ اب اپنے ابا کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دواور میری (بڑے ابو کی) باتیں مان لو۔'' اس نے کہا کہ آپ مجھے کوئی وجہ بتائیں کہ میں ابا کو چھوڑ کر آپ کی باتیں ماننے لگوں۔ انھوں نے کہا کہ ''دیکھو میں زندگی بانٹتا ہوں اور تمہارے ابا موت۔ کیا یہ عقلمندی ہے کہ زندگی چھوڑ کر موت کی طرف جاؤ!'' اس نے کہا کہ ''آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ آپ جو زندگی بانٹ رہے ہیں، وہ دنیا کی عارضی زندگی ہے، اور میرے ابا جو موت بانٹ رہے ہیں وہ دراصل موت نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ میں عارضی زندگی کے مقابلے ہمیشہ کی زندگی کو کیوں نہ ترجیح دوں؟!'' یہ سن کر انھوں نے کہا کہ ''تمہارے ابا کی تربیت کا نقش بہت گہرا ہے۔'' پھر انھوں نے اسے اپنا پرسنل نمبر دیا اور کہا کہ ''جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو صرف ایک فون کروادینا، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

مجاہد کو کسی پل چین نہیں تھا، وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ ہمیشہ متحرک و فعال، اور ہر ایک کی مدد پر آمادہ، ایسا لگتا تھا کہ حادثات اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو بات ابھی بڑوں تک نہ پہنچتی وہ اسے معلوم ہوجاتی تھی۔ ہوا یوں کہ اسے کہیں سے پتہ چلا کہ کتہ پیٹ کے علاقہ میں ایک مسجد پر کسی ہندو نے اپنی ملکیت کا دعویٰ کردیا ہے۔ اور مسجد پر تالا لگا دیا گیا ہے۔ وہ اس خبر کی تصدیق کے لیے بغیر کسی کو اطلاع دیئے مسجد تک پہنچ گیا۔ اور وہاں پہرہ پر متعین پولیس سے بحث وتکرار کرلی اور بضد ہوا کہ مجھے مسجد میں نماز پڑھنا ہے۔ پولیس والوں نے سوچا کہ یہ اتنا چھوٹا بچہ تو خود سے نہیں آسکتا ضرور اسے کسی بڑے نے بھیجا ہے۔ لہٰذا اسے گرفتار کرکے عنبر پیٹ پولیس اسٹیشن منتقل کردیا۔ ادھر سب گھر والے پریشان کہ مجاہد دیر سے غائب ہے۔ امی اس کے تمام دوستوں کو بلا بلا کر پوچھ چکی تھیں، کہ کسی نے مجاہد کو دیکھا ہے؟، سبھی نے انکار کیا۔ اب محلہ کے تمام نوجوان سرگرم ہوگئے اور ہر طرف اس کی ڈھونڈائی شروع ہوگئی۔ رات ہوگئی لیکن کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

دوسرے دن کوتہّ پیٹ کے علاقہ کی ایک عورت نے کہا کہ ایک چھوٹا بچہ مسجد کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ اس پر تالا کیوں لگایا گیا ہے؟ اب لوگ اس مسجد تک پہنچے، اور بالآخر معلوم ہوا کہ مجاہد فلاں تھانے میں ہے۔ بہرحال کسی طرح کوشش کرکے اسے شام تک گھر لایا گیا۔ اس کا حال یہ تھا کہ اسے گود میں اٹھا کر لانا پڑا کیونکہ اس پر اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ وہ چل نہ سکتا تھا اور اس کے پیر اور پیٹھ بری طرح زخمی تھے۔ لوگ اس کی حالت دیکھ کر رو رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا کہ ''مجھے بالکل درد محسوس نہیں ہو رہا ہے۔''

اس واقعہ کے بعد عوام اور قائدین کی توجہ اس مسجد کی طرف مبذول ہوئی اور سات آٹھ سال بعد اس کا

فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔ الحمدللہ! آج اس مسجد میں باقاعدگی سے نمازیں ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ مجاہد کی داستان ابتلاء کی تمہید تھا جبکہ وہ محض تیرہ سال کا تھا۔

ہم نے بہت سخت حالات، بہت تکلیف دہ دن اور بہت خوف زدہ کر دینے والے لمحات بھی ابا کی معیت میں گزارے ہیں، لیکن کبھی ہم نے محسوس نہیں کیا کہ ابا پست ہمت ہوئے ہوں یا ذرا برابر بھی مایوس ہوئے ہوں۔ ہمیشہ ہمارے سامنے عزم و ہمت کے کوہ گراں بنے رہے، ہمیشہ ہمیں دلاسہ، تسلی اور حوصلہ دیتے رہے۔ ہم پر وہ وقت بھی آیا جب مجاہد جبری طور پر گمشدہ تھا۔ اخبارات میں اس کی گمشدگی کے اشتہار ڈالے گئے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کس ایجنسی نے اسے پکڑا ہے، اسے کہاں رکھا ہے، اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟؟ مہینوں پتہ نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے، اس دوران جو قیامتیں ہم پر گزریں ان کا حال صرف اللہ جانتا ہے، اس دوران ابا کو کسی پل قرار نہ تھا، اپنے دل کی تسلی کے لیے پوچھتے کہ ''بیٹی! تمہارا دل کیا کہتا ہے۔ مجاہد کے بارے میں، کیا وہ محفوظ ہوگا، کیا وہ زندہ ہوگا؟'' میں اپنے دل کے ہزاروں اندیشوں سے نظریں چرا کر کہتی کہ میرا دل مطمئن ہے ابا، مجاہد ضرور محفوظ ہوگا'' یہ دور ہمارے لیے بڑی سخت آزمائش کا دور تھا، بہت سخت امتحان تھا ہمارے لیے۔

اُدھر مجاہد کا کیا حال تھا؟ اس کے ان پانچ سالوں کی روداد بیان کرنے، اس کے روح اور جسم پر لگے زخموں کو شمار کرنے، اس کی صحرا نوردیوں کے قصے دہرانے، اس کی آبلہ پائیوں کی حکایتیں سنانے اور اس کے جوش و جذبوں، امنگوں اور آرزوؤں کے تذکرہ کا حوصلہ فی الوقت مجھ میں نہیں ہے۔ مجاہد کہتا تھا کہ ''ان پانچ سالوں میں ہر دن فجر کی نماز کے لیے میں ابا کی آواز سن کر ہی بیدار ہوتا تھا کہ مجاہد اٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ عجیب معاملہ ہوتا تھا ہر خطرہ والی جگہ کی طرف قدم بڑھتے ہی ابا کی آواز آتی کہ مجاہد رک جاؤ اور میں رک جاتا۔'' وہ جب کوئی واقعہ بیان کرتا خصوصاً جب ''یہ داستاں ہے میرے دوست'' پڑھتا تو ہمارا گھر سسکیوں سے گونج اٹھتا تھا۔

غرض اس سارے عرصہ میں ایجنسیوں کے عہدیدار مسلسل آتے جاتے رہے، دباؤ بناتے رہے، دھمکیاں دیتے رہے، لیکن ابا پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہوئی، ساری تحریکی، تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیاں پورے جوش وخروش سے جاری رہیں۔ ذرا بھی پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی، ہمیشہ اجنبیوں کو خوش آمدید کہتے رہے۔ نوجوانوں کی فکری رہنمائی کرتے رہے، رہ نوردانِ شوق کو نئی نئی منزلوں سے آشنا کرتے رہے، ''تیز تر گامزن منزل ما دور نیست'' کی حدی خوانی کر کے قافلوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ شبِ دیجور میں امید سحر جگاتے رہے، مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں امید کی شمع جلاتے رہے۔ حوصلہ مندی کی یہ مثال آج کل تو بہت نایاب ہے، لیکن ابا ایمان ویقین کے خزانوں سے مالا مال تھے۔ ایمان ویقین ایک دریا کی صورت ابا کی زندگی میں بہتے تھے اور

لوگ اس دریا سے سیراب ہوتے تھے۔

پھر ہم پر وہ وقت بھی آیا جب مجاہد شہید ہو گیا، ہمارے ولولوں، جذبوں اور افکار و نظریات کو تہہ خاک سلانے کی کوشش کی گئی۔ ہمیں اس کی شہادت کے ذریعے ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے جنازے کے دوران وحشت و سفاکیت کا خونی کھیل کھیلا گیا۔ مجاہد کے جسد خاکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہاسپٹل سے گھر لانے تک جنازہ میں شریک افراد پر فائرنگ اور لاٹھی چارج کیا گیا، محلہ کے گھروں میں گھس گھس کر نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا۔ گھر کے سامنے کئی راؤنڈ فائرنگ کی گئی۔ لاٹھی چارج میں ابا بری طرح زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ اس قدر ہڑبونگ اور افراتفری مچائی گئی کہ ہمیں سکون سے مجاہد کا دیدار تک نہیں کرنے دیا گیا۔ گھنٹوں لوگ تتر بتر رہے۔ نماز جنازہ کا وقت حالات کو دیکھتے ہوئے ظہر کے بجائے عصر کر دیا گیا۔ دادا کے پہلو میں مجاہد کی قبر تیار کی گئی تھی مگر جنازہ وہاں تک نہیں لے جایا جا سکتا تھا، لہٰذا آناً فاناً افراد خاندان اور مجاہد کے ساتھیوں نے گھر کے قریب قبرستان میں قبر تیار کی بالآخر کسی طرح مجاہد کا جنازہ پڑھا گیا اور تدفین عمل میں آئی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان تمام حالات سے مجاہد کو گزرنا پڑا تو کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ مجاہد شاید قانون کی نظر میں کوئی ''مجرم'' تھا یا ''دہشت گرد'' تھا، یا سنگین قسم کے اس پر مقدمات رہے ہوں گے۔ ایسا کچھ نہیں تھا، شہادت سے سات سال پہلے اس پر صرف بابری مسجد کے ایک جلسہ کے انعقاد کا ایک معمولی کیس تھا۔ جس میں اس کی ضمانت بھی ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا جسے قرآن نے بیان کیا ہے:

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝٨ (سورۃ البروج)

ابا اور امی اس سارے عرصے میں صبر و استقامت کی مثال بنے رہے، مجاہد کا جسد مبارک جب گھر آیا تو ابا نے کہا ''بوڑھے باپ کو اپنے شہید بیٹے کے جنازہ کو کاندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے!'' اور ہمیں کہا کہ ''روؤ نہیں، دیکھو فلسطین میں تو ہر روز کئی کئی جنازے اٹھتے ہیں ان کی ماؤں بہنوں کو دیکھو کیسے صبر کرتی ہیں؟'' دکھ کی اس گھڑی میں جب کلیجے پھٹنے کے قریب ہوں اور دل شق ہو جائیں، منہ سے کسی کراہ کا نکلنا تک دشوار ہو، باہر گولیاں چل رہی ہوں اور اندیشے ظاہر ہو رہے ہوں کہ ابھی کئی لاشے اور گریں گے، الفاظ کی ادائیگی اور وہ بھی ایسے الفاظ کی ادائیگی! تسلیم و رضا کے جادہ پیماؤں کی زبان سے ہی ہوتی ہو گی!! صبر و برداشت کی اس حد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جبکہ اس ظلم ناروا اور قتل ناحق پر ساری دنیا کو آگ لگا دینے کا دل چاہتا ہو۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں

ابا نے مجاہد کے قتل کا ذمہ دار اور مجرم پورے سسٹم کو ٹھہرایا تھا، اور کہا تھا کہ اس قتل میں پورا نظام ملوث ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک سب کے سب مجرم اور قاتل ہیں۔ ہم نے مجاہد کی شہادت پر صبر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ ہمیں اب تک صبر نہیں آیا ہے اور صبر آ بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ قاتل آزاد ہیں اور کسی ایک مجرم کو بھی سزا نہیں ملی ہے!! کہا جاتا ہے کہ اسلام میں قصاص اس لیے ہے کہ مقتولین کے گھر والوں کو صبر آ جائے اور ان میں زندگی کی رمق دوڑ جائے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ... (سورۃ البقرہ:۱۷۹)

بے شک قصاص کے بغیر زندہ رہ جانے والے حقیقت میں زندہ نہیں رہ پاتے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں ہیں۔

یہ بظاہر جو آسودگاں ہیں انھیں، تم کبھی چشم حسرت سے مت دیکھنا
ان کے اندر سے گھلتے ہوئے جسم ہیں، اور پگھلتے ہوئے ان کے اعصاب ہیں

ابا نے مجاہد کی شہادت کو اپنے دل کا زخم نہیں بلکہ دل کا سکون بنالیا تھا۔

صرف معاملہ مجاہد کی شہادت پر ختم نہیں ہوا، پھر اس کے بعد معتصم سمیت جنازہ کے دیگر شرکاء پر کئی قسم کے مقدمات دائر کیے گئے جس کی پیشیاں اب تک بھگتائی جا رہی ہیں۔ مجاہد کی شہادت اور مابعد حالات کی ستم ظریفیوں کے باوجود ابا کے عزم و حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنوں اور غیروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود مسلسل مصروف کار رہے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں۔ ابا نے ان حالات میں بھی اپنی جہد مسلسل کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ وہ حقیقی معنوں میں جادۂ حق کے ایک ایسے مسافر ہیں جسے منزل پہ پہنچنے سے پہلے کہیں رکنا نہیں ہے۔ اور جو ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت ہمہ تن تیار ہوتا ہے۔

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال، لذت ساحل حرام

پھر ہم پر وہ وقت بھی آیا جب اچانک ابا کی طبیعت ناساز ہوگئی، آپ کئی دن آئی سی یو میں رہے، مسلسل جبر، دباؤ اور صدمہ کی وجہ سے آپ کو برین اسٹروک ہوگیا تھا، بیٹھے بیٹھے آپ پر غشی طاری ہوجاتی تھی۔ دو قدم بھی چلنا دشوار ہوگیا تھا، ایسے میں معتصم کی گرفتاری کا معاملہ پیش آ گیا۔ حیدرآباد میں مکہ مسجد واقعہ کے بعد گرفتاریوں اور

غیر قانونی حراستوں کا سلسلہ جاری تھا، کہ ۵/مارچ ۲۰۰۸ء کو معتصم کو بھی غیر قانونی طور پر اغوا کے انداز میں گرفتار کرلیا گیا۔ ابا اس ظلم وزیاتی پر تڑپ گئے۔ ہم بہنیں اغوا کی رپورٹ لکھوانے مقامی تھانے پہنچیں اس موقع پر دو بہنوں، اوران کے ۶ سال، ۱۰ سال اور ۵ سال، کی عمر والے چار بچوں سمیت ۲۲ خواتین اور سات لڑکیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس واقعہ نے سارے شہر کو دہلا کر رکھ دیا۔ ابا اپنی صحت کی خرابی کے باوجود اس ظلم کے آگے سینہ سپر ہوگئے۔ بالآخر کم سن لڑکیوں کی پانچ دن، خواتین کی سات دن اور معتصم کی تقریباً تین ماہ بعد رہائی عمل میں آئی۔

مجاہد کی شہادت کے بعد ان چار سالوں میں معتصم پر چھوٹے بڑے کل ۱۴ کیسس اور امی سمیت ہم تین بہنوں پر مختلف قسم کے کئی جھوٹے مقدمات قائم کیے گئے۔ معتصم کی تو ہفتہ میں دو تین دن عدالت میں پیشیاں لگتی تھیں، ہر دن کا موضوع گفتگو یہی ہوتا کہ کل کس کیس کی پیشی ہے اور آج کیا ہوا؟

تقریباً بائیس تیئس سال سے ہمارا گھرانہ اس ظلم وزیادتی کا شکار ہے، ملک میں کوئی بھی واقعہ پیش آتا اس کا سرا ضرور ابا سے جوڑا جاتا اور پھر اس سلسلہ میں پریشان کیا جاتا۔ ایک طرف یہ حالات اور دوسری طرف ابا کا صبر وحوصلہ، عزیمت واستقامت اور جہد وعمل، یہ دونوں چیزیں بالکل متوازی طور پر ساتھ ساتھ چلتی رہیں، جبکہ ایسے لرزہ خیز اور اعصاب شکن حالات کا ہر دن سامنا کرنا، اپنے فکر ونظریہ کی حفاظت کرنا، انھیں پروان چڑھانا، ان کی ترویج واشاعت کرنا اور بغیر کسی خلل کے اپنی تحریکی، تصنیفی اور تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھنا یہ بہت بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ایسے سخت اور جاں جوکھم کے حالات میں بھی اَبّا کی دلچسپیوں اور ترجیحات کا محور صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کے دین کی بالادستی کی جدوجہد تھی۔ جتنی یکسوئی اور یک رنگی میں نے آپ میں دیکھی، جتنا سکون واطمینان میں نے آپ کے رویہ اور انداز میں پایا اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ مصلحت اور تاویل کے قیدی بننے سے تو آپ سرے سے ناآشنا تھے، آپ کہتے تھے کہ

''یہ ہماری صحیح اسلامی فکر ونظریہ کی قیمت ہے اور کوئی چیز بغیر قیمت ادا کیے حاصل نہیں ہوسکتی۔ منزل کا راستہ دکھانے اور منزل پر پہنچنے کے لیے کچھ لوگوں کو ساحل پر ضرور اپنی کشتیاں جلانی ہوں گی بھلے سے یہ دنیا کو خلافِ حکمت ومصلحت لگے۔''

آپ نے بغیر کسی مداہنت ومصالحت کے اپنے فکر کی سالمیت کے ساتھ مزاحمت کے اس سفر کو جاری رکھا اور تادمِ آخر اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول میں سرگرداں رہے۔ حیات مستعار شاید ایسے لوگوں کے لیے ہی حیات جاودانی بن جاتی ہے، دارِ فانی میں لافانی رہ جانے والے لوگ شاید یہی ہوتے ہیں، شاید ایسے لوگ ہی روشنی کے چراغ کہلاتے ہیں جو زندگی کی منڈیروں پر رکھے جاتے ہیں، اہم مانے جاتے ہیں، وقعت پاتے ہیں اور راہ

دکھلاتے ہیں، شاید ایسے ہی لوگوں کو پہاڑی کے چراغ اور متاعِ آخرِ شب کہا جاتا ہے، شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے علامہ اقبال نے کہا کہ ''ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں'' ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی''۔

اَبّا کو افراد سازی میں کمال حاصل تھا۔ افراد سازی اور نئی نسلوں کی داشت پرداخت صحیح معنوں میں کارِ نبوت ہے۔ صالح افراد کی تیاری میں جو دیدہ ریزی، محنت و جانفشانی درکار ہوتی ہے، اس کے لیے انبیائی اوصاف اخلاص، صبر، گریہ وزاری، پاک وصاف کردار اور اعلیٰ اخلاق وغیرہ ضروری ہیں اور یہ چیزیں آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ صالح افراد تحریکوں اور معاشروں کو فراہم کرتے رہیں تاکہ فکرِ اِسلامی کی ترویج و اشاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے نصب العین کی جدوجہد جاری رہے۔ مختلف اداروں سے منسلک رہ کر آپ نے اپنے آپ کو اس اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ نے ستر برس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پرستار اور اعلائے کلمۃ اللہ کے علمبردار تیار کرنے میں لگا دیئے۔ آپ کی تعلیمی وتحریکی جہدِ مسلسل اس پر گواہ ہے کہ آپ نے طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت اور کردار سازی میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس کے علاوہ آپ نے اِسلام پسند نوجوانوں کی فکری تربیت بھی کی، آپ اسلام پسند نوجوانوں کے دینی رہنما بھی تھے اور فکری پیشوا بھی۔ آپ ان کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ نوجوان آپ کی انقلابی روح کے پرستار تھے۔ آپ ان کے دلوں کو ایمان ویقین سے سرشار کر کے ان کے عزم وارادہ کو مضبوط کر دیتے تھے۔ ان میں عقابی روح بیدار کر کے انھیں بلند پروازی کا سبق پڑھاتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑے خواب سجا دیتے تھے۔ ہم دیکھتے تھے کہ لوگ خالی آنکھوں سے آتے تھے اور ایمان ویقین کے نور سے بھر کر بڑے خواب آنکھوں میں سجائے اس طرح لوٹ جاتے تھے کہ ان کی آنکھیں دیے کی طرح روشن ہوجاتی تھیں۔ ابا جانتے تھے کہ اسلام پسند نوجوانوں کے لیے ملک کے ان حالات میں ''دعوت'' کا کام کرنا جاں جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہے، اس لیے آپ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان سے شدید محبت رکھتے تھے۔ حالات کیسے بھی رہے دل میں پیوست یہ محبت کبھی کمزور نہ ہوئی اور نہ کسی کے لیے کم ہوئی۔ آپ کے دل کی زرخیز سرزمین پر محبتوں کی یہ فصل ہمیشہ لہلہاتی رہی اور برگ و بار لاتی رہی، اس لیے کہ ''رجلان تحابا فی اللہ اجتمعا علیہ و تفرقا علیہ'' جیسی بشارتوں سے اس کی سینچائی کی گئی تھی۔ آپ جانتے تھے کہ عرش الٰہی کے سایہ کو پانے کے لیے یہ محبت ''مہر'' ہے اور یہ کتنی قیمتی ہے اور اس کی ادائیگی کتنی مشکل!!! اس کا اندازہ صرف اس وقت لگایا جاسکتا ہے جب ایسے نوجوانوں پر باطل شکنجہ کستا ہے، لوگ ڈر کر ان نوجوانوں سے منہ موڑ لیتے ہیں، انھیں پہچاننے تک سے انکاری ہوجاتے ہیں، انھیں دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں، ان سے سلام دعا تک کے روادار نہیں ہوتے اور ان

پر اپنے دلوں اور گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ عرشِ الٰہی کے سایہ کی خواہش میں ابا اس کی قیمت ادا کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔

آپ نے ستر برس جو پودلگائے ہیں اور آخری دم تک ان کی آبیاری کی ہے، ان شاء اللہ ان کے ثمرات سے کفر والحاد ختم ہوگا اور اس سرزمین پر بھی اسلام کی بہار آئے گی۔ لیکن اس کے لیے آپ کے جسد مبارک کو انتظار کرنا ہوگا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا جسد مبارک بھی سات سو سال تک استنبول میں اسلام کی بہار آنے کا منتظر رہا، آپ کے انتظار کی مدت کیا ہوگی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن بشارتِ نبویؐ کے مطابق یہ طے ہے کہ آپ کا انتظار ختم ہوگا اور آپ کی روح شاد کام ہوگی۔ ان شاء اللہ!

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئیگی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے
جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
تمھیں ہوگے فروغ بزم امکاں ہم نہیں ہوں گے

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک فکر، ایک نظریہ، ایک عزم، ایک مقصد، ایک عہد، ایک تاریخ اور ایک جدوجہد کا نام ہے۔ آپ کی شخصیت کو آپ کی فکر اور نظریہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی شخصیت کی تعمیر اور شناخت میں اس فکر کا کردار کلیدی ہے۔ یہ فکر اور نظریہ آپ کی شناخت اور پہچان اس لیے بنا کہ انھیں استقامت اور ثابت قدمی کے ذریعہ آپ نے مستحکم کر لیا تھا، اور ان کے اردگرد قرآن وسنت کے کڑے پہرے بٹھائے رکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے سامنے دنیا کی کتنی ہی مصلحتیں بیان کر دی جاتیں، سود وزیاں کے کتنے ہی تخمینے پیش کر دیے جاتے آپ اپنی فکر سے بال برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ یہی فکر اور نظریہ زندگی بھر آپ کا روڈ میپ بنا رہا۔ آپ کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو اس حقیقت کا نمایاں طور پر اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے دورِ طالب علمی میں ہی اپنے شعور کی گہرائیوں اور قلب کی وسعتوں سے اپنا مقصد اور نصب العین متعین کر لیا تھا۔ اس کا عملی اظہار جس چیز سے ہوتا ہے وہ نوعمری میں ہی جماعت اسلامی سے آپ کی وابستگی ہے۔ آپ کی اصل وفاداری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھی اور اس وفاداری کے تقاضے کے طور پر امت مسلمہ کی سرفرازی اور احیائے اسلام اور اقامتِ دین کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے۔ آپ کی جماعت سے وابستگی اسی مقصد اور نصب العین کی وجہ سے تھی۔ آپ نے اپنے لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی تمام توانائیاں اس مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے خرچ کر دیں۔ اس کی طرف دعوت کو آپ نے اپنا

اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ مکمل دیانت، پورے خلوص اور ناقابلِ تزلزل استقامت کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے لیے کوشاں رہے، اس کے لیے ہر مشکل اور تکلیف کو انگیز کیا، ہر مصیبت کو گلے لگایا اور ہر قربانی کو برضا و رغبت پیش کیا۔ اس مقصد اور نصب العین کی وجہ سے ہی آپ کی جماعت اسلامی سے وابستگی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ آپ کی جماعتی سرگرمیاں، آپ کی جستجو، لگن اور شبانہ روز کی محنت اور قربانیاں اس جنون کی گواہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس جنون کا بین ثبوت آپ کا جماعت اسلامی سے اخراج بھی ہے۔ کیونکہ جماعت اسلامی سے اخراج کا جو چیز سبب بنی وہ جماعت کی بنیادی فکر اور نصب العین سے چمٹے رہنا اور کسی طور اس سے دستبردار نہ ہونا ہے۔ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابا تحریک اسلامی کے ایک ایسے سپاہی تھے جنھیں ہتھیار نہ ڈالنے اور اپنے ہدف سے پیچھے نہ ہٹنے کی وجہ سے خود تحریک نے شہید کردیا۔

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بیں وحق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

جماعت اسلامی سے اخراج ابا کے لیے بہت بڑا سانحہ اور دلی صدمہ تھا۔ صدماتی کیفیت سے نکلنے میں ابا کو ایک لمبا عرصہ لگا۔ دل پر لگے تمام گھاؤ میں اس گھاؤ کی کسک سب سے الگ تھی۔ جماعت سے ابا کو نکال تو دیا گیا لیکن جماعت کبھی ابا کے دل سے نہ نکلی۔ آپ جماعت کی بنیادی فکر کے حامل اور اس کے بہترین وکیل اور ترجمان بنے رہے۔ آپ کسی بھی مجلس میں بے خوف اس کے اظہار کا حوصلہ رکھتے تھے۔ آپ نے کبھی جماعت اسلامی کی بدلتی پالیسیوں اور بنیادی فکر اور اصولوں سے انحراف کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا۔ ہمیشہ اس طرزِ عمل کی مخالفت اور مذمت کرتے رہے اور قرآن وسنت کے دلائل سے ان غلط پالیسیوں کا رد کرتے رہے۔ اس کی شروعات اس وقت ہوئی جب ۱۹۸۵ء میں ارکان جماعت پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی ہٹائی گئی۔ آپ نے جماعت کی اس الیکشنی پالیسی کی مخالفت کی اور اسے جماعت کے دستور اور آئین کے مغائر قرار دیا۔ پھر جمہوریت بچاؤ فورم بنایا گیا، آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اس کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔ ذمہ داران کو خطوط لکھے اور انھیں اس سے باز رہنے کی تلقین کی، پھر بابری مسجد کے مسئلے پر جماعت کی بے اعتنائیوں اور اعراض کی پالیسی پر شدید اعتراض کیا۔ ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کی تشکیل نے تو آپ کو سراپا سلگا کر رکھ دیا۔ آپ نے اس موقع پر صاف کہا کہ

''جماعت کسی مرحلہ پر ایک غیر دینی اصول پر دین اسلام سے ہٹ کر خالص کافرانہ اور مشرکانہ نظریات کی بنیاد پر ایک غیر اسلامی سیکولر پارٹی تشکیل دے گی ایسا پچاس سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا...... ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کا قیام گویا عملاً اس بات کا اظہار ہے کہ اس زمانے میں خاص طور سے سیاسی میدان میں دین اسلام کی بنیاد پر کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ ہمیشہ دو باتیں خاص طور سے کہتے رہے ایک یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے زندگی کے سارے ہی مسائل اور سارے ہی گوشوں پر حاوی ہے، دوسری بات یہ کہتے رہے کہ تمام مسائل کا حل اسلام میں موجود ہے، لیکن یہ ویلفیئر پارٹی کا قیام گویا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دونوں نظریوں سے پھر گئے ہیں۔ ہمارے عقیدے کے جو جزء تھے وہ ہمارے اپنے نہیں رہے...... جماعت کے موجودہ فیصلے کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''خیانت'' کی گئی ہے، وہ اس طور پر کہ جس ادارے کی بنیاد خالص اسلامی نظریات اور حاکمیت الٰہ پر ہوئی تھی اور جس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ دنیا کے سارے مسائل کا حل اسلام میں ہے، اس ادارے کے تحت اس ادارے میں بیٹھ کر اس ادارے کا نام لیتے ہوئے غیر دینی سیکولر بنیادوں پر ایمان لانا اور سیکولر بنیادوں پر کسی تنظیم کو قائم کرنا ایک طرح کی خیانت ہی ہے۔'' (جادۂ حق)

آپ جماعت اسلامی سے اخراج کے بعد بھی اس کی پالیسیوں کو ہدفِ تنقید بناتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو بانیٔ جماعت کے مقصد، مشن اور مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں تھی۔ آپ مولانا مودودیؒ کے چمن کو برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آپ کا شمار جماعت کے ان کارکنان میں ہوتا ہے جو بڑی محنت اور تربیت سے تیار کیے جاتے ہیں اور جو اصولوں اور معیار سے کسی طور دستبردار نہیں ہوتے۔ آپ کبھی جماعت اسلامی سے دستبردار نہیں ہوئے۔ بھلا ہو بھی کیسے سکتے تھے جب کہ آپ کے سامنے وہ ساری قربانیاں تھیں جو لوگوں نے جماعت اسلامی سے منسلک ہو کر دی تھیں، اپنے عیش و آرام، اپنے گھر بار، اپنے کاروبار اور پیشے سب کو چھوڑ کر چند روپیوں کی مزدوری بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے، آپ کے سامنے وہ سارے مناظر تھے جب آپ اکابرین جماعت کے ساتھ گاؤں گاؤں کا پیدل دورہ کرتے اور کھیتوں میں کام کرنے اور ہل اور رہٹ چلانے والوں کے پیچھے پیچھے جاتے اور انھیں دین کی دعوت دیتے تھے، آپ کے سامنے کارکنان کی انتھک جدوجہد کی وہ تصویریں بھی تھیں، جب وہ اپنے گلے سے تھیلا لٹکائے جس میں کتابیں اور کتابچے وغیرہ رکھے ہوتے ......اپنی سیدھ میں چلے جاتے، ایک ایک آدمی کے پیچھے جاتے، ان سے گفتگو کرتے، انھیں اپنا لٹریچر پڑھنے پر آمادہ کرتے، اپنے تھیلے سے کوئی کتاب یا پمفلٹ دے کر اسے پڑھنے کی التجائیں کرتے تھے۔ جماعت کی دعوت اور پیغام کے اس وسیع پیمانے پر پھیلنے کے پیچھے کتنے لوگوں کا خون پسینہ ایک ہوا ہے، جسے اس کا احساس ہوا اور جو

اس کا گواہ ہو وہ بھلا کیوں کر جماعت کے اندر بگاڑ اور فساد کو گوارا کرسکتا تھا!! لہٰذا اسی احساس کے تحت ابا نے جماعت کو سیدھی راہ پر ڈالنے اور ذمہ داران کو اپنے غلط کاموں کا احساس دلانے کے لیے اپنی سکت سے بڑھ کر بلاخوف لومۃ لائم کوشش کی۔ یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے، کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ ایک شخص آغاز میں جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگوں میں اجنبی تھا اور آخر میں اپنی فکر اور نظریہ کی وجہ سے خود اپنی ہی جماعت میں اجنبی بنادیا گیا۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ

''مولانا ہندوستان میں مولانا مودودیؒ کی فکر کے تنہا وارث تھے۔''

باعزو باوقار تھا اُس کا ہر ایک گام

ہم دیکھتے ہیں کہ ابا کی فکری سفر کی ابتدا ہی انتہا ثابت ہوئی۔ زندگی میں کوئی موڑ ایسا نہیں آیا جس میں سمت سفر بدل گئی ہو۔ آپ کی تحریروں کا جائزہ لے لیجیے ثابت ہوجائے گا کہ پہلی سے لیکر آخری تحریر تک مقصد، منزل اور راستہ ایک ہی رہا۔ کوئی حکمت آمیزی، مصلحت انگیزی، دوراندیشی اور خردمندی اس مقصد کی راہ میں مزاحم نہ ہوسکی۔ نہ پُرخار راستوں کی آبلہ پائیاں، تنہائیاں اور ویرانیاں اور نہ سفر کی طولانیاں، دشواریاں اور کٹھنائیاں اس راستے پر چلنے سے روک سکیں۔ آپ نے اس سفر میں صبر واستقامت اور توکل واستغناء کو اپنا رفیق بنالیا تھا، یہی وجہ ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کے قدم نہیں ڈگمگائے، نہ آپ کا عزم وارادہ کبھی کمزور ہوا۔ راستے کے کانٹے بھی آپ کو حسین ودلکش لگے اور اس راہ کے چھالے بھی گل وسنبل سے زیادہ عزیز ومحبوب۔ آپ کو پتہ تھا کہ یہ سفر تپتے صحرا کا ہے اس لیے آپ نے کبھی پانی کی طلب نہ کی، اس لیے کسی سراب سے دھوکہ نہ کھائے۔ آپ اس راز سے واقف تھے کہ ''تپتے صحرا میں، پاؤں کے چھالے پھوٹیں تو، پانی ملتا ہے'' نتائج سے بے پرواہ ہوکر سود وزیاں کا حساب لگائے بغیر اپنے متعینہ راستے پر چل نکلے، نہ کبھی دائیں بائیں دیکھا کہ کتنے لوگ ساتھ ہیں نہ کبھی پیچھے مڑکر دیکھا کہ کتنے لوگ ساتھ چھوڑ گئے ہیں، نہ کبھی زادِراہ پر نظر کی کہ کتنے دن کا سامان ہے۔ ہمیشہ اللہ پر توکل کیا اور کہا کہ ''یہ اللہ کا کام ہے وہ اپنے وسائل وذرائع سے پورا کرے گا۔ اسباب کی فکر کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ کبھی اسباب ووسائل پر نظر نہ کی پہلے کام شروع کردیتے تھے اور ہم دیکھتے تھے کہ جس کام کا بیڑا اٹھالیا وہ پار لگ گیا۔ اللہ کہیں نہ کہیں سے اسباب مہیا فرمادیتا تھا یہ نصرت غیبی دراصل تائید خداوندی تھی جو آپ کے دل کو اطمینان وسکون اور عزم ویقین سے بھر دیتی تھی۔ مادی وسائل پر نظر رکھنے والے منہ تکتے ہی رہ جاتے تھے اور عزم ویقین کا یہ پیکر آگے نکل جاتا تھا۔ حوادث ومصائب آپ کے ایمان میں اضافہ کا سبب بنتے تھے یہی وجہ ہے کہ آزمائشیں راہ میں آتیں تو وہ رکاوٹیں نہیں بنتی تھیں بلکہ مہمیز کا باعث بنتی تھیں۔ وہ آپ کو توڑتی نہیں بلکہ مضبوط کرتی تھیں۔

جنھیں عزم جواں ملتا ہے راہ زندگانی میں
مصائب راہِ منزل ان کو دکھلایا ہی کرتے ہیں

لگن ہو جن کے دل میں وہ پہنچ جاتے ہیں منزل تک
حوادث راستے میں دام پھیلایا ہی کرتے ہیں

زمانہ منقلب ہے انقلاب آیا ہی کرتے ہیں
اندھیرے راہ میں کچھ دیر کو چھایا ہی کرتے ہیں

موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کی دگرگوں ہوتی حالت، ذلت ونکبت کا پچھتّر سالہ دورانیہ، شریعت، شعائر اور عقیدۂ توحید کو لاحق خطرات، جان و مال، عزت و آبرو کی پامالیوں کی دلخراش داستان، سیکولرزم، جمہوریت اور نیشنلزم کی دیویوں کی قہرمانیوں اور مسلمانانِ ہند کے بے مایہ اور لاوارث اجتماعی لاشے کے تعفن نے ان کے اندر جس مرض کو جنم دیا اسے حدیث کی اصطلاح میں وھن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس وھن نے ان کے اندر ہمت وحوصلہ کی قوت دفاع کو ختم کر کے خوف، بزدلی، مایوسی اور دل شکستگی کو پروان چڑھایا ہے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی ہے اور اعتقادی، فکری ونظریاتی انحرافات کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ انھوں نے اسلام کے بجائے اس لادین سیکولر نظام کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اسی میں ان کو اپنی فلاح اور بہبود نظر آ رہی ہے۔ لہٰذا اس نظام بدی سے قربت اور مصالحت کے لیے حکمت ومصلحت کے نام پر ایسے ایسے قبیح دلائل گھڑے جا رہے ہیں جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے عملاً انھیں دور کر رہے ہیں۔ رواداری کے نام پر دین کی بالکل نئی نئی تاویلات پیش کی جا رہی ہیں۔ اس سیلاب بلاخیز میں عوام وخواص، جہلاء اور علماء یا تو بہے چلے جا رہے ہیں یا بے بسی وبے چارگی کے عالم میں خاموشی کی بکل مارے بیٹھے ہیں۔ امتِ مسلمہ کی اس زبوں حالی اور فکری ونظریاتی تنزلی پر آبا مسلسل اندوہ گیں اور مضطرب رہے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو دل بے قرار اور جذبۂ سیمابی بخشا تھا۔ اسی دل بے قرار اور جذبۂ سیمابی نے آپ کی زندگی کو امتِ مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی اور اس کے دفاع کے لیے سراپا تگ ودو اور جہاد مسلسل میں بدل ڈالا تھا، اللہ نے آپ کو علم کے ساتھ ذمہ داری کے شعور سے بھی بہرہ ور کیا تھا، لہٰذا آپ نے مسلمانانِ ہند کے اندر جو فکری، اعتقادی اور نظریاتی انحرافات پیدا ہو گئے تھے ان کی اصلاح کی پیہم کوشش کی۔ ان کا رشتہ الحاد ولادینیت سے کاٹ کر دین اسلام کی حقیقی بنیادوں سے جوڑنے کی کوشش کی اور اسلام کی نظریاتی سرحدوں کا پہرہ دیا۔ آپ ان ہستیوں میں سے تھے جنھیں

پیارے رسولؐ کی زبانی ''عدول'' کہا گیا ہے:

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين وتاويل الجاهلين۔ (بیہقی)

''آئندہ آنے والے ہر گروہ میں سے عدول لوگ (یعنی معتمد ثقہ لوگ) اس (کتاب وسنت کے) علم کو حاصل کریں گے (اور پھر) اس علم کے ذریعے غلو کرنے والوں کی تحریفوں کو مٹائیں گے، غلط کاروں کی غلطیوں کو رفع کریں گے اور (آیاتِ قرآنی واحادیث میں) جاہلوں کی تاویلوں کا رد کریں گے۔''

آپ اپنے وقت کے غزالیؒ بن گئے اور موجودہ زمانے کے فتنۂ باطنیت یعنی فتنۂ جمہوریت کی فکری بنیادوں پر ضرب لگائی اور دلائل اور براہین کی قوت سے جدید فلسفوں اور پروپیگنڈوں کے تناقضات کو عیاں کیا۔ ڈیموکریسی اور سیکولرزم کے اس رعب وطلسم کو توڑنے کی کوشش کی مسلمانوں کا دانشور طبقہ جس کا بری طرح اسیر ہو گیا ہے۔ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی فکری الجھنوں کو رفع کر کے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا اور علمائے وقت کی غلط کاریوں پر بھرپور گرفت کی۔ آپ نے امام ابن تیمیہؒ کا رول ادا کرتے ہوئے کبھی شرک وبدعت اور کفر وباطل کی تردید میں قلم چلایا تو کبھی جہاد کی تائید میں اپنے قلم کو تلوار بنایا، کبھی مسلمانوں میں روح جہاد پھونکتے ہوئے ان کے مردہ دلوں کو زندگی کی قوت سے بھر دیا تو کبھی خوف وڈر اور مایوسی ودل شکستگی کے مہیب اندھیروں کو زائل کرتے ہوئے انھیں اپنے دفاع پر آمادہ کیا اور کبھی مصلحت پرستی کے خولوں کو توڑتے ہوئے جبر وقہر کی قوتوں کو للکارا۔ امام ابنِ تیمیہؒ کے ہم عصر گواہی دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ کے لیے جاتے ہوئے ایسے ڈرتے تھے ''كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ'' مگر ابن تیمیہؒ نے ان میں جوش جہاد پروان چڑھا کر ان کی شجاعت کی سوئی روح کو بیدار کیا۔ اسی طرح آپ نے بھی مسلمانوں کے اندر عزم وہمت، غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اسی لیے آپ کو ہندوستان میں فقہ مزاحمت کے بانی ومبلغ کی حیثیت سے یاد کیا جا رہا ہے۔

آپ نے اپنے قلم سے ان آیاتِ قرآنی کا صحیح تناظر اور حقائق واشگاف کرنے کی کوشش کی جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے عام لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ نے قرآن وسنت میں کسی بھی قسم کی معنوی تحریفات کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور ہر معاملہ اور مسئلہ میں براہِ راست قرآن وسنت سے استشہاد واستنباط کر کے امت کو رجوع الی القرآن کی دعوت دی۔ بالکل یہی روشن نظیر شاہ ولی اللہؒ کے یاں ملتی ہے جسے انھوں نے رجوع الی القرآن کا نام دیا تھا۔ اسی طرح آپ نے شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودیؒ کی طرح جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت

کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور لوگوں کو احیائے اسلام، اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد پر بے چین کر دیا:

وہ اس صدی میں ملّت اسلام کے امام
وہ سرزمینِ ہند میں شمشیر بے نیام

بابری مسجد کی شہادت کا گہرا زخم تا زندگی آپ کے دل کا ناسور بنا رہا۔ بابری مسجد کی بازیابی کے سلسلہ میں آپ کا موقف بے لچک و دوٹوک تھا۔ آپ اپنی آخری سانس تک اس کی بازیابی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ آپ نے بابری مسجد کے مسئلہ میں مداہنت پر مبنی ہر موقف کی ڈٹ کر مخالفت کی، بابری مسجد سے دستبرداری کی ہر سوچ اور ترغیب دینے کی ہر کوشش پر کھل کر تنقید کی اور دلائل کی روشنی میں ثابت کیا کہ بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ہے۔ بابری مسجد کے تئیں امت کی بے حسی کو ختم کرنے اور اسے بازیابی کی جدوجہد پر ابھارنے کے لیے ''مساجداللہ'' نامی رسالہ تحریر کیا۔ آپ کی کوئی گفتگو بابری مسجد کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ مسلمان جو بابری مسجد کے سانحہ کے بعد بتدریج ہمت اور غیرت سے محروم ہونے لگے تھے آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ان کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ آپ کی بلند آواز جرس کارواں بن کر مسلمانوں کو ان کا راستہ دکھانے لگی، کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی ممنوعہ طلبہ تحریک نے آپ کی ایما پر ہی بابری مسجد کے مسئلہ کو اپنے اہداف میں شامل کیا تھا۔ بازیابی بابری مسجد تحریک کو زندگی آپ کے نفس گرم سے ملی۔ ہندوستان میں ۶ ردسمبر کو یومِ غم، یومِ تجدید عہد منانے کے سلسلہ کو باقی رکھنے اور اس مسئلہ کو زندہ رکھنے میں آپ کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ۹ رنومبر کے فیصلہ کو نہ ماننے کا آپ نے ببانگ دہل اعلان کیا۔ آپ کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ کعبۃ اللہ کی طرح بابری مسجد کی تطہیر بھی ضرور ہوگی، اور کوئی نہ کوئی صلاح الدین ضرور پیدا ہوگا جو بابری مسجد کو بازیاب کرے گا۔

پیدا کبھی ہوتی تھی سحر جس کی اذاں سے
اس بندۂ مومن کو اب میں لاؤں کہاں سے

آپ نے مختلف ممالک میں جماعت اسلامی سمیت غلبۂ اسلام کا نصب العین رکھنے والی اسلامی تحریکوں اور مزاحمتی تحریکوں کے نظریات اور عملیات کا گہرائی سے مطالعہ و تجزیہ کیا۔ نیز اخوان المسلمون کے نظریات اور کارکردگی کی تاریخ کا بھرپور خصوصی مطالعہ کیا۔ آپ جہاد کے بغیر غلبۂ اسلام کے خواب کو ''دیوانے کا خواب'' سے تعبیر کرتے تھے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ جب بھی اقامت دین اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہوگا قرآن وسنت کے

متعین کردہ راستہ سے ہی ہوگا۔ کسی اور دوسرے طریقے سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ دوسرے راستوں پر محنت کرنا محض وقت کا ضیاع ہے۔ پاکستان میں جماعت اسلامی کی الیکشنی پالیسی کے بےثمر اور فلاپ ہونے اور ماضی میں نجم الدین اربکان سے لےکر حال میں مصر میں مرسیؒ (اخوان) کے زوال تک کے تمام واقعات اس کا بین ثبوت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب افغانستان میں ۷ ستمبر ۲۰۲۱ء کو اسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا تو آپ کو ایسا لگا کہ جیسے اس مالی کی خواہش برآئی ہو جس نے ایک سنگلاخ اور شوریدہ زمین میں لہلہاتے ہوئے چمن کا خواب دیکھا تھا اور اس کسان کی محنت رنگ لائی ہو جس نے کڑی دھوپ میں سخت مشقت کرکے ہل چلایا تھا، بیج بویا تھا، راتوں کی نیند قربان کرکے کھیتی کو سینچا تھا اور اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ پکی کھیتی کو کٹتا ہوا دیکھ لے۔ آپ نے جب اپنے اس نظریہ کی کامیابی کی ایک جھلک افغانستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو آپ نے اس موقع پر ایک کھلا خط لکھا جس میں آپ نے اپنی اس فکر کا کھل کر اظہار کیا۔ آپ نے لکھا کہ

''۷ ستمبر کو بالآخر امارت اسلامیہ افغانستان کی اسلامی حکومت کا اعلان ہوگیا جب کہ عام دنیا میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی اسلامی حکومت قائم ہو یہ کسی طرح سے ممکن نہیں۔ جب کہ ان تصورات وخیالات کے برعکس درحقیقت پہاڑوں کے بیچ آج مسلح اسلامی حکومت کا قیام ہوگیا ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام وہ بھی مسلح طریقہ پر ایک ساتھ ہونا دوانہونی بات کا ہونا ہے۔

اب تک بیرونی دنیا میں اسلامی حکومت کا نام زبان پر لاتے ہوئے ڈر لگتا تھا ابھی کتنے دن کی بات ہے کہ اسلامی حکومت کو موضوع گفتگو بنانے سے بڑے بڑے سورماؤں کے دل کانپتے تھے۔ سب سے پہلے مودودی صاحبؒ کی شخصیت ہے جنھوں نے اسلامی حکومت بنانے کا تصور اور نظریہ منظر عام پر لایا تھا لیکن وہ بھی طریقہ بتانے سے قاصر رہے کہ اسلامی حکومت قائم ہوگی تو مسلح جہاد سے ہی قائم ہوگی اور اس کے پیچھے مسلح کوشش ہی کام آئے گی، یہ لکھنے کی ہمت ان کو بھی نہیں ہوئی جب کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلابات ہوئے ہیں اور آئندہ جتنے بھی ہوں گے وہ سب مسلح ہی ہوں گے۔''

اسلامی امارت کا قیام آپ کے اس نظریہ کی موجودہ دور میں کامیابی کی ایک روشن مثال ہے۔ آپ نے اپنی شدید علالت کے دوران ایک خواب دیکھا تھا جس میں دادا آپ کو اپنے پاس بلا رہے ہیں لیکن آپ دادا کے پاس جانے سے یہ کہتے ہوئے انکار کرتے ہیں کہ میں اس وقت تک موت کو قبول نہیں کروں گا جب تک کہ افغانستان میں امریکہ کو ذلیل وخوار اور افغانیوں کو فتح مند ہوتا ہوا نہ دیکھ لوں۔ صد شکر کہ یہ مبارک منظر آپ کی آنکھوں کو نصیب ہوا۔ اور آپ نے اس اطمینان کے ساتھ رخت سفر باندھا کہ آپ اپنے نظریہ کی سچائی اور

حقانیت میں صحیح تھے:

سحر کی پہلی کرن کے ظہور کرنے تک
تمام رات اندھیروں سے جاں لڑا کے چلے

علالت کی حالت میں آپ کا صبر وشکر، کام کی لگن اور امت کی فکر ہمارے لیے لائق تقلید نمونہ ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کے آتے ہی دین کا کام چھوڑ دیا جاتا ہے اور زندگی کے اصل مقصد سے ہٹ کر صرف علاج کو مقصود بنا لیا جاتا ہے لیکن ابا کے یاں اصل فکر دین کے کام کی تھی۔ آپ کی عمر کے آخری چھ ماہ جس میں آپ کے اکثر ایام دنیا و مافیہا سے بے خبر گزرے لیکن جب بھی آپ کی طبیعت کسی قدر بحال ہوتی آپ عالم اسلام اور ملک کے حالات کے تئیں فکر مند ہوتے۔ مختلف ہم خیال اصحاب کو فون لگواتے اور اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے اور انھیں کچھ کرنے پر ابھارتے۔

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا
گرچہ تھا تیرا تن خاکی نزار و درد مند
تھی ستاروں کی طرح روشن تری طبع بلند
موت کی لیکن دل دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

ان دنوں ملک میں جو بڑے واقعات پیش آئے سب پر اپنا بیان تحریر کروایا۔ مسئلہ حجاب پر، حجاب کے تعلق سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے رویہ پر، مسئلہ گیان واپی مسجد پر، گستاخئ رسول کے واقعات پر اور احمد آباد کیس کے فیصلہ پر۔ ملک کے حالات کے پس منظر میں ۲ رمئی ۲۰۲۲ء کو عید الفطر کا پیغام بھی تحریر کروایا۔ جس میں آپ نے لکھا:

''آج ہندوستان میں مسلمان اپنے دین اور جان و مال کے تحفظ اور بقا کی سخت آزمائشوں ومصائب کا شکار ہیں۔ اور باطل پرستوں اور فسطائی حکومت دونوں کے نشانوں کی زد پر ہیں۔ ملک کے ہر گوشے میں مسلمان ان کے ظلم وستم سے پریشان ہیں۔ خصوصاً آسام، دہلی، مدھیہ پردیش، کرناٹک اور راجستھان کے مسلمان حالیہ فسادات میں جان و املاک کے نقصان وزیاں اور بے جا ہراسانی وگرفتاریوں سے جوجھ رہے ہیں۔ کئی بستیاں بلڈوزر چلا کر اجاڑ دی گئی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں سینکڑوں مسلمان دربدری کی زندگی گزارنے پر

مجبور ہیں۔ اذان اور حجاب پر پابندی کی وجہ سے مسلمان اذیت کا شکار ہیں۔ ملک کی مختلف جیلوں میں سینکڑوں مسلم نوجوان قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرر ہے ہیں۔ ان حالات میں عید سعید کا استقبال کرتے ہوئے دل انتہائی رنجیدہ ہیں...... ہندوستان کے ان موجودہ حالات کے پیش نظر اس موقع پر مسلمانان ہند کے نام میرا پیغام ہے کہ ہر مسلمان اپنے دین وشعائر اور اپنی جان ومال، عزت وآبرو کے دفاع کے لئے ہر ممکن سامان تیار رکھے اور بزدلی اور کم ہمتی کے بجائے ہمت اور حوصلہ سے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم کرے...... دین کے معاملہ میں ذرا برابر بھی کمپرومائز نہ کریں اور نہ چھوٹی سی چھوٹی چیز سے بھی دستبرداری گوارا کریں بلکہ ہندوستان میں اسلام کا جو بچا کھچا سرمایہ ہے اس کی حفاظت کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں ورنہ حالات بتا رہے ہیں کہ اگر ہم نے استقامت، عزیمت اور مقابلہ کی راہ اختیار نہ کی تو اس ملک میں دعوت وتبلیغ اور نماز پڑھنے کی اجازت تو کجا سر چھپانے کی جگہ بھی نہ مل سکے گی۔''

الفاظ ہیں سادہ تو معانی ہیں کشادہ
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی مرد خدا ہے

احمدآباد کیس میں ۳۸ر افراد کی سزائے موت کے فیصلے پر اسی دن یعنی ۱۸ر فروری ۲۰۲۲ء کو اپنے کھلے خط میں لکھا:

''آج ۱۸ر فروری ۲۰۲۲ء کا دن ہمارے لئے ایک بہت ہی افسردہ اور غمگین دن رہا ہے۔ تقریباً 14 سال بعد نچلی عدالت سے گجرات سیریل بلاسٹ کا فیصلہ آیا ہے جو ہمارے حق میں نہیں ہے اور شاید ہندوستان کی تاریخ کا یہ پہلا فیصلہ ہے جس میں اتنی بڑی تعداد کو سزائے موت سنائی گئی ہے۔ یہ فیصلہ اپنے آپ میں بہت سے سوالات کھڑے کر رہا ہے کیونکہ اس میں سے اکثر نوجوان سیریل بلاسٹ سے کئی ماہ پہلے ہی سے جیل میں تھے اور یہ واضح ہے کہ انھیں زبردستی اس کیس میں ماخوذ کیا گیا اور اب انھیں بھی سزائے موت سنائی گئی ہے۔ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں!!

ہندوستان میں 2008ء کے آس پاس بم دھماکوں کے کئی واقعات پیش آئے مثلاً مالیگاؤں بم بلاسٹ 2006ء جس میں 40 مسلمانوں کی جانیں گئیں اور 125 زخمی ہوئے اسی طرح مکہ مسجد بم بلاسٹ 2007ء جس میں 16 مسلمان شہید اور 100 سے زائد زخمی ہوئے ان تمام دھماکوں کے ملزمین آج کھلے عام گھوم رہے ہیں اور کسی کو سزا نہیں ہوئی۔ لیکن گجرات بم بلاسٹ کیس میں اتنی بڑی تعداد کو سزائے موت اور تاحیات قید کی سزاؤں کا سنایا جانا مسلم دشمنی کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔

آج جبکہ ہم سبھی کے دل بے حد غمزدہ ہیں میں اپنے تمام باحوصلہ اسیر بیٹوں اوران کے افرادخاندان کوصبر کی تلقین کرتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ میں دکھ کی اس گھڑی میں آپ کے ساتھ ہوں لیکن میرا دکھ آپ کے دکھ سے سوا ہے کہ ہم نے آپ کوظلم و نا انصافی کی اس جنگ میں تنہا چھوڑ دیا اور آپ کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم کے خلاف اس طرح سے ڈٹ کر کھڑے نہ ہو سکے جس طرح کھڑا ہونا چاہئے تھا، جس کیلئے میں آپ تمام سے معافی کا طلبگار ہوں۔

انشاءاللہ آپ کی یہ قربانیاں اللہ ہرگز رائیگاں نہیں کرے گا "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ"...

ظلم وستم کی یہ شب دیجور اگرچہ طویل ہے لیکن یہ طئے ہے کہ ہر شب کی سحر ہوتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس شب کی بھی سحر ہوگی اور ہندوستانی مسلمان ضرور اس صبح نو کا نظارہ کریں گے جس کا خواب آپ نے دیکھ رکھا ہے۔"

اٹھائے گی جنھیں تاریخ مستقبل کی راہوں سے
ہماری خاک پا ان قافلوں کی رہنما ہوگی

اپنی شدید علالت کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے تئیں یہ فکرمندی دراصل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ وفاداری اور سچی محبت کے باعث تھی۔ اس محبت و وفاداری کا تقاضہ وہ اس عمر میں بھی پورا کرتے رہے جب انسان کوخود اپنا ہوش بھی نہیں رہتا۔ اس محبت و وفاداری نے انھیں اس مقام تک پہنچادیا تھا کہ تکلیف اور مرض الموت میں بھی اللہ کی محبت اور معرفت کے مزے لیں اور صبر اور شکر سے ملنے والی راحت سے لطف اندوز ہوں، اللہ نے آپ کی اس دعا کی لاج رکھ لی۔

اللّٰھم اجعل خیر عمری اٰخرہ، وخیر عملی خواتیمہ، وخیر أیامی یوم القاک فیہ۔

ترجمہ: "اے میرے پروردگار! میری عمر کا بہترین حصہ اس کے آخری پہر کو بنائیے اور میرے آخری اعمال کو بہترین بنائیے اور میری زندگی کے دنوں میں سب سے اچھا اور بہتر دن وہ بنائیے جس دن میں آپ سے ملاقات کروں۔"

کہ:

غم حیات، غم آرزو، غم ملت
تمام عمر کے افکار لے کے آیا ہوں

آپ نوّے سال کی عمر میں ایک طویل اور کڑا وقت گزار کے، اپنا فرض منصبی ادا کر کے بالآخر اپنے رب کے حضور ملاقات کے لیے جا پہنچے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اے اللہ ہم آپ کے اس فیصلہ سے راضی ہیں۔

جب آپ کی بامقصد اور بامعنی زندگی اختتام کو پہنچی تو اسلام پسند نوجوانوں کو لگا جیسے وہ ایک مضبوط سایہ سے محروم ہو کر کڑی دھوپ میں آ کھڑے ہوئے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا:

''باحوصلہ، بلند ہمت، عزیمت کا راہی، مداہنت و بزدلی کی چادر کو چاک کرنے والا، امت کے نوجوانوں میں عزم و حوصلہ پیدا کر کے انھیں ہمت، عزیمت اور شجاعت کا درس دینے والا، مایوسی کے حالات میں اپنی بے باک تحاریر سے امت کے نوجوانوں میں امید کی کرن پیدا کرنے والا بھی اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔''

(سید کاشف)

''تحریک اسلامی کے بزرگ رہنما، بے باک انسان، مردِ مجاہد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔'' (عدنان اظہر، محمد انس فلاحی)

''اس بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کا حوصلہ...... نہ رہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون'' (عابد عارف)

وہ خدا کے نیک بندے جو بچھڑ گئے ہیں ہم سے
کوئی ان کو جا کے ڈھونڈے کوئی ان کو جا کے لائے!!

آپ سے عقیدت و محبت کا رشتہ رکھنے والے لاکھوں دل آج ہمارے ساتھ غمزدہ ہیں۔ یقیناً ایسی مقبولیت و محبوبیت ان خوش نصیبوں ہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے پیش نظر اللہ کی رضا کے علاوہ کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان کی حیات فانی حیاتِ جاودانی بن جاتی ہے۔

''دنیا انھیں نگاہوں سے اوجھل پاتی ہے
اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں
ہمارے دکھ سکھ میں ہمارے شریک ہیں
ہماری آزمائشوں میں ہمارے شانہ بشانہ ہیں
وہ ہم سے پہلے جیلوں میں پہنچتے ہیں

ہماری راہوں کے کتنے کانٹے انھوں نے پہلے ہی سے چن لیے ہوتے ہیں

کوئی تیر ایسا نہیں ہوتا، جسے انھوں نے اپنے سینے پر روکا نہیں ہوتا

ان کی زندگی بھر کا کام ہمیں زندگی بھر یاد دلاتا ہے

کہ زندگی اسے کہتے ہیں

پس جو ایسی پیاری بات سمجھاتے ہیں

وہ جو اپنا فرض یوں نبھاتے ہیں

وہ جو یادوں میں بس جاتے ہیں

......کب جاتے ہیں!!''

اللہ پاک! اَبّا کی تمام عمر کی ریاضتوں کو قبول فرمایئے ان سے راضی ہوجایئے، ان کے درجات بلند کیجیے اور ہیشگی کی جنتوں میں بہترین جگہ عطا فرمایئے۔ ہمیں بھی اس قابل بنایئے کہ ہم اَبّا کے ساتھ جنت کے ان باغوں میں رہیں جہاں ملنے کے بعد پھر بچھڑنا نہیں ہوگا۔ آمین!

بڑے اَبّا
جنھوں نے مجھے زندگی اور زندگی کا حوصلہ دیا

اُمّ سلمیٰ اعظمی
بنت عبداللہ مرحوم، لکھنؤ

آج سے تیس، بتیس سال پہلے کی بات ہے جب میری زندگی کی کشتی طوفانوں سے ٹکراتی ہوئی حیدرآباد پہنچی اور محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بڑے ابا) کی آغوش میں پناہ حاصل کی تو گویا مجھے امن وسکون اور یکسوئی کی منزل نصیب ہوگئی۔ واقعہ یہ ہے کہ والد محترم جناب عبداللہ صاحب ایمان کی دولت سے سرفراز ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی وفات پا گئے۔ جس کے بعد خاندان کے دیگر افراد منتشر ہوگئے، بس میں اور مجھ سے چھوٹا بھائی محمد عمران (میری عمر چودہ پندرہ سال اور عمران کی عمر بارہ تیرہ سال رہی ہوگی) اپنے دینِ اسلام کے سہارے بلکہ ایمان ہی کی حفاظت کی خاطر جامعۃ الفلاح سے دہلی، مالیگاؤں اور پھر حیدرآباد پہنچ گئے۔ اس دوران کن کن لوگوں کے احسانات ہمارے اوپر تھے اس وقت تو نہیں معلوم تھا مگر بہت سارے محسن تھے۔ جب معلوم ہوا تو ان میں سے زیادہ تر لوگ مالک حقیقی کے حضور پہنچ چکے تھے۔

حیدرآباد میں مولانا کی سرپرستی میسر آئی اور مدرسہ جامعۃ البنات میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند دن گھر میں قیام کرنے کے بعد جب مجھ سے کہا گیا کہ اب تم کو ہاسٹل میں رہنا ہے تو میں بضد ہوگئی اور ہاسٹل جانے سے انکار کردیا۔ مولانا نے اپنی اہلیہ کو حکم دیا کہ ''جانے دو، ام سلمیٰ نہیں جارہی ہے تو اسے یہیں رہنے دو۔'' اور پھر میں نے زندگی کے مکمل آٹھ سال اس طرح گزارے کہ مجھے کبھی یتیم ہونے کا احساس بھی نہ ہوا۔ بڑی امی نے وہ محبت عطا کی اور وہ سلوک کیا کہ میں اُن کی پانچ بیٹیوں کی طرح ایک بیٹی بن کر رہی۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور برتاؤ میں بھی کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔ اس طرح مولانا اور مولانا کے تمام اہل خانہ نے مجھے زندگی، عزت، رتبہ و

مقام اور ہمت وحوصلہ عطا کیا کہ میں آج کسی لائق ہوسکی۔ اُن کے معاون جو لوگ بھی رہے ہوں مگر مجھے تو مولانا ہی کے گھر میں رہنے اور اپنی فضیلت اور بی اے تک کی تعلیم کا مرحلہ مکمل کرنے کا موقع ملا۔ اُن کی باتیں، اُن کی آواز، ان کا انداز، ان کی خوشی اور ان کی ناراضگی، اُن کے پڑھانے اور تربیت کرنے کا انداز، سب اس طرح یاد آرہے ہیں جیسے ایک بیٹی کو اپنے والد کے تمام طور طریقے یاد آتے ہیں۔ اور جیسے کیا وہ حقیقت میں ہمارے والد مرحوم کا نعم البدل تھے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے یا اُن کے گھر کے کسی بھی فرد نے مجھے اپنے گھر میں نہ رہنے دیا ہوتا تو معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا!

تعلیم مکمل ہونے کے بعد میرے نکاح کے لیے اسی طرح فکر مند رہے جس طرح ایک باپ اپنی بیٹی کے لیے ہوتا ہے۔ شادی کے بعد جب کبھی حیدرآباد جانا ہوتا بڑی محبت سے پیش آتے۔ بڑی امی مجھے ڈھیر سارے تحفے تحائف دیتیں، بچوں سے بڑی محبت کرتے اور اُن کی تعلیم وتربیت پر توجہ دلاتے۔ الحمدللہ تقریباً چوبیس سال کا عرصہ ہونے کو ہے۔ ہماری زندگی کی کشتی بخیر وعافیت رواں دواں ہے۔ یہ بڑے ابّا کی تربیت اور دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہوکر دین اسلام کی اقامت کے لئے بھی کچھ خدمت کرنے کی توفیق حاصل ہے۔

بڑے ابا جماعت اسلامی ہند کے رکن تھے۔ جامعہ دارالہدیٰ پہاڑی شریف کے استاذ تھے اور جامعۃ البنات کے بانی وناظم بھی۔ وہ جفاکش، سرگرم اور ہمہ وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ اپنی اس محنت، دیانت، فرض شناسی اور ہر ایک سے محبت کی بدولت مقبول خاص وعام تھے۔ صوم وصلوۃ کے انتہائی پابند، گھر میں اسلامی و مشرقی تہذیب کی مکمل پاسداری، ہم لوگوں کے پردے کا اہتمام اور تمام مہمانوں کی ضیافت اُن کی شناخت تھی۔ جامعہ میں ہوں کہ گھر پر، ہمہ وقت مہمانوں کی آمدورفت رہتی اور مولانا خاطر مدارات کا اہتمام کئے بغیر کبھی رخصت نہ کرتے۔ اُن کا اخلاص، دین داری اور اسلام سے محبت قابلِ رشک تھی۔ چہرہ نورانی، گفتگو کا اسلوب دلچسپ، نشست وبرخاست کا مخصوص انداز تھا۔ طبیعت میں مزاح بھی تھا مگر سنجیدہ وشگفتہ۔ خودداری، عزیمت اور بہادری تو اُن کی زندگی کی نمایاں ترین صفات میں سے تھیں۔ صبر واستقامت کی ایسی روشن مثال قائم کی کہ وہ تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اس پر ہم جیسے لوگوں کو کیا لکھنا ہے اور کیا کہنا۔ دوسرے افراد یقیناً لکھیں گے۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ صبر واستقامت اور ایثار وقربانی شعوری اور اختیاری تھی ورنہ قربانی کے مراحل سے بہت سے لوگوں کو گزرنا پڑتا ہے اور گزرے بھی۔ مگر ان میں زیادہ تر لوگ مجبوری میں گزرتے ہیں۔ بڑے ابا کی ایمانی حمیت تھی کہ وہ ثابت قدم رہے اور کبھی کسی لمحہ بھی باطل طاقتوں کے سامنے جھکنے کا گمان تک نہ کیا۔ اُن کی عزیمت ایسی تھی کہ اچھے اچھے بہادروں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر آپ اپنے فیصلے اور اپنی راہ پر اٹل رہے۔

اُن کی زندگی کے بہت سارے روشن پہلو ہیں جن کو مجھ سے بہتر دوسرے لوگ لکھیں گے، میرے تو یہ جذبات ہیں کہ بڑے ابا جیسے لوگوں کا ملنا اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ بڑے ابا کی مغفرت فرمائے۔ اُن کے درجات کو بلند کرے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اُن کی خطاؤں سے درگزر کرے اور ہم تمام پسماندگان کو ان کی دی ہوئی تعلیم اورنقشِ راہ پر چلنے کی طاقت وہمت ارزانی کرے۔

بالخصوص بڑی امی کو صحت وعافیت عطا کرے کہ اب وہ تنہا ہم سب کی سرپرست ہیں۔ ان کا وجود ہمارے لئے سایۂ رحمت ہے۔ (آمین)

فرشتوں کی کتابوں میں چمن کی آبرو ٹھہرے

صبیحہ ندی
بنت ندا احمد مرحوم، بھیونڈی

نفسِ مُطمَئِنَّہ

دراصل دنیا ایک سرائے خانہ ہے اور انسان مسافر، خوش قسمت ہے وہ انسان جو یہاں مسافروں کی طرح زندگی گزارے۔ یہ دنیا تو ہر مسافر کا دامن دل کھینچتی ہے سب کا دل لبھاتی ہے مگر سمجھدار مسافر اپنا دامن بچا لے جاتا ہے اور اس دنیائے فانی کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے کیونکہ اس کی نظر منزل پر ہوتی ہے، راہ کی دلفریبیاں اسے اسیر نہیں کر پاتیں۔ منزل کا تعین اور منزل پر پہنچنے کا یقین اس کو راہِ راست سے ایک لمحہ کو بھی ہٹنے نہیں دیتا۔ منزل نظروں سے کبھی اوجھل ہوتی ہی نہیں۔ ایسا ہی راہِ حق کا ایک مسافر ۲۷؍ستمبر ۲۰۲۲ء کو اس دنیائے فانی سے اللہ کے دربار میں حاضر ہو گیا جس کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ یہ ہمارے پھوپھا اور استاذِ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ہیں جن کی ذات یقیناً ایک نفس مطمئنہ تھی ہم نے آپ کے چہرے پر ایک ایسی روشنی دیکھی ہے جو مطمئن دلوں سے پھوٹتی ہے، جن کی زندگی میں ہم نے ہمیشہ یک رنگی دیکھی جن کا ظاہر، باطن، غصہ، رضا، تنہائی، مجلس سب یک رنگ تھے۔ ہم گواہ ہیں کہ مولانا نے دنیا سے بے رغبت زندگی گزاری جن کی زندگی کا حاصل صرف رب کریم کو راضی کرنا اور اس کے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا تھا۔

ہمارے استاذِ عظیم کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جس کا ورق ورق ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا آپ کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے ہمارے استاذ کی ایک ایک ادا دل پر نقش ہے اور ان شاء اللہ یہ نقش دوام ہوگا، کچھ نقوش آپ کی نذر ہیں۔

نقش اول: دنیا سے بے رغبتی

مولانا کو ہم نے اس حدیث کا مصداق پایا کہ ”کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل “مولانا نے اس دنیا کو سرائے فانی ہی سمجھا اور ہم جیسوں کے لیے جن کا دل دنیا میں لگا رہتا ہے ایک مثال چھوڑی۔ آپ کا لباس بھی مسافروں جیسا تھا اور آپ کی غذا بھی، اتنی احتیاط تھی آپ کی زندگی میں کہ اگر کبھی دسترخوان پر دو سالن ہوتے تو فوراً گرفت فرماتے اور اس میں سے ایک ہی سالن تناول فرماتے اور کہتے کہ ”اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔“ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے آپ کی آنکھیں نم ہو جایا کرتی تھیں اس درجہ احتیاط، تقویٰ کی یہ کیفیت میں نے صرف استاذ محترم میں ہی دیکھی ہے چونکہ میری تعلیم مولانا کی سرپرستی میں ہوئی اس لیے مجھے مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور خوب استفادہ کا بھی۔ کیونکہ مولانا صرف میرے استاد و محسن ہی نہیں بلکہ میرے پھوپھا بھی تھے میری تعلیم و تربیت اپنی پھوپھی کے گھر پھوپھا کی سرپرستی میں مکمل ہوئی ہے۔

نقش ثانی: اخلاص

ہمارے مولانا اخلاص کے پیکر تھے تمام امور کی ادائیگی اخلاص سے کرتے تھے طالبات کو بھی ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ جو بھی کام کرو اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ مولانا خود بھی ہمیشہ دنیوی نفع و نقصان سے بے نیاز رہے اور طالبات کو بھی یہی سبق پڑھایا کہ اللہ کے احکام کی ادائیگی میں کبھی یہ مت دیکھو کہ اس کے ادا کرنے سے ہمیں دنیا میں کیا فائدہ ہوگا۔ اسلام پر عمل کرنے میں اگر کچھ دنیوی نقصان اٹھانا پڑے تو اس کو اللہ کے لیے برداشت کرو ایسا ہر کام جو اسلام میں منع ہے اس میں خواہ بظاہر کتنا ہی فائدہ ہو اس کے قریب نہ جاؤ۔ مولانا کہتے تھے دنیا کا نقصان کوئی نقصان نہیں ہے، دین کا نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں ایسی بات بھی نہیں کرنی چاہیے جو اسلامی احکامات کے خلاف ہو۔ مولانا کی پوری زندگی حق لکھنے، حق بولنے اور حق کی راہ میں قربانیوں سے عبارت ہے۔ اس اعلیٰ درجہ کا اخلاص کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہوگا۔

نقش ثالث: ایثار و قربانی

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی زندہ تصویر تھے۔ مولانا کو دیکھ کر اس آیت کا مطلب ہمیں سمجھ میں آیا۔ مولانا حقیقی معنوں میں صرف اللہ واحد کے فرمانبردار تھے ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف اسی کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ زندگی کے تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے۔ ”قانون صرف اللہ کا ہے۔“ یہ مولانا ہی سے ہم نے سیکھا، دورانِ تعلیم ہم نے دیکھا کہ کوئی دینی مسئلہ درپیش ہوا اور اس

میں تمام لوگوں کی رائیں مختلف ہوئیں مگر مولانا کی رائے ان علماء سے مختلف بالکل کتاب وسنت سے ماخوذ اور کتاب وسنت کی بنیاد پر ہوتی۔ مثال کے طور پر بابری مسجد سے دستبرداری کا مسئلہ ہو یا طالبان کا افغانستان میں مجسموں کی مسماری کا مسئلہ ہو، مولانا کی رائے بالکل مختلف تھی جب لوگ طالبان کو مجسموں کے توڑنے پر لعنت ملامت کررہے تھے عین اسی وقت مولانا شرک کے سب سے بڑے مرکز میں بیٹھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں طالبان کے اقدام کو درست وقابلِ تحسین قرار دے رہے تھے یہ حق گوئی کی جرأت، یہ راہِ حق میں استقامت، مولانا کا وہ امتیازی نشان ہے جو انہیں اس دور کے علماء میں ممتاز کرتا ہے۔ جب لوگ اپنی عقلوں کے گھوڑے دوڑاتے مولانا کتاب وسنت کے حوالے دے کر انہیں وہیں خاموش کروادیا کرتے تھے۔

مولانا ہمیں سکھایا کرتے تھے کہ ''دیکھو جی! تم لوگوں کو صرف خدا کا بندہ بننا ہے جو لوگوں کا بندہ بن جاتا ہے وہ خدا کا بندہ نہیں بن پاتا'' اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا یہ مولانا کی زندگی کا مقصد تھا۔ اللہ کی رضا کے لیے مولانا کی قربانیوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ مولانا نے اللہ کے لیے گھر بار چھوڑا، اپنے وطن سے دور اللہ کے دین کی سربلندی کا جذبہ لیے قریہ قریہ بستی بستی علم دین کا چراغ روشن کرتے رہے اور بالآخر اپنے خلوص اور محنت سے علم کا وہ شجر لگایا جسے دنیا آج جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے جانتی ہے۔ یہ مدرسہ بھی مولانا کی قربانیوں کا امین ہے، مولانا کی قربانیوں کی بدولت ہی آج ہم طالبات زیورِ علم سے آراستہ اور راہِ حق پر گامزن ہیں، یہ مولانا کا فیضان نظر ہے کہ آج دنیا بھر میں مولانا کی طالبات حق کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ مولانا کی ایثار وقربانی کا روشن باب وہ ہے جب ہم نے دیکھا کہ مولانا کا جواں سال فرزند راہِ خدا میں شہید ہوگیا۔ مولانا نے اس موقع پر جس استقامت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ مولانا نے اس زمانے میں اپنے بیٹے کی شہادت پیش کی جس میں شہادت جیسی اصطلاحات سے لوگوں کے کان نامانوس تھے۔ مجاہد کی شہادت کے ذریعہ اس سنت کو زندہ کیا جو عرصہ ہوئے مٹ چکی تھی۔ اس شہادت پر اپنے صبر کے ذریعہ ایثار وقربانی کی تاریخ میں اس روشن باب کا اضافہ کیا جس کا سرا حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہاالسّلام سے جاملتا ہے۔

مولانا کی ایثار وقربانی کے اور بہت سے باب ہیں جنھیں بیان کرنے کی میرے قلم میں تاب نہیں ہے، مولانا سے قریبی تعلق رکھنے والے دوست واحباب، طلبہ وطالبات جانتے ہیں کہ مولانا نے راہِ حق کا انتخاب کرنے کے بعد کبھی قربانیوں سے گریز نہیں کیا۔ بھارت میں راہِ حق کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں ہے بسا اوقات اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑتا محسوس ہوتا ہے، لیکن مولانا نے بڑے صبر وتحمل سے تمام حالات کا مقابلہ کیا ہے اور مشکلات و مصائب کو انگیز کیا ہے۔ مولانا کی پوری زندگی ایثار وقربانی کا ایسا حسین مرقع ہے جو ہم طالبات کے لیے مہمیز کا

کام کرے گا اور مولانا کے مشن اور فکر کو جاری رکھنے میں ہمارے لیے زادِ راہ ہوگا۔ ان شاء اللہ!

عجب اک شان سے دربارِ حق میں سرخرو ٹھہرے
جو دنیا کے کٹہروں میں عدو کے رو برو ٹھہرے

اڑا کر لے گئی جنت کی خوشبو جن کو گلشن سے
انھی پھولوں کا مسکن کیوں نہ دل کی آرزو ٹھہرے

جو جنگ گاہوں میں رات و دن ستم کے دوبدو ٹھہرے
فرشتوں کی کتابوں میں چمن کی آبرو ٹھہرے

وہ دے گیا ہے خبر سحر کی، اندھیرا باطل کا دور ہوگا

ڈاکٹر عریشہ تنظیم
بنت مولانا اوصاف احمد فلاحی
معلمہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، حیدرآباد

تاریخ انسانی کی بعض شخصیات اتنی جامع اور ہمہ گیر ہوتی ہیں کہ اپنے آپ میں ایک تحریک ہوتی ہیں، اپنی سیرت و کردار کے ایسے گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے سمت سفر متعین کرنے میں ان کے نقشِ پا ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت کا فیض عام ہوتا ہے، ان کے دامن سے وابستہ ہونا گویا منزلِ مراد کو پہنچ جانا ہوتا ہے۔ یہ شخصیات حق کی طرف سے ایک نعمت بے بہا ہوتی ہیں، جن سے صرف ان کے زمانے کے لوگ ہی نہیں بلکہ ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت جدِّ محترم، استاذی مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ہے۔ جو میرے والدین کے عزیز خالو اور میرے سرپرست، مربی اور عزیز از جان نانا تھے۔ میں نے نانا اور نانی کی آغوشِ تربیت میں ابتدائی تعلیم سے لے کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا محترم نے 1934ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک زمین دار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ یہ وقت تھا کہ خلافت کے خاتمہ کے حادثۂ جانکاہ کو دس سال گزر چکے تھے اور ہندوستان میں بھی اس سانحہ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی، مسلمانوں کی علمی و سماجی حالت انتہائی ابتر تھی۔ مغرب کی ذہنی غلامی وَبا کی طرح پھیل رہی تھی، دین سے بیزاری ترقی کی علامت قرار پا رہی تھی، ایسے پُرآشوب حالات میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے باشعور والد محترم اپنے ہونہار نورِ نظر کی تعلیم و تربیت کے لیے انتہائی فکرمند تھے کہ بچپن ہی سے بچے میں بڑائی کے وہ آثار ہویدا تھے جو کسی انقلابی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ ع

تری عظمت پہ شاہد تھی تری پُرنور پیشانی

بزرگ کی پیشین گوئی

مولانا کی پیدائش جس قریہ میں ہوئی وہ ٹونس ندی کے کنارے آباد ہے۔ ندی کے کنارے آباد لوگوں کو آمدورفت میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہر ضرورت کے لیے کشتی میں بیٹھ کر ندی پار کرنا گویا ایک مشق ستم ہے مگر کچھ مخصوص لوگوں کے لیے یہی مشق ستم مکتبِ عشق میں داخلہ کا ایک عنوان بن جاتی ہے۔ یہ مشق ان لوگوں سے کرائی جاتی ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کو کوئی بہت بڑا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دریائیں، یہ ندیاں شخصیات کی سیرت وکردار کی تعمیر میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں، تعمیری انقلاب کا سبب بنتی ہیں اور رب تعالیٰ اور پسندیدہ ہستیوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرتی ہیں۔ بے چین طبیعتوں کے لیے تسکین کا سامان کرتی ہیں۔

قصہ فرعون وموسیٰ علیہ السلام ہو کہ قصۂ یونس علیہ السلام وحوت، ملاقات خضر وموسیٰ علیہ السلام ہو کہ معصوم ننھے موسیٰؑ کا تابوت اور فرعون کے محل کے قریب سے گزرنے والی ندی ہو یا حضرت نوح علیہ السلام کا 900 سال دعوت دینے کے بعد آخر کار رجحت پوری ہونے کے بعد کشتی میں سوار ہو کر نجات پانا ہو یا موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرا کے نجات دلانا ہو، ظالم فرعون کا دریا میں غرق ہونا ہو یا ہجرت کے پہلے قافلہ کا کشتی میں سوار ہو کر حبشہ کو روانہ ہونا ہو یا سعد بن ابی وقاصؓ کا دریا میں گھوڑا ڈال کر قصر ابیض کو فتح کرنا ہو یا طارقؒ بن زیاد کا اندلس کے ساحل پر کشتیاں جلا کر فتح اندلس کی بنا ڈالنی ہو، کتنی مطابقت ہے اولوالعزم پیغمبروں، اللہ کے نیک بندوں اور ندیوں، دریاؤں اور کشتیوں میں۔ یہ دریائیں، یہ ندیاں، یہ کشتیاں کتنا قدیم تاریخی پس منظر اور کردار رکھتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کشتی میں سوار ایک ننھا، معصوم، سرخ وسپید، خوبصورت بچہ مکتب جانے کی تگ ودو میں مصروف ندی سے اچھلنے والے پانی سے اپنا بستہ، تختی اور دوات جسے اس نے اپنے تخلیقی ذہن سے ایک رسی سے باندھ کر اپنی تختی سے لٹکا دیا تھا، اپنے اس سامانِ زیست کو بچانے کی فکر میں ہلکان ندی پار کر کے جلد سے جلد مکتب پہنچنا چاہتا ہے اور اسے یہ فکر لاحق ہے کہ کہیں ندی سے اچھلنے والا پانی اس کی لکھی ہوئی تختی پر سیاہی پھیر کر اس کی محنت اکارت نہ کر دے۔ ایک بزرگ یہ ماجرا بڑی دیر سے اور بڑے غور سے ملاحظہ کر رہے تھے، کیونکہ وہ بھی اسی کشتی میں سوار تھے، بچے کا مکتب سے عشق، تعلیم سے محبت دیکھ کر کشتی سے اترنے سے پہلے اس کے بارے میں ایک پیشن گوئی کرتے ہیں کہ ''یہ بچہ بڑا ہو کر بہت نام ور آدمی ہوگا۔'' بزرگ کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور یہ تندرست وتوانا خوبصورت بچہ آگے چل کر باغِ مودودیؒ کا گل سرسبد، فکر فراہیؒ کا امین، جادۂ حق کا مسافر، بحرِ علم کا شناور، صحیح فکر اسلامی کا علمبردار، نام نامی عبدالعلیم اصلاحی سے مشہور ہوا۔

مدرسۃ الاصلاح سے وابستگی

مولانا کے باشعور بالغ نظر والدمحترم نے اپنے بچے میں ذہانت وفطانت کے جوہر دیکھ کر محض بارہ سال کی عمر میں شمالی ہند کی مشہور دانش گاہ مدرسۃ الاصلاح میں داخل کردیا۔ مدرسۃ الاصلاح یعنی وہ درسگاہ جس نے امت کی زبوں حالی اور پستی کے دور میں امت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا جس کی بنیاد 1908ء میں مولانا مفتی شفیعؒ صاحب نے رکھی، ابتداً یہ ''مدرسۃ اصلاح المسلمین'' کے نام سے جانا جاتا تھا جو کہ انجمن اصلاح المسلمین کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ یہ مدرسۃ الاصلاح کی خوش نصیبی تھی کہ انیسویں صدی کے دو اعلیٰ دماغ اور بہترین شخصیات علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی اس کو سرپرستی ورہنمائی حاصل رہی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کو پروانۂ اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کی بہت زیادہ خدمت انجام دے سکیں، مگر مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے مدرسہ کے قیام سے لے کر دمِ آخر تک اپنے آپ کو مدرسہ کے لیے وقف کردیا، اس نابغۂ روزگار ہستی کی خدمات مدرسۃ الاصلاح کو کم وبیش بیس سال حاصل رہیں، اس مدت میں انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کی کایا پلٹ دی۔ مولانا نے مدرسہ کی تعلیم، اس کے مقصد اور طریقۂ کار میں فکری اور عملی اعتبار سے انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ قرآن مجید اور متعلقاتِ قرآن کو مدرسۃ الاصلاح کے نظامِ تعلیم کا مقصد اساسی قرار دے کر مدرسۃ الاصلاح کو نشانِ راہ اور منزلِ مقصود کا پتہ بتایا۔ قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت و ترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم کو اس کی تعلیم کے ماتحت کرکے ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق، حکمت کی تعلیم کے دروازے قرآن کے اندر ہی کھولے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن مجید ہی کی روشنی میں بڑھے۔ اس طرح مدرسۃ الاصلاح صرف ایک درسگاہ ہی نہیں بلکہ علوم قرآن کا ایک مرکز بن گیا جس کا مقصد اُمّتِ مسلمہ کو اس کے مقصدِ حیات سے آشنا کرکے عروج وترقی کی راہ دکھانا اور اقامتِ دین کا جذبہ پیدا کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ علوم قرآن کا یہ مرکز تحریکِ اسلامی کا بھی مرکز بن گیا۔

داخلہ کے وقت ملک وملت کے حالات

اس مرکزِ قرآن سے مولانا کی وابستگی مکتبِ عشق میں داخلہ کا عنوان بنی، مولانا کی یہ خوش نصیبی تھی کہ مدرسۃ الاصلاح آپ کی جولان گاہ علم قرار پایا۔ یہاں مولانا جس نصابِ تعلیم وتربیت سے گزرے اس نے آپ کے اندر قرآن وسنت کی گہری بصیرت، تدبر وتفکر کی اعلیٰ لیاقت اور علوم اسلامیہ میں کمالِ مہارت کے ساتھ ساتھ فقر واستغنا، اخلاص وایثار، محنت وریاضت، صبر وقناعت، بےنفسی وبےلوثی، سادگی وانکساری، بلند ہمتی واولوالعزمی اور حق گوئی وبیباکی کو پروان چڑھایا۔ مولانا جس وقت مدرسۃ الاصلاح آئے اس زمانے کو بھی ذہن میں رکھنا

ضروری ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب تقسیمِ ہند اور آزاد مملکت کا مطالبہ زور پکڑ چکا تھا اور یہ تحریک اپنے شباب پر تھی، مولانا اپنے بچپن کے واقعات یاد کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ''ہم بھی جھنڈا لے کر گلیوں میں دوڑا کرتے اور یہ نعرہ بھی خوب زور وشور سے لگایا جاتا کہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' یہ وہ زمانہ تھا جب تخت گرائے اور تاج اچھالے جارہے تھے، انگریز بہ ظاہر شکست خوردہ بباطن اپنی فکر ونظر کے وارثین چھوڑ کر ہندوستان سے رخصت ہونے کے لیے اپنا بوریا بستر باندھ رہے تھے۔ پورے ملک میں انتشار کی کیفیت تھی، ادھر مسلم قیادت دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک مسلم لیگ تھی جس کا مطالبہ تھا کہ مساوی تقسیم ہو اور مسلمانوں کو علیحدہ مملکت دی جائے۔ دوسری طرف جمعیۃ العلماء تھی، جو کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستان میں حکومت میں حصہ داری کی بات کررہی تھی۔ مسلمان علماء اور رہنما شعوری یا غیر شعوری طور پر قوم پرستی کا شکار ہوکر ''قومیں وطن سے بنتی ہیں'' کے پُرفریب نعرہ کو اختیار کر چکے تھے۔ حالات انتہائی غلط رخ پر جارہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مسلمان قومیت کا شکار ہوکر کفر وشرک کی دلدل میں اترنے کے لیے تیار ہیں، کیا علماء کیا عوام سب اس فتنہ کا شکار ہورہے تھے! صاف نظر آرہا تھا کہ مسلمانانِ ہند انگریزوں کی غلامی سے نکل کر متعصب ہندوؤں کے شکنجے میں پھنس جائیں گے۔ ہندو اکثریت قانون کے زور سے مسلمان اقلیت کا جینا دوبھر کردے گی۔ ان حالات کو دیکھ کر صحیح اسلامی شعور رکھنے والے اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر متفکر رہنے والے سخت مضطرب اور پریشان تھے۔

مولانا مودودیؒ نے ان دونوں نظریات کے بالمقابل اسلام کے سیاسی نظریہ کو ایک متبادل کے طور پر پیش کیا اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی عملی جدوجہد کا آغاز کرنے کے لیے تحریکِ اسلامی یعنی جماعت اسلامی کی بناء ڈالی اور جماعت کے قیام کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

> ''اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے کہ آزادیٔ ہند کی تحریک کا رخ حکومت کفر سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں۔'' (ایک شخص ایک کارواں)

حالات ایسے ہوگئے تھے کہ ہندوستان میں رہ جانے والے باشعور مسلمانوں کو اپنی تباہی و بربادی کھلی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ اکابرین وقائدین تک ہمت ہار گئے تھے گویا انھوں نے حالات کے آگے سپر ڈال دی ہو، ایسے حالات میں ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو مولانا مودودیؒ کی صدا پر لبیک کہہ چکے تھے اور صحیح اسلامی فکر اور اسلامی اساس پر قائم تھے، جن میں مدرستہ الاصلاح کے ذمہ داران اور مدرسین بھی شامل تھے۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی تربیت انہی جید، باصلاحیت، حوصلہ منداساتذہ کے

ہاتھوں ہو۔ مدرسۃ الاصلاح کے مدرسین کی عقابی اور جوہر شناس نگاہوں نے اس ہیرے کو پرکھ لیا، اس کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا ادراک کرلیا اوراس کی تراش خراش میں لگ گئے، چنانچہ مولانا کی تربیت خالص اسلامی ماحول میں اور تحریک اسلامی کے سرخیل مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اور مولانا ابوبکر اصلاحیؒ کی آغوش میں ہوئی۔

یک زمانہ صحبت با اَولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا (رومی)

علم کے دیار میں

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا داخلہ مدرسۃ الاصلاح کے مکتب درجہ سوم میں ہوا۔ دو سال مکتب میں پڑھنے کے بعد عربی اول اور اسی سال عربی دوم بھی مکمل ہوگیا۔ مولانا کا سنِ فراغت 1953ء ہے، اس طرح گویا دو سال مکتب اور چھ سال میں عالمیت، فضیلت مکمل ہوگیا۔ مولانا جب مدرسہ سے فارغ ہوئے تو مولانا کی عمر محض انیس سال تھی۔ مدرسۃ الاصلاح کی وادیٔ ذی زرع کی فضاؤں اور وہاں کے لائق وفائق جید اساتذہ نے مولانا کی دنیا بدل دی۔ مولانا کے اساتذہ اپنے تبحر علمی اور درویشی کی وجہ سے علماء سلف کی یادگار تھے۔ مولانا اپنے اساتذہ میں اختر احسن اصلاحیؒ سے بے حد متاثر تھے۔ مولانا ان کا اس ادب واحترام سے ذکر کرتے کہ حسرت ہوتی کہ کاش! ہم انہیں دیکھ پاتے۔ مولانا اکثر ان کے زہد وتقویٰ کا بھی ذکر کیا کرتے۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ مولانا فراہیؒ کے عزیز شاگرد اور جاں نثار خادم تھے اور جماعتِ اسلامی سے اول دن ہی سے وابستہ تھے، نہ صرف یہ بلکہ مولاناؒ کے تمام اساتذہ ہی جماعت کے وابستگان میں سے تھے۔

چونکہ مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے چنانچہ طلباء کو بھی جماعت اسلامی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، چنانچہ مولانا طالب علمی کے آغاز سے ہی اس قافلۂ سخت جاں کا حصہ بن گئے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

> ''اقامت دین کے اس صبر آزما پروگرام پر صرف ان ہی لوگوں نے لبیک کہا جو گفتار کے غازی نہ تھے بلکہ کردار وعمل کے اعتبار سے ٹھوس اور غیر متزلزل تھے اور نصب العین کی نزاکت واہمیت کے ساتھ ساتھ راستے کی دشواریوں کا صبر واستقامت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔'' (ایک شخص ایک کارواں)

اس قافلۂ سخت جان میں شمولیت کے بعد مولانا دمِ آخر تک اس کے نصب العین پر کاربند رہے۔

یہ راہِ عشق ہے اس راہ کا بھرم رکھا

سمجھ کے سوچ کے اس راہ میں قدم رکھا

مولانا مدرسۃ الاصلاح کے ان فارغین میں سے تھے جن کی نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت وتزکیہ کے تمام مراحل یہیں طے پائے۔ مولانا اپنے اساتذہ کی سادگی اور تربیت کے انداز کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے تھے کہ ''بعض اساتذہ بچی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے کھانے کو ترجیح دیتے اور طلبہ کے دسترخوان سے اٹھ کر چلے جانے کے بعد وہیں بیٹھ کر ٹوٹی ہوئی روٹیاں کھاتے۔'' اس طرزِ عمل کے ذریعہ گویا وہ اپنے طلبہ میں یہ شعور پروان چڑھا رہے ہوتے کہ کس طرح مدرسہ کو فائدہ پہنچانا ہے اور کس طرح رزق کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔ مولانا کہتے کہ '' کچھ بڑی جماعتوں کے طلبہ کے ساتھ میں بھی اساتذہ کے ساتھ شامل ہوجایا کرتا۔'' ان ٹوٹی روٹیوں کا کمال دیکھئے کہ کیسی بڑی بڑی باکمال ہستیاں وجود میں آئیں۔ کوئی شیخ التفسیر بنا تو کوئی شیخ الادب، کسی نے قرآن میں غوطہ زن ہوکر ایسے ایسے موتی وگہر برآمد کیے جن کی آب وتاب آج بھی باقی ہے، جن کے اثرات سے آج بھی دنیا فیض یاب ہورہی ہے۔ ان ٹوٹی ہوئی روٹیوں کے ذریعہ مولانا کے اندر وہ سادگی وانکساری اور شانِ استغنا پیدا ہوئی کہ مولانا کے لیے کہیں کا رختِ سفر باندھنا کبھی مشکل نہ رہا، یہ روکھی سوکھی ٹوٹی ہوئی روٹی کھانے کی عادت مولاناؒ کے ساتھ اس طرح لگ گئی تھی کہ مولانا کہیں بڑی شاندار دعوت میں بھی جارہے ہوتے تو اپنی سوکھی ہوئی دو روٹیاں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیتے اور دعوت کے دسترخوان پر انواع واقسام کے پرتعیش کھانوں سے احتراز کرتے ہوئے اپنی وہی سوکھی ہوئی روٹی جیب سے نکال کر بلا تردد کھالیتے۔ تربیت کا یہ رنگ اتنا گہرا تھا کہ کبھی مدھم نہ پڑا، کیا ہی اچھے اساتذہ تھے!!! اور کیا ہی خوب شاگرد!!!

مولانا اپنے اساتذہ میں جلیل احسن ندویؒ کا بھی اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ غالباً مولانا کے انشاء کے استاد تھے اور انھوں نے اپنے شاگردوں کو علم وادب کے جوہر عطا کر کے ان پر مہر بھی لگادی تھی کہ مجھے آپ لوگوں سے قوی امید ہے کہ آپ لوگ انشاء میں غلطی نہیں کریں گے۔ علم کی یہ پختگی مولانا اور مولانا کے ساتھیوں میں مولانا عبدالمجید اصلاحی جیراجپوریؒ کا خاصہ تھی۔

علمی برتری کا حال یہ تھا کہ مولانا جب بھی ادب پڑھاتے ایسا لگتا کہ ادب کا اس سے بہتر کوئی استاذ ہو ہی نہیں سکتا، اسی طرح جب تفسیر پڑھاتے تو ایسا لگتا کہ علم کی یہ گہرائی اور گیرائی صرف اصلاحیوں کا خاصہ ہے۔

دشتِ شبلیؒ میں

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد بھی مولانا کی علمی تشنگی باقی رہی اور مولانا نے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تلاش شروع کردی لیکن اس وقت کوئی ایسا ادارہ نہ ملا چنانچہ 1954ء میں مولانا نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے استفادہ کے خیال سے اعظم گڑھ کا رخ کیا۔ اعظم گڑھ قیام کے دوران مولانا نے دارالمصنّفین سے خوب خوب

استفادہ کیا اور مطالعہ وتحقیق کے ذریعہ علومِ اسلامیہ پر دسترس حاصل کر لی۔ خاص طور سے فقہ، اصولِ فقہ میں مہارت حاصل کی۔ چنانچہ آپ تفسیر و حدیث کے ساتھ ساتھ اصولِ تفسیر و اصولِ حدیث، ادب، بلاغت، انشاء میں بھی کمال درجہ کی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اسرارِ شریعت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اعظم گڑھ قیام کے دوران فکر ونظر کی بہت سی جہتوں سے مولانا کی آشنائی ہوئی۔ کئی مکتبۂ فکر کے لوگوں سے آپ کی ملاقاتیں رہیں۔ مولانا خاص طور سے جن شخصیات کا ذکر کرتے تھے، ان میں وحیدالدین خان صاحب کے بڑے بھائی، اجو خان صاحب، مولانا مجیب اللہ ندویؒ صاحب کی دلآویز شخصیتیں ہیں۔

کارگہِ عمل میں

تعلیم وتربیت کی جولان گاہوں سے گزرنے کے بعد آپ کا اگلا میدان، میدانِ عمل تھا، جہاں آپ کو بحیثیت مربی ومعلم اپنی سابقہ جدوجہد کے نتائج سے نئی نسل کو روشناس کرانا تھا۔

★ مدرسہ مظہر العلوم بنارس

وہ علم جو مدرسۃ الاصلاح میں ایک نصاب کا پابند تھا دارالمصنّفین میں وہ تمام سرحدوں سے ماوراء ہو گیا، مدرسۃ الاصلاح میں جس نشانِ منزل کا سراغ مل گیا تھا اس راہ کے تمام بام و در روشن ہونے لگے، اب علم اپنی حدوں سے نکل کر دوسروں میں منتقل ہونے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا علم کی اسی امانت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مولانا نے بنارس مدرسہ مظہر العلوم کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس سفر کی روداد بھی جذب و مستی کی وہ داستان ہے جس سے مسافر کی نگاہ بلند، ضمیر پاک اور مستیٔ شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مدرسہ مظہر العلوم بنارس مولانا کی علمی وعملی جولانیوں کا ایک زمانے تک مرکز رہا، مولانا جب 1956 میں مظہر العلوم تشریف لائے تو مولانا کے خیر خواہوں کا یہ اندازہ تھا کہ مولانا زیادہ دنوں تک مظہر العلوم میں ٹک نہیں پائیں گے، مگر مولانا کا عزم جواں اور حوصلہ بلند تھا، لہٰذا تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ یہ اندیشے اس لئے تھے کیونکہ مولانا تحریک اسلامی سے وابستہ اور مدرسۃ الاصلاح کے فارغ تھے جبکہ مدرسہ مظہر العلوم کا بالکل الگ ہی مزاج اور انداز تھا، مولانا اس الگ مزاج اور رنگ میں رچ بس گئے اور مولانا نے تحریک اسلامی کی ذمہ داریوں اور مدرسہ مظہر العلوم کی صدارت کو پہلو بہ پہلو اس خوبی سے نبھایا کہ کسی کو متاثر نہ ہونے دیا۔ واضح رہے کہ مولانا بنارس قیام کے دوران امیر مقامی جماعت اسلامی بنارس بھی رہے اور یہ عرصہ تقریباً ڈیڑھ دہائیوں پر محیط ہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کے ذمہ داران مولانا

سے بہت زیادہ محبت والتفات کا معاملہ رکھتے تھے اور مولانا کی علمی قابلیت کی دل سے قدر اور عزت کرتے تھے۔

★ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر

لیکن جب مادرِ علمی سے مولانا کا بلاوا آیا تو مولانا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے جاہ ومنصب اور کیریئر کے بارے میں نہ سوچا اور فوراً اپنے مادرِ علمی کی خدمت کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح مولانا کی مدرسۃ الاصلاح کو دوبارہ آمد 1970ء میں ہوئی۔ مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کی مسندِ صدارت کو رونق بخشی اور مدرسہ کے در و بام جگمگا اٹھے۔ اصلاحی حضرات جانتے ہیں کہ یہ زمانہ مدرسۃ الاصلاح کے لیے بڑا پُر آشوب اور قیامت خیز تھا، دیگر مسائل کے علاوہ مالی بحران کا بھی سامنا تھا۔ مولانا نے تمام حالات کا جائزہ لیا اور مسائل واختلافات سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کسی اقدامی عمل کی منصوبہ بندی شروع کر دی اور یہ تدبیر پیش کی کہ مدرسہ میں کوئی نیا تعمیری کام شروع کیا جائے۔ مولانا کی اس تدبیر نے لوگوں کو تعجب میں ڈال دیا کہ کئی مہینوں سے اساتذہ کی تنخواہیں نہیں دی گئی ہیں، ایسے میں تعمیر کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ بہر حال ناظم مدرسہ نے مولانا کی اس تجویز پر عمل کا فیصلہ کر لیا اور سب کچھ مولانا کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ لہٰذا مدرسہ میں تحفیظ القرآن کی عمارت کی بنیاد ڈال دی گئی۔ آج بھی مدرسۃ الاصلاح کے احاطہ میں واقع یہ بلڈنگ مولانا کی اعلیٰ تدبیری صلاحیتوں کی گواہ ہے۔

اس تعمیری کام کے آغاز سے مدرسہ کے بہت سے مسائل حل ہوئے، الحمدللہ بلڈنگ کی تعمیر مکمل ہوئی اور حالات پر عمدگی کے ساتھ قابو پا لیا گیا۔ مدرسہ کی ساکھ جو بری طرح متاثر ہو گئی تھی، دوبارہ بحال ہوئی۔ مولانا تین سال تک مدرسہ کی تعمیر وترقی میں جی جان سے لگے رہے۔ مولانا کے علم وفضل کا دریا رواں رہا اور ہر کسی نے اپنی بساط کے مطابق کسبِ فیض کیا۔

اس دوران مولانا امیرِ مقامی جماعتِ اسلامی سرائے میر بھی رہے۔

★ جامعہ دارالہدیٰ، کریم نگر

ایمرجنسی سے کچھ قبل مولانا کے استاذِ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ نے مولاناؒ کو خط لکھ کر کریم نگر جماعت اسلامی کی درسگاہ جامعہ دارالہدیٰ میں پڑھانے کی دعوت دی اور حکم دیا کہ فوراً کریم نگر آ جاؤ۔ مولانا استاذِ محترم کے اس حکم کو ٹال نہ سکے اور ایک مرتبہ پھر مدرسۃ الاصلاح چھوڑ کر استاذِ محترم کے حکم کی تعمیل کے لیے درویشِ خدا مست کے مانند سامانِ سفر باندھ لیا۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ہندوستان کے شمالی علاقوں میں رہنے والوں کے لیے جنوبی ہندوستان میں قیام کوئی آسان کام نہ تھا، وہ بھی آج سے پچاس سال قبل جب سفر کی صعوبتیں حد سے سوا تھیں۔ مولانا جب اپنے سفر کی داستان سناتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ اتنا پُرمشقت سفر، اجنبی علاقہ اور اجنبی لوگوں میں آنے کی ہمت کر پانا مولانا جیسے بلند عزم رکھنے والوں ہی کے بس کی بات ہے۔ شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی تہذیب وثقافت، اکل وشرب اور زبان و بیان میں بہت زیادہ فرق تھا۔ مولانا جیسے نفیس طبع لوگوں کے لیے یہ بڑا دشوار تھا کہ زبان کے اس ذائقہ کو ہضم کر سکیں۔ بہر حال مولانا نے اپنے استاذ کی خدمت میں سر نیاز خم کر دیا اور کریم نگر کے اس دور افتادہ علاقہ میں پہنچ گئے جہاں جامعہ دار الہدیٰ قائم تھا۔

جب پہنچے تو دیکھا کہ استاذِ محترم تو اپنا سامان باندھے واپسی کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ مولانا کے لیے یہ صورتحال بڑی پریشان کن تھی۔ ایک ہی آشنا اور شناسا......اور وہ بھی ساتھ چھوڑ کر جا رہا ہے۔ شاگرد تو یہ سوچ کر آئے کہ استاذ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ دیکھا تو یہاں استاذ محترم سارا کام شاگرد کے حوالے کر کے اطمینان کے ساتھ رخصت ہونے کو تیار ہیں۔ ''ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں'' کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پریشان ہونے کے باوجود استاذ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی اور خاموشی سے استاذ کی تیاریاں دیکھتے رہے۔ استاذ نے شاگرد کو جس مان سے بلایا تھا، شاگرد نے اس کا پورا خیال رکھا۔

مولانا نے مدرسۃ الاصلاح جیسی اعلیٰ تعلیم گاہ کریم نگر کے ایک چھوٹے سے مدرسہ کے لیے چھوڑ دی کوئی دنیادار بندہ اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ جماعت اسلامی کی یہ نوزائیدہ درسگاہ جو ابھی اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی، مولانا نے اپنا خونِ جگر جلا کر اس کی آبیاری کی اور اس کو ایک تناور درخت بنایا۔ یہاں مولانا کو خوش قسمتی سے مخلص ساتھیوں کی ایک جماعت نصیب ہوئی، جس میں جناب عباداللہ صاحب، عبدالغفور صاحب، ڈاکٹر بشیر صاحب، ایڈوکیٹ عبدالباری صاحب، جناب مرتضیٰ صاحب، مولانا محمد شریف نظامی صاحب وغیرہم تھے، یہ تمام ساتھی مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ مولانا کریم نگر قیام کے دوران عبدالرزاق لطیفی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا بھی ذکر کرتے تھے۔ مگر مولانا کو ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہ ملا کہ دستِ اجل نے لطیفی صاحب کو اچک لیا۔

مولانا ابھی کریم نگر ہی میں تھے کہ ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ ہوگئی اور جماعت اسلامی پر پابندی عائد ہوگئی۔ قید و بند کی صعوبتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دار ورسن سجنے لگے، زنداں میں زنجیروں کی جھنکار سنائی دینے لگی، وہ ایمان جس کا اہلِ ایمان دعویٰ کر رہے تھے اس کی آزمائش کا وقت آیا، جماعت کے اکابرین نے

استقامت کا ثبوت دیا ''آ جیل میں تو جیل کے اندر کی فضا دیکھ'' کا غلغلہ بلند ہوا تو کسی نے ''آباد رہیں گے ویرانے، شاداب رہیں گی زنجیریں'' کا نعرہ لگایا۔ غرض چہار جانب ایمان ویقین، ابتلاء وآزمائش کے مناظر تھے۔ مولانا کہتے تھے کہ ''مجھے بنارس اور سرائمیر میں تلاش کیا جارہا تھا، ہر وقت گرفتاری کا خطرہ تھا'' مولانا نے اس آزمائش کے وقت جماعت کے تمام اسیران کی خیر خبر رکھی، ان کی ضروریات کا خیال رکھا، گھر والوں کی ہمت بندھائی اور جماعت کی تمام سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ کچھ عرصہ بعد ظلم کے بادل چھٹ گئے جماعت پر پابندی خلافِ قانون قرار پائی اور جماعت کو پھر سے سرگرم ہونے کی اجازت مل گئی۔

بہر حال جب کریم نگر سے جامعہ دارالہدیٰ حیدرآباد منتقل ہوا تو مولانا بھی حیدرآباد آ گئے۔ آپ کا قیام مہدی پٹنم میں رہا۔ غالباً 1980ء میں جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر سے حیدرآباد منتقل ہوا ہے۔ اس وقت مولانا چھٹیوں میں اپنے وطن گئے ہوئے تھے، وہیں یہ اطلاع ملی اور مولانا نے اپنی فیملی کے ہمراہ حیدرآباد کے لیے رختِ سفر باندھا۔

★ حیدرآباد:

حیدرآباد نے جو کہ نوابوں کا شہر، تہذیب وثقافت کا مرکز اور علم وادب کا گہوارہ ہے، مولانا کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ مولانا کی حیدرآباد آمد اپنے اندر داستانوں اور روددادوں کا ایک جہان رکھتی ہے کہ حیدرآباد قیام کے دوران مولانا نے زندگی میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے، یہاں مولانا نے جماعت کے لیے دیوانہ وار کام کیا، مدرسہ کے بعد جو وقت بچ جاتا وہ تحریکی کاموں میں صرف کرتے۔ جہدِ پیہم کی یہ اعلیٰ مثال تحریکِ اسلامی میں بھی نایاب تھی۔ اس عہد کے لوگ مولانا کے اس جنون، اس تڑپ سے آگاہ اور اس کے شاہد ہیں۔ مولانا حیدرآباد میں ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھے اور یہاں جماعت کی مختلف ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

مولانا نے جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد سے جس طرح اس کے نصب العین کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیا اس کی نظیر موجودہ زمانے میں ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1985ء میں جب سے جماعت نے اپنے ارکان پر سے ووٹ نہ ڈالنے کی پابندی ختم کی مولانا بہت مضطرب اور بے چین رہتے تھے۔ مولانا جماعت اسلامی کی موجودہ پالیسیوں کو جماعت کی بنیاد اور اس کے مقاصد کے مغائر سمجھتے تھے۔ مولانا جماعت کی اس پالیسی کے خلاف میدان میں اتر آئے اور ''رسائل ومسائل'' سے وہ تمام بحثیں جو ووٹ کے مسئلہ پر تھیں اس کی فوٹو کاپی کروا کر مسجد عزیزیہ میں تقسیم کیں۔ مولانا جماعت کے اس فیصلے پر بہت برہم بھی ہوئے۔ تحریکِ اسلامی کا نظام کفر کی طرف جھکاؤ مولانا کے نزدیک ناقابلِ برداشت تھا، تحریک کا اصولوں سے انحراف مولانا کا جگر چھلنی

کررہا تھا اور جماعت کا مستقبل بحیثیت تحریکِ اسلامی تاریک نظر آرہا تھا۔

مولانا کی تحریک سے محبت، اصولوں سے وفاداری اور اس کے نصب العین "اقامتِ دین" کی تڑپ جماعت کے ذمہ داران کے طبعِ نازک پر گراں گزرنے لگی اور انھوں نے مولانا کی صدا پر کان نہ دھرا، الٹا یہ ہونے لگا کہ مولانا کے درسِ قرآن اور مولانا کی تحریروں کو جماعت کی جانب سے نشانہ بنایا جانے لگا کہ آپ نے یہ بات جو کہی، یہ جماعت کی فلاں پالیسی کے خلاف ہے، اور آپ نے جو تحریر کیا ہے اس سے جماعت کی مخالفت کی بو آرہی ہے، لہٰذا لگا ہے یہ لگا ہے مولانا کو معطلی کے پروانے ملتے رہے مگر آفرین ہے اس مردِ مجاہد پر کہ اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی جماعت کی کسی غلط پالیسی کو برداشت نہ کیا۔ مولانا کی کتاب "ملت کے دفاع کا مسئلہ" جماعتِ اسلامی کے لیے دردِ سر بن گئی۔ مولانا کا جب اس کتاب پر مؤاخذہ ہونے لگا تو مولانا نے صرف ایک بات کہی کہ آپ بس مجھے اس کتاب میں کوئی بات خلافِ قرآن وسنت بتا دیں۔

ہندوستان میں جماعت کی ساری فکری ونظریاتی عمارت زمیں بوس ہو جانے کے باوجود مولانا اپنی جگہ بنیاد کا پتھر بنے رہے۔ اسلامی فکر کی حفاظت اور تحریک اسلامی کو اس کی راہ پر گامزن رکھنے کو مولانا نے اپنا مقصدِ وحید بنالیا۔ مولانا نے زبان وقلم کی ساری صلاحیتیں اس فکر کو بچانے کے لیے صرف کر دیں۔ مولانا بلا کسی خوف لومۃ لائم ہر موقع پر ہر جگہ اپنی فکر کا برملا اظہار کرتے رہے۔ مولانا جماعت کی الیکشنی پالیسیوں سے دلبرداشتہ ہو کر کہتے:

> "لوگوں کے لیے یہ مسئلہ کچھ بھی ہو لیکن میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے مولانا مودودیؒ کا چمن نذرِ آتش کر دیا گیا ہو۔"

اسی لیے مولانا جماعت اسلامی کا مسلسل محاکمہ کرتے رہے۔

★ تعلیم بالغان کا آغاز:

دارالہدیٰ کی مصروفیات کے باوجود مولانا نے اپنے طور پر شام کے اوقات میں تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع کیا، مولانا جماعت کے اراکین اور ان کے اہلِ خانہ جس میں ہر عمر کے مرد وخواتین شامل تھے، ان کو عربی گرامر، قرآن وحدیث پڑھاتے رہے اور "المعہد" کے نام سے یہ سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ بالآخر یہی سلسلہ جامعۃ البنات حیدرآباد کے قیام کا سبب بنا۔

★ جامعۃ البنات حیدرآباد کا قیام:

مولانا نے 1988ء میں جامعۃ البنات کے نام سے حیدرآباد کے اس تاریخی مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کو شہر حیدرآباد میں لڑکیوں کے پہلے باقاعدہ مدرسہ کا اعزاز حاصل ہے۔

مولانا کی خدمات ہمہ جہت تھیں، مولانا ایک طرف جماعت اسلامی کے کاموں میں مصروف تھے تو دوسری طرف جامعہ دارالہدیٰ کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے ہوئے تھے تو تیسری طرف جامعۃ البنات کا قیام اور اس کی تمام تر ذمہ داری اور اس پر مستزاد تصنیفی و تالیفی مصروفیات۔

مولانا کی ان ہمہ جہت خدمات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے مولانا کو صرف دین کے کام کے لیے چن لیا تھا۔ مولانا اپنی ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داری سے بھی بالکل غافل نہ رہے بلکہ اپنے اہلِ خانہ کی مکمل دینی تربیت کا بھی بھرپور اہتمام فرمایا۔ مولانا اسوۂ رسول اللہ ﷺ اور اسوۂ صحابہؓ پر پوری طرح کاربند تھے، ورنہ عموماً لوگ باہر کے کاموں میں مصروف رہ کر گھر کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جامعۃ البنات کا 1988ء میں قیام اور مولانا کا اس کے لیے اپنے آپ کو کھپا دینا یہ تاریخ کے صفحات پر نقش ہو چکا ہے۔ جامعۃ البنات سے فارغ مولانا کی ہزاروں طالبات مولانا کے خلوص، مولانا کی محنت اور مولانا کی جگر پاشیوں کی گواہ اور امین ہیں۔ مولانا نے جامعۃ البنات کے قیام کے ذریعہ وہ کارنامہ انجام دیا کہ ہزاروں افراد اور جماعتیں مل کر بھی وہ کام نہ کر سکتی تھیں، جو تنِ تنہا مولانا نے کیا۔ ہزاروں دلوں، دماغوں میں اسلام کو حکمراں بنانے کا خواب منتقل کیا، ہزاروں گھروں کو اسلامی تعلیمات سے روشن و منور کیا۔ ہزاروں مدارس و مکاتب کو عمدہ، قابل، لائق، فائق معلمات عطا کیں، ملک بھر کی اسلامی تحریکات کو باصلاحیت کیڈر عطا کیا، معاشرہ سے شرک، بدعات، خرافات، بے جا رسوم و رواج کا خاتمہ کیا۔ یہ مولانا کا وہ کارنامہ ہے جس پر صفحات کے صفحات سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔ مولانا کا ہمیشہ سے یہ خواب تھا کہ طالبات کی ایک ایسی ٹیم تیار ہو جائے جو راست قرآن و سنت سے استفادہ کی حامل ہو، الحمدللہ مولانا کا یہ خواب پورا ہوا اور مولانا کی طالبات نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک تفسیرِ قرآن اور مطالعہ قرآن کے حلقوں سے جڑ کر مولانا کے خوابوں کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ جامعۃ البنات 24 سالوں تک مولانا کے خوابوں کا امین، امیدوں کا مرکز اور سرگرمیوں کا محور و مرکز بنا رہا۔ 24 سالوں بعد ایک ایسا وقت آیا جب مولانا کے خوابوں اور تمناؤں کا یہ مرکز پہلے نام نہاد کمیٹی اور پھر کچھ مفاد پرستوں کی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ یہ داستانِ الم بڑی طویل ہے کہ کس طرح مولانا نے اپنے کرچی کرچی دل ناتواں اور بوڑھے جسم کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کیا۔ اپنوں اور غیروں کے آپسی تال میل کو سمجھتے ہوئے مولانا بوجھل اور زخمی دل کے ساتھ اللہ کے لیے اپنے خونِ جگر سے سینچے ہوئے مدرسہ سے دستبردار ہو گئے اس غم کو بس اللہ ہی جانتا ہے۔ مولانا نے اپنے جواں سال بیٹے مجاہد سلیم کی شہادت کا غم بھی سہا مگر اس غم نے مولانا کو اس طرح نڈھال نہیں کیا جس طرح جامعۃ البنات کو کھو دینے کے غم نے کیا۔

مولانا کے لیے دوغم سوہانِ روح تھے، ایک جماعت اسلامی سے اخراج کا غم اور دوسرا جامعۃ البنات کو قربان کر دینے کا غم۔ اے اللہ! مولانا کی ان قربانیوں کو قبول فرما کر اس کا اجر اَضۡعَافًا مُّضَاعَفَةً کی صورت مولانا کو عطا کرنا کہ مولانا کی تڑپ اور زخمی دل اور کراہوں کے ہم گواہ ہیں۔ اے اللہ! ہمارے مولانا کو ان تکالیف پر صبر کرنے کا اجر خوب خوب عطا فرما۔

★ جامعۃ البنات کی تجدیدنو یعنی جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کا قیام

مولانا سخت حوصلہ شکن حالات میں بھی کبھی بد دل اور مایوس نہیں ہوتے تھے، کبھی حوصلہ نہیں ہارتے تھے اور نہ کبھی اپنی نگاہوں سے منزل کو اوجھل ہونے دیتے تھے۔ مولانا اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی تب و تاب رکھتے تھے۔ مولانا نے اتنے بڑے سانحہ کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری، نہ مولانا کا جذبۂ خدمت سرد پڑا اور نہ مولانا کے فیضِ عام کا سلسلہ ایک لمحہ کے لیے بھی رکا۔ مولانا تو صحرا میں بھی پھول کھلانے اور آندھیوں میں بھی چراغ جلانے کے فن سے آگاہ تھے۔ مولانا ایک بار پھر ایک نئے عزم و حوصلہ اور جوش و ولولہ کے ساتھ میدان میں آئے، جہد و عمل کا بادبان تیار کر کے، عزم و ہمت کا پتوار تھام کر کشتیٔ علم دین کو جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے رواں دواں کر دیا جس سے ایک زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔

بڑھنے والے کا قدم بڑھتا گیا
روکنے والے بہت روکا کیے

★ جامعۃ الشیخ المودودیؒ، پہاڑی شریف

2004ء میں مولانا کے فرزند مجاہد کی شہادت کے بعد مولانا نے مجاہد کی خواہش کے مطابق بچوں کے حفظ کا مدرسہ قائم کیا۔ جامعۃ الشیخ المودودیؒ کی تمام تر ذمہ داری بھی مولانا نے خود اٹھائی اور وہاں تعلیم و تربیت کا بہتر نظم کرنے کے لیے برابر کوشاں رہے۔ 2004ء سے قائم یہ مدرسہ پہاڑی شریف کے نونہالوں کی وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے سینکڑوں طالب علم اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد دوسرے اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور فارغ حفاظِ کرام کی ایک بڑی تعداد مقامی مساجد میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ مولانا کو اس مدرسہ سے بڑا والہانہ لگاؤ تھا، وہاں کے اساتذہ سے بے حد محبت کرتے اور کہتے کہ ”وہاں کے اساتذہ بے سروسامانی کے عالم میں جس طرح تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، وہ قابلِ تعریف اور لائقِ ستائش ہے۔“ 2022ء میں جبکہ مولانا کی طبیعت بہت ناساز تھی اور کسی طرح بھی پہاڑی شریف تک کا سفر کرنے کے قابل نہ تھے مگر مولانا کی جواں ہمتی اور عزم کہ اپنے عزیز نواسے عزام سے کہا کہ ”عزام ہمارے جانے

کا بندوبست کرو۔'' عزام نے کہا: ''نانا ابو! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ بہت زیادہ تھک جائیں گے۔'' مگر مولانا نے کہا: ''نہیں! میں وہاں جا کر اچھا ہو جاؤں گا۔'' آخر کار عزام کو ہار ماننی پڑی اور بذریعہ کار نانا کو اجتماع گاہ لانا پڑا۔ پیری میں جوانی کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہوسکتی ہے، ایسے ہی لوگوں کے لیے ذوقؔ نے کہا ہے کہ

زندگی زندہ دلی ذوقِ عمل شوقِ طلب
عہد پیری میں بھی کچھ لوگ جواں ہیں اے ذوقؔ

مولانا نے پورا جلسہ اٹینڈ کیا اور مختصر اُصدارتی خطاب بھی کیا اور کہا کہ

''یہ بڑی خوشی کا موقع ہے کہ تکمیلِ حفظِ قرآن کے موقع پر ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ یہ مدارس اور اہلِ مدارس ہندوستان میں بہت سے فتنوں سے امت کو بچائے ہوئے ہیں، اس پسماندہ علاقہ میں یہ چھوٹا سا مدرسہ بظاہر بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے اثرات بہت دور تک مرتب ہوں گے۔''

مولانا کی یہی باتیں ہمارے عزم وحوصلہ کو بڑھاتی تھیں جس کام کو لوگ چھوٹا سمجھتے، مولانا کی دوررس نگاہیں اس کی اہمیت وافادیت سے آگاہ ہوتیں۔

★ خونِ جگر کو اپنے سپردِ قلم کیا

مولانا نے تقریباً ستر سال درس وتدریس، تحریک وجہاد، تصنیف وتالیف میں گزارے، ان ستر سالوں میں مولانا زندگی میں ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما رہے، مولانا کی زندگی کو جہادِ مسلسل سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

نوجوانی ہی میں ''دارالاسلام اور دارالحرب'' جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھ کر ہندوستان میں مسلمانوں کی جدوجہد کی سمت کو متعین کر دیا۔

مولانا نے نوجوانی میں سوچ سمجھ کر قرآن وحدیث کی روشنی میں جس راہ کا انتخاب کیا اس راہ پر یقین کامل اور عزم جواں کے ساتھ گامزن رہے۔ اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ مولانا پر بھی گزری کہ ''تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار''۔ مولانا کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہ آئی کہ مولانا نے راہِ حق کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

مولانا اپنے قلم کو تلوار بنا کر باطل طاقتوں کو للکارتے اور باطل نظریات کا تعاقب کرتے رہے، اس میں مولانا نے کسی بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کیا۔ بات حق کی ہوتی تو مولانا سامنے والے کی حیثیت، مرتبہ، جاہ وحشمت

سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہ ہوتے۔

مولانا نے مولانا وحیدالدین خان، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی، پروفیسر غوری، جناب ریاض خان، مولانا عبدالحق انصاری، مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا یحییٰ نعمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحبان وغیرہ کے دلائل ونظریات کا اس طرح پوسٹ مارٹم کیا کہ کسی نے مولانا کے جواب میں تحریری جواب لکھنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پائی۔ مولانا جس انداز سے ان کے دلائل کی قلعی کھولتے ہیں، اس سے ان کے دلائل کا بودا پن اور بے وزنی اظہر من الشمس ہوجاتی ہے۔

جواں دلوں کا رفیق بھی تھا

مولانا طلبہ تحریک SIM کے نوجوانوں سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی ذہن سازی کرتے رہتے تھے ان نوجوانوں کی آمد پر مولانا کی باچھیں کھل جایا کرتی تھیں، ان سے مل کر اور ان سے باتیں کرکے مولانا بہت مسرور اور مگن ہوجاتے تھے۔ معلوم نہیں یہ تحریک کے نوجوانوں کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو مولانا کا ساتھ نصیب ہوا یا مولانا کی خوش نصیبی تھی کہ یہ جوانانِ رعنا مولانا کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مولانا کو ان نوجوانوں میں اسلام کا مستقبل روشن دکھائی دیتا تھا۔ گھر میں ان تحریکی مہمانوں کی آمد ہوتی تو گھر میں عید کا سماں ہوتا اور مولانا خوشی سے نہال ان کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوجاتے۔ نہ صرف کام و دہن بلکہ دل ونظر کی بھی خوب خوب مدارات کرتے!!

طلبہ تحریک سے مولانا کی یہ محبت بالکل عیاں تھی، لہٰذا جماعت اسلامی نے مولانا پر ان کے اجتماعات میں شرکت پر پابندی لگادی اور ان سے دوری اختیار کرنے کا حکم جاری کردیا لیکن مولانا کسی پابندی کو خاطر میں نہ لائے اور ہر اجتماع میں شریک ہوتے رہے۔ بالآخر مولانا کے جماعت سے اخراج میں یہ چیز ایک بڑی وجہ بنی۔

نہ ہو فکر اہلِ دانش، میں جنوں کی بات مانوں
کہ نوائے عقل جانوں، نہ ہوائے دل کو آؤں
تیری حرمتوں کی بابت، میں بہر محاذ پہنچوں
تیرے حق پہ جان دے دوں تیرے دیں کے کام آؤں

حادثات دل شکن

بابری مسجد کے مسئلہ سے تو مولانا کی جذباتی وابستگی تھی، مسئلہ بابری مسجد مولانا کے ذہن و دماغ پہ ہر وقت چھایا رہتا۔ مولانا نے دو کتابیں ''بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں'' اور ''مساجد اللہ'' بابری مسجد کے مسئلے

پر ہی لکھی ہیں۔ مولانا واضح طور پر کہتے تھے کہ ہندوستان میں ہماری تباہی و بربادی کا نقطۂ عروج بابری مسجد کی شہادت ہے۔ اگر ہم تباہی و بربادی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں بابری مسجد کو واپس لینا ہوگا۔ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے قائم کردہ تحریک تحفظ شعائر اسلام کی سرپرستی قبول کرنے کے جرم میں جماعت اسلامی کی جانب سے اخراج کو صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ وہ تحریک جس کی مدتوں خونِ جگر سے آبیاری کرتے رہے، کبھی خواب میں بھی جس سے الگ ہونے کو سوچا تک نہ تھا، بابری مسجد کے لیے اس تحریک کی پچاس سالہ رکنیت کو قربان کر دیا۔

اسی دوران عالمی سطح پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ 11 ستمبر 2001ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد ساری دنیا کے حالات میں اچانک تبدیلی کی ایک لہر چل پڑی اور ہر جگہ اسلام پسندوں پر شکنجہ کسا جانے لگا۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی اس تبدیلی اور بوکھلاہٹ کا اثر دکھائی دیا اور اسلام پسند نوجوانوں کی طلبہ تحریک کو خلافِ قانون قرار دے کر اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مولانا کی امیدوں اور تمناؤں کا یہ مرکز حکومتی جبر کا شکار ہو گیا، اس سے تعلق رکھنا جرم ٹھہرا۔

مولانا اس دردناک حادثہ اور المیہ پر نوحہ کناں رہے، اس موقع پر ہندوستان کی تمام مسلم تحریکوں اور تنظیموں کی جانب سے جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا، اس طرزِ عمل نے مولانا کو مضمحل اور مضطرب کر دیا۔ مولانا تنِ تنہا اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور حیدرآباد کی تمام مسلم تنظیموں سے ملاقات کر کے اس ظلم کے خلاف آگے آنے کی اپیل کرتے رہے۔ چنانچہ مولانا ہی کی دردمند صدا پر ایک کل جماعتی سمپوزیم حیدرآباد کے اردو گھر میں منعقد ہوا، جس میں ڈھکے چھپے الفاظ میں حکومت کے اس عمل کی مذمت کی گئی اور آئندہ کے لیے کوئی لائحۂ عمل طے کیے بغیر ہی یہ سمپوزیم اختتام پذیر ہو گیا۔

حیدرآباد میں بھی ایس آئی ایم کے نوجوانوں کی گرفتاریاں ہوئیں اور ان کو پابندِ سلاسل کیا گیا، ان اسیروں کے لیے مولانا بہت زیادہ پریشان اور فکرمند رہے اور مرکزی سطح پر جو گرفتاریاں ہوئیں، مولانا ان کے اہلِ خانہ اور متعلقین کے سلسلے میں بہت پریشان رہے۔ مولانا نے ہر طرح کے سرد و گرم میں اس تحریک کا ساتھ دیا، اس قافلۂ سخت جاں کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی مولانا کا نام اس کے سرپرستوں اور بہی خواہوں میں جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے بعد مولانا پریشان نظر آرہے تھے۔ ہم نے کہا کہ مولانا اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، مولانا نے بڑی ہی متانت اور مومنانہ بصیرت سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہاں جی لیکن اس کا سارا ملبہ افغانستان پر گرے گا، افغانستان کو اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔'' اس وقت ہمیں تو سمجھ نہ آئی لیکن ایک دو روز

کے بعد ہی امریکہ نے آسمان سر پر اٹھالیا اور اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا افغان حکومت سے مطالبہ کرنے لگا اور حوالے نہ کرنے کی صورت میں افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی دھمکیاں دینے لگا اور کچھ دنوں بعد افغانستان پر حملہ نے مولانا کے اندیشوں کو صحیح ثابت کردیا۔ہم نے پوچھا کہ مولانا!''اب کیا ہوگا؟''

مولانا نے کہا کہ ''کفر ذلیل وخوار ہوکر افغانستان سے نکلے گا۔'' ''مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے'' کے مصداق مولانا کا وجدان پہلے دن سے کہہ رہا تھا کہ افغان غالب ہوں گے۔

افغانستان کے حوالے سے ایک بات اور یادآرہی ہے کہ افغانستان میں طالبان حکومت نے جب بامیان کے بدھا مجسموں کو گرانے کا فیصلہ کیا تو ساری دنیا میں ہاہا کار مچ گئی اور ہر سطح پر طالبان کی مذمت ہونے لگی۔

وہ عالمی ادارے اور تنظیمیں جو بابری مسجد کی شہادت پر مہر بہ لب تھیں، جن کی زبانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے طالبان کے خلاف زہر اگلنے لگیں۔حتیٰ کہ ہندوستان کی مسلم تنظیمیں اور دینی شخصیتیں بھی اس کی مذمت میں آگے آگئیں۔کچھ لوگوں نے تو رضا کارانہ طور پر افغانستان جاکر طالبان کو سمجھانے کا فریضہ ادا کرنے کی ٹھان لی۔اس وقت مولاناؒ نے ساری دنیا کے ردِعمل کے خلاف شرعی نصوص کی روشنی میں ایک کتاب ''مجسّموں کا مسئلہ'' لکھی اور طالبان کے عمل کو عین اسلام کے مطابق قرار دیا۔

حیدرآباد کے حالات میں مولانا کا طرزِ عمل

2004ء کے آس پاس حیدرآباد میں مسلمانوں کے خلاف خوف وہراسانی کا ماحول بناکر ظلم و بربریت کا وحشت ناک کھیل کانگریس حکومت کی سرپرستی میں کھیلا جارہا تھا۔مختلف بہانے بناکر نوجوانوں کا انکاؤنٹر کیا جارہا تھا، اور انھیں جعلی مقدمات میں پھنسا کر پابندسلاسل کیا جارہا تھا۔ہرین پانڈیا قتل کیس میں شہر حیدرآباد کے کئی لوگوں کو ملوث کیا گیا تھا، لہٰذا گجرات پولیس جب چاہتی کسی کو بھی اس کیس میں پھنسا کر گرفتار کرلیتی۔

ان سیاہ کاریوں اور مظالم کے خلاف مولانا کے بڑے صاحبزادے مجاہد سلیم دوسرے نوجوانوں کے ساتھ سراپا احتجاج بن گئے...... پولیس انکاؤنٹر میں مارے گئے نوجوانوں کے گھر پہنچ کر شہداء کے لواحقین سے اظہارِ تعزیت و ہمدردی کی اور ان شہداء کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔16/رمضان المبارک 2004ء کو بعد نماز ظہر مسجد دارالشفاء حیدرآباد میں ''بدر سے لے کر آج تک، فلسطین سے لے کر بھارت تک، شہید ہونے والے شہداء'' کی یاد میں جلسۂ یادِ شہیداں کا انعقاد کیا، کنوینگ کے دوران بار بار شہداء کو یاد کرکے اور شہادت کا تذکرہ کرکے روتے رہے اور پرنم آنکھوں سے اپنی شہادت کے لیے دعائیں مانگیں۔

ابھی 17/رمضان المبارک کا چاند طلوع ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اللہ نے مجاہد کی دعا کو قبولیت کی سند

دے دی اور خلعت شہادت سے سرفراز کردیا۔

قبائے نور سے سج کر لہو سے باوضو ہوکر
وہ پہنچے بارگاہِ حق میں کتنے سرخ رو ہوکر

مجاہد جو پانچ بہنوں کا لاڈلا، ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون، باپ کی آنکھوں کا تارا اور راج دلارا تھا سب کو سوگوار چھوڑ کر جنت کے مزے لینے کے لیے اپنے رب کے حضور جا پہنچا۔ اس موقع پر اس پورے گھرانے نے جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر موجودہ زمانے میں نہیں ملتی۔

مجاہد بھائی کی شہادت کے موقع پر مولانا عمرہ کی ادائیگی کے لیے گئے ہوئے تھے وہیں انہیں اس المناک حادثہ کی خبر ملی......مولانا یہ خبر سن کر وہاں سے نکل پڑے حیدرآباد پہنچنے پر میڈیا والوں نے مولانا کو گھیر لیا اور پوچھا کہ آپ کا کیا کہنا ہے اس حادثے پر......

مولانا نے اس موقع پر جو تاریخی الفاظ کہے وہ یہ ہیں:

''ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے......ہمیں کسی سے بھی کچھ نہیں مانگنا ہے......جو کچھ کہنا ہے ہم اپنے اللہ سے کہیں گے......اسی سے مانگیں گے......مجاہد کو زندگی اسی نے دی تھی......مجاہد تو اپنی مراد کو پہنچ گیا ہے......نریندر مکارامین نے گولی چلائی لیکن اصل مجرم کون ہے؟؟ اصل قاتل کون ہے؟ یہ حکومت یہ عدلیہ......یہ پارلیمنٹ......وزیراعظم اور صدر جمہوریہ......یہ سب مجرم ہیں......قاتل ہیں......انہیں کی وجہ سے یہ ظلم و زیادتی ہورہی ہے......ناحق قتل ہورہے ہیں......کیوں کہ یہ خود انصاف پر قائم نہیں ہیں......ہم ان مجرموں سے کیا کہیں......ان قاتلوں سے کیا مانگیں......ہمیں جو کچھ مانگنا ہے صرف اللہ سے مانگیں گے......جو کہنا ہے اسی سے کہیں گے۔''

مولانا صبر و استقامت کا پہاڑ بنے کھڑے رہے، نوجوان لاڈلے بیٹے کا غم اٹھایا مگر کبھی آپ کے ارادے متزلزل نہ ہوئے، اس کے بعد آپ نے حافظ بیٹے کی تمناؤں کی تکمیل کے لیے لڑکوں کے حفظ کا ایک مدرسہ جامعۃ الشیخ المودودیؒ قائم کرکے پہاڑی شریف کی سلم بستی کی تقدیر بدل دی۔

ایک اور آزمائش

مولانا حالات و واقعات پر نظر رکھتے اور بڑی گہرائی سے جائزہ لیتے تھے 18 رمئی 2007ء بروز جمعہ حیدرآباد میں بڑا ہی دلدوز واقعہ پیش آیا۔ جمعہ کے دن حیدرآباد کی مکہ مسجد میں جبکہ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اچانک دھماکہ ہوا۔ اس بم دھماکہ اور بعد میں پولیس فائرنگ میں کئی لوگ شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

حیدرآباد میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا جس نے لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا مستزاد یہ کہ الزام بھی مسلمانوں کے سر تھوپا جارہا تھا۔

مسلمانانِ حیدرآباد اس واقعہ اور بعد کی صورتحال پر بہت مضطرب و پریشان تھے کیونکہ حیدرآباد پولیس اندھادھند مسلم نوجوانوں کو گرفتار کررہی تھی ان پر تشدد و تعذیب کے ہتھکنڈے استعمال کرکے ان پر بم دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے زور ڈال رہی تھی۔

ان حالات میں مولانا اسیران کی مدد کے لیے آگے آئے اوران کے اہل خانہ سے کہا کہ کچھ کرنے کے لیے آپ لوگوں کو آگے آنا ہوگا، اس ظلم کے خلاف آپ ہی کو آواز اٹھانا ہوگا، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ اسیروں کے گھر کی خواتین سڑک پر آئیں اوراس ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوگئیں۔ ہردن پولیس ظلم کے خلاف مظاہرے کیے گئے، دعائیہ اجتماعات منعقد کیے گئے اور پریس کانفرنسیں کرکے اسیروں کے تعلق سے جواب مانگے گئے آخرکار پولیس اورانتظامیہ نے نوجوانوں کو عدالت میں پیش کرنا شروع کردیا۔

پھر 5/مارچ 2008ء کو مولانا کے چھوٹے صاحبزادہ معتصم باللہ کو شام کے وقت ان کے گھر کے باہر سے سول ڈریس میں ملبوس کچھ لوگوں نے اغوا کرلیا اور نامعلوم مقام پر لے کر چلے گئے۔ معتصم کی بہنیں اور محلہ کے لوگ سعیدآباد پولیس اسٹیشن گئے تاکہ FIR لکھائی جائے اور پتہ لگایا جائے کہ آخر کس نے معتصم کو اغوا کیا ہے، لیکن پولیس والے کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہیں تھے۔ اور نہ ہی ایف آئی آر درج کررہے تھے۔ خواتین اس سے پہلے گرفتار نوجوانوں کا حال دیکھ چکی تھیں، لہٰذا وہ اڑ گئیں کہ ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک آپ لوگ معتصم کا پتہ نہیں کرتے اور ایف آئی آر درج نہیں کرتے۔ 29 خواتین اور کئی چھوٹے بچوں اور بچیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار شدگان میں مولانا کی دختران کے علاوہ ضعیف خواتین بھی تھیں پولیس نے کسی کا لحاظ نہ کیا، سنگینوں کے سائے میں 22 خواتین کو جیل بھیج دیا گیا اور سات کم عمر لڑکیاں جن کی عمر جیل جانے کی نہ تھی، ان کو پانچ دن پولیس اسٹیشن میں محروس رکھا گیا۔

مولانا حکومت کے اس ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ مولانا جو معمولی باتوں پر آبدیدہ ہوجایا کرتے تھے اس وقت صبر واستقامت کی چٹان بنے ہوئے تھے۔ شہر میں خواتین کی گرفتاری کو لے کر بے حد غم وغصہ بھڑک رہا تھا، عوامی ردِعمل بڑا سخت تھا۔ مولانا نے اس وقت ایک پریس کانفرنس کی اور پولیس ظلم کی سخت الفاظ میں مذمت کی، خواتین کی رہائی تک مولانا ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھے۔

اکلوتا بیٹا جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا، بیٹیاں گرفتار تھیں، گرفتار شدگان میں مولانا کی دو ماہ کی نواسی بھی تھی

لیکن مولانا کا عزم وحوصلہ سخت چٹان کی مانند تھا۔ مولانا نے حکومت کو انتباہ دیا کہ کفر وشرک کی حکومت تو چل سکتی ہے لیکن ظلم کی حکومت زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔

مولانا مسلسل خواتین کی رہائی کی کوششوں میں لگے رہے، بالآخر سات دنوں بعد خواتین کی رہائی عمل میں آئی۔ مولانا کی زندگی مسلسل آزمائشوں سے عبارت ہے۔ مولانا ان آزمائشوں سے سرخرو ہو کر نکلے۔ مولانا ایمان کے اس درجہ پر فائز تھے کہ "وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا" والی آزمائش بھی پایۂ ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ ڈال سکی۔

ہمیشہ سرخرو اٹھا ہمیشہ کامراں نکلا
شدائد نے لیا ہر معرکہ میں امتحاں اس کا

جامعہ کے شب وروز

مولانا ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ مولانا جہاں نظریہ سازی کے فن میں ماہر تھے، وہیں شخصیت سازی کا فن بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ کتنے ہی پتھروں کو تراش کر کندن بنایا۔ کتنے ہی منزل نا آشنا کو منزل سے آشنائی بخشی، کتنی ہی بے مقصد زندگیوں کو عظیم مقصد اور نصب العین عطا کیا اور کتنے ہی بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم گامزن کر دیا۔

مولانا جہاں ایک کامیاب مربی تھے، وہیں ایک باکمال استاذ بھی تھے۔ مولانا کے علم وفضل، حاضر جوابی، نکتہ رسائی کے بہت سارے واقعات ذہن میں آرہے ہیں، اور تڑپا رہے ہیں۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو جزئیات کے ساتھ تحریر کرتی کہ:

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمئ محفل کی یاد

مولانا کی گھنٹیاں اعلیٰ درجات میں ہوا کرتی تھیں، لیکن کسی معلمہ یا استاذ کی غیر حاضری پر مولانا ہماری عالمہ کی ابتدائی کلاسوں میں بھی آجایا کرتے تھے۔ کبھی وہی سبجیکٹ پڑھاتے، کبھی گرامر کے سوالات کرتے۔ مولانا کا انداز انتہائی مشفقانہ ہوتا، تھوڑی ہی دیر میں طالبات مولانا سے یوں گھل مل جاتیں جیسے ہمیشہ مولانا ہی سے پڑھتی آرہی ہوں۔

ہمارے جامعہ میں تقریری اور تحریری امتحان بھی ہوا کرتا تھا، عنوان ملتے ہی ہم مولانا کے پاس بھاگ کر جاتے کہ ہم سے پہلے کوئی پہنچ نہ جائے، ہم جاتے ہی مولانا کو عنوان بتا کر اس سے متعلق آیت دریافت کرتے،

اور شعر پوچھتے اور مولانا سے کہتے کہ مولانا اب آپ کسی کو مت بتائیے گا، مولانا ہماری بات سن کر مسکرا دیا کرتے کہ مسکرانا تو مولانا کا خاص وصف تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نے ہمیں مسدس حالی کے ابتدائی اشعار بتائے کہ ''کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا'' پورے چھ مصرعے پڑھنے کے بعد مولانا نے پوچھا کہ 'بقراط' کو جانتی ہو؟؟ کون تھا؟ ہم لوگوں نے کہا: ہاں۔ مولانا! ایک حکیم تھے۔ مولانا مسکرائے......ہم نے پوچھا مولانا! آپ کو یہ اشعار ابھی تک کیسے یاد ہیں۔ مولانا نے مسکرا کر کہا کسی زمانے میں تو مسدس کا بیشتر حصہ یاد تھا۔

عربی دوم میں مولانا نے ہمیں دو چار مرتبہ 'کلیلہ ودمنہ' پڑھایا، مولانا کلیلہ ودمنہ خوب مزہ لے کر پڑھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ''باب القرد والغیلم'' کے ابتدائی دو صفحات اور ''باب الناسک وابن عرس'' مکمل مولانا نے ہی ہمیں پڑھایا تھا۔ ''باب البوم والغربان'' کی بھی ایک دو کہانیاں مولانا نے ہی پڑھائی تھیں۔ آج بھی کلیلہ و دمنہ کھولتے ہیں تو مولانا کے انداز کی شیرینی دل ودماغ کو مٹھاس سے بھر دیتی ہے۔ پڑھانے کے لیے مولانا ہماری کلاسز میں کبھی کبھار آتے تھے مگر اسمبلی کے بعد تذکیر اکثر مولانا ہی کی ہوتی تھی اور تذکیر کے بعد اعدادیہ اور عربی اول کی طالبات کو اکثر جامعہ کے صحن ہی میں روک کر گردان کی مشق کرواتے تھے۔

عربی زبان سکھانے کے لیے مولانا نے جامعہ میں یہ اہتمام کروایا تھا کہ اردو اخبار کی کسی خبر کو بورڈ پر لکھ کر اس کا عربی ترجمہ بھی لکھ دیا جاتا اور یہ بورڈ تذکیر ہال میں رکھ دیا جاتا اور طالبات کو یہ تاکید ہوتی کہ سب لوگ اپنی اپنی نوٹ بک میں اس کو نوٹ کرلیں۔ اس طرح مولانا طالبات میں ترجمہ کے ذوق کو پروان چڑھاتے تھے۔ اسی طرح شہر میں منعقد ہونے والے علمی مقابلہ جات میں طالبات کو شرکت کا موقع فراہم کیا جاتا، چنانچہ مدرسہ کی طالبات 'انجمن اقبال'، 'تعمیر ملت'، 'بنتِ حرم' کے مقابلوں میں حصہ لیتیں اور انعامات حاصل کرتیں۔ اسی طرح جمعیت اہلِ حدیث کی جانب سے حفظِ حدیث کے مقابلوں میں طالباتِ جامعہ نے بھرپور تیاری کے ساتھ حصہ لیا اور ہمارے ہی جامعہ کی طالبہ نے پہلی پوزیشن حاصل کی، جس کی گونج شہر بھر میں مہینوں سنائی دیتی رہی۔ یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کیونکہ اس مقابلہ میں شہر حیدرآباد کے تمام دینی مدارس کے طلبہ و طالبات اور دیگر ریاستوں کے فارغین بھی شریک تھے۔

مولانا نے باقاعدہ ہمیں فضیلت سال اول میں پڑھایا۔ ہم نے مولانا سے تفسیر پڑھی۔ مولانا نے ہمیں سورۃ المائدۃ سے پڑھانا شروع کیا۔ مولانا ایک ایک لفظ کی ایسی عمدہ اور واضح تشریح کرتے کہ وہ آیتیں نقش ہو جاتیں۔ مولانا نے جو کچھ پڑھایا وہ آج تک ذہن میں تازہ اور مستحضر ہے۔ مولانا لفظی ترجمہ کے قائل تھے لفظ کو پکڑ کر چلنے کی تاکید کرتے اور صرف ونحو کے قواعد پوچھتے ہوئے سبق آگے بڑھاتے، جب تک عبارت حل نہ

ہو جاتی مولانا آگے بڑھنے ہی نہ دیتے۔

مولانا تفسیر پڑھاتے وقت ایسے ایسے نکتے نکالتے کہ ہم حیران رہ جاتے۔ہم مسلسل سوال کرتے اور مولانا بڑے ہی تحمل سے ہمارے سوالوں کے جواب دیتے۔ چند ہی کلاسوں میں ہم شعائر اللہ، محرمات، یہود و نصاریٰ کی فطرت، یہود کی ہٹ دھرمیوں اور ان کی خوش گمانیوں سے اچھی طرح آگاہ ہوگئے۔مولانا قومِ موسیٰؑ کے جہاد سے جی چرانے کی آیتیں پڑھا رہے تھے کسی طالبہ نے سوال کیا کہ مولانا! آج مسلمان بھی تو جہاد سے جی چرا رہے ہیں۔قومِ موسیٰؑ تو چالیس سال ارض تیہ میں بھٹکتی رہی، جہاد چھوڑنے کے جرم میں مسلمانوں کو کیا سزا دی جا رہی ہے؟؟''

مولانا نے فرمایا: ''وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ، آج مسلمانوں کو بھی تو سزا مل رہی ہے ذلت وخواری کی، بابری مسجد شہید کردی گئی یہ بھی تو سزا ہے۔'' مولانا تفسیر پڑھاتے تو ایسا لگتا کہ علم کا ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس سے ہر لحہ گرانقدر موتی برآمد ہو رہے ہیں۔

واللہ! اس سے قبل ہم قرآن کے اس ذائقہ سے محروم تھے۔مولانا نے ہمیں سوچنا، سمجھنا، قرآن میں تدبر و تفکر کرنا سکھایا، زندگیوں کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنا سکھایا، قرآن میں غوطہ زن ہوکر جدتِ کردار کا ہنر سکھایا۔تفسیروں سے استفادہ کی عادت ڈلوائی، دورانِ درس مولانا کہتے کہ ''تدبر قرآن کھولو جی! دیکھو! صاحبِ تدبرِقرآن کیا کہہ رہے ہیں۔'' اکثر ہم تدبر قرآن سے آیات کی تشریح مولانا کو پڑھ کر سناتے۔ایک مرتبہ مولانا نے ہم لوگوں سے کہا کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ صاحب تدبر قرآن نے قرآن کی تفسیر تحریر کرنے میں احادیث سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ کوئی تدبر قرآن سے یہ جائزہ لیتا کہ اس میں احادیث سے کتنا استفادہ کیا گیا ہے؟'' مولانا نے ہمارے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا مگر افسوس ہم مولانا کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔مولانا اردو تفاسیر کے علاوہ عربی تفاسیر سے بھی استفادہ کی ترغیب دیتے، چنانچہ کلاس میں اگر کوئی بحث چھڑ جاتی تو مولانا علامہ آلوسی کی ''روح المعانی'' اور امام رازی کی ''تفسیر کبیر'' کلاس میں منگوا کر پڑھاتے۔ یہ دونوں تفاسیر مولانا کی میز پر رکھی رہتیں۔ اکثر ہم مولانا کو غرقِ مطالعہ دیکھتے۔مولانا اس طرح ہمیں قرآن میں آیت کی تفسیر آیت سے، حدیث سے، اقوالِ صحابہ وسلف سے پڑھاتے۔مولانا شیدائی قرآن اور فدائی قرآن تھے اور قرآن کی تفسیر پڑھا کر یہی جذبہ ہم طالبات میں بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتے۔

فضیلت ثانیہ میں مولانا نے ہمیں 'تفسیر بیضاوی'، 'حجۃ اللہ البالغۃ'، 'مختارات من ادب العرب حصہ دوم'، 'دلائل الاعجاز' اور 'دیوان الحماسۃ' پڑھایا۔اس سال ہم نے ایک الگ ہی علمی جہان دریافت کیا۔

بیضاوی جب ہم پڑھتے تو بالکل چکرا جاتے۔ مادہ کی بحث، لفظ کے معنی، اس کے استعمالات، تراکیب میں اختلافات وغیرہ۔ ایک مرتبہ میں نے کہا

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

مولانا زور سے ہنسے۔ اکثر انہی باتوں سے ہماری کلاس کا ماحول ادبی ہوجایا کرتا، ایک مرتبہ ہم طالبات مولانا کو اشعار سنا رہی تھیں، مولانا نے بھی ہمیں ایک شعر سنایا، غالباً مولانا نے کہا کہ یہ سید حامد علیؒ صاحب کا شعر ہے

سوچتا رہتا ہوں رات و دن صبح شام و سحر
کیوں ہوگئی ہے موت سے بدتر ہماری زندگی

مولانا نے کہا کہ میں بھی دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ ہماری زندگی ایسی کیوں ہوگئی ہے۔ مولانا امت کی حالت پر ہمیشہ ماتم کناں رہتے، بارہا ہم طالبات سے اس کا اظہار کرتے۔

بیضاوی کے بعد مولانا جب حجت پڑھانے آتے تو ہماری ساری کلاس خوش ہوجاتی۔ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہم سب کا پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ حجت جب ہم پڑھ رہے تھے اسرارِ شریعت سے آشنائی ہورہی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ مولانا عقیدت سے کرتے اور ہر بات میں کہتے دیکھو شاہ صاحب کہہ رہیں کہ......ہم نے حجت میں ابداع، خلق، تدبیر، ذکر عالم المثال، حقیقۃ الروح، ذکر ملاءِ اعلیٰ وغیرہ پڑھا۔ مولانا کا ایک خاص انداز تھا حجت میں، کہتے ''دیکھو جی! شاہ صاحب کہہ رہے ہیں اس دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ فوٹو کاپی ہے، اس سے پہلے یہ ساری چیزیں ایک دوسرے عالم میں وجود پذیر ہوچکی ہیں۔'' قوت ملکوتیہ اور قوت بہیمیہ کی بحث میں طالبات بہت سارے سوالات کرتیں۔ مولانا حظیرۃ القدس کا نقشہ کھینچ رہے تھے اور ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ فرشتوں کی پاک مجلس کو ہم اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

''تفسیر بیضاوی'' اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' عموماً لڑکیوں کے مدارس میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ ایک مرتبہ حیدرآباد میں لڑکیوں کے دینی مدارس کا نصاب کیا ہو، اس پر غور وفکر کے لیے کئی مدارس کے ذمہ داران کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں مولانا کے ایک اصلاحی ساتھی جو لڑکیوں کا ایک بہت بڑا مدرسہ چلاتے تھے، انھوں نے کہا کہ لڑکیوں کے مدارس کے نصاب میں ''تفسیر بیضاوی'' اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' رکھنا مناسب نہیں ہے۔ یہ سبجیکٹ طالبات کے لیے مشکل ہوجاتے ہیں۔ اس پر مولانا نے میٹنگ میں کہا کہ ''اگر ان کتابوں کو نصاب سے نکال دیا گیا تو مدارس کا کیا معیار رہ جائے گا۔ لڑکیوں کے مدارس کا معیار برقرار رکھنے کے لیے ان کتابوں کو شاملِ

نصاب رکھنا ضروری ہے۔''

مولانا ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے کہ لڑکیوں کے مدارس کا تعلیمی معیار اعلیٰ ہو، اس معیار کو برقرار رکھنے کے لیے مولانا نے جی جان لگا دیا، اللہ مولانا کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آمین!

مولانا ملت اسلامیہ کی فکر میں گھلتے رہتے تھے

میرا غم ہو تیریٔ ملت، یہی غم مری خوشی ہو

کبھی رو پڑوں خوشی میں، کبھی غم میں مسکراؤں

کہ ہرا ہو تیرا گلشن، میں وہ سیل اشک لاؤں

یہ خزاں بہار ہو گر، میں رگوں کا خوں بہاؤں

دورانِ تعلیم ہم نے دو مسئلوں پر مولانا کو بہت زیادہ مضطرب اور حساس پایا، عالمِ اسلام اور فکرِ اسلامی۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ مسجد اقصیٰ اور مسئلہ فلسطین پر مولانا گہری نظر رکھتے تھے۔ ہمارے دورِ طالب علمی میں اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شارون 9 ستمبر 2003ء کو ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ یہ کسی اسرائیلی وزیر اعظم کا پہلا دورۂ ہندوستان تھا۔ ہماری کلاس میں مولانا اس ظالم صہیونی کے دورے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ فلسطینیوں کے قاتل اور مسجدِ اقصیٰ کے دشمن سے ہندوستان میں عزت واکرام کا معاملہ کیا جا رہا ہے، ان یہودیوں کے لیے تو دنیا وآخرت دونوں جگہ رسوائی وذلت مقدر ہے۔

مولانا عالمِ اسلام کے تمام مسائل کو مسجد اقصیٰ سے وابستہ مانتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام مسائل کو بابری مسجد سے وابستہ مانتے تھے۔ مولانا کہتے تھے کہ

> ''یہ قدرت کی مہربانی ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سارے مسائل کو ایک مسئلہ میں سمیٹ دیا ہے جیسے کسی فوج کو درجنوں محاذوں پر لڑنے کے بجائے قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہوں کہ وہ ایک ہی محاذ پر قوت آزمائی کرے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر فتح مند ہو جائے یا اپنے نکمے پن کا ثبوت دے کر پسپا ہو جائے۔'' (مساجد اللہ)

مولانا نے ہمارے اندر یہ شعور پروان چڑھایا کہ ہم ایک عالمی امت ہیں اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو کہیں نقصان پہنچتا ہے تو وہ ہمارا اپنا نقصان ہے۔ 2003ء میں عراق پر حملہ ہوا تو مولانا نے جامعہ کی تمام لڑکیوں کو جامعہ کے صحن میں اکٹھا کر کے عراق کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ مولانا عراق پر امریکی حملے کی مذمت کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ''ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔'' مولانا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ

رہے تھے، شدت گریہ سے چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ مولانا زیادہ کچھ نہ کہہ سکے، آپ کے بعد جامعہ کے استاذ مولانا حمایت المقیت صاحبؒ نے عراق کی تاریخ، امریکی حملہ کے پس پردہ حقائق بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''اس خطہ میں ایک ہی فلسطینیوں کا ہمدرد ہے صدام حسین، اسے بھی امریکہ راہ سے ہٹا کر عراق کو معاشی طور پر کمزور کردینا چاہتا ہے، تاکہ کوئی اسرائیل کے سامنے آئندہ سر نہ اٹھا سکے۔''

اسی طرح 2004ء مارچ میں شیخ احمد یٰسین کی شہادت کے موقع پر مولانا نے جو ایمان افروز الفاظ کہے وہ یہ تھے کہ ''ایک بوڑھے، معذور شخص سے بھی اسرائیل کو اتنا خوف ہے کہ اس پر بمباری کرتا ہے شیخ احمد یٰسین کو مار کر اسرائیل کو کیا ملا؟ لیکن شیخ جو اپنی عمر کی سات دہائیاں پار کر چکے تھے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوگئے۔ شہادت سے بڑھ کر ایک مومن کے لیے اور کیا سعادت ہوسکتی ہے! اسرائیل یہاں اپنی ساری چالبازیوں کے باوجود ناکام ہوگیا۔'' مولانا یہ باتیں کہہ رہے تھے تو آپ کا چہرہ جوش ایمانی سے تمتما رہا تھا۔

شیخ احمد یٰسین کی شہادت کے ایک مہینہ بعد ہی اسرائیلیوں نے عبدالعزیز الرنتیسی کو شہید کردیا، ہم نے اس نوجوان جری قائد کی شہادت پر مولانا کو بہت غمگین دیکھا۔ مولانا کہہ رہے تھے کہ ''یہ حماس کی ریڑھ کی ہڈی تھے، یہ حماس کا بہت بڑا نقصان ہے، اس کے باوجود ہم دنیوی نقصان کو نقصان نہیں سمجھتے، ہماری نظر میں یہی اصل فائدہ ہے کہ اللہ نے ہماری جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔''

اسی طرح جب 2009ء میں ملت کی مظلوم بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی گرفتاری کی خبر منظر عام پر آئی تو مولانا غمگین اور مضطرب ہوگئے بار بار کہتے کہ ''ہم اللہ کے یہاں گرفت سے نہیں بچ پائیں گے''، جامعہ میں عافیہ صدیقی کے لیے ایک دعائیہ اجتماع منعقد کیا گیا اور پھر مولانا کی تحریک اور مشورہ پر حیدرآباد پریس کلب میں بھی ایک جلسہ عام ''امت کی مظلوم بیٹی عافیہ صدیقی'' کے نام سے منعقد ہوا۔

عافیہ صدیقی کے ذکر پر مولانا کی آنکھیں نم ہوجایا کرتیں یہ غم بھی مولانا کے دل کا ناسور بنا رہا۔ کاش! عافیہ صدیقی کی رہائی مولانا کی زندگی میں ہوجاتی۔

مولانا اس طرح تعلیم و تعلّم کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر دینی شعور، دینی حمیت و غیرت اور عالم اسلام سے محبت و تعلق کو پروان چڑھاتے۔

مولانا کہیں بھی سفر پر جاتے تو واپس آکر ہم طالبات سے درجہ میں اپنے سفر کے واقعات اور تجربات بیان کرتے۔ ہم فاضلہ ثانیہ میں تھے مولانا رمضان کے بعد عمرہ سے واپس آئے، سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ ''میں جدہ میں راستہ سے گزر رہا تھا کہ ایک شخص اچانک میرے سامنے آگیا مجھے روک کر سلام کیا

اور کہا "أأنت ایمن الظواھری" (کیا آپ ایمن الظواہری ہیں) میں نے کہا "لا" نہیں تو۔ اس نے کہا "لکن کانك الظواھری" (لیکن آپ الظواہری جیسے ہی ہیں)۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مولانا ایمن الظواہری سے اتنے زیادہ مشابہ تھے کہ کوئی بھی دھوکہ کھا سکتا تھا۔

اسی سال مولانا نے کویت کا سفر بھی کیا۔ مدرسہ کی نمائندگی کے لیے نادرالنوری ٹرسٹ تشریف لے گئے وہاں گئے تو ان لوگوں نے کہا کہ آپ تو پچھلے سال آئے ہی نہیں......مولانا نے ہنس کر ان سے عربی میں کہا کہ ''میں نے حدیث پر عمل کیا ہے۔ حدیث میں ہے "زُرغبا تزدد حبا" ناغہ کر کے آنے کو تو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ یہ کوئی قصور تو نہیں ہے کہ پچھلے سال نہیں آئے تھے۔'' مولانا کی بات سن کر ٹرسٹ کے ذمہ داران مسکرانے لگے اور کہا کہ بھئی آپ کی بات تو درست ہے اور پھر مدرسہ کے لیے بھرپور تعاون کیا۔

مولانا ہم طالبات سے یہ باتیں شیئر کر کے اصل میں ہماری تربیت کرتے کہ آپ کے سامنے کتنا ہی بڑا آدمی ہو، آپ کو مرعوب نہیں ہونا ہے اور اپنی بات سلیقہ سے رکھنا ہے۔ مولانا نے کلاس میں جب یہ واقعہ سنایا تو ہم نے محض ایک واقعہ کی طرح سنا اور مولانا کی حاضر جوابی پر خوش ہوئے خوب ہنسے......لیکن آج جب یہ بات یاد آتی ہے تو سوچتے ہیں کہ کس طرح مولانا بغیر مرعوب ہوئے اپنی بات کہہ دینے کا فن جانتے تھے۔

مولانا جامعہ کی طالبات کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح اور سدھار کے لیے بھی مختلف قسم کے پروگرام منعقد کرواتے تھے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں خواتین کے لیے اصلاحِ معاشرہ کے اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا۔ رمضان کی آمد سے قبل محلہ واری سطح پر ''جلسہ استقبال رمضان'' منعقد کیا جاتا، اس کے علاوہ شہر کے سلم علاقوں میں جہاں دین سے دوری ہوتی ہے، ان علاقوں میں دین کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے گاہے بہ گاہے اجتماعات منعقد کیے جاتے۔

ان اجتماعات کے ذریعہ طالبات کی تقریری صلاحیتوں کو جلا ملتی اور طالبات کے اندر سے اسٹیج فیئر ختم ہوجاتا۔ طالبات کی تقریری وتحریری صلاحیتوں میں اضافہ کے لیے وقتاً فوقتاً جامعہ میں مقابلے بھی کروائے جاتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ جامعہ میں 2012ء میں ایک ''اسلامی پینٹنگ نمائش'' کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں امت کو درپیش مسائل اور اسلامی تاریخ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس طرح کے پروگرامس کے ذریعہ مولانا معاشرے کے جمود کو توڑنے کی کوشش کرتے اور مسلمانوں میں عمل کا داعیہ پیدا کرتے۔

''الاصلاحیۃ'' مولانا کی آرزوؤں اور تمناؤں کا آخری مرکز اور جہد وعمل کا محور رہا۔ الاصلاحیۃ کا معیارِ تعلیم بلند کرنے کے لیے مولانا ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ طالبات کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ

سے نہ جانے دیتے۔ فکری اور عملی ہر لحاظ سے طالبات کی تربیت کر کے انہیں علم وعمل کی راہوں پر دم لیے بغیر رواں دواں رہنے کی تلقین فرماتے چنانچہ گرمائی تعطیلات میں بھی طالبات کو ''پندرہ روزہ اسلامک سمر کیمپ'' کے انعقاد کی ذمہ داری سونپ کر انہیں چھٹیوں میں بھی مصروف عمل رکھتے۔ مولانا کی یہ سمر کلاسز نیلور سے لے کر وشاکھاپٹنم تک، گوداوری سے کھمم تک، راجستھان سے مہاراشٹرا تک، جھارکھنڈ سے آسام تک تمام علاقوں میں منعقد ہوتیں جن سے ملت کے نونہالوں اور عام طالبات وخواتین کی دینی تعلیم وتربیت کا کام انجام پاتا۔

مولانا کا وژن انتہائی وسیع تھا۔ طالبات کو ہمہ وقت تاکید کرتے کہ یہاں سے فراغت کے بعد مدرسہ قائم کرنا اور قرآن وسنت کے پیغام کو عام کرنا ہے۔ بیشتر طالبات نے مولانا کی اس ہدایت پر عمل کیا، چنانچہ آج طالبات نے ہندوستان بھر میں چھوٹے چھوٹے ادارے، تعلیم گاہیں، مسائی وصباحی مدرسے قائم کرر کھے ہیں۔ صرف حیدرآباد ہی میں سینکڑوں ایسے مراکز ہیں جہاں مولانا کی طالبات تعلیم وتربیت کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

مولانا کا فیض عام جاری رہے گا

مولانا کا اخلاص اور مولانا کا فیضانِ نظر ہی ہے کہ مولانا کی تمام طالبات علمی وعملی دنیا میں مصروف عمل اپنی قابلیت وصلاحیت کا لوہا منوا رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مخلص مردِ مومن محض اپنی نگاہِ التفات اور تبسم بے ریا سے کئی بھٹکے ہوئے مسافروں کو جانبِ منزل رواں دواں کر دیتا ہے۔ مولانا کے باب میں یہ بات بالکل صادق آتی ہے کہ مولانا کے ایک باغ سے سینکڑوں باغ وجود میں آچکے ہیں، جن کے پاکیزہ ثمرات سے انشاء اللہ ملتِ اسلامیہ فیض اٹھاتی رہے گی......کفر و شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں توحید خالص کے چراغ جلتے رہیں گے......ظلم وستم کی سیاہ رات میں ایمان واستقامت کے جگنو چمکتے رہیں گے......کفر وارتداد کی آندھیوں میں حق کے دیے روشن ہوتے رہیں گے......فکری ونظری گمراہیوں کے درمیان احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی صدائیں گونجتی رہیں گی......اور مولانا کا غلبۂ اسلام ......اور بابری مسجد کی تعمیر نو کا خواب......انشاء اللہ ان کے ذریعہ پورا ہوگا......مولانا کا یہ مقصد نسل در نسل منتقل ہوگا......یہاں تک کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا منظر آنکھوں کو نصیب ہو جائے......

مولانا نے للّٰہیت، خداخوفی، خلوص ومحبت......صداقت واستقامت......شجاعت وعزیمت......امانت و دیانت......کے جو چراغ روشن کیے ہیں......ان شاء اللہ ان کی لو کبھی مدھم نہ ہوگی......مولانا کے محبین......مولانا کے جانشین......مولانا کی فکر سے سمت سفر کشید کرنے والے جانثارانِ تحریک......مولانا سے قال اللہ اور قال الرسول کا درس لینے والے متلاشیانِ وشیدائیانِ علم......مولانا کے مقصد اور نصب العین پر ڈٹے رہنے والے غازیان واسیران ......انشاء اللہ مولانا کے نقوشِ قدم سے منزلوں کا پتہ پاتے ہوئے......مولانا کے مشن کی تکمیل کرتے رہیں گے۔

مولانا! آپ سے ہمارا وعدہ ہے کہ آپ کا مشن......آپ کے بعد بھی جاری رکھیں گے......دریچۂ دل میں آپ کی یادوں کے ...... آپ کی نصیحتوں کے چراغ روشن رکھیں گے...... آپ نے ہمارے لیے اپنی زندگی کھپادی......ہم بھی آپ کے مشن کے لیے اپنی زندگیاں کھپادیں گے......آپ ہمیں سایہ فراہم کرنے کے لیے کڑی دھوپ کا سفر کرتے رہے......درخت کی گھنی چھاؤں بن کر زمانے کے سرد و گرم سے ہماری حفاظت کرتے رہے......ہم بھی آپ کے چمن میں گلوں کی آبیاری کرتے رہیں گے......آپ نے اخلاص سے...... جانفشانی سے......جہدِ مسلسل سے...... ہماری شخصیت کی تعمیر کی......ہم بھی آپ کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے رہیں گے......ہم تو آپ کے قدموں کی دھول بھی نہیں......لیکن آپ کی سیرت کے روشن نقوش سے اپنی سیرت کی تعمیر کرتے رہیں گے......آپ کے بعد زندگی اندھیروں کی نذر ہوتی دکھائی دیتی ہے ......لیکن آپ کی زندہ و جاوید روشن حیات سے زندگی کی راہوں کو منور کریں گے...... کہ یہی آپ سے محبت کا تقاضہ ہے......وفاداری کا تقاضہ ہے......

اے اللہ! ہمارے مولانا کی مغفرت کا سامان کردے......ہمیں ہیشگی کی جنت میں اکٹھا کردے جس طرح مولانا نے رب چاہی زندگی گزاری......اسی طرح ہماری زندگی بھی کردے......اور ساقیٔ کوثر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں جامِ کوثر ہم سب کا نصیب بنادے......آمین!

تو اہلِ جنوں کا تھا روحِ رواں
تو اہلِ خرد کی حسیں داستاں
ہلا ڈالے جس نے دلِ دشمناں
جگر پاش تھی تیری کیسی اذاں
اٹھا جب تو سیلِ رواں کی طرح
کبھی کم نہ ٹھہرا تیرا حوصلہ
کبھی رک نہ پایا ترا قافلہ
ترا ہر عمل اک سعادت بنا
ترا ہر قدم صدقۂ جاریہ
تو صحراؤں میں ایک تنہا شجر
تو آزادیوں کی حسیں رہ گزر

تاریخ ترے نام کی تعظیم کرے گی

عبداللہ عزام غازی، حیدرآباد

ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ کے نیک بندے اللہ کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے اور بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانے کے لیے اپنا تن من دھن لگا دیتے ہیں، ایسی ہی باسعادت شخصیات میں سے ایک شخصیت میرے نانا ابو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ہے، جن کی زندگی کو اگر ایک جملہ میں سمیٹ دیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی زندگی 'دعوتِ دین کی جدوجہد سے شروع ہوکر احیاءِ دین کی جدوجہد پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔' یہ ایک جملہ میرے نانا ابو کی زندگی کی وہ لازوال داستان ہے جو مختلف قسم کی قربانیوں سے عبارت ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اپنے نانا ابو کی زندگی کی روشن یادوں کا تذکرہ کہاں سے شروع کروں۔ اس وقت سے جب میں ان کی آغوشِ شفقت میں پل رہا تھا اور ان کی انگلی تھام کر مسجد جایا کرتا تھا یا اس وقت سے جب میں نانا ابو کی خدمت کے قابل ہوا۔ واقعات کا تسلسل یہ تقاضہ کرتا ہے کہ میری تحریر اسی وقت سے شروع ہو جب میرا دورِ طفلی تھا۔ میں بچپن میں ہمہ قسم کی شرارتوں کا عادی تھا اور نانا ابو میری ان شرارتوں پر مجھے اپنی محفوظ پناہ گاہ میں چھپالیا کرتے تھے۔

وہ مردِ خود آگاہ وخدا مست کی صحبت

نانا ابو کے ساتھ میں اپنی پیدائش سے لے کر نانا ابو کے ہم سے رخصت ہوجانے تک رہا، یہ عرصہ دو دہائیوں پر محیط ہے۔ ابتدائی دو سال کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے مگر جب میں تین سال کا بھی نہیں تھا اور میرے اسکول میں داخلہ کی کارروائی ہورہی تھی تو نانا ابو کا مماّ کو ڈانٹنا اچھی طرح یاد ہے کہ ''ابھی سے ننھے میاں عبداللہ عزام اسکول نہیں جائیں گے۔'' اور میں نانا ابو کی بات سن کر خوش ہورہا تھا کہ بچپن میں اسکول کا مطلب جیل ہوتا

ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جمعہ کے دن اچھی طرح تیار ہوکر پٹھانی سوٹ پر واسکٹ پہنے میں 12 بجے تک نانا ابو کے آفس ''جامعۃ البنات'' میں چلا جایا کرتا تھا اور نانا ابو مجھے دیکھ کر کہتے کہ ''یہ افغانستان کے پٹھان صاحب کہاں سے آئے ہیں بھئی!'' نانا ابو مجھے جمعہ کے لیے تیار دیکھ کر کھل اٹھتے تھے۔ میں آپ کے پاس آفس ہی میں بیٹھا رہتا یہاں تک کہ نمازِ جمعہ کا وقت ہوجاتا اور نانا ابو وضو کر کے میری انگلی تھام کر مجھے مسجدِ بخاری شاہؒ لے جاتے۔ نانا ابو کے ساتھ مسجد جانا مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور میں ایک جمعہ کے بعد دوسرے جمعہ کا انتظار کرتا تھا۔ میں آفس میں دیکھتا کہ نانا ابو قرآن پڑھ رہے ہیں، جب تھوڑا بڑا ہوا تو پتہ چلا کہ نانا ابو کا معمول ہے کہ جمعہ کے روز مسجد جانے سے پہلے سورۃ الکہف ضرور پڑھتے ہیں۔ نانا ابو ہمیں بھی جمعہ کے روز سورۃ الکہف پڑھنے کی تاکید کرتے تھے۔

نانا ابو کی شخصیت میں وہ کشش تھی کہ میں ہوش سنبھالتے ہی نانا ابو کے ارد گرد رہنے کو ترجیح دیتا۔ اسکول جانے سے پہلے نانا ابو کے پاس اور اسکول سے آتے ہی نانا ابو کے ارد گرد، یہ میرا معمول تھا۔ نانا ابو کہیں جا رہے ہوتے ضد کر کے ان کے ساتھ لگ جاتا۔ چنانچہ بچپن ہی سے تمام اجتماعات اور مجالس میں نانا ابو کے ساتھ شریک رہتا، اگر کسی اجتماع وغیرہ میں نانا ابو کا خطاب ہوتا تو آپ کے عین پیچھے کھڑا رہتا۔ بچپن کے ایسے بہت سے مناظر میرے ذہن میں گھوم رہے ہیں جب میں نانا ابو کی تقریر کے دوران چہرے پر سنجیدگی طاری کیے آپ کی بات سمجھنے کی کوشش میں دانشور نظر آنے کی کوشش کرتا، لیکن پلے کچھ نہ پڑتا۔ بجز اس کے کہ نانا ابو بابری مسجد کے لیے رو رہے ہیں، سوائے اس کے کہ نانا ابو اسیروں کے لیے غمگین ہیں، سنتا ہوں کہ جب میں تین سال کا تھا تو ہمارے گھرانے پر آفتوں، آزمائشوں اور بلاؤں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ بڑے ماما شہید مجاہد سلیم کی پہلے غیر قانونی گرفتاری، جبری گمشدگی پھر آپ کی شہادت اور اس کے بعد میں سات سال کا تھا تو چھوٹے ماما معتصم باللہ کی گرفتاری، چھوٹا ہونے کے باوجود، ان تمام حالات سے میں اچھی طرح باخبر تھا۔ کیونکہ ہماری تربیت نانا ابو کے زیرِ سایہ اس انداز سے ہو رہی تھی کہ ہم نہ صرف اپنے گھر میں بلکہ اپنے ملک اور دنیا میں پیش آنے والے ہر طرح کے حالات و واقعات سے باخبر رہتے۔ میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ نانا ابو کی تقلید میں اردو اخبار ''منصف'' اٹھا لیا کرتا، اس میں تصویریں دیکھتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے نانا ابو اس میں کیا دیکھ رہے تھے اور پھر غور کرتا کہ اس تصویر کا مطلب کیا ہے۔ اسی تجسس اور شوق میں میں نے کچھ ہی دنوں میں اردو سیکھ لی یہاں تک کہ اردو اخبار پڑھنے کے قابل ہوگیا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ محض دس برس کی عمر سے ہی نانا ابو کے ساتھ مل کر خبروں پر تبصرہ کرنے لگا۔ یاد آ رہا ہے کہ نانا ابو اس وقت میرے ساتھ اس طرح گفتگو کرتے جیسے میں کوئی بڑا مفکر اور دانشور ہوں۔ نانا ابو بچپن میں

ہم بھائی بہنوں کی تربیت کے لیے کبھی ہمیں کتابیں پڑھنے کو دیتے تو کبھی واقعات سناتے۔

چھٹیوں میں جب تمام خالہ زاد بھائی بہن اکٹھے ہوتے تو نانا ابو ہمیں فارسی اور عربی پڑھاتے۔ بچپن میں ہی نانا ابو نے ہم سب بھائی بہنوں کو ایک گردان یاد کروائی فعل، فعلا، فعلوا۔ ہم چونکہ چھٹیوں میں شرارت اور مستی کے موڈ میں ہوتے اس لیے نانا ابو کے ہاتھ کم ہی لگتے مگر نانا ابو غیر محسوس طریقے سے ہمارا وقت ضائع ہونے سے بچانے کے لیے فوراً ہی چھٹیوں میں مولوی صاحب کا انتظام کردیتے جو شام کے اوقات میں ہمیں قرآن پڑھاتے اور سورتیں یاد کرواتے۔ اسی طرح نانا ابو وقتاً فوقتاً ہمیں علامہ اقبالؒ کے اشعار یاد کرواتے۔ ہمارے بچپن میں جبکہ ہمارا گھرانہ مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزر رہا تھا لیکن ہم نے کبھی گھر کے ماحول کو آزردہ اور افسردہ نہیں دیکھا بلکہ ہم نے دیکھا کہ نانا ابو ہماری ہر طرح کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارا رزلٹ، ہماری تعلیم، ہماری نماز، ہمارا قرآن سب کچھ نانا ابو کے علم میں ہوتا ہے۔ ہمارے اسکول میں کیا سرگرمیاں چل رہی ہیں، کون سے مقابلے ہو رہے ہیں، میں نے کس کس مقابلہ میں حصہ لیا، کس عنوان پر تقریر کروں گا، نانا ابو پوچھتے رہتے۔ میری تقریر چیک کرتے اور مقابلہ میں انعام حاصل ہونے کے بعد نانا ابو بھی خوش ہو کر انعام دیتے۔ ہم اپنا رزلٹ سب سے پہلے نانا ابو اور نانی کو دکھاتے۔ میں اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں نانا ابو سے شیئر کرتا۔ نانا ابو تمام باتیں غور سے سنتے۔ جب میں تھوڑا بڑا ہوا تو نانا ابو نے مجھے تحریکی لٹریچر کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ میں نے مطالعہ شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ اردو کے مشکل الفاظ آتے تو میں ان کا مطلب نانا ابو سے پوچھتا رہتا۔ میں نے نانا ابو کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا، ان کتابوں کو سمجھنے کے لیے بارہا نانا ابو سے مختلف قسم کے سوالات کیے۔ جن کا جواب نانا ابو بڑی ہی نرمی اور شفقت سے دیتے۔ نانا ابو خوش ہو کر کہتے ''عزام تم تو مفکر ہوتے جا رہے ہو!!''

بچپن کے دن یوں ہی بے فکری سے گزر رہے تھے۔ میں ابھی ساتویں کلاس میں تھا کہ ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس نے نانا ابو کو ہلا کر رکھ دیا۔ 2012ء جون کی 11 تاریخ تھی وہ مدرسہ جس کے آفس میں ہم دن رات اپنے نانا ابو کو مصروف دیکھتے تھے، نانا ابو نے اس سے علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نانا ابو کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا، اس سانحہ نے نانا ابو کے دل و دماغ پر بہت اثر ڈالا، نانا ابو جو ہمہ وقت چاق و چوبند رہتے تھے، اب اکثر سوچ و فکر میں گم دکھائی دیتے۔ یہاں تک کہ آپ کو قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کا غم آپ کے ساتھ تاعمر لگا رہا۔

جب سے نانا ابو کو عارضۂ قلب لاحق ہوا میں نانا ابو کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا۔ نانا ابو کو اخبار سے خبریں پڑھ کر سناتا۔ فون میں نیوز دکھاتا آپ کو کہیں جانا ہوتا تو لے کر جاتا، آپ کے ساتھ اجتماعات میں جاتا، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ 2012ء سے 2022ء تک میں نے نانا ابو کا ساتھ ایک ہفتہ سے زیادہ کے لیے کبھی نہیں چھوڑا،

اگر کہیں جاتا بھی تو ایک ہفتہ کے اندر واپس آجاتا کہ نانا ابو کے بغیر میرا دل ہی نہ لگتا تھا۔ نانا ابو کی فکر ہمہ وقت دامن گیر رہتی تھی۔ نانا ابو مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، صرف مجھ سے ہی نہیں بلکہ گھر کے تمام افراد کا بے حد خیال رکھتے تھے، سب کے کھانے پینے کی فکر رہتی تھی۔ نمازوں کے لیے ہمیں اٹھاتے خصوصاً نمازِ فجر میں پورے گھر کو اٹھانا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ نانا ابو سے میں نے خوب استفادہ کیا، ہر وقت آپ کے ساتھ بیٹھا، آپ کی قیمتی باتوں کو گرہ میں باندھتا رہتا تھا۔ میں نے اپنے نانا ابو کے ساتھ ایک لمبا وقت گزارا ہے اور میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے نانا ابو کی خدمت کا موقع دیا۔ میں نے دل وجان سے نانا ابو کی خدمت کی، مگر پھر بھی یہ احساس ستاتا ہے کہ شاید میں اچھی طرح آپ کی خدمت نہ کرسکا، نانا ابو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، ہر وقت آپ کو میری فکر رہتی، آخری وقت تک آپ میرے کھانے پینے کی فکر میں پریشان رہتے، کوئی دن بھی ایسا نہ گزرتا جس میں آپ نے مجھ سے یہ نہ پوچھا ہو کہ تم نے کھانا کھایا؟ کیا کھایا؟؟ اگر ناشتہ تاخیر سے کرتا تو غصہ کرتے کہتے کہ یہ کوئی ناشتہ کا وقت ہے۔ روز حال احوال دریافت کرتے، پوچھتے آج کی بڑی خبر کیا ہے، میں جب آپ کو خبریں پڑھ کر سناتا تو مختلف سوالات کرتے اور اگر کوئی نیوز کسی اور کے ذریعہ پتہ چلتی تو مجھ سے اس کی تصدیق کراتے اور کہتے کہ تم نے مجھے یہ خبر کیوں نہیں بتائی۔

نانا ابو کی زندگی کا جو کچھ میں نے تجزیہ کیا ہے اور جن امتیازی صفات کا مشاہدہ کیا ہے ان کے متعلق چند باتیں پیش کررہا ہوں۔

وہ سرکش عظیم تھا نظامِ منکرات کا

آپ کی زندگی قرآن وسنت سے گہرے عشق کی عکاسی کرتی ہے۔ آپ کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ آپ کی صحیح اسلامی فکر کا ترجمان ہے۔ آپ کی تمام تر تحریریں اور کتابیں اسلامی اصولوں سے سچی محبت اور گہری بصیرت کی گواہی دیتی ہیں۔ آپ نے ہر محاذ پر ملت کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرکے انھیں ہمہ قسم کی سازشوں سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ ان سازشوں کو ناکام بنانے کی حکمت عملی بھی تیار کرکے ملت کے سامنے پیش کردی۔

ملّتِ اسلامیہ میں جوش وولولہ پیدا کرنے کے لیے قلم تھام کر میدان میں مردانہ وار نکلے ملت کے نوجوانوں پر اپنی فکر کے گہرے اثرات مرتب کیے۔ آزادی کے بعد سے مسلمانوں کو درپیش، غیر اعلانیہ ظلم وجبر اور فسادات کے ذریعہ ان کی نسل کشی کی منصوبہ بندی اور ان کو ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی تمام سازشوں کو بھانپتے ہوئے ملت کے دفاع کا مسئلہ شریعت کی روشنی میں کیا ہے؟ تحریر کیا۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے فرق کو واضح کیا۔ آپ کا فکری کینوس اتنا وسیع تھا کہ اُمّتِ مسلمہ کو درپیش فکری گمراہیوں اور غیر اسلامی تصورات وطاغوتی نظریات کو

اسلام سے جوڑ کر پیش کرنے کی ہر شیطانی سازش پر ضرب لگائی۔

بابری مسجد پر سودے کی بات ہو یا جہاد کے احکامات سے روگردانی، مصلحت کے نام پر ووٹ اور الیکشن کو جائز قرار دینے کی بات ہو یا جمہوری تماشہ میں شرکت کی بات ہو، آپ نے تمام غیر شرعی اعمال کا رد کرتے ہوئے شریعت کی روشنی میں ہر بات کا مؤثر اور بھرپور جواب دیا اور باطل افکار و خیالات پر فکرِ اسلامی کی ایسی ضرب لگائی کہ آج بھی تمام مصلحت پرست اور باطل کے ایوان پناہ مانگتے ہیں۔ نانا ابو نے خوف و مصلحت کا بت پاش پاش کر دیا جسے حق سمجھا بے دھڑک برملا اس کا اعلان کیا۔ جرأت و بے خوفی سے حق بات کہہ دینا آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ آپ نے اسلام پسند نوجوانوں اور طلبہ میں اس بے خوفی کو پروان چڑھایا اور ان پر اپنے گہرے اور اَنمٹ نقوش چھوڑے۔

شجاعت وعزیمت کے مینار

نانا ابو نے جس انبیائی مشن کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر راہِ حق پر گامزن رہنے کا عزم کیا وہ راستہ بہت سی آزمائشوں اور قربانیوں سے گزرتا ہے۔ لہٰذا آپ کا یہ سفر بھی قدم قدم پر آزمائشوں سے بھرا پڑا تھا جس میں آپ نے ہر طرح کی قربانی پیش کی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔

نانا ابو کی زندگی آزمائشوں کی ایک طویل داستان ہے کئی مرتبہ بڑے ماما کو غیر قانونی حراست میں ٹارچر کیا گیا، ایک مرتبہ تو یہ عرصہ بہت طویل ہو گیا، آپ روز اپنے نورِ نظر کا انتظار کرتے اور ان کے گھر واپس ہونے کی راہ تکتے۔ مہینوں اس انتظار میں گزر گئے۔ کچھ خبر نہ ہوئی کہ وہ زندہ ہیں یا شہید کر دیئے گئے ہیں۔ روز و شب اسی کشمکش میں گزر رہے تھے پھر بڑے ماما کچھ دنوں سنت یوسفی ادا کرنے کے بعد نانا ابو کی آغوش میں کچھ پل سکون کے گزارنے کا خواب لیے اپنے گھر میں اپنی ماں بہنوں کے درمیان رہے، مگر یہ عرصہ صرف چار مہینوں پر محیط رہا کیونکہ بڑے ماما ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے، اتنی ہراسانیوں اور حراستوں کے باوجود بھی بڑے ماما کے جوش و جذبہ اور صبر و استقامت میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا تھا اور یہ چیز ظالم برداشت نہ کر سکے۔ بڑے ماما باطل کی آنکھوں کا کانٹا بن گئے۔ لہٰذا انھوں نے بڑے ماما کو اپنے نشانہ پر لے لیا اور آخر کار ایک دن سرِ عام گولیوں سے بھون دیا۔ اس طرح بڑے ماما نے اپنے من کی مراد پالی۔ اس صبر آزما موقع پر نانا ابو صبر و استقامت کی چٹان بنے رہے۔ آپ نے بڑے ماما کی شہادت کو رضائے الٰہی مان کر اپنے رب کے فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور بڑے ماما کی شہادت پر فخر کرتے ہوئے استقامت کا عظیم نمونہ پیش کیا۔

آپ کی پوری زندگی شرار بولہبی سے کشمکش میں گزری۔ آزمائشیں آتی رہیں، اہلِ باطل سے کشمکش چلتی رہی۔

انھوں نے آپ کے گھرانے کے دیگر افراد کو نشانہ پر رکھ لیا۔ آپ کے بیٹے بیٹیوں پر فرضی مقدمات دائر کیے گئے، ان کی گرفتاریاں کی گئیں۔ یہ ہتھکنڈے اور کارروائیاں صرف آپ کو کمزور کرنے، آپ کو اپنے مشن سے ہٹانے اور آپ کی فکر کو قید کرنے کے لیے تھیں، لیکن آپ نے ان تمام آزمائشوں کا بہترین حکمت عملی، دانشمندی اور صبر و استقامت سے سامنا کیا، اس طرح کی تمام آزمائشوں میں شجاعت، جرأت، عزیمت و استقامت کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کا اس زمانہ میں ہندوستان میں کوئی تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہاں تو ہر جگہ خوف و ڈر کے سائے ہیں اور ہر طرف باطل سے مفاہمت و مداہنت، مصالحت و مصاحبت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ بے شک نانا ابو کی یہ استقامت اس ملک میں نانا ابو کے مشن پر گامزن رہنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے:

مصائب میں نہ گھبرانا یہی مومن کی پہچاں ہے
ستم ہنس کر جو سہہ جائے وہی کامل مسلماں ہے

ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

نانا ابو شریعت اسلامی اور شعائر اسلام کے تحفظ کے سلسلہ میں ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ چنانچہ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے اور شہادت کے بعد آپ نے ہر موقع پر اس مسئلہ کی اہمیت کو بیان کیا۔ مسئلہ بابری مسجد سے نانا ابو کی وابستگی کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے، بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانانِ ہند میں 6/دسمبر کو یومِ سیاہ اور یومِ تجدید عہد منانے کا تصور اجاگر کرنے میں آپ کا اہم رول رہا ہے۔ بازیابی بابری مسجد کی جدوجہد کو آپ نے اپنی زندگی کا اہم مشن بنالیا تھا، اس کی بازیابی کو آپ نے ایک شرعی فریضہ قرار دیا ہے۔ بازیابی بابری مسجد کے ہر چھوٹے بڑے اجلاس میں شریک رہتے اور ایک ہی بات کہتے کہ ''بابری مسجد کو دوبارہ بنانا ہے اس کو بازیاب کرانا ہے۔''

جب ۹/نومبر کو بابری مسجد کا حتمی فیصلہ آیا تو نانا ابو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں نانا ابو کو اتنا ایموشنل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ ''اللہ میری گناہ گار آنکھوں کو بابری مسجد کی جگہ بت خانہ کی تعمیر کا منظر نہ دکھانا۔''

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

نانا ابو کو ملک کے حالات مستقبل میں کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں، اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ 2016ء میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کا اجتماع دارالہدیٰ پہاڑی شریف میں ہوا تو کچھ ارکانِ جماعت نانا ابو سے ملاقات کے لیے گھر تشریف لائے، گفتگو کے دوران نانا ابو نے کہا کہ ''اگر حکومت کہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان ملک چھوڑ کر چلے جائیں یا یہ ہمیں کہیں ایک جگہ بند کر دیں تو ہم کیا کریں گے؟؟؟'' جماعت کا جو وفد آیا تھا اس نے

ہنستے ہوئے کہا کہ ''مولانا ایسا ہونا ناممکن ہے۔'' لیکن آج واقعات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ نانا ابو کی بصیرت اور دوراندیشی تھی کہ آنے والے حالات کو بھانپ لیا کرتے تھے اور مستقبل کے خطرات کا اندازہ لگا لیتے تھے۔

نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

نانا ابو نے اسلام کی اشاعت و سربلندی کے جس مشن پر کاربند رہنے کا عزم کیا تھا، اس مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے آپ نے ان تھک محنت اور جدوجہد کی اور اپنی ساری زندگی اسی کے لیے وقف کر دی، لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا اسے پروان چڑھایا۔ ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور تادمِ آخر درس و تدریس کے اس انبیائی مشن سے وابستہ رہے۔

آپ نے اپنی پوری صلاحیتیں اور توانائیاں علم کو پھیلانے، علم سکھانے اور امت کو صحیح فکر اسلامی سے روشناس کرانے کے لیے وقف کر دیں، تعلیمی میدان میں آپ کا ہدف محض چند کتابیں پڑھا دینا نہیں تھا، بلکہ علم کے ذریعے وہ انقلاب برپا کرنا تھا جو ملت اسلامیہ کو عزت و سرفرازی سے ہمکنار کرے۔

ہر نقش ہے ان کا لافانی

نانا ابو بہت ہی سادہ طبیعت کے مالک تھے، دنیا کی رونق و شوکت آپ پر کبھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ آپ نے بہت سادہ زندگی گزاری۔ اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ حتیٰ کہ آپ کو پرانے جوتے تبدیل کروانے کے لیے بھی بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ جب بھی کہا جاتا کہ یہ جوتے پہننے کے قابل نہیں ہیں نیا جوتا پہن لیجیے کہتے کہ ''نہیں ابھی اچھے ہیں، استعمال کے قابل ہیں۔'' ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ نانا ابو کے جوتے کی حالت بہت خراب ہو گئی وہ جگہ جگہ سے پھٹنے لگا، نانی روز کہتیں کہ آج نیا جوتا پہن کر مدرسہ جایئے، لیکن نانا ابو نہیں مانتے، ایک دن خالہ اصرار کرنے لگیں تو پوچھا کہ ''یہ نیا جوتا کتنے کا ہے؟'' خالہ نے کہا کہ ''500 روپئے کا ہے'' تو غصہ سے کہنے لگے، ''اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی'' کہہ کر جوتا سامنے سے ہٹا دیا اور پھر وہی پرانا جوتا پہن کر مدرسہ چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس میں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ نانی نے ایک دن ناراضگی میں اس جوتے کو پھینک دیا، نانا ابو نے دریافت کیا کہ ''ہمارا جوتا کہاں ہے؟'' نانی نے کہا کہ ''میں نے اسے پھینک دیا ہے۔ اب یہ نیا جوتا پہنئے یا ویسے ہی مدرسہ چلے جایئے۔'' نانی کا مصنوعی غصہ دیکھ کر نانا ابو نے مسکراتے ہوئے نیا جوتا پہن لیا اور مدرسہ چلے گئے۔

ایک مرتبہ کسی صاحبِ خیر نے ہاسٹل میں رہائش پذیر لڑکیوں کے لیے آٹے کے دو تھیلوں کا عطیہ گھر لا کر دیا۔ نانا ابو نے فوراً مجھے بلایا اور کہا کہ یہ تھیلے اٹھاؤ۔ تو میں نے کہا کہ یہ بہت وزنی ہیں، میں اکیلے نہیں اٹھا سکتا۔

نانا ابو نے کہا ایک اٹھالو اور خود آگے بڑھ کر دوسرا اٹھالیا اور کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں راستے بھر حیران ہوتا رہا کہ نانا ابو نے اس عمر میں اتنا وزنی تھیلا کیسے اٹھایا۔ بہر حال ہم پیدل ہی نان بائی کی دکان پر گئے۔ نانا ابو نے کہا کہ ہمیں دوپہر تک اس آٹے کی روٹی چاہیے۔ نان بائی نے کہا ''مولانا! آپ فکر نہ کریں۔ دوپہر تک روٹی تیار ہو جائے گی۔'' ہم واپس آ گئے۔ روٹی آئی اور جب تک لڑکیوں نے روٹی کھا نہیں لی، آپ کو اطمینان نہیں ہوا۔

ایسے واقعات سننے اور لکھنے میں بہت معمولی نظر آتے ہیں لیکن جب ان کی گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنی عظمت وتقویٰ کی باتیں ہیں جو ذہن ودل پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

وہ ہمدرد سب کا، وہ سب کا رفیق

2020ء میں کرونا کی مہلک وبا نے ملک سمیت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، پورے ملک میں لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا۔ مساجد بند کر دی گئیں، لوگ اپنے گھروں تک محدود ہو گئے، محلہ کے لوگوں نے نمازِ تراویح اور نمازِ باجماعت کا اہتمام کیا تو نانا ابو ہر روز نماز اور تراویح کے لیے اکیلے ہی چلے جایا کرتے۔ میں کہتا کہ ''نانا ابو آپ نے مجھے آواز دی ہوتی تو میں آپ کو لے کر جاتا۔'' کہتے ''یہیں دو قدم پر تو جانا تھا تمھیں کیوں بلاتا؟؟'' نانا ابو بڑی ہمت والے انسان تھے، سال کے آخر میں جب حالات معمول پر آنے ہی لگے تھے کہ کرونا کی دوسری لہر نے پھر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نانا ابو نے ہمیں لوگوں کی ہر ممکنہ مدد کرنے پر ابھارا، چنانچہ چھوٹے ماما نے آکسیجن سیلنڈرس کی مفت تقسیم کی، گھر گھر پہنچانے کا انتظام کیا، ہم دن بھر اس میں مصروف رہتے، احتیاطاً نانا ابو کے قریب نہ جاتے کہ ہم اِدھر اُدھر گھوم پھر کر آ رہے ہیں، نانا ابو تفصیلات جاننے کے لیے بے چین رہتے، اچھی طرح نہانے کے بعد پوری احتیاط کے ساتھ میں نانا ابو کے قریب جاتا اور دن بھر کی روداد سناتا۔ نانا ابو سن کر خوش ہوتے اور کہتے کہ ''لوگوں کی مدد سے کبھی پیچھے نہ ہٹنا زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' نانا ابو دیوان خانہ کا دروازہ کھول کر بیٹھے رہتے، آنے جانے والے سے تفصیل پوچھتے، اگر کوئی آکر سیلنڈر لے جاتا تو دوسری مرتبہ کیوں نہیں آیا تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔ ہم احتیاط کرنے کی تاکید کرتے تو ہماری بات نظر انداز کر دیتے۔ نانا ابو بھی کرونا کی اس لہر میں بری طرح متاثر ہوئے تھے، لیکن اللہ نے مکمل شفاء عطا فرمائی تھی۔ الحمدللہ!

2022ء میں حجاب پر پابندی کا مسئلہ اٹھا۔ نانا ابو نے مجھے بلایا اور اپنا بیان تحریر کروایا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ اپنا موقف واضح کرے۔ نانا ابو بورڈ کے رویہ سے بہت مایوس تھے۔ نانا ابو کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا۔ جب عدالت نے حجاب پر پابندی کا فیصلہ سنایا تو نانا ابو نے اس فیصلہ کو ظالمانہ قرار دیتے ہوئے اسلام دشمنی پر مبنی اس فیصلہ کی مذمت کی۔

عزم وہمت کے پیکر

مارچ2022ء میں ''جامعۃ الشیخ المودودیؒ'' کا سالانہ جلسہ تھا، نانا ابو کے لیے دور کا سفر کرنا انتہائی مشکل تھا۔ نانی نے کہہ دیا کہ'' آپ جلسہ میں مت آیئے ورنہ طبیعت مزید خراب ہوجائے گی۔'' گھر سے تمام لوگ جلسہ میں شرکت کے لیے چلے گئے، میں نانا ابو کے پاس ہی رہا۔تھوڑی دیر بعد نانا ابو مجھ سے کہنے لگے کہ'' جلسہ میری صدارت میں رکھا گیا ہے اور مدرسہ کا ناظم بھی میں ہوں، یہ مناسب نہیں کہ میں نہ جاؤں،تم جلدی سے گاڑی منگواؤ،ہم بھی جلسہ میں جائیں گے۔'' میں نے طویل سفر ہونے کی بات کہی تو کہا کہ'' کیا ہم نہیں جانتے کہ پہاڑی شریف کہاں ہے؟ جلدی کرو دیر نہ ہوجائے۔'' کمزوری کے باوجود نانا ابو نے ایک گھنٹہ کا طویل سفر بذریعہ کار طئے کیا جبکہ حال یہ تھا کہ آپ چندمنٹ بھی بیٹھ نہیں پاتے تھے۔جلسہ گاہ پہنچے قرآن حفظ کرنے والے طلبہ کو مبارکباد دی، انہیں انعامات سے نوازا۔کافی دیر تک روتے رہے اور کہتے رہے کہ'' ان مدارس کی بڑی اہمیت ہے۔'' کچھ ہی دنوں بعد مدارس کے سروے کا سلسلہ شروع ہوا۔نانا ابو نے کہا'' یہ سروے نہیں یہ مدارس پر حملہ کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ہمیں تمام وسائل بروئے کار لا کر مدارس کا تحفظ یقینی بنانا چاہیے کہ آج اسلام انہیں مدارس سے زندہ ہے۔''

وہ عزم جواں ہر لمحہ رواں

نانا ابو نے آخری بیان جو مجھ سے تحریر کروایا وہ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موضوع پر تھا۔نانا ابو نے کہا کہ شاتمِ رسول کی سزا پر امت کا اجماع ہے، اور آج دینی حلقوں کی جانب سے اسے متنازعہ بنانے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے۔اس کو متنازعہ قرار دے کر لوگ اللہ کے دربار میں اپنے خلاف خود گواہ کی حیثیت سے پیش ہورہے ہیں۔

انتقال سے چند دن قبل میں نانا ابو کو مدرسہ لے کر گیا، نانا ابو نے مدرسہ میں طالبات سے ملاقات کی، ٹیچرس سے ملاقات کر کے مدرسہ کے تعلیمی حالات دریافت کیے اور مدرسہ کی کارکردگی پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا اور بار بار اللہ کا شکر ادا کرتے رہے۔

انتقال سے قبل نانا ابو جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد جانے پر اصرار کرنے لگے۔میں اور چھوٹے ماما آپ کو مسجد لے گئے، وہاں بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔نانا ابو مسجد سے واپس آ کر بہت خوش نظر آرہے تھے۔جمعہ کے دو دن بعد سے آپ کی طبیعت بگڑنے لگی۔

اہلِ چمن کے درد کا درماں چلا گیا

انتقال سے دو دن قبل مجھے بلایا اور کہا کہ دیکھو اخبار میں کیا خبر ہے۔میں نے پڑھ کر سنایا اس کے بعد نانا

ابو نے ناشتہ کیا اور رات دیر گئے تک سب سے بات چیت کرتے رہے۔ رات میں اچانک نانا ابو اللہ اللہ! اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگے، میں نے پوچھا نانا ابو کہیں تکلیف ہے؟'' تو کہنے لگے ''نہیں۔'' میں نے اصرار کیا کہ نانا ابو آپ تھک گئے ہیں، اب آرام کیجیے تو کہنے لگے ''میں اپنے اللہ کو پکار رہا ہوں۔'' فجر سے کچھ پہلے اچانک پھر آپ کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ چھوٹے ماما نے نانا ابو کو ہاسپٹل لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہاسپٹل جانے کے بعد طبیعت میں قدرے بہتری آئی لیکن سانس کی تکلیف ہونے کی وجہ سے ICU میں ہی رکھا گیا تھا۔ رات میں جب میں ملنے گیا تو میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہیں کل میں آپ کو گھر واپس لے جاؤں گا۔ ان شاء اللہ! میں جب واپس پلٹ رہا تھا تو دروازے تک مجھے دیکھتے رہے اور کروٹ بدل کر آواز دے کر بلانے کی کوشش کی۔ میں پھر نانا ابو کے پاس گیا تو نانا ابو نے پھر ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کہا کہ میں کہیں نہیں جا رہا، تو کہا کہ ''ٹھیک ہے۔''

دوسرے دن میرا امتحان تھا اور یہ لاسٹ پیپر تھا۔ اس لیے اس کا وقت دوسرے امتحانات سے مختلف تھا، میں جب پانچ بجے امتحان ہال سے باہر نکلا تو فون کھولا، چھوٹے ماما کا میسیج دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، ہاتھ پیر سن ہو گئے۔ مجھے ابھی تک نہیں معلوم ہے کہ میں نے اس دن کس طرح بائیک چلائی۔ اور کیسے گھر پہنچا۔ مجھے ہر وقت صدائیں دینے والے میرے نانا ابو میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ایک سکون آپ کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ میرے حواس قابو میں نہیں آ رہے تھے، مگر آپ کے چہرے کا نور اور اطمینان دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ جدائی تو عارضی ہے۔ نانا ابو ہمارے درمیان اپنی محبتوں، اپنی یادوں اور اپنے افکار سمیت ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہر طرح کے حالات میں ہماری اور ملت کی صحیح رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اللہ آپ کے مشن کو آگے بڑھانے اور آپ کی فکر نوجوان نسل میں منتقل کرنے میں ہماری مدد فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

وہ رخصت ہو گئے تو اک خلا محسوس ہوتا ہے
کوئی ملتا نہیں اب، اس چمن میں ترجماں ان کا

نقش ہائے سنگ میل
احساساتِ وابستگانِ جامعہ

اہلِ دل دوستو! مضمحل دوستو! دیدہ ور دوستو! بے جگر دوستو!
کارواں اِک رواں ہے بہ سمتِ جناں، باندھ لو تم بھی رختِ سفر دوستو!

دل میں ترجیحِ عقبیٰ کا اقرار ہو، اتباعِ شریعت پہ اصرار ہو
غیر کے تم تشبہ سے بے زار ہو، ہیں یہی مقصدِ بحر و بر دوستو!

تم سے روٹھیں جو اقدار، پھر خیر کیا؟ ہو نہ اُلفت جو لوگوں سے تو سیر کیا؟
اہلِ ایماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنو، آخرت گر ہے پیشِ نظر دوستو!

جاں فشاں، مہرباں، ہم عناں دوستو! باوفا، بے خطر، بہرہ ور دوستو!
تارِ شب سے نہیں اب مفر دوستو! ہاں تمھیں بس ہو شمس و قمر دوستو!

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت: جیسا کہ میں نے دیکھا

مولانا محمد سہیل احمد مکی
استاذ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، حیدرآباد

ایک ایسی علمی اور فکری شخصیت جو حیدرآباد کے افق پر طویل زمانے تک چھائی رہی، جس کا منہج کتاب و سنت، افکار وخیالات میں صحابہ کی جھلک، سیاسی دباؤ اور سماجی مصالح سے ماورا، رہن سہن میں سادگی اور زہد اس قدر کہ ''کن فی الدنیا کأنک غریب أو عابر سبیل'' کے مصداق، علمی جلالت شان اتنی کہ دقیق سے دقیق علمی موضوعات ہر وقت زیرِ بحث، عوامی زندگی میں اشتراک اتنا کہ ہر وقت دوسروں کی فکر گیری، خدا ترسی کا عالم یہ کہ اپنی تمام عبادات کی پابندی کے باوجود عدم قبولیت کا خدشہ، قرآن فہمی میں اس قدر گہرائی کہ ہر اسلوبِ قرآن اور مقصدِ فرمانِ خدا کا تتبع، اعلائے کلمۃ اللہ اور حفاظتِ شعائرِ اسلامیہ کا بچپن سے آخری ایام تک مسلسل جذبہ جس نے نہ جانے کتنی کتابوں کو زیورِ تصنیف سے آراستہ کرادیا۔ ایسی ہمہ گیر اور جامع کمالات شخصیت جس کو دنیا مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے نام سے جانتی ہے، جن کا علمی سفر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے شروع ہوکر جامعہ مظہر العلوم بنارس اور دارالہدیٰ کریم نگر، جامعۃ البنات حیدرآباد سے ہوتے ہوئے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ پر اختتام پذیر ہوتا ہے، اس طویل سفر میں نہ جانے کتنے نشیب وفراز سے گزرنا پڑا، کتنی صعوبات اور اپنوں کی ستم ظریفیوں کا سامنا کرنا پڑا، کتنے اپنے بیگانے ہوگئے، اور بیگانے اپنے بن گئے! لیکن حضرت مولانا صبر کا دامن تھامے مسکراتے ہوئے محوِسفر رہے۔ اگرچہ مولانا کی زندگی کا نصف اول حصہ بڑا خوشگوار گذرا لیکن نصف ثانی کا آخری حصہ حد درجہ ذہنی تکالیف اور آزمائشوں سے پُر رہا، ایسے حالات میں مولانا نے ایک نئے پلیٹ فارم

''جامعۃ البنات الاصلاحیۃ'' کی بناء ڈالتے ہوئے تعلیمی سرگرمیاں پورے آب وتاب سے شروع کردیں، امتِ مسلمہ کی بیٹیاں اس جلیل القدر علمی شخصیت اور اس کے قائم کردہ اس علمی مرکز سے جوق در جوق استفادہ کرتی رہیں، پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ نوّے سال کا یہ مردِ مجاہد اور خدا ترس عالمِ دین اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔

میں خوش نصیب ہوں کہ حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کی رفاقت اور طویل معیت کا مجھے شرف حاصل رہا ہے، اس کو اگر تاریخی آئینہ میں دیکھا جائے تو ۲۰۰۳ء سے آخری ایام تک سوائے چند سالوں کے استثناء کے یہ رفاقت طویل زمانہ پر محیط ہے، اس طویل رفاقت نے مولانا کی زندگی کے بیشمار واقعات میرے حافظہ میں از بر کردیئے ہیں، نہ جانے کتنی ایسی یادیں حضرت مولانا سے وابستہ ہیں جن کے تصور سے دل افسردہ ہوجاتا ہے، میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور مولانا کے ساتھ بیتے ہوئے تمام لمحات ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے صف آرا ہیں، جی چاہتا ہے کہ مولانا کی حیات اور کارناموں پر تنِ تنہا میں ایک کتاب لکھ دوں، لیکن اس وقت میں ایک مضمون کی تیاری کا پابندِ عہد ہوں جو مولانا کی حیات اور کارناموں پر مختلف حضرات کے مضامین کے گلدستہ کا ایک حصہ ہوگا۔ اس لیے مولانا کی حیات کے اہم گوشوں کو اختصار سے چشم دید گواہیوں کی روشنی میں قلمبند کروں گا۔

۲رجولائی ۲۰۰۳ء کی وہ ایک خوشگوار صبح تھی جب میری پہلی ملاقات حضرت مولانا سے جامعۃ البنات کے آفس میں ہوئی تھی، گو کہ میں مولانا کا ہم وطن تھا لیکن مولانا کا طویل زمانے سے حیدرآباد میں قیام اور وطن سے دوری اور خود میرے مکہ مکرمہ کی یونیورسٹی میں تقریباً چودہ سال کے طویل قیام کے سبب میری مولانا سے کوئی شناسائی نہیں تھی، ایسے میں مولانا میرے لیے اجنبی تھے۔ مولانا سے میری اس پہلی ملاقات میں مولانا کی سادگی نے مجھ پر محض یہی تاثر پیش کیا کہ آپ جامعۃ البنات کے ناظم ہیں۔ ان کی علمی قابلیت اور وسیع النظری پر ان کی سادہ گفتاری نے دبیز پردہ لگا رکھا تھا، البتہ ان کی خوش اخلاقی اور حسنِ تعاون نے میرے دل میں جگہ بنانا شروع کردیا تھا۔ میری تدریسی زندگی کی شروعات یہیں سے ہونے جارہی تھی۔ مولانا نے فوری طور پر میرا انتخاب کرکے اس شروعات پر مہر ثبت کردی۔ اب یہاں سے مولانا سے میری رفاقت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

واقعات کا اس قدر لامتناہی تسلسل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیسے بیان کروں، ہر واقعے میں مولانا کے علمی کمالات، اعلیٰ اخلاقی صفات اور کتاب وسنت کی نظریاتی اصالت کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ اس جامع کمالات شخصیت کا ہر پرتو اس کی گفتار، اس کی چال ڈھال، اس کی خاموشی، اس کی مسکراہٹ کی زبانِ حال سے ہویدا ہے۔ کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

کرم تبین فی کلامک ماثلا
ویبین عتق الخیل من اصواتھا

''شرافت آپ کی گفتگو میں مجسم عیاں ہے۔ گھوڑے کی عمدگی کا پتہ اس کی آواز سے ہی چل جاتا ہے۔''

مولانا کی ذات سے وابستہ بیشتر واقعات کو میں تاریخی تسلسل سے قطع نظر موضوعاتی لحاظ سے چند اہم نقاط پہ تقسیم کرنے کی کوشش کروں گا۔

مولانا کا علمی مقام

حضرت مولانا اصلاحی صاحبؒ نے محض طالب علمی کے دور ہی میں نہیں بلکہ پوری زندگی دینی علوم کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے میں سخت جدوجہد کی ہے، کتابوں کا مطالعہ ان کا بہترین مشغلہ تھا، اس کے علاوہ ہر صاحب علم سے بلا جھجک تشنہ موضوع پر استفسار اور تبادلۂ خیال کرتے۔ مولانا نے مجھے ایک دفعہ بتلایا: ''میں جب جامعہ مظہرالعلوم بنارس میں مدرس تھا تو جیسے ہی کبھی مجھے اطلاع ملتی کہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے ہیں تو میں اسٹیشن پہنچ کر حضرت سے کتاب میں پیچیدہ مسئلہ یا قاعدہ کو دریافت کرلیا کرتا، حضرت فوراً ہی مجھے جواب دے کر مطمئن کر دیتے۔'' جامعۃ البنات میں وقفہ کے وقت اساتذہ کے درمیان رہتے اور تفریحی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی علمی موضوع کو چھیڑ دیتے اور اساتذہ کی آراء معلوم کرتے ہوئے اپنے اشکال کو سامنے رکھتے، پھر جب تک مسئلہ حل نہ ہوتا اس کا تذکرہ بار بار کرتے۔ خالی گھنٹیوں اور وقفہ کے درمیان علمی تبادلۂ خیالات کے بہت سارے واقعات ہیں جو مولانا کی علمی جستجو اور تحقیقی ذوق کے غماز ہیں۔

ایک دفعہ مولانا نے شیخ ابوالحسن علی ندویؒ کی ''مختارات'' کے ایک موضوع ''کیف تتفاضل الکلمات بعضھا علی بعض'' جو علامہ عبدالقاہر جرجانی کی تحریر ہے کی ابتدائی عبارتوں کو میرے سامنے رکھ دیا اور فرمانے لگے: ''مولانا دیکھئے علامہ جرجانی اس عبارت میں کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' میں اس سوال سے متذبذب ہوگیا کہ آیا مولانا کا سوال حقیقی ہے یا وہ میرا علمی جائزہ لے رہے ہیں، جو بھی ہو میں نے کتاب میں غور کرکے مولانا کو جرجانی کا منشا بتلا دیا، اور مولانا خوش ہوگئے۔ اس سے مولانا کا علمی مقام میری نگاہوں میں بلند ہوگیا، کیوں کہ عبارت دراصل دقیق تھی، اس کا ابتدائی حصہ آخری حصے سے مکمل طور پر مرتبط تھا۔

جامعۃ البنات میں جب میرا کوئی پیریڈ خالی ہوتا تو میں کلاس سے آتے ہی مولانا کے آفس میں ان کے پاس بیٹھ جاتا، نہ جانے کون سی مولانا کے اندر کشش تھی جو ہر وقت مجھے ان کے پاس کھینچے لے جا رہی تھی، یا یوں

کہا جائے کہ مولانا کی محبت اور عقیدت آہستہ آہستہ میرے دل میں پروان چڑھ رہی تھی۔ ایسے ہی ایک دن میں کلاس سے آتے ہی مولانا کے پاس چلا گیا، مولانا نے فوراً مجھ سے سوال کر دیا: ''مولانا! شرط، سبب اور علت میں کیا فرق ہے؟ ذرا تحقیق کیجیے۔'' اس سوال نے میرے دل میں مولانا کی عظمت کو اور بڑھا دیا، اور تینوں کے درمیان باریک علمی فرق کی وجہ سے مجھے یہ شائبہ نہ رہا کہ مولانا میرا جائزہ لے رہے ہیں، میں نے فقہی انسائیکلوپیڈیا میں ان تینوں کے فرق کو تلاش کر کے مولانا کے سامنے پیش کر دیا، جس پر مولانا بہت خوش ہوئے۔

ایک دفعہ میں حضرت مولانا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ آپ نے میرے سامنے ایک عربی زبان کا کتابچہ بڑھا دیا، وہ کتابچہ دراصل میت سے متعلق شرعی احکام اور مسائل پر مشتمل تھا، ابتداءِ موت کی ہولناکیوں کی ایسی منظر کشی کی گئی تھی جس سے مومن کے دل پر گہرا اثر ہوتا، جا بجا مسائل کو تصویروں کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، اس لیے کتابچہ بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ مولانا نے یہ فرمایا کہ اس کتابچہ کا آپ اردو میں ترجمہ کر دیں، میں نے تعمیل کرتے ہوئے وقت لے کر ترجمہ کر دیا وہ شائع بھی ہو گیا۔ مولانا کی اس علم نوازی نے جہاں ان کے مقام کو بلند کیا وہیں میری علمی حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

ان سب کے علاوہ مولانا نہ جانے کتنی کتابوں کی عبارات میں اگر ''اِنّ'' کے اسم کو واضح پاتے تو اس کی خبر واضح نہ ہونے کی صورت میں مضطرب رہتے، یا ''کان'' کی خبر واضح ہونے کی صورت میں اس کے اسم کو تلاش کرتے پھرتے اور ہم اساتذہ سے استفسار کرتے، ان کی یہ جستجو اس بات کی آئینہ دار تھی کہ بغیر سمجھے کوئی عبارت سامنے سے نہ گزرے، یہ مولانا کا اعلیٰ علمی ذوق تھا۔

میرے ساتھی اور ہم سبق مولانا محمد ارشد اعظمی جو جامعہ مظہر العلوم بنارس میں علیا کے ایک جید اور باصلاحیت استاذ ہیں، ان کو ایک دفعہ جامعۃ البنات میں ایک ماہ کے لیے بلایا گیا، کیوں کہ میں اور مولانا اصلاحی صاحبؒ جامعہ کے سفارتی دورہ پر کویت جا رہے تھے۔ کچھ دن مولانا کے ساتھ قیام کے درمیان مولانا محمد ارشد صاحب کو حضرت مولانا کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ ہوا، اس کے استدلال میں وہ مجھ سے زبانی کہہ رہے تھے کہ حیدرآباد میں قیام کے دوران حضرت مولانا نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک حدیث کی نحوی ترکیب مجھ سے پوچھی، میں نے اس وقت فوری جواب تو دے دیا، لیکن ابھی تک اس کی ترکیب میں مجھے شرح صدر حاصل نہیں ہوا۔ اس سوال سے مولانا کے علمی مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا ایک ادیب تھے انھیں اسلامی ادب سے شغف تھا، لیکن غیر اسلامی ادب سے انھیں وحشت تھی، کیوں کہ ان کی ساری علمیت کا محور ایک فکری منہج تھا جو خالص کتاب وسنت کی تعلیمات پر مبنی تھا۔

مولانا کا فکری منہج

حضرت مولانا کا فکری منہج سلف صالحین کا منہج تھا جو براہ راست کتاب وسنت کے نصوص پر قائم تھا، انھوں نے ایک طویل عرصہ تدبرقرآن میں صرف کیا، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے اصل منشاء کو وہ جاننے کی کوشش کرتے، وہ قرآن کریم سے فکری استنباطات کرتے اور متعلقہ موضوع پر احادیث مبارکہ کا تتبع کرتے، پھر متعلقہ موضوع پر علماء کی آراء کا تقابل کرتے۔ مولانا کے فکری موضوعات میں توحید، اقامتِ دین، شعائر اسلام، حق و باطل کی کشمکش، اسلامی اخوت، اسلام کا غلبہ اور باطل کی پسپائی، جہاد کی فرضیت جیسے اہم موضوعات تھے۔ مولانا اپنی دینی فکری روش میں دنیاوی مصلحتوں کو قطعاً جگہ نہ دیتے، بلکہ ان مصلحتوں کو تنزلی کی پہلی منزل تصور کرتے۔ مولانا اسلامی نظام کے علاوہ تمام دوسرے نظاموں کو اسلام کا بالمقابل نظام اور جاہلیت کا نظام قرار دیتے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' میں جاہلیت کی تعریف میں رقم طراز ہیں:

> ''معلوم ہوا کہ جاہلیت کا تعلق کسی زمانہ سے نہیں ہے، بلکہ حق کے خلاف عقائد وخیالات، جذبات اور اعمال واخلاق کا نام جاہلیت ہے۔ اس طرح لفظ جاہلیت پورے طور سے اسلام کی ضد اور بالمقابل لفظ ہے۔''
>
> (جاہلیت کے خلاف جنگ، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، مکتبہ الاقصی، حیدرآباد، ص: ۴)

شعائراللہ بالخصوص مساجد کی حفاظت اور تقدس کا جذبہ مولانا کے اندر اس قدر موجزن تھا کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس پر یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور زیادتیوں سے بے حد غمزدہ رہتے اور اس کی آزادی کے لیے امتِ مسلمہ کے دلوں میں دینی روح پھونکتے، ایسے ہی بابری مسجد کے انہدام پر تو ان کا غم وغصہ دیکھنے کے قابل تھا، امت کی بے حسی پر پوری قوم کو جھنجھوڑتے ہوئے اپنی کتاب ''مساجد اللہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ذرا غور کیجیے مسجد کو مسجد، اور اللہ کا گھر سمجھنے اور کہنے کے باوجود اس کی بے حرمتی اور مسماری کو آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود نہ کانوں پر جوں رینگے اور نہ آنکھوں سے خون ٹپکے، نہ دل دھڑکے، نہ ہاتھ اٹھیں، نہ قدم آگے بڑھیں، نہ دل روئے، نہ ہمارے عیش وعشرت میں خلل پڑے تو کہاں ہے ہمارا ایمان؟ اور کیسی ہے اللہ اور اس کے رسول سے ہماری محبت؟ اور کیا معنی رکھتی ہے دعوت وتبلیغ کی ہماری چیخ وپکار؟!!''
>
> (مساجد اللہ، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، مکتبہ الاقصیٰ، حیدرآباد، ص: ۱۷)

تدبرقرآن میں حضرت مولانا کی پوری کوشش رہتی کہ آیات کے سیاق وسباق اور نظامِ قرآن سب کو سامنے رکھتے ہوئے منشائے خداوندی کو سمجھا جائے، ان کے اس طریقۂ تدبر سے جو بات سامنے آتی بسا اوقات آیات کے عمومی ترجمے اور بعض علماء کی رائے سے مختلف ہوتی لیکن وہ اسے مفسرین کی تفاسیر کی روشنی میں ثابت

کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''لَآ اِکْرَاہَ فِي الدِّيْنِ'' (البقرۃ:۲۵۶) کے متعلق ابتداءً یہ لکھتے ہیں:

''اس فقرہ کا استعمال تحریر وتقریر میں اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اکثر استعمال آیت کے منشاء ومراد کے خلاف ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فقرہ کے ذریعہ دین کی کئی حقیقتوں کا انکار کردیا جاتا ہے اور کئی ذمہ داریوں سے اپنا دامن بچالیا جاتا ہے، نتیجہ کے طور پر دین کا اصل چہرہ مسخ ہوکر رہ جاتا ہے۔'' (لا اکراہ فی الدین، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، مکتبہ الاقصیٰ، حیدرآباد، ۲۰۱۲ء، ص:۵)

یہ بیان کرنے کے بعد مولانا آیت کے فقرہ کو سمجھنے کے لیے مختلف مفسرین کی تفاسیر بیان کرتے ہیں جن میں باہم اختلاف بھی ہے، پھر اختلاف کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں بعض مفسرین کے اقوال کو ترجیح دیتے ہوئے آیت کا مفہوم واضح کرتے ہیں کہ آیت میں جس جبر واکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد فطری جبر ہے، یوں رقمطراز ہیں:

''اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے ٹکڑے میں جس جبر واکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود فطری جبر کی نفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت وضلالت کے معاملہ میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت وقدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو کوئی نہیں تھا، لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی۔'' (حوالہ سابق، ص:۶)

ایک اور آیت قرآنی کے فقرہ ''وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا'' (ہود:۱۱۳) میں ظالموں کی طرف جس جھکاؤ سے منع کیا گیا ہے اس کی متعدد شکلوں کو جاننے کے لیے صاحب جلالین کی مختصر تفسیر کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا وضاحت کرتے ہیں:

''یعنی جھکاؤ کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ باطل سے محبت کی جائے یا ان کے ساتھ مداہنت برتی جائے یا ان کی سرگرمیوں اور کرتوتوں پر رضا اور خوشی کا اظہار کیا جائے۔'' (حوالۂ سابق، ص:۲۰)

مولانا اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ منشائے خداوندی کی وضاحت کے بعد آیت کے تناظر میں دینی تنظیموں اور ان کے قائدین، علماء ومشائخین کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے افسوس کا اظہار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''افسوس ہے کہ آج اس جھکاؤ کو قطعاً سمجھا نہیں جارہا ہے، اور اس کے انجام کی پرواہ نہیں کی جارہی ہے۔ اس دور میں دنیا کے لوگ نہیں، کاروباری افراد نہیں، سیاست اور ڈپلومیسی کے اشخاص نہیں بلکہ دین کے لوگ علماء اور مشائخ، دینی انجمنوں اور دینی تنظیموں کے قائدین اور مرشدین، دعوت وتبلیغ کے مراکز کے ذمہ دار

اصحاب کس طرح اہلِ باطل کی طرف محبت، مداہنت اور پھر ان کی مدح و ستائش کرتے ہوئے مسلسل جھکاؤ میں مبتلا ہیں۔'' (حوالۂ سابق، ص: ۲۰)

مولانا کے اعلیٰ اخلاق و کردار

حضرت مولانا اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں اعلیٰ اخلاق وصفات کے حامل تھے، میں نے ان کے ساتھ طویل رفاقت میں کبھی انھیں ماتحتوں کو جھڑکتے نہیں دیکھا، چاہے ان سے ان کے خلاف ہی کچھ نہ ہو جائے، بلکہ نہایت شفقت اور محبت سے سمجھاتے اور تاکید فرماتے، گفتگو کا انداز نہایت سنجیدہ متانت سے پُر ہوتا، غصہ کا اظہار کبھی وہ نہ کرتے ہاں اللہ کے حکم کی پامالی یا شعائر اللہ کی توہین یا باطل کی تائید اگر کہیں سے ہوتی تو ان کے چہرے پر سخت غصہ کے آثار نمودار ہوتے، آپ مخالفین کی آراء کو بھی بڑی متانت اور سکون سے سنتے، پھر ان کا جواب بھی خوش اخلاقی سے دیتے، مخالفین کے ساتھ بحث ومباحثہ میں بھی کبھی جدال اور تکرار کی نوبت نہیں آنے دیتے۔

مولانا اپنے رفقاء کار کے ساتھ اس قدر اپنائیت سے پیش آتے کہ انھیں گمان ہی نہ ہوتا کہ وہ ان میں ہر لحاظ سے بڑے ہیں۔ میری اپنی زندگی میں متعدد واقعات پیش آئے جس میں انھوں نے میرے مسائل کو حل کرنے میں اتنا تعاون کیا جیسا ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ کرتا ہے، میں نے کبھی بھی اپنا کوئی مسئلہ پیش کیا تو انھوں نے فوراً اسے حل کر دیا۔ معذرت یا ٹال مٹول کی جھلک تک نظر نہ آئی، میرا قلم مولانا کے حسنِ اخلاق بیان کرنے سے قاصر ہے، میری آنکھیں وہ ایام یاد کر کے آبدیدہ ہو رہی ہیں جب میں ابتدائی تدریسی زمانے میں حیدرآباد میں تنہا تھا۔ مدرسہ میں چھٹی کے بعد مجھے جانے میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو میرا ہاتھ اپنے دستِ شفقت سے پکڑتے ہوئے مجھے اپنے گھر لے جاتے، پہنچتے ہی اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے بولتے: ''ہما! مولانا سہیل آئے ہیں، کیا پکا ہے، کھانا دو۔'' پھر ساتھ میں کھلاتے۔

میں وہ دن بھول ہی نہیں سکتا جب میں اپنے ساتھ اپنے دو بیٹوں کو بغرض تعلیم حیدرآباد لایا تھا۔ اور اسکول و کالج میں داخلہ بھی کرا دیا، پھر ان کا دل نہ لگا مجھے اطلاع دیئے بغیر وہ دونوں وطن لوٹ گئے اور میں بیماری کی حالت میں مولانا کے سامنے آبدیدہ ہو رہا تھا، تو مولانا نے مجھے ایسا سہارا دیا کہ مجھے کافی حوصلہ ملا۔

میرے ساتھ ان کے حسنِ اخلاق کا وہ منظر بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے جب میں جامعۃ البنات کی خدمات سے دور ہوا تو میں سیدھا حضرت مولانا کی خدمت میں جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حاضر ہوا، میرا مقصد یہ تھا کہ مولانا اگر مجھے قبول کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنی آزادی سے کسی بھی ادارہ سے منسلک ہو جاؤں گا، لیکن صد آفریں ہو مولانا کی وسیع الظرفی اور مولانا کے گھر والوں کی کشادہ دلی پر کہ انھوں نے نہ صرف مجھے گلے لگایا

بلکہ اس خوشی کے احساس کو بھی ظاہر کیا کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ مدرسہ کے لیے آپ کو پا کر میں خوش نصیب ہوں یا آپ اس مدرسہ کو پا کر خوش نصیب ہیں یہ کہتے ہی انھوں نے حماسہ کے ایک شعر کی طرف اشارہ کیا جس میں شاعر نے یہ کہا ہے:

و انک لا تدری اذا جاء سائل
أ أنت بما تعطیه أم هو أسعد

''تمھیں پتہ نہیں جب کوئی حاجت مند آئے، کہ تم اسے دے کر خوش نصیب ہو یا وہ (پا کر) خوش نصیب ہے۔''

مجھے اب بھی جامعۃ البنات کے وہ ابتدائی دوسرے سال کے جانکاہ حادثہ کا زمانہ یاد ہے جب حضرت مولانا کے پسر مجاہد سلیم کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اس وقت مولانا دبئی میں تھے فوراً تشریف لائے، لیکن مولانا کا صبر اتنا قوی تھا کہ میری ملاقات اور مشاہدہ میں وہ صبر کے پہاڑ بن کر صامت و جامد تھے، پھر بعد کے ایام میں میں نے باریکی سے مولانا کا مشاہدہ اور ملاحظہ کرنا شروع کیا، شہید مجاہد سلیم کی یادوں سے متعلق ایک بات وہ بار بار میرے سامنے دہراتے کہ ''کوئی بھی نوجوان سامنے سے گزرتا ہے تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ میرا لڑکا مجاہد جا رہا ہے۔'' تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد میں نے مجاہد سلیم سے متعلق مولانا کے تمام جذبات کو اپنے الفاظ میں شعری شکل دے دی، پھر ایک دن مولانا آفس میں تنہا تھے تو تنہائی پا کر میں نے وہ تمام اشعار مولانا کو سنا دیئے، اس وقت مولانا اشعار سن رہے تھے اور خاموشی سے ان کی آنکھوں سے جھرنے کی شکل میں آنسو گر رہے تھے، یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی تو میں نے آبدیدہ ہو کر مولانا سے شعر سنانے پر معذرت کی، کچھ ہی دیر کے بعد مولانا ایسے ہم کلام ہوئے جیسے وہ وضوء سے فارغ ہوئے ہوں۔ میرے دل میں مولانا کے آنسوؤں کو دیکھ متنبی کا یہ شعر یاد آیا:

من سرَّ اهل الأرض ثم بکی أسی
بکی بعیون سرها و قلوب

''جو روئے زمین کے لوگوں کو خوش کرے گا پھر غم کی وجہ سے روئے گا۔ تو وہ ان آنکھوں اور دلوں سے روئے گا جن کو خوش کیا تھا۔''

مولانا کی خوش اخلاقی اور دوسروں کی دلجوئی کا دائرہ ان کے شاگردوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ مولانا کے قدیم شاگردوں میں مولانا عبدالمغنی صاحب جو طویل زمانہ تک جامعہ مظہر العلوم بنارس میں صدر المدرسین رہے، حضرت مولانا بارہا ان کا ذکر خیر کرتے اور بنارس سے آنے والوں سے ان کے حالات دریافت کرتے،

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا عبدالمغنی صاحب مریض ہوکر صاحبِ فراش ہوگئے۔ میں ایک دفعہ بقرعید کے موقع پر گھر جارہا تھا تو مولانا نے ایک بڑی رقم لفافہ میں بند کرکے مجھے دی اور فرمایا: ''مولانا عبدالمغنی صاحب کی خیریت معلوم کرتے ہوئے یہ رقم مولانا کو دے دینا۔'' میں جب وطن پہنچا تو پہلی فرصت میں مولانا عبدالمغنی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور مولانا کی امانت ان کے حوالہ کردی۔ تب مولانا عبدالمغنی صاحب تھوڑی دیر تامل کے بعد وہ لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی مجھے واپس کرتے ہوئے یہ بولے: ''میں نے اسے قبول کرلیا اب اسے حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کردیں، ان کے قبول کرنے اور پھر مولانا کو لوٹانے کا منظر بالکل ایسا ہی تھا جیسے ایک شاعر نے کہا ہے:

اذا نلت منک الود فالمال هین
وکل الذی فوق التراب تراب

''مجھے جب آپ کی محبت مل جائے تو مال معمولی چیز ہے۔ اور ہر چیز جو مٹی کے اوپر ہے مٹی ہی ہے۔''

میں نے اصرار کرتے ہوئے مولانا عبدالمغنی صاحب سے کہا کہ قبولیت کا تعلق باطن کے ساتھ ظاہر سے بھی ہے اس لیے آپ لے لیجیے اسی میں مولانا کی خوشی ہے، بہرحال مولانا کی امانت میں ان کے حوالے کرکے آیا۔

ضرورت مندوں کا مالی تعاون کرنا تو جیسے مولانا کا وطیرہ تھا، لیکن یہ سب کچھ رازدارانہ انداز میں کرتے، مولانا معین الدین ندوی صاحب ایک طویل زمانہ تک جامعۃ البنات میں ہمارے ساتھ مدرس کی حیثیت سے رہے اور مولانا اصلاحی صاحبؒ سے بہت قریب رہے، ان کے ذریعہ مولانا کے انفاق فی سبیل اللہ کے بہت سارے راز کا پتہ چلتا۔

میں مولانا کے ساتھ کویت اور سعودیہ کے طویل سفر میں شریک سفر رہا (جس کا تذکرہ جلد ہی تفصیل کے ساتھ کروں گا) تو میں ذرا نشاط وحرکت میں کاہل تھا، اور جہاں جانا ہوتا مجھے مولانا کے ساتھ جانا ضروری ہوتا، کیوں کہ بیشتر جگہوں پہ میں مولانا کا مترجم بنتا، مولانا بار بار کہتے کے چلئے چلا جائے، لیکن میری تاخیر پر کبھی غصہ یا ناگواری کا اظہار نہ کرتے، کبھی کبھی تو مجھے یہ گمان ہوتا کہ مولانا میری ناز برداری کررہے ہیں، یہ سوچ کر میں شرمندہ بھی ہوجاتا، سفر کے طویل ایام کے دوران ہردم مولانا میرے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔

مولانا کے اخلاق حسنہ کی یہ مختصر سی جھلک ان کے تعارف کے لیے دریا کے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے دریا کے پانی کے ذائقہ کا پتہ تو لگایا جاسکتا ہے، لیکن دریا کی وسعت کا نہیں۔

مولانا کا اخلاص وللّٰہیت

حضرت مولانا اصلاحی صاحبؒ اگر ایک طرف ایک متبحر عالم دین اور صحیح فکر کے حامل مفکر اور اعلیٰ اخلاق و صفات کے حامل منفرد شخصیت تھے تو دوسری طرف ایک مومن، صالح، زاہد و مخلص بندۂ خدا۔ مولانا کی نیکیوں کا علم تو اللہ ہی کو ہے، کیوں کہ اس کا تعلق باطن سے ہے اور باطن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، لیکن ظاہر میں میں نے جو ان کو دیکھا تو وہ نماز کے اس قدر پابند تھے کہ سفر ہو یا حضر، تدریسی مصروفیت ہو یا میٹنگ وغیرہ ہر حال میں وقت ہوجانے پر وہ نماز کے لیے تیار ہوجاتے، اتنا ہی نہیں بلکہ ساتھ میں موجود لوگوں کو بھی نماز کی تذکیر کرتے۔

نماز کی اس مکمل پابندی کے باوجود انھیں بار بار یہ احساس رہتا کہ ہماری یہ نماز، جو بظاہر اٹھنے بیٹھنے اور چند اذکار و آیات کی قرأت پر مشتمل ہے، اللہ کی بارگاہ میں قبولیت سے سرفراز ہوتی ہے یا نہیں، ان کے اس ایمانی احساس کو الفاظ کے جامہ میں میں نے کئی بار سنا، اور مجھے لگا کہ یہ تو ایک سچے مومن کا احساس ہے، جو خوف اور امید دونوں سے ملا جلا ہے۔

آخری عمر کے ایام میں جب وہ دواؤں کی کثرت اور اطباء کی تعلیمات اور جسم میں لاغری کی وجہ سے روزہ رکھنے سے قاصر رہتے تو فدیہ کی مقدار معلوم کر کے اپنے بیٹے معتصم کو جلد سے جلد ادائیگی کی تاکید کرتے۔ یہی حال زکوٰۃ کی ادائیگی کا تھا۔

مولانا کی زاہدانہ زندگی بھی قابلِ دید تھی۔ دنیا کی چمک دمک، مال و دولت کی ریل پیل، اچھے مکانات اور شاندار گاڑیاں مولانا کو کبھی راغب نہ کرتے، مولانا کے ساتھ ایک بار کی نشست میں ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے کار کے مختلف ماڈلس کا تذکرہ کیا تو فوراً مولانا بول اٹھے: ''گاڑیوں کے اتنے ماڈل کیسے آپ لوگوں کو معلوم؟'' شاید مولانا کا یہ سادہ سا سوال اپنے اندر یہ حکیمانہ پیغام دے رہا تھا کہ علماء کی نظر میں دنیا کا کوئی مقام نہیں ہونا چاہیے، ایک عالم دنیا میں بھرپور زندگی تو گزارتا ہے، لیکن وہ دنیا کو مقصد نہیں بناتا، اس کے لیے دنیا کے سارے اسباب، سامانِ سفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، یہی مومن کی زاہدانہ زندگی ہے، یہی مولانا کا مزاج تھا اور اسی مزاج کی سچی تصویر آپ کی مکمل شخصیت تھی، چنانچہ وہ سادہ سے لباس کرتا پائجامہ اور چوڑی ٹوپی میں ہمیشہ ملبوس رہتے، کپڑوں میں کبھی تنوع اور نیا پن نظر نہیں آیا، ٹوپی بھی بسا اوقات سر پر صحیح نہ رہتی، ایسا گمان ہوتا تھا کہ شاید مولانا کبھی آئینہ کے سامنے نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ مولانا کا آئینہ تو صرف کتاب وسنت تھا، ہاں اس میں ہر وقت دیکھتے، خود کو بھی بار بار دیکھتے اور امت کے افراد کو بھی، اور ہر کجی اور کمی کو درست کرنے کے لیے کوشاں رہتے، آپ کی اسی زاہدانہ سادگی کی ہیئت کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ آپ کے علمی مقام ومرتبہ کو

پہچاننے سے قاصر رہتے۔

مولانا کا اندازِ گفتگو اور طرزِ کلام تصنع وتکلف سے بالکل پاک ان کی زاہدانہ طبیعت کا عکاس ہوتا، موضوعِ گفتگو کھانے کی ڈشوں، لباس کے انواع واقسام، دنیاداروں کے اوصاف بیان کرنے کے بجائے، امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل، اسلام کے غلبہ اور اقامتِ دین کی فکر، اسلامی تشخص کو لاحق خطرات، مسلمانوں کی بے حسی، دنیا کی بے ثباتی، اخروی زندگی کی ابدیت جیسے موضوعات ہوتے۔

حضرت مولانا اخلاص وامانت داری کے پیکر تھے، ان کے ہر عمل میں اخلاص وللّٰہیت کی جھلک نظر آتی، آپ نے دینی حساس موضوعات پر کئی ایک علمی کتابیں تصنیف کیں لیکن کہیں اپنے تعارف میں ان کتب کا تذکرہ نہ کرتے، میں تو ان کے ساتھ طویل رفاقت کے باوجود ایک زمانے تک یہی نہیں جان سکا کہ مولانا کئی کتب کے مصنف بھی ہیں، مولانا جامعۃ البنات کے اولین بانی تھے۔ مولانا اس جامعہ کے نصاب ساز تھے، لڑکیوں کی تعلیم کو اعلیٰ معیار سے مزین کرنے کے لیے 'حجۃ اللہ البالغۃ'، 'تفسیر بیضاوی' اور علامہ جرجانی کی 'دلائل الاعجاز' جیسی معرکۃ الآراء کتابیں نصاب میں شامل کیں جو بہت سے لڑکوں کے دینی مدارس میں بھی صعوبت کی وجہ سے پڑھائی نہیں جاتیں۔ وہ ہر سال جامعہ کے مالی استحکام کے لیے اسفار کی صعوبات برداشت کرتے، لیکن کسی مجلس میں اپنی کسی جدوجہد کا تذکرہ نہ کرتے، کیوں کہ ان کی یہ ساری جانفشانیاں خالصتاً لوجہ اللہ تھیں۔ مولانا کو بارہا رقیبوں کی طرف سے تنخواہ دار ملازم کا طعنہ دیا گیا، لیکن مولانا اس کو بھی خاطر میں نہ لاکر اپنی لگن میں محو رہتے۔ مولانا کا تمام وقت طالبات کی تعلیم وتربیت اور امت کے مسائل میں صرف ہوتا، قابلِ مبارکباد ہیں ان کے گھر والے جنھوں نے کبھی بھی مولانا کے اوقات کا محاسبہ نہیں کیا، بلکہ ان کو مدرسہ کے کاموں کے لیے مکمل فارغ کردیا تھا۔

مولانا کی امانت داری بھی اپنی مثال آپ تھی، جس کی بیشمار مثالیں ہیں۔ مجھے ابھی تک وہ دن یاد ہے جب میں مولانا کے ساتھ کویت گیا ہوا تھا، کویت کے ایک ادارہ کی طرف سے سعودی عرب کے پڑھے ہوئے لوگوں کو مبعوث کرنے کا سلسلہ جاری تھا، مولانا نے مجھ سے کہا کہ آپ مبعوث ہوجایئے، میں نے عرض کیا کہ مبعوثین کی تنخواہیں یہ لوگ کم دیتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جامعہ کی تنخواہ کو برقرار رکھتے ہوئے مبعوث ہوجاؤں، تو مولانا نے فرمایا: آپ دو جگہوں سے تنخواہ کیسے لے سکتے ہیں؟ میں نے مولانا کو ایسی کئی مثالیں پیش کیں لیکن مولانا راضی نہ ہوئے اور میں نے مبعوث ہونے سے گریز کرلیا۔

وہ مولانا کی امانت داری ہی کا جذبہ تھا کہ جب کسی استاد کو اسٹاف روم میں خالی دیکھتے تو بڑے ادب سے عرض کرتے کہ شاید آپ کی گھنٹی خالی ہے، جامعۃ البنات میں ترانہ اور تذکیر کے بعد عربی کی ابتدائی جماعت کی

طالبات کو ہال میں اکٹھا کر لیتے ،صرف کی گردانیں سننے لگتے ،نحو کے ابتدائی مسائل پوچھنے لگتے ،بڑی جماعت کی طالبات کو کوئی مشکل موضوع دے کر عربی کی امہات کتب تک کا سفر کرا دیتے ۔آپ کی شب و روز کی انتھک جدوجہد نے طالبات کے دلوں میں مولانا کا عالی مقام پیدا کر دیا تھا۔

مولانا کے اسفار

مولانا کے ملک، بیرونِ ملک ان گنت اسفار ہیں جو اپنی خصوصیات آپ لیے ہوئے ہیں ۔میں ان اسفار کا احصاء اور تفاصیل بیان نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی یہ میرے موضوع کا حصہ ہیں اور نہ مجھے ان سے متعلق دقیق معلومات ہیں، میں تو صرف مولانا کے اس سفر کو قید قلم کروں گا جس میں میں مولانا کا ہمرکاب تھا، ابتداء سے انتہا تک میں مولانا کے ساتھ تھا اور جس میں میں نے مولانا کے بہت سے ایسے حالات کا مشاہدہ کیا جو مولانا کی شخصیت کے سنہرے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں، اور جن سے مولانا کی قدر شناسی میں ہمیں مدد ملے گی۔

مولانا نے پہلی بار مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ''آپ عربی داں ہیں، آپ کے بعض عربوں سے تعلقات بھی ہیں، آپ سعودی عرب اور کویت کے سفر کے لیے تیار ہو جائیے۔'' مولانا کے میرے تئیں یہ تاثرات کچھ اس انداز سے تھے کہ میں ہاں کرنے پر مجبور ہو گیا، نیز مولانا جیسی بڑی شخصیت کی خواہش کو میں کیسے ٹال سکتا تھا، ان دنوں عمرہ کے ویزے میں کچھ دشواریاں اور مشکلات تھیں، میں نے اپنا اور مولانا کا پاسپورٹ ممبئی میں واقع اپنے ایک ساتھی کے آفس میں یہ کہہ کر بھیج دیا کہ ویزا اور ٹکٹ کا کام ہوتے ہی فوراً ہمیں خبر دیں کہ ہم ممبئی آجائیں، ویزے کی کارروائی میں دیر ہو رہی تھی، اِدھر مولانا گھبرا رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہم جلد سے جلد کسی اطلاع سے پیشتر ہی ممبئی کو نکل جائیں، مولانا کے متواتر اصرار پر ہم ممبئی کے لیے نکل پڑے۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہی ہوا جس کا پہلے سے مجھے اندازہ تھا، یعنی ویزے کا کام ابھی تک نہیں ہوا تھا اور ہمارے آفس والے ساتھی نے کہا بھی کہ آپ لوگ بغیر اطلاع کے اتنے پہلے کیوں آگئے لیکن ہمارے مولانا صاحب مطمئن بلکہ خوش تھے کہ کوئی بات نہیں ممبئی میں ہم قیام کر لیں گے۔ ویزے کی کارروائی تک ہم لوگ تقریباً ممبئی میں دو ہفتے رہ گئے، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مولانا کی خوشی مدرسے کے کام کے لیے جلدی سے نکل جانے پر تھی یا میرے ساتھ کی وجہ سے مولانا اتنے باحوصلہ تھے، لیکن غالب گمان یہی تھا کہ مدرسہ کے لیے سفر موہوم نہ ہو کر آغازِ سفر سے مولانا کی خوشی میں اضافہ ہو رہا تھا، یہ سفر ممبئی سے شروع ہو کر بلادِ حرمین ہوتے ہوئے کویت کی منزل تک ہمیں لے جانے والا تھا، مولانا کے ساتھ تینوں جگہوں کی انمٹ یادگاریں اب بھی میرے خانۂ دل میں محفوظ ہیں۔

ممبئی شہر میں ہمارا قیام میرے دوست قاری نسیم الحق صاحب امام مسجد چونہ بھٹی و مدرس دارالعلوم امدادیہ

کے یاں بھنڈی بازار میں تھا، وہ جگہ شہر کی مرکزی جگہ تھی جہاں سے کہیں بھی آمدورفت آسان تھی، پندرہ روزہ قیام کے دوران قاری صاحب نے ہم لوگوں کا بہت خیال رکھا جس کے لیے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ ممبئی میں طویل قیام کے دوران رمضان کا مہینہ ہونے کے باوجود مولانا کبھی چین سے نہیں بیٹھے، ہر دن کوئی نہ کوئی پروگرام بناتے، میں چاہوں نہ چاہوں مجھے بھی ساتھ لے جاتے، ایک دفعہ وہ مجھے روزنامہ اردو ٹائمز کے ایڈیٹر کے پاس لے گئے، مولانا کا کوئی مضمون جو پہلے سے تیار تھا یا تنہائی میں تحریر کیا تھا (مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے) اس کی اشاعت کے بارے میں اس ایڈیٹر سے بات کررہے تھے۔ ایڈیٹر صاحب بھی (جن کا نام مجھے یاد نہیں ہے) مولانا سے بے تکلف تھے، دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں اس واقعہ کو بیان کرکے یہ بتلانا چاہ رہا ہوں کہ مولانا حالتِ سفر میں بھی اپنے دینی مشن کو جاری وساری رکھتے۔

ایک دن مولانا اپنے شاگرد مولانا جنید بنارسیؒ صاحب کے یاں جانے کے لیے تیار ہوئے جو بھنڈی بازار سے کچھ ہی فاصلے پر تجارتی سرگرمیوں میں مصروف تھے، مولانا مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ آپ بھی چلئے، میں نے روزہ کی تھکن اور سستی کی وجہ سے معذرت کرلی اور مولانا تنِ تنہا چلے گئے، وہاں پہنچنے کے بعد نہ جانے مولانا جنید صاحب سے ان کی کیا بات ہوئی کہ مولانا نے مجھے فون کیا کہ ابھی آپ آجایئے مولانا جنید صاحب آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ مولانا کتنے وسیع الظرف تھے کہ شاید انھوں نے میرا غائبانہ تعارف مولانا جنید بنارسی صاحب سے کرایا ہوگا جبھی تو وہ مجھ سے ملنے کے متمنی تھے۔ یا شاید مولانا سے رہا نہیں گیا ہوگا اور مجھے ساتھ کرنے کا انھوں نے ذریعہ ڈھونڈ لیا۔ بہرصورت مولانا کی مجھ سے محبت اور شفقت ہی دراصل اس کے پیچھے کارفرما تھی۔ میں فوراً ہی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور مولانا جنید صاحب سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل کرلی۔ مولانا اتنا خوش تھے کہ بولے ''اب یہیں سے افطار کرکے چلنا ہے''، میں نے جواب میں کہا ''ٹھیک ہے مولانا آپ جیسا فرمائیں۔''

میں ممبئی کی بھیڑ بھاڑ میں زیادہ نقل وحرکت سے اوبھ رہا تھا اور مولانا تھے کہ مجھے ہر حال میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے اور ہر دن کوئی نہ کوئی پروگرام بناتے۔ ایسے ہی ایک دن بولے کہ ''چلئے مدن پورہ میں میرے ایک بھتیجے رہتے ہیں جنھیں ہم لوگ (مٹو) پکارتے ہیں، وہاں اطمینان سے رک کر افطار وغیرہ سے فارغ ہوکر آئیں گے۔'' وہاں جانے پر ان لوگوں نے ہماری بہت ہی خاطر تواضع کی، ان کا پورا گھر مولانا کی آمد پر خوشی سے نہال نہال ہورہا تھا، بہت دیر تک مولانا ان لوگوں سے گھلے ملے رہے، اور رہ رہ کر میرا تعارف بھی کراتے

جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی، لیکن قربان جاؤں میں مولانا پر کہ انھوں نے میرے اندر کیا خوبی پائی تھی کہ میرے لیے اتنا بے قرار رہتے، یا ان کی فطری اعلیٰ خوش اخلاقی تھی جس کی وجہ سے وہ مجھ پر مہربان رہتے، اس ملاقات کا خاص اور قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ مولانا مدرسہ کے لیے اپنے بھتیجے سے ایک بڑا مالی تعاون حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ میں نے سوچا کہ ہمارا مدرسہ کا سفر تو سعودی عرب سے شروع ہوگا ابھی تو ہم سرِ راہ، منزل سے دور ہیں، لیکن مولانا تھے کہ ہر جگہ اور ہر لمحہ انھیں منزل ہی نظر آتی تھی، کیوں کہ ان کے دل میں ہر وقت مدرسہ کی لگن اور دھن رہا کرتی تھی۔

ویزا اور ٹکٹ کی کارروائی مکمل ہوتے ہی ہمارے آفس والے دوست نے ہمیں اپنے مکان پر جوگُرلا میں واقع تھا مدعو کیا، ہم جب رات میں ان کے گھر پہنچے تو مولانا تھکے تھکے سے ہو رہے تھے، کچھ کھا پی کر ہم نے مولانا کو آرام کرنے کے لیے کہا اور وہ گہری نیند سو گئے۔ سحر سے پہلے میں نے مولانا کو بیدار کیا اور ہمارے دوست کی خواہش پر سحری کا دسترخوان لگ گیا۔ کھانے میں دیگر چیزوں کے ساتھ بہترین بھنا ہوا قیمہ تھا جو ان کے گھر میں بنا تھا، وہاں سے روانہ ہونے کے بعد دیر تک راستے میں مولانا لذیذ قیمہ کی تعریف کرتے رہے، تعریف کا یہ انداز میں نے کبھی ان سے نہیں سنا تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا وہ کھانے پر تعریف وتبصرہ کبھی نہیں کرتے تھے لیکن آج خلافِ توقع ان کی زبانی تعریف سن کر میرے دل میں ایک احساس بیدار ہو رہا تھا کہ شاید قیمہ کی لذت میں وطن اور بچپن کی یاد کا عنصر غالب رہا ہو کیوں کہ ہمارے وطن اعظم گڑھ کے علاقہ میں ناشتہ میں بہترین قیمہ کا استعمال برسوں سے مانوس رہا ہے۔ بچپن اور وطن کی یادوں سے کوئی بھی بشر مستثنیٰ نہیں ہے۔ بہرحال اب ہم لوگ ویزا اور ٹکٹ کے ساتھ مکہ مکرمہ جانے کے لیے نکل پڑے۔

جدہ ائیر پورٹ پر جیسے ہی ہم پہنچے جناب خالد صاحب ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے جن سے میری پہلی ملاقات ہو رہی تھی۔ چوں کہ سعودیہ میں میری اور مولانا کی منزلیں کام کی ترتیب کے لحاظ سے الگ تھیں، میرے لیے مکہ مکرمہ کا علاقہ مختص تھا اور مولانا کو جدہ میں سرگرم عمل ہونا تھا، اس لیے جدہ ہی سے ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ آئندہ کے لیے میرے اور مولانا کے درمیان دو ملاقاتیں طے پائیں، ایک ملاقات میں مولانا کو مکہ آنا تھا، اور دوسری ملاقات میں مجھے جدہ جانا تھا۔ حسبِ پروگرام مولانا مکہ مکرمہ تشریف لائے، میں انھیں جامعہ ام القریٰ لے گیا، بعض ذمہ دارانِ جامعہ سے ملاقاتیں کرائیں، میں عربوں کے سامنے مولانا کا تعارف کرا رہا تھا، وہ لوگ مولانا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھر حرم شریف کے شعبۂ افتاء کے ذمہ دار میرے عرب استاذ شیخ سلیمان السلومی کے پاس میں مولانا کو لے کر گیا، انھوں نے افطار میں ہمیں مدعو کر لیا۔ بہت سے

دینی موضوعات اور جامعہ کے تعارف کے تعلق سے میرے توسط سے دونوں میں گفتگو ہوئی، وہ مولانا کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ دوسری ملاقات میں ہمیں شہر جدہ کے پُررونق علاقہ بلد میں اکٹھا ہونا تھا، خالد صاحب مولانا کو لے کر بلد آئے اور میں مکہ سے جدہ پہنچا اور ہم تینوں کی ایک نشست مختصر ہی سہی لیکن بڑی دلچسپ رہی جس میں ہم نے عید کے بعد کویت کے لیے ایک نئے سفر کی ترتیب بنائی۔ سعودیہ کا ہمارا یہ سفر جامعہ کے حق میں اچھا رہا، میری کامیاب مساعی پر مولانا بہت ہی خوش تھے۔

عید کے ایک ہفتہ بعد پھر میں اور مولانا جدہ کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اکٹھا ہو رہے تھے، اب ہمیں کویت کا رخ کرنا تھا۔ کویت میں ہمارے عزیز جناب قیصر صاحب شدت سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جدہ سے دو گھنٹے کی مسافت طے کرتے ہوئے ہم کویت پہنچے تو ایئرپورٹ پر قیصر صاحب ہمارے استقبال میں کھڑے تھے، وہ سیدھے ہمیں کویت سٹی کے جلیب الشیوخ علاقہ میں واقع جماعت کے مرکز میں لے گئے، کیوں کہ وہیں پر ہمارا قیام مقرر تھا۔

جامعہ کے کام کے لیے کویت ہماری اہم منزل تھی، گو کہ کویت کا میرا پہلا سفر تھا لیکن کئی کویتی احباب جو جامعہ ام القریٰ میں زیرِ تعلیم رہے ان سے ملاقات کی امید نے میرے اس سفر کو بہت حوصلہ افزا کر دیا تھا۔ مولانا میری معیت پا کر پروگرام پہ پروگرام بناتے رہتے۔ میں نے ایک کویتی دوست کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے تمام کویتی احباب کو اکٹھا کرتے ہوئے اپنے دولت خانہ پہ مجھے اور مولانا کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ پروگرام کے مطابق ہم سب اس کویتی کے گھر اکٹھا ہوئے، میں ایک ہندوستانی عام لباس میں ان عربوں کے بیچ بیٹھا ہنس ہنس کر بلا تکلف باتیں کر رہا تھا، اِدھر مولانا ہمارے درمیان ظاہری فرق کے باوجود ایک بے تکلف اپنائیت بھری گفتگو کو بڑی باریکی سے دیکھ رہے تھے جس کا اظہار انھوں نے بعد میں مجھ سے کیا۔ مولانا کی پُروجاہت شخصیت سے وہ لوگ اتنا متاثر تھے کہ بار بار مولانا سے ہم کلام ہونے کی کوشش کرتے اور میں اس کوشش کو کامیاب کر دیتا، آخر میں ان لوگوں نے ہمارے جامعہ کے لیے مالی تعاون بھی پیش کیا۔

ایک دن میں مولانا کے ہمراہ جمعیۃ الشیخ عبداللہ النوری پہنچا، مولانا کے ایک حیدرآبادی عزیز ابراہیم خلیل اللہ صاحب کے توسط اور تعاون سے جمعیت کے ڈائریکٹر شیخ نادر النوری سے ان کے آفس میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک دیندار، امت کا درد رکھنے والے عالم دین تھے، مولانا کی ان سے طویل گفتگو ہوتی رہی۔ جامعہ کا پورا تعارف ان کے سامنے آ گیا اور مولانا کی بااثر شخصیت نے ان پر اتنا اثر کیا کہ وہ بولے: آپ جامعہ کا کوئی بڑا پروجیکٹ ہمارے سامنے پیش کریں ہم اسے پاس کر دیں گے۔ اگلے دن ہم نے کمیٹی والوں سے رابطہ

کر کے کسی تعمیری پراجیکٹ کا باقاعدہ نقشہ ارسال کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن کمیٹی والوں نے اس میں لاپرواہی کا مظاہرہ کیا، اور یہ سنہرا موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا جس پر مولانا بہت افسردہ ہوئے۔

کویت کے جماعت کے مرکز میں ہمارا قیام اس طرح رہا کہ ایک بڑا سا ہال تھا، جس میں جماعت کا کوئی اجتماع یا میٹنگ کبھی کبھار منعقد ہوتی، مولانا ایک دو احباب کی معیت میں وہیں رات کو سوتے، اور میں بازو کے ایک کمرے میں مولانا کے ایک خاص شاگرد کی خواہش پر بازو کے خالی بیڈ پر سوتا، رات دیر تک گفتگو جاری رہنے کی وجہ سے مجھے صبح بیدار ہونے میں دیر لگتی، ادھر مولانا صبح سویرے ہی سے نشیط اور متحرک ہوجاتے، اور ان سے ملنے جلنے والوں کا سلسلہ لگا رہتا، بار بار آ کے مجھے اٹھاتے اور کہتے کہ ''اٹھئے چلئے بہت سی جگہوں پر جانا ہے، کتنا سوئیں گے؟'' آپ میری کاہلی سے پریشان بھی رہتے لیکن کبھی آپ نے مجھے سخت جملہ نہیں کہا۔ بلکہ بڑے ہی شفقت سے ہر وقت پیش آتے۔ آپ کے شفقت بھرے لہجہ سے، ایسا گمان ہوتا کہ ایک نشیط باپ اپنے سست مگر کارآمد بیٹے کو کاموں کی کثرت کا احساس دلاتے ہوئے بیدار کر رہا ہے۔

مولانا پر ضعف جسمانی اور پیرانہ سالی کے اثرات کے باوجود وہ ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوا ٹھتے، سستی کا تو جیسے ان کے یہاں گزر ہی نہیں ہوتا، میری چال کی رفتار تیز ہوتی اور مولانا کی رفتار صحت وعمر کی وجہ سے دھیمی، ایسے میں مولانا ہر وقت مجھے بریک لگاتے اور ہم ساتھ ہوجاتے، ایک دفعہ راستے میں تھوڑا پانی جمع تھا میں نے فوراً لمبی چھلانگ لگادی اور آگے بڑھا، پیچھے مڑا تو دیکھا کہ مولانا اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھائے ہوئے کھڑے ہیں۔ جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے بڑھایئے، مجھے اپنی عجلت اور لاپرواہی پر ندامت ہوئی، فوراً ہی میں نے آگے بڑھ کر مولانا کا ہاتھ تھام لیا اور انھیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔

کام کی لگن مولانا کو اس قدر تھی کہ چھوٹی سے چھوٹی جگہ بھی مولانا چھوڑنا نہ چاہتے اور مجھے لے کر پہنچ جاتے۔ مولانا کی کامیاب پلاننگ اور مسلسل نشاط وچستی کی وجہ سے کویت بے وقت پہنچنے کے باوجود بھی ہمارا کویت کا سفر بہت ہی کامیاب رہا۔ اب ہم دونوں یہاں سے بچھڑنے والے تھے۔ مولانا کو دبئی جانا تھا، مسلسل طویل اسفار کے باوجود دبئی جانے کے لیے وہ تروتازہ تھے، ادھر پروگرام کے مطابق میں حیدرآباد کے لیے روانہ ہوگیا۔

مولانا کے آخری ایام اور رحلت

مولانا کی عمر میں اللہ نے برکت عنایت فرمائی تھی، آپ طویل زمانے سے خرابی صحت کے شکار تھے جو لمبی

عمر والوں کے لیے عام سی بات ہے، لیکن خرابی صحت کے باوجود آپ کوئی پروگرام مس نہیں کرتے، آپ پابندی سے پڑھانے بھی آتے اور آتے ہی کسی خاص کلاس کی طالبات کو آفس میں بلا لیتے اور پڑھانا شروع کر دیتے، نقاہت کی وجہ سے بولنے میں دقت ہوتی، لیکن ٹھہر ٹھہر کر ہی سہی بولتے رہتے۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں سے کسی خاص دینی موضوع پر تبادلۂ خیال بھی کرتے رہتے۔ آپ اتنے باحوصلہ تھے کہ آخر عمر میں بھی بڑے سے بڑے کام کو انجام دینے کو سوچتے اور اس کی بات کرتے۔ مولانا امت مسلمہ کی اولوالعزم شخصیات میں سے تھے جن کی سوچیں ہمیشہ بڑے کارنامے انجام دینے کی ہوتی ہیں جسے متنبی نے یوں کہا ہے:

علی قدر أهل العزم تأتي العزائم
وتأتي على قدر الكرام المكارم

''عزم والوں کے معیار کے مطابق ہی عزائم وجود میں آتے ہیں اور خوبیاں بھی شریفوں کے معیار کے مطابق ہی وجود میں آتی ہیں۔''

مولانا کی زندگی میں مدرسہ کی بہت ہی اہمیت اور عظمت تھی، ان کا کہنا تھا کہ مدرسہ ہی دینی، فکری شخصیات پیدا کرنے کا کارخانہ ہے، وہ مانتے تھے کہ مدارس اسلام کے قلعے ہیں اور تحریکات کے منبع بھی، یہیں سے اصلاحِ معاشرہ کی کامیاب پلاننگ ہوگی اور دفاعِ اسلام کی قوت سازی بھی، مولانا کی زندگی کی شروعات مدرسہ ہی سے ہوئی تھی، اور پوری زندگی مدرسہ سے جڑے رہے، پھر ان کی زندگی کا آخری سفر بھی مدرسہ سے ہو کر گزرا۔

مولانا کے آخری ایام کا زیادہ حصہ جب مدرسہ سے دور، گھر پر گزرنے لگا تو مدرسہ آنے کے لیے ہر وقت بیتاب رہتے، ان کی مسلسل بے تابی کو دیکھ کر گھر کے لوگ آٹو کے ذریعہ مدرسہ پہنچاتے، اِدھر خبر ملتے ہی میں اور مولانا جاوید اختر صاحب ان کے استقبال کے لیے حاضر رہتے۔ مدرسہ کے قدیم واچ مین اور مولانا کے طویل ترین مخلص خدمت گزار شمس الدین صاحب کا ہی مولانا کے نقل وحرکت میں اصل تعاون اور سہارا ہوتا۔ مولانا دیر تک بیٹھتے، پھر لیٹتے پھر بولتے کہ گھر جاؤں گا۔

مولانا کی طبیعت دن بدن نازک ہوتی جا رہی تھی۔ اب مولانا مدرسہ آنے سے قاصر ہوتے جا رہے تھے، اب تو ہمیں دیر ہونے پر ملنے کے لیے مولانا کے گھر جانا پڑتا تھا، مولانا جاوید اختر صاحب مولانا کی زیارت میں مجھ سے آگے تھے، ایک دفعہ مولانا سے ملاقات میں کافی دن گزر گئے تو مولانا نے گھر سے ہی ملنے کا پیغام بھیج دیا جس پر مجھے ندامت ہوئی۔

مولانا مریض تھے صاحبِ فراش تھے، کھانے پینے میں مشکلات تھیں، قوتِ گویائی بھی شدید متاثر تھی،

اٹھنا بیٹھنا تو بالکل ہی مشکل ہو چکا تھا، پھر بھی آپ باہوش تھے، آنکھوں سے دوسروں کو پہچان لیتے، اشاروں سے کچھ کہہ دیتے، گھر والے اور ہم لوگ اتنا تو مطمئن تھے کہ مولانا کی ذات موجود ہے، مولانا ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں، ہم ان سے بات چیت نہیں کر سکتے تو کیا ہوا انھیں دیکھ تو رہے ہیں، ان کے درخشاں وجود سے گھر کا کونا کونا اور بطور خاص دیوان خانہ تو منور ہے، لیکن افسوس کہ ایک دن ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔

۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء کی ابتدائی شام ہم سب کے لیے انتہائی ستمگر ثابت ہوئی، فون کے ذریعے مولانا کی رحلت کی خبر سن کر میں حواس باختہ ہو گیا، فوراً ہی دل نے چیخ چیخ کر یہ پکارنا شروع کر دیا کہ ہمارے محترم مولانا، ہمارے مربی و سرپرست، امتِ مسلمہ کے قائد و امیر، پریشان حالوں کے پرسانِ حال، بے کسوں کے غم خوار، طالباتِ جامعہ اور ہزاروں طالبات کے مشفق استاذ و مربی، آپ ٹھہریئے، ہم سے منہ موڑ کر نہ جایئے، میں مانتا ہوں کہ آپ کا حق میں نے ادا نہیں کیا، میں نے آپ کی کما حقہ خدمت نہیں کی، آپ جو کام مجھ سے لینا چاہتے تھے اسے میں نے پورا نہیں کیا، شاید میرے اُس قصور کو آپ بھولے نہیں جب آپ بادلِ ناخواستہ جامعۃ البنات سے منہ موڑ کر جا رہے تھے اور میں بدنصیب آپ کے ہمراہ نہیں گیا، میں معذرت خواہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے:

فإن كان ذنبي كل ذنب فانه
محا الذنب كل المحو من جاء تائبا

''اگر ساری خطائیں میری ہی ہیں تو یقینا معذرت کے ساتھ آنے والا خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔''

آپ ہم سے دور نہ ہویئے، آپ پلٹ کر نہ جایئے، آپ ہی نے تو مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے، ذرا یاد کیجیے اس خوشی کو جس کا اظہار آپ نے مجھے جامعۃ البنات الاصلاحیہ میں پا کر کیا تھا، ذرا یاد کیجیے ماضی کی اپنی ان شفقت و محبت بھری اداؤں کو جس کی وجہ سے آپ نے مجھ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، اچھا چلیے مولانا یہ سب کچھ آپ نہیں سنتے تو سنیے میں عہد کرتا ہوں کہ آپ کے جانے کے بعد اب آپ کا دامن کبھی نہیں چھوڑوں گا، آپ کے تعلیمی مشن کو تاحیات میں پورا کرتا رہوں گا، سنیے...... سنیے...... سنیے۔

میں یہ جانکاہ خبر سن کر مولانا کے گھر گیا اور ان کے جسد خاکی کے پاس پہنچا، مولانا کے عقیدت مندوں کا مولانا کے آخری دیدار کے لیے ایک سیلاب سا اُمڈ پڑا تھا، میں مولانا کے روبرو کھڑا رخِ انور کا دیدار کر رہا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں اور دل مولانا سے یوں مخاطب تھا: آپ زندگی بھر اچھے تھے اور مرنے کے بعد بھی اچھے ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے، اگر مصائب و آلام میں آپ کی زندگی صبر کا نمونہ نہ ہوتی تو آج ہم آپ کی جدائی پر آنسوؤں

کے خزانے کو خالی کر دیتے۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان جیسے کلمات تو کلاس میں طالباتِ جامعہ کو پڑھایا کرتے، آج وہی سبق آپ کے جانے کے بعد آپ کی بیٹی ظل ہما پڑھا رہی ہے۔

مولانا کی زندگی کا سورج جب تک روشن تھا مولانا کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کی یادیں ستاروں کی مانند سورج کے سامنے اوجھل تھیں، جیسے ہی ان کی زندگی کا سورج غروب ہوا ہمارے دلوں میں اندھیرا چھا گیا اور وہ یادیں تاروں کی طرح یک بیک جگمگانے لگیں، مولانا کا اونچا علمی قد جو اُن کی حیات میں تھا، ان کے جانے کے بعد ہماری نگاہوں میں اس کی اونچائی آسمان کو چھونے لگی۔

مولانا کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات اور ان کی یادوں کی یہ ایک سرسری جھلک ہے، جس کو بیان کرتے وقت جذبات کی شدت کو میں نے روکنے کی کوشش کی ہے، اور میں نے یہ بھی چاہا کہ شاید یہ سب حقائق بیان کرنے سے مولانا کے فراق کا غم ہلکا ہو جائے، جیسا کہ متنبی نے کہا ہے:

و للواجد المكروب من زفراته

سكون عزاء أو سكون لغوب

''اور اس غمزدہ کو جو اپنی آہوں سے بے چین ہے، یا تو صبر سے سکون حاصل ہو جاتا ہے یا تھک ہار کر۔''

لیکن میرے اضطراب میں سکون حاصل ہونے کے بجائے شدت آ گئی ہے، شاید اس لیے کہ مولانا کی جدائی کا غم اتنا شدید ہے جسے متنبی ہی نے یوں بیان کیا ہے:

إن القتيل مضرجا بدموعه

مثل القتيل مضرجا بد مائه

''یقیناً آنسوؤں کا لت پت مقتول خون سے لت پت مقتول کے مانند ہے۔''

جذبات پر قابو پانے اور صبر کا دامن تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے مولانا سے راضی خوشی ان کے تمام اعمال کو قبول کرتے ہوئے، لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنت الفردوس میں ان کا مسکن بنائے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

آہ! ہمارے ناظم صاحبؒ

مولانا جاوید اختر قاسمی
استاذ جامعۃ البنات الاصلاحیہ، حیدرآباد

اخلاص کا پیکر اصلاحی سا کوئی دریا دل نہ ملا
الفت کے سمندر میں انکے جھانکا تو کوئی ساحل نہ ملا

۹/جولائی ۲۰۱۲ء کو حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحیؒ سے پہلی دفعہ ملاقات اور دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ پھر مسلسل گیارہ سال سایۂ عاطفت میں گزارنے اور بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دراز قد و قامت، معصوم شکل وصورت، کھلا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، سفید اور ہلکی داڑھی، چوڑی پٹی والی ٹوپی، سر پر سفید رومال، گھٹنے تک کرتا، کرتے پر صدری، کھلتا پائجامہ، آنکھوں پر موٹا چشمہ گویا سراپا سادگی کا مجسمہ، بالکل سادہ دل، سادہ مزاج اور سادہ زبان، بڑوں کا بے حد احترام وعزت کرنے والے اور چھوٹوں پر نہایت شفیق ومہربان، تواضع وانکساری اور اخلاص وللٰہیت کے پیکر تھے۔ لیکن خلافِ سنت وشریعت اگر کوئی بات دیکھتے سنتے یا پڑھتے تو زبان وقلم سے نکیر فرمانے اور اصلاح کرنے میں ذرہ برابر تامل وتاخیر نہیں کرتے تھے۔ صدق بیانی، حق گوئی اور بے باکی آپؒ کی فطرتِ ثانیہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ملک میں بابری مسجد کا مسئلہ اٹھا، یا بیرونِ ملک بیت المقدس کا قضیہ چھڑا تو آپ نے ''بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں'' اور ''مساجد اللہ'' جیسی کتابیں تحریر فرمائیں۔ جب مولانا نے یہ محسوس کیا کہ کچھ مخصوص لوگ آیاتِ جہاد اور آیت "لا اکراہ فی الدین" کی تعیین و تفسیر میں تاویلات سے کام لے رہے ہیں، تو دو مستقل رسالے "لا اکراہ فی الدین" اور ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' تصنیف فرمائے۔

اس طرح آپ کی متعدد تصانیف اسی نظریہ کی غماض ہیں، لیکن علم وتحقیق تصنیف وتالیف میں آپ کا خاص

مزاج یہ تھا کہ مضامین کے تحریری دعوی کی دلیل اور دین وشریعت پر ہونے والے اشکالات کے جواب میں نصوصِ آیات وروایات اوراَ کابر کی عبارات ہی کو پیشِ نظر رکھتے۔

آپ کی ذات سادہ اورخاموش طریقہ پرتصنیف وتالیف،علم وتحقیق کے لیے بہترین نمونہ ہے۔آپ کو ہمیشہ اور ہروقت غلبہ دین کی فکردامن گیرہوتی تھی۔اسی جذبے کے پیشِ نظر جامعہ کے استراحت کے وقت چائے نوشی کی مجلس میں ہم اساتذہ کے ساتھ آپ کی گفتگو کا موضوع بحث اکثر اسی قسم کی آیات وروایات کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ... الخ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ الخ، فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ، مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ اورالجہاد ماض الی یوم القیامۃ وغیرہ رہا کرتی تھیں،آپ دینی حمیت،ملی وتحریکی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔آپ کا سینہ امت کے درد کا سفینہ تھا، میں نے ناظم صاحبؒ کو عالم ضعیفی میں اس حال میں دیکھا کہ جسم بیماری میں گھلا ہوا ہے اوردل ودماغ قوم وملت کے دردوغم میں۔

یہی وجہ ہے کہ کہیں سے علماء، مدارس،مساجد کی بے حرمتی یا شعائر اسلام کے خلاف کوئی خبر سنتے تو تڑپ کر رہ جاتے اس کے دفاع اورازالہ کے لیے فوراً قلم اٹھاتے،حیدرآباد ودیگر مقامات سے شائع ہونے والے اخبار و رسائل میں مضامین تحریر فرما کر دینی،ملی وقومی ہمدردی کے جذبہ کا اظہار کرتے تھے،خاص طور سے میں نے کئی مرتبہ مشاہدہ کیا کہ اگرکسی دینی تنظیمی اورتحریکی نوجوان کی حراست یا شہادت کی اطلاع ملتی تو نہ صرف مغموم و مضطرب ہوتے بلکہ ضرورت مندوں کا مالی تعاون فرماتے اگر معاملہ قرب وجوار کا ہوتا تو خود ملاقات کرکے ہمت وحوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

ناظم صاحبؒ کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ دینی،شرعی،ملی وتنظیمی مسئلہ پرحق گوئی وحق بیانی میں نہ خود کے ذاتی نقصان کی پرواکرتے نہ انجام کی فکر، نہ کسی شخصیت یا جماعت سے مرعوب ہوتے ، نہ رشتہ وتعلقات نبھانے کے لیے مداہنت سے کام لیتے۔یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے مطالعہ میں دو کتابیں ''جہاد کیا ہے؟'' اور ''روحِ جہاد'' آئی جس میں ''ظلم واستبداد'' کو جہاد کی علت قراردے کرکفروشرک کی علت سے احتراز کرنے اور شوقِ شہادت،جذبۂ جہاداورروحِ جہاد کو مسترد اور بے وزن کرنے کی بھرپور محنت اور جادۂ حق سے راہِ فراراختیار کرنے کی مکمل کوشش کی گئی تو ناظم صاحب بے چین ہوگئے اوراس کے جواب میں بڑی محنت،جستجو اورعرق ریزی سے مدلل،مفصل اور پُرمغز مستقل پانچ مضامین تحریرفرمائے جومحترم جناب پروفیسرمحسن عثمانی ندوی مدظلہ کی مرتبہ کتاب ''عصرحاضر اورنظریۂ جہاد تنقید واستدراک'' اور ''مطالعات'' میں شائع ہوچکے ہیں۔حالانکہ آخر

الذکر کتاب ''روحِ جہاد'' کے مصنف سے حضرت کے بہت قریبی تعلقات ومراسم بھی ہیں۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ناظم صاحبؒ ان مضامین پر تنقید یا نظریہ کی اصلاح کے لیے دلائل وشواہد کے پیش کرنے میں اپنے ضعف اور جسمانی کمزوری کے باوجود بڑی ہمت اور حوصلے سے نصوصِ آیات وروایات اور فقہ کی عبارات میں بہت فکرمندی، غور وخوض اور تتبع وتلاش کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ہدایہ میں کتاب السیر کی تدریس احقر سے متعلق ہے۔ ہدایہ کی عبارت مجھ سے پڑھواتے کہ صاحبِ ہدایہ نے جہاد کی علت کیا بتائی ہے، ظلم یا کفر؟ جب عبارت پڑھی گئی ''وقتال الکفار واجب وان لم یبدوا للعمومات'' اور للعمومات کی تشریح میں جب بین السطور من الآیات والاخبار دکھائی گئی تو بہت مطمئن ہوئے اور فرمانے لگے کہ اس سے صاف اور واضح کیا بات ہوسکتی ہے؟ پھر بھی لوگ کفر اور غلبۂ کفر کے بجائے ظلم کو علت قرار دے کر حقیقت سے انحراف کر رہے ہیں تو یہ تھا ناظم صاحبؒ کا حقیقت بیانی میں نظریۂ خاص جو آج کل حالات ومصلحت کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر کبھی بغرض طنز ومزاح ہم اساتذہ یہ عرض کر دیتے کہ ''حضرت! آپ کا موقف بالکل مسلم، دلائل کافی مضبوط ہیں کہ اسلام کا اہم فریضہ جہاد ہے لیکن ملک کے موجودہ حالات اور امت کے دینی جذبات دیکھتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر عمل کیسے ممکن ہوگا۔'' تو ناظم صاحب فرماتے کہ ''مولانا! پہلے ہم علماء اپنے زبان وقلم سے اس طرح کی کوشش تو کریں جس طرح دوسرے اسلامی احکام وفرائض کے فضائل، خصوصیات واہمیت اور اس پر ملنے والے اجر وثواب کا شوق ورغبت دلانے میں کرتے ہیں تو اللہ پاک حالات بنائیں گے دلوں کو کھولیں گے اور فتح وکامیابی سے ضرور ہمکنار فرمائیں گے۔''

مزید فرماتے کہ ''قرآن کریم میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کی طرح كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ بھی ہے تو ہم اس دوسری آیت سے صرفِ نظر کیوں کریں، کیا ہم علماء اس آیت کی تبلیغ واحکام میں نبیؐ کے نائب نہیں ہیں؟ کیا اس پیغام کو امت تک پہنچانے کے لیے کوئی نبی کی بعثت ہوگی؟ کیا اس کے ترک پر ہمارا مواخذہ نہیں ہوگا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قتال کی تفسیر وتبلیغ کے لیے مصلحت کے پیشِ نظر کسی خاص حالات کے انتظار کا حکم دیا ہے؟'' ان سب سے بڑھ کر افسوس تو یہ ہے کہ بعض علماء ان آیات کی تاویل کرتے ہوئے اس فریضہ کو بے وزن اور کنڈم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس وقت مولانا کی مفکرانہ گفتگو اور دلائل کا دل پر اس قدر اثر پڑتا کہ مولانا کی قدر اور جذبۂ محبت میں مزید اضافہ ہوتا۔

حضرت ناظم صاحبؒ کی طبیعت میں اپنے علماء واکابر کی بہت عزت تھی یوں تو آپ فکر شاہ ولی اللہؒ وفراہیؒ،

فکر مودودیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی فکر کے امین تھے لیکن آپ کی مجلس میں خاص طور سے ان اکابر علماء حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ، مفکر اسلام مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ، علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا ابواللیث اصلاحیؒ وغیرہ رحمہم اللہ کے محاسن، ان کے تقویٰ وطہارت، ان کے تحریکی، تقریری، تصنیفی اور علمی کارنامے کا ذکر خوب کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ ماضی قریب کے علماء کے فقہ وفتاویٰ میں فقیہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ اور جدید فقہی مسائل میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے فقہ وفتاویٰ کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔

حضرت ناظم صاحبؒ ہم اساتذہ کو ان اکابرین کے کارنامے اور واقعات سناتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کے شاملیؒ کے میدان، مولانا سجادؒ کی خلافت کمیٹی اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے قیام، شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال، علامہ کشمیری کا قوتِ حافظہ، مولانا گیلانی وسید سلیمان ندوی کی ادب وسیرت نگاری، علی میاں ندوی کے عرب علماء میں علمی مقام، محدث کبیر اعظمیؒ کی اسمائے رجال میں معلومات، علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں گہرائی وگیرائی، مولانا مودودیؒ کے اقامتِ دین کے تصور، تفہیم قرآن وحدیث، مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے تدبر قرآن اور مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کی قائدانہ صلاحیت اور فصاحت لسانی کے تذکرے بہت کثرت سے کیا کرتے تھے۔

ناظم صاحبؒ حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' بڑی دلجمعی ودلچسپی سے پڑھاتے تھے بسا اوقات فرماتے تھے کہ ''شاہ صاحبؒ کے یہ اچھوتے اور نادر مضامین دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ منجانب اللہ حضرت کے قلب پر القا کیا گیا ہے۔''

ایک مرتبہ میں طالبات کو ''الفوز الکبیر'' کے درس میں تورات میں تحریف لفظی ہوئی ہے یا معنوی میں علماء کی آراء بتارہا تھا جس میں علامہ کشمیری کی رائے سب سے بلکہ شاہ صاحب سے بھی الگ ہے، علامہ دونوں طرح کی تحریف کے قائل ہیں اور اس پر بہترین نکتہ بیان کیا ہے۔ ناظم صاحبؒ نے غالباً اس کو سن لیا تھا بعد میں دریافت کیا کہ یہ نکتہ کہاں لکھا ہے، تو میں نے استاذ محترم مفتی امین صاحب پالنپوری مدظلہ کی کتاب ''الخیر الکثیر'' پیش کی تو آپ انور شاہ کشمیری کی رائے پسند فرما کر مسرت کا اظہار کرنے لگے۔

ناظم صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے درس وتدبر قرآن میں خاص ذوق عطا فرمایا تھا میں نے دیکھا کہ اکثر قرآنی نصوص میں غرق رہتے اور اس کے لیے عربی تفاسیر روح المعانی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیضاوی وغیرہ سے مراجعت فرماتے اور فقہ وفتاویٰ کی کتاب میں ہدایہ، فتح القدیر، علامہ کاسانی کی بدائع الصنائع، ردالمحتار و در المختار،

الموافقات اور شامی وغیرہ کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔

حضرت ناظم صاحبؒ میں یہ خوبی بھی میں نے دیکھی کہ ایسے کسی مشہور عالم دین، محدث، فقیہ یا مقرر جن کے علم وفضل سے امت فیضاب ہوتی ہے اور جن کی علمی، فقہی، دینی وتحریکی خدمات عالمگیر ہوتی ہیں، ان سے استفادہ میں مسلکی یا آراء کے اختلافات آڑے نہیں آنے دیتے تھے بلکہ ایسے حضرات کی بے حد قدر کرتے۔ ان کی ناسازی طبیعت کی خبر سے بے چین ہوکر شفا کے لیے دعا کرتے اور موت کی اطلاع پاکر بہت متفکر ومغموم ہوجاتے اور مغفرت کے لیے دعا کا اہتمام فرماتے۔

۲۰۱۲ء کو جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں یوم عربی کا جلسہ منعقد کیا گیا تھا جب مشورہ میں مہمان خصوصی کی بات آئی تو ناظم صاحب فرمانے لگے کہ جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے شیخ الحدیث محترم مولانا خواجہ شریف صاحب بہت اچھے ادیب بھی ہیں عربی زبان پر ان کی بہت اچھی پکڑ ہے ان کو بلایا جائے پھر مجھے ساتھ لے کر جامعہ نظامیہ پہنچے اور شیخ صاحب سے ملاقات کرکے عہدہ صدارت کی درخواست کی گئی۔ خواجہ صاحب کا پروگرام بہت پہلے سے کہیں طے ہونے کی وجہ سے معذرت خواہی کی گئی۔ اس وقت میں دونوں بزرگوں کی ملاقات وگفتگو کے انداز اور ناظم صاحب کی کشادہ قلبی وکسر نفسی سے بہت متاثر ہوا۔

فروری ۲۰۲۱ء میں فقیہ عصر استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دام ظلہ کرونا وائرس کے زمانے میں دبئی میں بیمار ہوکر دواخانہ میں شریک ہوگئے تھے۔ اس موقع پر ناظم صاحبؒ کی مولانا سے ہمدردی ومحبت کا مجھے اندازہ ہوا کہ اکثر ان کے فقہی، دینی وملی خدمات کا تذکرہ کرتے تھے اور صحت کے لیے فکرمند رہتے، روزانہ بلا ناغہ طبیعت معلوم کرتے تو میں اپنے دوست جن کے پاس یومیہ مولانا کی خبر آتی تھی مفتی شوکت ثنا قاسمی سے دریافت کرکے بتادیتا تھا۔ میں ایک دن کسی وجہ سے جامعہ نہیں آیا تو ناظم صاحب مضطرب رہے اور مغرب بعد فون کرکے معلوم کیا کہ آج کی کیا اطلاع ہے افاقہ کی خبر سنائی تو مطمئن ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کامیاب ناظم، بے مثال مربی، منجھے ہوئے مدرس، حق گو مقرر ان سب سے بڑھ کر بے باک مصنف تھے۔ میں نے آپؒ کے گیارہ سالہ دورِ نظامت میں کسی طالبہ، عملہ، معلمین ومعلمات سے سخت کلامی تو درکنار باز پرس کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ آپ کی یہی سادگی خاموشی اور خوش خلقی ہمارے کام کرنے میں اخلاص پیدا کرتی تھی۔ آپؒ ہم اساتذہ وعملہ کی ضروریات کا اس قدر خیال رکھتے کہ تنخواہ کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی، اگر کسی وجہ سے پہلی تاریخ کو تعطیل ہوتی تو ختم ماہ پر رقم کی اجرائی کا حکم صادر فرماتے۔ کبھی کسی عملہ کو پیشگی رقم کی ضرورت پڑ جاتی تو اجرائی میں ذرہ برابر بھی

تاخیر وتامل نہیں کرتے بلکہ کسی کی ضرورت کوخود محسوس کرتے تو بلا مطالبہ کے ان تک رقم پہنچانے کا اہتمام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لاک ڈاؤن کے زمانے میں بھی اساتذہ کی تنخواہ میں ایک روپے کی بھی کمی نہیں کی گئی۔ اسی طرح طالبات کی تعلیم وتربیت، صحت وتندرستی اور خورد ونوش کے سلسلے میں بہت متفکر رہتے اور اکثر ہاسٹل کی ذمہ دار سے دریافت کرتے کہ آج طالبات کی کتنی تعداد ہے، کوئی بیمار تو نہیں ہے، آج کیا پکا ہے؟ ہاسٹل میں!

ناظم صاحبؒ طالبات کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے اوران کے معاملات سے آگاہ رہتے تھے۔ جب بھی کسی موقع سے کسی مجلس میں طالبات کو نصیحت وتربیت فرماتے تو سب سے پہلے تقویٰ، نماز کی پابندی، وقت کی قدر اور کام میں اخلاص نیت کی ترغیب دیتے۔ فرماتے کہ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ عمل خالصتاً لوجہ اللہ ہو جس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہ ہو۔

درسی کتب کے مطالعہ کے ساتھ طالبات کو خارجی کتابوں بلکہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے اخبار بینی اور امت تک اپنی بات پہنچانے کے لیے مضمون نگاری کا بھی شوق دلاتے۔ نیز معاشرہ میں زندگی گزارنے اور حالات مخالف ہونے کی صورت میں دینی خدمت انجام دینے کا طریقہ سکھاتے تھے۔ آپ اکثر عالمی حالات کے تناظر میں گفتگو فرماتے تھے۔

طالبات کے داخلہ کے وقت حضرت ناظم صاحبؒ کا توکل، استغناء، خدمتِ دین کا جذبہ قابلِ دید اور میرے لیے تو باعثِ تعجب تھا کیونکہ جامعہ بے سروسامانی کی حالت میں ایک خطیر رقم کے کرایہ کی بلڈنگ میں منتقل ہوا تھا مزید اخراجات میں اساتذہ کی تنخواہ، ہاسٹل کا خرچہ، طالبات کی آمد ورفت کے لیے سواری کا انتظام وغیرہ کے پیش نظر میری کوشش ہوتی کہ کچھ تو فیس وصول ہو جائے، لیکن ناظم صاحبؒ فرماتے ''جانے دیجیے مولانا! سہولت سے جو دے سکتے ہیں لے لیجیے ورنہ رہنے دیجیے۔'' حضرت کے پیش نظر کبھی پیسہ نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ میں تقریباً گیارہ بارہ سال سے اس ولی صفت بزرگ کے توکل کا مشاہدہ کر رہا ہوں کہ الحمدللہ آپ کے توکل کی برکت سے جامعہ کی کوئی ضرورت کبھی رکی نہیں، کبھی کسی چیز کی کمی ہوئی نہیں، ہر کام وقت پر انجام پاجاتا ہے مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

یوں تو حضرت ناظم صاحبؒ کی تدریسی خدمات کا زمانہ بہت طویل رہا ہے، آپؒ کے باصلاحیت شاگردوں میں محدث، مفسر، مقرر اور مصنف علماء کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان عالمات کی بھی ہے جو ملک و بیرون ملک تدریسی، تحریکی اور تنظیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ مولانا کے شاگردوں میں دو چار ایسی شخصیات ہیں جن کو جامعہ کے تقسیم اسناد وغیرہ کے جلسہ میں دیکھنے اور اسٹیج سے یہ کہتے ہوئے کہ ''میں اپنے استاذ محترم حضرت

مولانا عبدالعلیم اصلاحی دام ظلہ کی دعوت پر اس جلسہ میں حاضری کو سعادت سمجھتا ہوں، جامعہ مظہر العلوم بنارس میں حضرت سے مختلف کتابیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی آج جو کچھ ہوں حضرت کی تعلیم وتربیت کا اثر ہے۔'' سن کر میں کیا سارا مجمع ششدر رہ گیا، جن میں حضرت مولانا ابوظفر حسان ندوی دامت برکاتہم العالیہ کی شخصیت ہے جن کے علم وفضل، تقویٰ وطہارت، زبان وقلم سے کون واقف نہیں ہے؟! آپ کی تفسیر وتقریر اور سوال و جواب کے ذریعہ ہی پیس ٹی وی (Peace TV) متعارف ہوا اور تعجب تو اس وقت بھی ہوا جب استاد کی سادگی اور شاگرد پر شفقت ومہربانی کا منظر دیکھا کہ ندوی صاحب جامعہ کی گیٹ پر کار سے اترنے کی کوشش کررہے ہیں تو اصلاحی صاحبؒ ان کو اتارنے میں سہارا دے رہے ہیں۔

دوسری شخصیت مفسر قرآن حضرت مولانا غفران صاحب فلاحی دامت برکاتہ کی ہے جن کی علمی بصیرت، خدمتِ تفسیر و بیان سے مہاراشٹر کے مراٹھواڑہ کا مکمل علاقہ فیضاب ہورہا ہے اور ان کا اپنے استاذ محترم سے عقیدت ومحبت کا یہ عالم ہے کہ جامعہ کا تعاون کرنے کرانے کے علاوہ بڑے اخلاص ومحبت سے یہ کہتے ہوئے کچھ رقم میرے حوالے کررہے ہیں کہ میری طرف سے میرے استاذ کو بطورِ ہدیہ پیش کردیجیے گا، اسی طرح حضرت مولانا جنید احمد صاحب بنارسیؒ ہیں جو اب اللہ کو پیارے ہوگئے، اللہ ان کو غریقِ رحمت فرمائے۔ ان ہی شاگردوں میں مولانا حافظ نعیم الدین اصلاحی جو شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح ہیں، ان سے بھی مولانا کی ملاقاتوں کا حال دیکھا ہے۔ شاگرد کی طرف سے جو عزت وتعظیم اور استاد کی جانب سے جو شفقت ومحبت دیکھی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔

ناظم صاحبؒ کی تعزیتی نشست میں ایک اور شاگرد رشید سے سنا جو اپنے استاذ محترم کے خاص نظریات، دینی خدمات اور خوبیاں بڑے کرب سے بیان کررہے تھے، اسی طرح شاگردات میں قابلِ ذکر ہیں محترم جناب ماسٹر ابراہیم صاحب آکوٹ کی دو صاحبزادیاں محترمہ عمارہ فردوس صاحبہ جالنہ، اور محترمہ مبشرہ فردوس صاحبہ اورنگ آباد جن کی علمی، قلمی تقریری وتحریکی صلاحیت سے مختلف ادارے اور متعدد تنظیمیں مستفید ہورہی ہیں اور ایسے ہی آپؒ کی شاگردات میں خود آپ کی صاحبزادیاں بھی ہیں جو تدریسی، تقریری، تحریری، تحریکی اور قلمی اعتبار سے باصلاحیت ہیں ان میں قابلِ ذکر ہیں محترمہ عالمہ وفاضلہ ڈاکٹر ظلِ ہما صاحبہ جو علم وفکر، زبان وقلم، تحریک وتدریس میں ہی نہیں بلکہ سادگی وسنجیدگی میں بھی اپنے والد محترم کی حقیقی وارثہ وامینہ ہیں، جو ناظم صاحبؒ کے تمام تر مشن، فکری، قلمی، علمی اور دینی خدمات کی کوششوں کو مستحکم بنانے اور فروغ دینے کے لیے شب وروز کوشاں رہتی ہیں، دعا ہے کہ اللہ پاک صحت وسلامتی کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار فرمائے۔ آمین!

جب ۲۰۱۸ء میں حکومت کی طرف سے تین طلاق پر قانون بنانے کی کوشش شروع ہوئی تو اس موقع سے محترم جناب مشتاق ملک صاحب صدر تحریک شبان کی کوشش سے شہر کے مختلف مقامات پر تحفظِ دین وشریعت کے عنوان سے کئی پروگرام منعقد ہوئے تھے جس میں ناظم صاحبؒ مدعو ہوتے تھے اور ساتھ میں میں بھی رہا کرتا تھا، دیکھتا تھا کہ ناظم صاحبؒ اکثر آخری مقرر کی حیثیت سے بڑی مختصر لیکن جامع، پُرمغز، مدلل اور دوٹوک گفتگو فرماتے تھے اس موقع پر ناظم صاحبؒ کا علماء میں ادب واحترام اور علمی مقام دیکھ کر بہت متاثر ہوتا تھا اور بے حد خوشی بھی ہوتی تھی۔

ناظم صاحبؒ بڑے مردم ساز اور مردم شناس تھے بلکہ آپ کی طبیعت میں ''انزلوا الناس منازلهم'' کا جذبہ بھی دیکھا کہ جب مولانا محمد سہیل صاحب مکی مدظلہ اس جامعہ میں تدریس کے لیے تشریف لائے تو ناظم صاحب نے خوشی اور جذبہ محبت کے اظہار میں عربی کا ایک شعر سنایا، جس کا خلاصہ تھا کہ آپ خوش نصیب ہیں کہ ہمارے پاس آئے یا میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے آپ کو دوبارہ پالیا۔

پھر کچھ ہی مہینوں کے بعد جامعہ عثمانیہ کے دائرۃ المعارف کے شعبۂ عربی میں کلیدی عہدے پر تقرری کے لیے اشتہار آیا تو ناظم صاحبؒ کو مولانا سہیل صاحب سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ آپ اس کام کے لیے بہت موزوں اور باصلاحیت ہیں، آپ ضرور درخواست دیجیے اگرچہ اس سے میرا اور جامعہ کا نقصان ہوگا۔

اسی طرح ناظم صاحب کو احقر پر بڑا اعتماد تھا اور بہت محبت کرتے تھے۔ جامعہ کے بیشتر امور، استاذ کی تقرری، طالبات کے داخلہ وغیرہ میں مشورہ کرتے بلکہ جامعہ میں اگر کوئی صاحب مسئلہ دریافت کرنے آتے جو ناظم صاحب خود بھی بتا سکتے تھے لیکن میرے تکمیل افتاء کرنے کی وجہ سے مجھ سے فرماتے کہ دیکھئے کیا مسئلہ معلوم کر رہے ہیں بتا دیجیے۔

ناظم صاحبؒ بڑے وسیع الظرف اور فیاض تھے، کبھی کسی سائل کو گن کر دیتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور نکال کر دے دیتے تھے۔ ایک دن بڑی رازداری سے سنا رہے تھے کہ ''مولانا! آج گھر پر ایک صاحب اپنے والد کے کفن کے لیے پندرہ سو روپئے مانگنے آئے تو میں نے دے دیا۔'' پھر قدرے توقف کے بعد فرمانے لگے کہ ''یہی صاحب مجھ سے آج سے قریباً ایک سال قبل بھی اپنے والد کے کفن کے نام پر پندرہ سو روپئے لے کر گئے تھے۔''

ناظم صاحبؒ کی منکسر المزاجی اور سادگی بیان کرنے کے لیے بس یہی بات کافی ہوگی کہ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹی وی ایس پرانی گاڑی ہے جس پر کہیں جانے میں میرے بچے بھی عار محسوس کرتے ہیں لیکن قربان جاؤں اپنے ناظم صاحبؒ کی سادگی پر کہ کسی کام سے یا کبھی کسی جلسے یا پروگرام میں جانا ہوتا تو اس وقت میری بھی اور معلمات کی بھی کوشش ہوتی کہ سواری کا نظم کریں لیکن ناظم صاحبؒ یہ فرماتے ہوئے میرے پیچھے بیٹھ جاتے

کہ چلیے مولانا کیا ہوتا ہے کاروار سے، وہاں تک پہنچنا ہی تو ہے۔

ناظم صاحبؒ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کبھی کسی خارجی کام کے لیے اساتذہ سے نہیں کہتے۔ بلکہ جب کبھی جامعہ میں کسی پروگرام یا جلسہ وغیرہ میں مہمانوں کی آمدورفت، طعام و قیام یا ہاسٹل میں اچانک کوئی شدید ضرورت جیسے نل، لائٹ، پانی کا نظم یا آبپاشی وغیرہ کے مسائل درپیش ہوتے تو ناظم صاحبؒ بڑے مضطرب و متفکر رہتے حالانکہ یہ تمام کام ان کے کم سخن، سلیم الطبع، وسیع الظرف، بلند ہمت وحوصلہ اور دینی مزاج رکھنے والے صاحبزادے محترم بھائی معتصم باللہ اوران کے رفقاء کے تعاون سے بحسن وخوبی انجام پاجاتے ہیں۔

ناظم صاحبؒ نماز باجماعت اور جامعہ کے اوقات کے بھی بہت پابند تھے۔ نماز فجر کے بعد تفریح کا معمول تھا بلکہ کبھی کبھی پیدل ہی جامعہ تشریف لے آتے، اس جامعہ کے ابتدائی زمانے میں کئی سال یہ معمول رہا ہم دونوں مسجد بخاری شاہ میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے پھر فرماتے آپ جایئے اور ناظم صاحب خود پیدل چل کر گھر تک چلے جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا پیرانہ سالی میں بھی اچھے خاصے صحت منداور چاق و چوبندر ہا کرتے تھے۔ کوئی پریشان کن بیماری نہیں تھی صرف قوتِ ہاضمہ کی شکایت رہا کرتی تھی، گیارہ سالہ مدت میں صرف دو وقت دواخانہ میں شریک ہوتے ہوئے دیکھا۔ پہلی بار ۲۰۱۳ء میں آپ ایک شاگرد عزیز کی دعوت پر نیپال ایک پروگرام میں تشریف لے گئے تھے واپسی پر دل کے عارضہ کی وجہ سے ملک پیٹ کے یشودھا دواخانہ میں شریک کرائے گئے تھے۔

دوسری بار ستمبر ۲۰۲۲ء میں تنفس کی تکلیف کی وجہ سے ملک پیٹ کے میٹرو کیور اسپتال میں شریک ہوئے تھے کیونکہ آپ کا علاج ومعالجہ اکثر گھر پر ہی آپ کے بااعتماد اور قابلِ قدر برادرزادہ (بھتیجے) جناب محترم ڈاکٹر خالد صاحب کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر آکسیجن اور گلوکوز چڑھانے کا عمل بھی گھر پر ہی ہوتا تھا۔

آہ! کیسے لکھوں کہ ۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء دن کے سہ پہر میرے لیے وہ غمناک، المناک، تاریک و تکلیف دہ گھڑی تھی جب ایک شاگرد کا فون آیا کہ مولانا ''ناظم صاحب'' اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ گو خبر غیر متوقع نہیں تھی لیکن کان اس کے سننے اور دل قبول کرنے کو آمادہ نہیں تھا، کیونکہ ڈیڑھ دو گھنٹہ قبل ہی مولانا کو دواخانہ سے دیکھ کر آیا تھا۔ خیر اسی کشمکش میں جامعہ کی ایک مؤقر معلمہ (جو اس وقت دواخانہ میں تھیں) سے تفتیش کرنے پر خبر کی تصدیق ہوتے ہی دل کی دنیا میں ایک تلاطم سابرپا ہو گیا، بہت ہی کرب کے ساتھ حلق سے ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' نکلا۔

اپنے مشفق و مہربان ناظم صاحبؒ کی معیت وسایۂ عاطفت میں گزری ہوئی مدت کی ایک ایک بات اور پل پل کی یادیں یکا یک نگاہوں کے سامنے آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور زبان سے بے ساختہ نکلا آہ! ہمارے ناظم صاحب!! لیکن دوسرے ہی لمحہ یہ حقیقت کہ ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ'' الخ اور یہ کہ ''موت سے کس کو

رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے'' ذہن میں آتے ہی خود کو سنبھالا اور سیدھے حضرت کے دولت خانہ سعید آباد حاضر ہوا جہاں مولانا کے آخری دیدار کے لیے رشتہ داروں، معتقدین ومتوسلین، طالبات ومعلّمات کی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں بھی پُرنم نگاہوں سے حضرت کے نورانی چہرہ کو تکے جارہا تھا جو آج اور بھی چمکدار و پُررونق ہوگیا تھا، ایسا محسوس ہورہا تھا کہ آپ دریافت کریں گے کہ جامعہ میں سب خیریت تو ہے؟ کیسی ہیں طالبات و معلّمات؟ تعلیم کیسی چل رہی ہے؟ آج کتنی تعداد ہے طالبات کی؟ لیکن آج میں ان تمام سوالات سے محروم ہوگیا تھا۔ اسی دوران حضرت کا نواسہ عزیزم عبداللہ عزام سلمہ جس نے اپنے کھیلنے کودنے کی عمر میں کھیل کود اور تفریح چھوڑ کر دن رات مسلسل نانا کی تیمارداری اور خدمت گزاری کا حق ادا کردیا تھا جس کا حق تھا رونے کا، دیکھا کہ چارپائی پکڑ کر زاروقطار رورہا ہے، سر پر ہاتھ رکھ کر صبر کرنے کے لیے دلاسا وتسلی دی۔

یوں تو اس وقت تک مولانا کے وفات کی اطلاع میڈیا کے ذریعہ عام ہوچکی تھی، لیکن نماز جنازہ کا وقت اور جگہ کے تعین کے لیے جامعہ کے سابق استاد اور میرے مشفق دوست مفتی امان اللہ صاحب قاسمی سے واٹس اپ پر خبر دینے کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ متعینہ وقت کے مطابق ۲۸ ستمبر ۲۰۲۲ء بعد نماز فجر شہر کی مشہور مسجد اجالے شاہ سعید آباد میں حضرت مولانا کے داماد جناب مولانا انیس احمد فلاحی صاحب کی امامت میں شہر کے مشہور و معروف علماء کرام، مساجد کے ائمہ وخطبا، حضرت کے معتقدین اور لواحقین اور نوجوانانِ سعید آباد نے نماز جنازہ ادا کی۔ بعد نماز جنازہ سعید آباد میں سڑک سے متصل مولانا کے گھر کے سامنے قبرستان میں اس مردِ مجاہد ابوشہید، علم وفضل، صدق ووفا، جود وسخا، دکھاوا اور ریاکاری نام ونمود کے جذبہ سے عاری، دلِ دردمند وفکر ارجمند رکھنے والے، صبر ورضا، توکل واستغناء کے پہاڑ، نرم خو ونرم مزاج، اخلاص وللّٰہیت کے پیکر کو بدیدۂ نم سپرد خاک کردیا گیا۔ ناظم صاحبؒ کی رحلت سے دل مغموم ومضطرب ہوگیا ہے۔ اب معمول یہ ہے کہ قبر پر جاکر حضرت کے لیے مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دعاء خیر کرتا ہوں اور حسرت سے کبھی قبر اور کبھی اس کمرہ کو دیکھتا ہوں جس میں مولانا سے زندگی میں اکثر ملاقات کیا کرتا تھا جو اتفاق سے آمنے سامنے ہی ہیں۔

اب تو خود سے عزمِ مصمم کرلیا ہے کہ ہر حال میں انشاء اللہ مولانا کے کاز اور لگائے ہوئے باغ (جامعۃ البنات الاصلاحیۃ) کو امانت سمجھ کر اس اخلاص سے جو مولانا سے وراثت میں ملا ہے ترقی دینے میں مکمل سعی پیہم کروں گا تاکہ حضرت کی روح کو تسکین پہنچے اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنے۔

دعا ہے کہ اللہ پاک ناظم صاحبؒ کی حسنات ودینی خدمات کو قبول فرماکر جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

گم شدانِ راہ کو گویا کہ رہبر کر دیا

ڈاکٹر آفرین کوثر
بنت ڈاکٹر محمد معین
صدر معلّمہ جامعۃ البنات الاصلاحیہ حیدر آباد

دنیا آزمائش گاہ ہے طرح طرح کی آزمائشیں، پریشانیاں، مصائب و آلام انسان کو لاحق ہوتے ہیں ان آزمائشوں میں صبر و ثبات، مصائب و آلام کو خندہ پیشانی سے جھیلنا ایک بندۂ مومن کی شان ہے۔ تذکرہ ایک ایسی ہی مومنانہ شان رکھنے والی ہستی کا ہے جو "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

دل غم سے نڈھال ہے، آنکھیں نم ہیں، دنیا اندھیری نظر آرہی ہے کہ ہمارے استاذ محترم ہمیں اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر 'اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی' کہہ کر رخصت ہو گئے۔ کبھی یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ ہم مولانا کے بغیر بھی زندہ رہیں گے جس نے جینے کا ہنر سکھایا، وہی کبھی آنکھیں بند کر لے گا یہ سوچا ہی نہ تھا...... کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ مولانا کے بغیر زندگی کے معنی کیا ہوں گے...... کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا کہ زندگی کے سارے رنگ آپ کے بغیر کھو جائیں گے...... کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا کہ آپ کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہو جائے گا۔

ہر وقت لمحہ بہ لمحہ قدم قدم پر آپ سے رہنمائی لینے کی عادت...... ایسی پختہ تھی کہ آپ کے بغیر جامعہ کے معاملات کو آگے بڑھانا دشوار ہی نہیں دشوار تر لگ رہا ہے۔ وہ بڑے بڑے کام جو آپ کی معیت اور آپ کی رہنمائی میں ہم نے کیے اب سوچ رہی ہوں کہ کس طرح ہو پائیں گے؟ ہم ہر کام بغیر کسی تردد کے کر گزرتے تھے صرف اس بھروسہ پر کہ آپ ہمارے سامنے موجود ہیں...... اب آپ کے بعد جامعہ کی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانا بہت مشکل نظر آرہا ہے...... ہمتوں کو مجتمع کرتی ہوں...... حوصلوں کو آواز دیتی ہوں، آپ کے پڑھائے ہوئے صبر و ثبات کے اسباق دہراتی ہوں مگر پھر بھی میرے حواس ابھی تک قابو میں نہیں ہیں۔ ہر گزرتا وقت احساسِ زیاں کو مزید گہرا کر رہا ہے۔ مولانا آپ کی صورت میں اللہ نے ہمیں ایک شجر ہائے سایہ دار عطا کیا

تھا۔جس کی چھاؤں میں ہم ہر سرد و گرم موسم میں علم و عمل کی، درس و تدریس کی منزلیں طے کرتے تھے۔آپ زمانے کی ساری تمازتیں تنہا خود اپنے اوپر جھیل کر ہمیں سایہ اور ٹھنڈک بخشتے تھے۔اس لیے ہم کبھی تھکتے نہ تھے۔آہ! اس گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں!......کہاں سے لائیں کوئی آپ جیسا؟ آج جب آپ کی جدائی کا دکھ سہ رہے ہیں تو سمجھ آ رہی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا غم صرف ایک بیٹی کا غم نہیں تھا۔ایک نبیؐ کی رحلت، ایک قائد، ایک رہنما، ایک معلم سے محرومی کا بھی غم تھا......آج درد کی یہ صورت نمایاں ہو کر، ہمارے سامنے آ گئی ہے کہ ہم نے صرف ایک روحانی باپ ہی نہیں کھویا بلکہ ایک قائد، ایک معلم، ایک مربی، ایک رہنما اور ایک راہبر کھو دیا ہے۔غم کی شدت الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھالی جاسکتی، غم کی یہ تمام کیفیات قضاء وقدر کے فیصلوں کو بھی ٹال نہیں سکتیں۔مرضیٔ رب یہی تھی کہ خدا کا یہ نیک بندہ جو خدا کے نبی کے پیکر میں ڈھلا، نبی کے پیغام کو عام کرنے میں لگا ہوا تھا اپنے رب کے جوار میں پرسکون نیند سو جائے۔اللہ! ہم تیرے فیصلے سے راضی ہیں۔

مولانا سے میرے تعلق کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو مولانا میرے استاذ تھے، دوسری حیثیت یہ ہے کہ مجھے مولانا کے ساتھ طویل عرصے تک کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ دونوں حیثیتیں ہی مجھے عزیز ہیں کیونکہ یہی میری شخصیت کی تعمیر کی بنیاد ہیں۔طالب علمی سے معلمہ اور صدر معلمہ بننے تک کا سفر ۳۲ سالوں پر محیط ہے۔اس طویل عرصہ میں، میں نے مولانا سے جو کچھ سیکھا ہے، جو تجربات حاصل کیے ہیں اور ہر دن مولانا کی ایک نئی خوبی اور صفت سے واقف ہوتی رہی ہوں ان کو بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔لیکن کوشش کروں گی کہ مولانا کے خلوص، مولانا کی امانت داری، مولانا کی ہمدردی و خیر خواہی، طالبات کی تعلیم و تربیت سے متعلق فکرمندی اور تندہی اور مولانا کے نمایاں اوصاف کی ایک جھلک پیش کر دوں۔ باتیں تو بہت ہیں مگر مجلہ کے صفحات مجھے اجازت نہیں دیتے کہ تمام چیزوں کا احاطہ کروں۔کیونکہ مولانا کے شاگردوں اور شاگردات کے تاثرات کا ایک تانتا لگا ہوا ہے، ہر کوئی چاہتا ہے کہ مولانا سے متعلق اپنی یادوں، اپنی باتوں کا ذکر کرے، ان شاء اللہ سبھی کو اس کتاب میں جگہ دی جائے گی۔

میں سب سے پہلے اپنے طالب علمی کی کچھ یادیں سپردِ قرطاس کرنا چاہوں گی، جس سے آپ کو مولانا کی تڑپ اور مولانا کے جذبۂ جنون کا اندازہ ہوگا۔

محلہ کی ایک نیک دیندار خاتون جو مولانا کے علم و فضل کی معترف اور مولانا کے تقویٰ و خلوص سے متاثر تھیں، جنھیں ہم فوقیہ آنٹی کہتے تھے، ان کے مشورہ پر میں نے جامعہ میں داخلہ لیا تھا۔

جب میں نے جامعہ میں داخلہ لیا یہ جامعہ کا ابتدائی دور تھا۔مولانا ہمہ وقت چاق و چوبند اور مستعد نظر آتے

جس سے جامعہ میں تقویٰ و دین داری کی ایک لہر چہار سو دوڑتی دکھائی دیتی۔ ایسا لگتا جیسے ہم ایک الگ دنیا میں آ بسے ہوں، دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ کے اثرات سعید آباد کے علاقہ میں بھی نظر آنے لگے۔ جامعہ کا اندرونی ماحول بیرونی ماحول پر اثر انداز ہونے لگا اور ہر طرف نیکی وتقویٰ کی بہار اپنی جھلک دکھلانے لگی۔ جامعہ میں ہمارے روز وشب دین کو سیکھنے اور تقویٰ و پرہیز گاری کی آبیاری میں گزرنے لگے، پاک اور پاکیزہ ماحول، نیک لوگوں کی صحبت اور علمِ دین سیکھنے کا جوش اپنی آخری حدوں پر تھا، ہر کام میں یہ صحیح ہے، دین کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ دیکھنا ہماری اولین ترجیح ہوتا تھا...... بڑا زعم بھی تھا کہ علمِ دین سیکھ رہے ہیں۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ابھی ہم اعدادیہ ہی میں تھے کہ ہم نے سنا کہ ہمیں جامعہ کی جانب سے ٹی وی پر کچھ دکھایا جائے گا۔ اس زمانے میں ٹی وی کو ہم نہایت ہی خراب چیز اور انتہائی بے دینی کا کام سمجھتے تھے۔ جب ہم نے یہ سنا تو بہت پریشان ہوئے اور محلہ کی اس رہنما خاتون کے یہاں گئے اور انہیں واقعہ سنایا۔ انھوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ مولانا سے بات کیجیے۔ دوسرے دن میں اور میری کچھ ساتھیاں مدرسہ کے وقت سے کچھ پہلے جامعہ پہنچ گئے۔ ہم گئے تو ہم نے دیکھا کہ مولانا جامعہ میں موجود ہیں۔ اسی دن ہمیں معلوم ہوا کہ مدرسہ میں سب سے پہلے آنے والی شخصیت مولانا ہی کی ہوتی ہے کہ ابھی تک واچ مین وغیرہ بھی نہیں آئے تھے مگر مولانا موجود تھے۔ مولانا نے ہمیں دیکھ لیا...... اور کہا کہ ''ارے...... آپ لوگ اتنی جلد مدرسہ آ گئیں۔'' ہم نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ ''مولانا! ہم مدرسہ اس لیے پہلے آ گئے ہیں کہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں......'' مولانا نے بڑے ہی شفیق انداز میں کہا ''کہیے کیا کہنا ہے؟'' ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا ''مولانا! ہم نہیں چاہتے جامعہ میں ٹی وی لگے اور ہمیں کوئی چیز ٹی وی پر دکھائی جائے۔'' ہمارا اتنا کہنا تھا کہ ہم نے دیکھا مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مولانا نے انتہائی وزنی ٹی وی اکیلے اٹھا کر آفس کے باہر لا کر پٹخ دیا اور کہا کہ کوئی ٹی وی، وی وی نہیں لگے گا۔ آپ لوگ جائیے اور اطمینان سے پڑھائی کیجیے۔ ہم اپنی کلاس میں چلے گئے اور مولانا نے ٹی وی لگانے نہ دیا۔ ہمیں نہیں معلوم مولانا نے کس طرح اس کو رکوایا۔ آج جب میں یہ واقعہ یاد کرتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ مولانا خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ ٹی وی لگے مگر جامعہ کے دوسرے لوگوں کی وجہ سے کشمکش میں تھے، مگر جیسے ہی ہم طالبات نے مولانا کے سامنے اعتراض کیا مولانا نے فوراً ہماری بات قبول کر لی۔ یہ کسی کو سننے میں بہت معمولی واقعہ لگ رہا ہوگا مگر میرے لیے یہ مولانا کی عظمت پر دلیل ایک واقعہ ہے کہ اتنی چھوٹی ہماری کلاس...... اور مولانا ہم سے واقف بھی نہیں مگر ہماری بات کی اتنی اہمیت کہ ہماری وجہ سے ناراضگی مول لی اور پروگرام کینسل کر دیا۔

شہریانِ حیدر آباد پر مولانا کا یہ احسان ہے کہ مولانا نے لڑکیوں کا مدرسہ قائم کر کے ہر گلی اور ہر محلہ میں

عالمات و فاضلات کو پہنچا دیا۔ آج یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کی کوئی گلی اور محلہ ایسا نہیں ہوگا، جہاں مولانا کی شاگردات نہ پائی جاتی ہوں۔ شہر کے ہر اہم اسکول اور کالج میں جامعہ کی فارغات ضرور موجود ہوتی ہیں اور تدریسی خدمات انجام دیتی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں جب مولانا نے جامعہ قائم کیا اس وقت شہر میں لڑکیوں کا کوئی ایک بھی دینی ادارہ نہیں تھا۔ مولانا کا قائم کردہ جامعہ ہی شہر حیدرآباد کا اولین ادارہ تھا۔ حالانکہ مولانا اس سے پہلے تک لڑکوں کے مدرسے میں پڑھاتے آئے تھے مگر مولانا کو احساس تھا کہ لڑکیوں کے لیے کوئی مدرسہ ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کے اس تعلیمی ادارے کے قیام کے پیچھے مولانا کا نظریہ یہی تھا کہ لڑکیوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانا چاہیے کیونکہ ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم کا ذریعہ بنے گی۔ مولانا کا جو مقصد تھا کہ انقلاب بذریعہ تعلیم، الحمدللہ! مولانا اس میں کامیاب رہے کہ آج نہ صرف ملک کے مختلف گاؤں اور قصبوں میں بلکہ حیدرآباد کے مسلم معاشروں میں بھی آپ کی طالبات نے انقلاب برپا کردیا ہے۔ جامعہ کی تعلیم یافتہ مولانا کی اکثر طالبات مولانا کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف ہوگئیں۔ کئی خاندان جو شرک و بدعت کی گمراہیوں میں ڈوبے ہوئے تھے مولانا کی طالبات کی کوششوں سے توحید کے مرکز میں تبدیل ہوگئے۔ کئی خاندان جو مختلف اوہام پرستیوں کا شکار تھے اس سے اپنا پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ کئی خاندان جو غیر اسلامی رسوم وخرافات میں مبتلا تھے اس سے باز آگئے۔ معاشرہ سے لین دین اور جہیز کی لعنت کو کم کرنے میں بھی مولانا کی طالبات کا بڑا حصہ ہے۔ کئی طالبات نے اپنے گھروں میں جہیز کی لعنت کو ختم کیا۔ کئی طالبات نے اپنی شادیوں سے انکار کیا کہ ہم جہیز لینے والوں سے شادی نہیں کریں گی۔ ان چیزوں کی بازگشت معاشرہ میں ہوتی رہی اور لوگ برملا کہنے لگے کہ مولانا کی طالبات بڑی شدت پسند واقع ہوئی ہیں۔ مولانا اس طرح کے واقعات سنتے اور خوش ہوتے تھے کہ بہرحال معاشرے کا نظام بدلنے والا ہے اور الحمدللہ! جن باتوں کو لوگ شکایتاً مولانا کے سامنے پیش کرتے تھے، بعد میں جب اس طرح کے واقعات تسلسل سے پیش آنے لگے تو لوگوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اور پھر لوگ ان چیزوں کی تحسین وتعریف کرنے لگے۔ خود ہمارے جامعہ کی کمیٹی کے ایک صاحب کے بیٹے کا رشتہ ہماری جامعہ کی طالبہ سے طے پایا ان لوگوں نے جب منگنی میں ویڈیوگرافی کی تو اس طالبہ نے رشتہ سے انکار کردیا اور کہا کہ ہمارے جامعہ سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اگر ایسا غیر شرعی کام کریں گے تو میں اس کو قبول نہیں کروں گی۔ اس واقعہ کی بڑی گونج تھی ہمارے جامعہ میں۔ کمیٹی کے لوگوں نے مولانا کو شدت پسندی کے طعنے بھی دیئے لیکن ہم نے دیکھا کہ مولانا بڑے مطمئن تھے۔ یقیناً طالبات میں کسی بھی غلط بات کو برداشت نہ کرنے کی سوچ اور عمل مولانا کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ

پورے شہر حیدرآباد پر مولانا کی کوششوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ہر گھر میں مولانا کے مدرسہ کا چرچا ہوا ہے۔ مولانا کی کاوشوں کا یہ دنیاوی صلہ ہے۔ ان شاءاللہ آخرت میں ''اضعافا مضاعفہ'' کی صورت میں مولانا کے لیے اجرِعظیم ہوگا۔

مولانا طالبات کی تعلیم کے لیے بڑے ہی پُرجوش اور پُرعزم رہا کرتے۔ تلاش میں رہتے کہ کس طرح طالبات کو مدرسہ میں داخلہ دلوائیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک جگہ ایک ٹھیلہ راں ٹوپی لگائے ٹھیلے پر کچھ رکھ کر بیچ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی ننھی معصوم سی بچی بھی تھی۔ مولانا نے ان سے کہا کہ آپ اپنے ساتھ اس بچی کو کیوں لیے گھوم رہے ہیں؟ اسے مدرسہ میں داخل کروا دیجیے۔ وہ بھی شریف آدمی تھے مولانا کے کہنے پر چھوٹے چھوٹے بالوں والی ننھی سی بچی کو مدرسہ میں داخل کروا دیا۔ مولانا اس بچی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ اس بچی کی دیکھ بھال کرتیں۔ وہ بچی مدرسہ میں پڑھ کر عالمہ وفاضلہ بنی اور کچھ دنوں تک مدرسہ میں تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ اس طرح پتہ نہیں کتنے واقعات ہیں کہ مولانا بچیوں کو لائے اور ان کی تمام ذمہ داری اٹھائی اور کسی کو اس کا علم ہی نہ ہوا۔

مولانا نے جامعہ کی تعمیر وترقی اور معیار کے لیے بہت محنت کی۔ ہم طالبات کی تعلیم کے لیے دور دراز کے سفر کرتے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے قابل اساتذہ جامعہ میں لاتے۔ مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو مدعو کرتے اور ان کے لیکچرس رکھواتے۔ مولانا کے ایک دوست تھے مولانا حمایت المقیت صاحب جنھوں نے تمام ارضِ قرآنیہ کا سفر کیا تھا۔ مولانا اکثر ان کو بلاتے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً جماعتوں میں گھوم پھر کر اپنے اسفار کی روداد طالبات کو سناتے۔ اپنے مشاہدات سے آگاہ کرتے، اپنے تجربات بتاتے، اس طرح طالبات کے ذہن کشادہ ہوتے تھے اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔

جب ہم جامعہ کے اعلیٰ درجات میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ہمیں جو استاذ بخاری پڑھاتے ہیں، وہ اہلِ حدیث ہیں اور جو استاذ ''ہدایہ'' پڑھاتے ہیں وہ ''تبلیغی جماعت'' کے حنفی فکر رکھنے والے۔ اور جو تفسیر پڑھاتے ہیں وہ ''جماعت اسلامی'' کے، اس کے باوجود ہم دیکھتے کہ اساتذہ باہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور کوئی ہمیں اپنا مسلک نہیں پڑھا رہا ہوتا ہے۔ بلکہ سب لوگ درس بالکل یکسوئی، خلوص سے اور غیر جانبدار ہو کر پڑھاتے ہیں۔ یہ مولانا کے جامعہ کا وہ امتیازی وصف ہے جس کی وجہ سے ہمارے یہاں ہر مسلک، ہر مکتبۂ فکر کی طالبات تعلیم حاصل کرتیں۔ حتیٰ کہ مہدوی مسلک کی لڑکیوں نے بھی ہمارے جامعہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کا ماحول تبدیل کیا۔ لطف تو یہ ہے کہ شہر حیدرآباد کی تمام بڑی جماعتوں کے ذمہ داران کی دختران نے مولانا کے مدرسہ سے فیض حاصل کیا۔ چاہے تبلیغی جماعت کے رضوان القاسمی صاحب ہوں یا جماعت اسلامی

کے احمد محی الدین صاحب یا عبدالعزیز صاحب یا اہل حدیث کے مولانا صفی احمد مدنی صاحب ہوں، مسلکوں اور تنظیموں کا اتنا حسین امتزاج حیدرآباد میں مولانا کے جامعہ کا ہی وصف تھا۔ مولانا نے شہر حیدرآباد میں وہ علمی تحریک چلائی کہ شہر میں لڑکیوں کے مدارس کا جال بچھ گیا۔ وجہ کچھ بھی ہو......مگر اکثر مدارس کا وجود مولانا کا رہینِ منّت ہے۔ ہر مدرسہ کے پیچھے مولانا کی ہی فکر کارفرما ہے اور اکثر مدارس مولانا کا ہی نصاب پڑھانے کی فکر میں ہلکان نظر آتے ہیں۔ شہر حیدرآباد پر مولانا کی علمی کوششوں کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں جسے تادیر ہی نہیں تادور محسوس کیا جاتا رہے گا۔ ان شاء اللہ!

مولانا نے ہم طالبات کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اپنا دن رات ایک کر دیا تھا۔ ہمہ وقت آپ کو یہی فکر رہتی کہ کس طرح طالبات کے اندر علمی صلاحیت پروان چڑھے، کس طرح عربی زبان و ادب پر عبور حاصل ہو۔ مولانا کا اندازِ تدریس انتہائی سادہ اور سلیس تھا۔ مولانا لفظ کو پکڑ کر چلنے پر بہت زیادہ زور دیتے۔ اگر کوئی طالبہ ترجمہ کے بجائے عبارت کا مفہوم بیان کرتی تو مولانا کہتے کہ پہلے ترجمہ تو کرو جی......اس کے بعد مفہوم خود بخود متعین ہو جائے گا۔ مختلف فیہ مسائل میں مولانا طالبات سے ان کی رائے ضرور پوچھتے۔ جب کوئی طالبہ رائے پیش کرتی تو مولانا اس سے دلیل دریافت کرتے اس طرح درجہ میں اختلافِ رائے، رائے کو پیش کرنا، کسی کی رائے کو رد و قبول کرنے کا ماحول بنتا۔ اس طرح دو طرفہ تدریس ہوتی۔ مولانا کسی مسئلہ میں اپنی رائے سب سے آخر میں رکھتے۔ پہلے کہتے کہ دیکھو جی! مولانا امین صاحبؒ کی رائے کیا ہے؟ دیکھو صاحب معارف کی رائے کیا ہے؟؟ امام رازیؒ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟؟؟ پھر مولانا کہتے مجھے تو یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ابھی اس میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مجھے صیام کے باب میں مولانا کی بحث ”وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ“ میں یاد ہے کہ مولانا نے کس طرح آیت پر غور و فکر، تفکر و تدبر کے دروازے ہم پر وا کیے۔ ہمارے کسی ایک رائے پر متفق ہوتے ہی مولانا کا اعتراض وارد ہو جاتا۔ پھر ہم مختلف تفاسیر سے اس کا جواب تلاش کرتے تو مولانا دوسرا اعتراض کرتے۔ اس طرح دو تین دن یہی آیت زیرِ بحث رہی اور آخر میں مولانا نے یہی کہا کہ اس آیت پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ آنکھ بند کر کے ہر مسئلہ پر ”آمنّا صدقنا“ کہنا مولانا کو بالکل پسند نہیں تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ تعلیم صرف ایک کھینچی ہوئی لکیر پر نہ ہو بلکہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ مسئلہ کو سمجھا جائے۔ صرف تعلیم ہی کے سلسلے میں نہیں بلکہ مولانا اکثر اخبار میں کوئی خبر پڑھ کر ہم سے پوچھتے بتاؤ جی! آپ لوگوں کی کیا رائے ہے اس مسئلہ میں۔ اس طرح ہماری فکر کی آبیاری کرتے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، کسی بھی سیاسی مسئلہ میں اپنی علیحدہ رائے رکھنا، سب مولانا کا مرہونِ منت ہے۔ مولانا عبارت خوانی اور عبارت

فہمی پر بہت زیادہ زور دیتے جب تک عبارت طالبات حل نہ کرلیتیں سبق آگے ہی نہ بڑھتا۔

مولانا فضیلت سالِ آخر میں ''دلائل الاعجاز''، ''تفسیر بیضاوی'' اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' پڑھاتے تھے۔ تینوں کی تدریس کا انداز بالکل جداگانہ تھا۔ دلائل الاعجاز مولانا بڑے ہی پُرلطف انداز میں شیرینی سے پڑھاتے اور تفسیر بیضاوی جب مولانا پڑھاتے تو ہماری جان پر بنی رہتی کہ مولانا ابھی پوچھیں گے اگر یہ مبتدا ہے تو اس کی خبر کیا ہے؟ فعل کا فاعل کہاں چلا گیا۔ جب ہم بیضاوی پڑھ رہے تھے تو ایسا لگ رہا تھا یہ تو علم کی ایک الگ ہی دنیا ہے۔ بیضاوی پڑھنے سے ہمیں یہ ادراک ہوا کہ ہمارا علم تو کچھ نہیں بلکہ علم کے جہاں کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ پورے سال میں ہم نے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کا ایک رکوع پڑھا۔

مولانا نے حجۃ اللہ البالغـــۃ پڑھا کر تو ہمیں اسرارِ شریعت کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہر وقت ہمارا موضوعِ بحث حجت کے مضامین ہی رہتے۔ ہم قوت ملکوتیہ اور قوت بہیمیہ کو اپنے اندر تلاش کرنے لگتے۔ عالم مثال، عالم برزخ، عذابِ قبر، ملاءِ اعلیٰ، حظیرۃ القدس کیا کیا بحثیں تھیں!......اور مولانا کا منفرد اندازِ بیان، حجت پڑھاتے وقت ہمیں ایسا لگتا کہ مولانا ایک الگ جہان میں پہنچے ہوئے ہیں اور ہمیں اپنے ساتھ اس جہاں کی سیر کرا رہے ہیں۔ حجت میں ہمارے بے تکے سوالات ہوتے......کبھی ہم مولانا سے پوچھتے مولانا! ہم بھی کوئی اچھا کام کریں تو اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر ملاءِ اعلیٰ سے کریں گے؟ کیسے دنیا والوں کے دلوں میں فرشتے الہام کرتے ہیں؟ ہمارے ان سوالوں کے جوابات مولانا بڑے ہی تحمل سے دیتے۔

آج میں یہ سطریں تحریر کر رہی ہوں تو ایسا لگ رہا ہے میں آج بھی وہی طالب علم ہوں۔ آج بھی مولانا میرے ان سوالوں پر مسکرا رہے ہیں۔ مولانا! آپ کا احسانِ عظیم کبھی بھلایا نہ جاسکے گا کہ کیسے آپ نے ''مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں'' کر دیا۔ آپ کی یاد سے دل درد آشنا معمور ہے جب بھی دعا کو ہاتھ اٹھتے ہیں والدہ مرحومہ کے ساتھ آپ کے لیے خصوصی دعا کرتی ہوں کہ آپ کے ذریعہ سے اس ذاتِ باری تعالیٰ کا عرفان ہوا جس کے لطف و کرم کی حد نہیں اور اس کے اس لطف خصوصی پر شکر واجب ہو جاتا ہے جو اس نے آپ جیسا استاذِ عظیم عطا کر کے کیا۔ ربِ کائنات کا یہ خاص کرم اور خاص عطا ہے کہ اس نے ہمیں آپ کے در سے وابستہ کیا اور ایسا وابستہ کیا کہ ہر طرح کا سرد و گرم زمانہ، ہر طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں آپ کے ساتھ برداشت کیں۔ آپ کے عزم و حوصلہ نے ہر مصیبت سے نکلنے کا راستہ دکھلایا۔ آپ کی استقامت نے آندھیوں میں بھی چراغ جلائے رکھنے کی ہمت عطا کی۔ اب تو اللہ سے یہی دعا ہے کہ آپ کی کچھ صفات میرے اندر بھی پیدا فرما دے تا کہ وہ بڑی ذمہ داری جو آپ مجھ پر ڈال گئے ہیں اس کو حسن و خوبی سے نبھا کر سرخرو ہو جاؤں اور آپ سے کہہ سکوں کہ مولانا آپ نے جو ذمہ داری مجھے دی تھی اسے میں نے خلوصِ دل سے احسن طریقے سے ادا کیا۔ اللہ! مولانا کا صبر، مولانا کا

تحمل، مولانا کی نرم مزاجی، مولانا کا اخلاص ہمارے اندر بھی پیدا فرما دے۔

مولانا جہاں میرے استاذ و مربی تھے۔ وہیں یہ بات میرے لیے باعثِ شرف بھی ہے کہ مجھے مولانا کی کم و بیش پچیس سال تدریسی رفاقت حاصل رہی۔ ابتداءً جب ہم ''تدریب'' میں تھے تو مولانا گاہے بہ گاہے ہمیں تدریس کے اصول، مطالعہ کی اہمیت وغیرہ بتاتے۔ ہمہ وقت یہ نصیحت کرتے کہ طالبات کے ساتھ شفقت اور نرمی کا مظاہرہ کیجیے۔ تدریب کے بعد جب ہم باقاعدہ ٹیچر بن گئے تو ہم نے مولانا کا ایک الگ انداز دیکھا کہ مولانا اپنی ذمہ داریوں کے تئیں کس قدر حساس دل اور بیدار مغز ہیں کہ مولانا کسی بھی درجہ سے طالبات کی کاپیاں منگوا لیتے۔ انہیں چیک کرتے اور پھر متعلقہ ٹیچر کو آفس میں بلواتے یا انٹرکام پر بلواتے اور اس طرح مواخذہ کرتے کہ ٹیچر کی جانب سے اگر مضمون میں ذرہ برابر بھی لاپرواہی برتی گئی ہے تو مولانا کی زیرک نگاہیں فوراً اس کا ادراک کر لیتیں۔ مولانا بالکل عام سے لہجے میں غلطیوں کی نشاندہی کرتے مگر مولانا کا رعب اس قدر تھا ہم معلّمات کے دلوں میں کہ جس کو بلایا جاتا وہ کانپ کانپ جاتا۔ میں اور مولانا کی صاحبزادی مثل الربیٰ جو کہ میری سینئر ہیں۔ ہماری کچھ زیادہ ہی طلبی ہوتی تھی۔ کیونکہ ہم گرامر، صرف، نحو پڑھاتے تھے۔ مولانا طالبات کو دعا کے بعد روک لیتے۔ ان سے گردانیں سنتے، نحو کے سوالات کرتے اور پھر ہمیں بلواتے...... ہم دل میں دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے، ڈرتے ہوئے مولانا کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے۔ مولانا مثل الربیٰ سے تھوڑی سختی سے پوچھتے کہ کیا پڑھا رہی ہو جی تم؟؟ پھر پوچھتے یہ کون ہے؟ مثل الربیٰ کہتی کہ یہ آفرین ہے۔ مولانا کا لہجہ بدل جاتا۔ پھر پوچھتے آپ کیا پڑھا رہی ہیں؟ میں جواب دیتی کہ مولانا میں صرف پڑھا رہی ہوں۔ مولانا کہتے کہ توجہ سے پڑھائیں، صیغوں وغیرہ کی، اوزان کی پہچان میں طالبات کو پختہ کر دیں۔ میں کہتی جی مولانا! پھر کہتے آپ لوگ پڑھانے میں محنت کریں کیونکہ بنیاد مضبوط ہوگی تو آگے کی تعلیم بہتر ہو سکے گی۔ ہم مولانا کے پاس سے ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ واپس آتے اور پھر نئے سرے سے ایک جوش ایک جذبہ سے پڑھاتے۔ ہمیں ایسا لگتا کہ مولانا کا ہمیں اپنے پاس بلانا صرف ایک تنبیہ نہیں بلکہ ہمارے لیے ایک مہمیز ہوا کرتا تھا۔

درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب مولانا نے مدرسہ میں صدر معلّمہ کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا ہر کام باہمی مشورہ سے کرنے کے عادی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں بھی رائے دریافت کرتے اور میرے مشوروں کو اہمیت دیتے اور میں نے دیکھا کہ مولانا اپنے ماتحتین کے تئیں کتنے نرم دل اور نرم خو ہیں، تمام اساتذہ کا خیال رکھنا، ان کے مسائل سے واقفیت رکھنا اور جہاں تک ہو سکے حل کرنے کی کوشش کرنا۔ اسی طرح معلّمات کے بارے میں مجھے وقتاً فوقتاً تاکید کرتے رہتے تھے

کہ مسائل سے واقفیت رکھو۔ مولانا کے اندر میں نے بحیثیت ذمہ دار جو خوبی سب سے زیادہ دیکھی وہ یہ تھی کہ مولانا وقت کے بہت زیادہ پابند تھے اور وقت کی پابندی میں سختی سے کام لیتے تھے۔ اگر کوئی تاخیر سے مدرسہ آتا فوراً گرفت فرماتے۔ مولانا خود سب سے پہلے مدرسہ آتے اور درجوں میں بھی وقت کی پابندی یعنی وقت پر کلاس میں آنا اور وقت ہوتے ہی فوراً نکل جانا یہ مولانا کا خاص امتیاز تھا۔ ہمارے تمام اساتذہ بھی مولانا کے اسی اصول کے پابند تھے الحمدللہ۔

بحیثیت صدر معلمہ میں نے مولانا کی جو دوسری اہم صفت دیکھی وہ طالبات کے ساتھ فیسوں میں رعایت کا معاملہ تھا۔ داخلہ کے دوران طالبات کے سرپرست میرے پاس سے مولانا کے پاس جانے تک تمام ہی فیس معاف کروالیا کرتے تھے۔ کبھی میں کہتی کہ ''مولانا! آپ سب کی فیس معاف کردیتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ کے اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔'' مولانا مسکرا کر کہتے ''اجی! ہم کہاں پورے کرتے ہیں...... اخراجات تو اللہ میاں پورے کرتے ہیں۔'' اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ دو طالبات شعبۂ حفظ میں داخلہ کے لیے آئیں اور میں نے داخلہ فارم پر فیس وغیرہ لکھ دی۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی طالبات مولانا کے پاس دستخط کروانے گئیں۔ وہاں ان کے چچا تھے انھوں نے فارم دیکھ کر مولانا سے پوچھا کہ مولانا! کچھ فیس معاف نہیں ہوسکتی؟ مولانا نے کہا کہ کیوں نہیں ......آپ اپنی پریشانی بتائیں......لڑکیوں کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ ان کے چچا نے جواب دیا کہ ان کے والد صاحب تو امریکہ میں رہتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا، پھر آپ فیس کیوں کم کروار ہے ہیں؟ پھر مسکرا کر کہا آپ نے یہ بنیا گیری سیکھی کہاں سے ہے۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا مولانا! میرے ایک استاذ تھے وہ کہتے تھے کہ کوئی بھی معاملہ کرتے وقت اتنا چکاؤ کہ سامنے والے کے پسینے نکل جائیں۔ تو مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی! یہ کوئی تجارتی لین دین کا معاملہ نہیں ہے یہ تو اللہ کے دین کا معاملہ ہے۔ وہ صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ ارے مولانا میں تو صرف ٹرائی کر رہا تھا۔

الحمدللہ کبھی فیس کی وجہ سے ہمارے مدرسہ سے کسی طالبہ کو واپس نہیں کیا گیا اور مولانا کی یہ رعایت اور اللہ پر یہ توکل ہی تھا کہ ہر طرح کے حالات میں ہم نے الحمدللہ! جامعہ کی ترقی کے اقدامات کیے۔ اسی طرح اساتذہ کی تنخواہوں کی وقت پر ادائیگی اور اضافہ کے لیے مولانا ہمہ وقت فکر مند رہتے۔

مولانا ٹھوس تعلیم کے قائل تھے۔ مولانا ہماری تعلیمی میٹنگوں کے درمیان ہمیشہ یہی کہتے کہ جو پڑھایئے ٹھوس اور پختہ پڑھایئے۔ مولانا پیپر ورک کے قائل نہ تھے۔ مولانا خود تمام درجوں کی طالبات کو چیک کرتے اور کمی نظر آنے پر متعلقہ ٹیچر کو جب بلاتے تو وہ کہتی مولانا میں نے یہ پڑھایا، یہ لکھایا، سارے ہوم ورک، کلاس ورک مولانا کے سامنے رکھ دیے جاتے۔ مولانا سب دیکھ لیتے پھر کہتے کہ پھر بچی کو آیا کیوں نہیں؟ اس طرح ہمارے

مدرسہ میں ہم پیپرورک سے زیادہ یاددلانے، زبانی سننے پر توجہ دیتے۔

مولانا کو میں نے ہمہ وقت چاق وچوبند اور چست پایا۔ مولانا کے یہاں آرام، سستی، تھکن کی اصطلاحات نہیں تھیں۔ مولانا جہدِ مسلسل کے قائل تھے۔ مولانا صرف تعلیمی سرگرمیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے بھی ہمہ وقت ہمیں تحریک دیتے رہتے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ مدرسہ میں اسلامی پینٹنگ نمائش چل رہی تھی۔ مولانا نے مجھے فون کیا کہ اسی نمائش کے درمیان جلسہ تحفظ ختم نبوت رکھنا ہے۔ میں بہت پریشان ہوگئی۔ میں نے مولانا سے کہا مولانا! بہت کام ہوتا ہے۔ فنکشن ہال کی بکنگ، پمفلٹ کی چھپوائی، اخبار میں پریس نوٹ، مہمانِ خصوصی کو بلوانا۔ مولانا نے کہا کہ جلد از جلد سب کام کریں۔ ہم نے ایگزیبیشن کے ساتھ ساتھ بھرپور محنت سے اس جلسہ کو ایگزبیشن کے درمیان ہی منعقد کیا۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا کے شاگرد مولانا جنید احمد بنارسی مرحوم نے کی۔ مولانا نے تقریر کے درمیان پہلی مرتبہ کہا کہ ''جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد'' لڑکیوں کا ہندوستان میں وہ واحد ادارہ ہے جس کا سارا انتظام وانصرام خواتین ہی کے ذریعہ ہورہا ہے۔ اور یہ ساری دوڑ دھوپ، یہ ایگزبیشن، یہ جلسہ یہ سب معلّمات کی ہی محنتوں کا نتیجہ ہے، ہم نے صرف مہمانِ خصوصی کا انتظام کیا ہے۔

مولانا کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی ورنہ مولانا ہمہ وقت مجھ سے انٹرکام پر پوچھتے کہ صدر معلمہ صاحبہ یہ کام ہوگیا کیا۔ طالبات کی تقریریں تک مولانا ایک نظر خود دیکھتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ''جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ملک پیٹ حیدرآباد'' ہندوستان کے ان نایاب مدرسوں میں سے ایک ہے جسے اپنے بانی وناظم کی اتنی بھرپور توجہ حاصل رہی۔

امتحانات کا زمانہ آتے ہی مولانا بالکل الرٹ ہوجاتے۔ معلّمات کی میٹنگ ہوتی۔ نصاب کی تکمیل ہوچکی ہے؟ اعادہ کہاں تک پہنچا؟ پیپر کس طرح بنانا ہے؟ غرض مولانا ہمہ تن مصروف ہوتے۔ سوالیہ پرچہ بھی دیکھتے اور رزلٹ سے ایک دن پہلے میٹنگ میں تمام درجات کے رزلٹ کا جائزہ لیتے۔ رجسٹرس پر سائن کرتے اور معلّمات کو یہ تاکید ہوتی کہ پیپر بہت زیادہ سختی سے نہ چیک کریں۔ جس کے مضمون میں طالبات ناکام ہوتیں ان سے وجہ پوچھتے کہ طالبات کیوں ناکام ہوئیں۔ غرض مولانا کی انتظامی صلاحیت انتہائی اعلیٰ درجے کی تھی کتنا ہی گنجلک معاملہ کیوں نہ ہو مولانا اسے سلجھا لیا کرتے۔ جس مسئلہ کو ہم بہت بڑا مسئلہ سمجھتے مولانا منٹوں میں اسے حل کرلیا کرتے۔

آخری ایام میں جب مولانا مدرسہ ہفتہ میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آتے، تمام معلّمات کے ساتھ میں بھی مولانا سے ملاقات کے لیے جایا کرتی۔ ایک مرتبہ ہم مولانا کے اطراف کھڑے ہوگئے۔ مولانا ہم سے باتیں کرنے لگے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے کہا مولانا! میں آفرین ہوں۔ مولانا کہنے لگے معاف کیجیے گا آپ اتنی دیر سے کھڑی ہیں۔ میں نے پہچانا ہی نہیں کہ صدر

معلمہ ہیں......بیٹھ جائیے...... میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے کہا کہ مولانا! میں بھی تو آپ ہی کی شاگردہ ہوں، کھڑی ہوں تو کیا ہوا؟ مولانا نے کہا کہ نہیں بیٹھ جائیے۔ میں کھڑی ہی رہی۔ مولانا نے تمام معلّمات کو اور مجھے خوب دعائیں دیں۔ اب یہ سطریں تحریر کررہی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ ہمارے لیے دعاؤں کا یہ در بند ہوگیا ہے۔ اب کون اتنے خلوص سے جھولیاں بھر بھر کر دعائیں دے گا؟! مولانا آپ کا وجود ہمارے لیے گھنی چھاؤں تھا۔ آپ ہمارے استاذ ہی نہیں ہمارے رہبر و رہنما بھی تھے آپ کے بعد بہت زیادہ تنہائی اور اجنبیت محسوس ہورہی ہے دنیا میں، کہ ہم تو صرف آپ کی فکر ونظر سے مانوس تھے۔ دنیا میں کوئی دوسرا ایسا دکھائی ہی نہیں دیتا جس سے رہنمائی حاصل کریں۔ مولانا! آپ نے ہماری بہترین رہنمائی کی۔ ہمیں وہ سب کچھ سکھایا جس کی ایک معلمہ کو، ایک منتظمہ کو، ایک مسلمہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ آپ کی ان کاوشوں کا آپ کو بہترین صلہ دے۔ مولا! ہمیں صبر اور استقامت دے کہ آپ کے لگائے ہوئے اس درخت کو ہمارے ذریعہ طاقت وتوانائی ملتی رہے اور ملت کی بیٹیاں جن کے غم میں آپ گھلے جاتے تھے، اس سرچشمۂ ہدایت سے فیض پاتیں رہیں، آمین!

مولانا! آپ کو اللہ نے پانچ بیٹیاں دی تھیں لیکن ہم ہزاروں طالبات کے آپ روحانی باپ تھے۔ آپ کی ان بیٹیوں کے بھی کارِخیر کا ثواب انشاء اللہ آپ کو ملتا رہے گا۔ اب بس رب کریم سے یہی التجا ہے کہ ہمیں آپ جیسا صبر، آپ جیسی استقامت اور آپ کا سا خلوص اور آپ کی سی برداشت عطا فرمائے۔ اللہ! ہمارے مولانا کی تمام کاوشوں اور کوششوں کو قبول کرلے اور مولانا کو اجرِ جزیل عطا فرما کہ ہم جیسے لوگ جو مولانا کی ایک نظر سے سرتاپا بدل گئے مولا! ہمیں بھی وہی نظر عطا فرما اور ہمیں بھی شخصیت سازی کا وہ فن عطا فرما جو تو نے ہمارے مولانا کو عطا کیا تھا۔

سنگ بے قیمت تراشا اور جوہر کردیا
شمع علم و آگہی سے دل منور کردیا
فکر وفن تہذیب وحکمت دی شعور و آگہی
گم شدان راہ کو گویا کہ رہبر کردیا
چشم فیض اور دست وہ پارس صفت جب چھوگئے
مجھ کو مٹی سے اٹھایا اور فلک پر کردیا
دے جزا اللہ تو اس باغبان علم کو
جس نے غنچوں کو کھلایا اور گل تر کردیا

ایک مشفق استاد، ہمدرد سرپرست اور عظیم خیرخواہ

مولانا معین الدین ندوی صاحب
سابق استاذ جامعۃ البنات، حیدرآباد

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی علیہ الرحمۃ ان عہد ساز اور عہد آفرین شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے چمنستان ایمان و اسلام اور دبستانِ علم وفکر کی آبیاری میں اپنا سب کچھ لگا دیا ہے۔ آپ کے رگ و ریشہ میں غلبۂ اسلام اور دینِ محمدی کی بالادستی کے ایسے حسین اور پیہم جذبات موجزن تھے جو وقتاً فوقتاً آپ کی نجی مجلسوں، ملاقاتوں اور درس وتدریس کے حلقوں میں جھلکتے رہتے تھے گویا آپ ایک بے قرار داعی تھے، جسے اپنی دعوت پیش کیے بغیر قرار نہ آتا ہو اور اس شعر کا مصداق تھے:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی؟!

آپ کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں کا محور محض غلبۂ اسلام تھا نہ صرف یہ کہ آپ اپنے ملاقاتی علماء، اہلِ علم وفضل، احباب اور تحریکی نوجوانوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے بلکہ دخترانِ ملت کے ایک بہت بڑے طبقے کو اس کاز کے لیے ایسا تیار کیا کہ جن کی زندگی کا مقصد غلبۂ اسلام بن گیا، طالبات ومعلّمات کی شکل میں ملک وبیرونِ ملک میں ایک ایسی جماعت تیار کردی جو ہمہ وقت مولانا کی عالی فکروں کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن مصروف ہے۔

نمونۂ اسلاف ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا میں خورد نوازی اور محبت وشفقت کا عنصر ایسا نمایاں تھا کہ ہر ملنے

والا آپ کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا حقیقی ہمدرد اور مہربان سمجھتا تھا اور آپ کی رہبری و رہنمائی پر بھروسہ رکھتا تھا۔ آپ کا اندازِ گفتگو اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی بڑا پُروقار اور عظمت والا ہوتا تھا۔ آپ بڑی مہذب گفتگو فرماتے تھے اور بڑے کم سخن تھے۔ ”قوله فصل لا فضول“ کی عملی تصویر تھے آپ اس قدر خلیق تھے کہ کبھی بھی مولانا سے ہم ہی رخصت ہونے کی اجازت لیتے مولانا ہمارے بیٹھے رہنے سے کبھی نہیں اکتاتے، کچھ نہ کچھ مفید موضوعات پر گفتگو جاری رہتی۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا

یہی آپ کی پہچان تھی۔

مولانا ایسے پاک طینت و پاک دل تھے کہ موقف کے سخت اختلاف کے باوجود، اپنوں اور خوردوں سے سخت اذیتوں کے باوجود کبھی بھی حرف غلط کی طرح اپنے کسی حریف کی نہ برائی بولتے اور نہ ہی سننے کی تاب لاتے، بلکہ آپ کا یہ تکیہ کلام تھا ”چھوڑیئے نا جانے دیجیے۔“ یہ کہہ کر مقصدی گفتگو میں مشغول ہوجاتے گویا آپ یہ پیغام دیتے:

سنگ ریزوں کی چبھن کا مجھے احساس کہاں
میں تو منزل کے مناروں پر نظر رکھتا ہوں

قرآن مجید نے جن پاکیزہ الفاظ سے نبیوں کا تعارف کرایا ہے ان میں دو لفظ قدر مشترک ہیں ”ناصح امین“۔ مولانا میں نصیحت و امانت کی یہ دونوں صفات ایک وارث نبی ہونے کی حیثیت سے بہت حد تک نمایاں تھیں۔ آپ حد درجہ امت کے خیر خواہ اور حد درجہ امت کے امین تھے۔ یہ احساس امانت اور نصیحت آپ کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ اسی لیے عالم اسلام میں کہیں بھی اور کسی خطہ میں بھی اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف کوئی بھی آواز اٹھتی تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس فرماتے اور اس درد کا اظہار فرماتے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مولانا کی زندگی، اللہ کی بندگی، دین سے وفاداری، قرآن کریم سے وابستگی، سنت سے شیفتگی، اسلام کو سربلند دیکھنے کی تڑپ، اور امتِ مسلمہ کی آبرو باقی رہنے کی آرزو سے عبارت تھی، اسی مقصد کے لیے آپ زندگی بھر روتے اور تڑپتے رہے، راتوں کو اٹھ کر سجدے کرتے رہے اور ناک رگڑتے رہے۔ آپ کی زندگی کے دن اپنی شخصیت کی تعمیر میں نہیں، اپنے لیے ناموری اور اپنے خاندان کی سرفرازی کی جستجو میں نہیں بلکہ صرف اسلام کی

سربلندی کے لیے جہدِ مسلسل میں گزرے ہیں۔ اسی لیے آپ نے بنگلہ وسواری پر کبھی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ نبوت کے گھرانے کی سادگی ومجاہدہ کو اپنی زندگی کی پہچان بنائی، آپ کا رہن سہن، لباس، غذا سب کے سب سیدھے سادے تھے۔ کہیں بھی تکلف کا گزر نہیں تھا، کبھی بھی بات کرتے تو صرف کام کی بات کرتے، مقصد کی بات کرتے۔ لفظی صناعیوں سے بھی آپ بالکل پاک تھے۔ مدعا صاف سمجھ میں آجاتا تھا، آپ کی سادگی میں پرکاری اور بلا کی تاثیر تھی، جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے:

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

دین کی خدمت میں مصروف علماء کرام، طلبائے عزیز اور افراد کار کی خبرگیری، ان کے حالات سے باخبری اور ان کی مدد ونصرت کے لیے مولانا ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے اور جو بن پڑتا تھا وہ ضرور کرتے، علم دین میں لگے رہنے کی خوب تلقین فرماتے، اور ہر حال میں خدمتِ دین کو اپنا مقصد بنا کر چلنے کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ باصلاحیت علماء اور عزیزوں کی بہت قدر فرماتے اور ان کی صلاحیتوں کو ٹھکانے لگانے اور استعدادوں کو کھپانے کے لیے بہت فکرمند رہتے تھے۔ یا تو ان کو اپنے پاس رکھ لیتے یا اپنے تعلق دار اربابِ مدارس کو متوجہ کر کے ان کو کام پر لگاتے، اس طرح مولانا علیہ الرحمۃ کے آس پاس بھی باصلاحیت علماء کی ایک بہت بڑی جماعت علم پروری اور علم دین کی ترویج واشاعت میں ہمیشہ لگی رہی، اور آپ سے ملنے والے علماء بھی بہت باصلاحیت اور دعوت وعزیمت کی راہ پر گامزن رہے۔

اس طرح مولانا کے اردگرد علم وآگہی کے متوالوں کا ایک بڑا گروہ تھا...... جو مولانا کی صحبت کو غنیمت جان کر مختلف علمی وفکری موضوعات پر گفت وشنید کرتے اور مناسب رہنمائی پا کر راہِ عمل میں قدم رکھنے کے بلند حوصلے پاتے۔

مولانا کی ہم طالبانِ علم نبوت اور طالبات شریعت کے متعلق ایک بڑی خواہش یہ تھی کہ قرآنِ مجید اور احادیث نبویہ کو براہِ راست سمجھ سکیں۔ قرآن کے براہِ راست مخاطب بنیں، قرآن وحدیث کے نصوص سنتے ہی ان کا معنی، مراد اور مفہوم ومقصود ذہن میں آجائے یعنی کتاب وسنت کے محض الفاظ ہی سے مدعا سمجھ میں آجائے۔ ترجمہ وتفسیر کے محتاج نہ رہیں، البتہ آپ تمام علماء کی تفسیری وتشریحی کاوشوں کی قدر فرماتے تھے اور ان پر گہری وتنقیدی نگاہ رکھتے تھے بلکہ زندگی بھر مولانا کی کتب بینی کا یہ حال رہا کہ آپ نے ہر موافق ومخالف علماء کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کے اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔

آپ کسی سے رائے کا اختلاف رکھتے تو بھی پورے آداب کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرماتے، کبھی بھی

اپنی رائے پر اصرار نہیں فرماتے۔ البتہ دلائل سے ثابت ضرور کرتے۔ آپ زندگی بھر قرآن مجید کے خوشہ چیں رہے، آپ کے بیشتر دلائل قرآن مجید ہی سے ہوتے تھے سبھی کو اسی کی ترغیب دیتے تھے علوم قرآن کی ابدیت کے بہت بڑے قائل و داعی تھے اور اسی میں ملت کی کامیابی تصور فرماتے تھے۔ امت کے عروج و زوال کو قرآن سے جوڑ کر دیکھتے تھے:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

ترکِ قرآن کی ذلت وخواری سے امت کو بچانا چاہتے تھے اس کے لیے آپ نے درس قرآن کے حلقے قائم کیے اور عام اور بے طلب انسانوں کو قرآنی پیغام سے جوڑا، عصری تعلیم گاہوں اور کاروباری مصروفیتوں سے جڑے ہوئے بے شمار لوگوں کو فہم قرآن کی طرف متوجہ کر کے انھیں خدمت قرآن پر لگایا اور انھیں اپنی تخلیق کے مقصد سے روشناس کرایا اور مدارس کے طلبہ وطالبات میں قرآن فہمی کی سچی لگن پیدا فرمائی۔ آپ علیہ الرحمۃ کی یہ ساری خدمتیں بے لوث مخلصانہ اور نمود وریا سے کوسوں دور تھیں، خاموش مزاجی سے آپ اتنا کام کر لیتے تھے کہ زباں آوری سے بھی اس قدر ممکن نہ تھا، اپنی فکری وروحانی تڑپ سے مخاطب تک اپنا پیغام پہنچا کر رہتے تھے۔ کسی نے سچ کہا:

عشق محروم زباں ہو کے زباں ہوتا ہے
ہونٹ ہلتے نہیں افسانہ بیاں ہوتا ہے

بہر حال مولانا کی زندگی علامہ اقبال کے اس شعر کی مصداق تھی:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

مولانا سے میرا بہت قلبی لگاؤ اور روحانی تعلق تھا، دراصل میرے استاذ حضرت مولانا شہباز اصلاحیؒ کے ساتھی ہونے کی وجہ سے مجھے مولانا میں ایک مشفق استاد، ایک ہمدرد سرپرست اور ایک عظیم خیر خواہ کا وجود نظر آتا تھا۔ اسی لیے میرا جب سے تعلق ہوا مولانا سے ملاقات، آپ کا دیدار، آپ کی صحبت میں بیٹھنا، آپ کی باتوں کا سننا، مختلف موضوعات پر آپ سے مذاکرہ ومشاورت کرنا کبھی مدرسہ اور کبھی گھر پر حاضری اور جب تک جسمانی توانائی قائم رہی اپنی گاڑی پر بٹھا کر مختلف جگہ لے جانا میرے محبوب مشغلے رہے ہیں۔ میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے، معاملات کیے ہیں۔ ہر موقع پر میں نے مولانا کو بالکل کھرا اور سچا پایا اور یہ بھی دیکھا کہ

آپ خود ہر قسم کے نقصان کے لیے تیار رہتے تھے لیکن ساتھ رہنے والوں کا شمہّ برابر نقصان نہیں چاہتے تھے۔

بسا اوقات خود ان کی ذات سے محتاط رہنے کو کہتے کہ کہیں دوسرا ان کی وجہ سے ستایا جائے، یا پکڑ میں آجائے یہ مولانا کے کریمانہ اخلاق کی بلندی ہے۔ ورنہ آدمی مصیبت کے وقت دوستوں کی تلاش میں رہتا ہے اور اپنے غم بانٹنا چاہتا ہے۔

میری حیدرآباد آمد کے دوسال بعد ایک مخلص عالم دین کی ایماء پر آج سے تقریباً بارہ تیرہ سال قبل مولانا سے میری پہلی ملاقات تدریس کی درخواست کے ساتھ جامعۃ البنات کے دفتر میں ہوئی، میں نے عربی میں درخواست لکھی تھی، مولانا نے درخواست پڑھ کر فرمایا ''جس آدمی کی تلاش تھی اللہ نے اسے بھیج دیا۔''

پہلی ہی ملاقات پر مولانا کا یہ جملہ سن کر مجھے اس قدر خوشی ہوئی جسے میں الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھال سکتا۔ اس موقع پر مولانا نے مجھ چھوٹے سے طالب علم کے ساتھ جس زندہ دلی اور اپنائیت کا ثبوت پیش کیا میں تاحیات مولانا کا رہینِ منت رہا۔ میں کہیں بھی رہا ہفتہ پندرہ دن یا مہینہ میں ایک مرتبہ ملاقات کو اپنی سعادتوں میں اضافہ کا ضامن سمجھتا رہا، مولانا بھی میری ملاقات کے لیے بے چین رہتے تھے، جب بھی حاضر ہوا آپ نے کہا بہت دنوں سے یاد کر رہا تھا، آپ آ گئے۔ آپ فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور گھر والوں کو کچھ کھانے کے لیے لانے کو بار بار فرماتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اندر سے چائے وائے نہ آ جائے۔

پھر خوب اطمینان سے باتیں کرتے۔ احباب کی خیریت دریافت کرتے، کسب معاش اور معاشی حالات پوچھتے کچھ اچھے حالات سنتے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیتے، بہت قدر فرماتے بلکہ میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے نازنخرے، زودگفتاری کو خندہ پیشانی سے جھیلتے۔ میں نے کبھی مولانا کے چہرے پر بیزارگی کی شکن نہیں دیکھی، مولانا میری روحانی تشفی کا سبب، فکری بالیدگی کا ذریعہ تھے، اخلاق کی بلندی کا نمونہ، صبر واستقامت کے کوہِ گراں، دعوت وعزیمت کے پیکر، محبت وشفقت کے جذبات سے سرشار، فکر ایمان اور غلبۂ اسلام کے علمبردار تھے۔ مولانا سے میرا بڑا گہرا جذباتی تعلق ہے۔ کہاں تک اسے قیدِ الفاظ میں لاؤں بس اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ مولانا کی حسنات کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں انبیاء، صدیقین، شہداء وصالحین کے جوار میں جگہ عنایت فرمائے اور ہم سب کی جانب سے انھیں جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے لگائے ہوئے چمن کو تا قیامت قائم ودائم فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر خدمت اسلام کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آباد تجھ سے محفل علم وادب تھی یاں

مولانا شوکت علی حسامی
استاذ جامعۃ الشیخ المودودیؒ، پہاڑی شریف، حیدرآباد

اللہ جل جلالہ کے قانونِ قدرت کے مطابق ۲۷ رستمبر بروز منگل یکم ربیع الاول ۱۴۴۲ھ کو صدر جامعہ حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا انتقال ہوگیا اور وہ شمع بجھ گئی جس کی روشنی سے بندگانِ خدا مستفید اور فیض یاب ہوتے تھے وہ پیر مئے خانہ اٹھ گیا جس کے درِ دولت پر رندانِ مدح خوار جمع ہوتے تھے۔ علم وفن کا وہ آفتاب ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا جس کی ضیا پاشیوں سے کاروانِ علم صحیح سمت میں اپنا سفر جاری رکھتا تھا، گلشن ادب کا وہ گل سرسبد سرجھکا گیا جس کی رعنائی وزیبائی قلب ونظر کو تازگی بخشتی تھی اور جس کی بو مشامِ جاں کو معطر کرتی تھی۔ آپؒ کی وفات کے جانکاہ حادثہ نے ہر دل کو مضطرب اور بے چین کر دیا۔ طبیعت کو افسردہ اور بے قرار کر دیا اور اشک ہائے غموں کو بہانے کا موقع عطا کر دیا، لیکن کیا کیجیے موت ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے ہر متنفس اور ذی روح کو اس سے دوچار ہونا ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

اس غمناک اور حسرت ناک موقع پر ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں کہنے کی ہدایت دی ہے: ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئ عندہ باجل مسمی فلتصبر ولتحتسب۔''

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔لیکن حضرت کی زندگی کے روشن اور تابناک نقوش آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے ہم چند روشن نقوش کو اختصار کے ساتھ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں، اس امید پر کہ حضرت کی زندگی کے یہ نقوش ہماری مصروف زندگی کو تابناک اور خوشگوار بنانے میں مدد ومعاون ثابت ہوں گے اور ہماری حیات کے رخ کو صحیح نہج پر استوار کرنے کے ضامن ہوں گے۔

علمی مصروفیات

آپؒ کی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی وصف یہ ہے کہ آپؒ نے خود کو علوم دینیہ کی تدریس اور اس کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا تھا اور طلبہ وطالبات کو قرآن وسنت کے جام وساغر سے سیراب کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی جھونک دی تھی، علم کے دیئے کو جلانے اور اس کی روشنی زمانہ بھر میں بکھیرنے کے لیے مستقل اپنا تن من دھن لگا دیا تھا، چنانچہ آپ حضرت والا کی تدریس کا دورانیہ سات دہائیوں سے بھی زیادہ ہے۔قرآن کریم واحادیثِ نبویہ کی تفسیر وتشریح اور اس کے علوم ومعانی بیان کرنے میں اپنی عمر عزیز کا ایک خاص حصہ وقف کر دیا تھا، نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عطر بیز دہن سے جھڑی ہوئی موتیوں کو امت تک پہنچایا اور **قال اللہ وقال الرسول** کی صدائے دلنواز کو بلند کرنے میں جو محنت اور جانفشانی آپ نے کی وہ آپ ہی کا خاصہ ہے۔

آپ نے اس مقصد کے لیے تعلیم وتدریس کے شعبہ کو منتخب فرمایا، آپؒ نے اپنی عمر کا آدھا حصہ اگر ملت کے بیٹوں کی تعلیم وتربیت میں وقف کیا تو آدھا حصہ ملت کی بیٹیوں کے لیے وقف کر دیا کیونکہ آپ کا احساس تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم وتربیت سماج اور معاشرے کی اصلاح کی ضامن ہے۔لڑکی اگر دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوگی اور اس کے اخلاق وکردار بہتر اور عمدہ ہوں گے تو وہ اپنے نونہالوں کو بھی دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے گی، ان کی دینی تربیت کرے گی اور ان کے ذہن ودماغ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور سعی کرے گی۔

لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی اسی اہمیت وضرورت کا احساس کرتے ہوئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۸۸ء میں جامعۃ البنات کا قیام عمل میں لایا اور پھر ۲۰۱۲ء میں جامعۃ البنات سے علیحدگی کے بعد آپ نے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے قیام کے ذریعے اپنے اس مقصد کو جاری رکھا اور اپنی آخری سانس تک مسلسل مصروفِ عمل رہے۔بہترین جید الاستعداد معلّمین ومعلّمات اداروں کے لیے منتخب کیے۔ان کے اخلاق وکردار کو سنوارنے اور دوسروں کے لیے مثال اور قابلِ تقلید بنانے پر خاص توجہ فرمائی۔آپؒ کی اسی محنت وجدوجہد کا نتیجہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں آپ کے زیرِ سرپرستی سینکڑوں طالبات دینی تعلیم وتربیت کے جوہر سے آراستہ ہو کر علومِ قرآنیہ وعلوم نبویہؐ کے چشمہ صافی سے فیضیاب ہو کر نہ صرف اپنے اپنے علاقوں میں بلکہ دنیا کے طول وعرض

میں حتی المقدور بندگانِ خدا کو علم کی روشنی سے منور کر رہی ہیں اور معاشرہ سے جہالت کی تہ بہ تہ تاریکیوں کو زائل کر رہی ہیں۔ دونوں اداروں کے ذمہ دارِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے آپ کا رویہ اساتذہ اور ملازمین کے ساتھ بہت بہترین اور عمدہ تھا۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہوتی ہے اس کے دماغ میں اختیارات کا نشہ ایسا سماتا ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں لانے کا بھی روادار نہیں ہوتا، ماتحتوں اور ملازمین کے ساتھ اُس کا رویہ حاکمانہ ہوتا ہے اور اساتذہ و معلّمین کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ تیر و نشتر بن جاتا ہے، لیکن بحمدللہ حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ان اخلاقی گراوٹوں سے کوسوں دور تھے۔ اساتذہ اور ملازمین کے ساتھ محبت اور خیرخواہی سے پیش آتے تھے۔ اساتذہ کرام کی کمیوں کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں پیش پیش رہتے تھے اور اُف تک بھی نہ کہتے تھے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا۔

اس کے علاوہ مولانا مرحوم نے اپنے فرزند ارجمند مجاہد سلیم اعظمی کی شہادت کے بعد مجاہد شہید کے ثواب جاریہ اور ان کی غلبۂ دین کے تئیں فکر اور جذبہ کو برقرار رکھنے اور ملت کے اندر انھیں پروان چڑھانے کی غرض سے ۲۰۰۴ء میں جامعۃ الشیخ المودودیؒ کے نام سے ایک ادارہ کا قیام (محمدیہ کالونی پہاڑی شریف) عمل میں لایا۔ الحمدللہ! مولانا کی سرپرستی میں یہ مدرسہ ۱۸ سالوں سے کامیابی کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اس مدرسہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ نے شرک و بدعت کی دلدل اور جہالت کی گمراہیوں میں پھنسی اس سلم آبادی میں مدرسہ کے قیام کا فیصلہ کیا جہاں پر حضرت بابا شرف الدینؒ درگاہ کے اثرات نمایاں اور غالب تھے اور پورا معاشرہ دینی شعور سے نابلد تھا۔ الحمدللہ! اللہ کے فضل و کرم اور معلّمین و منتظمین کی شبانہ روز کوششوں کی وجہ سے کافی حد تک اس علاقہ کے لوگوں میں دینی شعور پیدا ہو رہا ہے اور شرک، بدعات و خرافات میں بھی نمایاں کمی دیکھنے میں آ رہی ہے اور مدرسہ کی موجودگی کے واضح اثرات دیکھے جا رہے ہیں جو مولانا کے اخلاص اور دوررس نظر کا مرہونِ منت ہیں۔

مدرسہ میں کم سن طلبا و طالبات کے لیے ابتدائی دینی و عصری تعلیم کے ساتھ تحفیظ القرآن الکریم کا نظم ہے گو کہ برائے نام فیس مقرر ہے مگر دیکھا جائے تو مجموعی طور پر مفت تعلیم ہی کا نظم ہے اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مدرسہ کے تمام اخراجات کی تکمیل کی ذمہ داری مولانا کے اہلِ خانہ نے اٹھائی ہوئی ہے۔

الحمدللہ! اب تک درجنوں طلباء و طالبات ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ حفظِ قرآن مجید کی سعادت حاصل کر کے

دستار بندی وسند سے سرفراز ہوکر اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے شہر کے مختلف جامعات سے رجوع ہورہے ہیں اور بیشتر عالمیت وفضیلت کے کورس کو مکمل کر کے تعلیم وتدریس اور دینی خدمت میں سرگرم عمل ہو چکے ہیں۔خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ اس علاقے کی اکثر مساجد میں مدرسہ کے حفاظ کرام ہی امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اس ادارہ کے ذریعہ مولانا کے مقاصد جلیلہ کی حصولیابی کی جدو جہد ہوتی رہے اور خود مولانا اور مجاہد سلیم شہید کے لیے یہ ادارہ ثواب جاریہ کا باعث بنارہے۔آمین!

حضرت مولاناؒ بے باکی اور حق گوئی کا روشن استعارہ تھے جو بات حق سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کر دیا کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے تھے جو موقف درست اور حق بجانب نظر آتا تھا اس پر پوری مضبوطی اور دلیری کے ساتھ جم جاتے تھے اور لوگوں کی بیان بازیوں اور بے بنیاد پروپگنڈوں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔آپ توکل علی اللہ اور استغناء وبے نیازی کی جیتی جاگتی مثال تھے۔اللہ کی ذات پر کامل یقین اور اس کی ذات پر مکمل بھروسہ آپؒ کا طرۂ امتیاز تھا۔ بندگانِ خدا سے بے نیاز اور ہر ضرورت کی تکمیل کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔مولانا ہنس مکھ، خوش اخلاق، خوش اطوار اور مجلسی آدمی تھے ہر ایک کے ساتھ گھل مل جاتے تھے، اجنبی ہو کہ بیگانہ، اپنا ہو کہ پرایا ہر ایک کو اپنی مرنجاں مرنج طبیعت سے خوش کر دیتے تھے اور ان کے دلوں میں جگہ بنا لیتے تھے جس کی وجہ سے مولانا سے پہلی بار ملاقات کرنے والا شخص بھی یوں محسوس کرتا کہ وہ عرصہ دراز سے حضرت مولانا کا شناسائی ہے اور ان سے کئی بار ملاقاتیں کر چکا ہے۔

حضرت مولانا بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے علمی وعملی صلاحیتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود بڑے چھوٹے ہر ایک کے ساتھ تواضع وفروتنی سے پیش آتے اور اپنی علمی قابلیت کی کسی پر دھونس جمانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔آپؒ کی اسی تواضع وخاکساری نے معاصرین میں ممتاز مقام کا حامل بنایا اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔اس کے علاوہ حضرت والا فطری طور پر خاموش مزاج اور کم گو تھے، ہمیشہ سامع بن کر رہتے مگر جب قرآن وحدیث کا درس دیتے تو علم کے موتی اور چشمے بکھیرتے تھے۔فضول باتیں بنانا اور بے کار بحثوں میں پڑنا آپؒ کو بالکل پسند نہیں تھا، اگر کوئی اس طرح کی لاطائل اور لایعنی گفتگو چھیڑتا تو آپ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تھے یا کلام کا رخ کسی مفید اور تعمیری امور کی طرف پھیر دیتے تھے۔

"مَوتُ العَالِمِ مَوتُ العَالَمِ" عالم کی موت عالَم کی موت ہے۔

ہمارے مولانا کی مثال اس حدیث کا آئینہ ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ علم کو اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ لوگوں کے سینے سے نکال لے بلکہ پختہ کار علماء کو موت دے کر علم اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں

گے اوران سے دینی مسائل پوچھیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔(بخاری)

آپؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں امتیاز قوتِ برداشت تھا۔آپؒ بڑے صابر اور متحمل مزاج تھے، خلافِ طبیعت باتوں کو برداشت کر لیتے تھے اور دورانِ گفتگو آلِ غزل کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے چھوٹوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بھی نظرانداز کر دیتے تھے۔اگر تنبیہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو بڑی محبت اور پیار سے تنہائی میں بلا کر خوشگوار اور پُرلطف لہجہ میں تنبیہ فرماتے اور آئندہ سے شکایت کا موقع نہ دینے کی تاکید کرتے تھے۔حضرت والا کی ایک خاص اور سب سے نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ اپنے اساتذہ اور ملازمین کو وقت پر مشاہرہ دیتے اور دیر کرنے پر محبت سے دریافت کرتے کہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو کیوں نہیں آئے،اس حقیر وفقیر کو حضرت والا کی ۱۳؍سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سرپرستی حاصل رہی۔آپ ایک مربی اور مشفق باپ کی طرح پیش آتے اور اس طویل عرصے میں کبھی بھی ایک لفظ تو کیا اُف تک بھی نہ فرمایا کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور کیوں نہ کیا۔ایک آخری چیز جسے میں خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گا کہ اس ناچیز نے محسوس کیا کہ آپ مستجاب الدعوۃ تھے جب کبھی کسی غرض کے لیے کہا جاتا تو فرماتے''جایئے ان شاءاللہ ہوجائے گا''اور وہ من وعن ہوجاتا اور دل خوشی سے باغ باغ ہوجاتا۔حضرت ناظم صاحبؒ سے آخری ملاقات میں آپ کی جو آخری نصیحت تھی وہ یہ کہ جو بھی کام کرو اخلاصِ نیت کے ساتھ اور توکل علی اللہ کرتے ہوئے کرو اور اس میں کسی غیر کو شامل نہ کرو۔

اخیر میں یہ حقیر وفقیر اور مدرسہ جامعۃ الشیخ المودودیؒ کے سبھی سابق اور موجودہ اساتذۂ کرام غمزدہ اور افسردہ دلوں کے ساتھ اللہ باقی سے فریاد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی مغفرت فرمائے،اُن کی قبر کو تاحدِ نظر وسیع فرمائے،ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے،ان کے حسنات کو قبول فرمائے،ان کی سیئات سے درگزر فرمائے اور ان کے تمام پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور حضرت والا کے مشن کو جاری وساری رکھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

افلاک رو رہے ہیں زمیں بھی اداس ہے
آنسو بہا رہی ہے فضا تیری موت پر
آباد تجھ سے محفل علم و ادب تھی یاں
جانے سے تیرے ہوگئی ویراں و بے اثر

کبھی چشمِ تصور سے دلوں کے حکمراں دیکھو

عائشہ حبیب بنت محمد حبیب
معلّمہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد

مولانا کی حیات وخدمات ایسی ہیں کہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔ اگر یہ احساس نہ ہوتا اور مولانا کی زندگی کے واقعات کو عوام کے سامنے لانا میں اپنا فرض نہ سمجھتی تو کبھی اپنے قلم سے اپنے احساسات ومشاہدات ضبطِ تحریر میں نہ لاتی۔ کیونکہ اس مضمون کی کوئی سطر ایسی نہیں ہے جس کو لکھتے وقت باوجود صبر وضبط کے آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہوئے ہوں۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے قلم سے حق ادا نہ ہو پایا اور تحریر جذبات سے عاری رہ گئی۔ کیونکہ وہ جذبات جو ذہن ودل میں ہیں انھیں صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا ممکن نہ تھا۔ ہم مولانا کی حیات مبارکہ اور اخلاقِ کریمانہ پر قلم اٹھانے کی محض کوشش کرسکتے ہیں۔ ہر مضمون نگار یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی تحریر کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی امید رکھتے ہیں کہ ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش ثمر آور ہوگی......ان شاءاللہ!

دعا ہے کہ مولانا کے افکار وخیالات نئی نسل میں منتقل ہوں اور مولانا کا پیغام ان دلوں تک پہنچ جائے جو اس کی تشنگی رکھتے ہیں، اس کے مشتاق اور اس کے اہل ہیں اس کے ذریعے ایک ایسی صالح جماعت منظر عام پر آئے جو حق وصداقت کی علمبردار، خلافت کی امین، اسوۂ رسولؐ کی پاسدار، اُمتِ محمدیہؐ کی غیرت کی شاہکار، مسجدوں، مدرسوں کی محافظ، طاغوت سے ٹکرانے والی، دنیا کی محبت اور اس کے دھوکوں سے اپنا دامن بچانے والی اور خوشی خوشی رب کی راہ میں قربانیاں پیش کرنے والی ہو۔

سرمایۂ ملّت

بیسویں صدی میں ایسی شخصیات تاریخ عالم کے افق پر نمودار ہوتی نظر آتی ہیں، جو امت کے تن مردہ میں

روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں مثلاً امام حسن البناؒ شہید، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید قطب شہیدؒ جیسی شخصیات جنھوں نے دین اسلام کی صحیح تعبیر پیش کر کے امت کو اس کے فرض منصبی سے آگاہ کیا، ان کے بعد ان کے کام کو آگے بڑھانے میں ہندوستان میں جن ہستیوں کا خونِ جگر شامل رہا ہے، ان میں فرزندانِ مدرسۃ الاصلاح کا نام سرِفہرست ہے، اس فہرست میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا بھی ہے۔ جنھوں نے اپنی تمام توانائیاں اس فکر کی ترویج اور نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں کھپا دیں۔

یقینا مولانا جیسی شخصیات پوری ملت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ جن کی ذات فکری گمراہیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں جگمگاتی ہوئی شمع کے مانند ہوتی ہے۔ جن کی روشنی سے انسانیت راہِ راست کا پتہ پاتی ہے۔ مولاناؒ جیسی شخصیات روشنی کا مینار ہوتی ہیں، جن سے جادۂ حق سے بھٹکے ہوئے قافلوں کی منزلوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

آپؒ جادۂ حق کے اس قافلے کے ہمرکاب رہے جو انبیاءؑ و رسلؑ کے جانشین، صدیقین و صالحین کے ہم نشین، شہداء کے مشن کے امین ہوتے ہیں۔ جو ایمان کی لذت کو چکھ لیتے ہیں۔ جن کی زندگی تقویٰ و پرہیز گاری میں گزر جاتی ہے جن کے لیے دنیاوی خسارہ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ دنیا، دنیا کے باطل نظاموں اور جھوٹے خداؤں کا جنھیں خوف چھو کر نہیں گزرتا۔ وہ جو اپنے دشمن کی چالوں کو مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ ان کے بچکانہ ہتھکنڈوں کو خاطر میں نہیں لاتے، جن کی آنکھوں میں حق کے شرارے کوندتے ہیں، جن کی صبحیں باسعادت اور شامیں رہینِ عبادت ہوتی ہیں، جن کو حکمت کے گوہر ودیعت ہوتے ہیں۔ جن کے سب کام تحت شریعت ہوتے ہیں، جو قدامت پسندی کی معراج ہوتے ہیں، جو طلب گار راہِ ہدایت اور رہ روان سبیل شہادت ہوتے ہیں، جو منزلوں کی طرف سبک خیز ہوتے ہیں، جو ملت کی تاباں قیادت اور اہلِ ایمان کے سینوں کی راحت ہوتے ہیں۔

ہمیں فخر ہے کہ اسی قافلے کے ایک فرد، اسی راہ کے ایک راہی کو اللہ رب العزت نے ہمارے درمیان، ہماری تعلیم و تربیت کے لیے، ہماری اصلاح کے لیے، کتاب اللہ کی تفسیر، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے، حق و باطل کی تمیز کے لیے، عزت کی زندگی کا شعور دینے کے لیے بھیجا تھا۔ ہمارے مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جو دیکھنے میں تو ایک فرد لیکن حقیقت میں ایک کارواں تھے۔

مولاناؒ نے اپنی زندگی کے لیے ہدایت ربانی کو مینارۂ نور بنایا، اسی ہدایت کی روشنی میں آپ نے اللہ کی معرفت کو حاصل کیا، اس کی عظمت و بزرگی کو اپنے دل میں بٹھایا، اس کے تقدس سے اپنے دل و دماغ کو معطر کیا۔ اور ساتھ ہی اللہ کے محبوب نبیؐ کی رسالت پر کامل یقین کی لذت سے سرشار ہو کر آپؐ کی محبت کو اپنے دل میں بسایا۔ آپؐ کی ڈگر پر اپنی زندگی کو چلایا، آپؐ کی فکروں کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، آپؐ کے تمام غموں کو اپنے سینے

سے لگایا، آپ ﷺ کے ارمانوں کو اپنے دل کا ارمان بنایا، آپ ﷺ کی محبت میں آپ ﷺ کی اطاعت میں اپنے آپ کو گھلایا......اس کے نتیجے میں آپ کی زندگی ایمان کے کمال کو پہنچی اور آپ کے اندر آخرت کی فکر پروان چڑھی اور اللہ سے تعلق کا، پیارے نبیؐ کی محبت کا، اعمال کی درستگی کا، دعاؤں کی قبولیت کا، عبادات کی حلاوت کا، تلاوت کی لذت کا وہ خزانہ آپ کو حاصل ہوا جس کے ذریعے ایک مومن دنیا وآخرت میں کامیاب ہوتا ہے......

مولاناؒ کی سیرت کے کئی پہلو ہیں اور آپ کی زندگی کے بے شمار ایسے مواقف ہیں جو اپنے اندر لوگوں کے لیے نصیحت اور موعظت رکھتے ہیں اور انھیں اپنے مقصد اور نصب العین کا شعور دیتے ہوئے متحرک و پُرجوش رکھتے ہیں۔ جن میں سے بعض مواقف کی میں عینی شاہد بھی ہوں، اپنی بے بضاعتی کے باوجود میری کوشش ہوگی کہ میں انھیں آپ کے سامنے مختصراً پیش کرسکوں۔

ورثۃ الانبیاء

☆ آپؒ حضرت نوح علیہ السلام کی طرح سالہا سال اپنی قوم کی اصلاح میں لگے رہے لیکن کبھی مایوس اور بددل نہیں ہوئے۔

☆ آپؒ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت میں اپنے وقت کے تراشیدہ تمام بتوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔ اللہ نے آپؒ کو بھی خلیل اللہ کی طرح ہر ہر موڑ پر، ہر ہر طریقہ سے آزمایا، جب آپؒ ان امتحانات میں کامیاب ہوئے تب اللہ نے آپؒ کے بیٹے کی قربانی کو قبول فرما کر آپؒ کو مقبول بنادیا۔

☆ آپ کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح اپنے دوست احباب سے دھوکے ملے، جنھیں آپؒ اللہ کی رضا کے لیے خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ آپؒ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دار ورسن سے رشتہ جوڑنا تو گوارا کیا لیکن کبھی فانی دنیا کے فریبِ حسن کا شکار نہ ہوئے۔

☆ آپؒ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے طرز پر وقت کے فرعونوں کے سامنے ''اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ'' کا اعلان کرتے ہوئے افضل جہاد کے فریضہ کو انجام دیتے رہے اور اپنی قوم کو غلامی کی دلدل سے نکالنے اور اپنی ملت کے کھوئے ہوئے عزت ووقار کو بحال کرنے کی فکر میں اپنے آپ کو دن رات گھلاتے رہے۔

☆ آپؒ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح دردمندوں کے درد کا درماں تھے۔

☆ آپؒ نے انبیاء علیہم السلام اور بطورِ خاص پیارے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اللہ کی آیات کی تلاوت، کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ کی روایت کو زندگی بھر زندہ رکھا اور صحیح معنیٰ میں ''العلماء ورثۃ

الانبیاء'' کا حق ادا کر دیا۔

دورانِ درس مولاناؒ جب کبھی انبیائی مشن اور مقصد بعثت کو بیان کرتے تو آپؒ کے الفاظ میں اک عزم اور حرارت محسوس ہوتی جو سامع کے دل تک پہنچ جاتی ...... ہر واقعہ کی تشریح اس طرح کرتے کہ لگتا گویا ہم اپنی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں۔

آپ کی ہر تحریر اولوالعزم انبیاء کے ذکر سے پُر رہتی تھی، انہی کے واقعات کو مثال کے طور پر پیش کرنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ بحیثیت ایک عالم آپؒ اپنے کو انبیاء کا حقیقی وارث ثابت کر چکے ہیں۔ آپؒ نے اپنے منصب کو نہ صرف پہچانا بلکہ اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اس منصب پر اپنے کسی قول وفعل سے کبھی کوئی آنچ نہ آنے دی، آپ کے کسی عمل میں ذرہ برابر بھی کجی کبھی نہ دیکھی گئی۔ ہمیں اس بات پر یقین ہے کہ آپؒ انبیاء کے سامنے سرخرو ہوں گے۔ (انشاءاللہ)

خیارِامت

آپؒ خیار امت کی صفات والے تھے۔ اپنے دشمن کو معاف کرنا، اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے فکر مند رہنا، ان کے درد کو اپنا درد سمجھنا، ان کے لیے دعائیں کرنا اور دعاؤں میں رونا، خیارِامت کی نمایاں صفات ہوتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خیارِامت (امت کے نیک ترین لوگ جو اس امت میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں) کی تعداد 500 ہے اور ابدال 40 کی تعداد میں رہتے ہیں...... نہ پانچ سو کی تعداد کم ہوتی ہے اور نہ 40 کی۔ جب کوئی ابدال مرجاتا ہے تو اس کی جگہ اللہ تعالیٰ 500 خیارِامت میں سے کسی ایک کو مقرر کر دیتا ہے۔ یہ سن کر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے اعمال کے بارے میں بتادیجیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> ''وہ اس شخص کو معاف کر دیتے ہیں جو ان پر ظلم کرتا ہے۔ اس شخص کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو جو کچھ بھی دیتا ہے، اس کے ذریعہ وہ فقراء و مساکین کی خبر گیری کرتے ہیں۔'' (مشکوٰۃ)

خضرِراہ

مولانا کی زندگی اور آپ کی جدوجہد پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ آپؒ کو

اللہ نے مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے...... خضر راہ...... بنا کر بھیجا تھا۔

آپؒ نے امت کو وہ نشان راہ دکھائے جس پر چل کر وہ اپنا کھویا ہوا مقام و مرتبہ حاصل کر سکتی ہے اور وہ اسباب بتائے جو اس کی ہزیمت اور زوال کا سبب بنے ہیں۔ آپ سوتے ہوؤں کو جگانے آئے تھے، آپ نے یہ فرض الحمدللہ ادا کر کے دکھا دیا۔ مولانا نے ہندی مسلمانوں کو بتایا کہ عزت و سرفرازی کی راہ کا راز اور غلامی سے نجات صرف ''اَلْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی'' کو تھام لینے میں ہے۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی۔

اور واضح بتا دیا کہ قدرت نے مسلمانوں کے تمام مسائل کو ایک مسئلہ میں سمیٹ دیا ہے۔ اور ان کے سامنے یہ لائحہ عمل پیش کیا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بابری مسجد کے مسئلے کو پہلے حل کرنا ہوگا۔ یہ راز، یہ فارمولہ اور خاکہ مولانا نے آشکار تو کر دیا ہے اب ہمیں اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی عزت و شوکت اور مقام و مرتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

میرے مجاہد، میرے قائد......!

مولانا اور مولانا کے افرادِ خاندان ہمیشہ ہی دشمن کے تیروں کا ہدف بنے رہتے ہیں۔ ہر بار ہم آپ سے اور آپ کے افرادِ خاندان سے ملتے کہ اظہارِ یگانگت اور دلجوئی کریں۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں مولاناؒ سے اظہارِ ہمدردی کرنے لگی...... تب مولاناؒ نے میری باتوں کو سنا اور ان باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ''یہ ایک شعر ہے، اسے لکھو جی!'' میں کچھ سمجھ نہ پائی، پھر بھی کاغذ قلم لیے ہمہ تن گوش ہوگئی کہ مولانا کی آواز گونجی جو آج تک میری سماعتوں میں محفوظ ہے:

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ایک شعر کے ذریعہ آپ نے اپنا سارا افسانۂ عشق کہہ دیا کہ ہم تو محبت میں زیادہ کی توقع کرتے تھے...... میں حیرت سے تکتی رہی...... پھر میں نے بے اختیار مولانا کے شعر کے جواب میں کہا:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ سن کر مولانا مسکرا دیے......

آپ کا شوقِ شہادت

میرے مولانا زندگی بھر شہادت فی سبیل اللہ کے حد درجہ مشتاق رہے۔ ہم نے بستر مرگ پر آپ کو حضرت خالد بن ولیدؓ کی طرح شہادت کی دعائیں کرتے پایا ہے (اللہ میرے مولانا کو درجۂ شہادت پر فائز فرما، آمین!)۔ ایک مرتبہ سخت علالت میں فرمایا کہ ''یوں بستر پر لیٹے رہنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، دل تو یہ چاہتا ہے کہ پولیس کے جوان ہی یہ احسان کر دیں کہ مجھے حوالات میں لے جائیں، تاکہ اللہ کے یہاں شرمندگی سے بچ جاؤں۔''

یہ ایمان ویقین اور عشق ووفا کی کونسی منزل تھی! عقل اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔

وفا تو کانٹوں کی سرزمیں ہے یہاں وہی جاں نثار آئے
سکون میں جس کو بے کلی ہو، تڑپ میں جس کو قرار آئے

ریشم کی طرح نرم

لوگ کہتے ہیں کہ جن کی زندگی میں سخت مصیبتیں پیش آتی ہیں، جن کو دشوار حالات سے گزرنا پڑتا ہے...... ان حضرات کی بات چیت میں سختی اور مزاج میں تلخی آجاتی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ میری زندگی میں کوئی ایسی شخصیت گزری ہو کہ جس پر مولانا محترم سے زیادہ سخت حالات پیش آئے ہوں یا کسی کو اس قسم کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہو......لیکن مولانا کے مزاج میں کسی قسم کی سختی یا تلخی کی کوئی رمق کبھی نہیں پائی گئی۔ آپ میں غصہ کی اک جھلک تک کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس بات کے اپنے تو اپنے، غیر بھی معترف تھے۔ غرض ایسا انسان مومن کامل ہوتا ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

مرابط فی سبیل اللہ

ہم نے دیکھا ہے کہ جن حالات میں جوانوں کی ہمت تک جواب دے جاتی تھی اس وقت بھی مولانا مضبوطی سے ڈٹے رہتے۔ عالم پیری میں بھی آپ کا حوصلہ جواں تھا۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے علاقے سعید آباد میں کرفیو نافذ تھا......ہوا یوں کہ اپریل 2012ء میں چند وجوہات کی بنا پر حالات کشیدہ ہو گئے...... ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول تھا، کوئی فرد اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا تھا...... یہاں تک کہ مدرسہ کی کمیٹی میں سے کسی نے بھی اس دوران مدرسہ کا رخ نہ کیا...... جب کہ مدرسہ کے ہاسٹل میں تقریباً 150 طالبات تھیں......جن کی حفاظت اولین مسئلہ تھا۔ اس موقع پر مولانا محترمؒ ہی وہ واحد مرد تھے جو مع اہل وعیال ہاسٹل کی طالبات کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دیتے رہے۔ مولانا مدرسہ کے آفس سے اک

لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹے......

ایک دن مولانا نے کمیٹی کے کسی ممبر کو فون کیا اور کہا کہ ''کچھ دیر کے لیے مدرسہ آ جائیں۔'' انھوں نے آنے سے معذرت کر لی اور کہا کہ ''مولانا ہم نہیں آ سکتے۔'' مولانا کو ان کے جواب سے بہت دکھ ہوا......مولانا اس وقت تنہا تھے لیکن آپ نے اپنی طالبات کو تنہا نہیں چھوڑا......ہم دیکھتے تھے کہ رات کا کوئی بھی پہر ہو مولانا اپنے آفس میں جاگتے رہتے تھے۔ آپ کو طالبات کی فکر نے اپنا آپ بھلا دیا تھا......ہم طالبات گویا کہ اسلام کی سرحدیں تھیں اور مولانا ہمارے مرابط تھے۔

اللہ ان آنکھوں کو قبول فرما کہ جو دن رات ہماری حفاظت میں، ہماری فکر میں جاگتی رہیں ......اور ان مبارک آنکھوں کو اپنا دیدار نصیب فرما......آمین!

محافظ کتاب وسنت

مولانا محترم تفسیر قرآن کے اعلیٰ اساتذہ میں شامل تھے۔ مولانا کو قرآن اور علوم قرآن میں خاصا درک حاصل تھا بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا غواص تھے اور قرآن سے ایسے ایسے گہر اور موتی برآمد کرتے تھے کہ عقل حیران ہو جاتی تھی۔ قرآن کے درس کے وقت آپ کا چہرہ روشن ہو جاتا گویا اللہ کی محبت کا نور بکھر گیا ہو۔ چہرہ پر ایک مسکراہٹ ٹھہر جاتی، جذب اور وجد کی کیفیت نمایاں ہو جاتی۔ آپ نے اپنے مقاصدِ زندگی میں سب سے اہم مقصد حفاظتِ قرآن کو بنایا تھا۔ جس طرح حفاظ کرام آیتوں کے محافظ ہوتے ہیں اسی طرح آپ قرآن کی اصطلاحات، مطالب و معانی کے محافظ بنے رہے۔ اور ہمیشہ ایسے لوگوں کے تعاقب میں لگے رہتے تھے کہ جو قرآنی آیات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیا کرتے ہیں۔ آپ کہا کرتے تھے کہ ''قرآن کریم اور سنت رسولؐ ہی ہمارا اثاثۂ حیات ہیں۔ یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہیں۔ انہی کو مضبوطی سے تھام کر ہم سرفرازی حاصل کر سکتے ہیں۔'' بقول علامہ اقبالؒ

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است

ایں دو قوت اعتبار ملت است

''ہمارا اثاثۂ حیات قرآن کریم اور حکمت ہے انھی دو قوتوں سے ملت اسلامیہ کا وقار اور بھرم ہے''۔

مولانا ملت اسلامیہ میں موجود بنی اسرائیل کے قبیل کے ایسے تمام ہی علماء کو پہچانتے تھے جو قرآنی آیات کی تاویلات وتحریفات میں مشغول ہیں۔ جو سالہا سال سے اپنی گمراہ کن تاویلات کے ذریعہ امت کو گمراہ کرنے کا فریضہ بڑے ہی احسن طریقے پر ادا کر رہے ہیں۔ کفر سے رواداری ثابت کرنے کے لیے اور عقیدۂ البراء والولاء سے روگردانی کرنے کے لیے آیاتِ جہاد اور چند مخصوص قرآنی اصطلاحات کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور اپنے

من پسند معنیٰ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔جن کی انھی حرکتوں پر علامہ اقبال کہتے ہیں:

از شکر فیبائے آں قرآں فروش

دیدہ ام روح الامینؑ را در خروش

اس قرآن فروشی کی عجیب وغریب باتوں سے میں نے روح الامین جبرئیلؑ کو واویلا کرتے دیکھا ہے۔

درس کے دوران مولانا ان اصطلاحات کے درست معنیٰ ومفہوم بتاتے اور ان آیات کی بہترین تفسیر کرتے کہ جو آج اجنبی بنا دی گئی ہیں۔

علماءِ سو کی جانب سے کی جانے والی تحریفات پر آپ کی گہری نظر ہوتی تھی۔ایسے تمام لوگوں کے مضامین کا تنقیدی مطالعہ کرتے، ان کے حوالہ جات اور سوال وجواب کی تحقیق کرتے اور خوب غور وفکر کرتے۔جب ان کی کج روی کی جڑ تک پہنچ جاتے تو ان کے جواب میں نصوصِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے استدلال اور استنباط کرتے ہوئے، اسلاف کے اقوال واعمال پیش کرتے ہوئے اور فقہ کی کتابوں سے حوالے دیتے ہوئے ان کی گمراہ کن باتوں کا رد کرتے۔نظریۂ جہاد کے دفاع میں جب مولانا دلائل وبراہین کی سپر لے کر کھڑے ہوتے اور دوٹوک جواب دیتے تو آپ کے مقابلہ میں کوئی ٹک نہ پاتا۔

مولانا کی تحریروں کے مطالعے سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ کئی ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو اپنے مطلب کے لیے احادیث کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال کرتے ہیں جبکہ مکمل حدیث ان کے موقف کی یکسر مخالف ہوتی ہے۔مولانا نے ایسے کئی چور راستوں کو بند کر کے امت کو حقائق سے روشناس کروایا۔

مولانا کے چلے جانے کے بعد بھی کوئی ان آیات اور اصطلاحات پر ظلم نہیں کر سکتا کیونکہ مولانا کی کتابیں اور آپ کی فکر کے امین اس طرح کی تحریفات سے امت کو آگاہ کرنے اور اس عظیم گناہ (جس کی پاداش میں بنی اسرائیل کی بساط الٹ دی گئی، ان سے قوموں کی امامت چھین لی گئی اور وہ عذابِ الٰہی سے دوچار ہوئے) سے بچانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ان شاءاللہ!

محاذوں والے

آپ شریعت محمدیؐ میں موجود ایک حکمِ خداوندی یعنی جہاد وقتال کے محافظ تھے...... عصر حاضر میں ''الجہاد'' قرآن کی ایک مظلوم اصطلاح بن گئی ہے...... جس سے لوگ دامن بچا کر کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ایسے وقت میں آپؒ نے امت کو اس حکم سے نہ صرف محبت کرنا سکھایا بلکہ شوقِ شہادت سے سرشار کر کے جہاد کے لفظ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

''جس نے میری سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھاما، میری امت میں بگاڑ کے وقت، اس کے لیے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔'' (بیہقی)

اُمّت میں بگاڑ کے وقت ایک سنتِ نبی ﷺ کو مضبوطی سے تھامنا سو شہیدوں کے اجر و ثواب کے برابر ہے...... غور کریئے اس شخص کے مقام و مرتبہ پر جس نے امت میں وہن کی بیماری کے وقت اس سنت کو اور حکمِ خداوندی کو مضبوطی سے تھام کر نہ صرف اسے زندہ کیا بلکہ اس کی حفاظت بھی کی اور اس کا داعی بھی رہا...... اس شخص کے درجات کا اندازہ لگایئے کہ اسے اللہ کی رضا کی کونسی معراج ملی ہوگی! اور محبت رسول ﷺ کی کیسی سند ملی ہوگی......!!

اس کی قسمت پہ رشک آسماں بھی کرے
جس کو بس اپنے رب کی رضا چاہیے

امام احمد بن حنبلؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور دیگر علماء فرماتے ہیں:

''کہ جب لوگوں کے درمیان کسی بات میں اختلافِ رائے پیدا ہوجائے تو دیکھو کہ محاذوں والے کس طرف ہیں کیونکہ بے شک حق اُن کے ساتھ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے......'' (العنکبوت) (مجموع الفتاویٰ لابنِ تیمیہؒ)

بلاشبہ حق آپ کے ساتھ تھا اور آپ جادۂ حق کے مسافر اور رہنما تھے۔

مراجینا مرامرنا

محبت اجالوں سے جس کو بھی ہوگی
وہ ظلمت کی چادر کو اوڑھے، تو کیسے؟

جو محشر کی امید رکھتا ہو دل میں
سکوتِ شبی وہ نہ توڑے تو کیسے؟

بابری مسجد کی بازیابی کے لیے مولانا بہت متحرک رہا کرتے تھے۔ مولانا کی ہر گفتگو میں بابری مسجد کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ خصوصاً بابری مسجد کی بازیابی کے لیے منعقد کیے جانے والے جلسوں میں آپ کی جامع تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ جس سے ملت کے نوجوانوں کو حوصلہ اور عزم ملتا تھا۔ اس عالمِ پیری میں بھی آپ جوانوں کا حوصلہ اور امید تھے اور باہمت نوجوان آپ کی امید اور حوصلہ تھے۔ آپ کی تقاریر سے چند نکات پیش کیے جا رہے

ہیں، جن سے آپ کی تڑپ، بے چینی، فکر مندی، حوصلہ افزائی اور رہنمائی بخوبی ظاہر ہوتی ہے:

☆ ''بابری مسجد، مسجد تھی، مسجد ہے اور تا قیامت مسجد رہے گی۔

☆ اگر یہ کہا جائے کہ بابری مسجد کو پورے ہندوستان نے منہدم کیا ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ خاموش بیٹھے مسلمان، تماشائی بنے مسلمان بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

☆ ''لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ'' اس آیت میں موجود ذلّت سے کوئی بھی اپنے کو بچا نہیں سکتا۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ اس ہندوستان کی سرزمین پر مسلمان بھی ذلیل ہوں گے۔

☆ میرا یقین ہے کہ جس دن حکومتی دباؤ سے مسلمان بابری مسجد کا نام لینا چھوڑ دیں گے اُس دن ہندوستان پر اللہ کا عذاب آ سکتا ہے۔ ہماری پست ہمتی کا حال یہ ہے کہ ہم بابری مسجد کے لیے دعا کرنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ آج یہ کیوں سمجھا جارہا ہے کہ بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر ناممکن ہے؟

☆ آج یہ چند لوگ جو بابری مسجد کی از سرِ نو تعمیر کی بات کرتے ہیں یہ حقیقت میں ہندوستان کے محافظ ہیں۔ یہی لوگ ہندوستان کو اللہ کے عذاب سے بچائے ہوئے ہیں۔

☆ بڑی بڑی جماعتوں نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ ایک بار جہاں مسجد بن جاتی ہے تو تمام مسلمان بھی مل کر اس کی حیثیت میں تبدیلی نہیں لا سکتے تو پھر اس معاملے میں طاغوتی عدالت کو حکم کیسے مان لیا؟ ان کے فیصلوں کو مان کر گناہ میں کیوں شریک ہوئے؟ مسجد منہدم کر دی گئی، اس کی جگہ بت خانہ بنا دیا گیا تو مسلمانوں نے کیوں شرکت کی، بت خانہ بنانے میں؟ مسلمان عدالت کا فیصلہ ماننے کے اعلان کے ساتھ ہی بت خانہ بنانے میں شریک ہو گئے اور مسجد سے دستبرداری مکمل ہو گئی۔ مسجد ڈھانے والوں کے جرم میں شرکت ثابت ہو گئی۔ اب خدا کے نزدیک یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم بے بس تھے۔

☆ بابری مسجد بیت اللہ، کعبہ کی شاخ ہے۔ اس کی بے حرمتی کعبہ کی بے حرمتی ہے۔ مسجد صرف اور صرف اللہ کی ملکیت ہوتی ہے۔ بابری مسجد یا کوئی اور مسجد مسلمانوں کی ملکیت ہرگز نہیں ہے کہ وہ اُسے بت خانہ بنانے کے لیے دے دیں۔ کوئی مسلمان اس بات کا حق نہیں رکھتا۔

☆ ہجرت کے وقت کیا یہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ چند سال بعد ہی وہ مکہ فتح ہوگا؟ جہاں سے کسمپرسی کی حالت میں نکالے گئے تھے۔ یہ اُن کا یقین و ایمان ہی تھا کہ اللہ چاہے گا تو ایک دن کعبہ بتوں سے پاک ہوگا۔ اسی یقین اور اسی ایمان کی آج ضرورت ہے۔

☆ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بہت سی تحریکیں اور تنظیمیں بابری مسجد کے نام پر بنیں گی۔ ٹوٹیں گی، پھوٹیں گی لیکن

بنیں گی ضرور، جس طرح صلیبی جنگوں کے ۹۰ برس بعد بیت المقدس فتح ہوا تھا، اسی طرح سے مجھے یقین ہے کہ بابری مسجد بھی ۹۰ برس میں پھر تعمیر ہوگی۔ محض ایمان و یقین کی ضرورت ہے۔ ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے۔''

کسی دیوار نے سیلِ جنوں روکا نہیں اب تک

مولانا جماعت اسلامی کی بدلتی ترجیحات اور پالیسیوں پر دل شکستہ و دلگرفتہ ہوجاتے تھے۔ اقامتِ دین سے شروع ہونے والے اس سفر میں جب ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کا پڑاؤ آیا تو مولانا حد درجہ غمگین ہوگئے۔ صحیح معنی میں مولانا کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مولانا اسے جماعت اسلامی کی تاریخ کا سیاہ ترین باب قرار دیتے تھے۔ مولانا اگرچہ کہ جماعت سے نکالے جاچکے تھے، لیکن جماعت آپ کے دل سے کبھی نہیں نکلی تھی، یہی وجہ ہے کہ جماعت کی جب بھی کوئی نئی پالیسی منظر عام پر آتی مولانا اس پر ضرور نگاہ رکھتے اور اپنی تنقید کے ذریعہ اصلاح اور تعمیر کی کوشش کرتے۔ جماعت کی اصلاح مولانا اپنا فرض سمجھتے رہے اور یہ فرض آپ آخر وقت تک ادا کرتے رہے۔

جماعت اسلامی سے مولانا کا اخراج اس بات پر ہوا کہ مولانا جماعت کی بنیادی فکر اور نصب العین سے سرمو ہٹنے کے روادار نہ تھے اور جماعت کی موجودہ پالیسیوں سے متفق نہ ہو رہے تھے، میرا خیال ہے کہ اگر جو مولانا مودودیؒ اس زمانے میں ہوتے تو وہ بھی اپنی جماعت سے نکالے جاتے، اس میں کوئی شک نہیں۔

لیکن یہ قدرت کی مہربانی ہی ہے کہ جس فکری اختلاف کی بنا پر مولانا کا جماعت سے اخراج کیا گیا تھا، مولانا اس جماعت میں مع اپنی سالم فکر و نظریہ کے واپس آچکے ہیں۔ مولانا کے کئی شاگرد اور طالبات جماعت میں مولانا کی فکر و نظر کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ جماعت کے شعبۂ خواتین میں ذمہ داریاں نبھانے والی بیشتر خواتین و طالبات وہ ہیں جو مولانا کی تربیت اور آپ کی فکر و نظر کے سائے میں پروان چڑھی ہیں۔ اس طرح مولانا اپنے شاگردوں کی شکل میں دوبارہ جماعت میں لوٹ کر آچکے ہیں۔

پرواز کو میری روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا

ظلم سہہ کے ظالموں کو اور نہ ثبات دو

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ فرضی مقدمات میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں بھی ہیں جن سے آئے دن مختلف خاندانوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کہیں سے بھی اس طرح کی گرفتاری کی کوئی خبر آتی تو مولانا اپنے درد اور کرب کا اظہار ہم طالبات اور اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے ضرور

کرتے تا کہ ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ اس سلسلہ میں مولانا کے بعض بیانات کے اہم نکات اور نصیحتیں پیش کی جارہی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اس مسئلے سے نگاہیں چرا کر اور راہِ فرار اختیار کر کے ہم سکون وچین سے اپنے روز وشب بسر نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک ایسے خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے جس سے جلد یا بدیر سب کو دوچار ہونا ہوگا۔

☆ اپنے ایک خطاب میں آپ نے فرمایا: ''حالات سخت تشویشناک ہوتے جارہے ہیں۔ کیونکہ حکومت صرف مسلمانوں کو نشانہ بنارہی ہے۔ یہاں جب بھی کوئی گولی چلتی ہے، کبھی کوئی بم بلاسٹ ہوتا ہے تو تفتیش نہیں کی جاتی، چھان بین نہیں کی جاتی...... کہ اصل مجرم کون ہے؟ مجرموں کو چھوڑ کر محض بے قصور مسلم نوجوانوں کو اس موقع پر تحقیق کے نام پر گرفتار کیا جاتا ہے۔ حکومت اور انتظامیہ کی نااہلی ہے کہ وہ اصل مجرم کو پکڑنے میں ناکام ثابت ہوتی ہے۔ اپنی اس خامی کو چھپانے کے لیے مسلم نوجوان چارے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح اب جو حالات چل رہے ہیں اس میں بھی مسلمان نوجوانوں کو بے دریغ پکڑا جارہا ہے اور جس انداز میں ان سے تفتیش کی جارہی ہے، وہ نہایت ہی بدنما ہے۔ جو نوجوان اس مرحلے سے گزر رہے ہیں، جب وہ اپنے اوپر روا رکھے جانے والے مظالم کی روداد بیان کرتے ہیں تو واقعی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کو سننے کی تاب نہیں ہے۔ امریکہ اور اسرائیل سے ٹریننگ لے کر ہندوستانی پولیس نے جو سیکھا ہے وہ یہ کہ نہتے معصوم مسلم نوجوانوں کو اذیت پہنچانا اور ان پر ظلم کرنا۔''

''یاد رکھو! اب تو چند لوگوں کو پکڑا جارہا ہے لیکن یہ چند لوگ جب ختم ہوجائیں گے جو کہ مسلمانوں کی ڈھال ہیں، جو مسلمانوں کی اذیتیں خود پر جھیل رہے ہیں۔ تو یہ دائرہ اور وسیع ہوگا۔ اور یہاں جو بھی مسلمان ہے وہ مجرم قرار دیا جائے گا۔ آج ان کی تو کل ہماری باری آئے گی۔ یہ سوچ کر ہی ہمیں ان حالات میں دوسروں کے لیے اتنا تو کرنا چاہیے، جتنا ہم کر سکتے ہیں۔

پہلا کام یہ کہ اپنے اللہ سے دعا کریں مسلم بھائیوں کے لیے۔ اللہ ہی مسبّب الاسباب ہے اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ ایک لمحے میں حالات کو بدل سکتا ہے۔ دشمنوں، کافروں اور قاتلوں کو بھی وہ زیر کر سکتا ہے۔

دعا کے ساتھ ہمیں ملت کے اندر بیداری پیدا کرنا ہے۔ جیسے کوئی فرد اپنے خاندان اور متعلقین کے لیے فکرمند ہوتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کو پوری ملت کی حفاظت، ملت کے وقار کو قائم رکھنے میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ اپنا فرض سمجھتے ہوئے اپنا وقت، اپنی محنت، اپنا پیسہ اس راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔

اس ظلم کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ ظالموں کے ظلم کو ثبات حاصل ہوجائے گا۔ اور ظلم بڑھتا چلا جائے گا۔ ظلم کو خاموشی سے سہنا بھی ظالموں کا ساتھ دینے کے برابر ہے۔ لہٰذا جس طرح سے بھی آپ ظلم کے خلاف آواز بلند کر سکتے ہیں ضرور کریں، ورنہ عنداللہ ضرور جوابدہ ہوں گے۔''

صبر وعزیمت کے کوہِ گراں

آج علماءِ سو جہاں امت کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرانے کے بجائے، ان کے فرائض یاد دلانے کے بجائے ''اتقوا مواضع الفتن'' کا فتویٰ دیتے نظر آتے ہیں، وہیں مولانا اور مولانا کی کتابیں ان فتوؤں کو ''فرار من الزحف'' سے تعبیر کرتے ہوئے امت کو عمل کی راہ سجھاتے ہیں۔ آپ نے کسی بھی موقع پر مسلمانوں کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ہر موقع پر قرآن وحدیث کے ذریعہ رہنمائی کرتے رہے۔ آپ ہندوستان میں غلبۂ اسلام، شہادت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھنے والی، کام کرنے والی تحریکوں کے سرپرست اور معاون تھے ...... ہر ایک کو حق کا راستہ دکھاتے رہے، باطل پگڈنڈیوں سے بچاتے اور آگاہ کرتے رہے......

ہم گواہ ہیں کہ مصائب وآلام کے باوجود مولانا محترم نے ملت اسلامیہ کی رہنمائی کی ذمہ داری کو اپنا فرض سمجھ کر نبھایا۔

آپ آزمائشوں میں صبر واستقامت کی تلقین کرتے، اپنے الفاظ سے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ...... محروسین وشہداء کے گھر والوں کو دلاسہ دیتے ...... ایسے موقع پر آپ کے الفاظ بے آب وگیاہ صحرا میں ٹھنڈے پانی کے قطرے لگنے لگتے ...... کیونکہ سامع پر اسی کے الفاظ اور دلاسے اثر انداز ہوتے ہیں جو خود اس دور سے گزر رہا ہو ...... جو خود آزمائشوں کی بھٹی میں تپا ہو ...... جو خود قربانیاں پیش کرتے ہوئے صبر وضبط کی معراج پر رہا ہو ...... جو خود ان حالات کو جھیل کر دوسروں کو صبر کی تلقین کر رہا ہو۔

اس نظامِ بدی سے بغاوت کریں

شرک فی الحکم سے بیزاری اور بغاوت تمام انبیاءؑ کی روایت رہی ہے یہ ان کا فرض منصبی تھا کہ دنیا سے شرک اور نظامِ شرک کو ختم کریں اور توحید اور نظامِ توحید کو قائم کریں۔

اسی نظامِ شرک سے بغاوت کے جرم میں ابراہیمؑ خلیل اللہ آگ میں ڈالے گئے، اسی کی سزا میں موسیٰؑ کلیم اللہ نے ہجرت کی، اسی بغاوت کے سبب عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام وزکریا علیہ السلام سزائے موت کے مستحق ٹھہرے۔ اسی شرک کو مٹانے کے لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پتھر کھائے، کانٹوں پر چلے، سبّ وشتم کے تیر سہے اور اپنے خون سے طائف کی زمین کو رنگین کیا، اور ۱۰ سال مسلسل جنگ کی۔

انبیاء ورسلؑ کے حقیقی جانشین میرے مولانا بھی اسی نظامِ کفر وشرک کے باغی تھے، آپ نے اپنی زندگی لوگوں کو نظامِ شرک کی اطاعت سے باز رکھنے کی کوشش میں صرف کی اور اللہ کی وحدانیت، الوہیت اور اسی کی حاکمیت کے علمبردار رہے۔

عصر حاضر کے سیاسی نظریات سے نفرت وبیزاری

جہاں ایک طرف مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے دنیا کے طاغوتی نظاموں سے قربت کا معاملہ اختیار کیا ہوا ہے، اور انھیں قابلِ قبول بنانے میں اپنی صلاحیتیں خرچ کر کے نظامِ کفر کی قباحتوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس نظام کو مستحکم کرنے کے لیے اس میں شرکت کی دعوت دی جارہی ہے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا جارہا ہے۔ جب ہم مولانا کا ان نظاموں کے ساتھ معاملہ دیکھتے ہیں تو بالکل الٹ نظر آتا ہے۔ مولانا ان نظریات کی مخالفت میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ عصر حاضر کے سیاسی نظریات سے نفرت وبیزاری کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کہا کرتے تھے کہ:

☆ ''جمہوریت اور اسلام میں کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ اسلام کی بنیاد غیر اللہ کی الوہیت سے انکار پر ہے۔ دونوں میں کبھی بھی تال میل نہیں ہوسکتا۔ اسلام اور جمہوریت میں قربت پیدا کرنے کی کوشش ایک احمقانہ کوشش ہے۔ لوگوں کی من مانی کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

☆ موجودہ سیاسی نظریات شرک کی پیداوار ہیں اور شرک سے یہ سب چیزیں ماخوذ ہیں۔ شرکیہ باتوں سے ملی ہوئی باتیں توحید سے میل نہیں کھاتیں۔ ان سے چھٹکارا اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ ان کے خلاف جدوجہد کی جائے اور کوئی کوشش منظم طریقہ سے ہو کہ نظامِ اسلامی قائم ہوجائے۔ مسلسل کوشش ہو تو اس کی راہ نکل سکتی ہے۔ اللہ مدد کرے گا۔ اللہ کی مدد سے اسلامی نظام قائم ہوسکتا ہے، شرط ہے کہ اس کے لیے کوشش کی جائے۔''

اس نظامِ شرک میں شرکت کا ایک بڑا ذریعہ ووٹ ہے، لہٰذا آپ ہمیشہ ووٹ دینے کے مخالف رہے کہ یہ تو راست طور پر ''نظامِ شرک'' کے لیے ''بت گری'' اور سراسر ''بت تراشی'' کا فعل ہے۔ پھر کیسے ووٹ دے کر کسی انسان کو خدا کی کرسی پر بٹھانے کا کام ایک مسلمان کرسکتا ہے۔ اور کیسے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نظام کفر وشرک میں ووٹ دینا ایک شرعی فریضہ، قانونی حق، امانت اور شہادت ہے؟!!

نبی موحدؐ کی امت کو ووٹ کے ذریعہ بت تراشی اور بت گری کرتے دیکھ کر مولانا کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ آپ کے آفس میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے عنوان پر بنی پینٹنگ ہمیشہ لگی ہوتی تھی۔ جسے دیکھ کر آپ اکثر آنسو بہاتے نظر آتے۔

دل دردمند

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''اللہ ایسے شخص پر رحم کرے، جو بیچتے، خریدتے اور معاملہ کرتے وقت فیاضی اور نرمی سے کام لیتا ہے۔'' (البخاری)

مولانا کی شخصیت ہر لمحہ ہمیں درس و تدریس کے مراحل سے گزارتی تھی۔ ایک مرتبہ جب مولانا تعطیلات کے بعد اپنے گاؤں سے واپس آئے تو اپنے ساتھ قالینوں کے دو بنڈل لے آئے۔ پوچھنے پر چاچی نے بتایا کہ گاؤں میں سخت گرمی تھی، اس چلچلاتی دھوپ میں ایک خستہ حال قالین فروش گھر پر آیا۔ اور اس نے بتایا کہ صبح سے اس کی ایک قالین بھی فروخت نہیں ہوسکی۔ تب اس کی بیچارگی و مفلسی نے مولانا کو اتنا متاثر کیا کہ آپ نے پہلے اسے بٹھا کر پانی پلایا، کھانا کھلایا اور بعد کو اس کی ساری قالینیں اس سے اس کی مطلوبہ قیمت پر خرید لیں۔ اور ساری قالینیں گاؤں میں بانٹ دیں اور دو مدرسہ کے لیے لائے ہیں۔

اس واقعہ کو سن کر ہم نے مولانا سے سوال کیا کہ ''مولانا آپ اس شخص کی مدد پیسوں سے کرسکتے تھے پھر آپ نے قالینیں کیوں خریدیں؟''

مولانا نے فرمایا کہ ''کبھی کبھی کسی سے بلاضرورت بھی چیزیں خرید لینی چاہئے، تاکہ اس کی غیرت اور عزتِ نفس کو ٹھیس نہ پہنچے۔''

ایک سادہ سا جملہ، ہلکا پھلکا لہجہ، ریاکاری اور تصنع سے پاک عمل ہمارے دل کی دنیا بدلتا چلا گیا...... یہ کون لوگ تھے کس دنیا سے آئے تھے کتنا پاک صاف کردار لائے تھے...... کتنا نرم دل پائے تھے!!

جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

تم شہرِ اماں کے رہنے والے درد ہمارا کیا جانو

۱۷ رمئی ۲۰۰۷ء میں مکہ مسجد بم بلاسٹ اور مابعد پولیس فائرنگ کے واقعہ سے سارا حیدرآباد دہل گیا تھا۔ مسلمانوں میں شدید غم و غصہ کا طوفان امڈ آیا تھا کیونکہ اللہ کے گھر پر حملہ راست اسلام پر حملہ تھا...... مسلمانوں کے دل اس غم سے بھاری تھے کہ تبھی ہر سمت سے مسلم بے قصور معصوم نوجوانوں کی گرفتاری کی خبریں آنا شروع ہوئیں اور شہر کے ہر علاقے سے گرفتاریاں ہونے لگیں، خاص طور پر حیدرآباد کے حساس علاقے سعیدآباد سے کئی نوجوانوں کو وقفے وقفے سے گرفتار کیا گیا...... سالوں سے ہم دیکھتے آئے ہیں کہ ہندوستان کے کسی خطے میں کچھ ہوتا ہے تو اس کا تعلق حیدرآباد سے ضرور جوڑ دیا جاتا ہے اور اسی بہانے کسی مطلوبہ شخصیت کو اٹھا کر دوسری ریاستوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ خاص کر مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کا نام تو ضرور ہی لیا جاتا۔

ان دنوں حیدرآباد کے مسلم گھرانے اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے بہت زیادہ فکرمند تھے اور مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں پر بے چین ہوگئے تھے۔عوام میں بے چینی، غم وغصہ کی لہر احتجاج کی شکل اختیار کرگئی تھی......جلسے، دعائیہ اجتماعات اور دھرنے شروع ہوئے۔

ان ہی حالات میں 5/مارچ 2008ء کو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے گھر کے سامنے سے آپ کے چھوٹے صاحبزادے کو بغیر اطلاع کے، نقاب پوش، سول ڈریس پولیس نے اغوا کرلیا......جس کی خبر ملتے ہی محلے کی خواتین جو پہلے ہی دیگر گرفتاریوں سے غم وغصہ کا شکار تھیں، مولانا کی بیٹیوں کے ساتھ مقامی پولیس اسٹیشن پہنچیں تاکہ FIR لکھوائیں اور پتا لگائیں کہ بچہ کہاں ہے؟ کس نے گرفتار کیا اور کہاں رکھا گیا ہے......؟ تب پولیس عملے نے نہ صرف مکمل لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ FIR لکھنے سے بھی انکار کردیا۔اس بحث ومباحثے کے دوران دیگر محلوں کی خواتین بھی پولیس اسٹیشن پہنچنے لگیں۔جن میں ضعیف العمر خواتین کے علاوہ معصوم لڑکیاں بھی شامل تھیں۔پولیس نے وہاں موجود تمام خواتین کو مع معصوم بچوں کے گرفتار کرلیا، جن میں مولانا کی بیٹی، اور ۲ ماہ کی ننھی منی نواسی سمیت سات کم عمر لڑکیاں تھیں۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔خبر کے ملتے ہی مولانا اور کچھ ذمہ دار لوگ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے اور بات چیت کے ذریعے خواتین کو رہا کرانے کی بھرپور کوشش کی، لیکن پولیس کے ذمہ دار نہیں مانے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انھیں اوپر سے آرڈر ملا ہے، خواتین کی گرفتاری کا......ایسا لگتا تھا کہ یہ ایک طئے شدہ منصوبہ تھا، عوام کو خوف میں مبتلا کرکے خاموش کرانے کا......

میرے خیال سے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ پولیس نے اتنی بڑی جرأت کرتے ہوئے باپردہ مسلم خواتین کو، کثیر تعداد میں گرفتار کیا۔اس واقعے نے حیدرآباد میں ہلچل پیدا کردی۔

ان حالات میں میرے مولانا کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا......ایک طرف بیٹا اغوا ہوچکا تھا، دوسری طرف دو بیٹیاں ۳۰ خواتین سمیت جیل میں تھیں، آپ کو کسی پل چین نہ تھا دن رات ان کی رہائی کے لیے سرگرداں رہتے، وکلاء سے مشورے کرتے......کہ کیا کیا جائے......سب کے گھروالوں کو تسلی دیتے......

ایک دن مولانا اپنی بیٹیوں اور دیگر خواتین سے ملاقات کے لیے جیل پہنچے......خواتین کو تسلی دینے کے بعد مولانا نے اپنی بیٹی کی گود میں دو ماہ کی ننھی منی نواسی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھا تو آنکھیں نم ہوگئیں......سب نے سمجھا کہ بیٹیوں کی محبت میں مولانا کی یہ کیفیت ہوئی ہے لیکن مولانا کے اپنی بیٹیوں سے کہے گئے ایک جملے نے سب کو حیرت سے منہ کھولنے پر مجبور کردیا......

مولانا نے کہا کہ ''دیکھو جی! ساری خواتین رہا بھی ہوجائیں تب بھی آپ لوگوں کو یہیں رہنا ہے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوجایئے کیونکہ معتصم کے رہا ہونے تک بطورِ احتجاج ہم آپ کو نہیں چھڑوائیں گے.....'' ادھر بیٹیوں نے بھی فرمانبرداری میں سرِ تسلیم خم کردیا۔

گرفتاری کے دوسرے دن مولانا پولیس اسٹیشن میں کم عمر لڑکیوں کو تسلی اور دلاسہ دینے پہنچے.....ساتھ میں چھوٹے بچوں کی پسندیدہ کھانے پینے کی ڈھیر ساری چیزیں بھی تھیں..... بچیاں ملاقات پر خوش ہوئیں، ان کو ہمت ملی......اس روز لڑکیاں روزہ سے تھیں......مولانا نے ان بچیوں سے کہا کہ تم لوگ روزہ مت رکھو جی! کمزور ہوجاؤ گی۔ تب ایک بچی نے کہا: ''مولانا ہم نے تو مسلم محروس بھائیوں کی رہائی کے لیے روزہ رکھا ہے.....''

یہ سن کر مولانا کچھ دیر سوچتے رہے اور بچیوں کی ہمت دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے۔ پہلی مرتبہ جب کورٹ میں ان لڑکیوں کی ضمانت پر بحث ہوئی اور خاتون جج نے ضمانت مسترد کردی تو یہ وہ موقع تھا کہ ہم نے پہلی مرتبہ مولانا کا جلال دیکھا، مولانا کا چہرہ غم وغصہ سے تمتما رہا تھا......مولانا انتہائی غصہ میں واپس آئے اور ایک پریس کانفرنس کی اور اپنے غیض وغضب کا اظہار کیا۔ مولانا کی مسلسل کوششوں سے کم عمر بچیاں، پانچ دن اور خواتین سات دن میں رہا ہوئیں۔

اس دوران ہم نے دیکھا کہ مولانا ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھے...... پریس کانفرنسیں، انٹرویوز اور اخباری بیانات کے ذریعے پولیس ظلم کو عیاں کرتے رہے اور متاثرین کے اہلِ خانہ سے ملاقاتیں کرکے انھیں حوصلہ دیتے رہے۔

مسلم نوجوانوں اور خواتین کی گرفتاری کسی کا کوئی ذاتی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ یہ پورے مسلمانوں کا مسئلہ تھا اور ایک سخت آزمائش تھی۔ لیکن اکثر لوگ اپنے ڈر اور خوف کی بنا پر اس سے دامن بچالے گئے اور محروس نوجوانوں اور ان کے اہلِ خانہ کو بے یارومددگار چھوڑ دیا اور ان احادیث کی پرواہ نہیں کی جن میں کہا گیا ہے کہ

> ''جو شخص بھی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے یارومددگار چھوڑ دے جہاں اس کی حرمت پامال اور عزت مجروح کی جارہی ہو تو اللہ بھی اس کو کسی ایسی ہی جگہ پر بے یارومددگار چھوڑے گا، جہاں یہ چاہے گا کہ اس کی مدد کی جائے.....'' (ابوداؤد)

> ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے دشمنوں کے ہاتھوں سے کسی مسلمان قیدی کو فدیہ دے کر چھڑایا تو میں (محمد ﷺ) وہی قیدی ہوں۔'' (الطبرانی)

مولانا کا عمل ان ساری احادیث کے مطابق رہا...... یقیناً آزمائش کی اس گھڑی میں مولانا سرخرو ہوئے اور

دامن بچالے جانے والوں کے دامن میں خسارے کے سوا کچھ نہ آیا۔

بہر حال خواتین کی رہائی پر مولانا عوام کی کثیر تعداد کے ساتھ جیل پہنچے۔ بس کے ذریعہ انھیں واپس لایا گیا۔ اس موقع پر ننھی منی بچیاں نظم پڑھ رہی تھیں، جس کے الفاظ تھے:

تم شہر اماں کے رہنے والے درد ہمارا کیا جانو
ساحل کی ہوا تم موج صبا طوفان کا دھارا کیا جانو

اس نظم کو سن کر مولانا رونے لگے...... اسے دوبارہ پڑھوایا اور پھر اس وقت سے یہ مولانا کی پسندیدہ نظم بن گئی۔ دوسرے دن اخبار کی سرخیوں میں بھی نظم کا یہ مصرعہ اس تمہید کے ساتھ آیا کہ

''جیل سے رہا مسلم خواتین کا شہر حیدرآباد کے مسلمانوں سے شکوہ''
''تم شہــر اماں کے رہنے والے، درد ہمارا کیا جانو''

جیل سے رہا ہونے والی لڑکیوں میں سے کسی نے مولانا سے ازراہِ تفنن کہا کہ ''مولانا اک وقت تھا کہ معتصم باللہ نے ایک مسلم بہن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے رومی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی...... آج ملت کی بیٹیوں نے تاریخ کا وہ قرض چکا دیا ہے......

مولانا ہمیشہ کی طرح مسکرائے اور آبدیدہ ہو گئے۔

وہ یارکم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

مولانا حضرتؒ کا انداز تعلیم و تربیت طالبات کے اندر سے جمود و تعطل کو ختم کر کے ان کے اندر تحریکی و اجتہادی فکر پروان چڑھا کر انھیں میدانِ عمل کی راہ دکھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تربیت میں رہ کر ایسے روشن ضمیر کردار وجود میں آئے جو فضول جھگڑوں، باہمی تکفیر اور فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر اسلام کی عالمگیر صداقتوں کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ آپ کے دروس اور آپ کی سیرت ہر ہر قدم پر رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنے والی صدائے جرس ثابت ہوتی رہے گی۔

اللہ کا احسان اور بہترین انعام ہے کہ اس نے اپنے کرم سے اس بے دینی اور غفلت کے دور میں اپنا فضل فرمایا کہ ہمیں مولانا کے مدرسہ سے جوڑ دیا، ورنہ ہماری زندگی کا بڑا حصہ غفلتوں میں ضائع ہو جاتا۔ اس کا کرم ہے کہ اس نے اپنے محبوب بندہ کی زیرِ نگرانی ہماری تربیت کی۔

مولانا کی روحانی تربیت کی بدولت ہم نے دیکھا کہ جب کسی روح میں حق داخل ہوتا ہے تو باطل زندگیوں

سے کیسے نکلتا ہے، حق و باطل میں کس طرح تمیز ہوتی ہے اور پھر حق کی راہ میں اپنی جان و مال کو لگانے کا جذبہ کس طرح ابھرتا ہے، غرض آپ کی تعلیم سے دلوں کو وہ فہم نصیب ہوتا تھا کہ جو ایک مؤمن کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے کہ ہم کون ہیں؟ دنیا میں کیوں بھیجے گئے ہیں، بحیثیت ایک مسلم، بحیثیت ایک عالم، بحیثیت ورثۃ الانبیاء، ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟

یہ وہ احساس ہے یہ وہ شعور ہے جو مولانا نے اپنے طالب علموں میں پیدا کر کے ان کی روح کو اس قدر بے چین و بے قرار کر دیا ہے کہ اب وہ کسی غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی معاشرے اور غیر اسلامی تہذیب کا حصہ ہرگز نہیں بن سکتے۔ وہ جہاں کہیں ہوں گے باطل افکار و نظریات سے ہمیشہ نبرد آزما ہوتے رہیں گے...... اور اس سفر کے نشیب و فراز میں آپ کی ذات مبارکہ سرچشمۂ قوت اور منبع نور ثابت ہوگی جو ہمارے حوصلوں کو ہمیشہ مہمیز کرتی رہے گی۔

شمع وہ بجھ کے بھی نہیں بجھتی
اپنے اندر جو نور رکھتی ہے

مولانا کا اندازِ تربیت اور آپ کی نصیحتیں

مولانا حضرتؒ کا اسلوبِ تربیت اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا تھا...... طالب علموں کو ایک چھوٹی سی بات بھی اس انداز میں کہتے کہ صرف ایک جملے سے ہی اُن کی سوچ و فکر کا رخ تبدیل ہو جاتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ قارئین کے لیے یہ عام واقعات ہوں لیکن میرے لیے یہ متاعِ زندگی ہیں۔

☆ مولانا محترم نے ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک ادا کرنے میں احتیاط کیا کریں...... کبھی بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کریں۔'' (یہ احترام و ادب کا قاعدہ ہے جو ایک سچے عاشق کا خاصّہ ہوتا ہے)۔

☆ مولانا کی نصیحت تھی کہ ''ہر نماز کے لیے تازہ وضو کیا کریں''...... میں ہمیشہ سوچا کرتی کہ شاید اسی لیے مولانا روشن چہرے والے ہیں۔

☆ مدرسہ میں منعقد اسلامک پینٹنگ نمائش کے دوران جس میں طالبات کی جانب سے قرآنی آیات اور احادیث کی تشریح میں بنائی گئی پینٹنگز اور ماڈلس تھے...... جس کا مشاہدہ کرتے ہوئے مولانا حضرتؒ جب اُس ماڈل کے قریب سے گزرے کہ جس میں طالبات نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ یہود نہ صرف مسجد اقصیٰ پر قابض ہو چکے ہیں بلکہ دنیا پر اُن کا تسلط بڑھتا ہی جا رہا ہے...... تب مولانا حضرتؒ نے

طالبات کو یہ نصیحت فرمائی کہ ''یادرکھو! اپنے قول وعمل سے کبھی یہ ظاہر مت کرنا کہ دنیا میں یہود کو کوئی مقام یا کسی قسم کی کوئی بالادستی حاصل ہے...... ہمارا اس بات پر مکمل ایمان ہونا چاہیے کہ یہود پر قیامت تک ذلت مسلط ہے۔ اس پر قرآنی مہر لگ چکی ہے۔''

ہم ششدر رہتے تھے کہ مولانا کی سوچ وفکر کس بلندی پر پہنچی ہوئی تھی اور آپ کا ایمان کس پائے کا تھا۔ اکثر ہم کسی معاملے میں گریہ وزاری کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اس عمل سے ہمارے مخالفین کی تعریف ہورہی ہے۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہمارے ہر قول وعمل سے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کی نکیر ہو...... ایک سچا بندہ اور ایک سچا عاشق کیسے ان دشمنوں کی بھولے سے بھی تعریف بیان کرسکتا ہے کہ جن پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام فرشتوں کی لعنت ہو......

مولانا کی اس بات سے ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں ایسا ماڈل تیار کرنا چاہیے تھا جس میں فلسطینی معصوم بچوں کی ہمت و جرأت کو بیان کیا جاتا کہ جو مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے ابابیلوں کی طرح ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھامے اسرائیلی ہاتھیوں کے آگے لشکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہراول دستہ بن کر صف بستہ کھڑے ہیں اور ساری دُنیا کو زبانِ حال سے یہ پیغام دے رہے ہیں کہ یہ ''بزدل قوم'' اُمّتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابابیلوں کے عزم وحوصلے کے آگے ڈھیر ہے۔

☆ آپ کا اندازِ تدریس بہت منفرد تھا۔ تمام تفاسیر سے آیات کی تفسیر پڑھواتے...... درس کے دوران ایسے سوالات کرتے کہ طلباء وطالبات غور وفکر کرتے ہوئے جوابات دیتے ہوئے خود ہی حقائق تک پہنچ جاتے اور بات دماغ کی تہوں میں اور دل کی گہرائیوں میں بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد مطلوبہ آیت کی تفسیر دوسری آیتوں کے ذریعہ کرتے اور آخر میں نتیجہ بحث پیش کرتے اور موجودہ حالات پر ان آیات کو منطبق کرکے آپ طالبات میں تحقیق اور تفکر وتدبر کی صلاحیت کو پروان چڑھاتے اور ان میں عمل کا داعیہ پیدا کرتے۔

☆ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مدرسوں کا قیام بہت ضروری ہے کیونکہ مدرسے بہت سے لوگوں کی بخشش کا سامان ہوتے ہیں...... بہت سوں کی نجات کا ذریعہ اور بہت سوں کے گناہوں سے بچنے کا ذریعہ......اور کفارہ ہوتے ہیں۔

مولانا نے ہمیں دینی مدارس سے محبت کرنا سکھایا...... مولانا کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم بلاتفریق مسلک ہر دینی مدرسہ سے محبت کرتے ہیں......

☆ مولانا اپنی مادرِ علمی سے بہت محبت کیا کرتے تھے...... وہاں کے قصے سناتے ہوئے کبھی آبدیدہ ہوجاتے تو

کبھی چہرہ ایک انوکھی چمک سے روشن ہوجاتا اور ایک دل آویز مسکراہٹ آپ کے چہرے پر چھا جاتی تھی۔ مدرستہ الاصلاح کے اپنے اساتذہ کا جب کبھی ذکر کرتے تو اس محبت سے کرتے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے......

ہر سال مولانا اپنی زکوٰۃ کا کچھ حصہ مدرستہ الاصلاح کے لیے ضرور نکالا کرتے تھے......میں نے ایک مرتبہ مولانا سے دریافت کیا کہ ''مولانا آپ اپنے ذاتی مدرسہ کو چھوڑ کر مدرستہ الاصلاح کو اپنا تعاون کیوں دیا کرتے ہیں؟'' مولانا کا جواب بہت ہی عمدہ اور خوبصورت تھا......''ہاں! ہم اپنے مدرسہ کا تعاون کرتے ہیں اور آپ اپنے مدرسہ کا تعاون کیجیے۔''

مولانا کی اس بات نے مجھے سمجھا دیا کہ طویل عرصہ گزرنے کے باوجود مولانا کی اپنے مادرِ علمی سے محبت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی......اور مجھے بھی اپنے مدرسہ سے اتنی ہی محبت کرنی چاہیے......تب سے مدرسہ میرے لیے متاعِ حیات بن گیا۔

☆ مولانا شعبۂ فضیلت کو 'حجۃ اللہ البالغۃ' کا درس دیا کرتے تھے۔ جب پڑھانا شروع کرتے تو ہم آپ کے اندر وجد کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ حجت کے درس کا پہلا دن تھا، ہم نے دریافت کیا کہ مولانا یہ مضمون کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ تب آپؒ نے ہم سے چند سوال کیے:

''یہ بتاؤ جی! کہ اللہ نے نماز بندوں پر کیوں فرض کی؟ روزہ کیوں فرض کیا گیا؟ زکوٰۃ کیوں دینا چاہیے؟ قوموں کو شریعت کیوں دی جاتی ہے؟''

ہمیں پتہ تھا کہ مولانا یوں ہی سوال نہیں کرتے پھر بھی ہم نے چھوٹے چھوٹے جواب دیئے کہ ''تاکہ اللہ کی عبادت کریں، تاکہ نیک بنیں، تاکہ جنت کے حقدار بنیں، وغیرہ وغیرہ۔''

ہمارے دماغ اس تہہ تک نہیں پہنچ پائے جہاں تک مولانا ہمیں لے جانا چاہتے تھے۔ اکثر آپ اس قسم کے سوالات کیا کرتے کہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے کیوں نہیں جلایا؟ جبکہ اس کا کام جلانا ہے؟ ۳۱۳ مسلمانوں نے ۱۰۰۰ کفار کو کیسے شکست دے دی؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر زندہ کیوں کر اٹھالیا گیا جبکہ زندہ لوگ اس کی طاقت نہیں رکھتے؟ چند نوجوان سالہا سال غار میں کیونکر زندہ تھے؟ جبکہ یہ ناممکن ہے۔ ساری دنیا ڈوب گئی تو نوح علیہ السلام کی کشتی کیسے بچ گئی؟ چھری کا کام کاٹنا تھا تو پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام پر وہ کیوں نہ چلی؟ دریا نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے راستہ کیوں بنادیا جبکہ ایسا تو کسی دریا نے کبھی نہ کیا؟

ان سوالات پر ہم سب غور وفکر کرنے لگتے پھر بھی ایک ہی جواب دے پاتے:

''اللہ کے حکم سے۔''

مولانا فرماتے: جواب تو اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ سب واقعات فطرت سے ہٹ کر ہیں، مافوق الفطرت واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں؟ اور کیسے؟ اس پر سب خاموش تھے۔

تب مولانا نے جواب دیا کہ یہ معجزات اُسی وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں جب ساری دنیا سے حق سمٹ کر ایک گروہ یا چند لوگوں یا صرف ایک فرد میں آجائے۔ تب حق کی حفاظت کے لیے، حق کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ فطرت سے ہٹ کر اپنی قدرت کے اقسام قبض، بسط، اہالہ اور الہام میں سے کسی ایک کو استعمال کرتے ہیں۔ تب جا کے ''كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ'' جیسے معجزات پیش آتے ہیں۔

مولانا حجت کے یہ سوالات جب کرتے تو ہمارے دماغ کی رگیں تک کھل جاتیں۔

آپؒ نے اپنی استغراقی کیفیت کے ساتھ ہم پر اللہ کی قدرت کا ایسا رعب بٹھا دیا کہ ہر دل خدا کی شانِ بادشاہی کا معترف ہو گیا۔ ہم اللہ کی کبریائی کے گواہ بن گئے۔ ایسا ایمان دلوں کو میسر آیا کہ اللہ کی قدرت کے آگے باطل خداؤں کی بناوٹی شان وشوکت کی قلعی کھل گئی۔

اسی سبب مولانا کے شاگردوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر اُس بت سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں جو ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' کے غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

☆ بڑی سے بڑی بات اور نصیحت اس نرمی، سادگی اور اختصار کے ساتھ کرتے کہ سامع کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی......اسی مناسبت سے ایک واقعہ آپ کی نذر ہے۔

ایک تحریری مقابلے میں مجھے انعام اول حاصل ہوا۔ مولانا کو خوش کرنے کی غرض سے جیسے ہر طالبہ اپنا انعام مولانا کو دکھاتی ہے میں بھی اس خوش خبری کو لے کر مولانا کے یہاں پہنچی......مولانا اور چاچی (مولانا کی اہلیہ) دونوں بہت خوش ہوئے۔ مولانا نے مجھے خوش ہو کر سو روپئے کا نوٹ دیا اور چاچی نے پانچ سو روپئے کا نوٹ دیا۔ یہ انعام میرے لیے حاصل شدہ انعام سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ مولانا کا دیا ہوا ایک یا دو روپیہ بھی ہم طالبات کے لیے لاکھوں سے قیمتی ہوا کرتا تھا، جس کو ملتا وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی، میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ میں اپنے ساتھیوں کو نوٹ دکھا کر فخریہ ابرو چڑھا رہی تھی۔ فاتحانہ مسکراہٹ چہرہ پر چھا گئی تھی۔ ایسا لگ رہا

تھا کہ اصل انعام تو اب ملا ہے۔

تب مولانا نے کہا: ”تمہیں تو اتنا سارا پیسہ ملا ہے جی، ان پیسوں کا تم کیا کروگی؟“

میں نے بتایا: ”مولانا میں ان پیسوں کو خرچ نہیں کروں گی ہمیشہ اپنے پاس محفوظ رکھوں گی۔“

مولانا نے کہا: ”کیا یہ ممکن ہے؟“

میں خاموش تھی تب آپ نے ایک ایسا جملہ کہا جس نے میری سوچ کو ایک نیا رخ دیا۔ آپ نے کہا: ”صدقہ کردو۔“

دو لفظوں سے بنا یہ جملہ مجھے بہت کچھ سکھا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ اگر ہم اپنی قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں، صدقہ کریں، تب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گی۔

☆ مولانا کی تربیت کا یہ انوکھا انداز تھا کہ آپ طالبات کو کوئی ٹاسک دیا کرتے تھے...... جیسے کہ مولانا نے مجھے دورانِ تعلیم ہی کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کو کہا تھا...... مولانا بہت اہمیت سے مجھے عنوان دیا کرتے تھے، تب مجھے بھی یہ لگنے لگا تھا کہ میرے اندر یہ صلاحیت ہے اور پھر میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتی اور مولانا سے اس کی اصلاح کرواتی...... مولانا میری ان ٹوٹی پھوٹی کچی کہانیوں کو بھی بہت اہمیت سے پڑھتے تھے، اس کی خامیوں کی طرف لطیف اشارہ کرتے اور اس کی نظر نہ آنے والی خوبیوں کی تعریف کرتے اور ان کہانیوں کو اخبار میں ڈلوانے کی بات کرتے تھے......

کسی بزرگ کا بچوں کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اہمیت دینا، ان کی خوبیوں کی تعریف کرنا، اور خامیوں کو دور کرنے میں رہنمائی کرنا...... بچوں میں خوداعتمادی کو پروان چڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے...... مولانا کی ان کوششوں کے سبب مجھ میں کہانیاں لکھنے کا شوق پروان چڑھا...... الحمدللہ جو آج بھی باقی ہے......

☆ مولاناؒ کا روز کا معمول تھا کہ آپ جماعت میں داخل ہوتے تو ہم طالبات سے اخبار بینی کے تعلق سے پوچھا کرتے تھے...... یہ بھی تربیت کا ایک طریقہ ہے کہ شاگرد کو حالات حاضرہ سے واقف رہنے کا عادی بنائیں۔

☆ مولاناؒ کی یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ آپ کی طالبات کسی فیلڈ میں دوسرے مدارس کے طلباء وطالبات سے کسی طور پر کم نہ ہوں...... ایک مرتبہ مدرسے کی جانب سے جلسے کے انعقاد کے لیے گرانڈ فنکشن ہال کی بکنگ کروائی جارہی تھی...... اس فنکشن ہال کا مالک غیر مسلم تھا...... اسے اردو کم آتی تھی، اور وہ کسی طور Amount میں کمی نہیں کررہا تھا...... مولانا حضرات اسے اپنی بات سمجھا نہ پارہے تھے۔ اس وقت کچھ

طالبات اور معلمات بھی موجود تھیں تب ایک طالبہ نے آگے بڑھ کر انگلش اور تلگو میں اسے اپنی بات سمجھائی اور اسے Amount کم کرنے پر آمادہ کرلیا......وہ حیران ہوا تھا کہ مسلم لڑکی نے کیسے تلگو اور انگلش میں بات کی، وہ بھی مدرسہ کی طالبہ۔

اونر نے تب مولانا سے کہا:

''سر آپ کی یہ اسٹوڈنٹس بہت زیادہ Talented ہیں یہ آپ کے اسکول کو بہت اوپر لے جائیں گی۔''

اس موقع پر مولانا کے چہرے پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور آنکھوں میں جو پانی چمکنے لگا تھا وہ وہاں موجود ہم تمام طالبات کے لیے دنیا و مافیہا سے قیمتی تھا......

دنیا نے تو محض ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ جو اپنی بیٹیوں، بیٹوں، پوتا، پوتی کی تعریف سن کر خوش ہوا کرتے ہیں اور انہی میں مگن رہتے ہیں لیکن میرے مولانا نہ جانے کس جہاں سے آئے تھے کہ جو اپنی طالبات، ملت کی بیٹیوں کی تعریف پر خوش ہوا کرتے تھے اور آپ کا سیروں خون بڑھ جایا کرتا تھا......!!

☆ جب کسی جلسے میں طالبات عنوان کے مطابق نظمیں پڑھا کرتیں تو مولانا حیرت اور خوشی سے سوال کرتے...... کہ بچیاں موقع کے لحاظ سے نظمیں کیسے پڑھ لیا کرتیں ہیں......اسی طرح طالبات کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوا کرتے اور ان کی کارکردگی کو سراہتے۔

☆ دورانِ درس ہم نے مولانا سے سوال کیا''مولانا کیا وجہ ہے کہ آج مسلمانوں کی کوئی کوشش، کوئی کارکردگی بارآور نہیں ہو پارہی ہے؟ کوئی دعوت، کوئی تبلیغ ثمر آور نہیں ہو پارہی ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مولانا کچھ دیر خاموش تھے پھر فرمایا:

مجاہدو! اسکو یاد رکھنا یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ
جہادِ حق کارگر نہ ہوگا اگر نہ ہو گریۂ شبانہ

ہم نے پوچھا کہ''گریۂ شبانہ سے اس کا کیا تعلق؟'' مولاناؒ نے فرمایا:''راتوں کو اپنے رب کے آگے دعاؤں میں گریہ وزاری نہ ہو تو......کوئی کام، کوئی مشن، کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ دعا کے ذریعہ اللہ کی مدد نہ مانگی جائے، اللہ کے حضور گریہ وزاری نہ کی جائے......''

☆ مولاناؒ خود بھی اواہٌ منیب تھے۔ اپنے رب کے ذکر اور اس کی محبت میں رونے والے......راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرنے والے......

2021 میں رمضان المبارک کے موقع پر ہمارے لیے مولانا کے گھر طاق راتوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ وہ

دن تھے کہ جن میں مولانا سخت علیل تھے بستر سے بغیر سہارے کے اٹھ نہ پاتے تھے...... اس وقت ساری طالبات تراویح، تلاوتِ قرآن اور ذکر واذکار میں مصروف تھیں کہ اچانک رات کے 3 بجے دیوان خانہ سے **لا الٰہ الا اللہ** اور **سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم** کی صدا بلند ہونے لگی...... اس سناٹے میں وہ آواز روح تک کو کپکپا گئی...... اک سحر چھا گیا......

دریافت کرنے پر پتا چلا کہ مولانا محترمؒ کا یہ روز کا معمول تھا کہ آپ تہجد کے وقت بیدار ہوجاتے اور بآواز بلند کلمہ کا ورد کرتے ہیں، جبکہ زبان سے الفاظ ادا کرنا مشکل تھا۔ پھر بھی اٹھ کر ذکر واذکار میں مصروف ہوتے۔ تھکن کے خیال سے اگر کوئی روکنا بھی چاہتا تب بھی نہ رکتے۔ اکثر نماز کی مخصوص کرسی پر بیٹھے ہوتے اور گھنٹوں گزر جاتے......

آپ کا وہ کمرہ اور آپ کی وہ مخصوص کرسی زبان حال سے آپ کے چلے جانے کو بیان کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ابھی وہ صدا وہاں سے پھر گونجے گی۔

☆ مولاناؒ آخری وقتوں میں جب کبھی مدرسہ تشریف لاتے تو مدرسہ میں ہلچل پیدا ہوجاتی، 5/ستمبر، بروز پیر 2022ء مولاناؒ آخری بار مدرسہ تشریف لائے، ہم سب خوشی خوشی آپ سے ملنے دوڑ پڑے...... مولاناؒ آئے تو ہم لوگ صدر معلمہ صاحبہ کے ہمراہ آپ کے آفس میں گئے۔ ہم کافی دیر تک مولانا کے سامنے کھڑے تھے...... لیکن مولانا نے ہمیں نہیں پہچانا...... جب بہت دیر گزر گئی تو بتایا گیا کہ صدر معلمہ صاحبہ اور معلمات ملاقات کو آئی ہیں۔ تو مولاناؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... اس وقت مولانا کی بات چیت بہت دھیمی تھی...... اور آپ بہت کمزور ہو چکے تھے...... اور ہر کسی سے آخری کلمات کے طور پر معافی، درگزر کرنے اور دعا کی گزارش کرنے لگے تھے...... اسی لیے آپ نے صدر معلمہ صاحبہ سے فرمایا:

''معاف کرنا، ہم نے آپ کو پہچانا نہیں، ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کرنا......''

اور آپ کے آنسو بہہ نکلے...... ہم سب بھی آپ کے ساتھ آبدیدہ ہوئے...... پھر مولانا نے ہمیں نصیحت فرمائی...... جو آخری نصیحت تھی...... وہ یہ کہ ''جو پڑھو، مضبوطی کے ساتھ پڑھو۔''

اُس دن جتنی طالبات ملاقات وعیادت کو آئیں اُن سب کو آپ نے یہی نصیحت فرمائی کہ ''جو پڑھو مضبوطی کے ساتھ پڑھو۔''

☆ مدرسہ کی جانب سے ہر سال طالبات کے اصرار پر پکنک جانے کا اہتمام کیا جاتا ہے...... ہر سال مولانا اپنی نگرانی میں معلمات اور طالبات کو لے جایا کرتے تھے۔ ہم کبھی مولانا کی غیر حاضری میں پکنک نہیں گئیں

سوائے اس سال کے جس سال مولانا سخت علیل تھے، سال 2022ء کی پکنک مولانا کی غیر حاضری میں ہوئی۔ جب مولانا کو پتا چلا کہ طالبات پکنک پر جانے کی اجازت چاہ رہی ہیں تو آپ نے اپنی ذمہ داری دو اساتذہ کرام کو دی اور طالبات کو مولانا حضرات کی زیر نگرانی روانہ کیا۔

مولانا کو طالبات کی حفاظت کی اتنی فکر تھی کہ آپ وقتاً فوقتاً گھر سے فون کرواتے رہے، بچیوں کی خیریت دریافت کرواتے اور وقت پر واپس لوٹنے کی ہدایات کرتے رہے......

مولانا کو احساس ذمہ داری چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا......مولانا کی بے چینی کو دیکھ کر ہم سب اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کرنے لگے اور طالبات کی خوب دیکھ بھال کی۔

مولانا کے بغیر اُس پکنک پر غیر محفوظ ہونے کا احساس تو ضرور تھا لیکن یہ یقین تھا کہ ہم جہاں کہیں ہوں مولانا کی دعاؤں کے حصار میں ہوں گے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ہمارے اطراف دعاؤں کا حصار باندھنے والا چلا گیا۔

مولانا! آپ کہاں چلے گئے......؟ آپ کے بغیر آپ کی دعاؤں کے بغیر آپ کا مدرسہ اور آپ کی طالبات خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہی ہیں۔

آپ کے بعد بھی یہ احساس ہمیشہ زندہ رہے گا کہ آپ نے مدرسہ کی طالبات کی حفاظت کی ذمہ داری ہم سب کے حوالے کر دی تھی۔ ان شاء اللہ ہم اس ذمہ داری کو اپنی طاقت بھر، جہاں تک بن پڑے ادا کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو......آمین!

☆ میں نے 2021ء میں لاک ڈاؤن کے بعد اپنی ساتھیوں کے لیے پینٹنگ مقابلہ منعقد کیا تھا۔ جس میں مختلف علاقوں کی ساتھیوں نے حصہ لیا تھا۔ ہماری یہ عادت تھی کہ اپنی ہر سرگرمی سے مولانا کو آگاہ کرتے تاکہ مولانا خوش ہوں۔ ہر بار کی طرح اس موقع پر بھی مولانا کے پاس پینٹنگز لے کر پہنچ گئے۔ مولانا نے اس وقت کہا کہ ''عائشہ! تو اپنے آپ میں ایک تحریک ہے جی۔'' میں اپنے مولانا کی زبان سے یہ کلمات سن کر خوشی کے ساتویں آسمان پر پہنچ چکی تھی۔ کسی بھی شخص کی تعمیر و ترقی میں حوصلہ افزاء کلمات و القابات بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ہم پینٹنگز دکھانے لگے جو کہ قرآنی آیات، خلافت کی واپسی، فلسطین، مسجد اقصیٰ، مسجد بابری، شام کی دردناک صورتحال، اتحادِ امت، CAA،NRC جیسے موضوعات پر بنائی گئی تھیں۔

مجھے لگا کہ میں مولانا کو خوش کرنے اور بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ اس وقت میں نے آپ کو بہت غمگین اور نڈھال کر دیا ہے۔ مولانا ایک ایک پینٹنگ دیکھ کر روتے جا رہے تھے۔ کیونکہ یہ وہ عناوین تھے جو تا زندگی مولانا کے درد دل کو بڑھاتے رہے تھے۔

جامعہ ہذا کے معاونین

مولانا اپنے مدرسہ کے معاونین کے بے حد ممنون تھے...... مولانا کی نصیحت تھی کہ معاونین سے ہمیشہ ربط میں رہیں...... آپ ان حضرات کے لیے ہمیشہ دعا گو رہا کرتے تھے...... جو معاونین ملاقات کے لیے آتے تو ان کی ضیافت کی تلقین کرتے تھے......

مولانا نے مدرسہ کی جانب سے یہ اعلان کروایا تھا کہ اگر کوئی معاون کسی طالبہ کی سفارش کرتے ہوئے مدرسہ میں داخلہ کروائے گا تو اُس طالبہ کی فیس میں کمی کی جائے گی یا اُس طالبہ کی فیس معاف کر دی جائے گی...... اس طرح معاونین خوش ہوئے اور کئی لوگوں نے مدرسہ میں بچیوں کا داخلہ کروایا...... (اس چیز کو ہم نے آج بھی جاری رکھا ہے)۔

مولانا خلوص وللّٰہیت سے کئے جانے والے کاموں کے قدردان تھے...... اللہ ان معاونین کی پُرخلوص کوششوں کو قبول فرمائے، ان کو جزائے خیر سے نوازے اور ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور فرمائے۔ آمین!

تواضع وانکساری کے پیکر

27/مارچ 2022ء کو مدرسہ کی جانب سے جلسہ استقبالِ رمضان منعقد کیا گیا۔ مولانا اپنی صحت کی ناسازی کے باوجود بھی جلسہ گاہ تشریف لائے، جلسہ کی کنوینر معلمہ نے اناؤنس کیا:

اب میں ناظم جامعہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب سے بہت ہی ادب کے ساتھ التماس کرتی ہوں کہ آپ اپنی قیمتی نصیحتوں سے ہم طالبات اور خواتین کو مستفید کریں:

ہم نے ہر منزلِ امکاں پہ جلائے ہیں چراغ
ورنہ ہر قافلہ راہوں میں بھٹکتا ہوتا

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب وہ شخصیت ہیں جو صاحبِ قلم بھی ہیں، صاحبِ علم بھی اور جن کے ہزاروں طلبہ وطالبات صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور علم کا چراغ روشن کر رہے ہیں۔ مولانا کی دی ہوئی تعلیمات سے فیض اٹھا کر ساری دنیا میں اسلام کے پیغام کو عام کر رہے ہیں۔ اور یہ ساری چیزیں مولانا بڑے ہی صبر، سکون اور خلوص کے ساتھ کر رہے ہیں۔ میں مولانا کی صحت کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو صحت کاملہ اور عاجلہ عطا فرمائے۔ اور ہمارے سروں پر مولانا کا سایہ تا دیر قائم رکھے۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

اس کے بعد مولانا کو مائک دیا گیا۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جتنا نام میرا لیا جارہا ہے اتنا میں لائق نہیں ہوں، اب ایک ہی مدرسہ چل رہا ہے...... یہ سب اللہ کے فضل اور حیدرآباد کے لوگوں کی نوازش ہے کہ مدرسہ چل رہا ہے...... ورنہ میں کہاں اور یہ کام کہاں؟

میں یہ سوچتا ہوں کہ حیدرآباد کی نوازش اور ہو اور یہ کہ یہ کام اور بڑھے اور مدارس کھلیں، میری طرف سے آپ اللہ سے گزارش کریں، اللہ سے درخواست کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس کام کو جس قدر بھی ہو قبول فرمائے اور نیک توفیق عطا فرمائے۔

میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ لوگ میرا ساتھ دیں اور اپنی دعاؤں میں شامل رکھیں۔ بس یہی چند لفظ تھے میرے پاس جو میں نے آپ کو دے دیئے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ''

مدرسہ اور اس کے متعلقین سے اٹوٹ محبت

آخری وقت مولانا کا کل اثاثہ ''الاصلاحیۃ'' کی معلّمات اور طالبات تھیں۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا یا کسی کے گھر فوتگی کا سنتے تو آپ بے حد بے چین ہوجاتے۔ دعائیں کرنے لگتے، عیادت کے لیے اپنی بیٹیوں کو بھیجتے، چھوٹے بچوں سے بھی بزرگوں کی طرح تعزیت کرتے۔

میری خالہ اور پھوپھی کے انتقال کا سنا تو مجھے بلا کر پرسہ دیا اور نم آنکھوں کے ساتھ میرے مرحومین کے لیے مغفرت کی دعائیں کیں۔ مجھے تب پتہ چلا کہ حقیقی تعزیت کیا ہوتی ہے۔ اللہ آپ کے بے لوث جذبوں، اعمال اور دعاؤں کو قبول فرمائے آمین!

☆ ایک مرتبہ سرما کے موسم میں مولانا کو کم سنائی دے رہا تھا، میں نے سلام کیا تو آپ عادت کے مطابق کچھ دیر خاموش رہے۔ میں نے سمجھا کہ آپ نے نہیں سنا ہے...... میں نے پھر سے سلام کیا تو جواب دیا۔ میں نے کہا مولانا دعاؤں میں یاد رکھئے۔ مولانا نے کہا: کیا جی؟ میں نے کہا: مولانا ہم سب لوگوں کے لیے دعا کیجیے۔ پھر سے مولانا نے کہا: کیا جی؟ میں پھر سمجھی کہ مولانا کو سنائی نہیں دے رہا ہے، پھر سے میں نے کہا: مولانا ہمارے لیے دعا کیجئے۔ تب آپ نے کہا: ''اللہ تمہیں اچھا رکھے، صحت و عافیت سے رکھے۔'' اس کے بعد میں چلی گئی...... کچھ دیر بعد باجی کا فون آیا...... وہ پوچھ رہی تھیں کہ تم نے ابا سے کیا کہا ہے؟ میں نے کہا: ''بس دعا کے لیے کہا تھا۔ اور تو کچھ بات نہیں ہوئی۔''

باجی نے کہا: ''تمہارے جانے کے بعد سے پریشان ہیں، رو رہے ہیں کہ عائشہ کو کیا ہوا ہے کہ وہ بار بار دعا کے لیے کہہ رہی تھی۔''

تب مجھے پتا چلا کہ مولانا جو مجھ سے ''کیا جی'' کہہ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ ''تم کو کیا ہوا ہے جی؟'' اس طرح کی فکرمندی، اس طرح کی خیرخواہی اب دنیا میں مجھے کہیں نہیں ملے گی...... اس محرومی کے ساتھ ہم کیسے جئیں یااللہ!

☆ بیماری کے دنوں میں جب مولانا مدرسہ نہیں آپارہے تھے، طالبات، اساتذہ کے علاوہ مدرسہ کے واچ مین اور ڈرائیور حضرات تک مولانا سے بار بار ملنے جاتے تھے، ان کی عقیدت اس قدر تھی کہ وہ اپنے سر پر مولانا کے دست مبارک رکھواتے اور دعا کرواتے تھے ان کا یقین تھا کہ مولانا کی دعاؤں سے ان کی مشکلیں، مصیبتیں اور تکلیفیں دور ہوجاتی ہیں۔

مولانا کا دل ہمیشہ مدرسہ میں لگا ہوتا تھا۔ مولانا کے آخری ایام تھے، ہاسپٹل میں آپ کی عیادت کو سارے لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا کسی سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا، آپ بے چین و بے قرار لگ رہے تھے۔ میں نے کئی بار آپ کو پکارا لیکن آپ نے توجہ نہیں دی۔

میں نے بہت ساری سورتوں اور دعاؤں کو پڑھ کر دم کیا۔ میں تذبذب میں تھی کہ مولانا میری آواز سن پارہے ہیں یا نہیں۔ تب میں نے آپ کی ہمت بڑھانے کے لیے کہا مولانا آپ کو مدرسہ میں سب یاد کر رہے ہیں۔ طالبات نے سلام کہا ہے اور بڑے ضبط سے کہا، ان شاء اللہ آپ جلد ٹھیک ہوجائیں گے اور دوبارہ مدرسہ آنے لگیں گے۔

مولانا مجھے دیکھتے رہے آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر چہرے پر لڑھک آیا...... میں سمجھ گئی کہ اس بے بسی کی کیفیت میں بھی آپ مدرسہ اور طالبات کو یاد کر رہے ہیں۔

یادیں امانت ہیں

ہماری مجلسیں جمتیں تو اس میں صرف آپ کی جدید تحریروں پر گفتگو ہوتی کہ آج آپؒ نے کس مسئلے پر کیا لکھا، آپ کی تقریروں کی بات ہوتی کہ مولانا نے کس ٹاپک پر کیا کہا...... اکثر ہم انگشت بدنداں ہوتے کہ مولانا نے اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی۔ جبکہ دیگر علماء اس پر ایک لفظ بھی کہنے سے کترا رہے ہیں۔ جیسے پیارے نبیؐ کی شان اقدس کا مسئلہ ہو یا پردہ پر پابندی کا مسئلہ ہو۔ بابری مسجد کی بازیابی کا مسئلہ ہو یا طلاق ثلاثہ سے لے کر شریعت میں ترمیم، CAA,NRC کا مسئلہ ہو، ہر موضوع پر آپ کچھ نہ کچھ لکھتے اور گفتگو کرتے نظر آتے۔ تو ہماری دلچسپی اور بڑھ جاتی۔ ہم جلدی جلدی اسے یاد کر لیتے۔

آپ ملک کی بڑی بڑی مسلم تنظیموں، جماعتوں کو، چاہے وہ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' ہو یا ''جماعت اسلامی ہند''، ''تبلیغی جماعت'' ہو یا ''جمعیت اہلِ حدیث'' سب کو جھنجھوڑتے اور عمل پر ابھارتے......تو ہم آپ کے سارے الفاظ محفوظ کر لیتے۔

مولانا کے بعد بھی جب ہم آپ کی باتیں یاد کرتے ہیں تو گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ ماضی کی یادیں اتنی قیمتی ہیں کہ ہم زندگی بھر اسے اپنے قیمتی اثاثہ کے طور پر محفوظ رکھیں گے۔ شاید ہی آج کے زمانے میں کسی شاگرد کے پاس ایسی قیمتی یادیں ہوں!

بسترِ مرگ پر ہوش وحواس میں جو آخری جملہ مولانا نے مجھ سے کہا وہ تمام علماء میں احساسِ ذمہ داری کو جگانے کے لیے کافی ہے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے جی! لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ سے کوئی کام نہیں ہو پا رہا ہے......جبکہ کام بہت باقی ہے......مدرسہ کو بھی نہیں جا پا رہا ہوں......''

میں اس وقت خاموش کھڑی رہ گئی، آپ کی تسلی کے لیے میرے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ آپ کی بے چینی دیکھ کر آنسو پھندہ کے مثل گلے میں اٹک گئے تھے......آپ کی تڑپ، آپ کا احساسِ ذمہ داری دیکھ کر اپنے آپ میں شرمندگی ہو رہی تھی۔

تب میری ایک ساتھی نے کہا: ''مولانا ہر جگہ آپ نے مدرسوں کا جو جال بچھایا ہے اُس میں آپ ہی کا کام تو چل رہا ہے۔ آپ ہی کام کر رہے ہیں۔ آپ کا کام رکا نہیں ہے۔''

تب دل کو کچھ تسلی ہوئی تو فرمایا: ''مدرسوں کا کام چلتے رہنا چاہیے۔ رکنا نہیں چاہیے۔''

مولانا کے اہلِ خانہ

. . . ھم القوم لا یشقیٰ بھم جلیسھم۔ (بخاری)

ترجمہ: یہ (اہلِ ذکر) وہ لوگ ہیں کہ ان کے ہم نشین بھی شقی نہیں رہتے۔''

مولانا محترمؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین مخلص خاندان عطا کیا ہے......آپ کے خاندان کا ہر فرد اخلاق کے کمال کو پہنچا ہوا ہے......ایک ایسا خاندان کہ جس نے مولانا کا ہر قدم پر ساتھ دیا......ہر قسم کے حالات میں مولانا کے لیے ڈھال بنا رہا......مولانا جس چیز کو چاہتے اس چیز کو سارا خاندان اولین ترجیح دیتا......اس کے لیے جی جان لگا دیتا......مولانا اگر خاص مقصد کے لیے اللہ کی جانب سے چنے گئے تھے تو یہ خاندان بھی اللہ نے حق کے لیے منتخب کیا ہے......مولانا کی اہلیہ، مولانا کی بیٹیاں خلوص ومحبت کا مجسم نمونہ ہیں......روزِ اول سے لے کر آج

تک تعلیم حاصل کرنے والی مدرسہ کی طالبات اس بات کی معترف ہیں کہ مولانا کے خاندان سے مل کر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے...... وہی خلوص، وہی بے لوث محبت...... غرض ایک ایسا خاندان کہ جو تن من دھن سے اپنے آپ کو دین اسلام کے لیے وقف کر چکا ہے۔

پاک دل و پاکباز

چاچی: مولانا محترم کی اہلیہ محترمہ جنھیں ہم طالبات چاچی کہتی ہیں...... جو ساری طالبات کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتی ہیں...... ایسے کہ ہر طالبہ یہ تصور کرتی ہے کہ چاچی مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہیں...... غرض چاچی سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اسی لیے میرا یہ مضمون چاچی کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا...... مولانا محترم کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی گوشہ، کوئی لمحہ، چاچی کے نام کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا......

کبھی چشمِ تصور سے دلوں کے حکمراں دیکھو

ہماری چاچی وہ عظیم ہستی ہیں کہ جن کے ایمان ویقین کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالمِ نہ ہوتے ہوئے بھی چاچی کا ایمان عالموں کے ایمان پر بھاری ہے، گرچہ یہ عالم نہیں ہیں لیکن یہ حقیقی اور معنوی دونوں طور سے عالموں کی ماں ضرور ہیں...... ہم نے ہر معاملہ میں انہیں ثابت قدم، صبر واستقامت کی اعلیٰ مثال کے طور پر پایا ہے۔ زندگی کے ہر کٹھن مرحلہ میں آپ مولانا کو دلاسہ دیتی ہوئیں اور ہمت بڑھاتی ہوئیں حضرت خدیجہؓ کی تصویر پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ چاچی محلے کے ہر گھر کی خبر گیری کرتی ہیں...... اوران کی ضروریات کا خیال رکھتی ہیں...... آپ اپنے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ حیدرآباد میں بھی ایک محبوب شخصیت کا مقام رکھتی ہیں...... ہماری ہر دل عزیز چاچی......

مولانا اور چاچی حیدرآباد کے جس جس محلے میں رہائش پذیر رہے، اُن محلوں کے لوگ سالوں سے ان حضرات کے کریمانہ اخلاق و کردار، انکساری اور سخاوت کے معترف ہیں...... ان پاکیزہ نفوس نے اپنے کسی پڑوسی کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی...... اس کے برعکس پڑوسیوں کی خبر گیری کرنا، ہر ایک کی دامے، درمے، سخنے مدد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا...... یہ آسانی بانٹنے والے لوگ ہیں...... رحمن کے بندوں پر رحیم ہیں...... اللہ ان کی تمام نیکیوں کو قبول فرما اوران سے راضی ہوجا......

چاچی ایک ایسی خاتون ہیں کہ جو ہر کسی کی مجبوری کو سمجھتی ہیں، ہر ایک کی فکر کرنے والیں، ہر ایک کو محبت و شفقت دینے والیں...... آپ گھر کے اور ہاسٹل کے ملازموں پر بے حد کریم ثابت ہوتی ہیں...... سالوں سے ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ ماشاء اللہ آپ کے اخلاق میں کوئی تبدیلی نہیں آئی...... محلے میں کسی کے گھر شادی ہوتو

پُرجوش ہوجاتی ہیں...... کسی ملازمہ کی بیٹی کی شادی کا سن لیتی ہیں تو اس کی ساری تیاری اپنے ہاتھوں سے کرتی ہیں...... سینکڑوں افراد کا کھانا اکیلے، بلا کسی تکلیف کے بنالیا کرتی ہیں، ماشاءاللہ......

جب کبھی ہاسٹل کے ملازمین ناغہ کرتے ہیں تو آپ بلا کسی تردد کے اکیلے ہاسٹل کی طالبات کے لیے پکوان میں لگ جاتی ہیں...... جس کی وجہ سے طالبات کی خواہش ہوتی کہ پکانے والی خاتون ہر دوسرے دن غیر حاضر ہوجائیں تاکہ ہم چاچی کے ہاتھ سے بنے پکوان کھائیں......

کبھی کسی بچہ کا کپڑا سلتی نظر آتی ہیں تو کبھی کسی کے گھر اپنی ہانڈی کا سارا کچھ بھیجتی نظر آتی ہیں، چاہے گھر کے لوگ بھوکے رہ جائیں...... چاچی کی فیاضی سے مولانا بہت خوش ہوا کرتے تھے...... آپ کی جلد بازی، آپ کے کام دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے...... چاچی ہر ایک کی خوشی میں خوش ہونے والی اور ہر ایک کے غم میں غمگین ہوجانے والی خاتون ہیں۔ مولانا کے بعد چاچی بالکل خاموش رہنے لگی ہیں اور اپنے کو کاموں میں مصروف رکھنے لگی ہیں...... اللہ چاچی کو صبر دے، آمین!

مولانا اور چاچی کے لیے پانچ ہونہار، لائق وفائق بیٹیوں کی صورت میں جنت موجود ہے، اس کے علاوہ یہ مدرسہ کی بے شمار طالبات کی تعلیم وتربیت کے ذریعہ جنت کے حقدار بن چکے ہیں...... یہ وہ عظیم ماں باپ ہیں کہ جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا جواں سال بیٹا قربان کیا...... میرے مولانا حضرت ابراہیمؑ کی طرح اور چاچی حضرت ہاجرہؑ کی طرح صبر واستقامت کے پہاڑ بنے رہے...... اور بیٹے نے اسماعیلؑ سنت کو زندہ کیا......

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارْ

اس کی قسمت پہ رشک آسماں بھی کرے
جس کو بس اپنے رب کی رضا چاہیے

ہم نے چاچی کی زبانی اس واقعہ کو کئی مرتبہ سنا ہے کہ اس ماں نے اپنے بیٹے کے لیے رب العالمین سے شہادت کی دعا مانگی تھی...... اور وہ قبول ہوئی...... اس واقعہ کو سن کر ہر بار ایمان ویقین کی کیفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے...... چاچی ایک جذب کے عالم میں یہ قصہ سنایا کرتی ہیں...... ایسا لگتا ہے کہ کسی مافوق الفطرت کہانی کا کوئی سین ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے...... ہوا یوں:

حج کو جانے والی ماں نے اپنے لختِ جگر، نورِ نظر سے (جو کہ پانچ بیٹیوں کے بعد پہلی نرینہ اولاد تھی) پوچھا کہ ’’حج سے واپسی پر تمہارے لیے کیا لاؤں؟‘‘

اس وقت بیٹے نے مسکرا کر کہا کہ ’’اماں میرے لیے دعا کرنا......‘‘

ماں نے کہا کہ ''بیٹا! کیا دعا مانگوں؟''

آنکھوں میں آنسو بھر کے بیٹے نے کہا ''اماں میرے لیے کعبۃ اللہ کا غلاف پکڑ کر شہادت کی دعا مانگنا......''

ماں نے بے چین ہوکر بیٹے کو دیکھا...... ''ایسے کیوں کہہ رہے ہو......''

بیٹے نے کہا:

میں اسماعیلؑ بنوں، تو ہاجرہؓ بن کر دعائیں کر
شہادت کے لیے تو دل بڑا بے چین ہوتا ہے

یہ راز و نیاز ماں اور بیٹے کے درمیان ہوتے رہے اور آسمانوں پر تقدیر لکھی جا چکی تھی۔ اس کے بعد جب ماں حرم شریف میں پہنچتی ہے کعبۃ اللہ پر پہلی نظر پڑتی ہے تو بے اختیار بیٹے کی خواہش یاد آتی ہے وہ دوڑتی ہوئی کعبۃ اللہ کے روبرو آتی ہے......آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ کعبۃ اللہ کا غلاف پکڑ لیتی ہے اور اپنے رب کے حضور فریاد کرتی ہے کہ ''اے اللہ! میرے بیٹے کو اپنے راستے میں قبول فرما......میرے مجاہد کو شہادت نصیب فرما......''

اس عظیم ماں کے لبوں سے نکلی ہوئی دعا کو رب کائنات قبول کر لیتا ہے......اس کے بیٹے کو اپنی جنت الفردوس کے لیے چن لیتا ہے اور اپنے عرش کے سائے میں جگہ دیتا ہے......

تو ماں کہتی ہے:

میرے لختِ جگر، نورِ نظر جاؤ خدا حافظ
محافظ ہو تم مسلم قوم کے جاؤ خدا حافظ
ملوں گی تم سے جنت میں انشاء اللہ خدا حافظ

ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملے...... چاچی جو اپنے بیٹے کی شادی کے ارمان سجا رہی تھیں......اسی وقت رب ذوالجلال نے مجاہد بھائی کی شہادت کا جام بھیجا اور اپنے پاس بلا لیا۔

یہ داستاں ہے میرے دوست ایسے لوگوں کی
جو اپنے گھر میں بھی رہ کر حقیر سمجھے گئے

مجھے یقین ہے اپنے خدا کی نصرت پر
میں مر گیا بھی تو یہ سلسلہ نہ ٹوٹے گا

یہ ترانہ مجاہد بھائی کا پسندیدہ ترانہ تھا، جو وہ اکثر بڑی آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ ترانہ ہمیں آج بھی یاد

ہے جو مولانا کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کا ترجمان ہے۔ وہ بیٹا جو آپ کا حقیقی جانشین تھا، وہی عزم و استقلال، وہی رعب و دبدبہ، وہی استقامت اور امت مسلمہ کے مستقبل کی فکر، امت کو ذلت کے راستوں سے بچانے کی فکر، وہی لوگوں کو جوڑنے کی فکر، غرض اس کی شخصیت میں ایک ہنگامہ تھا، ایک تحریک تھی وہ مولانا سے دوستانہ گفتگو کرتے نظر آتے......ایسا لگتا کہ جیسے بہت دن بعد کوئی عزیز جگری دوست مل گیا ہو......مولانا ان سے خوب باتیں کرتے، ان کی باتوں پر ہنستے، مسکراتے......اس جیسی گفتگو آپ نے پھر کسی سے نہ کی۔

اس قدر چہیتے، اس قدر محبوب، دوستوں جیسے بیٹے کی شہادت کو سہنا کوئی آسان بات نہ تھی، دل و دماغ کی کیا کیفیت رہی ہوگی!

مدتوں دعاؤں میں مانگا ہوا بیٹا، ربِ کائنات نے واپس لے لیا......پھر بھی اس آزمائش کی گھڑی میں یہ ماں باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہؑ کی طرح جمے رہے...... بیٹے کا جنازہ سامنے رکھا تھا......اس وقت ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا ''اللہ کا شکر ہے اللہ نے میرے بیٹے کو، میرے مجاہد کو شہادت دی، میں نہیں روؤں گی، اللہ میاں! میرا بیٹا جنت میں ہے......''

کوئی کہہ رہا تھا ''ہم کسی کو کچھ نہیں کہتے......نہ اپنے کو کچھ کہتے ہیں نہ گورنمنٹ کو کچھ کہتے ہیں......جس کی چیز تھی......جس نے پیدا کیا تھا وہ لے گیا......''

مولانا کی زندگی کی تین بڑی آزمائشوں میں یہ دوسری آزمائش تھی جس میں آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کامیاب ہوئے......

کہنے اور سننے والوں کے لیے یہ واقعات محض واقعات ہوں گے لیکن جن نفوس پر یہ آزمائش آئی تھی وہ کسی قیامت سے کم نہ تھی......اس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے......ہماری نظروں کے سامنے کوئی سرخرو ہو رہا تھا...... ہر لمحہ، ہر معاملے میں کوئی کامیابی سے امتحانات پاس کرتا ہوا جنت کا حقدار بنتا جا رہا تھا......

مجاہد بھائی کی شہادت کے بعد مولانا پر اندرونی اور بیرونی دباؤ بڑھنے لگا، وہ سخت آزمائش اور کڑے امتحان کا زمانہ تھا۔ بیرونی دباؤ کو دیکھ کر اپنے بھی مولانا پر دباؤ بنانے کی کوشش کرنے لگے اور سطحی چالیں چلنے لگے۔

مجھے اچھی طرح وہ دن یاد ہیں جب میں اپنی ساتھیوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً مولانا کے آفس کے چکر لگاتی رہتی ......مولانا ہر بار تنہا آفس کے ٹیبل پر کہنی ٹکائے ہتھیلیوں پر چہرہ گرائے خاموش بیٹھے نظر آتے، گرم پانیوں سے لبریز وہ آنکھیں ایک نکتہ پر مرکوز ہوتیں۔ مولانا کا یہ حال دیکھ کر میرا دل کٹ جاتا تھا۔ میں نڈھال ہو کر لوٹ آتی تھی...... یہ غم ہمارے لیے اتنا بڑا تھا تو مولانا کی کیفیت کا تو ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے تھے......

چند دن بعد مدرسہ میں پینٹنگ کے مقابلہ کا انعقاد ہوا۔ میں نے رات بھر جاگ کر مولانا کے لیے ایک پینٹنگ بنائی اور صبح سویرے مولانا کے آفس میں اپنی پینٹنگ لے کر حاضر ہوئی، اس وقت آفس میں مولانا محمد صادق قاسمی صاحب مرحوم (جو فقہ کے اعلیٰ اساتذہ میں شمار ہوتے تھے) بھی موجود تھے...... میں نے مولانا ناظم صاحب سے کہا ''مولانا یہ پینٹنگ آپ کے لیے بنائی گئی ہے۔'' مولانا قاسمی صاحب نے وہ پینٹنگ ہاتھ میں لی اور اس پر لکھا شعر پڑھا:

ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو

مولانا قاسمی صاحب بہت خوش ہوئے، خوشی خوشی مولانا کو دکھانے لگے۔

''مولانا! بچی نے آپ کے لیے بنایا ہے۔''

اس پینٹنگ کو دیکھ کر، اس شعر کو سن کر مولاناؒ مسکرائے لیکن وہ مسکراہٹ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

میں تو چھوٹی تھی لیکن پھر بھی میری کوشش تھی کہ مولانا کے دل کو اس پینٹنگ سے کچھ دلاسہ اور کچھ تسلی مل جائے، لیکن بڑے کہلانے والے لوگ مولانا کو دکھ دے رہے تھے۔

مولانا! آپ ان آزمائشوں کو سہتے، صبر کرتے اس دنیا سے چلے گئے لیکن وہ پینٹنگ جو آپ کی زندگی کی عکاس ہے وہ آج بھی آپ کے آفس میں رکھی ہوئی ہے۔ جو ہمیں ہر وقت ان دنوں کی یاد دلاتی ہے اور زبانِ حال سے آپ کی زندگی کو ہمارے سامنے بیان کرتی ہے۔

☆ مولانا نے اپنے گھر، گھرانے کی تربیت اتنی اچھی طرح کی ہے کہ اللہ کے بندوں پر آپ کے افرادِ خاندان، مشفق، رحم دل، مہربان ثابت ہوتے ہیں، ہر موقع پر اتنی مدد کرتے ہیں کہ جتنی کوئی کسی اپنے کے لیے بھی نہیں کرتا۔

2020۔2021 لاک ڈاؤن میں پھیلی ہوئی وبا ''کورونا'' کے مریضوں کے لیے گھر گھر آکسیجن سیلنڈر اور راشن کی مفت تقسیم مولانا کے گھر سے عمل میں آئی تھی۔ مولانا کے حکم پر مولانا کے افرادِ خاندان اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ ''کورونا'' سے ڈر اور خوف کا یہ عالم تھا کہ کوئی قریبی رشتہ دار بھی کسی مریض کی عیادت اور خدمت کے لیے تیار نہ تھا اور لوگ جنازے کو کاندھا دینے کے بھی روادار نہ تھے۔

ایسے حالات میں یہ خاندان اپنی جان خطرہ میں ڈال کر، سود وزیاں کی پرواہ کیے بغیر، لوگوں کی جان بچانے میں لگا ہوا تھا۔ الحمد للہ! مولانا کی اس مدد کی وجہ سے کئی لوگ صحت مند زندگی گزار رہے ہیں اور مولانا کے گھرانے کے لیے دعاء گو ہیں۔

اس موقع پر میری خالہ بیمار ہوئیں۔ باوجود بڑے خاندان کے کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ میرے فون کرنے پر مولانا کے نواسے عزّام اور غانم آکسیجن سلنڈر لے کر وہاں پہنچے، اور اس طرح اُن کی جان بچ گئی۔ وہ آج تک ان بچوں کو یاد کر کے دعا دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ! ان تمام جانوں کی حفاظت کے بدلے، ان کی دعاؤں کے بدلے مولانا کے گھر کی حفاظت فرما۔ ہر بری بلا، ہر آفت سے محفوظ رکھ۔ آمین!

☆ سال 2020 میں حیدرآباد کے کچھ مسلم علاقے تیز بارش کے سبب سیلاب سے دوچار ہوئے۔ کئی علاقوں کے لوگ گھر سے بے گھر ہوئے۔ عوام الناس اپنے گھروں کو کھلا چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہوئے۔ جہاں ایک فلور تک پانی جمع ہو چکا تھا، وہاں چھوٹے چھوٹے بچے، خواتین، بوڑھے اور مریض پریشانی اور بے بسی کے عالم میں اپنے گھروں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی علاقے زیرِ آب آئے، گلی کوچے، دلدل کی تصویر پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر مولانا بہت بے چین ہوئے اور آپ کے کہنے پر آپ کے فرزند اور نواسوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان علاقوں میں رفاہی کام انجام دیئے۔ جس علاقے میں پانی جمع تھا وہاں پہنچ کر پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالا۔ ان کو ابتدائی طبی امداد دے کر، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہوئے دوسرے مقامات پر منتقل کیا۔ ایک متاثرہ علاقے سے تقریباً تیرہ شیر خوار بچوں کو نکالا گیا، کئی بیماروں اور خواتین و لڑکیوں کو بچایا گیا جو ایک دو دن سے اپنے گھر میں پھنسے ہوئے تھے...... اس طرح مولانا اور آپ کے گھرانے کی ہمدردی و غمخواری کی کئی اعلیٰ مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہر موقع پر بلا نام و نمود آپ کا خاندان خدمتِ خلق کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے آگے آتا اور ذمہ داریوں کو احسن طریقہ پر ادا کرتا ہے۔

☆ مولانا اپنی طالبات کی بہت عزت و احترام کیا کرتے تھے...... ہمارا اتنا خیال کرتے تھے کہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا کہ جتنی عزت و محبت اپنے خود کے گھر اور خاندان سے ملتی ہے اُس سے کئی گنا زیادہ مولانا ہماری عزت کرتے ہیں...... آج بھی ہم مولانا کے گھر جب جاتے ہیں تو اسی خلوص کی خوشبو کی تلاش میں جاتے ہیں۔ مولانا کے اخلاق و کردار کے یہ موتی ہمیں مولانا کے گھر کے ہر فرد میں نظر آتے ہیں...... وہی خلوص، وہی عقیدت، وہی محبت، وہی شفقت...... جو مولانا کی صفات تھیں...... یہ مولانا کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا کے گھرانے کا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی ہم سے خلوص و محبت سے پیش آتا ہے، بزرگوں کی طرح ہمارا احترام کرتا ہے، سچ ہے کہ بچے اپنے بڑوں کو دیکھ کر ہی یہ سیکھتے ہیں کہ کس سے کس طرح پیش آنا ہے......

''ہم اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتے ہیں''

تین موقعوں پر مولانا نے یہ بات کہی تھی جسے سن کر اہلِ ایمان کے دل کانپ جاتے ہیں۔

مدرسہ سے علیحدگی کے موقع پر آپ نے کہا کہ ''میں مدرسے کا معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔''

اہلِ علم حضرات یقیناً ان الفاظ کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر کوئی مظلوم اپنا وکیل اللہ کو بنالیتا ہے اور اپنے کسی معاملے میں اللہ کو حَکم مان لیتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے......؟

مولانا محترم کے یقین پر ہمارا یقین اتنا مضبوط ہے کہ ہم بھی اللہ کے عدل وانصاف کے منتظر ہیں...... ہر معاملے میں۔

☆ بیٹے کی شہادت کے وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے:

''ہم کسی کو کچھ نہیں کہتے، نہ اپنوں کو کچھ کہتے ہیں نہ حکومت کو کچھ کہتے ہیں......ہمیں کسی سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے ہم اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔''

یہ دردانگیز الفاظ اور پُرسوز آواز مظلوم کی وہ آہ تھی کہ جو عرش کو ہلا دیتی ہے جس پکار سے آسمان کے فرشتے بے چین و بے قرار ہو جاتے ہیں۔

☆ جماعت اسلامی سے ظلماً اخراج پر بھی آپ نے کہا کہ ''یہ معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔'' یہ سانحہ مولانا کے لیے اتنا تکلیف دہ تھا کہ تقریباً چھ ماہ آپ کی طبیعت غیر ہوتی رہی۔ انتقال سے کچھ دن پہلے آپ نے فرمایا کہ

''مجھے اس موقع پر اتنا غم پہنچا تھا کہ جتنا جوان بیٹے کی شہادت پر بھی نہیں پہنچا......تقریباً چھ ماہ مجھ پر غنودگی طاری رہی......''

ان دل شکن حالات میں وہ اولیاء اللہ ہی ہوتے ہیں جو اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر کے صبر و رضا کی تصویر بن جاتے ہیں...... ہوسکتا ہے کہ بے رحم دنیا ان واقعات کو نظر انداز کر کے، مولانا کا ذاتی معاملہ اور ذاتی آزمائش گردانتے ہوئے اپنے کو بری ظاہر کر کے بھول جائے۔ لیکن کیا عرش پر بیٹھا خدا ان آہوں کو اور ان جملوں کو فراموش کرسکتا ہے......؟؟؟؟ اس کا جواب تو اہلِ علم ہی دے سکتے ہیں......

راہ وفا کی آساں کب تھی

مولانا راہ حق کے بے باک نڈر مجاہد تھے، اللہ کے جری سپاہی تھے، جو کہتے ڈنکے کی چوٹ پر کہتے۔ اس راہ

عزیمت میں بہت سے لوگ آپ کے ہم رکاب ہوئے، ساتھ چلنے پر مصر ہوئے، آپ کے ہم مشن اور ہم خیال ہونے کے دعویدار ہوئے۔ لیکن جب مولانا کسی موقف پر ڈٹ جاتے اور صدائے احتجاج بلند کرتے تو بہت سے ساتھیوں کی سانسیں رک جاتیں...... جب حق کی راہ میں مصیبتیں آتیں، رکاوٹ اور تکلیفیں آتیں تو وہی ہم قدم، ہم مشن، ہم خیال ساتھی مولانا کا ساتھ چھوڑ کر اپنا دامن بچا کر کنارے ہوتے ہوئے اور راستہ بدلتے ہوئے نظر آتے:

راہ وفا میں جب رہ رہ کر، پاؤں کے نیچے کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ عزیمت، ساتھ مرا دے کر پچھتائے
کوئی ذرا یہ ان سے پوچھے، راہ وفا کی آساں کب تھی
اہلِ عزیمت کی راہوں میں، دنیا نے کب پھول بچھائے!!

مولانا کا یہ اعجاز ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو بھی ہمیشہ ساتھ لے کر چلتے رہے جو آپ کے مزاج سے یکسر مختلف تھے۔ ایسے لوگ کہ جن کے دعوؤں کے وزن کو مولانا پہلے سے جانتے تھے۔ تب بھی انھیں اپنے ساتھ رکھ کر خوش اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے رہے۔

راستے کی چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو آپ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ کا دامن ان میں الجھتا تو اُسے چھڑانے کے بجائے اپنا دامن پھاڑ کر وہیں چھوڑتے ہوئے منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے تھے۔

اس راہ میں جامعۃ البنات بھی آپ کا ایسا ہی دامن ثابت ہوا، جو ہمیشہ کانٹوں میں الجھتا رہتا تھا، جس پر آپ نے بے حد پیار و محبت سے گل بوٹے بنائے تھے، جس کی خاطر دن رات اپنی توانائیاں صرف کی تھیں، لیکن جب وہ دامن بہت زیادہ الجھنے لگا...... تو ایک دن مولانا نے اپنے اُس دامن کو بھی پھاڑ کر پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنی منزل کی جانب قدم بڑھا دیئے......

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر، اک اک ساتھی چھوٹ گیا

مولانا مدرسہ جامعۃ البنات کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ 24 سال دن رات اس کی آبیاری کی تھی...... ہم بھی اپنے مدرسے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اہلِ علم جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے لیے ہر اس چیز کو آزمائش بنا دیتے ہیں جو اُن کو محبوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ ہمیشہ لوگوں کی سازشوں، مخالفتوں، حسد اور دشمنی کا شکار ہوتا رہا۔ وہ مدرسہ کہ جس کے بانی و ناظم آپ تھے...... جس کا نام خود آپ نے رکھا تھا...... اس

مدرسہ سے آپ علیحدہ ہوگئے......صرف اور صرف مدرسہ کو انتشار سے بچانے کے لیے......مولانا نے بہت کوشش کی کہ معاملات درست ہوجائیں......لیکن ایسا نہ ہوسکا اور جامعہ بے جا ضد اور حسد پر قربان ہوگیا۔

یہ ایک طویل اور دلخراش داستان ہے......جو نہ لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے اور نہ ہی میرے قلم میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ان واقعات کو تحریری شکل دے سکے۔ مجھے ان واقعات کے بیان کرنے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف یا کسی کا لحاظ واحترام مانع نہیں ہے۔ سِوائے اس اطمینان کے کہ مولانا اپنا ہر معاملہ سب سے مضبوط وزبردست ہستی کے حوالے کرچکے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

مولانا نے جامعہ کی عمارت کو چھوڑ کر جامعہ کے نام میں ''الاصلاحیۃ'' کا اضافہ کرکے جامعہ کو کرائے کی بلڈنگ میں منتقل کردیا۔ یہ مرحلہ ہم سب کے لیے بہت کٹھن تھا۔ اپنے مدرسہ کو چھوڑنا ہمارے لیے اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ وہ مدرسہ جس کی ترقی، انتظام وانصرام میں ہم مولانا کے ہم قدم، آپ کے حکم کے تابع دن رات لگے ہوئے تھے......جس وقت سے ہم مدرسہ سے جڑے اسی وقت سے مدرسہ ہمارے لیے اولین ترجیح بن چکا تھا، جس کی ترقی کے لیے ہم نے مولانا کی ہر کوشش میں ساتھ دیا تھا......مدرسہ ہی ہماری خوشی اور مدرسہ ہی ہمارا غم تھا......اس سے جدا ہونا سوہانِ روح تھا......ہم اس سے جدائی کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، دن رات اپنے سجدوں سے اسے آباد کیا تھا......کبھی جلسوں کی تیاری تو کبھی اسلامک پینٹنگ نمائش کی تیاری میں اپنی جان کھپادی تھی۔ تعلیم وتعلّم میں دن رات لگے رہتے تھے۔ مدرسہ ہمارے لیے صرف مدرسہ نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھا۔ جس کے بانی وقائد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ تھے۔

مدرسہ سے جدائی کے موقع پر ہم نے اس کے صحن میں نماز ادا کی اور اپنے مدرسہ سے یہ کہا کہ: ''اے منبعِ علم ودانش! اگر مولانا نے تمہارا فیصلہ اللہ کے حوالہ نہ کیا ہوتا تو ہم تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتے بلکہ تمہارے لیے اپنی جان تک قربان کردیتے......''

نئے مدرسہ میں پہلا دن تھا، ہمارے لیے اپنے مدرسہ کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر قدم اٹھانا دشوار ہورہا تھا۔ نئی عمارت میں داخل ہونا بہت زیادہ مشکل تھا۔ ہر کسی کی آنکھ آنسوؤں سے لبریز تھی، دل اتنا بوجھل تھا کہ شدتِ غم سے کسی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس عمارت کو مدرسہ کے طور پر دل قبول ہی نہیں کرپارہا تھا۔

ہم دل پر جبر کر کے......خود کو بمشکل تیار کر کے جیسے تیسے اپنے آپ کو ڈھکیل کر مدرسہ کے اندر لے گئے......
سب سے پہلا کمرہ جسے آج ہم مولانا کا آفس کہتے ہیں......سامنے نظر آرہا تھا......ہم اس جانب بڑھ گئے تاکہ اس عمارت کا مشاہدہ کریں......کمرہ میں قدم رکھتے ہی ہمارے قدم رک گئے......آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ......دل شدت غم سے پھٹنے لگا......جو نظارہ ان آنکھوں نے دیکھا وہ بڑا ہی دل فگار تھا......اس خالی کمرہ میں مولانا محترم جو ہماری تمام تر عزت و احترام کا مرکز ہیں ''فرش'' پر بیٹھے تھے......ایک کاغذ اور قلم ہاتھ میں لیے ہمیں مسکراتے ہوئے سلام کر رہے تھے......

ہمارے دل کٹ گئے......آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے، میرے ساتھی زار زار رونے لگے......کچھ کی ہچکیاں بندھ گئیں......غرض جس نے بھی دیکھا وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پایا......اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پایا......کوئی جان نہیں سکتا تھا کہ اس روشن، تر و تازہ اور مسکراتے چہرے کے پیچھے ہزاروں غم چھپے ہیں۔

بہاروں سے پہلے جو آنکھوں پہ بیتی
وہ اتنی کٹھن تھی کہ مشکل بیاں ہے

مولانا کی زندگی کے یہ وہ دن ہیں کہ جن کی آزمائشوں، تکلیفوں کے بارے میں سوائے اللہ اور چند لوگوں کے کوئی دوسرا گواہ نہیں ہے۔ کہ ان دنوں مولانا پر کیا بیتی......؟

ان پاکیزہ نفوس کو سلام کہ جو اِن نامساعد حالات میں بھی مولانا محترم کی ڈھال بنے رہے......آپ کے قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے، آپ کا حوصلہ بنے رہے......اور اس آزمائش میں ثابت قدم رہے......ہم اُن معاونین کے بھی بے حد ممنون ہیں کہ جنھوں نے ''الاصلاحیۃ'' کی پہلے دن سے مدد کی۔

اللہ ان تمام کو اجرِ عظیم میں برابر کا شریک بنائے اور ان کی بڑی سے بڑی تکلیف کو اپنے فضل سے دور فرمائے۔

الحمدللہ! یہ ''الاصلاحیۃ'' کا وہ ہراول دستہ ہے کہ جس نے الاصلاحیہ کو ایک سال کے اندر اندر مستحکم کر کے کامیابی کے آسمان پر پہنچا دیا......

مدرسے کے فرش پر مولانا کو بیٹھا دیکھ کر ہم اس کیفیت سے گزرے کہ جس کے بیان کے لیے الفاظ کا چناؤ ناممکن ہے......سب نے بے چین و بے قرار ہو کر کہا مولانا آپ نیچے زمین پر کیوں بیٹھے ہیں......؟ ہماری بے بسی تھی کہ ہم ایسی کوئی چیز نہ پاتے تھے کہ جو مولانا کے بیٹھنے کے لیے لا سکیں......

ہماری تڑپ کو دیکھ کر مولانا بھی بے چین ہوئے تھے۔ آپ کی آنکھیں بھیگی تھیں اور تب آپ نے ایک ایسا تاریخ ساز جملہ کہا جو صرف اور صرف اللہ کے دوستوں کا ہی خاصہ ہوتا ہے......

''مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے جی......ہم تب بھی اللہ ہی کے لیے کام کر رہے تھے، اب بھی اللہ ہی کے لیے کام کریں گے......عمارتوں کا کیا ہے؟ وہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ عمارتیں معنی نہیں رکھتیں......مقصد اہم ہوتا ہے......ہمارا کام نہیں رکے گا......''

مجھے اُس وقت مولانا، حضرت خالد بن ولیدؓ کا پرتوَ لگے کہ جنھوں نے فرمایا تھا کہ ''میں جب سپہ سالار اعظم تھا، تب بھی اللہ ہی کے لیے لڑ رہا تھا اور اب جب کہ میں معزول ہو کر ایک عام سپاہی ہوں تب بھی اللہ ہی کے لیے لڑوں گا......''

میری تمام ساتھیوں نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ پُرعزم انداز میں ان شاء اللہ کے الفاظ سے مولانا کے عزم کو تقویت دینے کی چھوٹی سے کوشش کی......لیکن آج تک ہم اُس تکلیف کو نہیں بھول پائے...... مجھے آج بھی اس آفس میں داخل ہوتے وقت وہ سین یاد آجاتا ہے۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے مولانا کو ان کٹھن مراحل سے گزرتے، آزمائش کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ یقیناً آپ کیمیا گر تھے......کہ نئے سرے سے آپ نے قوت جمع کر کے دوبارہ مدرسہ کے نظام کو مستحکم کر دیا۔

یا اللہ! میرے مولانا کی ہر تکلیف کے بدلے جنت کے درجات بلند فرما۔ آمین!

تعلیم و تعلّم سے ہوگا الحاد کا پردہ چاک یہاں
یوں جوشِ عمل ہے ہوش ربا کہ باطل ہوگا خاک یہاں

اقامت دین کی راہ میں آپ نے مدرسہ کو ایک بیج کی حیثیت سے بویا تھا۔ ایک دن یہ بیج تناور درخت بنے گا اور اس کا ثمر امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میسر آئے گا......آپ کی کاوشوں سے جو چراغ ہر گھر میں ٹمٹما رہے ہیں اللہ ان کی روشنی کو کبھی مدھم نہ ہونے دے گا۔ ایک دن دنیا اس سے روشن ہوگی اور یہی روشنی آفتابِ اسلام کے طلوع کا ذریعہ بنے گی، ان شاء اللہ!

آپ کے مدرسہ کی طالبات اسلام کی داعیات، مبلّغات اور جانشینِ صحابیاتؓ بنیں گی اور ہر میدان میں اپنا لوہا منوائیں گی......خلافت کے قیام، اسلام کے احیاء، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور شہادتِ حق کے فریضہ کی ادائیگی میں

اپنا رول ادا کریں گی......جس موقع پر ہماری ضرورت ہوگی وہاں ہم امِ عمارہؓ، خولہؓ اور خنساءؓ کی جانشین بن کر تاریخ کو دہرائیں گی۔ان شاءاللہ!

میرے مولانا نہیں رہے......

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ اتار کے شہر کا
کوئی شخص تھا میرے شہر میں کسی دور پار کے شہر کا

ہاسپٹل میں قرآن کی تلاوت اور کلمہ کی شہادت کے بیچ ہونے والی آپ کی وفات، اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جگر کٹ گیا...... ہمارے قدم لڑکھڑا گئے...... چہرے بجھ گئے، ہمارا سورج ہم پر تاریک ہوگیا......ان جاں گسل لمحات میں ہر ایک کے آنسو بہہ رہے تھے، تھمتے نہ تھے...... جو بیٹھا تھا بیٹھا ہی رہ گیا...... جو کھڑا تھا اُسے اسی حالت میں گھنٹوں گزر گئے......غم کا اک وہ گراں تھا جو ہم پہ آگرا......آپ کا اس دارِفانی سے کوچ کر جانا ہمارے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔

مولانا کے اہل وعیال کو کتنا بڑا صدمہ پہنچا......اور ان کا کیا حال بنا......اس کی تصویر کشی کے لیے ہزاروں صفحات بھی کم پڑیں گے......کوئی بھی اُس صدمہ سے باہر نہیں آپایا......

آپ کے جنازے پر ہماری جو کیفیت تھی اُس کے بعد ہم اُس محبت کی شدت اور اُس غم کی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ جو حضرت عمرؓ کا غم تھا......''اگر کسی نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم میں نہیں رہے تو میں اپنی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا......''

حضرت عمرؓ کی وہ باتیں دنیا کے لیے بھلے ہی ''بہکی بہکی باتیں'' تھیں، لیکن اہلِ عشق کی اصطلاح میں غم کے پیرائے میں عشق کی انتہا تھی......اللہ ہمیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا صبر عطا فرما۔

ائے کاش یہ ہوسکتا!

غم ضبط نہ ہوسکتا ائے کاش یہ ہوسکتا
میں کھل کے تو روسکتا، ائے کاش یہ ہوسکتا
میں کھل کے نہ روسکتا پر پلکوں کے اشکوں سے
دامن کو بھگوسکتا، ائے کاش یہ ہوسکتا

لٹ جاتی محبت میں جو چیز بھی میری تھی
پر تم کو نہ کھوسکتا، اے کاش یہ ہوسکتا

ان العین تدمع والقلب یحزن، ولا نقول الا ما یرضی ربنا۔

''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' ...... مذکورہ آیت کو میں دن میں کئی مرتبہ دہراتی ہوں...... کہ اے میرے رب! میں اس بات کا یقین رکھتی تو ہوں کہ سب کو آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے......لیکن اس بات کا یقین کہاں سے لاؤں کہ مولانا ہم میں نہیں رہے......یقین ہی نہیں آتا کہ آپ چلے گئے ہیں کبھی نہ آنے کے لیے......

مولانا! کاش آپ کو ہم کسی طرح یہ دکھا پاتے کہ آپ کی یہ روحانی بیٹیاں آپ کو کس قدر یاد کرتی ہیں...... آپ کے جانے سے ہماری زندگیوں میں کس قدر خلا پیدا ہوگیا ہے...... مدرسہ کے جس راستے پر ہم آپ سے ملاقات اور آپ کی دعاؤں کی طلب اور امید میں قدم رکھتے تھے، وہ قدم اب اس راستے پر چلتے چلتے رک جاتے ہیں......غم سے بوجھل ہوجاتے ہیں...... کہ ہماری آمد کی منتظر شخصیت چلی گئی......ہم اُن نگاہوں کو کہاں تلاش کریں، جو ہمارے لیے ہر وقت فکر مند رہا کرتی تھیں......؟ ہم اُن نظروں کو کہاں ڈھونڈیں کہ جو ہمارے اندر اپنی تحریک کو تلاش کرتی تھیں......ہم وہ دعائیں کہاں سے پائیں......؟!!

یا خدا! ہم صبر کہاں سے لائیں کہ سب کو دلاسہ دینے والا......صبر کی تلقین کرنے والا......خلوص وللّٰہیت کا پیکر چلا گیا......اب کون ہمیں صبر کرنا سکھائے گا......؟!

مولانا محترم کی کئی طالبات ایسی ہیں کہ جن کے لیے مولانا ہر وقت دعا گو رہا کرتے تھے جو اس بات کا پختہ یقین رکھتی تھیں کہ مولانا کی دعاؤں نے ان کو اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ آپ کی انہی دعاؤں کے طفیل ان کی زندگی آزمائشوں سے بچی ہوئی ہے......وہ طالبات آج اپنے کو یتیم تصور کررہی ہیں......ان کے سر سے دعاؤں کا وہ سایہ اٹھ گیا ہے......ان کے لیے دعائیں کرنے والا چلا گیا ہے......

یا خدا! ہمارے ان آنسوؤں کو جو مولانا کے عظیم احسان پر شکرانے کے طور پر رواں ہیں مولاناؒ کی نیکیوں میں اضافے کا سبب بنا دینا، مولانا کی میزان میں نیکیوں کے ساتھ جمع کروا دینا......آمین!

کہاں تلاش کریں جز ترے سکونِ نظر
کہ اس جہاں میں کوئی تجھ سا دوسرا بھی نہیں

ہر تحریک میں، ہر ادارے میں ایسے کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ہر جانے والے کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور اُس

خلا کو پُر کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے تو بس آپ ہی تھے جس کا کوئی بدل ہمارے پاس نہیں ہے، کوئی آپ جیسا قائد نہیں، کوئی آپ جیسا رہنما نہیں ہے۔

آخری بات اپنی ہم نشینوں سے

ساتھیو! ہر محبت اپنے اندر ایک تقاضہ رکھتی ہے۔ اس کو پورا کیے بغیر ہم کسی کی بھی محبت کا دم نہیں بھر سکتے اور ناہی دعویٰ کر سکتے ہیں۔

مولانا سے عقیدت رکھنے والے اور آپ کو اپنا استاد ماننے والے نفوس اپنی اہمیت کو پہچانیں کہ آپ بہت قیمتی ہیں، آپ کو اس بات کا ادراک ہونا چاہئے کہ مولانا کے مشن کی تکمیل اور اس تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانے کا کام ہمارے ذمہ ہے......

''ہر ذمہ دار سے اس کی ذمہ داری کے تعلق سے پوچھا جائے گا۔''

اس کے تحت ہم سب مکلف ہو چکے ہیں...... اللہ ہمیں اس تحریک اور فکر کو زندہ رکھنے اور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے کی توفیق دے۔ آمین!

ورنہ یہ دعویٔ عشق ووفا، محبت وعقیدت سوائے زبانی جمع خرچ کے کچھ اور نہیں ہوگا۔

شوق کی آگ کو مدھم نہ کرو دیوانو
اپنی آواز کی لو کم نہ کرو دیوانو

سرودِ رفتہ

ذکریات شاگردانِ عزیزاں

وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

وہ اک شجر تھا مثل طوبیٰ
تم اس کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے
دلوں کے دکھ درد کھولتے تھے
سوال پیچیدہ پوچھتے تھے
پھر اس حکیم حلیم سے سن کے
حرفِ اخلاص جھومتے تھے
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

نہیں وہ موجود گو بظاہر
جگہ جگہ ہے سراغ اس کا
وہی ہے ساقی، اسی کی محفل
ایاغ اس کا، چراغ اس کا
ہزاروں دل ہیں کہ جن کے اندر
جھلک رہا ہے دماغ اس کا
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

ذرا سے خاکی وجود میں وہ
رہا ہے برسوں تلک سمٹ کر
بدن کا بوسیدہ خول ٹوٹا
غبار خاکی رہا ہے چھٹ کر
شعاؤں کے پر لگا کے اب وہ
حضور یزداں پلٹ گیا ہے
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

نہ روؤ اس کو کہ جلوہ فرما
وہ کہکشاں تابہ کہکشاں ہے
فرازِ جنت کے سبزہ زاروں میں
رونقِ بزم قدسیاں ہے
ہوا مقرب وہ انبیاء کا
وہ آج مخدوم نور یاں ہے
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

موت العالِم موت العالَم

مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری، ممبئی

کل تک جنھیں مدظلہ العالی، دامت برکاتہم، زیدلطفہ جیسے دعائیہ کلمات سے یاد کرتا تھا، آج انھیں رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے۔ یہ کوئی اور نہیں میرے مشفق استاذ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ہیں جو فضلائے مدرستہ الاصلاح کے نمائندہ اور مثالی فضلاء میں سمجھے جاتے ہیں اور ہیں۔

میرا ان کا شاگردی اور استاذی کا تعلق رہا ہے، ان سے میں نے بنارس جامعہ مظہر العلوم میں ۱۹۵۷ء، ۱۹۵۸ء میں پڑھا ہے۔ ان کے نقوش انمٹ ہیں اور ان کے اثرات دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ ان سے میں نے ادب عربی، انشاء نگاری اور حدیث کا درس لیا ہے۔ وہ اپنے طلبہ پر خاص دھیان رکھتے اور خاصی توجہ برتتے، وہ ایک دیدہ ور اور بالغ نظر استاذ تھے۔ ان کی تدریس روایتی طریقے سے ہٹ کر تھی۔ کہیں سے اظہار قابلیت یا تعلّی کا شائبہ تک نہ تھا۔ سادگی اور سادگی میں بھی ایک انداز۔ وہ بحیثیت مدرس تقریر نہیں کرتے تھے، وہ موضوع کی تفہیم کرتے تھے۔ یہی ان کی ایسی خوبی ہے جو کم ظرفوں کو کھلتی ہے، اور سنجیدہ طبیعتوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

مولانا کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے، کتنی راہیں بدلیں، کتنی منزلیں چھوڑیں، مظہر العلوم بنارس سے شروع کیا گیا سفر سعید آباد کی بستی میں اپنے انجام کو پہنچا۔ اس طرح ان کی بے تاب طبیعت کو ابدی سکون حاصل ہوا۔ اللّٰھم ارحمہ و ادخلہ فسیح جناتہ۔

مولانا نے اپنی تدریسی زندگی میں سوائے اجر کے اور کچھ نہیں پایا، لیکن شکایت کہیں نہیں کی، کسی کی نہیں اور کسی سے نہیں کی۔ کریم نگر میں جب ان کی ایک تین سالہ صاحبزادی کا انتقال ہوا تھا، اور جنازے میں مولانا اور

ایک دو عزیز یا شاید وہ بھی نہیں، اور چند نفوس جن کی شمولیت سے جنازہ تو اٹھ گیا اور تدفین بھی ہوگئی، مگر وہ معصوم بیٹی کا غم سہار نہ سکے اور حیدرآباد آ گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جواں سال بیٹے مرحوم مجاہد جنھیں پولیس کی گولی کا نشانہ بنایا گیا، وہ بھی انھیں وہاں سے آمادۂ سفر نہ کر سکا، جیسا کہ اپنی بیٹی کی تجہیز و تدفین کے مناظر سے طبیعت منغص ہوگئی، وجہ کل اتنی ہے، وہاں اجنبیت کا احساس شدید سے شدید تر رہا، یہاں شہادت کا مرحلہ تھا، جو مجاہدین کا طرۂ امتیاز رہا۔

مولانا نے غالباً ذاکر حسین کالونی میں مدرستہ البنات کی طرح ڈالی اور اپنے کو اس کے لیے وقف کر دیا اور تن من دھن سے اس کی آبیاری میں جٹ گئے۔ چونکہ وہ جماعت اسلامی کے ممبر تھے اور جماعت پر اور جماعت کے لوگوں پر ان کا ایقان غیر متزلزل تھا، اس لئے انھوں نے جب وہاں کے لوگوں کو جماعت کے اشارے پر اپنا ہم سفر چنا اور جماعت کے بینر تلے کام شروع ہوا تو مولانا کی حیثیت مؤسس حقیقی یا بانی مبانی کی نہیں رہی، وہ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے ادارے کی سربراہی کرتے رہے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب ان کے انھی ہم سفروں کی جانب سے ان کو وہ دن دیکھنا پڑا، جو بڑا سانحہ تھا، جو اُن کے لئے حیرت انگیز میرے لئے متوقع تھا۔ ۱۹۹۲ء میں جب انھوں نے مجھے بلایا تھا، تو میں نے اشارے کنائے میں نہیں باوضوح اور باصراحت انہیں آگاہی دی تھی، مگر جماعت کے لیے قربانی دینے والا میری کیا سننے والا تھا اور میری کیا ماننے والا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو ٹوٹ جاتا، لیکن آفریں ہو مولانا کی ہمت اور ارادے کی پختگی کو کہ انھوں نے نامساعد حالات، وسائل کی کمی اور تعاون کے عدم دستیابی کے باوجود ایک نئے ادارے کی داغ بیل ڈالی اور بچیوں کی مذہبی تعلیم، زبان و ادب کے مطالعہ اور شعور و استقامت کے فروغ کیلئے حیدرآباد کو ہی مرکز چنا۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ لٹے ہوئے کارواں کا مسافر پھر طرحِ اقامت ڈال رہا ہے تو سنجیدہ طبیعتوں سے رہا نہ گیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر مولانا کے حوصلے و ارادے کو خوش آمدید کہا اور دست تعاون آگے بڑھایا اور اس طرح پژمردہ طبیعتوں میں امیدوں کے گلاب کھلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے مولانا نے وہ کر دکھایا جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اولوالعزمان دانش مند جب کرنے پر آتے ہیں
چٹانیں پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

مولانا کے اس سفر میں ان کی تربیت یافتہ اور ان سے فیض حاصل کردہ سابقہ طالبات بھی آ کھڑی ہوئیں، یہ مولانا کی خوش قسمتی بھی ہے اور ان کی شخصیت کا سحر بھی جسے پڑھا دیا وہ ان سے وابستہ ہو گیا۔

میں نہیں جانتا اس ادارے کے قیام کے وقت اس کی قانونی حیثیت کیا رکھی گئی ہے، لیکن میری اندر کی خواہش بھی ہے اور میری دعا بھی ہے کہ وہ کہانی دوبارہ نہ دہرائی جائے اور ادارے کا نظم ونسق مولانا کے مخلص کارکنوں اور ان کی اولاد کے ہاتھ میں ہو۔

مولانا کی عمر نوے سال یا اس سے کچھ اوپر تھی، وہ پوری زندگی اعلائے حق اور فکرِ اسلامی کے احیاء اور فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ مولانا جب کسی موضوع پر لکھتے تو اس کا حق ادا کر دیتے، کسی کتاب کو پڑھ کر اس کا چربہ نہیں اتارتے بلکہ زندہ موضوع پر زندگی سے بھرپور تحریر قاری کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ ان کی استدلالی قوت استخراجی بھی تھی اور استقرائی بھی تھی اور تحریر کتاب وسنت کے حوالوں سے مالا مال ہوتی۔ تحریر شگفتہ اور تازگی لئے ہوتی۔ کہنگی نہ سوچ میں تھی اور نہ تحریر میں، ہاں رہن سہن کہنگی زدہ تھا، جس میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ یہی حال ان کی تدریس کا بھی تھا، کہ ادق سے ادق مضمون کو اپنے طالب علموں کے سامنے الم نشرح کر دیتے۔

ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مولانا چلے گئے، ہر کوئی جانے والا ہے لیکن ان کی یادیں باقی ہیں۔ ان کی تحریر کی شگفتگی قائم ہے۔ ان کا میلانِ طبع ان سے استفادہ کرنے والوں کو بجا طور پر معلوم ہے اور ان کی ایک بڑی تعداد اس سے متاثر بھی ہے۔ مولانا کے حلقۂ درس میں جو آیا اُن کا ہو کر رہ گیا۔ یہ صحیح ہے ان کے تلامذہ میں ایسا کوئی نہیں ہے، جو کل ہند سطح پہ متعارف ہو، لیکن ایسے بہت ہیں جو ان سے اکتساب کی سوغات برابر بانٹ رہے ہیں اور ان کے چراغ سے مستعار روشنی لے کر اپنے دیے کو جلائے ہوئے ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ:
کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا نعیم الدین اصلاحی
استاذ تفسیر وادب جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

بلاشبہ موت ایک حقیقت ہے۔ ہر ذی نفس کو فنا ہونا ہی ہے۔ ’’كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ‘‘۔ موت کا جام پینا ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ سب مرنے والے برابر نہیں ہوتے، بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کی موت سے ایک گھر متاثر ہوتا ہے، بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت سے افرادِ خاندان کے علاوہ پوری بستی، پورا شہر اور پورا ضلع متاثر ہوتا ہے، مگر بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی موت سے ایک عالم متاثر ہوتا ہے۔ ’’موت العالِم موت العالَم‘‘۔

۲۰۲۲ء ایک ایسا سال ہے جس میں بڑے بڑے علماء، مفکرین اور دانشوران خاکدان فنا کو چھوڑ کر عالم بقاء کو سدھار گئے۔ مولانا جلال الدین عمری، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا عبدالعلیم اصلاحی اور منشی محمد انور صاحب رحمہم اللہ۔ ان میں آخر الذکر چار شخصیتیں تو ماہ ستمبر۔ اکتوبر میں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں: ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مولانا نظام الدین اصلاحی، منشی محمد انور اور مولانا عبدالعلیم اصلاحی۔ جن میں دو شخصیتیں مولانا جلال الدین عمری اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی جدائی کا صدمہ پورے عالم اسلام میں محسوس کیا گیا۔ مولانا نظام الدین اصلاحی اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ دونوں صاحبان فرزندانِ اصلاح میں نہایت نامور نام ہیں۔ مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب سے راقم کا تعلق بڑا ہی گہرا رہا جو تقریباً 42 سالوں پر محیط ہے۔ مولانا درمیان میں جب گجرات امیر حلقہ منتخب ہو کر چلے گئے اور اپنی میقات پوری کر کے واپس آ گئے

اور چاند پٹی میں رہائش پذیر ہوگئے تو دوبارہ جامعۃ الفلاح سے وابستگی کے لئے جن لوگوں نے اہم ترین کوششیں کیں ان میں مولانا ابوبکر صاحبؒ اور حاجی عبدالمتین صاحبؒ سرفہرست ہیں۔ انہیں کے کہنے پر میں چاند پٹی ان سے ملنے گیا اور چند ہی دنوں کے بعد مولانا کی خدمات سے جامعہ تادم واپسیں مستفید ہوتا رہا۔

جماعت اسلامی کی تحریک جب ہندوستان میں برپا ہوئی اور اس میں جن نامور اداروں کے افراد شریک ہوئے ان میں ''مدرسۃ الاصلاح'' اور ''ندوۃ العلماء'' کے فضلا سرفہرست ہیں۔ ان دونوں اداروں کی سرپرستی اور علمی رہنمائی میں مولانا شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ناظم ندوی، مولانا جلیل احسن ندوی فرزندانِ ندوہ کے وہ افاضل ہیں جن کی کوششوں سے مولانا مودودیؒ کا لٹریچر عربی زبان کے نہایت اعلیٰ اور مؤثر اسلوب میں منتقل ہوا جس سے عالم عرب میں تحریک اسلامی کا بھرپور تعارف ہوا۔ یہ ان کا وہ کارنامہ ہے جس کا کوئی بھی منصف مزاج فرد انکار نہیں کرسکتا۔

اسی طرح مولانا فراہیؒ کے تلامذہ نے جماعت اسلامی کی توسیع، اس کی اشاعت اور سب سے بڑھ کر اس کی فکری رہنمائی میں جو کردار ادا کیا وہ بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا صدرالدین اصلاحی اور ان بزرگوں کے تلامذہ نے جماعت اسلامی کو علمی لحاظ سے جو اعتبار اور وقار بخشا ہے اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ان ہی شخصیتوں میں ایک اہم نام مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا بھی ہے جن کو اب مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا محسوس ہوتا ہے۔

جب مولانا نظام الدین اصلاحی، ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا انتقال ہوا تو میں اس وقت ملک کے باہر تھا، ''اناللہ'' پڑھا اور ان کے متعلقین سے اظہارِ تعزیت کیا۔ اب تھوڑی سی فرصت میسر آئی ہے، ان کی بیٹی عزیزہ ظل ھما سلمہا کا بار بار تقاضہ ہے کہ مولانا مرحوم کی شخصیت پر کچھ میں بھی روشنی ڈالوں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصرار اور تقاضا کچھ بیجا بھی نہیں ہے، کیونکہ مولانا سے میرا نیازمندانہ تعلق نصف صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط ہے۔

مولانا سے ملاقات

جامعہ مظہر العلوم بنارس میں ہمارے خاندان کے ایک صاحب مقیم الدین نام کے پڑھتے تھے اور میں اپنے گاؤں کے قریب ہی ایک مدرسہ میں حفظ قرآن میں مشغول تھا۔ مقیم الدین صاحب مظہر العلوم کے اساتذہ کا تذکرہ اکثر کرتے جن میں سب سے زیادہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا نام بڑی والہانہ عقیدت ومحبت کے ساتھ لیتے۔ وہ جب بھی مولانا کا ذکر میرے سامنے چھیڑتے میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش کہ مولانا کا دیدار مجھے بھی نصیب ہوجاتا! اسی اثناء میں جماعت کا ایک ضلعی اجتماع میرے مدرسہ میں جو ''جامعہ مطلع

العلوم بنارس'' کی ایک شاخ تھا، منعقد کیا گیا۔ اجتماع ہمارے دیار کا تھا، میں بھی اس اجتماع میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک ہوا۔ اس اجتماع میں شرکت کے لئے بنارس سے دو عالم دین تشریف لائے اور انھوں نے تقریریں کیں۔ پہلے مقرر مولانا بشیر صاحب مظہریؒ تھے اور دوسرے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ تھے۔ ان دونوں مقررین نے خاصی طویل تقریریں کیں، لیکن چونکہ میری عمر کم تھی اور یہ میری زندگی کا پہلا اجتماع تھا جس میں میں شریک ہوا تھا، کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس اجتماع کا حاصل بس مولانا کی زیارت تھی۔ یہ واقعہ غالباً 1964۔65ء کا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ مولانا جب تقریر کررہے تھے جاڑے کا موسم تھا، غالباً فروری یا مارچ کا مہینہ رہا ہوگا، تقریر کے دوران ان کی موٹی اور بوٹے دار چادر بار بار ان کے کندھے سے سرکتی تھی اور مولانا اس کو سنبھالتے جاتے تھے اور جب مظہر العلوم میں مولانا سے میری ملاقات ہوئی تو اس وقت بھی وہی بوٹے دار چادر مولانا اوڑھے ہوئے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ حیدرآباد میں جب میں ان سے ملا تو اس وقت بھی جاڑے کا موسم تھا اور مولانا اسی چادر میں ملبوس تھے۔ مجھے مولانا کی اس وفادار چادر پر بڑا رشک آتا تھا۔

جامعہ مظہر العلوم میں ملاقات

میں نے ستمبر 1966ء میں حفظ قرآن کی تکمیل کی۔ ایک سال 1967ء تک دورۂ حفظ کیا اور 1968ء میں بنارس کا رخ کیا تاکہ آگے اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ ''جامعہ اسلامیہ امرسی پور'' میں طلبائے حفظ کے لئے دیگر تعلیم کا نظم نہیں تھا۔ میں صرف حافظ تھا، اس کے علاوہ میں نہ ہی اردو جانتا تھا اور نہ ہی ہندی، انگریزی اور حساب۔ میں شوال 1968ء میں کچھ اردو اور حساب کی جانکاری کے لئے بنارس آگیا، کیونکہ ہمارے والد صاحب کی منشاء حفظ کے ذریعہ پوری ہوچکی تھی، میں حافظ ہوگیا تھا اور دیار میں تراویح بھی باقاعدگی سے پڑھانے لگا تھا، لیکن علاقہ کے مکاتب میں پڑھانے کے لئے اردو، ہندی، حساب کی جانکاری ضروری تھی اور اس کے لئے انہوں نے مجھے مظہر العلوم بھیجا تھا تاکہ میں وہاں منشی پاس کرلوں اور دیار کے مکاتب کے کام آسکوں۔ بنارس آکر میں کچھ دنوں اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور گھر سے جو مصارفِ سفر لایا تھا وہ ختم ہوگئے تھے۔

ایک دن میں جامعہ مظہر العلوم کے دارالاقامہ گول گڈا والی روڈ پر چل رہا تھا کہ میرے عم زاد بھائی محمد اکرام صدیقی صاحب سے میری اچانک ملاقات ہوگئی، انہوں نے علیک سلیک کے بعد مجھ سے پوچھا کہ کب آئے ہو؟ میں نے بتایا چار چھ دن سے یہاں ہوں۔ وہ فوراً مجھ کو اپنے ساتھ لے کر نائب صدر مدرس صاحب کے پاس آئے، میں نے دیکھا تو یہ وہی صاحب تھے جن کو امرسی پور کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا، یعنی مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ۔ مولانا نے مجھ سے انٹرویو میں (داخلہ ٹسٹ میں) کچھ مفرد الفاظ لکھوائے جیسے

افتخار اور محمد اکرام وغیرہ، محمد اکرام کا لفظ فوراً لکھ دیا، ہمارے ساتھ جولڑکے تھے جو ہمارے ٹسٹ کا مشاہدہ کررہے تھے وہ فوراً پکار اٹھے، ارے! یہ اس کے بھائی کا نام ہے، اس لئے بہت آسانی سے لکھ لیا۔ مولانا نے اس مختصر اور آسان ٹسٹ کے بعد میرا داخلہ عربی اول میں لے لیا۔ گو میری اردو کمزور تھی، بلکہ نہیں کے برابر تھی، لیکن حافظ قرآن تھا اور یاد اچھا تھا اس لئے داخلہ میں آسانی ہوئی۔ جیسا عرض کیا گیا ہے مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحی ان دنوں مظہر العلوم میں نائب صدر مدرس کے عہدے پر فائز تھے اور مسند صدارت کی رونق صدر مدرس مولانا عبدالحمید صاحب مکی فرنگی محلی کے دم سے قائم تھی۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے میرا داخلہ تو لے لیا تھا لیکن داخلہ فارم پر دستخط مولانا عبدالحمید مکیؒ صاحب کا ہونا تھا۔ مولانا نے مجھے ایک دن ان کے سامنے پیش کیا۔ مولانا عبدالحمید مکی صاحبؒ نے اردو کی ایک کتاب اُٹھائی اور میرے سامنے رکھی اور اس میں درج ایک نظم پڑھنے کو کہا، میں نے وہ نظم بہت آسانی سے پڑھ دی۔ اس میں ایک لفظ تھا ''کیریاں'' مولانا نے اس کا معنی مجھ سے پوچھا، میں نے کہا ''مجھے نہیں معلوم''، مولانا نے کہا: ''آم کے درخت میں پھول لگتا ہے؟'' جی ہاں! ہم لوگ اس کو ''بور'' کہتے ہیں۔ مولانا نے کہا ''بالکل صحیح'' اس کے بعد اس کے پھول چھوٹے چھوٹے دانے سرسوں کی طرح نکلتے ہیں اور پھر جب وہ تھوڑا بڑے ہوتے ہیں، چٹنی کے لائق ہوجاتے ہیں تو ان کو ''کیری'' کہتے ہیں۔ میں نے جھٹ کہا ''ٹکورا ٹکورا'' مولانا میرے اس جملے پہ مسکرا دیئے اور پھر مجھ سے نصیحت آمیز لہجہ میں فرمایا: تمہاری اردو بہت کمزور ہے، لہٰذا تمہارا داخلہ صرف چھ مہینے کے لئے لیا جارہا ہے، اس درمیان محنت کرکے اگر تم نے اپنی کمزوری دور کرلی تب تو ٹھیک ہے، ورنہ تمہارا داخلہ منسوخ کردیا جائے گا۔ میں نے مولانا کے اس جملے کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور تعلیم میں جٹ گیا۔ عربی اول میں میرا داخلہ ہوا تھا اور عربی اول کی گھنٹیاں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں:

۱۔ کتاب النحو — مدرس: مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ (نائب صدر مدرس)
۲۔ میزان ومنشعب — مدرس: مولانا ضیاء الحسن ندوی قاسمیؒ (شیخ الحدیث)
۳۔ دروس الادب — مدرس: مولانا حیدر علی مظہریؒ
۴۔ فارسی کی پہلی کتاب — مدرس: مولانا عبدالمغنی صاحب مظہریؒ
۵۔ انشاء — مدرس: مولانا حیدر علی صاحب
(جن کے ذمہ ''دارالافتاء'' بھی تھا)

عربی اول میں ہمارا داخلہ تو ہوگیا لیکن ہماری اردو نہایت کمزور تھی۔ اسی طرح ہمارے درجہ کے دیگر طلبہ کی

اردو بھی چنداں اچھی نہیں تھی، لہٰذا ہمارے درجہ میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب نے ایک گھنٹی اردو کی بھی بڑھادی اور یہ گھنٹی جامعہ کے خوش نویس مولانا حیدر علی صاحب کے سپرد کر دی گئی۔

اس وقت تعلیمی اوقات آٹھ گھنٹیوں پر مشتمل ہوتے تھے، جس میں عربی اول کے طلبہ کی دو تین گھنٹیاں خالی رکھی گئی تھیں تاکہ یہ خالی گھنٹیوں میں اپنے اسباق کی تیاری کر سکیں۔ مرحومی مولانا عبدالعلیم صاحب ہمارے درجہ میں کتاب النحو پڑھاتے تھے۔ میں اس کے درس میں پہلے ہی دن سے شریک تھا۔ پہلے دن مولانا نے کتاب النحو کے موضوع کی عبارت خوانی کرائی جو کتاب کے شروع میں غالباً اس طرح درج ہے:

''نحو وہ علم ہے جس سے اسم، فعل اور حرف کو باہم ترکیب دینے اور ان کے آخر کے حالات جاننے کی کیفیت معلوم ہو۔ فائدہ اس علم کا یہ ہے کہ انسان روزمرہ کی بول چال اور تحریر عبارات میں ہر قسم کی خطائے ترکیبی سے محفوظ رہے۔''

مذکورہ عبارت میرے کچھ پلے نہ پڑی۔ کیونکہ میں اردو زبان سے بالکل نابلد تھا، کیسے سمجھتا کہ ''نحو'' کیا چیز ہے؟ ''علم'' کسے کہتے ہیں؟ ''خطائے ترکیبی'' کیا ہے؟ مجھے اپنے اوپر بڑا افسوس ہوا کہ یہ کتاب کیسے پڑھوں گا! دوسرے دن جب درجے میں مولانا کی گھنٹی میں حاضر ہوا تو مولانا نے پہلے دن پڑھائے ہوئے سبق کا اعادہ کرایا۔ لڑکوں سے پوچھا ''نحو'' کسے کہتے ہیں؟ ہمارے بعض ساتھیوں نے بتایا، لیکن میں کچھ نہ بتا سکا۔ اس دن پہلے کے مقابلے زیادہ افسوس ہوا اور پھر سوچنے لگا آخر یہ کتاب کیسے پڑھوں گا؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ اس کے اسباق کو رٹ لیا جائے، چنانچہ مولانا نحو کے جتنے مسائل پڑھاتے جاتے میں پابندی کے ساتھ ان کو رٹ لیتا، چاہے سمجھ میں کچھ نہ آئے اور جب مولانا درجہ میں پوچھتے تو میں سب سے پہلے جواب دینے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ایک سال میں کتاب النحو کے جتنے اسباق ہوئے میں ان سب کا حافظ ہو گیا۔

البتہ صرف کا مسئلہ اس کے برعکس تھا، حالانکہ میزان ومنشعب کتاب جب پہلی بار ہاتھ آئی تو عجیب الجھن ہوئی۔ کیونکہ پہلی مرتبہ دیکھنے میں ایسا لگا جیسے الفاظ کا جال ہے جو پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے استاد مولانا ضیاء الحسن صاحب ندوی اور قاسمی تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن عبارت خوانی کرائے بغیر ماضی کی گردان رٹنے کی ہدایت فرمائی۔ میں دوسرے دن رٹ کر گیا، میری زبان میں شدید لکنت تھی، لوگوں سے گفتگو نہیں کر پاتا تھا، جو سنتا ہنس دیتا اور میں شرمندہ ہو جاتا، لیکن جب قرآن پڑھتا یا گردان سناتا ذرہ برابر بھی لکنت نہ ہوتی۔ میں صرف کے مضمون میں درجہ میں ممتاز تھا۔ ایک ہی بار میں ماضی کی گردان مولانا کم از کم پانچ بار سنتے،

اگر کوئی طالب اٹک جاتا اور اس کی سانس ٹوٹ جاتی تو اس کو آگے سبق نہ دیتے۔ اس طرح صرف کی گھنٹی میں درجہ کے تمام طلبہ کا ایک سبق نہیں ہوتا، بلکہ جتنے طلبہ تھے اتنے ہی سبق بھی۔ البتہ دو تین طالب علم بہت نمایاں تھے اور انہوں نے مولانا ضیاء الحسن صاحبؒ سے میزان و منشعب کے ساتھ ایک تعلیل کی کتاب ''عزیز الطالبین'' بھی پڑھی۔ باقی ساتھی اس سے محروم رہے۔ ان میں سے بندی گھاٹ کے ایک طالب علم حافظ شفیق الرحمن تھے اور وہ مولانا کے خاندان کے بھی تھے، وہ درجہ میں نمایاں ترین طالب تھے۔ عربی اول میں تھے تبھی ہائی اسکول کا امتحان بھی دے رہے تھے۔ وہ مظہر العلوم میں میرے ساتھ صرف چھ مہینے رہے۔ اس کے بعد انہیں عربی دوم میں ترقی دے دی گئی۔ انھوں نے مظہر العلوم سے صرف ایک سال تعلیم حاصل کی، بعد میں وہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج چلے گئے اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ عرصہ تک ریاض میں اور آج کل امریکہ میں اپنی فیملی کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے، آمین۔

دوسرا طالب علم میں تھا اور تیسرے طالب کا نام امین الدین ٹونکی تھا، یہ چندولی ضلع کے رہنے والے تھے، مظہری ہونے کے بعد مظہر العلوم میں ہی مدرس ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد مظہر العلوم چھوڑ کر امروہہ میں کسی مدرسہ میں مدرس اور صدر مدرس ہوئے۔ اب ریٹائرڈ ہو کر وہیں اقامت پذیر ہیں۔ امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مظہر العلوم بنارس میں عربی اول میں ہمارے ساتھ غالباً پندرہ بیس طالب تھے جن میں چند بنارس شہر کے بھی تھے، جن میں مظہر العلوم سے فارغ ہونے والے مولانا رفیق صاحب بنارسی، مولانا امین الدین بنارسی، مولانا زبیر احمد بنارسی اور مولانا امین الدین ٹونکی کے نام نمایاں ہیں۔

مدرسہ کا سالانہ امتحان ہوا تو میں نمایاں نمبرات سے کامیاب ہوا، اس سے میرا حوصلہ بے حد بڑھ گیا۔ دوسرے سال جامعہ وقت سے پہلے پہنچ گیا۔

دوسرے سال ہمارے درجہ کی گھنٹیاں اس طرح سیٹ ہو گئیں:

۱۔ امین الصیغہ ...... مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب

۲۔ القرأۃ الراشدۃ ...... مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب

۳۔ تیسیر المنطق ...... مولانا حیدر علی صاحب

۴۔ ھدایۃ النحو ...... مولانا عبدالمغنی مظہری صاحب

۵۔ نور الایضاح ...... مولانا حیدر علی صاحب

۶۔ شرح مأۃ عامل ...... مولانا عبدالمغنی صاحب

مولانا مرحوم ہم کو دو گھنٹیاں پڑھاتے تھے، ایک امین الصیغہ کی گھنٹی تھی، دوسری القرأۃ الراشدۃ کی۔ صرف مولانا ضیاء الحسن نے پڑھائی تھی اور بڑی دلچسپی اور شوق ولگن کے ساتھ پڑھائی تھی، اس لئے صرف میں کوئی خاص محنت کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن نحو کا مسئلہ اس سے مختلف تھا، نحو کے مسائل از بر ہونے کے باوجود سمجھ سے بالاتر تھے۔ ادب کی گھنٹی مولانا کے زیر تدریس آئی تو یک گونہ مسرت ہوئی، درجے میں سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا۔ مولانا نے فرمایا: ''کون عبارت خوانی کرے گا؟'' میں فوراً کھڑا ہو گیا اور کتاب کا پہلا جملہ پڑھا، غالباً جملہ کچھ اس طرح تھا ''أنام مبکرا فی اللیل وأقوم مبکرا فی الصباح''۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ترجمہ صحیح کیا یا غلط، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ مولانا نے پوچھا ''مبکرا'' کی ترکیب کیا ہے؟ مولانا کا طرزِ تدریس یہ تھا کہ باری باری سب سے پوچھتے۔ جب میری باری آئی تو میں نے بتایا: ''حال''، مولانا کا ستائش بھرا جملہ سن کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور اب میرا معمول ہو گیا کہ ''نحو'' کے رٹے ہوئے اصولوں کو مولانا کے سوالات کے مطابق عملاً منطبق کرنے لگا، جس کی وجہ سے سال بھر کے اندر اندر رٹے ہوئے اصول خوب سمجھ میں آ گئے اور مزاجِ نحو اور فن نحو سے خوب اچھی طرح مانوس ہو گیا اور آج تک اس سے مستفید ہو رہا ہوں۔ اس میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے فیض تربیت کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ اور مولانا کا طلبہ پر یہ وہ احسان تھا جس کو کوئی طالب فراموش نہیں کر سکتا۔ **فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔**

تیسرے سال بھی میں مدرسہ کھلنے سے دو ایک روز پہلے ہی پہنچ گیا۔ نظام الاوقات والدروس پر نظر پڑی، یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ اس سال مولانا ''مولوی اول'' (عربی سوم) میں قرآن مجید کی گھنٹی لیں گے۔ مولانا نے ''سورۃ الحدید'' سے ''الناس'' تک کا کورس مکمل کیا۔ مولانا آیات کے ترجمہ پر اکتفاء کرتے اور نحوی اشکال کا جواب دیتے۔ شاید مظہر العلوم کے نصاب میں ترجمہ قرآن ہی رہا ہو۔ نحو کے قواعد کو سمجھنے میں جو کمزوری تھی اس کی وجہ سے ''الّا'' کا ترجمہ تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا، چنانچہ ''سورۃ الجن'' آیت ''**اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ**'' کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اسی طرح ''سورۃ الغاشیہ'' کی آیت ''**اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ**'' کا ترجمہ اور اس کی تفسیر گرفت میں نہ آ سکی۔ جبکہ عربی دوم میں ''ھدایۃ النحو'' بھی بڑی محنت سے پڑھی تھی اور سمجھ کر از بر بھی کر لیا تھا۔ ''ھدایۃ النحو'' میں استثناء کی بحث میں ہے کہ مستثنیٰ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مستثنیٰ متصل ۲۔ منقطع اور ۳۔ مفرغ

۱۔ مستثنیٰ متصل وہ ہے جس میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے آتا ہے۔ جیسے **جاءنی القوم الا زیدا**

۲۔ مستثنیٰ منقطع یہ ہے کہ مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہ ہو۔ جیسے **جاءنی القوم الا حمارًا۔**

''ھدایۃ النحو'' کی مثال کی روشنی میں یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح یہ منقطع ہوگیا۔ کیونکہ ''علیھم'' اور ''من تولیٰ و کفر''، تو ایک ہی جنس کے ہیں، تو منقطع کیسے ہوگیا؟ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مدرسۃ الاصلاح میں چار سال رہا، مگر یہ عقدہ وہاں بھی لاینحل ہی رہا۔ اللہ تعالیٰ مولانا جلیل احسن ندویؒ کی قبر کو نور سے بھر دے، انہوں نے اس کو خوب اچھی طرح واضح کیا۔ جس کی جھلک ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ میں مولوی اول کے امتحان میں تقریباً تمام ہی مضامین میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔

چوتھے سال بھی حسب معمول مدرسہ کھلنے سے پہلے آ گیا، دارالاقامہ میں پہنچا تو مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کو موجود پایا اور کسی نے مجھے خبر دی کہ اب مولانا مظہر العلوم میں نہیں رہیں گے بلکہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر جا رہے ہیں۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ کچھ دیر کے بعد میں سنبھلا تو سیدھے مولانا کے پاس گیا اور مولانا سے عرض کیا کہ ''سنا ہے آپ مظہر العلوم چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح تشریف لے جا رہے ہیں۔'' مولانا خاموش رہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مولانا نے کہا ''چلو تیار ہو جاؤ۔'' یہ سن کر مولانا عبدالمغنی صاحب نے کہا ''ارے کرایہ ورایہ بھی ہے کہ خالی جانا چاہتے ہو؟'' اس پر مولانا نے کہا کہ ''اس کے علاقہ میں دھان خوب ہوتا ہے۔ دھان بیچ کر آیا ہوگا، کرایہ کی کمی نہیں ہوگی۔'' اس پر مولانا عبدالمغنی صاحب خاموش ہو گئے۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے علاقہ کے ایک اور ساتھی عالمگیر صاحب بھی اپنے گاؤں سے آ گئے، ان کو معلوم ہوا کہ مولانا اصلاح جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ نعیم الدین بھی جا رہا ہے تو وہ بھی مولانا کے پاس گئے اور کہا کہ ''ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔'' تو مولانا از راہ کرم اور خورد نوازی ان کو بھی ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ پھر اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں چار افراد پر مشتمل یہ قافلہ مظہر العلوم سے روانہ ہوا۔ روڈ ویز کے لئے رکشہ لیا گیا اور تھوڑی دیر میں بنارس روڈ ویز پہنچ گئے۔ اعظم گڑھ کی بس جانے کے لئے تیار تھی، ہم چار افراد اس میں سوار ہو گئے۔ ان چار افراد میں ایک تو میں تھا، دوسرے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب، تیسرے عالمگیر اور چوتھے منشی سہیل صاحب تھے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جامعۃ الفلاح کے لوگ ایک عرصہ سے مولانا کو جامعۃ الفلاح آنے کے لیے اصرار کر رہے تھے لیکن مولانا مظہر العلوم چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا جب جامعۃ الفلاح کے اربابِ انتظام کو پتہ چلا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح جا رہے ہیں تو جلدی سے منشی سہیل صاحب کو بنارس بھیجا گیا کہ مولانا کو پہلے جامعۃ الفلاح لایا جائے، تاکہ انہیں قائل کیا جا سکے کہ ان کی مناسب جگہ جامعۃ الفلاح ہے نہ کہ مدرسۃ الاصلاح۔

بعد میں مجھے مولانا شبیر اصلاحی صاحب مرحوم (سابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح) نے بتایا تھا کہ منشی سہیل مرحوم کی ایک خاص صلاحیت یہ تھی کہ انہوں نے اساتذہ کو فراہم کرنے میں بڑی مہارت سے کام لیا تھا، اس وجہ سے جامعۃ الفلاح بہترین اساتذہ کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ منشی سہیل صاحب مولانا کے گاؤں ''بندی گھاٹ'' کے تھے اور جامعۃ الفلاح کے سفیر تھے۔ علاوہ ازیں وہ مولانا کے قریبی دوست تھے۔ بس کا اتنا طویل سفر زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اعظم گڑھ پہنچتے پہنچتے تھک کر چور ہوگیا۔ ہم لوگ بس سے اترے اور روڈ ویز پر چائے کے ایک ہوٹل میں ہم چاروں نے چائے پی اور بلریا گنج کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ ہماری بس جب بنارس سے محمد پور پہنچی تو مولانا نے کسی صاحب کو تحریر دی کہ میں منشی سہیل صاحب کے ساتھ جامعۃ الفلاح جارہا ہوں، آپ جامعۃ الفلاح پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہم لوگ مغرب سے کچھ پہلے جامعۃ الفلاح کے سامنے بس سے اترے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لڑکے جو اس وقت میدان میں کھیل رہے تھے، ہمارا سامان لیا۔ مودودیؒ ہال کے جنوب والے کمرے میں ہمارا سامان رکھ دیا گیا اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا سامان مولانا شہباز اصلاحی صاحبؒ کے کمرے میں رکھا گیا۔ مغرب اور عشاء کی نماز مودودیؒ ہال میں ادا کی گئی۔ عشاء کے بعد ہم لوگ سونے کی تیاریاں کررہے تھے کہ دو آدمی محمد پور سے آگئے جو دونوں مدرسۃ الاصلاح کے رکن انتظامیہ تھے۔ لڑکوں نے بتایا حکیم عبدالقیوم صاحب ندویؒ اور مولانا عبدالمجید صاحب ندویؒ ہیں۔ یہ دونوں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے سلسلہ میں یہاں کے ارکانِ انتظامیہ سے تبادلۂ خیال کے لئے آئے ہیں۔ رات میں ہم لوگ سو گئے۔ مگر رات میں جب نیند کھلی تو مودودیؒ ہال میں لوگوں کی آوازیں گونجتی سنائی دیں۔ صبح ہوئی تو لڑکوں نے بتایا کہ رات میں گرما گرم گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکیم ایوبؒ اور شہباز اصلاحیؒ کی ثالثی کے نتیجہ میں ارکانِ جامعۃ الفلاح کی یہ تجویز رد ہوگئی کہ مولانا مدرسۃ الاصلاح کے بجائے جامعۃ الفلاح میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ حکیم صاحبؒ نے ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''چونکہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب نے مدرسۃ الاصلاح کو زبان دے دی ہے اس لئے مولانا کو وہیں جانا چاہئے۔''

اس زمانہ 1970ء میں مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم کا آغاز 15/شوال سے ہوتا تھا اور جامعۃ الفلاح میں 6/شوال سے۔ مدرسۃ الاصلاح کے کھلنے میں ابھی دیر تھی اس لئے مولانا کو لامحالہ اپنے وطن ''بندی'' جانا تھا۔ مولانا نے ہم دونوں (نعیم الدین اور عالمگیر) کو بلایا اور فرمایا ''دیکھو مدرسۃ الاصلاح میں ابھی انتشار ہے، رمضان سے کچھ پہلے بہت سے اساتذہ کو نکال دیا گیا ہے، اس کے مقابلہ جامعۃ الفلاح میں سکون ہے، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم دونوں کا داخلہ مدرسۃ الاصلاح کے بجائے جامعۃ الفلاح میں کرادوں۔'' ہم دونوں

خاموش رہے۔ دونوں نے جامعۃ الفلاح کا فارم پُر کیا اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے روبروٹسٹ کے لئے پیش ہوئے۔ مولانا نے عربی سوم کے قرآن کا امتحان لیا اور دیر تک سوالات کرتے رہے، ہمیں یاد ہے کہ ہم آیات کا ترجمہ کرلیتے تھے لیکن مفہوم ادا نہیں کر پاتے تھے۔

ایک آیت کے سلسلہ میں ان کا سوال یاد ہے۔ ''سورۂ دہر'' کی آیت "نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا" میں مولانا نے پوچھا "شَدَدْنَا أَسْرَهُمْ" کا مفہوم کیا ہے؟ اور "وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا" کی تفسیر کیا ہوگی؟'' ہمیں یاد ہے کہ ہم مولانا سبحانی صاحب کے سوالات کا جواب نہ دے سکے تھے۔ مولانا نے کچھ انشاء کے سوالات بھی کئے۔ مولانا نے ہم سے کہا کہ ''تم لوگوں کا قرآن بھی کمزور ہے اور انشاء بھی مناسب نہیں۔ لہٰذا تمہارا داخلہ عربی سوم میں لیا جاتا ہے'' اور مولانا عنایت اللہ صاحب نے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ فرمایا۔ مولانا نے کہا ''نعیم الدین عربی چہارم میں چل سکتا ہے، لیکن عالمگیر کمزور ہے۔'' مگر مولانا عنایت اللہ صاحب نے کہا ''میرا خیال ہے دونوں بچے چونکہ ساتھ آئے ہیں اس لئے ان کو ایک ہی درجہ میں رکھنا مناسب ہوگا۔'' چنانچہ ہم دونوں عربی سوم کی کلاس میں پڑھنے لگے۔ اس زمانہ میں جامعۃ الفلاح کے جن اساتذہ کو دیکھا ان میں مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا شہباز اصلاحی، مولانا شبیر اصلاحی قابل ذکر ہیں اور ایک حافظ صاحب بھی جو رکن جماعت تھے، ان کی بینائی کمزور تھی، سرائے میر کے قریب کے رہنے والے تھے، یہ حافظ صاحب اور مولانا صغیر صاحب نئے تھے، دوسرے اساتذہ کو جامعہ مظہر العلوم میں دیکھ چکا تھا۔

1970ء میں رمضان سے پہلے مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب، مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب اور مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب کو دیکھ چکا تھا اور مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے حکم سے ان لوگوں کے ساتھ جامعہ سلفیہ بنارس کے دوعرب اساتذہ سے ملنے کے لئے گیا تھا اور اسی سال بنارس میں مولانا شبیر اصلاحی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا جامعۃ الفلاح کے لئے مہریں بنوانے گئے تھے اور مولانا نے مجھے بھی ان کے ساتھ کردیا تھا۔ ایک سال پہلے مولانا عبدالحسیب کو بھی دیکھ چکا تھا۔ مولانا نے بھی برادرم عبدالہادی فلاحی کے ساتھ جامعۃ الفلاح کے طلبہ کے لئے ریلوے کنسیشن کی سہولت حاصل کرنے کے لئے سفر کیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب صاحب شیروانی زیب تن کئے ہوئے اور سر پر سفید غترہ پہنے ہوئے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا شبیر اصلاحی صاحب کو بھی دیکھا، دارالاقامہ میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کے کمرے میں تشریف

فرماتے تھے۔ رہے مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب تو انہیں اپنے گاؤں میں ہی دیکھ چکا تھا اور وہ ہمارے مدرسہ (مدرسہ اسلامیہ امرسی پور شاخ جامعہ مطلع العلوم) میں کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ ہمارے خاندان کے بزرگ شیخ سلیمان صدیقی رکن جماعت تھے، اس لئے مولانا کا دورہ ان کی جماعتی کارکردگی کا جائزہ لینے اور تحریک کی توسیع کے لئے اکثر ہوا کرتا تھا اور جب مظہر العلوم میں آیا تو وہاں بھی مولانا ابوبکر صاحب کو دیکھتا اور جب جامعۃ الفلاح پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ 1970ء میں مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب جامعۃ الفلاح کے ناظم تھے، اسی لئے جامعۃ الفلاح میں داخلہ کے وقت مولانا عبدالعلیم اصلاحی اور مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ فجزاھما اللہ احسن الجزاء۔

جب ہم جامعۃ الفلاح میں داخل ہوئے تو تعلیمی سال کا ابھی آغاز ہوا تھا۔ اس لئے عموماً کلاسوں میں اساتذہ حاضر نہیں ہو رہے تھے، البتہ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب پہلے ہی دن سے کلاسوں میں بڑی پابندی اور پوری تیاری کے ساتھ آتے۔ تعلیمی جدول کے لحاظ سے ہمارے درجے (درجہ عربی سوم) کی دو گھنٹیاں مولانا سبحانی صاحب کے ذمہ تھیں، ایک قرآن مجید کی گھنٹی جس کا نصاب سورۂ حدید تا سورۂ ناس تھا اور ان کی دوسری گھنٹی مفصل کی تھی۔ مولانا عنایت اللہ صاحب دونوں گھنٹیوں میں وقت کی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے۔ ہم لوگ مظہر العلوم میں لفظی ترجمہ کے عادی تھے "قال کلیلۃ" کا ترجمہ "کہا کلیلہ نے" سے کرتے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے جب سورۂ حدید آیت "وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ" کا ترجمہ کیا: "کیا معقولیت ہے کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے" تو میں نے جھٹ سے یہ بچکانہ سوال جڑ دیا کہ "معقولیت کے معنی کہاں سے پیدا ہو گئے؟ مولانا نے اس سوال کا کیا جواب دیا مجھے یاد نہیں۔" مفصل میں جو سبق تھا وہ صیغہ صفت "فعول" پر مشتمل تھا اور خوب اچھی طرح سمجھ میں آیا تھا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ہم لوگوں کو داخل کر کے بندی گھاٹ روانہ ہوتے وقت ہم سے یہ کہہ کر گئے کہ اصلاح جانے سے پہلے ایک ہفتہ بعد ہم تم لوگوں سے ملنے آئیں گے۔ مولانا اصلاح جانے سے پہلے جب ہم سے ملنے فلاح آئے، ہم سے خیریت پوچھی، ہم دونوں (عالمگیر اور میں) نے بیک زبان کہا کہ "مولانا! ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ اصلاح چلیں گے۔" مولانا نے ہم لوگوں کو سمجھایا، جب ہم لوگ نہ مانے تو مولانا سبحانی کو لگایا کہ ان لڑکوں کو یہیں روک لیجئے، مولانا سبحانی صاحب نے بڑی محبت اور دلجوئی کے ساتھ ہمیں سمجھایا، لیکن ہم لوگ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ سبحانی صاحب نے ہمیں فلاح میں روکنے کے لئے ایک ترکیب سوچی اور فرمایا کہ تم لوگوں کا داخلہ چونکہ تمہارے مطلوبہ درجہ عربی چہارم میں نہیں ہو سکا ہے شاید اس لئے تم جا رہے ہو۔

اس لئے ہم تمہارا داخلہ عربی چہارم میں لے لیتے ہیں، لیکن ہم نے مولانا کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ کیونکہ ہم مولانا کے ساتھ ہی رہنا چاہتے تھے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے جب دیکھا کہ ہم یہاں رہنے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہیں تو ہم کو مجبوراً اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئے اور ہم ایک ہفتہ تک جامعۃ الفلاح میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں سے ترکِ تعلیم کر کے بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کے لئے روانہ ہو گئے۔ اعظم گڑھ پہنچنے کے بعد ہم لوگ سرائمیر کے لئے شام کی ٹرین سے روانہ ہوئے، ایک اسٹیشن ''پھریہا'' پر تقریباً مغرب کے وقت پہنچے۔ کھڑکی سے جھانکا، اسٹیشن کا نام پڑھا، ''پھریہا'' لکھا ہوا تھا، میں نے مولانا سے استفسار کیا کہ کیا یہی وہ بستی ہے جہاں مولانا فراہیؒ رہتے تھے۔ کیونکہ مولانا کے نام سے ہم آشنا تھے، اسباق النحو کی پشت پر انہیں کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ مولانا نے کہا ''ہاں''۔ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جو دیر تک رہی۔ سرائمیر اسٹیشن پر عشاء سے کچھ پہلے گاڑی پہنچی، ہم لوگ گاڑی سے اترے، دولڑکے وہاں موجود تھے جو مولانا کو لینے کے لئے آئے تھے۔ مولانا کے پاس کوئی خاص سامان نہیں تھا، اس لئے ان دونوں نے ہمارے سامان اُٹھا لئے۔ تھوڑی دیر میں ہم مدرسہ پہنچ گئے، ہم تینوں کے سامان مہمان خانے میں رکھ دیئے گئے جو دفتر کے شمال جانب متصلاً تھا۔ ہم لوگوں نے وہیں مہمان خانے میں کھانا کھایا، مسجد میں نماز ادا کی۔ یہاں کی پرشکوہ مسجد دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ کیا یہی ہے وہ مسجد جہاں کبھی مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ وغیرہ نماز پڑھتے رہے۔ یہی سوچتے ہوئے پھر مہمان خانے میں آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک بزرگ مہمان خانے میں آئے، مولانا سے دیر تک بڑی اپنائیت اور بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ بزرگ چلے گئے اور ہم لوگ سونے کے لئے تیار ہو گئے، تو مولانا نے ایک سرد آہ بھری اور فرمایا: ''میں نے جامعہ مظہر العلوم بنارس میں 16 برس تک کام کیا، لیکن کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے کبھی مظہر العلوم چھوڑ کر جانا بھی پڑ سکتا ہے۔'' کچھ دنوں بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ مولانا کے ہم وطن حکیم ادریس ہیں۔

دوسرے دن ہمارے داخلے کی کارروائی ہوئی، ٹسٹ کے لئے مولانا صلاح الدین اصلاحی کے روبرو پیش ہوئے۔ انہوں نے ایک کتاب آگے بڑھائی اور پڑھنے کو کہا۔ ہم نے عبارت پڑھی ''إن الرائد لا يكذب أهله، لو خدعت الناس ما خدعتكم، ولو كذبت الناس ما كذبتكم'' ''رائد'' کا معنی پوچھا۔ ہم دونوں نہیں بتا سکے، کیونکہ ہمارے لئے یہ نیا لفظ تھا۔ مولانا نے اس کا معنی ہمیں سمجھایا، پھر آگے عبارت پڑھنے کو کہا، جو بھی نئے الفاظ آتے محترم مولانا صلاح الدین صاحب اس کے معانی کی طرف کچھ اشارے

کرتے رہے جس سے عبارت فہمی ہمارے لئے آسان ہوجاتی۔

مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ ٹسٹ طویل تھا، مگر مولانا صلاح الدین صاحب کی نرمی اور رہنمائی کی وجہ سے یہ مرحلہ بآسانی طے ہوگیا۔ مولانا محترم نے میرے داخلہ فارم پر لکھا: یہ عربی چہارم میں بآسانی چل سکتے ہیں اور عالمگیر مرحوم کے فارم پر لکھا: یہ عربی چہارم میں بمشکل چل سکتے ہیں۔ افسوس کہ مولانا صلاح الدین صاحب بھی ماہ جون ۲۰۲۳ء میں انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس طرح کے ریمارکس کے بعد ہم دونوں کا داخلہ عربی چہارم میں ہوگیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے بعد جامعہ مظہرالعلوم سے ہمارے جو ساتھی بھی آئے ان سب کا داخلہ عربی چہارم میں ہوا اور خاص بات یہ ہے کہ سراج، نثار دونوں بھائی عربی چہارم پڑھ کر مدرسۃ الاصلاح آئے تھے، مگر ان کا بھی داخلہ ہمارے ہی درجہ میں ہوا۔

چند ہی دنوں کے بعد طلبہ کلاس میں حاضر ہونے لگے اور پڑھائی شروع ہوگئی، جاڑے کا موسم تھا، طلبہ باہر دھوپ میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ عربی ہفتم کلاس کے سامنے اس کلاس کے لڑکے دھوپ میں بیٹھے ہوتے۔ اس میں صرف چار طلبہ تھے جن میں وہ دونوں طالب علم بھی تھے جو سرائمیر اسٹیشن آئے تھے اور ہم لوگوں کے سامان اُٹھانے میں ہماری مدد کی تھی۔ ایک کا نام محمد اجمل اور دوسرے کا سلطان احمد تھا جو آگے چل کر ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کے نام سے مشہور ہوئے۔ افسوس کہ چند سال قبل مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ ہارٹ اٹیک کے ذریعہ انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عربی چہارم میں ہماری گھنٹیاں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں:

۱۔ قرآن مجید — مولانا صلاح الدین صاحب اصلاحی
۲۔ حدیث مؤطا امام مالکؒ — مولانا غالب احسن اصلاحی
۳۔ جمہرۃ خطب العرب — مولانا صلاح الدین صاحب اصلاحی
۴۔ البلاغۃ الواضحۃ — مولانا صلاح الدین صاحب اصلاحی
۵۔ نخبۃ الفکر — مولانا طاہر صاحب چکیا
۶۔ ہدایہ اولین — مولانا ابوالليث صاحب خیرآبادی قاسمی
۷۔ انگریزی — جناب ماسٹر منور صاحب گھوسی

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس جدول میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا نام نہ پاکر راقم کو بہت مایوسی ہوئی کہ ہم مولانا کی تدریس سے محروم ہوگئے۔ مولانا صدر مدرس ہوکر آئے تھے اور ان کی گھنٹیاں شاید عربی ہفتم میں لگائی گئی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا کی گھنٹیاں اس طرح تھیں:

عربی ہفتم: قرآن مجید، سبعہ معلقات، حجۃ اللہ البالغۃ اور بدایۃ المجتہد

جب ہم لوگ مدرسۃ الاصلاح پہنچے تو اس وقت مدرسہ کے انتظامی امور کے ذمہ داران درج ذیل تھے:

ناظم اعلیٰ : جناب عبدالحمید پانڈے صاحب

نائب ناظم : جناب ماسٹر بدیع الزماں صاحب بندولی

معتمد مال : جناب عبدالرحمن ناصر صاحب

صدر مدرس : مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ

نائب صدر : مولانا زین العابدین قاسمی صاحب

عربی اول تا عربی ہفتم کے طلبہ درج ذیل تھے:

عربی اول : قیام الدین اور ان کے ساتھی

عربی دوم : راشد ایوب اور ان کے ساتھی

عربی سوم : ابوسعد سہریا اور ان کے ساتھی

عربی چہارم : ابرار احمد اور ان کے ساتھی (یہی درجہ میرا بھی تھا)

عربی پنجم : حکیم فیضان صاحب اور ان کے ساتھی

عربی ششم : لئیق احمد اور ان کے ساتھی (اسرار صاحب سکروری تھے)

عربی ہفتم : محمد اجمل، سلطان احمد اور ان کے ساتھی (یہ کل چار تھے)

مولانا مدرسۃ الاصلاح میں 1973ء تک رہے۔ دو سال تک مولانا منصب صدارت پر فائز رہے اور ایک سال بحیثیت مدرس خدمات انجام دیں۔ مولانا کے صدر مدرسی کے زمانہ میں ہی عبدالحمید پانڈے صاحب نے نظامت سے استعفیٰ دے دیا تو ان کی جگہ مولانا ابوالحسن علی فراہی کو ناظم مقرر کیا گیا۔ دو سال تک صدر مدرس بنے رہنے کے بعد مولانا نے صدر مدرسی سے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ مولانا احتشام الدین صاحب کو صدر مدرس مقرر کیا گیا اور مولانا نے ایک سال مولانا احتشام الدین اصلاحی صاحب کی ماتحتی میں بحسن وخوش اسلوبی گزارا۔ 1973ء میں جب ہم لوگ عربی ششم کے سالانہ امتحانات دے رہے تھے کہ اچانک مجھ سے ایک دن قاری قربان صاحب نے کہا کہ اب مولانا یہاں نہیں رہیں گے، وہ کریم نگر (اے پی) جا رہے ہیں۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری، کیونکہ میں بہت خوش تھا کہ اب رمضان بعد جب مدرسہ آئیں گے تو عربی ہفتم میں مولانا قرآن، عربی ادب، حجۃ اللہ البالغۃ اور بدایۃ المجتہد وغیرہ ہمیں پڑھائیں گے۔

لیکن میرے اندر ہمت نہیں تھی کہ مولانا سے میں پوچھوں کہ آپ کیوں ہمیں بھنور میں چھوڑ کر جارہے ہیں۔ سالانہ امتحان ختم ہوا۔ مدرسہ میں چھٹی ہوگئی۔ لڑکے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ہم لوگوں کو شام کو اعظم گڑھ سے آنے والی ٹرین سے شاہ گنج جانا تھا۔ ہم سرائمیر اسٹیشن پر جمع تھے، ہمیں چھوڑنے کے لئے مولانا بھی اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ ٹرین آئی، مجھ پر اتنی شدید رقت طاری ہوگئی کہ میں مولانا کے قریب جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ٹرین چل پڑی اور مولانا بھی مدرسہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ میرے آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، اب مجھے یاد نہیں کہ یہ آنسو کب رکے۔

رمضان بعد مدرسہ کھلنے سے ایک روز پہلے میں مدرسۃ الاصلاح حاضر ہوگیا۔ مدرسہ میں اب میرا کوئی ہمدرد وغمگسار نہیں تھا اس لئے میں مضطرب رہتا۔ مگر یہ اضطراب دھیرے دھیرے جاتا رہا۔ اسی درمیان مولانا کا میرے نام خط آیا اور ہدایت دی کہ بنارس سے آنے والے تمام ساتھیوں کو دکھا دینا۔ مولانا نے لکھا تھا کہ ''تم لوگوں کی اردو بہت کمزور ہے اس لئے تم لوگ مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا صدر الدین اصلاحی کی تالیفات کا غور وتامل سے مطالعہ کرو۔'' مجھے یہ خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور مولانا کی ہدایت پر عمل کرنے لگا، البتہ ساتھیوں نے کتنا عمل کیا مجھے پتہ نہیں۔

مدرسۃ الاصلاح میں ہمارے تعلیمی سال کے اختتام میں چند ماہ باقی رہ گئے تھے۔ مولانا کے یہاں کریم نگر کے پتہ پر میں نے ایک خط لکھا کہ مولانا اب میں مدرسۃ الاصلاح سے فارغ ہونے والا ہوں اور جوں جوں فراغت کے دن قریب آرہے ہیں میری بے چینی میں اضافہ ہورہا ہے کہ فراغت کے بعد میں کیا کروں گا۔ مولانا نے خط کا جواب فی الفور دیا ''تم دلجمعی کے ساتھ اپنی تعلیم حاصل کرتے رہو۔ آئندہ کیا کروگے؟ یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں'' میں یہ بتاتا چلوں کہ مولانا نے جن اعلیٰ درجے کے مؤلفین ومحققین کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا تھا وہ میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوا، بلکہ عبارت کے حسن وقبح کو پرکھنے کی صلاحیت بھی پروان چڑھی۔ اردو زبان کی کمزوری دور کرنے میں ایک اور شخص نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا اور وہ تھے مولانا عبدالرحمن ناصر (معتمد مال مدرسۃ الاصلاح)۔ ان سے ایک روز میں نے کہا: میری اردو بہت کمزور ہے، اس کا حل بتائیے۔ انہوں نے مجھ کو نہایت اہم مشورہ دیا جس سے میرے اندر تھوڑا بہت تنقیدی شعور پیدا ہوا۔ مولانا نے فرمایا: پاکستان سے پہلے ایک پرچہ نکلتا تھا جس کا نام فاران ہے۔ اب یہاں کی لائبریری میں نہیں آتا ہے، لیکن اس کی پرانی فائلیں یہاں موجود ہیں۔ اس کے دو کالم کا مطالعہ یکسوئی کے ساتھ کرو، اس سے یہ کمزوری دور ہوسکتی ہے، پرچہ کا اداریہ ''نقش اول'' کے عنوان سے اور اس کے تبصرے ''ہماری نظر میں'' کے عنوان سے چھپتا

ہے، اس کا مطالعہ تمہارے لئے مفید رہے گا'' اس کے ساتھ ''تجلی'' کا اداریہ اور اس کے تبصرے جو ہر ماہ ''کھرے کھوٹے'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے اس کا مطالعہ اردو زبان کے سمجھنے میں مفید ثابت ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں کی ہدایات پر میں نے مکمل عمل کیا اور کیا بتاؤں کہ مجھے کتنا فائدہ پہنچا! اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو اجر جزیل عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

1973ء میں مولانا کے کریم نگر جانے کے بعد میں 1974ء میں فارغ ہوکر سرائے میر سے قریب ہی سنجرپور کے مکتب میں اپنے دوست حافظ ارشاد صاحب کی کوششوں سے 17 رستمبر 1974ء میں مدرس ہوگیا اور پھر تین سال کے بعد ''نیوتنی'' ضلع ''اناؤ'' میں جماعت اسلامی کی درسگاہ جامعہ اسلامیہ میں میرا تقرر ہوگیا۔ سنجرپور میں جب تک تھا مولانا سالانہ چھٹیوں میں اپنے وطن بندی آتے تو مدرسۃ الاصلاح اور سرائمیر کے احباب سے ملاقات ضرور کرتے، مجھ کو معلوم ہوتا تو میں سنجرپور سے سرائمیر آتا، شرفِ ملاقات سے ہمکنار ہوتا۔ نیوتنی جانے کے بعد خط وکتابت کے ذریعہ ایک دوسرے کے احوال وواقعات سے واقفیت ہوتی۔ نیوتنی کے قیام کے زمانے ہی میں مولوی عالمگیر اصلاحی حیدرآباد آئے اور مولانا نے انہیں ظہیرآباد کے ایک مدرسہ میں بحیثیت مدرس رکھوادیا۔

مولانا کریم نگر میں زیادہ دن تک نہیں رہے، کیونکہ مدرسہ دارالہدیٰ کریم نگر سے حیدرآباد منتقل ہوگیا تھا۔ شاید عبدالرزاق لطیفی صاحب کے ایک عزیز عبدالحفیظ خان کی کوشش سے مہدی پٹنم میں منتقل ہوا ہوگا۔ جامعۃ الفلاح کا وفد چھٹے آل انڈیا اجتماع میں شرکت کے لئے حیدرآباد آیا تو اس وقت مولانا سے ملاقات مہدی پٹنم میں ہوئی تھی اور پھر یہ مدرسہ وادئ ھدیٰ میں منتقل ہوگیا، لیکن مولانا کی رہائش ایک طویل عرصہ تک مہدی پٹنم میں ہی رہی۔ پھر 1988ء میں محلہ سعیدآباد منتقل ہوئے اور اس وقت سے ان کا خاندان وہیں سکونت پذیر ہے۔ اللہ انہیں استقامت بخشے، آمین۔

مولانا بنارس کب تشریف لائے؛ جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ مولانا جب مدرسۃ الاصلاح پہنچے تو رات میں مہمان خانہ میں ہم لوگوں سے فرمایا تھا 16 سال تک مظہر العلوم میں قیام پذیر رہا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مظہر العلوم کبھی چھوڑنا بھی پڑسکتا ہے۔ مولانا ایک سال تک فراغت کے فوراً بعد مدرسۃ الاصلاح میں چھوٹے بچوں کے نگراں بھی رہے ہیں۔ اس کی تصدیق پروفیسر عبیداللہ فراہی سے بھی ہوتی ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی سیمینار کے موقع پر حیدرآباد سے اس سیمینار میں شریک ہوئے تھے اور پروفیسر عبیداللہ بھی آئے تھے، انہوں نے اس موقع پر مجھ سے فرمایا کہ مولانا ہم لوگوں کے نگراں تھے۔ نہایت نرم خو اور نرم مزاج نگراں تھے

اور مجھ سے بہت میا کرتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سے نگرانی چھوڑنے کے بعد کچھ دن دارالمصنّفین میں گزارے اور یہ وہ زمانہ تھا جب وحید الدین صاحب اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خان صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وحیدالدین خان صاحب کوانہوں نے **كليلة ودمنة** پڑھایا تھا۔ غالباً یہی وہ زمانہ بھی ہے جب مولانا وحیدالدین خان صاحب ''تعبیر کی غلطی'' لکھ رہے تھے جس میں مولانا عبدالعلیم صاحب کا ذکر بھی ہے۔ دارالمصنّفین کے قیام کے دوران مولانا نے فقہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اس میں خصوصی مہارت پیدا کرلی تھی، جس کا اظہار ان کی کتابوں اور مقالات سے ہوتا ہے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مدرسہ مظہرالعلوم 54ء یا 55ء میں پہنچے ہیں۔

مولانا نے مجھ سے مظہرالعلوم پہنچنے کا قصہ بیان کیا تھا کہ ان کے پاس مظہرالعلوم کے صدر مدرس مولانا عبدالحمید صاحب مکی کا خط آیا کہ آپ مدرسہ پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ مولانا پیلی کوٹھی بنارس پہنچے اور کسی سے کہا کہ ''ہم مولانا عبدالحمید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ صاحب ان کو لے کر حافظ عبدالحمید صاحب کے پاس پہنچ گئے جو شعبۂ حفظ کے بہت پرانے استاذ تھے، حافظ صاحب فوراً سمجھ گئے۔ انہوں نے صدر مدرس مولانا عبدالحمید مکی صاحب سے ملاقات کرادی۔ اس طرح مولانا مظہرالعلوم میں مدرس ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد ان کا شمار مظہرالعلوم کے اعلیٰ مدرسین میں ہونے لگا۔ مظہرالعلوم میں ان کے کچھ نامور شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں:

مولانا ابومحمد مظہری، مولانا عبدالمغنی مظہری، مولانا حیدرعلی مظہری، مولانا افتخارالحسن مظہری، مولانا الطاف الرحمن مظہری، مولانا عبدالباقی مظہری، مولانا شریف صاحب مظہری، مولانا بدیع الزماں بنگالی مظہری، مولانا صابر مظہری فلاحی، مولانا مطیع الرحمن مظہری فلاحی وغیرھم۔ مدرسۃ الاصلاح کے نامور شاگردوں میں مولانا اجمل صاحب اصلاحی اور مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ اور پروفیسر اسلم اصلاحی ہیں جو علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔

مولانا کے اساتذہ

مدرسۃ الاصلاح میں جن اساتذۂ کرام کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا ابوبکر اصلاحیؒ کے نام لائق ذکر ہیں، ان میں مولانا اختر احسن صاحبؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اور مولانا ابواللیث صاحبؒ ندوی سے خاص طور پر متاثر ہوئے تھے اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سے ان کا خصوصی تعلق خاطر تھا۔ مظہرالعلوم میں جب بھی وہ ''ہمارے مولانا'' کہتے تھے ہم طلبہ سمجھ جاتے کہ اس سے مولانا

اختر احسن اصلاحیؒ مراد ہیں اور جب کبھی فرماتے کہ "ہمارے مدرسہ میں ایسا ہوتا ہے" تو ہم لوگوں کے نزدیک اس سے مراد "مدرسۃ الاصلاح" ہوتا۔ وہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی علمی گہرائی، فکری تعمق اور قرآن مجید میں ان کی بصیرت کے بے حد مداح تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی تدریس کا ذکر کبھی چھیڑتے تو فرماتے کہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحبؒ کی زبان میں گولکنت تھی، لیکن جب قرآن مجید پڑھاتے تو ان کی گفتگو منظم، مربوط اور مسلسل ہوتی اور سلاست اور روانی کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کا انتقال پہلے ہو چکا تھا اس لئے ان کو میں نے نہیں دیکھا، لیکن مولانا ابواللیث صاحبؒ اور مولانا صدرالدین صاحبؒ کو مظہر العلوم میں پہلی بار دیکھا تھا اور مولانا کو ان دونوں کا عقیدت مند پایا۔ مولانا ابوبکر اصلاحیؒ کو تو ان کے یہاں بارہا دیکھنے کا موقع ملا، اضلاع مشرقیہ کے دورے پر، مظہــرالعلوم بنارس میں اور اس سے پہلے اپنے گاؤں میں اور اپنے حفظ کے مدرسہ "مدرسہ اسلامیہ امرسی پور" میں دیکھ چکا تھا اور انہیں دیکھ کر ہی میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں بھی انہیں کی طرح عالم بنوں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے گاؤں سے مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا ننھیالی رشتہ تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تفسیر "تدبر قرآن" کو میں نے پہلی مرتبہ مظہر العلوم میں آپ ہی کے پاس دیکھا تھا۔ اصلاحیوں میں جو مقام مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ کا ہے اس سے سبھی لوگ بخوبی واقف ہیں۔ ایک مرتبہ ملاقات کے لئے میں مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کے یہاں "پھولپور" پہنچا۔ ملاقات کے دوران مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا ذکر چھڑ گیا۔ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحبؒ نے فرمایا: "مولوی علیم شروع ہی سے بڑے متقشف واقع ہوئے ہیں"۔

انہوں نے واقعہ بیان کیا کہ "مولانا امین احسن اصلاحیؒ اپنے والد کے انتقال کے بعد پاکستان سے تعزیت کے لئے اپنے وطن "بمہور" تشریف لائے تو کچھ دن قیام کے بعد مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے اور اپنی واپسی تک مدرسۃ الاصلاح پر قیام فرمایا۔ ایک روز مولوی علیم صاحب نے ان کے بارے میں کہا: "ایسے لوگ اقامت دین کا کام کیا کریں گے جو روز ایک شیروانی بدلتے ہیں۔" مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے سامنے مولانا امین احسن اصلاحیؒ جیسے عالم دین پر مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے تبصرے کو سن کر مجھے بڑا تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی! میں جب حیدرآباد آتا ہوں تو مولانا عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ضرور کرتا ہوں۔

اس سال آیا اور دوسرے ہی دن مولانا سے ملاقات ہوئی تو مولانا سے ان کے اس تبصرے کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ اس کی کیا حقیقت تھی؟ مولانا نے فرمایا کہ "مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ پر تبصرہ میں نے مولانا اختر احسن صاحب کے سامنے کیا تھا، ہوسکتا ہے کہ انہوں نے مولانا صدرالدین صاحبؒ سے کہا ہو۔" ہوا

یہ تھا کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ شیروانی بہت شوق سے پہنتے تھے اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد ان کو شیروانی کے کاریگر اچھے نہیں ملتے تھے، ہندوستان آمد کے موقع کو غنیمت جان کر شیروانی کے مشہور ٹیلر محمد حسین صاحب اعظم گڑھ سے کئی شیروانیاں سلوائی تھیں، ہر ایک شیروانی کو منگاتے اور پہن کر دیکھتے کہ صحیح سلی ہوئی ہے کہ نہیں؟ یہی دیکھ کر میں نے مولانا اختر احسن صاحب کے سامنے یہ مذکورہ تبصرہ کیا تھا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ مولانا ابواللیث صاحب کی سیاسی بصیرت اور ان کے دوٹوک تبصرے کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے میرے سامنے مولانا ابواللیث اصلاحی کی اس خوبی کا ذکر کیا اور کہا: ''ایک مرتبہ قاضی عدیل عباسی صاحب نے لکھنؤ میں اتر پردیش تعلیمی کونسل کا اجلاس بلایا، جس میں یوپی کے بڑے بڑے علماء شریک ہوئے، اس میں بنارس سے مظہر العلوم کے نمائندے کی حیثیت سے میں شریک تھا۔ اس اجلاس میں مولانا منظور نعمانی صاحب نے تعلیمی کونسل کی تعلیمی پالیسی بیان کی۔ مولانا ابواللیث صاحبؒ کھڑے ہوئے اور کہا کہ کیا مولانا منظور صاحب کی تقریر پر کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ تمام حاضرین نے بیک زبان کہا کیوں نہیں؟ آپ کو اس پر اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہے۔ مولانا علیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس پر مولانا ابواللیث صاحب نے نہایت جامع نقد و تبصرہ کیا کہ مولانا منظور نعمانی صاحب کی تجویزیں رد ہوگئیں اور مولانا ابواللیث صاحب کے مشوروں کو قبول کر لیا گیا۔''

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے مزید فرمایا: ''ہماری قیام گاہ میں قومی آواز کے ایڈیٹر اور مشہور صحافی حیات اللہ انصاری دوسرے دانشوروں کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ اجلاس کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی قیام گاہ پہنچے۔ حیات اللہ انصاری نے کہا کہ ''لوگ جماعت اسلامی والوں کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہوتے ہیں، لیکن اس شخص نے تو ایسی باتیں کیں جو نہایت معقول تھیں۔'' حیات اللہ انصاری کی اس بات کی تصدیق مولانا ابوالبقاء ندوی نے بھی کی تھی جو اس اہم اجلاس میں دارالمصنّفین کے نمائندے کی حیثیت سے شریک تھے اور مولانا عبدالعلیم صاحب کے ساتھ وہ بھی اسی کمرے میں قیام پذیر تھے۔

لیکن مولانا ابواللیث اصلاحی صاحبؒ سے گہری ارادت و عقیدت رکھنے کے باوجود جب مولانا مرحوم نے اپنے دوسرے دورِ امارت میں الیکشن میں جماعت اسلامی پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی ہٹالی تو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جماعت اسلامی کے ان نمایاں ارکان میں سے ایک تھے جنہوں نے مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب پر شدید تنقیدیں کیں اور دوسری طرف مولانا ابواللیث صاحب کا کمالِ تحمل بھی سامنے آیا کہ انہوں نے ان تنقیدوں کو بڑے ہی صبر سے برداشت کیا اور ان ارکان کے خلاف کوئی ضابطے کی کارروائی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب

حضرات کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مولانا عبدالعلیم صاحب کے مدرسۃ الاصلاح سے کریم نگر اور پھر حیدرآباد منتقل ہوجانے کے بعد مولانا سے تلمذ اور استفادہ کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا تھا، لیکن خط وکتابت اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، جیسا کہ سطورِ بالا میں مذکور ہوا۔

مولانا کا حلقۂ احباب

مولانا چونکہ مدرسۃ الاصلاح، دارالمصنّفین، مظہرالعلوم، جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر وحیدرآباد، جامعۃ البنات والاصلاحیۃ وغیرہ سے وابستہ رہے، اس لئے احباب وتلامذہ کا وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ اعظم گڑھ آمد کے موقع پر جن لوگوں سے ملاقات کرتے ان میں حکیم ایوب صاحب، حاجی مطلوب صاحب سرائمیر، مولانا مجیب اللہ ندوی اور مولانا صدرالدین اصلاحی قابل ذکر ہیں، کبھی کبھی مولانا مجھے بھی ہمراہ لے لیتے۔ ایک دفعہ جامعۃ الفلاح تشریف لائے اور اپنے معمول کے مطابق حکیم صاحب سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا۔ اتفاق سے حکیم صاحب کہیں گئے ہوئے تھے اس لئے ملاقات نہیں ہوسکی، واپسی کے وقت ان کے بچوں کو ایک کتابچہ دیا اور کہا کہ ''حکیم صاحب یہ پڑھ کر اپنا تاثر ضرور ظاہر کریں'' اور مجھ سے فرمایا کہ ''کسی دن آکر حکیم صاحب سے ان کا تاثر معلوم کرلینا۔''

دو چار روز بعد میں حکیم صاحب سے ملنے گیا۔ حکیم صاحب معمول کے مطابق تپاک سے ملے، چائے نوشی کے درمیان میں نے ان سے مولانا کے کتابچہ کے سلسلہ میں ان کا تاثر جاننا چاہا۔ حکیم صاحب نے ارشاد فرمایا: ''مولویوں میں دینی شعور نہیں پیدا ہوسکتا۔'' مجھے یہ تبصرہ سن کر سخت حیرت اور تعجب ہوا، کیونکہ حکیم صاحب مولانا عبدالعلیم صاحب سے متاثر بھی تھے اور ان کے قدردان بھی۔

حکیم صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا کہ تم جماعت سے کیسے متاثر ہوئے؟ میں نے کہا: ''مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کے ذریعہ جماعت کے قریب ہوا اور بعد میں اس کا لٹریچر پڑھا۔'' حکیم صاحب نے فرمایا: ''مولانا عبدالعلیم صاحب سے میں بھی متاثر ہوں۔ آدمی نہایت ہی مخلص ہیں۔'' راقم کے نزدیک یہ دونوں بزرگ اپنے اصولوں کے بڑے پکے تھے۔ اپنے اصولی موقف پر جمنا ان دونوں کی شناخت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، آمین۔

مولانا صدرالدین صاحب سے ملاقات

مولانا حیدرآباد سے جب بھی وطن آتے مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب سے ضرور ملاقات کرتے۔

ایک مرتبہ ملاقات میں میں بھی شریک تھا۔ انہوں نے بڑے تپاک سے مولانا کا خیر مقدم کیا، خیر و عافیت کے تبادلے کے بعد مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب نے پوچھا: ''علیم صاحب! آپ کا جماعت کے ساتھ کیا معاملہ چل رہا ہے؟'' یاد رہے کہ اس زمانے میں مولانا کو جماعت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالعلیم صاحب نے اس کا مختصر جواب دیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''مولانا! انہوں نے جواب بڑا ہی مبہم دیا ہے، اس جواب سے معاملہ کی پوری تفصیل آپ کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں اس کا پورا پس منظر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مولانا نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے اور اس میں مسلمانوں کا بڑا جانی و مالی نقصان ہو تو آپ کے پھولپور کے مسلمان یہاں کے ہندوؤں سے اس کا انتقام لے سکتے ہیں۔ یہ شرعی لحاظ سے بالکل جائز ہے۔'' مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ ''یہ تو بہت ہی بے تکی اور نہایت غلط بات ہے، یہ بھی کوئی لکھنے کی چیز ہے۔'' مولانا عبدالعلیم صاحب مولانا صدر الدین صاحب کی یہ باتیں سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب سے ملاقات

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب نے حیدر آباد قیام کے دوران لڑکیوں کی دینی تعلیم کے پیش نظر بعض ارکان کے ساتھ مل کر سعید آباد میں جامعۃ البنات کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی اور اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ مدرسہ کی ضروریات جب بڑھیں تو مولانا بیرونِ ملک کا سفر کرنے لگے۔ میں جامعۃ الفلاح کی طرف سے جاتا تھا اور چار سال تک ہم دونوں وہاں اکثر و بیشتر ساتھ ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہم دونوں مکہ اور مدینہ میں ساتھ ہو جاتے۔

ایک مرتبہ ہم دونوں انجینئر مجید اللہ خاں صاحب کیلو سبعہ جدہ کے یہاں مقیم تھے، مولانا نے فرمایا: ''مولانا نجات اللہ صدیقی صاحب بھی یہیں کیلو خمسہ پر سکونت پذیر ہیں، چلو ان سے مل آیا جائے۔'' میں بھی بہت ہی شوق سے تیار ہو گیا۔ مولانا نے فون کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب سے وقت مانگا۔ ڈاکٹر صاحب نے بخوشی دوسرے دن تین بجے کا وقت ملاقات کے لیے مقرر فرمایا۔ ہم دونوں وقت پر ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا استقبال کیا اور بڑا پر تکلف ناشتہ کروایا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس درمیان میں مولانا نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ ''ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کے پاس ایک کتاب بھیجی تھی، آپ نے اس کا مطالعہ فرمایا؟'' ڈاکٹر صاحب نے فوراً کہا: ''جی ہاں! ہم نے کتاب پڑھ لی اور اس کتاب پر تبصرہ کر کے آپ کے پاس واپس بھیج دیا ہے۔ کیا یہ کتاب آپ کو اب تک نہیں ملی؟''

مولانا نے کہا: ''نہیں، اب تک نہیں پہنچی ہے۔'' پھر ڈاکٹر صاحب مولانا کی طرف متوجہ ہوئے: ''علیم صاحب! آپ نے جو کتاب لکھی ہے اس کی وجہ سے آپ نہ صرف اپنے اور اپنے گھر کو تباہ کریں گے بلکہ پوری ملت کو تباہی سے ہمکنار کریں گے۔''

پھر ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر اصولِ فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لیا اور کہا: ''ان کتابوں کا میں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ میں اس موضوع سے نابلد ہوں اور صرف آپ ہی اس سے واقف ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب مسلسل گفتگو کرتے رہے اور آخر تک لب ولہجہ نہایت سخت اور تند تھا، مگر واہ رے ہمارے مولانا! صبر وتحمل کا پیکر! ڈاکٹر صاحب کے تند وتیز لہجہ کا جواب پُرخلوص اظہارِ مسرت اور مسلسل تبسم! جب ڈاکٹر صاحب کا تند وتیز لب ولہجہ تھما اور وہ خاموش ہوئے تو مولانا نے نہایت پُرسکون اور مدہم لہجہ میں ایک نہایت زہریلا تیر چلایا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ امریکہ میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے مادہ پرست ہوگئے ہیں، اس وجہ سے ایسی باتیں کررہے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب پھر گویا ہوئے، مگر اب لب ولہجہ نہایت سنجیدہ اور متین تھا: علیم صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ میں مادہ پرست ہوگیا ہوں، لیکن آپ ذرا بتایئے مادہ پرستی کیسے غلط ہے۔'' پھر ڈاکٹر صاحب نے قرآن وسنت سے بہت سے دلائل پیش کئے جس سے ثابت کیا کہ اقامت دین اور اشاعت اسلام میں مال ودولت کی اہمیت بھی اسلام میں مُسلّم ہے۔

مولانا نے ڈاکٹر صاحب کا جواب زیرلب مسکراہٹوں سے دیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے بڑے مشفقانہ لب ولہجہ میں مولانا سے فرمایا: علیم صاحب! ہمارے آپ سے بڑے دیرینہ تعلقات ہیں، مدرسۃ الاصلاح سے جو ہمارے اور آپ کے مخلصانہ تعلقات قائم ہوئے آج تک برقرار ہیں۔ بہت دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہورہی ہے، مگر افسوس ہے کہ آپ سے ہماری گفتگو بڑی تلخ رہی۔ اس تلخ نوائی کی معافی چاہتا ہوں۔ مولانا نے اس کا جواب صرف پُرخلوص تبسّم سے دیا اور ہم لوگ کیلوخمسہ سے رخصت ہوگئے اور افسوس ہے کہ عالم اسلام کا یہ مایہ ناز ماہر معاشیات مولانا کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا شہباز اصلاحیؒ سے ربط وتعلق

مولانا شہباز اصلاحیؒ فرزندانِ اصلاح میں نہایت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی اور مولانا شہباز صاحب کا عہد مدرسۃ الاصلاح میں ایک ہی ہے۔ یہ عہد مدرسۃ الاصلاح کا نہایت زریں عہد ہے۔ اس کی مسند تعلیم وتربیت پر مولانا اختر احسن اصلاحی جلوہ افروز تھے جو تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی زور دیتے تھے۔ ان

کی تعلیمی و تربیتی رہنمائی میں مدرسہ سرگرم عمل تھا۔

مدرسۃ الاصلاح میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جن ساتھیوں سے متاثر تھے اور جن سے عقیدت واحترام کا تعلق برابر قائم تھا وہ مولانا شہباز اصلاحیؒ کی ذاتِ گرامی تھی۔ مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحیؒ، مولانا شہباز صاحبؒ سے کچھ جماعتیں پیچھے تھے، اس لیے ان کی تربیت پر مولانا شہباز صاحب خصوصی توجہ فرماتے۔

تحریک جماعت اسلامی قائم ہو چکی تھی، مدرسۃ الاصلاح کے نامور اساتذہ اس کے سرگرم داعی اور پُرجوش مبلغ تھے جن میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا ابوبکر اصلاحیؒ سرفہرست تھے۔ ان کے طلبہ میں مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اس سے متاثر تھے اور تحریکی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے آس پاس کے گاؤں اور دیہات جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ طلبہ واساتذہ کا جماعتی دورہ ان علاقوں میں مستقل ہوتا۔

مولانا شہباز صاحب اور مولانا عبدالعلیم صاحب بھی ان علاقوں کا دورہ کرتے اور جماعتی کام کی توسیع میں حصہ لیتے۔ اس کے ماہانہ اجتماعات میں یہ دونوں بڑی پابندی سے شریک ہوتے۔ اکثر وبیشتر ان دونوں کا دورہ پیدل ہوتا، حتیٰ کہ اعظم گڑھ کے ضلعی اجتماع کے لیے بھی یہ دونوں سرائے میر سے بسا اوقات پیدل ہی روانہ ہو جاتے۔ دونوں نہایت صحت منداور جسیم تھے، پیدل دورہ کرنے میں انہیں کوئی تکلّف نہیں ہوتا تھا اور نہ تکان محسوس کرتے تھے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ مولانا شہباز صاحبؒ کے ساتھ اپنے دوروں کا بڑی دلچسپی سے تذکرہ کرتے۔ مولانا نے ایک بار مجھ سے کہا: ملک کے آزاد ہونے کے بعد پھول پور میں جماعت کا ایک اجتماع رکھا گیا تھا، میں مولانا شہباز کے ساتھ پھول پور اجتماع کے وقت سے پہلے پہنچ گیا تاکہ لوگوں سے ملاقات کر کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ ہم دونوں دعوت دیتے دیتے ایک صاحب سے ملے جو نسبتاً پڑھے لکھے لگے۔ مولانا شہباز صاحب نے ان کے سامنے جماعت اسلامی کی دعوت نہایت مدلل اور مؤثر انداز سے پیش کی جس سے مخاطب بہت متاثر ہوئے اور مولانا شہباز صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ پاکستان چلے جائیں، کیونکہ وہ ملک ابھی عالم وجود میں آیا ہے، اس کو ایسے افراد کی سخت ضرورت ہے جو اس کی رہنمائی کر سکیں اور آپ کے اندر میں وہ ساری خوبیاں پاتا ہوں جو ایک نوزائیدہ ملک کو اسلامی خطوط پر ڈھال سکیں۔ مگر یہ مجاہد کہاں جاتا! اس نے تو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز اپنے وطن بھارت ہی کو بنا لیا تھا۔

مولانا شہباز صاحب سے میری ملاقات کا سلسلہ ان کے ندوہ میں آنے کے بعد شروع ہوا۔ میں جب مدرسہ اسلامیہ، نیوتنی، ضلع اناؤ میں تھا تو ندوہ اکثر آنا جانا ہوتا اور اپنے استاد جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب مرحوم

اور مولانا شہباز صاحب سے ملاقات کرتا اور جامعۃ الفلاح آنے کے بعد تو میں جب بھی لکھنؤ جاتا ان دونوں سے ضرور ملاقات کرتا۔ مولانا شہباز صاحب مولانا عبدالعلیم صاحب کا تذکرہ ضرور کرتے۔ ایک مرتبہ ملاقات کے درمیان میں نے کہا: ''مولانا! میں رمضان میں حیدرآباد جا رہا ہوں اور مولانا عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ضرور کروں گا۔'' مولانا نے مجھ سے فرمایا: ''مولانا عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ شہباز آپ سے کچھ نہیں مانگتا، صرف آپ کی خیریت کا خواہاں ہے، آپ اپنی خیریت سے اس کو کیوں نہیں آگاہ کرتے! آپ کا اس میں کیا جائے گا! ایک پوسٹ کارڈ ہی نا خرچ ہوگا!''

میں حیدرآباد پہنچا اور مولانا سے ملاقات ہوئی، مولانا شہباز صاحب کا تاثر اور ان کی خواہش ہو بہو انہیں کے اسلوب میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالعلیم صاحب نے مولانا شہباز صاحب کی خواہش کو کس انداز میں لیا، مجھ کو اس وقت اس کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکا۔ مولانا اجتماعات میں شرکت کے بہت پابند تھے۔ اگلے اجتماع میں پہنچا، مولانا غیر حاضر تھے، مجھے تعجب ہوا کہ مولانا کہاں چلے گئے! اجتماع سے غیر حاضر ہوتے نہیں، آخر کیا بات ہے؟! ایک ڈیڑھ ہفتے کے بعد مولانا سے ایک اجتماع میں ملاقات ہوئی تو مولانا سے پوچھا کہ آپ کہاں تھے؟ خیریت تو ہے؟ میں نے بہتوں سے پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں؟ مگر مجھے ہر ایک نے کہا کہ بھائی ہمیں نہیں معلوم ہے۔ مولانا نے کہا کہ

> ''تم نے مولانا شہباز صاحب کی خواہش کا تذکرہ کیا، مجھے نہایت افسوس ہوا۔ میں دوسرے دن اسٹیشن پہنچا اور چالو ٹکٹ لیا اور لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا اور الحمدللہ مولانا شہباز صاحب اور عزیزی مسعود سے مل کر آ رہا ہوں۔''

یہ مسعود صاحب حاجی منظور صاحب شیشے والے بنارس کے فرزند ہیں، ان کا بھی شیشے کا کاروبار ہے اور شہر لکھنؤ میں اچھا چل رہا ہے۔ یہ واقعہ بظاہر بہت معمولی لگتا ہے، لیکن یہ معمولی واقعہ مولانا شہباز صاحب اور مولانا عبدالعلیم صاحب کے درمیان اخلاص و محبت کی گہرائی کا غیر معمولی پتہ دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام عطا فرمائے، آمین۔

مولانا کی کتابیں

جب مظہر العلوم میں پہنچا تو جن اساتذۂ کرام سے طلبہ متاثر اور مطمئن تھے ان میں سب سے زیادہ معتبر نام مولانا عبدالعلیم صاحب کا تھا۔ مولانا ضیاء الحسن قاسمی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، طلبہ پر ان کا رعب بہت تھا، لیکن طلبہ جس شخصیت سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے وہ مولانا عبدالعلیم صاحب کی ذاتِ گرامی تھی۔ مولانا کے سلسلہ میں یہ خیال تھا مولانا مظہر العلوم کے اساتذہ میں فن ادب و تفسیر میں بڑی مہارت رکھتے

ہیں اور اسی طرح تصنیف و تالیف کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ اس وقت مظہرالعلوم میں مولانا کی دو کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں، ایک ''دارالاسلام اور دارالحرب'' کے نام سے شائع ہوئی، دوسری کتاب ''المجتبیٰ'' کا ترجمہ تھا۔ ''کتاب المجتبیٰ'' غالباً الٰہ آباد بورڈ کے نصاب میں داخل تھی۔ بورڈ کے امتحان دینے والے طلبہ کی سہولت کی خاطر اس کا ترجمہ کرایا گیا تھا جو نہایت مقبول تھا۔ جس کی وجہ سے مولانا کی شہرت علمی دنیا میں دور تک پہنچی۔ غالباً یہ کتاب مفتی بنارس مولانا عبدالسلام صاحب نے اپنے ادارہ سے شائع کی تھی۔

''دارالاسلام اور دارالحرب'' مولانا کی باقاعدہ پہلی تصنیف تھی جو شاید مولانا سعید احمد اکبرآبادی (مدیر رسالہ ''برھان'' دہلی) کے کسی مقالہ پر نقد و استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے نام لئے بغیر ان کے خیالات کی تردید کی ہے اور ہندوستان کو فقہی دلائل کے ذریعہ دارالحرب ثابت کیا ہے۔ البتہ دارالحرب کے احکام ہندوستان میں مرتفع رہیں گے، جس طرح جمعہ کی نماز فرض ہے مگر مسافر پر اس کا حکم مرتفع ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کی علمی دنیا میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس پر مدیر ''صدق جدید'' مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مدیر ''تجلی'' مولانا عامر عثمانی صاحب نے تبصرے کئے اور مصنف کی کاوشوں کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا۔

ان تبصروں کی وجہ سے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کی شخصیت علمی دنیا میں قدر و منزلت سے دیکھی جانے لگی۔ مدرسہ مظہر العلوم سے نکل کر حلقۂ دیوبند کے بہت سے علماء نے اس کتاب کو سراہا۔ ہم لوگ مدرسۃ الاصلاح میں تھے، اس وقت مولانا مدرسۃ الاصلاح میں صدر مدرس تھے۔ اس سال بھی معمول کے مطابق ''بیت العلوم'' کا سالانہ جلسہ نہایت دھوم دھام سے منعقد ہوا تھا جس میں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی رحمہما اللہ بھی شریک اجلاس تھے۔ ان دونوں علماء نے اس سال ''بیت العلوم'' کی روایت سے ہٹ کر تقریر کی تھی، کسی جماعت یا کسی مدرسہ پر کسی قسم کی چوٹ کئے بغیر، نہایت عمدہ، موثر اور دلنشین خطاب کیا جس کا عوام پر بہت اچھا اثر پڑا تھا، لیکن دونوں بزرگوں کی تقریریں ''بیت العلوم'' کے ذمہ داروں کے مزاج، ذوق اور رجحان کے خلاف تھیں، اس لئے پھر ان بزرگوں کو ''بیت العلوم'' کے اجلاس میں شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو!

اس جلسہ کے دوسرے دن جمعہ کا دن تھا، ہم طلبہ ''دارالمعلومات'' میں تھے، بہت سے طلبہ محو مطالعہ تھے کہ اچانک دارالمعلومات کے سامنے ایک رکشہ رکا اور ایک بزرگ لنگی میں ملبوس برآمد ہوئے۔ ہم لوگ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ قاضی مجاہدالاسلام صاحب یہاں کیسے؟! صرف اس وقت ہم طلبہ ہی تھے، چھٹی کی وجہ سے کوئی استاذ نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے کہا: ''حضرت آپ کیسے زحمت کش ہوئے ہیں! حکم دیا ہوتا ہم نے سواری کا نظم کیا ہوتا، آپ

اس زحمت سے محفوظ رہتے۔''

مولانا نے فرمایا: ''برسوں سے ہماری تمنا تھی کہ مدرسۃ الاصلاح کی زیارت کی جائے۔ آج مجھے بیت العلوم کے جلسہ کے ذریعہ یہ موقع نصیب ہورہا ہے اور اس مرکز علم وفن کے دیدار سے مشرف ہورہا ہوں۔ سنا ہے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اس وقت یہاں ہیں اور صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ میری ان سے ملاقات کی سبیل نکل سکتی ہے؟''

طلبہ نے کہا: ''آج جمعہ ہے، وہ گھر جاچکے ہیں۔'' اسی اثناء میں قاری قربان صاحب اپنے کمرے سے برآمد ہوئے جو مسجد کے شمال مشرق میں تھا۔ انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا: ''آپ مولانا عبدالعلیم صاحب کو کیسے جانتے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا: ''ان کی کتاب ''دارالاسلام اور دارالحرب'' سے''۔ اس وقت ہمیں احساس ہوا اور یک گونہ مسرت بھی کہ مولانا کی یہ کتاب اربابِ علم ودانش کے نزدیک کیا قدرومنزلت رکھتی ہے!

کتاب المجتنی کے علاوہ مولانا نے دو کتابوں کا اور ترجمہ کیا ہے جن میں سے ایک کتاب ''راہِ سعادت'' ہے جو علامہ امام ابن القیم الجوزی کی کتاب ''طریق الھجرتین وباب السعادتین'' کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ آسان، عام فہم، شگفتہ وشیریں زبان میں کیا گیا ہے۔ یہ تصوف وتزکیہ کی کتاب ہے اور قرآن وسنت کے دلائل سے مزین اور آراستہ ہے۔

ایک اور عربی کتاب کا ترجمہ مولانا نے اردو میں کیا ہے، عربی کی کتاب ایک اخوانی عالم الدکتور علی عبدالحلیم محمود کی لکھی ہوئی ہے اور نظامِ تربیت کے موضوع پر ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ''وسائل تربیت'' کے نام سے کیا گیا ہے، اس کتاب کے ذریعہ اخوان المسلمون کے نظامِ تربیت کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا نے بہت سے مقالات اور کتابچے لکھے ہیں جو بالعموم تنقیدی ہیں، جو مختلف شخصیات اور تحریکی احباب کے فکر ونظر پر نقد واحتساب ہے۔ ان شخصیات اور مولانا کے دیرینہ رفقاء میں جناب مولانا وحیدالدین صاحب، جناب ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب، جناب مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب، جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، جناب پروفیسر عمر حیات خان غوری صاحب، جناب ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب وغیرھم قابل ذکر ہیں۔

کچھ نقد واحتساب جماعت اسلامی کی پالیسیوں اور پروگراموں پر بھی ہے جس کی وجہ سے پہلے مولانا کو جماعت کی رکنیت سے معطل کیا گیا اور بعد میں ان کا اخراج عمل میں آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کے اخراج سے میں بہت دکھی تھا، کیونکہ میں مولانا سے ہی متاثر ہوکر جماعت میں آیا تھا اور پھر بعد میں جماعت کے

لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ میرے علاوہ بہت سے لوگ ہیں جو مولانا سے متاثر ہو کر ہی جماعت کے رکن بنے، جن میں مولانا افتخار الحسن صاحب ندوی، مولانا صابر فلاحی صاحب، مولانا مطیع الرحمن فلاحی، مولانا عالمگیر اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبدالواسع ندوی، مولانا ابو حاتم کھجوریہ وغیرہ کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے۔ ان سب کو بھی مولانا کے اخراج سے ضرور صدمہ ہوا ہوگا۔

جماعت اسلامی سے مولانا کا تعلق

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح میں اپنی تعلیم کے زمانہ ہی میں جماعت سے متاثر ہو گئے تھے اور مدرسۃ الاصلاح میں ہفتہ واری اجتماع میں اساتذہ کے ساتھ کچھ طلبہ بھی بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب کی کتاب ''جماعت اسلامی کی تشکیل جدید'' میں جماعت سے متاثر طلبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، شاید ان طلبہ میں مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا شہباز اصلاحی اور مولانا عبدالعلیم سرفہرست رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جماعت اسلامی مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کے دل کی آواز تھی، مولانا کا دل اسی کے لئے دھڑکتا تھا، مولانا جہاں بھی رہے جماعت اسلامی ان کی شناخت بنی رہی۔ جب میں 1968ء میں مظہر العلوم بنارس میں عربی اول میں داخل ہوا تو اس وقت مولانا ضلع بنارس کے امیر تھے اور پورے شہر میں آپ کا دورہ ہوتا تھا۔ بنارس کے علماء کے درمیان بھی آپ جماعت کے امیر ہی کی حیثیت سے معروف تھے۔ بسا اوقات میں بھی مولانا کے ساتھ ہفتہ واری اجتماع میں شریک ہوتا۔ ایک جگہ کا نام یاد ہے جہاں میں بھی شریک تھا، آج وہ محلہ اور اس کی مسجد جماعت اسلامی کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے، محلہ کا نام اوری پورا ہے۔

شہر کے باہر بھی مولانا کے دورے ہوتے تھے، نودر، نورنگ آباد، ندھوراں، نادی، دھراؤں اور چکیا میں اکثر اجتماعات ہوتے اور مولانا کے دورے ان علاقوں میں مستقل ہوتے۔ دھراؤں کے مولانا نجیب اللہ خان صاحب اصلاحی بھی نہایت سرگرم رکن جماعت تھے۔ وہ مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد اور مولانا ابوبکر اصلاحی کے ہم درس تھے۔ مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب اضلاع مشرقی یوپی کے ناظم تھے۔ یہ بھی دورے کرتے تھے اور یہ ہمارے گاؤں بار بار آتے تھے، البتہ مولانا عبدالعلیم صاحب کو میں نے اپنے گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ وہی امرسی پور گاؤں میں دیکھا تھا، لیکن مولانا نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے گاؤں گئے ہیں اور شیخ سلیمان کے یہاں جو قدیم رکن تھے، قیام کیا تھا۔ مولانا جب تک مظہر العلوم میں رہے ایسا لگتا تھا کہ مظہر العلوم بنارس جماعت اسلامی کا مدرسہ ہے، میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا، لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس مدرسہ پر نصاب

کی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا اثر ہے، سیاسی اعتبار سے جمعیۃ العلماء کے اثرات ہیں۔ مولانا اسعد مدنیؒ کو میں نے مظہر العلوم ہی میں سب سے پہلے دیکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس مدرسہ پر مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اور جماعت اسلامی کی گہری چھاپ تھی۔ وہاں کے مکتب میں تو جماعت اسلامی کا مکمل نصاب ہی داخل تھا۔ مولانا کے مظہر العلوم چھوڑ کر جانے سے صرف مدرسہ کا ہی نقصان نہیں ہوا بلکہ شہر بنارس اور اس کے اطراف میں جماعت کا کام بھی معطل ہو کر رہ گیا جس کا اثر آج تک محسوس کیا جا رہا ہے۔ الحمدللہ آج کل جب سے عزیزم اسد اللہ اعظمی بنارس کے ذمہ دار ہوئے ہیں جماعت کا کام کافی بہتر ہوا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ مولانا کا دور واپس لوٹ کر آ رہا ہے۔ اللہ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ رکھے، آمین۔

بنارس شہر میں ایک مشہور تاجر حاجی منظور صاحب تھے جو جماعت کے رکن تو نہیں تھے مگر نہایت مخلص کارکن تھے۔ مولانا کے ان سے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کے بچوں سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے جناب مسعود صاحب لکھنؤ کی ایک مشہور شخصیت ہیں، یہ بھی مولانا کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح مولانا سے بڑی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ بھی ملّی کاموں میں اپنے والد مرحوم کی طرح بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے، آمین۔

جناب حاجی منظور صاحب نے مولانا سے کہہ رکھا تھا کہ جماعت کی توسیع اور اس کے اجتماعات میں جو مصارف ہوں اس کی آپ فکر مت کیجئے گا، آپ صرف واؤچر بھیج دیا کیجئے، میں سب ادا کر دوں گا۔ منظور صاحب بنارس میں (ڈالمنڈی میں) شیشے کے بڑے کاروباری تھے۔ غالباً آبائی وطن سکرور اعظم گڑھ ہے۔ مولانا وحید الدین خان کے قریبی عزیز تھے۔ مولانا جب بنارس ضلع کے امیر تھے تو اس وقت حلقہ اتر پردیش کے امیر معروف خطیب مولانا حامد حسین صاحب تھے۔ ان کا خطاب حافظ انیس الرحمن صاحب مرحوم کے مکان کے متصل میدان میں دو یا تین دن لگا تار بعد نماز عشاء ہوتا رہا۔ غالباً یہ خطاب 1969ء میں ہوا۔ خطاب میں بھیڑ کافی تھی۔ روزآنہ خطاب ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک رہتا، مگر مجمع مجال ہے کہ ٹس سے مس ہو۔ مجھے اب تک یاد ہے اسٹیج پر مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اور ان کے ایک دوست جناب عبدالحمید صاحب جو میداگن کے پاس لکڑی کے بڑے کاروباری تھے براجمان تھے۔ مولانا حامد حسین صاحب جماعت اسلامی کے صف اول کے مقرر تھے، ہر دن علامہ اقبال کے شعر سے خطاب کا آغاز کرتے، پہلے دن جو شعر پڑھا تھا اس کا کچھ حصہ جو مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے:

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

اسی طرح ہر روز خطاب کا آغاز علامہ اقبال کے کسی نئے شعر سے کرتے۔

آپ درمیان درمیان میں علامہ اقبال کے اشعار سے اپنے خطاب کو مؤثر بناتے۔ آخری دن مولانا نے مسلمانوں کی پستی، زبوں حالی اور ملّی انتشار کا نقشہ کھینچتے ہوئے علامہ کے یہ اشعار اپنے مخصوص لب ولہجہ اور آہنگ کے ساتھ پیش فرمائے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اس خطابِ عام کا اشتہار خوب ہوا تھا، بڑے بڑے پوسٹر اہم مقامات پر ہم لوگوں نے چسپاں کئے تھے اور مولانا نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ پورے شہر میں اعلان کرایا تھا اور یہ خدمت مولانا کے حکم سے میں نے ہی انجام دی تھی۔ یہ خطابِ عام بڑا کامیاب رہا اور اس کی کامیابی میں مولانا عبدالعلیم صاحب کا سب سے اہم رول تھا۔

مولانا جب مدرسۃ الاصلاح آئے تو اس وقت امیر حلقہ مولانا شفیع مونس صاحب تھے۔ ان کو سب سے پہلے میں نے سرائمیر ہی میں دیکھا تھا اور مجھ کو وہ اس اہم منصب کے لئے بالکل موزوں نہیں لگے، کیونکہ میرا عہد طفلی تھا اور مولانا حامد حسین صاحب کو امیر حلقہ کی حیثیت سے دیکھ چکا تھا، ان کے مقابلہ میں وہ بہت پستہ قامت لگے اور میں نے اندازہ لگایا شاید ان کی صلاحیت بھی پست ہو۔ بچپن کے بعض اندازے شاید ایسے ہی غلط ہوتے ہیں۔

سرائے میر کے امیر مقامی مولانا احمد محمود صاحب اصلاحی تھے جو شاعر بھی تھے اور مقرر بھی۔ مولانا یہاں 1970ء میں آنے کے بعد حسب سہولت قاری قربان صاحب اور مولوی اخلاق صاحب کے ساتھ مختلف گاؤں کا دورہ کرتے اور جماعت کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے۔ مقامی اجتماعات میں جو سرائمیر میں منعقد ہوتے برابر شریک ہوتے۔ کبھی کبھی مولانا کے ساتھ مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوتا۔ میں عربی ششم میں تھا، سنجر پور پورب محلہ میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا ہم دو طالب علموں کے ساتھ شریک ہوئے۔ ان دو طالب علموں میں

ایک میں تھا اور ایک علاؤالدین دمکا۔ اس جلسہ میں مولانا ادریس صاحب اصلاحی بھی شریک تھے جو کبھی جامعہ اسلامیہ بنارس کے صدر مدرس تھے اور مولانا کے استاد بھی تھے۔ سب سے پہلے علاؤالدین نے تقریر کی اور بہت شاندار تقریر کی۔ اس کے بعد میری تقریر ہوئی جو بہت پھیکی تھی۔ بعد میں جب ہم لوگ رات میں سرائے میر کے لئے لوٹے تو میں نے مولانا سے کہا: ''مولانا! میں تقریر کر رہا تھا تو میری زبان بالکل خشک ہوگئی تھی۔'' مولانا نے کہا: ''تم ڈر گئے تھے اس لئے ایسا ہوا۔'' اس طرح مولانا طالب علموں کو اجتماعات میں لے جا کر ان کی صلاحیتوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے۔ اس موقع پر مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اور مولانا ادریس صاحب نے تقریریں کیں اور طویل تقریریں کیں اور مجمع ہمہ تن گوش تھا جو تقریروں کی تاثیر کا پتہ دے رہا تھا۔

مولانا جب کریم نگر پہنچے اور وہاں سے حیدرآباد منتقل ہوئے تو وہاں بھی تحریک کے کام میں پیش پیش تھے جس کے گواہ جناب مہتدی صاحب حیدرآبادی اور عبدالعظیم صاحب نظام آبادی ہیں۔ یہ دونوں بھی مولانا کے خاص شاگرد ہیں۔ جس میں مہتدی صاحب تو بہت شاندار مقرر ہیں اور اسی طرح عبدالعظیم نظام آبادی صاحب بھی مقرر ہیں اور علاقہ کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے مرد اور خواتین پر مولانا کی تحریکی تربیت کے اثرات ہوں گے جن سے میں واقف نہیں ہوں۔

مختصر یہ کہ مولانا جہاں بھی رہے لوگوں پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتے۔ میں نے اپنے اساتذہ میں، جو بیشتر مرحوم ہو چکے ہیں اور بہت ہی تھوڑے ہیں جو بقید حیات ہیں، مولانا سے زیادہ صابر و شاکر، متوکّل، بے نیاز، متحمل، منکسر المزاج اور حق کے معاملے میں نڈر اور بے باک کسی کو نہیں پایا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

پروفیسر محمد اسلم اصلاحی
سابق ڈین اسکول آف لنگویجز،
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

مدرسۃ الاصلاح میں بغرض تعلیم میرا قیام ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک رہا یعنی کل تقریباً دس گیارہ سال۔ یہ زمانہ ہماری ملکی اور غیر ملکی تاریخ میں انتہائی ہنگامہ خیز اور پرآشوب رہا تھا۔ وہ اس طرح کہ اگر اسی زمانہ میں ہمارے ملک نے چین اور پاکستان سے تین بڑی لڑائیاں لڑیں تو وہیں دوسری طرف ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں کو میدان جنگ میں دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب بحکم خدا ستارے گردش میں آتے ہیں تو ان کے اثرات سے بمشکل تمام ہی کوئی بچ پاتا ہے۔ انجام کار ہمارا مدرسہ بھی اس گردش ایام کا شکار ہوا اور یہاں بھی ہمارے بعض اساتذہ اور مدرسہ کے بعض اراکین باہم دست بگریباں ہو گئے اور ایک مرحلے پر حالات اتنے خراب ہو گئے کہ کارپردازان مدرسہ کو اپنے مسائل کے حل کے لئے مجلس عمومی کو بلانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ بالفاظ دیگر جن حاملین فکر فراہیؒ کے کاندھوں پر عوام کالانعام کی رشد و ہدایت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی انھیں کو عوام کے دربار میں خود اپنی رہنمائی اور رہبری کے لئے دست بستہ جانا پڑا اور اپنی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے ان سے مدد طلب کرنی پڑی۔

مجھے آج بھی یہ اچھی طرح یاد ہے کہ مذکورہ مجلس عمومی کا انعقاد مدرسہ کی طویل و عریض مسجد میں ہوا تھا اور قرب و جوار کے وہ لوگ جنھیں مدرسہ کے امور سے خاطر خواہ دلچسپی تھی، اچھی خاصی تعداد میں حاضر ہوئے تھے، اس مجلس کی ابتدائی کارروائی کا آغاز یوں تو انتہائی متانت اور سنجیدگی سے ہوا لیکن آہستہ آہستہ مخاصمین کے طرز تخاطب کی لے بگڑنے لگی یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں انھوں نے الفاظ کے زیر و بم پر اپنا قابو کھو دیا اور پھر

جلد ہی بات ترش کلامی نیز تلخ نوائی سے نکل کر تو تڑاک تک پہنچ گئی اور جس کا اختتام دھینگا مشتی اور ہاتھا پائی پر ہوا۔ اس انتہائی ناگفتہ بہ صورتحال کے تدارک کے لئے بالآخر پرنو وکیل جن کا شمار اس زمانے میں اعظم گڑھ کے انتہائی شاطر اور تیز طرار وکیلوں میں ہوتا تھا، نے مائک سنبھالا اور انتہائی لجاجت بھرے انداز میں حاملین فکر فراہیؒ سے درخواست کی کہ وہ پرسکون ہوجائیں اور ان کی باتوں کو غور سے سنیں۔ خدارا کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے مدرسہ کو درپیش مسائل مزید پیچیدہ ہوجائیں۔ شکر ہے کہ ان کی یہ درخواست صدا بہ صحرا نہیں ثابت ہوئی اور حاضرین ان کی جذباتی تقریر کو سننے کے لئے خاموش ہوگئے۔ اپنی اس تقریر میں انھوں نے انتہائی پرجوش انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم انتشار و افتراق کے راستوں سے بچیں اور آپس میں اتفاق و اتحاد کی بنیادوں کو مضبوط کریں اور اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا، ان کے اس طرح کے خیالات کا حاضرین پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ان کی باتوں کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوگئے۔

ایک مختصر لیکن جذباتی تقریر کے بعد انھوں نے وہاں موجود لوگوں سے ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی اجازت طلب کی جو مدرسہ کو درپیش مسائل پر پرسکون ماحول میں غور و فکر کرے گی اور چند دنوں کے اندر اندر ہی اپنی تجاویز نیز سفارشات کو منظر عام پر لائے گی۔ حاضرین کی اکثریت نے ان کی اس رائے سے اتفاق کیا اور اس طرح انھیں متعلقہ کمیٹی کی تشکیل کی اجازت مل گئی۔ اس کمیٹی نے باہمی بحث و تمحیص اور متحارب گروہوں سے صلاح و مشورہ کے بعد چند دنوں کے اندر ہی اپنی رپورٹ پیش کردی۔ اصلاح احوال کے لئے اس رپورٹ میں جن تجاویز کا ذکر تھا ان کے گہرے اثرات مدرسہ کے آنے والے حالات پر پڑے کچھ منفی کچھ مثبت۔ منفی اثرات کا ذکر چونکہ یہاں طوالت سے خالی نہیں اس لئے ان کو ہم یہاں قلم انداز کرتے ہیں۔ اب جہاں تک مثبت اثرات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم بصد فخر و ابتہاج یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاذ گرامی محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی مدرسہ میں آمد انھیں مثبت اثرات کی رہین منت تھی۔

اس میں دورائے نہیں کہ مذکورہ بالا ہنگامی حالات کی وجہ سے مدرسہ کی شہرت و ناموری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا لیکن بایں ہمہ ان کے طفیل میں مدرسہ کے انتظامی و تعلیمی نظام میں بعض انتہائی خوش آئند تبدیلیاں ہمیں دیکھنے کو ملیں۔ ان گراں قدر تبدیلیوں میں سے سب سے پہلی تبدیلی حضرۃ الاستاذ علامہ عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ہمارے مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس تقرری تھی۔ ہم طلبہ چونکہ حضرت سے واقف نہیں تھے اس لئے ہمارے دلوں میں یہ خواہش جاگی کہ ہم ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ ہماری ان کوششوں کے نتیجے میں ہمیں پتہ چلا کہ جناب والا بنارس کے کسی مدرسہ میں معلمی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور نظریاتی طور پر وہ

بعض امور میں اختلاف رائے کے باوجود جماعت اسلامی سے قریب یا اس سے وابستہ ہیں اور ہندوستان کو دارالحرب مانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں اس آخرالذکر مسئلے یعنی دارالحرب کو لے کر ہم طلبہ کے درمیان بحثاً بحثی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ بعض طلبہ اگر اس فکر کے حامی تھے تو وہیں بعض ایسے بھی تھے جنھیں اس رائے سے اتفاق نہیں تھا ایسے طلبہ کا کہنا تھا کہ موجودہ بھارت نہ تو دارالحرب ہے اور نہ ہی دارالاسلام بلکہ یہ دارالامان ہے کیونکہ یہاں آئینی لحاظ سے کسی مذہب، کسی فرقے یا کسی گروہ کو ایک دوسرے پر بالادستی حاصل نہیں ہے نیز موجودہ دستور ہند اس ملک میں رہنے والے کو برابری کا حق دیتا ہے۔ وہ طلبہ جو استاذ گرامی کے اس نظریے کے حامی تھے کہ آج کا بھارت مسلمانوں کے حق میں عملاً دارالحرب ہے، یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اولاً دارالامن کی اصطلاح موجودہ دور کی پیداوار ہے کیونکہ تاریخ کی کتابوں سے ہمیں یا تو دارالاسلام کا پتہ چلتا ہے یا پھر دارالحرب کا۔ ثانیاً موجودہ بھارت میں تمام دستوری تحفظات کے باوجود مسلمانوں کی جان و مال نیز عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہاں پر آئے دن ہونے والے مسلم کش فسادات ہیں۔

ان تمام باتوں کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ استاذ گرامی کے قدوم میمنت لزوم سے پہلے ہی ہم طلبہ کی ذہنی وفکری سوچ کے دھارے مدرسہ کے اندرونی انتشار وخلفشار سے ہٹ کر بڑی حد تک بیرونی خطرات وخدشات کی طرف مڑ گئے تھے اور ہم اس بحث میں نہیں الجھتے تھے کہ فی زمانہ فکر فراہی کا سب سے بڑا حامل کون ہے اور کیوں ہے۔ اسی طرح ہم اندرون مدرسہ بعض اساتذہ کرام کی ریشہ دوانیوں پر بحث وتکرار سے اجتناب کرنے لگے تھے۔ بالاختصار ہم یہاں کہہ سکتے ہیں کہ استاذ محترم نے اپنی آمد سے قبل ہی ہمارے ذہن وفکر کو ایک نئی جہت اور ایک نئے آہنگ سے آشنا کر دیا تھا اور انھیں سب وجوہات سے ہم طلبہ کی اکثریت انتہائی شدت وحدت سے مدرسے پر ان کی آمد کا انتظار کرنے لگی تھی، میں تو خاص طور سے اس ساعت ہمایونی کے لئے چشم براہ ہوگیا کیونکہ ذہنی وفکری لحاظ سے میں خود کو استاذ گرامی کے اس نظریے کے قریب پاتا تھا کہ موجودہ بھارت مسلمانوں کے لئے دارالامن نہیں بلکہ دارالحرب ہے بلکہ دارالحرب سے بھی بدتر ہے۔ بدتر اس لئے کہ یہاں دنیا والوں کو دھوکہ دینے کے لئے مسلمانوں کے خلاف ہر چند کہ اعلان جنگ نہیں ہے پھر بھی یہاں مسلمانوں کا قتل عام اور ان کی املاک کو تباہ و برباد کرنا ایک برہنہ حقیقت ہے۔ اس بدترین صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اسی زمانہ میں ایک طرحی غزل لکھی تھی جس کا درج ذیل شعر کافی مقبول ہوا:

اس حسن کرشمہ کا عنوان نہیں کوئی
کرتوت تو چنگیزی دستور اہنسائی

میری اس فکری ساخت کے پس پشت میرے والد بزرگوار کا یہ نظریہ تھا کہ:

ممکن نہیں ہے صلح حسین و یزید میں
اسلام ہے تو کفر سے ٹکرائے گا ضرور

بالفاظ دیگر معرکۂ حق و باطل میں ہم مسلمانوں کے پاس کوئی تیسرا اختیار نہیں ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی اس باب میں لَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ نہ صرف خود کو دھوکہ دیتا ہے بلکہ اپنی اس طرح کی سوچ سے اوروں کو یہ بتلانا چاہتا ہے کہ اس کے عقیدہ و ایمان میں خلل ہے، نقص ہے اور یہ نقص ہماری نگاہوں میں ایک ایسا نقص ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی کے سارے دروازے ہمارے سامنے بند ہوجاتے ہیں۔ اس ضمن میں سچ تو یہ ہے کہ ہماری موجودہ ذلت و رسوائی نیز تنزل و ادبار اسی فساد ایمانی کا نتیجہ ہیں۔

یہاں اس طول کلامی سے ہماری غرض و غایت صرف اتنی ہے کہ حضرۃ الاستاذ سے میری قربت صرف تعلیم و تعلم کی حد تک محدود نہیں تھی کیونکہ ہمارے مابین فکری و نظریاتی ہم آہنگی کا ایک ایسا رشتہ تھا جس نے مجھ کو غیر درسی امور میں بھی ان سے قریب کر رکھا تھا۔ بنابریں میں غیر تدریسی اوقات میں بھی ان کی ذات بابرکات سے فیضیاب ہوتا تھا۔ چنانچہ بحیثیت صدر مدرس جب کبھی بھی انھیں طلبہ کے بعض انتظامی امور و مسائل کے تعلق سے میری رائے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ ضرور میری رائے جاننے کی کوشش کرتے۔ مدرسے پر آنے کے بعد انھوں نے کچھ ایسے اقدامات کئے اور بعض ایسی انتظامی اصلاحات انجام دیں جن کے نقوش نہ صرف میرے ذہن و دماغ میں آج تک تازہ ہیں بلکہ ان سے مجھے اس وقت بے انتہا مدد ملی جب مجھے یونیورسٹیوں کے مختلف انتظامی عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں نے ان سے سیکھی وہ یہ کہ حالات خواہ کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں ہم اپنا آپا کبھی نہ کھوئیں اور اگر معاملات بالکل ہی خراب ہوجائیں تو ہم ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ پر عمل پیرا ہو کر ان کو خوبصورتی سے ٹال جائیں یا پھر صبر جمیل کا مظاہرہ کریں۔

دوسری بات یہ کہ ہم كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کی تفسیر بن کر ہمہ وقت خود کو مصروف رکھیں یعنی ''بیکار مباش کچھ کیا کر''، یہی وجہ تھی کہ ہم نے دیکھا کہ ان کا تقرر مدرسہ پر ہر چند کہ بحیثیت مدرس اور صدر مدرسین ہوا تھا لیکن ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ چنانچہ وہ مدرسہ پر اپنی رسمی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد اکثر و بیشتر قصبہ سرائے میر کا رخ کرتے جہاں ان کے حلقۂ احباب میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے ابتداء میں ہم طلبہ کا خیال تھا کہ وہ وہاں محض تفریح طبع یا تضیع اوقات کے لئے جاتے ہیں، لیکن مجھے اپنے اس غلط خیال پر اس وقت سخت ندامت ہوئی جب ایک روز وہ کہنے لگے ''اجی! فی زمانہ ہندوؤں کے درمیان تبلیغ و اشاعت دین کا کام کرنا

بہت مشکل ہے۔ یہ بہت ڈھیٹ اور منھ پھٹ لوگ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا ایسا کیا ہوا؟ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ تو کہنے لگے ''کل میں جب لکشمی (قصبہ سرائے میر کے اس وقت کے ایک معروف کپڑا تاجر) کے پاس دعوتی لٹریچر لے کر گیا تو انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ جواباً میں نے جب ان سے یہ کہا کہ یہ اسلام کے متعلق چند کتابیں ہیں، انھیں اپنے پاس رکھ لیجئے۔ فرصت ملے تو انھیں پڑھ لیجئے گا۔ اِن سے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے میں آپ کو بہت مدد ملے گی۔ یہ سن کر اس نے برجستہ میرے منھ پر کہا کہ

''آپ مسلمان لوگ بہت چالاک ہیں جب حکومت ہاتھ میں ہوتی ہے تو تلوار لے کر ہمارے پاس آتے ہیں اور جب حکومت چلی جاتی ہے تو کتابیں لے کر''۔

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہے تھے تو ان کے انداز بیان سے ان کے داخلی کرب کا اظہار ہو رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے لکشمی کی باتوں سے انھیں سخت دھچکا لگا ہے لیکن پھر فوراً سنبھلتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ دعوت حق کی راہ میں اس طرح کی صورتحال تو معمول کی بات ہے۔ ہمیں اس سے قطعاً مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں نتائج کی پرواہ کئے بغیر اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ ان کے ان کلمات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لکشمی کی تلخ نوائی پر خندہ زن ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ اس طرح کے جملوں سے ان کے دعوتی عزم وارادے کو مزید توانائی حاصل ہوتی ہے۔

استاذ گرامی یہ سب کچھ کہہ رہے تھے اور میں من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ ہماری دینی تعلیم وتربیت کا مقصد صرف ڈگریاں یا اسناد حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی غرض وغایت یہ ہے کہ ہم نہ صرف اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کریں بلکہ دیگر بندگان خدا کو یہ بتلائیں کہ ان کا خالق اور ان کا رازق ان سے کیا چاہتا ہے۔ استاذ محترم سے ملاقات سے قبل یہ نکتہ گراں مایہ میری نظروں سے اوجھل تھا اور میں سمجھتا تھا کہ ہمارا ہدف صرف نصابی کتابوں کو پڑھنا پڑھانا ہے، امتحان دینا ہے اور پھر ڈگری لے کر یہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔ فراغت کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے یہ چیز ہم پر واضح نہیں تھی۔ کیونکہ ہم اپنے پیشرو طلبہ کو دیکھتے تھے کہ وہ زیادہ تر مدرسی کے پیشے سے وابستہ ہو جاتے ہیں یا پھر تجارت کے گورکھ دھندھوں میں پھنس جاتے ہیں ہاں البتہ انھیں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو عصری جامعات میں داخلہ لے کر اپنے جذبۂ حصول تعلیم کی مزید آبیاری کرتے ہیں۔

استاذ محترم کی نظر میں یہ سبھی طریقے، یہ سبھی راستے مستحسن تھے بشرطیکہ ہم مدارس کی تعلیم کے اصلی ہدف اعلاء کلمۃ اللہ، احقاق حق اور ابطال باطل کو ہمیشہ مقدم رکھیں۔ جہاں کہیں بھی رہیں اپنے قول وعمل سے اولاد آدم کو دین حنیف کی دعوت دیتے رہیں۔ دراصل یہی وہ ہدف تھا جس کو روبہ عمل لانے کے لئے استاذ گرامی ہمہ وقت نرم

دم گفتگو اور گرم دم جستجو رہا کرتے تھے۔ جب تک مدرسہ کے اندر رہتے تدریسی اوقات میں اپنی ساری صلاحیتیں طلبہ کے سامنے نصابی کتب کی تشریح وتوضیح کے لئے وقف رکھتے اور جب اس اہم فریضے سے فارغ ہوتے تو انتظامی امور وفرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوجاتے۔ ان تمام مصروفیتوں کے دوران وہ تھوڑا بہت وقت تبلیغ و اشاعت دین کے لئے بھی نکال لیا کرتے تھے۔

اللہ کا یہ بڑا کرم ہے کہ مجھے استاذ محترم سے علمی استفادہ کا موقع اس وقت ملا جب میں عربی درجات کے آخری سالوں میں تھا اور مجھے مدرسہ میں ہورہی اکثر تعلیمی نیز انتظامی سرگرمیوں کی نہ صرف خبر رہتی تھی بلکہ میں بسا اوقات ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتا تھا۔ کلاس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان پر سرسری نہیں بلکہ گہرائی سے غور وفکر کرتا تھا۔ جن کتابوں نے اس زمانے میں مجھے ذہنی اور فکری طور پر بہت زیادہ متاثر کیا ان میں شاہ ولیؒ اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو اولین مقام حاصل ہے۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کی تدریس کی ذمہ داری استاذ محترم کو سونپی گئی تھی۔ اب یہ اس کتاب کے مشمولات کی جذب معنویت تھی یا استاذ محترم کے طریقۂ تدریس کی خوبی کہ مجھے خود پتہ نہیں چلا کہ میں کیوں جوں جوں اس کتاب کو پڑھتا جاتا ہوں میرے ناپختہ ذہن و دماغ کے دائروں میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور میرے اندر یہ احساس جاگزیں ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے مذہب کا دائرۂ عمل چند رسوم وتقالید کی ادائیگی تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہماری تگ وتاز کا محور صرف عبادات ہی نہیں بلکہ وہ امور ومعاملات بھی ہیں جن سے انسانی تہذیب وتمدن کو فروغ نیز بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

اس کتاب کے درس کے دوران استاذ محترم خود کو محض مشکل الفاظ وتراکیب کی تشریح وتوضیح تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اس ضمن میں ان کی کوشش ہوتی تھی وہ ہم طلبہ کے دائرۂ فہم میں ان افکار ونظریات کو لائیں جن کی تبلیغ وترسیل کے لئے شاہ صاحب نے اپنی اس فکر انگیز کتاب کو تحریر کیا تھا اور جن سے واقفیت ہمارے عقیدہ و ایمان کو توانائی اور مضبوطی عطا کرتی ہے۔ کتاب کے منطقی طرز استدلال کی وضاحت استاذ محترم کچھ اس قدر پرکشش، پراثر اور سلیس انداز میں کرتے کہ فکر ولی اللٰہی کے باریک سے باریک گوشے کھل کر سامنے آجاتے اور ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوتی جاتی کہ تجلیات حق کے ادراک نیز اسرار احکام شریعت کی حقیقی تفہیم کے لئے تزکیہ نفس اولین شرط ہے کیونکہ شریعت میں مذکور بعض امور غیبیہ کی گرہ کشائی ہمارے لئے اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم اپنی قوت بہیمیہ کو کچل کر ملکوتی صفات سے متصف نہ ہوجائیں۔ بالفاظ دیگر ہمارے اندر روحانیت کی نمود صرف اسی شکل میں ممکن ہے جب ہم اپنی ذات والا صفات کو مادیت کی آلائشوں سے پاک کرلیں۔ یہ کام بہر حال کچھ آسان نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے انتہائی ریاضت اور بڑی مشقت کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہر ہوسنا کے نہ داند جام وسنداں باختن

قوت بہیمیہ کوتاراج کرنا نیز نفسانی خواہشات پر غلبہ پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اشد الجهاد جهاد الهوىٰ کا مطلب یہی ہے۔ استاذ محترم نے احکام شریعت کے اس ملکوتی پہلو کو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے محتویات کی روشنی میں ہم طلبہ پر نہ صرف واضح کیا بلکہ اپنے طور طریق اور طرز عمل سے یہ ثابت کیا کہ جب آنکھیں بند ہوتی ہیں تو دل بیدار ہوتا ہے ایک ایسا دل جس کے بارے میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس پس منظر میں میں نے جب کبھی ان سے گفتگو کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا دل ہر مظلوم و بے کس انسان کے لیے تڑپتا ہے حتی کہ ان لوگوں کے لئے بھی تڑپتا ہے جو بسبب حقد وحسد ہمہ وقت ان کی بیخ کنی کے لئے سرگرم رہتے تھے۔ مجھے ان کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوتی تھی کیونکہ اپنے مخالفین کے لئے خیر سگالی کا جذبہ رکھنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ ان کے اس جذبہ خیر خواہی کا سب سے پہلا مشاہدہ ہم طلبہ نے اس وقت کیا جب ہم سب نے دیکھا کہ ہمارے مدرسہ کے مطبخ کے ملازم ''پانچوں صاحب'' کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ہم یہ جان لیں کہ یہ حضرت یعنی پانچوں صاحب ہیں کون۔ یہ پانچوں صاحب ہمارے مطبخ کے سب سے پرانے ملازم تھے۔ ویسے تو وہ مطبخ کا تقریباً ہر کام کرتے تھے لیکن ہم نے ان کو اکثر تندور کے پاس لوئیاں بناتے دیکھا۔ اس سے ہماری خاص دوستی تھی، ہماری یعنی ہم بعض طلبہ کی۔ وہ بھی خاص مطلب کے لئے اور وہ یہ کہ جب کبھی عصر کے بعد ہماری بھوک کا پارہ برداشت کی حدوں کو پار کر جاتا اور ہمیں بوجہ مفلسی اس کو کم کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تو ہم قصے کہانیوں کی کوئی کتاب لے کر تندور کے پاس جا کر بیٹھ جاتے اور طباخ کو جس کا نام یاسین تھا کہانیاں سناتے کیونکہ اسے کہانی قصے سننے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے حضرت پانچوں بھی اس شوق میں اس کے برابر کے شریک و سہیم تھے ہماری اس خدمت یعنی ہماری قصہ خوانی کے عوض طباخ یاسین جب ہماری طرف کوئی جلی کٹی یا خراب ہوگئی روٹی کو اچھال دیتا تو ہم اسے لے کر نو دو گیارہ ہوجاتے یہاں یہ یاد رہے کہ طباخ اس طرح کی فیاضی صرف اسی وقت دکھلاتا جب کہانی پوری ہوگئی ہوتی اور کہانی سنانے کے دوران کوئی روٹی جل جاتی یا خراب ہوجاتی۔ اگر شومئ قسمت سے کوئی روٹی نہ جلتی اور کہانی پوری ہوجاتی تو ہمیں بصد یاس ومحرومی خالی ہاتھ وہاں سے نکل کر کھیل کے میدان کی طرف جانا پڑتا تھا لیکن ایسی حالت میں ہمارے پانچوں صاحب اکثر کام آتے اور آنکھوں سے چلے جانے کا اشارہ کر دیتے اس اشارے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہاں سے باہر نکل جاؤ اور مطبخ کے احاطے کی مشرقی دیوار جہاں املی کا پیڑ ہے

وہاں انتظار کرو۔ ہمارے ایسا کرنے پر وہ کوئی جلی کٹی یا پھر کوئی صحیح سالم روٹی اندر سے باہر کی طرف اچھال دیتے۔ رشوت اور خوشامد کے ذریعہ حاصل کی گئی یہ ''قوت لا یموت'' اس وقت ہمارے لئے خوان یغما سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اللہ ہماری اس خطا کو معاف کرے۔ ارے، یہ معافی کیسی؟ ہم بچے تو اس وقت معصوم تھے۔

بات طویل ہوگئی، اسی لئے تو کسی شاعر نے کہا ہے کہ ''یاد ماضی عذاب ہے یارب۔'' ہاں تو بات ہو رہی تھی حضرت پانچوں کی جن کی آنکھوں کو استاذ گرامی نے ایک عدد چشمے سے مزین کر دیا تھا۔ حضرت کو ان سے یعنی پانچوں صاحب سے خاص انسیت تھی۔ کہتے تھے کہ ''جب میں یہاں زیر تعلیم تھا اس وقت سے یہ بندۂ خدا مدرسہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بوڑھے ہوگئے ہیں اعضاء و جوارح جواب دے رہے ہیں۔ پھر بھی دیکھو مطبخ کے کاموں کی بجا آوری میں ہر وقت رواں دواں رہتے ہیں اب تو ان کی آنکھیں اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ دال اور شوربے کے درمیان فرق کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے کام کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ مدرسہ کی خدمت کب سے انجام دے رہے ہیں انھیں خود اس کا کچھ پتہ نہیں۔ کب تک یہ خدمت انجام دیں گے اس کی بھی انھیں کچھ خبر نہیں۔ ترس آتا ہے ایسے سادہ لوح لوگوں پر۔''

استاذ محترم کی اس طرح کی باتیں غمازی کر رہی تھیں کہ انھیں مدرسہ کے ہر کس و ناکس بالخصوص وہاں پر موجود کمزوروں، محتاجوں نیز ضرورت مندوں کی بے انتہا فکر ہے اور وہ ان کی طرف دست تعاون بڑھانے کا پر خلوص جذبہ رکھتے ہیں۔ پانچوں صاحب کی آنکھوں پہ لگا یہ چشمہ اسی پر خلوص جذبے کا شاہد عینی تھا۔ پانچوں صاحب نے خود اس حقیقت کا انکشاف کیا۔ اس انکشاف کے تعلق سے ہمارے استفسار پر وہ کہنے لگے کہ مولوی صاحب یعنی علیم صاحب خود مجھے اپنے ساتھ لے کر چشمے کی دوکان پر گئے اور میری آنکھوں کی جانچ کرائی اور پھر میرے لئے یہ چشمہ بنوایا اور اس کی پوری قیمت انھوں نے ہی ادا کی۔ پانچوں صاحب جب یہ سب انکشاف کر رہے تھے تو مجھے استاذ محترم کی وہ حالیہ باتیں یاد آنے لگیں جن کا تعلق پانچوں صاحب کی تعریف و توصیف سے تھا۔ یہ سب باتیں یقینا پیش خیمہ تھیں استاذ محترم کے اس کار خیر کی جن کے زیر اثر انھوں نے ایک غریب و نادار شخص کی کمزور آنکھوں کو ایک عدد چشمہ مہیا کرا دیا تھا۔

استاذ محترم کی اس خاموش نیکی سے ہم سبھی بے انتہا متاثر ہوئے اور ہمارے دل میں اسی کے ساتھ یہ خواہش جاگی کہ ہم اس موضوع پر ان سے براہ راست گفتگو کریں۔ ایک روز کلاس کے اختتام پر جب ہم نے آپ سے اس بابت بات کی تو آپ نے حسب معمول چہرے پر تبسم بکھیرتے ہوئے ہمیں بتلایا کہ ''پانچوں کا کہنا صحیح ہے میں نے ہی ان کے لئے چشمے کا انتظام کیا ہے۔'' یہ سن کر جب میں نے یہ استفسار کیا کہ ''اور پیسے کا انتظام کس نے کیا؟'' تو

کہنے لگے: تم لوگوں نے۔ میں نے یہ سن کر حیرت بھرے لہجے میں کہا: ''وہ کیسے؟ ہمیں تو اس کی مطلق خبر نہیں۔ پانچوں صاحب تو کہہ رہے تھے چشمے کی قیمت آپ نے ادا کی ہے۔ ہم لوگوں کا انھوں نے نام تک نہیں لیا؟؟''

یہ سننا تھا کہ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ طاری ہوگئی اور کہنے لگے کہ ''میں نے چشمے کی قیمت تم لوگوں پر عائد کردہ جرمانے کی رقم سے ادا کی ہے۔ وہ جرمانہ جس کی تم میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، شدید مخالفت کررہے تھے اور سنو اسی رقم سے میں نے درسگاہ میں گھڑوں کا انتظام کیا جس کے ٹھنڈے پانی سے تم لوگوں کو گرمی کے موسم میں یقیناً بڑی راحت ملی ہوگی۔ تم لوگ تو یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ فی الوقت مدرسہ کی مالی حالت کافی کمزور چل رہی ہے۔ اساتذہ کی تنخواہوں کا انتظام کرنا مشکل ہورہا ہے۔ مطبخ کے لئے راشن پانی کی فراہمی میں بے شمار دقتیں پیش آرہی ہیں۔ میں جس روز مدرسے میں آیا تھا اور پانچوں سے میری ملاقات ہوئی تھی تو میں نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن انھیں مجھے پہچاننے میں دشواری پیش آرہی تھی نتیجتاً انھیں مجھے پہچاننے کے لئے مجھ سے بہت نزدیک آنا پڑا۔ یہ دیکھ کر میں نے اسی وقت ارادہ کرلیا تھا کہ میں بہرصورت پانچوں کے لئے چشمے کا انتظام کروں گا لیکن گزشتہ کئی مہینوں میں بارہا کوشش کے بعد بھی میں اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے نہ تو اپنی تنخواہ میں کوئی گنجائش نکال پارہا تھا اور نہ ہی مدرسہ کی مالیات مجھے اس بات کی اجازت دے رہی تھی۔

اب رہا پانچوں کی تنخواہ کا معاملہ تو اس بیچارے کو یہاں سے ملتا ہی کیا ہے، جو کچھ بھی ملتا ہے تم لوگوں سے اس کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مدرسہ کی خدمت اس کا مطمحِ نظر ہے باقی کام اللہ حوالے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی مدرسہ والوں کے لئے وقف کردی لیکن بدلے میں مدرسے والوں نے انھیں کیا دیا، سوچو ذرا!

ان تمام باتوں کے مدنظر میں نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے جس سے نہ تو مدرسہ کی مالیات زیر بار ہو اور نہ کسی کی تنخواہ پر اس کا براہ راست اثر پڑے۔ لہٰذا بہت غور و فکر کے بعد میں نے طے کیا کہ کیوں نہ ان طلباء پر دس پیسے کا جرمانہ عائد کیا جائے جو کلاس میں دس منٹ یا اس سے زیادہ کی تاخیر سے آتے ہیں۔ ابتداء میں حسب توقع تم لوگوں نے اس جرمانے کی شدید مخالفت کی لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ بعض اساتذہ نے میرے اس فیصلے کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہنے لگے کہ مدرسہ کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طلبہ سے جرمانہ وصول کیا جائے۔ یہ سب زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ لڑکوں کو چاہئے کہ وہ اس بدعت کے خلاف آواز اٹھائیں اور کسی طرح کا کوئی جرمانہ ادا نہ کریں۔ ان مخالفتوں کے باوجود میں اپنے فیصلے پر قائم رہا کیونکہ میرے ارادے نیک تھے۔ میری نیت صاف تھی۔ میں جانتا تھا کہ بعض غریب طلبہ پر جرمانہ کی ادائیگی پریشانی کا سبب بنے گی پھر یہ سوچ کر دل کو تسکین دے لیا تھا کہ ایسے طلبہ کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کلاس وقت مقررہ پر پہنچیں اور ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کریں۔ شکر ہے کہ میں اپنے ارادے کے نفاذ میں ثابت قدم رہا اور آہستہ آہستہ میرے

پاس جرمانے کی اتنی رقم اکٹھا ہوگئی جس کے ذریعہ میں اپنے بعض ایسے رفاہی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکا جن کی تکمیل کی تمنا ایک عرصہ سے میرے دل میں موجزن تھی۔''

استاذ محترم یہ سب کچھ بیان کررہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کی اس حکمت عملی اور دور اندیشی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کے مخالفین ومعاندین کو اگر ان کے اس طریقۂ کار کا پتہ چل جائے تو وہ ان کے خلاف کئے گئے تبصروں پر نہ صرف شرمندہ ہوں گے بلکہ اللہ کے حضور صدق دل سے توبہ کرکے ان کے اعمال حسنہ کی عمل آوری میں ان کے دست راست بن جائیں گے۔ آج ہم مسلمان بالعموم وسائل کی کمی کا رونا روتے ہیں میں نے استاذ محترم سے اس باب میں یہ سیکھا کہ وسائل کے تعلق سے ہم دوسروں پر انحصار کرنا چھوڑ دیں اور خود اپنے وسائل پیدا کرنے کی کوشش کریں اور اس ضمن میں ہمیشہ اللہ کے اس قول ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' یعنی جو لوگ بھی ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ان کی رہنمائی کریں گے، کو پیش نظر رکھیں لیکن اس کے لئے نیت کا خلوص شرط اولین ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ استاذ محترم نے جب مدرسے کو خیر آباد کہا تو بعض اساتذہ نے جو ان کے طریقۂ کار کے ناقد اور مخالف تھے جرمانے کی رسم کو از سرنو جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کی ناکامی کی اصلی وجہ میری نگاہ میں ان کی نیتوں کا فتور تھا یا پھر ان کے اندر ان صفات کی کمی تھی جن سے اللہ نے استاذ محترم کی ذات بابرکات کو متصف فرمایا تھا یعنی نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز۔

یقین جانئے اگر خدائے لم یزل نے ان کی شخصیت کو ان خوبیوں سے مزین نہ فرمایا ہوتا تو وہ ہم طلبہ سے جو پہلے سے ہی فلاکت زدہ تھے، ایک پائی بھی نہ وصول کرپاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب حضرت نے کلاس میں تاخیر سے حاضری پر دس پیسے جرمانے کا اعلان کیا تھا تو ہم طلبہ کے اندر ان کے خلاف شدید ناراضگی پھیل گئی تھی اور کسی ایک طالب علم کو بھی اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ ہم سب نے کہا تھا کہ یہ ایک نئی بدعت ہے۔ اس سے پہلے کبھی بھی اس طرح کا جرمانہ طلبہ سے نہیں لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ تھی اس سلسلے میں ہمیں ان اساتذہ کا بھرپور تعاون حاصل تھا جو مدرسہ پر استاذ گرامی کی آمد سے دل ہی دل میں ناراض تھے۔ ہمارے سراپا احتجاج کو دیکھ کر ایسے اساتذہ خوش تھے کہ چلو جو کام ہم نہیں کرسکے اسے یہ طلبہ انجام دے رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ طلبا کے احتجاج سے ڈر کر استاذ محترم اپنا فیصلہ واپس لے لیں گے اور مجلس انتظامیہ کو بھی پتہ چل جائے گا کہ یہ نووارد استاذ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے درمیان کس قدر نامقبول ہے۔ حضرۃ الاستاذ کو بھی اس صورتحال کا اندازہ تھا لیکن ان کی صدق دلی اور خلوص نے ان کے پائے ثبات میں کسی طرح کی کوئی لرزش نہیں آنے

دی۔ ہر چند کہ اس سلسلے میں یعنی جرمانے والے معاملے میں بعض اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت نے ابتداء میں ان کے ساتھ کسی طرح کی کوئی معاونت نہیں کی لیکن استاذ محترم اپنے عزم وارادے پر قائم رہتے ہوئے کلاس میں تاخیر سے پہنچنے والے طلبہ سے جرمانے کا مطالبہ برابر کرتے رہے۔ انھوں نے اس کام کو بخوبی انجام دینے کے لئے علیحدہ سے ایک نوٹ بک خریدی اور باقاعدگی سے اس میں ان طلبہ کا نام لکھنے لگے جو ان کی کلاس میں تاخیر سے آتے تھے۔

ہم طلبہ نے جب ایک دن ان سے اس موضوع پر براہ راست گفتگو کی تو کہنے لگے کہ ''اگر اس طرح کے جرمانے سے بچنا چاہتے ہو تو کلاس میں وقت پر آنے کی کوشش کرو۔ اگر تاخیر کروگے تو جرمانے کی رقم ادا کرنی پڑے گی اور پھر اگر جرمانہ لگ ہی جاتا ہے تو دس پیسے تو بہت معمولی رقم ہے۔ اس کی ادائیگی میں تم لوگوں کو دقت نہیں ہونی چاہیے۔'' حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دس پیسے میں ہم لوگ اس وقت پاؤ بھر مونگ پھلی خرید لیتے تھے۔ آج کل تو یہ سکہ ناپید ہو گیا ہے۔ اس کا ذکر تو اب صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم طلبہ کی اکثریت کا تعلق غریب و نادار گھرانوں سے تھا میں خود یتیمی کے بوجھ تلے دبا تھا۔ بہرحال ہماری تمام عذرداریاں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں اور وہ اپنے عزم وارادے پر قائم رہے اور آخر میں یہ فرمایا: ''میرے عزیزو! یہ جان لو کہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے کچھ چھوٹی چھوٹی قربانیاں ناگزیر ہیں۔''

ان کی ان تمام وضاحتوں کے باوجود جرمانے کے تعلق سے ہماری ناراضگی برقرار رہی اور سردست ہم سب نے تہیہ کر لیا کہ ہم ساعت مقررہ پر کلاس میں پہنچیں گے اور پھر دیکھیں گے ہم سے کیوں کر جرمانے کی رقم وصول کی جاتی ہے۔ ابتدائی چند ہفتوں میں ہم میں سے ہر ایک طالب علم اپنے اس عزم بالجزم پر قائم رہا لیکن آہستہ آہستہ خدا خدا کر کے یہ کفر یعنی ہمارا عزم ٹوٹنے لگا اور ہم اسی رفتار بے ڈھنگی پر آ گئے جو ہمارے عزم بالجزم سے پہلے تھی اور استاذ محترم کی نوٹ بک میں تاخیر سے آنے والے طالب علموں کے ناموں کا اندراج ہونے لگا۔ اس اندراج کے باوجود ہم جرمانے کی رقم ادا نہ کرنے کے فیصلے پر قائم رہے۔ اس ضمن میں غور طلب بات یہ ہے کہ اس باغیانہ روش کے جواب میں استاذ محترم نے نہ تو ہمیں کسی طرح کی کوئی دھمکی دی اور نہ ہی کسی طرح کی کوئی کارروائی کی۔ وہ اس سلسلے میں صرف اتنا کرتے تھے کہ کلاس کے اختتام پر اپنی نوٹ بک میں تاخیر سے آنے والے طالب علم کا نام لکھ کر ان سے مسکراہٹ بھرے لہجے میں کہتے تھے۔ ''بھئی! تم پر جرمانے کی اتنی رقم واجب الادا ہے۔ اگر آج یہ رقم تمہارے پاس نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ کل اسے ضرور لانا۔'' جس متبسم انداز سے وہ تقاضا کرتے اس سے ہم کیا ہمارے علاوہ کوئی اور شخص بھی مطلوبہ رقم کی ادائیگی نہیں کرتا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اگر متواتر و مستقل پتھر کی سل پر پانی گرے تو اس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ کچھ دنوں بعد ہماری صفوں میں دراڑ آنی

شروع ہوگئی اور بعض طلبہ نے بار بار مسکراہٹ بھرے تقاضے سے بچنے کے لئے مطلوبہ رقم کی ادائیگی میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور پھر رفتہ رفتہ رقم کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس باب میں جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں ایسے طلبہ کا سرخیل تھا جنھوں نے جرمانے کی عدم ادائیگی کی قسم کھائی تھی۔ بنابریں جب طلبہ کی اکثریت متعلقہ رقم ادا کرنے لگی تب بھی میں اپنی قسم پر قائم رہا اور دوسری طرف استاذ محترم کا تبسم آمیز تقاضا بھی جاری وساری رہا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک وہ مجھ پر اس باب میں کوئی دباؤ نہیں ڈالتے میری جانب سے جرمانے کی عدم ادائیگی یوں ہی جاری رہے گی۔

لیکن جب مجھ پر جرمانے کی رقم رفتہ رفتہ بڑھ کر ڈیڑھ روپیہ ہوگئی تو ایک دن کلاس کے بعد چہرے پر حسب معمول مسکراہٹ بکھیرے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ''اجی! تمہارے جرمانے کی رقم اب بہت زیادہ ہوگئی ہے کلاس کے تقریباً سبھی لڑکے جرمانے کی رقم ادا کرنے لگے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سوال کرنے لگے ہیں کہ آخر ان سے یعنی تم سے کب اس جرمانے کی رقم وصول کریں گے۔ اب دیکھو تمہاری وجہ سے دیگر طلبہ بھی مجھے سوالوں کے گھیرے میں لینے لگے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جرمانے کے ذریعہ جمع شدہ رقم میرے کسی ذاتی کام کے لئے تھوڑی ہے۔ اب تک تقریباً ڈیڑھ سو روپئے جمع ہو چکے ہیں میری نیت ہے کہ میں ان پیسوں کا استعمال کسی ایسے کام میں کروں جس سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوجائیں۔'' میں نے فوراً سوال کیا۔ مثلاً؟؟ کہنے لگے ''ستبدی لک الایام ما کنت جاهلاً (یعنی زمانہ ان سب چیزوں کو تم پر ظاہر کر دے گا جن سے تم ابھی ناواقف ہو)'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ حضرت کی اس طرح کی باتوں کو سن کر بہر حال مجھ پر اتنا اثر ضرور ہوا کہ میں نے جرمانے کی رقم ادا کر دی۔

پانچوں صاحب کے متعلقہ چشمے کی بابت جب ہم طلبہ نے ان سے براہ راست استفسار کیا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، تو وہ جرمانے کے تعلق سے ہم سب کی مخالفانہ روش کا ذکر مسکرا مسکرا کر کچھ اس انداز سے کرنے لگے جیسے وہ ہم تمام طلبہ سے یہ کہہ رہے ہوں کہ جب تک کسی کام کے منطقی انجام کا ہمیں علم نہ ہوجائے ہمیں اس بارے میں کسی طرح کی بھی رائے زنی سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اس سے جہاں ہماری ذہنی پستی اور عجلت پسندی کا اظہار ہوتا ہے وہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمیں اپنے اولوالامر یعنی اصحاب امور پر اعتماد نہیں ہے اور یہ بات اللہ کے حکم "أَطِيْعُوا اللهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" کے منافی ہے۔ ہماری قوم یعنی قوم مسلم کے تعلق سے فی زمانہ یہ بڑی سچائی ہے کہ ہم اکثر و بیشتر حالات میں اپنے زعماء وقائدین کے

بارے میں رائے زنی کو انتہائی عجلت اور شتابی سے انجام دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے قومی رہنماؤں کے صالح اقوال وافعال بسا اوقات ہماری فوز وفلاح کے بجائے ہمارے لئے فتنہ وفساد کا سبب بن جاتے ہیں۔

بہر حال امر واقعہ خواہ کچھ بھی ہو، جرمانے کے ذریعہ حاصل شدہ رقم حضرت پانچوں کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی کیوں کہ اس کے دانشمندانہ استعمال سے ان کی کمزور ہوتی بینائی لوٹ آئی اور اب وہ جلی کٹی اور صحیح سلامت روٹیوں کے درمیان تمیز بہت اچھی طرح کرنے لگے اور ہم طلبہ کو اس سارے واقعے سے یہ سبق ملا کہ کسی کار خیر کو انجام دینے کے لئے ہنگامے نیز شور شرابے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے تو محض تھوڑی سی بصیرت اور دانائی درکار ہوتی ہے اور جس کا بھرپور مشاہدہ ہم نے استاذ محترم کے متذکرہ بالا کاموں میں کیا جن سے انھیں نہ تو کسی ستائش کی تمنا تھی اور نہ ہی کسی صلے کی پرواہ۔ یہ سب کچھ انھوں نے توشۂ آخرت کے طور پر لوجہ اللہ کیا اسی لئے ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے حضور ان کو ان تمام اعمال حسنہ کا اجر اضعافاً مضاعفۃ ملے گا۔

یہاں یہ حقیقت مدنظر رہے کہ استاذ مکرم کی اس طرح کی خیر خواہی وخیر سگالی کا دائرہ صرف غریبوں، محتاجوں نیز ان کے دوستوں، ہمدردوں اور شناساؤں تک ہی محدود نہیں تھا۔ اس ضمن میں سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہمدردانہ جذبات ہر خاص وعام کے لئے وقف تھے حتی کہ وہ ان لوگوں کے لئے بھی نیک خواہشات رکھتے تھے جو ان کی کمیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے تھے اور لایعنی اکاذیب نیز بے سر پیر کی باتوں کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت اور پرخلوص طریق کار کو اپنے بے جا طنز وتشنیع کا نشانہ بناتے تھے۔ اس تعلق سے جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ ان کے حاسدین وحاقدین جس قدر مدرسہ کے نظم ونسق کے میدان میں ان کی اصلاحی کوششوں کو اپنے تمسخر واستہزاء کا نشانہ بناتے اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوجاتے۔ انجام کار ایک انتہائی قلیل مدت میں اساتذہ کی اکثریت آپ کے حسن انتظام اور حسن معاملات کی قائل ہوگئی اور تقریباً ہر شخص کی زبان پر ان کے کاموں کو لے کر آیت ''لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ'' ورد کرنے لگی۔

بایں ہمہ جو لوگ کورمغز اور شپرۂ چشم تھے۔ ان کو استاذ محترم کے روشن کارناموں نے مزید مضطرب اور بے قرار کردیا اور وہ اب چھپ کر نہیں بلکہ کھل کر آپ کی تنقید نہیں بلکہ تنقیص پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ وہ یعنی حضرۃ الاستاذ اپنے بے تکے کاموں سے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں یہی نا کہ ان کے علاوہ باقی اساتذہ نااہل ہیں، نکمّے ہیں؟ ان کے ہر عمل سے دوسروں کی تضحیک کی بو آتی ہے۔ وہ جو کام بھی کرتے ہیں ادھورا کرتے ہیں اور اس سے نمود ونمائش کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کی باتیں جب جناب والا تک متواتر پہنچنے لگیں تو وہ کبیدہ

خاطر رہنے لگے اور اکثر یہ کہتے سنے گئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدخواہوں نیز حاسدین کے شر سے محفوظ رکھے۔اسی حالت میں مجھ سے ایک روز انتہائی کرب بھرے لہجے میں کہنے لگے ''آخران لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ میرے ہر کام میں مین میخ نکال لیتے ہیں، میرے طریقۂ کار میں اگر کوئی کمی ہے، نقص ہے تو مجھے بتائیں، مجھے قائل کریں میں ان کے مشوروں کی روشنی میں اس کمی کو دور کرنے کے لئے انشاء اللہ بھر پور کوشش کروں گا۔ پیٹھ پیچھے کسی پر کیچڑ اچھالنا شریفوں کا شیوہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔اگران لوگوں کی ہرزہ سرائی کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو بہت ممکن ہے کہ میں یہاں سے جلد ہی اپنا رخت سفر باندھ لوں۔'' وہ یہ سب کچھ غم زدہ لہجے میں کہہ رہے تھے اور میں فرط حیرت سے ان کے چہرے کے نقوش کو پڑھ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ مخالفین کی یاوہ گوئیوں سے ان کے قلب وروح کو کتنی تکلیف پہنچی ہے۔وہ میرے استاذ محترم تھے۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان کو دلاسہ دوں تو آخر کن الفاظ میں دوں۔وہ اپنے دکھ درد کا اظہار کررہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ہماری قوم میں محسن کشوں کی ایک طویل تاریخ رہی ہے لہٰذا مصلحین وقت کو ان کی چنداں فکر نہیں کرنی چاہیے اور اپنی اصلاحی اور رفاہی کاوشوں کو جاری وساری رکھنا چاہیے۔

یہ سب کچھ سوچ کر میرے اندر ذرا ہمت پیدا ہوئی اور متانت بھرے لہجے میں کہا کہ ''حضرت! اگر آپ کے معاندین ومخاصمین آپ کی بیخ کنی پر کمر بستہ ہیں تو آپ یہ نہ بھولیں کہ آپ کے کاموں کی ستائش کرنے والوں کی تعداد ان معارضین وحاسدین سے کہیں زیادہ ہے۔بعض کو چھوڑ کر ہم طلبہ کی اکثریت نہ صرف آپ کے کاموں کی قدر کرتی ہے بلکہ اس بات کا صدق دلی سے اعتراف کرتی ہے کہ آپ نے کتنی زندگیوں کو تنگ نائے سے نکال کر انھیں ایک بحر ناپیدا کنار سے آشنا کر دیا ہے اور ان پر یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ ہماری تگ وتاز کا دائرہ صرف درسیات تک محدود نہیں رہنا چاہیے کیونکہ سواد امت کے مسائل خود ہمارے اپنے مسائل ہیں بنا بریں ان سے کنارہ کشی نیز ان سے عدم التفاتی خود اپنی ہی تباہی وبربادی کے مترادف ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ہماری یہ خوش بختی ہے جو آپ کی ذات بابرکات کو ہمارے عظیم مدرسہ کی خدمت کے لئے لے آئی ہے۔یقین جانئے کہ جو لوگ بھی آپ کی مخالفت میں آگے آگے ہیں ان کے اپنے اغراض ومقاصد ہیں انھیں مدرسہ کی فلاح و بہبود سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔اگر یہ لوگ اپنے ارادوں میں مخلص ہوتے تو ہمارے مدرسہ کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔انھیں لوگوں نے حالات کو اس قدر خراب کر دیا تھا کہ ہمیں اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے جاہل عوام کے پاس جانا پڑا۔''

میں یہ سب کچھ کہہ تو رہا تھا لیکن مجھے ساتھ ہی ساتھ ان کے چہرے کی لکیروں کو دیکھ کر یہ احساس ہورہا تھا

کہ میرے یہ الفاظ ان کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا تو ضرور رہے ہیں تاہم ان کا دماغ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کا دل مدرسہ اور مدرسہ کے مسائل سے اوب گیا ہے اور وہ کسی اور دنیا میں پرواز کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر جب میں نے ان سے اپنی معروضات کے تعلق سے ان کے تاثرات کو جاننا چاہا تو مسکرا کر خاموش ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی، لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد ایک روز پھر اپنے ناقدین وحاسدین کی نکتہ چینیوں کا تذکرہ انتہائی تکلیف دہ لہجے میں کرنے لگے اور مجھے ان کی باتوں سے لگنے لگا کہ جیسے انھوں نے مدرسہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے جب یہ محسوس ہوا تو میں نے برجستہ ان سے کہا: ''اگر ایسی بات ہے تو آپ کو نہیں بلکہ آپ کے مخالفین کو مدرسہ سے باہر کا راستہ دیکھنا چاہیے کیونکہ وہی تو درحقیقت ہمارے مدرسہ کے موجودہ مسائل کے ذمہ دار ہیں۔ وہ خود تو کوئی ایسا کام کرتے نہیں جس سے ان کی واہ واہی ہو۔ ہاں البتہ انھیں دوسروں کے کاموں میں برائی نکالنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ایسے لوگوں کی یقینا ہمارے مدرسہ کو ضرورت نہیں ہے۔ ہم طلبہ کی اکثریت ان کی شاطرانہ چالوں سے واقف ہے۔ اسی لئے تو آپ کے حاسدین ہم طلبہ کو آپ کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔''

یہ سب کچھ سن کر انھوں نے یعنی استاذ محترم نے جو کچھ فرمایا اسے زریں حروف سے لکھا جانا چاہیے۔ کہنے لگے:

''میاں اسلم! میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ ان لوگوں کو مدرسے سے باہر کیا ہو رہا ہے، کچھ پتہ نہیں ہے۔ مدرسے کی چہار دیواری سے باہر بہت کم لوگ ان کو جانتے ہیں۔ انھوں نے یہیں رہ کر پڑھائی لکھائی کی اور یہیں پر برسر ملازمت ہو گئے۔ یہ اگر باہر جائیں گے تو انھیں اپنے قدموں کو جمانے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا کیا؟ میں تو یہاں آنے سے پہلے متعدد جگہوں پہ اپنی تدریسی خدمات انجام دے چکا ہوں۔ مجھے جس وقت یہاں آنے کی دعوت دی گئی تو میں اس وقت بنارس میں تھا، میں ابتداء میں یہاں آنے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ آپ کی مادر علمی اس وقت بحرانی دور سے گزر رہی ہے اور ایسے عالم میں آپ کی یہاں آمد اشد ضروری ہے تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور یہاں آ گیا۔ باہر میرے احباب کا ایک بہت بڑا حلقہ ہے۔ یہ حلقہ ہمہ وقت میری طرف دست تعاون بڑھانے کے لئے تیار رہتا ہے، ان میں سے جس کسی کو بھی یہاں میرے خلاف ہو رہی ریشہ دوانیوں کا پتہ چلتا ہے، تڑپ اٹھتا ہے اور مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا یہاں سے جانے کے بعد بھی میرے لئے کام کی راہیں کھلی ہیں۔''

استاذ گرامی یہ سب کچھ کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو اپنی فکر نہیں بلکہ ان لوگوں کی فکر ستائے

جارہی ہے جنھیں مدرسہ پر ان کا وجود برداشت نہیں ہورہا ہے اسی لئے دن رات ان کی کردار کشی کے لئے سازشیں کرتے رہتے ہیں اور جنھیں آپ کی مقبولیت اور آپ کی قدر ومنزلت ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔آج کے زمانے میں ایسی سوچ رکھنے والے شاذ ونادر ہی ملیں گے جنھیں اپنی پریشانیوں کی نہیں بلکہ دوسروں خاص طور پر اپنے حریفوں اور بدخواہوں کی فکر مضطرب کردیتی ہے۔

ہم سب "وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" کی تلاوت کرتے ہیں اور صرف تلاوت ہی نہیں بلکہ اس کی تفسیر وتوضیح کے لئے بڑے بڑے مفسرین کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن عملی زندگی میں اس کا انطباق تقریباً صفر کے برابر ہے۔بالعموم ہمیں صرف اپنی ذات سے سروکار رہتا ہے، ہمارے قول وعمل سے دوسروں پر کیا گزرے گی اس کی ہمیں مطلق فکر نہیں ہوتی۔ان کے انھیں سب اوصاف حمیدہ کے مدنظر ہم طلبہ استاذ محترم جیسی عظیم شخصیت کو کھونا نہیں چاہتے تھے اور دل ہی دل میں خدائے بزرگ وبرتر سے دعا کرتے تھے کہ وہ مدرسہ چھوڑ کر کہیں اور نہ جائیں تاکہ ہم ان کے فیوض وبرکات سے برابر فیض یاب ہوتے رہیں اسی کے ساتھ ساتھ ہم سب یہ بھی دعا کرتے تھے کہ اللہ ان کے معاندین ومخالفین کو عقل سلیم عطا کرے اور وہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا عمل نہ کریں جس سے مدرسہ کا خوشگوار ماحول زہر آلود ہو اور ہمارے باہمی تعلقات میں مزید خرابی پیدا ہو۔یہی نہیں بلکہ ہم بارگاہ رب العزت میں یہ بھی التجا کرتے تھے کہ اے خالق کون ومکاں! ہم مسلمانوں کو اس امر کی توفیق عطا کر کہ ہم ملی مصالح ومقاصد کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد پر مقدم رکھیں۔

بہر حال ہماری ساری دعائیں، ہماری ساری التجائیں بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت سے محروم رہیں اور ہم شدنی کو نہیں ٹال سکے اور وہ منحوس گھڑی ہمارے سامنے بہت جلد آگئی جب ہم سب نے دیکھا کہ استاذ محترم اپنے خلاف سازشوں نیز نکتہ چینیوں سے اس قدر دل برداشتہ ہوگئے کہ مدرسہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور ہم چاہنے والوں کو مایوس واداس چھوڑ کر اپنی مادر علمی جو ان کی کارگاہِ عمل بھی تھی، کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا اور ہم اس طرح ان کی شفقتوں، عنایتوں اور کرم فرمائیوں سے سدا کے لئے محروم ہوگئے۔

وہ جب تک ہمارے درمیان رہے نہ صرف خود سرگرم عمل رہے بلکہ ہم سب کو سرگرم عمل رکھا اور ہمیں احساس دلاتے رہے کہ تمہارے لئے صرف کتابی علم کافی نہیں ہے۔تمہیں مدرسہ میں رہ کر دراصل خود کو آنے والی زندگی کے لئے تیار کرنا ہے کیونکہ تم حصہ ہو اس عظیم امت کا جو عامۃ الناس کو نہ صرف خیر کی طرف دعوت دیتی ہے بلکہ انھیں برائیوں سے روکتی ہے۔ربط امت یعنی امت سے وابستگی کا احساس جس قدر میں نے استاذ محترم کے یہاں دیکھا وہ دوسروں کے یہاں مجھے خال خال ہی نظر آیا۔اس پہلو کی طرف وہ اکثر ہم طلبہ کی توجہ مرکوز کراتے

رہتے تھے اور کہتے تھے کہ فرد کا وجود ملت سے ہے لہذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ خود کو ہمیشہ قوم وملت کے مسائل سے مربوط رکھے نیز ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہمارے جسم کے کسی ایک حصے میں ہونے والے درد سے ہمارے اعضاء وجوارح مضطرب اور پریشان ہوجاتے ہیں۔

ان کے اس جذبۂ اخوت ملی اور ان کے شعور مؤدت اسلامی کا مشاہدہ ہم نے عیاں طور پر اس وقت کیا جب ہم نے دیکھا کہ وہ فساد زدہ نوناری گاؤں کے امدادی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس امر کی وضاحت کے لئے ہم یہ بتادیں کہ جن دنوں استاذ محترم مدرسہ میں اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ قریب کے ایک گاؤں نوناری میں بھیانک ہندو مسلم فساد ہوگیا جس میں حسب معمول مسلمانوں کی املاک کو بے انتہا نقصان پہنچا ان کے گھروں کو پھونک دیا گیا الغرض ان کی ہر چیز کو تہس نہس کردیا گیا حتی کہ انھیں مجبور کردیا گیا کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر راہ فرار اختیار کریں۔ ایسے عالم میں قرب وجوار میں رہنے والے مسلمان ان کی مدد کے لئے آگے آئے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک ریلیف کمیٹی قائم کی جس کے روح رواں استاذ محترم تھے۔ اس کمیٹی کے توسط سے آپ نے تباہ و برباد ہونے والے لوگوں کی بھرپور مدد کی اور انھیں یقین دلایا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ جس زمانے میں وہ یہ کارِخیر انجام دے رہے تھے ہم لوگوں نے دیکھا کہ وہ کلاس کے بعد فوراً مدرسہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اس دوران ہم لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کلاس لیتے وقت راحت رسانی سے متعلق اپنے کاموں کا تذکرہ بالکل نہیں کرتے ہیں کہ مبادا اس سے ہماری پڑھائی کا نقصان ہو۔ ہم لوگ جب کبھی اس سلسلے میں ان سے سوال کرتے تو مسکرا کر ٹال جاتے اور کہتے کہ آپ لوگ فی الوقت اپنی ساری توجہ کتابوں پر مرکوز کریں۔ ہاں البتہ خالی اوقات میں اگر کوئی طالب علم اس کارِخیر میں شریک ہوتا ہے تو وہ ضرور ایسا کرے کیونکہ اس طرح کے کاموں سے ملی اخوت واتحاد کے جذبات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اس زمانے میں جب کبھی میں قصبہ سرائے میر گیا تو دیکھا لوگوں کی زبانوں پر استاذ محترم کے اوصاف حمیدہ کے چرچے تھے اور تقریباً ہر شخص کا اس امر پر اتفاق تھا کہ فساد زدگان کی مدد کا کام وہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں وہ نہ صرف مصیبت زدہ لوگوں کی طرف اپنا دست تعاون بڑھا رہے ہیں بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی ڈھارس بھی بندھا رہے ہیں اور ان کو سمجھا رہے ہیں کہ ہم کسی بھی حالت میں اللہ کی رحمتوں، نعمتوں اور برکتوں سے مایوس نہ ہوں، یہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اس میں ہماری کوتاہیوں، لغزشوں اور خطاؤں کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ ہمیں اپنے اقوال وافعال کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے

لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے علماء کرام کو اس طرح کے رفاہی، فلاحی اور امدادی کاموں کی قیادت کے لئے آگے آنا چاہئے۔ اپنی اس رائے کے ذریعہ غالباً وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہمارے طبقۂ علماء نے خود کو چند دینی امور تک محدود کر رکھا ہے۔ ملت کے سماجی، معاشی نیز اقتصادی فوز وفلاح کو وہ اپنے دائرۂ عمل سے خارج تصور کرتے ہیں۔ میں بھی استاذ محترم سے شرف ملاقات سے قبل یہی سمجھتا تھا کہ ہمارا ہدف صرف اسناد/ ڈگریاں حاصل کرنا ہے اور پھر اس کے بعد حصول معاش کے لئے کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوکر پیشۂ معلمی کے فرائض انجام دینا ہے یعنی ''از خود خیزد برخود ریزد'' اللہ اللہ خیر صلاّ۔ ملت کے مسائل ومشکلات سے ہمارا سروکار صرف رسمی اور واجبی ہو۔ ایسا اس لئے کہ ہم نے اپنے سے پیش روؤں کو ایسا ہی کرتے دیکھا تھا۔ اس پس منظر میں ہم یہاں بصراحت کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے دوسروں کے لئے جینے کی ادا استاذ محترم سے سیکھی اس باب میں ان کا طرزِ عمل حدیث نبوی ''واللّٰہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ۔'' یعنی جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کے لئے کوشاں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں مصروف رہتا ہے، کی عملی تفسیر تھا۔ اس معاملے میں ان کی سب سے بڑی خوبی جس کی طرف اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے، یہ تھی کہ وہ اپنا دست تعاون بڑھاتے وقت اپنے خیر خواہوں اور بدخواہوں کے درمیان تمیز نہیں کرتے تھے۔

مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے لئے وہ ہمہ وقت سرگرداں رہتے تھے۔ اس کے لئے ان کے نزدیک مدرسہ کے اندر اور باہر کی تخصیص نہیں تھی۔ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی انھوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو ان کے تعاون اور ان کی مدد کی ضرورت ہے فوراً اپنی بے لوث خدمات کو حاضر کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سب نے ان کو ہمہ وقت مصروف عمل دیکھا۔ قصبہ سرائے میر کی سبزی منڈی میں واقع مسجد میں ان کا ہفتہ واری درس قرآن اسی طرح کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک اضافی ذمہ داری تھی جسے انھوں نے اپنے سر پر لے رکھا تھا اور جسے وہ بڑی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ ہمارے دیگر محترم اساتذہ کے یہاں اس طرح کی کوششیں تقریباً مفقود تھیں۔

ان کی اس طرح کی کارگزاریوں کے تعلق سے جب کبھی بھی ہم طلبہ نے ان سے استفسار کیا تو ان کا کہنا تھا کہ کاموں کی حد بندی کرنا دانشوروں کا شیوہ نہیں۔ ہمیں ہر اچھے کام کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے کوئی بھی شخص ہمارے معاشرے کے لئے ناگزیر نہیں ہے کہ خدانخواستہ اگر وہ ہمارے درمیان سے چلا گیا تو ہماری زندگیوں کا سارا نظام معطل ہوجائے گا۔ جب ہم یہاں مدرسہ میں اپنے طلبا کو قرآن کا درس دے سکتے ہیں تو یہی کام ہم دوسری جگہوں پر دوسرے لوگوں کے سامنے کیوں نہیں انجام دے سکتے ہیں۔ اس میں کیا قباحت ہے؟ یہاں سے فراغت کے بعد اگر تمہیں اپنے علاقے میں یا پھر کسی اور جگہ درس قرآن دینے کی ضرورت محسوس

ہوئی تو کیا تم کسی اور کی جھولی میں اس سعادت کو ڈال دو گے۔ خدارا ایسا نہ کرنا۔ یہ بڑے شرف کی بات ہے کہ اللہ نے تمہیں قرآنی علوم کی دولت سے نوازا ہے۔ اس سے نہ صرف تم خود فائدہ اٹھاؤ بلکہ اس سے دوسروں کو بھی اپنے ذریعہ مستفید ہونے کا موقع دو۔ اگر تم لوگ ایسا نہیں کرتے ہو تو تم کتمان علم جیسے گناہ عظیم کا ارتکاب کرو گے جس کی وجہ سے بنو اسرائیل کو تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔

استاذ محترم کے اس طرح کے حکیمانہ خیالات اور مدبرانہ باتیں ہم طلبہ کی نگاہ میں ان کو ممتاز مقام عطا کرتی تھیں۔ یہاں اس تلخ حقیقت کا اعادہ شاید بے محل نہ ہوگا کہ آپ کی مدرسہ پر آمد سے قبل ہم طلبہ کی اکثریت بعض اساتذہ کی ناچاقیوں اور ان کی باہمی ریشہ دوانیوں کا شکار تھی۔ اساتذہ کے تعلق سے ہماری وفاداریاں بٹی ہوئی تھیں۔ ان کی گروپ بندیوں کو لے کر بسا اوقات ہم طلبہ بحث و تکرار پر اتر آتے تھے۔ ایسا کرتے وقت ہمیں مطلق اس بات کی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے دین میں ہم مسلمانوں کے مابین کسی طرح کے تفرقہ یا رسہ کشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی شخص ہماری صفوں میں خلفشار و انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہمیں ایسا کرتے وقت قرآنی حکم ''وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا'' کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور ہم سب کو ہر وقت یہ دعا کرتے رہنا چاہیے ''لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا'' ہماری معاشرتی زندگی میں خوشگواری اور خیر سگالی کے فروغ کے لئے یہ آیت کسی نسخۂ کیمیا سے کم نہیں ہے۔ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' کی تفسیر و تفہیم کے لئے ہمیں سیوطی، رازی یا صاحب کشاف کی تفاسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس میں کسی طرح کا کوئی غموض یا ابہام ہو۔ استاذ محترم کا کہنا تھا کہ اس کو ہمیں صرف طوطوں کی طرح رٹنا نہیں ہے بلکہ اس کو ہمیں اپنے عمل کے ذریعہ ثابت کرنا ہے ہر چند کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے طور و طریق نیز اعضاء و جوارح جب اس آیت کی تفسیر بن جائیں گے تب ہمارے معاشرے میں حقیقی امن و سکون کا غلبہ ہو جائے گا اور ہم ہر طرح کے ذہنی دباؤ اور ہیجان سے آزاد ہو جائیں گے۔

استاذ محترم کے اس طرح کے ناصحانہ فرمودات نیز ان کے مخلصانہ اعمال نے ہم طلبہ کے اذہان و افکار کو بے انتہا متاثر کیا اور ہم ان کی بدولت ایک نئی فکر اور سوچ سے آشنا ہوئے، ایک ایسی سوچ جس کے طفیل میں ہم حلقۂ یاراں میں ریشم کی طرح نرم و ملائم ہو گئے۔ ہمیں ہر طرح کے ذہنی اور فکری تناؤ سے نجات مل گئی اور ہماری سوچ کے دھارے تخریب و انتشار کے بجائے تعمیر و اصلاح کی طرف مڑ گئے۔ تنقید و تنقیص کے مابین کیا فرق ہوتا ہے اس کی حقیقی جانکاری حاصل ہوئی۔ اس شعور و ادراک کے بعد ہم نے طے کیا کہ ہم اپنے خلاف کی جانے والی تنقید کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھیں گے اور اس کی روشنی میں اپنے اندر پائی جانے والی کمیوں، کوتاہیوں اور

عیبوں کو اگر وہ ہیں، تو دور کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ کیونکہ اس حوالہ سے استاذ محترم کا کہنا تھا کہ ہمارا ناقد حقیقی معنوں میں ہمارا ہمدرد اور ہمارا بہی خواہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمیں اس کے خلاف محاذ آرائی سے حتی الامکان نہ صرف گریز کرنا چاہیے بلکہ اپنے خلاف اس کے بیان کردہ عیوب و نقائص کی روشنی میں اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور ہو سکے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہماری کمزوریوں سے واقف ہونے کا موقعہ دیا۔

آج اگر ہمارے کلمہ گو بھائیوں کے درمیان اس طرح کی سوچ عام ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے مابین پائی جانے والی ناچاقیوں اور شکر رنجیوں کے امکانات تقریباً معدوم ہو جائیں گے۔ اپنے مخالفین کی آراء و خیالات کو کس طرح اور کس قدر اہمیت دی جائے اس کا شعور ہمیں استاذِ محترم کے طفیل حاصل ہوا۔ بایں ہمہ ہمیں مطلق پتہ نہیں تھا کہ آنجناب خود اپنے نکتہ چینوں اور بدخواہوں کی یاوہ گوئیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ اس قدر زیادہ کہ ان کے احترام میں انھوں نے ایک دن اپنی کارگاہِ عمل یعنی مدرسہ کو انتہائی خاموشی سے خیر باد کہہ دیا، بہر حال قسام ازل کا یہی فیصلہ تھا۔

وہ چلے تو گئے لیکن میرے لئے ان کا جانا ''رفتید و لے نہ از دل ما'' والا معاملہ تھا۔ میں اور میرے ہم خیال طلبہ جب کبھی بھی ملتے ہیں تو ان کا ذکر خیر ضرور کرتے ہیں۔ مدرسہ سے فراغت کے بعد بھی آپ کی حکیمانہ و مشفقانہ باتیں، آپ کے بیش قیمت اقوال و فرمودات میرے لئے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کی طرح کسی کام کے کرنے یا کسی طرح کا فیصلہ لینے میں بالعموم عجلت سے گریز کرتا ہوں۔ کسی کام کے بارے میں اگر سمجھتا ہوں کہ نرمی سے کام چل جائے گا تو استاذ محترم کی طرح گرمی سے حتیٰ الامکان گریز کرتا ہوں۔ ''**الصموت حسنة من الحسنات**'' پر نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اس پر آپ کی طرح صدق دلی سے عمل کرتا ہوں۔ کہنے کے لئے یہ اوصاف و خصائل مادر علمی مدرسۃ الاصلاح کی دین ہیں لیکن فی الواقع یہ سب کچھ آپ کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں۔

استاذ محترم سے میری آخری ملاقات حیدر آباد میں ہوئی تھی جہاں میں ایک سمینار میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ سمینار کے مقامی شرکاء میں سے جب میں نے ایک صاحب سے استاذ محترم سے اپنی گہری عقیدت اور فرط محبت کا ذکر کیا تو انھوں نے بتلایا ''کہ میں حضرت کے محلے میں رہتا ہوں اور میں بھی ان کے معتقدین میں شامل ہوں۔ وہ مسلم بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم ایک شاندار ادارہ کے منتظم اعلیٰ ہیں مقامی لوگوں میں انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے''۔ یہ سب کچھ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ استاذ محترم سے میری ملاقات کے تعلق سے میری مدد کریں۔ میری اس درخواست پر

انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کل سمینار کے اختتام کے معاً بعد مجھے ساتھ لے کر استاذ محترم کے پاس چلیں گے۔

دوسرے روز حسب وعدہ وہ مجھ سے ملے اور پھر ہم دونوں نے استاذ محترم کی بارگاہ میں حاضری دی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان گئے حالانکہ یہ ملاقات ایک لمبے عرصے کے بعد ہورہی تھی۔ پُرسش احوال کے سارے رسمی کلمات ختم ہونے کے بعد جب میں نے عرض کیا کہ مرحوم مجاہد (آپ کے فرزند اکبر کا نام) کی شہادت کی خبر سن کر ہم لوگوں کو انتہائی دکھ پہنچا۔ اللہ ان کی شہادت قبول فرمائے اور مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ یہ سننا تھا کہ آپ یعنی استاذ محترم یکدم سے چونک پڑے اور ہلکے سے خفگی بھرے انداز میں کہا: ''دکھ؟؟ کیسا دکھ؟؟ اللہ کی امانت تھی وہ اس نے واپس لے لی، اس میں دکھ کی کیا بات ہے۔ ہماری زندگی اگر اللہ کی راہ میں کام آگئی تو اس میں دکھ کی کیا بات ہے۔ ہمیں تو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی ہمارے بنانے والے کے کام آگئی۔''

یہ ساری باتیں، یہ سارا کلام ہر چند کہ اپنی جگہ صد فی صد درست اور صائب ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے ذاتی طور پر یہ کلمات موقع و محل کے لحاظ سے کچھ اچھے نہیں لگے۔ بایں ہمہ آج بھی جب تنہائی کے لمحات میں یہ الفاظ مجھے یاد آتے ہیں تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ آپ کا عقیدۂ آخرت کس قدر پختہ اور غیر متزلزل تھا۔ اپنے جواں سال لخت جگر کی شہادت کے غم کو اس طرح خوشیوں میں ڈھال دینے کے لئے کلیجہ چاہیے۔ غیر معمولی کلیجہ۔ ان کے ایمان کی اس پختگی کے پیش نظر میں کامل یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بروز آخرت انشاء اللہ ان کا شہید لخت جگر یعنی مجاہد سلیم جنت الفردوس کی طرف لے جانے میں ان کی پیشوائی کرے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
ایک مثالی استاذ و خاموش داعی

محمد صابر فلاحی
سابق صدر مدرس،
مدرسہ دائرۃ الاصلاح چراغ علوم، بنارس

یہ دنیا فانی ہے جو یہاں آیا ہے اس کو ایک روز جانا ہے شروع سے ایسا ہو رہا ہے اور روزِ آخر تک ہونا ہے۔ شخصیت چاہے کتنی ہی قیمتی ہو اور زمانہ میں جتنی بھی زور آور ہو موت کے سامنے بے بس ہے۔

"كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" اور "اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَايَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَايَسْتَقْدِمُوْنَ".
یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑے ڈاکٹر فیل ہیں جس کے دھرمی اور بے دھرمی سبھی قائل ہیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مالک حقیقی سے ملنے والے کے بارے میں متعلقین صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تدریس اور کردار سے واقف کاروں کی ایک لمبی فہرست ہے، جو ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کتنے اللہ کو پیارے ہوگئے اور ان گنت دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی رحلت کی خبر سے ایسا محسوس ہوا جسم میں جان نہیں، رگوں میں خون نہیں۔ سامنے غم کا کوہِ گراں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا کا وطن اور تعلیم

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اعظم گڑھ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے ٹونس ندی کے کنارے بندی گھاٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں غالب پور میں ہوئی جس کے بارے میں اقبال سہیل مرحوم نے فرمایا تھا:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِّ اعظم ہوتا ہے

اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہاں اس وقت ہندوستان کے نامور اساتذہ سے کسب فیض کیا اور فکر فراہیؒ کے علمبردار بن کر نکلے، فراغت کے بعد کچھ عرصہ شبلی منزل میں مطالعہ میں مشغول رہے اور نوع بہ نوع علمی کارناموں کی ورق گردانی کرتے رہے۔

تدریسی خدمات

جامعہ مظہر العلوم بنارس میں عالیہ درجات میں مدرس ہوئے پھر صدر مدرس کی حیثیت سے ایک لمبے عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ طرز تدریس مثالی تھا، طلبہ سے عبارتیں پڑھواتے اور انہیں سے ترجمہ کرواتے جہاں ضرورت سمجھتے بولتے ورنہ خاموش رہتے، جس کا اثر یہ ہوتا کہ طلبہ میں عبارت فہمی کا شعور پیدا ہوتا اور آہستہ آہستہ صلاحیت نکھرتی جاتی۔ میں بھی مولانا محترم کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں اور مجھے احساس ہے کہ جو کچھ بھی ملا ہے، وہ مولانا کی تعلیم وتربیت سے حاصل ہوا ہے۔

مولانا کو اپنے شاگردوں سے بہت لگاؤ تھا بنارس کے قرب وجوار میں آج بھی بہت سے شاگرد موجود ہیں آخری وقت میں مولانا کی خواہش تھی کہ صحت ٹھیک رہتی تو گاڑی کر کے اپنے سبھی شاگردوں سے مل لیتا، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوئی دل میں دبی رہ گئی......

تحریکِ اسلامی سے وابستگی

مولانا کا تعلق تحریکِ اسلامی سے تعلیم ہی کے زمانہ سے تھا۔ بنارس آنے کے بعد اس تعلق میں مزید استواری آئی۔ آپ بنارس میں ایک لمبے عرصے تک جماعت اسلامی کے مقامی امیر رہے۔ آپ خاموش مبلغ تھے، آپ کی قیادت اور مثالی کردار سے بنارس کا ایک بڑا طبقہ جماعت کے کام سے متاثر تھا۔ تدریس سے فراغت کے بعد ایک رومال گلے میں لپیٹ لیتے اور رفقاء سے ملنے نکل جاتے۔ یہ روز کا معمول تھا جسے میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں دیکھا۔

مسلک میں اعتدال اور رواداری

مولانا فکری اعتبار سے کسی بھی مسلک کے حمایتی نہیں تھے اور نہ کسی مسلک کے انکاری تھے۔ مولانا خاندانی لحاظ سے اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن عملاً نہیں دیکھا گیا کہ آپ اہلِ حدیث ہیں۔ مولانا کے ایک چہیتے شاگرد جواب مرحوم ہو گئے ہیں ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے کہ مولانا کو ایک بار میں نے اپنے گھر مدعو کیا اور ایک میلاد کے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی۔ مولانا نے دعوت قبول کی اور میلاد میں شریک ہوئے۔ جب سب لوگ سلام پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو مولانا بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ ہم سے بتا رہے تھے کہ ہم نے مولانا سے پوچھا کہ آپ تو اہلِ حدیث ہیں کیسے کھڑے ہو گئے؟ مولانا نے جواب دیا کہ ہمیں یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ مولانا کی رواداری سے وہ بہت متاثر رہے اور جب بھی ہمارے یہاں ملنے آتے تو استاذ محترم کے بارے میں ضرور پوچھتے۔

عربی ادب میں مہارت کے ساتھ اردو ادب و شاعری کا اچھا ذوق

غالباً ۱۹۶۷ء کی بات ہے مولانا صوفی سلیم اللہ صاحب مرحوم باغ کے وسیع و عریض میدان میں سیرت النبیؐ کے سہ روزہ عظیم الشان اجلاس کے دوسرے دن بعد نماز ظہر طلبائے مدارس کا انعامی تقریری مقابلہ کرایا کرتے تھے۔ راقمِ سطور جامعہ مظہر العلوم بنارس میں درجہ مولوی دوم کا طالب علم تھا۔ اساتذۂ مدرسہ نے بالاتفاق ناچیز کو انعامی مقابلہ میں تقریر کرنے کے لیے منتخب کیا۔ استاذ محترم نے بہ تقاضائے سیرت ''اتحادِ امت'' کے عنوان پر ایک تقریر تحریر کر کے حوالہ کر دی۔ تحریر اپنے موضوع پر جامع، مانع اور پُر اَثر تھی۔ موقع کی مناسبت سے علامہ اقبال کے اشعار سے اور زیادہ مؤثر بنا دیا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باوجود ایک شعر آج بھی یادداشت میں ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مولانا صاحبِ تصانیف تھے

مولانا کی کئی کتابیں معرضِ ظہور میں آ چکی ہیں۔ دو کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں۔ ایک عقائد نسفی کا سلیس بامحاورہ ترجمہ ''متن العقائد'' کے نام سے مولانا کے لائق باصلاحیت شاگرد جو بعد میں صدر مدرس ہوئے ایک عربی مدرسہ میں۔ مولانا ابوالمحمود محمد مظہری کے نام سے شائع ہوئی اور دوسری کتاب ''دارالحرب اور دارالاسلام'' معرکۃ الآراء علمی کتاب فقہ کی امہات الکتب سے حوالہ کے ساتھ مدلل انداز میں سامنے آئی۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں جو ملی مسائل کے حل سے تعلق رکھتی ہیں۔

مولانا کی زندگی تاریخ دعوت وعزیمت کا نمونہ

مولانا کی زندگی تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔مولانا کے فرزند دلبند مجاہد (شہید) کو کئی مرتبہ فرضی کیسوں میں گرفتار کیا جاتا رہا اور بالآخر بے دردی سے شہید کردیا گیا۔اپنے بیٹے کی شہادت پر مولانا پرغم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن مولانا نے اس پر صبر کیا اور اس طرح صبر کیا گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہوں:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس موقع پر مولانا کو کہتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ کا شکر ہے میں ایک شہید کا والد ہوں۔

بنارس کے بعد جامعۃ الفلاح اور مدرسۃ الاصلاح کی تدریسی خدمات

بنارس میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کے بعد مولانا کچھ دنوں جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں استاذ رہے پھر مادرِ علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں منتہی درجات کے طلبہ کو قرآن اور عربی ادب پڑھاتے رہے اور بہت سے نامور شاگرد موصوف سے استفادہ کرتے رہے۔مولانا نعیم الدین اصلاحی اسی دور کے فارغین میں سے ہیں جو اب جامعۃ الفلاح میں شیخ التفسیر ہیں۔

آخری قیام گاہ اور جامعۃ البنات کا قیام

مولانا کی آخری زندگی سعید آباد، حیدرآباد میں گزری اور وہیں چونتیس سال پہلے جامعۃ البنات قائم کیا جو بعد میں جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے قائم رہا۔مولانا نے اسے خوب ترقی دی جو آج ایک تناور درخت کی صورت میں پھل دے رہا ہے وہاں کی فارغات بچیاں حیدرآباد کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کررہی ہیں اور تحریک کے ساتھ درس وتدریس میں لگی ہوئی ہیں۔مولانا کی یہ عظیم تعلیمی خدمات ہیں جو بارگاہِ رب العزت میں انشاءاللہ توشۂ آخرت بنیں گی۔مولانا تقریباً ۹۰ سال باحیات رہے۔

آپ کی آخری آرام گاہ آبائی وطن سے دور حیدرآباد میں سعید آباد کے علاقہ میں ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

''خون اور خاک میں تڑپنے والی اچھی رسم کی انھوں نے بنیاد ڈال دی، خدا اِن پاک طینت، نیک فطرت عاشقوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔'' آمین

ابوالمکارم فلاحی، دہلی

استاذ محترم جناب مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحی رحمہ اللہ سے میرا تعارف اور تعلق اس وقت ہوا جب میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۷ء کا زمانہ تھا۔ مجھے دورانِ طالب علمی بنارس جانے کا موقع ملا جہاں اس وقت مولانا مدرسہ مظہر العلوم میں مدرس تھے۔ اور ساتھ ہی جماعت اسلامی سے بھی منسلک تھے اور اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے تھے، اسی دوران ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پھر وہ بنارس سے بلریا گنج آ گئے اور کچھ مدت جامعۃ الفلاح میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ وہاں بھی مجھے آپ سے شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ تو یاد نہیں کہ مولانا سے کون کون سی کتابیں پڑھیں، البتہ یہ یاد ہے کہ آپ سے فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ پڑھی تھی۔ آپ کا انداز تدریس و تفہیم بہت اچھا تھا۔ بہت سے طلبہ نے آپ سے علمی استفادہ کیا، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اجرِ عظیم سے نوازے، آمین!

مولانا محترم بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ کھانے پینے اور لباس وغیرہ میں بہت سادگی تھی۔ آپ کو دیکھ کر یہ پہچاننا مشکل تھا کہ آپ ایک عظیم علمی شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ نے کئی علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف کی ہیں اور بے شمار لوگوں نے آپ سے علمی استفادہ کیا ہے۔ آپ کی جرأت و ہمت اور بے باکی کے ساتھ حق بات کہنے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ایک بار حیدرآباد میں جماعت اسلامی کا آل انڈیا اجتماع تھا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ مولانا بھی اس میں شریک اور سرگرم تھے۔ اس موقع پر کسی انتظامی معاملے میں، غالباً شرکاء

کے کھانے کے نظم میں کچھ نقص اور بدنظمی ہوگئی، جس سے بعض شرکاء اجتماع کو پریشانی ہوئی۔ اس وقت مولانا کو دیکھا کہ تیزی سے ادھر سے اُدھر دوڑ رہے ہیں اور جماعت کے ذمہ داروں سے مل کر سخت لہجے میں بات کر رہے ہیں کہ یہ بدنظمی کیوں ہوئی؟ پھر جلد ہی اس نقص کا تدارک ہوگیا۔

میں جب دہلی میں مقیم ہوگیا تو کبھی کبھی ان سے کسی پروگرام میں ملاقات ہوجاتی تھی، وہ ملاقات پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔ اب کافی طویل مدت سے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انھیں غریقِ رحمت کرے، ان کی خدمات اور نیکیوں کو قبول فرمائے۔ بشری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

مشفق ومحترم استاذ

محمد نذیر، کویت

مشفق ومحترم استاذ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مولانا شہاب الدین فلاحی اور پھر مولانا جلیل احسن ندوی رحمہ اللہ کے جامعۃ الفلاح لوٹ جانے کے بعد، مولانا محترم ۱۹۷۳ء میں یوپی سے جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر بحیثیت استاذِ حدیث وفقہ تشریف لائے۔ پھر وہ تلنگانہ ہی کے ہوکر رہ گئے۔ مولانا محمد شریف، مولانا اظہار الحق قاسمی، مولانا عبدالمجید اصلاحی پہلے سے موجود تھے۔ آپ کے بعد مولانا کبیرالدین فوزان نے جامعہ کو جوائن کیا۔ بچپن میں ہم طلباء نثار احمد، جاوید اقبال، عبدالمعز، سراج، معراج، علی رضا اور علی اصغر مولانا کے گھر سواران محلہ آیا جایا کرتے تھے۔ مولانا ایک بہت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ اور گھر میں بھی بہت سادہ رکھ رکھاؤ تھا۔ ان دنوں مٹی کے برتن استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ پانی کے گلاس اور چائے کے کپ بھی۔ ہمیں تعجب ہوتا تھا کہ کس احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔

مولانا انتہائی دھیمے لہجے میں درس دیا کرتے تھے۔ ہم نے مولانا کو طلباء پر کبھی غصہ کرتے ہوئے یا سزا دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم مولانا کو ہمیشہ مسکراتے ہوئے پاتے۔ ان دنوں عربی میں تفسیر قرآن جلالین، حدیث کی کتابیں مشکوٰۃ المصابیح، ترمذی شریف، مسلم شریف اور بخاری شریف اور فقہ کی کتابیں قدوری اور ہدایہ معریٰ بغیر اعراب کے ہوا کرتی تھیں۔ تراجم تو نہیں تھے۔ ہم عربی متن کو پڑھتے ہوئے ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ہم طلباء ظاہر ہے پڑھتے ہوئے اعراب میں بہت ساری غلطیاں کیا کرتے تھے۔ مولانا انتہائی صبر وتحمل کے ساتھ اعراب

اور ترجمہ کی تصحیح فرماتے۔ وہی مسکراہٹ بھرا دھیمہ لہجہ...... جواب بھی یاد آتا ہے۔ اور میں اپنے استاذ کی پُرخلوص محبت اور شفقت کی کمی ہمیشہ محسوس کرتا ہوں۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ مولانا کی ٹوپی سر پر ہمیشہ گھومتی رہتی تھی اور اکثر ٹیڑھی ہوتی رہتی تھی۔ مولانا کی ایک منفرد شناخت، مخصوص انداز میں کھکارنے کی آواز تھی۔ ایک دفعہ میں مسجد عزیزیہ جدہ میں نماز تراویح ادا کررہا تھا کہ اگلی صف سے اس مخصوص کھکار کی آواز سنائی دی، میں چونک گیا کہ مولانا یہاں ہیں۔ سلام پھیرتے ہی کھڑا ہوگیا۔ آگے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور تلاش کیا تو دو صف بعد مولانا کی ٹیڑھی ٹوپی اور عمامہ سے انھیں پہچان لیا اور بعد تراویح ملاقات کی۔ مولانا کو اپنے ساتھ فلیٹ پر لے آیا۔ جہاں، میں اپنے برادرانِ نسبتی وحیدالدین اسلم، نصیرالدین اسلم اور مرحوم مظہرالدین اسلم کے ساتھ مقیم تھا۔ نصیر اور مظہر بھی مولانا کے شاگرد تھے۔

مولانا نے ہمارے ساتھ دو دن قیام کیا۔ تیسرے دن جمعہ تھا۔ مولانا نے بیت اللہ کے طواف کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم مکہ مکرمہ گئے۔ بعد نماز عصر طواف کیا۔ پھر مولانا قرآن مجید کا نسخہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا، سورہ کہف کی تلاوت کی؟ میں نے کہا: نہیں۔ مولانا نے حدیث سناتے ہوئے نصیحت کی کہ ہر جمعہ سورہ کہف کی تلاوت کی پابندی کرو۔ اس سے قبل میں سورہ کہف کی تلاوت پابندی سے نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد سے آج تک الحمدللہ مولانا کی نصیحت پر عمل کرتا ہوں۔

کریم نگر میں مولانا مرحوم کے قریبی دوست جامعہ کے اساتذہ کے علاوہ مرحوم عباد اللہ صاحب، چچا ڈاکٹر بشیر احمد اور جناب علی مرتضیٰ صاحب تھے۔ دارالہدیٰ کے ساتھ مولانا بھی حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ پھر مولانا نے لڑکیوں کے لیے جامعۃ البنات کو قائم کیا اور ۲۴ سال تک جامعۃ البنات کی نظامت سنبھالی۔ پھر کچھ اختلافات پر جامعۃ البنات کے دو حصے ہوئے۔ ایک آپ کی زیرِ نگرانی رہا جس کا نام جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ہے۔ مولانا کا امتیازی وصف یہ ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز اور بڑے حادثات میں بھی صبر واستقامت کا پیکر بنے رہے۔ اپنے بیٹے مجاہد کی شہادت کے واقعہ پر آپ کا صبر قابلِ دید رہا جو تحریک اسلامی کے افراد کے لیے ایک بہترین مثال ہے۔

مولانا سے آخری ملاقات میری بھانجی دختر عبدالخالق راشد صاحب کی شادی پر ہوئی۔ ہمارے دوست معراج الدین فرزند مولوی جناب عباد اللہ صاحب اور نصیرالدین اسلم اصرار کرکے مولانا کو فنکشن ہال لے آئے۔ مولانا بہت کمزور ہوگئے تھے۔ علالت کے باوجود اپنے شاگردوں کو پہچانا اور ان سے گفتگو بھی کی۔ جن میں

عبدالخالق راشد صاحب، ڈاکٹر شکیل احمد مرحوم، غلام ربانی، علی رضا جاوید اور کریم نگر سے تشریف لائے جامعہ کے کچھ طلبائے قدیم شامل تھے۔

الحمدللہ! مولانا نے جس تعلیم وتدریس کے مقصد سے ہجرت کی تھی اسی کام میں تازندگی مشغول رہے اور کامیاب ہوئے۔مولانا کے بے شمار طلباء وطالبات ہیں جو انشاءاللہ مولانا کے مشن اور مقصد کو جاری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا کی کوششوں اور کاوشوں کو قبول فرمائے...... **علمٌ ینتفع بہ** کے زمرہ میں تا قیامت آپ کے اعمال صالحہ میں اضافہ در اضافہ فرمائے...... غریق رحمت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔(آمین)

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

مولانا سے تاحیات محبت والفت کا رشتہ برقرار رہا

مسعود احمد، لکھنؤ

میرے استاذ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب بھی اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ذی علم اور بے باک انسان تھے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کافی دنوں تک بنارس میں مدرسہ مظہرالعلوم، آدم پورہ میں استاد رہے اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ہمارے والد محترم جناب حاجی منظور احمد صاحب مرحوم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ مولانا جماعت اسلامی ہند کے سرگرم اور فعال رکن تھے۔ سال 1958 میں مجھے ان سے قرآنِ مجید ناظرہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے آپ کی صحبت صالحہ سے بہت کچھ سیکھا اور فیض اٹھایا یہاں تک کہ زندگی کے مقصد کو پالیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔

مولانا سے تاحیات محبت والفت کا رشتہ برقرار رہا۔ انھوں نے بنارس کے بعد حیدرآباد دکن کو مستقل اپنا وطن بنالیا تھا۔ میرا جب کبھی بھی حیدرآباد جانا ہوتا، میں ان سے ملاقات کرتا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوتے اور عزت افزائی فرماتے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں رہے، مگر ان کی دینی وعلمی خدمات ان کی یادوں کو عرصہ تک باقی رکھیں گی۔ دعا کرتا ہوں کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں ودیگر اہل خانہ ان کی نیکیوں میں اضافہ کا ذریعہ ثابت ہوں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل ارزانی کرے۔ آمین!

نقوشِ تاباں
تاثرات برادرانِ اصلاح

وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

وہ شخص اب اک سحر کی صورت
جہاں میں پھیلا ہوا ملے گا
رہِ خدا کے سپاہیوں کی
دعاؤں میں وہ رچا ملے گا
ستیزہ گاہوں میں جاں لڑاؤ
وہاں وہ خود تم سے آملے گا
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

وہ تیز دھارا ہے روشنی کا
کہیں نہیں ہے مقام اس کا
وہ ان کے جذبات میں ہے شامل
جو لے کے نکلیں پیام اس کا
اقامتِ دین حق کی خاطر
جو کرتے پھرتے ہیں کام اس کا
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

کتاب دوراں کے ہر ورق پر
حیات اس کی رقم شدہ ہے
ہزاروں سینوں میں درد پنہاں
فغاں میں اس کی بہم شدہ ہے
کئی صدی کا جہاد پیہم
مساعی میں اس کی ضم شدہ ہے
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

نظام اسلام آئے گا جب
تو اس کا تازہ ظہور ہوگا
جہاں میں شورِ نشور ہوگا
وقوع محشر ضرور ہوگا
وہ دے گیا ہے خبر سحر کی
اندھیرا باطل کا دور ہوگا
وہ شخص اب یاں نہیں ملے گا

ذکرِ خیر۔مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا

ڈاکٹر شفیق احمد اصلاحی، دہلی
رکن مجلس شوریٰ حلقۂ دہلی، جماعت اسلامی ہند

یہ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں درجہ عربی اول میں میرا داخلہ ہوا۔اس وقت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ عربی ہشتم یعنی آخری کلاس کے طالب علم تھے۔

وہ مدرسۃ الاصلاح کا زریں دور تھا۔مولانا اختر احسن اصلاحیؒ صدر مدرس تھے۔ان کے دورِصدارت میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی اصلاح وتربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

میں اس وقت ایک نووارد طالب علم تھا جو آدابِ مدرسہ سے ناواقف تھا۔مدرسہ کے احاطے میں آم کے درخت تھے۔آم کی فصل آئی ہوئی تھی، میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ایک پکا آم، پیڑ کے نیچے گرا ہوا تھا۔میں نے اسے اٹھالیا۔مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے میرے ہاتھ میں آم دیکھا تو مجھ سے پوچھا:''یہ آم کہاں سے لیا ہے؟''

میں نے اس درخت کی طرف اشارہ کیا۔مولانا نے فرمایا:''ارے بھائی! یہ مدرسہ کی امانت ہے، مدرسہ کے ذمہ داروں سے پوچھے بغیر مت لیا کرو، یہ آم لے جاؤ، دفتر میں منشی جی کے پاس جمع کردو۔''اس کے بعد میں نے پھر ایسی غلطی نہیں کی۔مجھے یہ احساس ہوا کہ مدرسہ کی چیزیں مدرسے کی امانت ہیں، قیمت ادا کیے بغیر ان کا استعمال جائز نہیں۔اسی زریں دور کا ایک اور واقعہ ہے۔ہم پانچ چھ طلبہ، بعد نماز عصر ٹہلنے کے لیے نکلے۔

ہمارے ساتھ مولانا عبدالعلیمؒ صاحب اور مولانا امانت اللہ صاحبؒ بھی تھے، ٹہلتے ہوئے ہم لوگ کچھ دور نکل گئے۔ ہمارے ایک ساتھی نے نیم کے درخت سے ایک ٹہنی توڑی اور اس سے پانچ چھ مسواکیں بنالیں اور ہتھیلی میں لے کر سب کے سامنے پیش کردیں۔ سب سے پہلے مولانا عبدالعلیم صاحبؒ نے وہ مسواک اٹھائی جو سب سے کمتر تھی۔ اس کے بعد مولانا امانت اللہ صاحبؒ نے بقیہ مسواکوں میں جو سب سے کمتر تھی، اٹھالی۔

اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور اخیر میں سب سے کمتر مسواک اس کے حصے میں آئی جس کے ہاتھ میں وہ ساری مسواکیں تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

اس طرح کے واقعات اور قصے کہانیاں تو سنی تھیں مگر اس کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی صلاحیت و صالحیت کو دیکھتے ہوئے مولانا اختر احسن اصلاحی صاحبؒ نے مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کو تعلیم سے فراغت کے بعد، مدرسہ پر روک لیا اور چھوٹے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری انھیں سونپ دی۔ چنانچہ انھوں نے پوری تن دہی اور شفقت و محبت کے ساتھ یہ ذمہ داری ادا کی۔

اسی دور میں مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کبھی کبھی مدرسہ پر خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے۔ ایک بار خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے ایک دردناک واقعہ بیان کیا جسے سن کر سب کی آنکھیں نم ہوگئیں اور خود مولانا (مرحوم) پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ دراصل مولانا بہت حساس اور رقیق القلب واقع ہوئے تھے، جس کی بنا پر ان پر یہ رقت طاری ہوئی۔ مگر کچھ لوگ اسے مولانا کی جذباتیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک بار مرکز جماعت اسلامی ہند کی طرف سے وادیٔ ہدیٰ حیدرآباد میں ایک تربیتی پروگرام رکھا گیا تھا، اس میں شرکت کے لیے میں بھی گیا ہوا تھا۔ اس وقت مولانا مرحوم غالباً وادیٔ ہدیٰ میں ہی درسگاہ دارالہدیٰ کے ذمہ دار تھے۔ مجھے کچھ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ضرورت تھی، مگر قدیم شناسائی اور گہری قربت ہونے کے باوجود، مولانا کو زحمت دیتے ہوئے تکلف محسوس ہو رہا تھا لیکن مولانا نے بے تکلف دوست کی طرح شہر جا کر ہماری فرمائشیں پوری کیں۔ یہ ان کی خاکساری اور ذرہ نوازی تھی۔

یہ متفرق واقعات، سبک روی سے پیش آتے رہے۔ سست روی سے ہی سہی، مگر اس کے باوجود مولانائے محترم سے محبت و تعلق خاطر میں اضافہ ہوتا رہا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولانا مرحوم سے رشتہ داری کا تعلق بھی قائم ہوگیا اور وہ ہمارے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر انیس کے خسر اور ہمارے سمدھی ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کی نیکیوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے، انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

آدمی کیا ہے، اک فسانہ ہے — اشک پی پی کے مسکرانا ہے
پیر و مرشد ہوں کہ ہوں شاہ و فقیر — جو بھی آیا ہے اس کو جانا ہے

(متین امروہوی)

موت سے کس کو رست گاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ: ایک حقیقی عالمِ دین

مولانا عمر اسلم اصلاحی
مدیر سہ ماہی نظام القرآن
واستاذ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

ان دنوں طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ڈاکٹر نے ایک مہینہ کا بیڈ ریسٹ کرنے کو کہا ہے اور اس کے بعد بھی سخت تاکید کی ہے کہ چند مہینے آپ لکھنے پڑھنے کے کام سے گریز کیجیے۔ ورنہ طبیعت میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہوجائے گی تو تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود معذرت چاہتا ہوں، ورنہ مولانا کے سلسلے میں مجھے اس لیے بھی لکھنا تھا کہ مولانا اصلاح پر جب بھی آتے تو مجھ سے ضرور ملتے تھے اور بعض دفعہ تو وہ لوگوں سے کہتے بھی تھے کہ ''بھائی موجودہ مدرسۃ الاصلاح کو میں عمر اسلم کے حوالے سے جانتا ہوں...... ان سے نہیں ملوں گا تو کس سے ملوں گا......''

بابری مسجد کی شہادت کے بعد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب مدرسہ پر تشریف لائے اور دفتر مالیات میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں میں بھی موجود تھا اور بھی کئی افراد موجود تھے دفتر کے لوگ تو تھے ہی۔ مولانا نے کہا کہ ''بابری مسجد شہید نہ ہوتی اگر مسجد والوں نے اپنا کردار ادا کیا ہوتا۔'' انھوں نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے گھر کی حفاظت خود نہیں کرتا اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے جب تک وہ لوگ اس کی حفاظت کے لیے آگے نہ آئیں جن کو اس گھر کی ضرورت ہے۔'' اور پھر انھوں نے اشارہ کیا خانۂ کعبہ کی طرف کہ ابرہہ نے اپنی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو ڈھانا چاہا تو وہ ڈھا نہیں سکا کیوں کہ مکہ والوں نے اس گھر کی حفاظت کی تدبیر کی۔ لوگوں کی یہ رائے مناسب نہیں ہے کہ مکہ والے اپنی جان بچا کر چلے گئے تھے اور کعبہ کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا ایمان اتنا مضبوط نہیں تھا۔ مولانا کا کہنا یہ تھا کہ

''جب ابرہہ نے ان پر حملہ کرنا چاہا تو مکہ والوں نے دیکھا کہ براہِ راست ان سے مقابلہ ممکن نہیں

ہے تو انھوں نے جنگی تدبیر کے طور پر مکہ خالی کر دیا اور پہاڑیوں میں آ کر چھپ گئے اور وادئ محسر کے پاس پہاڑیوں کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ چنانچہ جب ابرہہ اور اس کی فوج وہاں پہنچی تو انھوں نے فوج پر پہاڑوں کے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ چونکہ خود مکہ والوں نے اس گھر کو بچانے کی کوشش کی تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو بچایا۔'' تو میں نے کہا کہ مولانا پھر تو مولانا فراہی کا موقف بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''صورتِ حال کا جائزہ لیجیے تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت بھی ہے۔''

کچھ عرصہ کے بعد میں مکہ گیا تو عید کے بعد میں نے اپنے دوست جناب شوکت علی صاحب سے کہا کہ مجھے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ وغیرہ کو اطمینان سے دیکھنا ہے۔ چونکہ وہ خالی ایام تھے عید کے بعد وہاں بھیڑ نہیں ہوتی، اس لیے جب ہم لوگ وہاں گئے اور ہم نے اس کا واقعی جائزہ لیا...... تینوں جمرات کے سامنے پہاڑیوں میں درّے نظر آئے۔ ان درّوں کو دیکھا تو ایسا لگا کہ مولانا فراہیؒ کا موقف بالکل درست ہے اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب بھی اسی کے قائل تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ ''جب آدمی اپنی ضرورت کی چیز کے لیے آگے بڑھتا ہے اور اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے لیکن جب کوئی آدمی سارا معاملہ صرف اللہ کے حوالے کر کے خود کنارے ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کچھ نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کو کسی عمارت سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی جنگ اپنے ہاتھ میں لے لے...... جتنی جنگوں میں اہلِ اسلام کو فتح ملی ہے سب میں مسلمانوں نے جی جان کی بازی لگائی تب ان کو فتح ملی ہے۔ اس میں مالی اور جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لوگوں نے یہ کہہ دیا ہو کہ بھائی اللہ کا معاملہ ہے۔ اللہ کے دین کا معاملہ ہے وہ سمجھے گا ہم سے کوئی مطلب نہیں ہم کنارے ہو جائیں اور بالکل محفوظ ہو جائیں۔''

تو یہ تھا مولانا کا موقف...... اور جب بابری مسجد کی شہادت کے بعد میں خود بھی ایک وفد کے ساتھ ایودھیا گیا اور وہاں لوگوں کے بیان اور مواقع کا مشاہدہ کرنے کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی اس سے بھی مولانا کا موقف زیادہ مضبوط نظر آتا ہے۔

یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تو اس کو بیان کر رہا ہوں۔ اسی طرح ایک بار اور مولانا مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے، وہ بدھ کا دن تھا۔ عام طور سے بدھ کو طلبہ کی بزم ہوتی ہے۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا آج اگر آپ رک جاتے تو تمام بزمیں مشترک کر دی جاتیں اور آپ کا ایک خطاب ہو جاتا۔ مولانا نے کہا کہ ''بھائی وقت میں گنجائش نہیں ہے اگر پہلے سے مجھے معلوم رہا ہوتا تو گنجائش پیدا کر کے آتا۔ رکنا تو ممکن نہیں ہے لیکن آپ میری

طرف سے ایک تقریر کر دیجیے گا۔'' میں نے کہا ''آپ کی تقریر میں کیسے کروں گا؟ مولانا نے کہا کہ ''آپ اپنی تقریر میں طلبہ سے یہ کہہ دیجیے کہ وہ سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس میں بھی انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولوالعزم شخصیات کا خاص طور سے مطالعہ کریں......'' پھر انھوں نے خود کہا کہ ''یہ مت سمجھئے گا کہ میں انبیاء کرام علیہم السلام یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی کو غیر اولوالعزم سمجھتا ہوں...... یہ بات نہیں ہے...... میں اس لیے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے سلسلہ میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ میں نے ان کے اندر عزم کی کمی پائی......تو انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہو، چاہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت ہو یا شخصیات کی سیرت ......ان کی سیرت کا مطالعہ خاص طور سے کروایئے جو مجاہدانہ کردار کے حامل تھے اور جنھوں نے لوگوں کو حوصلہ و ہمت دیا ہے۔ اس سے لوگوں کے اندر وہ روح پیدا ہوگی جس روح کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میرا یہ پیغام آپ اپنے الفاظ میں طلبہ تک پہنچا دیجیے۔'' پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگے کہ ''ارے بھائی میں تقریر کروں گا بھی تو میں کوئی مقرر آدمی تھوڑی ہوں۔'' اور بولے کہ ''آپ مقرر ہیں اور میری یہ بات آپ کہہ دیں گے تو زیادہ سلیقہ کے ساتھ، ادیبانہ شان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا ''مولانا شرمندہ مت کیجیے۔ ٹھیک ہے آپ کے پاس وقت نہیں ہے تو میں انشاء اللہ آج اپنی صدارتی گفتگو میں آپ کا یہ پیغام طلبہ تک پہنچا دوں گا۔''

مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ میں حیدرآباد آؤں......(مدرسہ کے کام سے ہی سہی) وہ چاہتے تھے کہ وہاں قرآن مجید کے کچھ دروس وغیرہ رکھوائیں......اور دنیا کو یہ بتائیں کہ قرآن مجید کا درس کیسے دیا جاتا ہے؟...... قرآن مجید کا وہ درس، 'درس قرآن' نہیں ہوتا۔ جس میں آیتیں تو قرآن مجید کی پڑھی جاتی ہیں اور اس کا ترجمہ بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد غیر متعلق تقریر کی جاتی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ایک درس سنا ہے اور مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ آیت اور ترجمہ کے بعد وہی گفتگو کرتے ہیں جو آیت سے متعلق ہوتی ہے۔ اس طرح کے دروس کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

یہ مختصر یادیں ہیں جو آپ سے بیان کر دی ہیں۔ اللہ آپ کو عزم و حوصلہ عطا فرمائے۔

میں نے نظام القرآن (فروری، مارچ، اپریل ۲۰۲۳ء) کے شذرات میں جو کچھ لکھا ہے سطورِ ذیل میں اسے بھی جوں کا توں پیش کر رہا ہوں:

''مولانا نظام الدین اصلاحیؒ کے انتقال کے بعد تیسرے ہی دن ۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء کو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ مولانا کے والد کا نام جناب محمد نسیم ہے۔ مولانا نے مدرسۃ الاصلاح میں ۳۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو درجہ سوم مکتب میں داخلہ لیا، اس وقت ان کی عمر مدرسہ کے ریکارڈ کے مطابق

۱۱ رسال تھی۔ اس طرح ان کا سن پیدائش ۱۹۳۴ء بنتا ہے۔ ۱۰ رمئی ۱۹۵۳ء کو فراغت حاصل کی۔ ان کے رفقائے درس میں بشیر احمد بستی، محمد اظہار الحق مونگیر اور عبدالمجید جیراجپوری تھے۔ فراغت کے بعد ہی مدرسۃ الاصلاح میں طلبہ کے نگراں ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۴ء تک بحیثیت نگراں مدرسہ کی خدمت کرتے رہے پھر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک جامعہ مظہر العلوم بنارس میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۷۰ء میں پھر مدرسۃ الاصلاح تشریف لے آئے اور ۱۹۷۳ء تک بحیثیت صدر مدرس مادرِ علمی کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۸ء جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر وحیدرآباد میں معلّم رہے پھر آپ نے ۱۹۸۸ء ہی میں جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کی سعید آباد حیدرآباد میں بنیاد ڈالی اور حین حیات تک اس کے ناظم رہے۔

کئی اور دینی وعلمی اداروں کے ممبر رہے۔ جماعت اسلامی ہند سے بھی ایک طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ مولانا کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں: ● بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ● جاہلیت کے خلاف جنگ ● اسلامی فکر کیا ہے؟ ایک تنقیدی جائزہ ● زکوٰۃ کی اہمیت ● دارالاسلام اور دارالحرب ● مساجداللہ ● ملت کے دفاع کا مسئلہ شریعت کی روشنی میں ● مجسموں کا مسئلہ ● ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو ● نظام خلافت وامارت کی شرعی حیثیت ● طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں۔ سیکولر جمہوری نظام۔ الیکشن اور تحریک اسلامی۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے مدرس تو تھے ہی بہترین منتظم بھی تھے، طلبہ وطالبات کی تربیت کا خاص ہنر تھا۔ وہ اپنے طلباء وطالبات کو دینی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ خود بھی مجاہد تھے اور اپنے زیرِ تربیت طلبہ وطالبات کو بھی مجاہد اور مجاہدہ ہی بناتے تھے۔ ان کی پسند وناپسند کا معیار وہی تھا جو ایک حقیقی عالم دین کا ہوتا ہے۔ اپنے گھر بندی گھاٹ آتے تو مدرسۃ الاصلاح کی بھی زیارت کرتے۔ میں نے اگرچہ مولانا سے پڑھا نہیں تھا لیکن وہ مجھے بھی اپنے عزیز شاگردوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔''

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت فضلاء مدرستہ الاصلاح اور اراکین تحریک اسلامی کے مابین محتاج تعارف نہیں، مولانا کی شخصیت کے اساسی عناصر تدریس، تحریر اور تحریک ہیں۔ انسان کا اولین فریضہ تعلیم و تدریس ہے کیوں کہ اولین علامتِ نبوت تعلیم ہی ہے۔ مولانا کے یہاں تعلیمی فرائض کا مکمل شعور موجود تھا، تحقیق و تصنیف کو اپنا اساسی ہدف قرار دیا۔ مولانا عظیم مصنف نہیں تھے لیکن ان کی نگارشات ان کی فکری عظمت پر دال ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی تحریک کا واضح نمونہ تھی۔ ان کے یہاں تساہلی کا گزر نہ تھا۔ ایک چیز جو آپ کی زندگی سے عبارت رہی وہ ایمانی جرأت وشجاعت ہے۔ ایمان خوف وہراس کی ضد ہے۔ جس کی وجہ سے مولانا کو شدید دشواریوں کا سامنا رہا، اس کے باوجود مصائب وشدائد کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ہمیشہ اپنے خیال کو بے کم وکاست پیش کیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے ان کے اپنے پیمانِ وفا نبھا نہ سکے۔

لیکن مولانا ایسے جری اور نڈر کہ سمجھوتا کرنا انھیں نہیں آتا تھا، فکر فراہیؒ کو پڑھ لینے کے بعد انسان بے نیاز ہوجاتا ہے۔ نہ اسے اربابِ سیاست کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی دربارِ نظام سے وابستگی کی فکر۔ وہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی طرح فکر فراہی کے امین رہے ایسے امین کو مرحوم ضیاء الحق کی باریابی کی چاہت نہیں ان کی درخواست کے باوجود ٹی وی پر درس قرآن کے لیے تیار نہیں ہوئے، کیوں کہ درس اور رقص میں کوئی تال میل نہیں ہے، ضیاء صاحب نے مولانا اصلاحی کو مکان اور قرآن اکیڈمی بنا کر دینے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن مولانا اس کے لیے تیار نہیں ہوئے کیوں کہ مولانا دولتِ استغناء سے معمور تھے۔ مولانا عہد حاضر کے اہل صفہ میں سے

تھے۔ فقر اقبال انھیں عزیز رہا اور امت کا زوال ان کے لیے باعثِ قلق بنا رہا۔ یہی وقار مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے یہاں موجود رہا۔ وہ ایک ایسے مبلغ تھے جن کے یہاں مصلحت پسندی سے کبھی کوئی یارانہ رہا۔

مولانا سے حیدرآباد میں تین ملاقاتیں رہیں۔ پہلی ملاقات کے لیے خود حاضر ہوا اس کی وجہ یہ رہی کہ راقم نے انھیں مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت استاذ دیکھا تھا پر افسوس کہ زانوئے تلمذ اور شرف تخاطب سے محروم رہا۔ جب پہلی بار غالباً ۱۹۹۴ء میں حیدرآباد جا رہا تھا تو ذہن میں آیا کہ حاصلِ سفر یہ ہو کہ مولانا سے ملاقات کی جائے، بات کی جائے اور آپ کے عہد کے مدرسۃ الاصلاح کی داستان سنی جائے۔ حاضر ہوا تو مولانا کا والہانہ پن دیکھ کر بہت خوش ہوا، مولانا نے پہلے بڑے مشفقانہ انداز میں خاکسار کی خیریت معلوم کی، مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ کرام کے قصے سنائے کہ وہ کس طرح قرآن پڑھا کرتے تھے۔ مولانا کی گفتگو کا نچوڑ تھا کہ مدرسہ پر تدریس قرآن کا مفہوم مکالمہ ومباحثہ ہے۔ شاید یہ کہنا بے احترامی نہ ہو کہ وہاں کے اساتذہ کرام طلبہ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ان کے سوالات سے اساتذہ کرام کی تدبر کے زاویے وا ہوتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ ''استاذ کی تدریس میں یہ چیز شامل ہو کہ وہ اپنے طلبہ سے سیکھنا بھی چاہتے ہیں۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''درس قرآن میں جس طرح تبیین وتشریح پیش نظر ہو اسی طرح شرکاء کے تاثرات وتساءلات سے اپنے درسِ قرآن کی افادیت کو بڑھایا جائے۔'' مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا قرآن کریم کی گہرائیوں سے واقف ہیں۔ انھوں نے تصانیف فراہی کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح نے مولانا کو توقف وتدبر عطا کیا تھا، لیکن تحریک نے اسے تعجل میں تبدیل کر دیا۔ مدرسۃ الاصلاح کے تعلق سے مولانا کی داستان سرائی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی اور مجھے یونیورسٹی جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ ہمت کر کے اپنے جانے کی اجازت چاہی تو مولانا نے فرمایا: ''سفیان صاحب! کھانے کے بعد جانے کی اجازت دوں گا۔'' اس کے بعد مولانا نے اپنا مدرسہ دکھایا جسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہاں صراحت مناسب ہوگی کہ آپ کے حرکات وسکنات پر حکومت کی نظر رہتی تھی۔ انہی الجھنوں میں رہتے ہوئے اتنا بڑا ادارہ قائم کر دیا! آج خواتین امت اس سے مستفیض ہو رہی ہیں اور اپنے ادراک کو تقویت بخش رہی ہیں۔ اہل حیدرآباد کو اس ادارے کی عظمت کا احساس ہے کہ خواتین حیدرآباد کو مہذب بنانے میں اس ادارے کا غیر معمولی رول رہا ہے۔ حیدرآباد کے مختلف لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مولانا اہل حیدرآباد کے مابین ایک خاص مقام ومرتبہ کے حامل ہیں۔

اس کے بعد دو بار مولانا کی ذاتِ اقدس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو عشائیہ کے لیے بضد رہے۔ آپ کے دسترخوان اور آپ کی فکرمندیوں دونوں کو ملاحظہ کیا، انھیں ہندوستان کی انتہا پسندی کا پورا اندازہ

تھا۔ دراصل میں تعزیت کے لیے گیا تھا، ناعاقبت اندیشوں کے ہاتھوں آپ کے بیٹے جناب مجاہد سلیم کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ یہ ایسا حادثہ تھا جس نے پورے ملک کو گرفت میں لے لیا۔ نوجوان بیٹے کا یہ حادثہ والدین کے لیے جانکاہ ہوتا ہے۔ میں بار بار شہید محترم کا ذکر کرتا رہا اور آپ ہر بار تقدیرِ الٰہی کا ذکر کرتے رہے۔ اور صبر کے لیے مجھ سے دعا کی درخواست کرتے رہے۔ چوں کہ مولانا نے خود کو مطالعہ قرآن کا عادی بنایا ہے اس لیے انھیں تقدیر اور صبر کی تلقین قرآنی کا اندازہ ہے۔ ایک صاحب ایمان کو پتا ہے کہ مقدرات میں چھیڑ چھاڑ نہیں کی جاسکتی، اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان:۲)

''اس کی سلطنت میں اس کا کوئی ساتھی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کر کے اسے ایک متعین شکل دی ہے۔''

مولانا کو بخوبی اندازہ تھا کہ قرآن کریم میں صبر کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، ایمان اور صبر میں بڑا عمیق رشتہ ہے۔ صبر و صلوٰۃ کا معاً ذکر ہے، مولانا فراہیؒ نے ''مفردات القرآن'' میں لفظ ''صلوٰۃ'' کی قابلِ قدر تشریح کی ہے۔ جہاد کا تصور صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں صبر کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ کلام عرب کی روشنی میں صبر کی توضیح کی ہے۔ صبر سے ایمان محکم ہوتا ہے۔ مومن صبر کی ڈھال کے ساتھ اپنے مراحل طے کرتا ہے۔ صبر فلاح کی ضمانت ہے۔ نیز اللہ کی رفاقت کا حبل متین بھی۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے صبر ایوبی کا مظاہرہ کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ''اس بار آنے کا کیا سلسلہ ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک خطبہ دینا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ''تمہاری علمی سرگرمیوں سے واقف ہوں لیکن خیال رہے کہ ہم اپنی شناخت سے کٹ نہ جائیں۔ فراہی شناخت بڑی قیمتی شئ ہے اس کے بغیر قرآن کی معنوی اور ادبی فہم کا امکان نہیں۔''

مدرسۃ الاصلاح ایک قرآنی درس گاہ ہے۔ جس نے قرآنیات کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کے فارغین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق قرآنی معارف میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔ مولانا نے مولانا امین احسن اصلاحی کا بڑے احترام سے نام لیا۔ تدبر قرآن کی عظیم خدمات کا اعتراف کیا، نیز اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ''فکر فراہیؒ کے حقیقی جانشین مولانا امین احسن اصلاحیؒ ہیں۔'' یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے علمی اعتبار سے جماعت کو استناد بخشا ہے بلکہ اسے قرآنی رخ دینے میں مولانا کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ انسان قرآن کریم سے مستفاد ہونے کے بعد نئے زاویوں سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کی گفتگو اجتہادی ہوتی ہے۔ قرآن کریم علمی اور معاشرتی مجاہد بناتا ہے۔ مولانا عبدالعلیم صاحب علمی اور معاشرتی مجتہد تھے وہ اپنی ہر بات

برانگ دہل کہتے تھے، انھیں حکومت کے کارندوں سے کبھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ قرآن کریم مصلحت کوش اور بزدل نہیں بناتا۔ مولانا کی پوری زندگی مصالح سے پاک رہی۔ دوٹوک انداز میں کہہ دینا انھیں خوب آتا تھا۔

جب انھوں نے ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی اور پروفیسر نجات اللہ صدیقی کے یہاں مصلحت کوشی دیکھی تو ان کے جواب کے لیے ''طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی کے مقالات پر ایک تنقیدی نظر'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس میں مرجع قرآن کریم کو بنایا ہے۔ مولانا کے موقف میں مداہنت کی رعایت بالکل نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے تنقید اور تردید کے لیے قرآن کریم سے استدلال کیا ہے۔ مولانا کے استدلال سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ خود قرآن کریم سے آپ کے نقطۂ نظر سے ایک علاحدہ رائے اختیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے صفحات گواہ ہیں کہ مولانا نے قرآن کریم کا باعتناء مطالعہ کیا ہے۔

حالات کے پیش نظر ہم اپنی شناخت سے دست بردار ہو جائیں یا ہم اپنی مشرقیت سے دست کش ہو جائیں، مولانا نے اسے کبھی گوارہ نہیں کیا۔ مولانا کا موقف تھا کہ اسلام دنیا میں تمام ادیان پر غلبہ کے لیے آیا ہے۔ اس کے لیے کوشش کرنا، اقامت دین کو لائحۂ عمل قرار دینا اور اپنی زندگی کا مقصد شریعتِ اسلامی کا نفاذ قرار دینا ہی حقیقی اسلام ہے۔ اللہ کی عطا کردہ زندگی انہی مقاصد میں مبذول ہو جائے تو زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ مولانا کے یہاں ہمیشہ حصول مقصد رہا کبھی انھوں نے مشاکل وموانع کو اپنی راہ کا روڑہ تصور نہ کیا۔

مولانا سے ایک تیسری اور آخری ملاقات رہی تو انھوں نے ایک طرف نظام کے کارناموں کی ستائش کی تو دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ان کے اندر تشیع کا بول بالا ہوا تو اس نے مذہبی اعتبار سے شہر کو خاصہ متاثر کیا۔ اہلِ نظام لہو ولعب کا شکار ہوئے۔ ان کی جمہوریت نے دین اسلام کو خاصا نقصان پہنچایا، آج اس شہر میں بدعات کا بول بالا ہے۔ لوگوں کے عقائد متاثر ہو رہے ہیں۔ یہاں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے متصوفین اور خانقاہوں نے عقائد باطلہ کو عام کیا ہے۔ شرک کا بازار گرم ہے۔ مولانا کی تبلیغی مساعی اور دروس قرآن نے خرافات پر قدغن لگائی ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''نظام کی کشادہ دلی نے عثمانیہ یونیورسٹی کو مشرقی تہذیب سے بہت دور پھینک دیا ہے۔ اس میں سب کچھ نظام نے بنایا لیکن بیت اللہ کی کوئی علامت انھیں بنانے کی فکر نہیں رہی۔''

بہرکیف ایک طرف مولانا نظام کے اچھے نقوش کے قدرداں تھے، تو دوسری طرف ان کے غلط اقدامات کے ناقد بھی۔ دائرۃ المعارف اور دارالعلوم عہد نظام کا جیتا جاگتا کارنامہ ہے۔ دائرۃ المعارف نے عربی ادبیات

اور اسلامی ادبیات کی اشاعت میں نا قابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔اس میں کلام نہیں کہ عربی کی امہات الکتب کا ایک طویل اشاعتی سلسلہ رہا ہے۔ جسے دائرۃ المعارف نے اہلِ علم تک پہنچایا۔مولانا نے یہ بھی وضاحت کی کہ مخطوطات کے تحفظ میں عہد نظام کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔خود سالار جنگ میوزیم ایک بڑا ثقافتی مرکز ہے، اس کے میڈیکل کالج کی خدمات صفحات پر مرتسم ہیں۔مولانا کو فکر مندی رہی کہ حیدر آباد کی علمی اور دینی حیثیت کو برقرار کیسے رکھا جائے۔ڈاکٹر حمید اللہ کو اپنے حیدر آباد پر فخر رہا۔انھوں نے تحریر فرمایا کہ ''میں عہد نظام میں آزاد حیدر آباد کی پیداوار ہوں میں اب غلام حیدر آباد میں واپس جانا پسند نہیں کروں گا۔'' مولانا حیدر آباد کے علمی مقام و مرتبہ سے اچھی طرح واقف تھے۔مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ''مولانا حمید الدین فراہیؒ دارالعلوم کو ایک نیا اسلامی رخ دینا چاہتے تھے لیکن مدت قلیل اور خود نظام کی فرماں روائی نے ان کی چاہتوں پر قدغن لگائی۔''

مولانا کی بہت سی تحریریں ہیں جو انسان کو جذباتی اور جہادی بناتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ نجات اللہ صدیقی اور فضل الرحمن فریدی کے خیالات اور اسلوب مداہنت سے مولانا کا فکری تصادم رہا۔مولانا نے دارالاسلام اور دارالحرب پر گفتگو کرتے ہوئے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔مولانا کی تحریروں میں جہاد کا نقطہ نظر واضح انداز میں موجود ہے۔لیکن ان مباحث میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ جہاد کن حالات میں ضروری ہے۔ جہاد جست واحد کا نام نہیں ہے۔ جہاد توقف و تدبر کا متقاضی ہے۔منافقین جہاد سے کتراتے تھے اور محاذ پر جانے سے گریز کرتے تھے۔مولانا نے جہاد کی اسپرٹ سے کبھی اعراض نہیں کیا، انھیں مولانا وحید الدین خاں کی مصلحتوں سے کبھی اتفاق نہیں رہا۔ یہاں تک کہ انھیں جماعت کی پالیسیوں سے بھی اتفاق نہیں رہا۔مولانا ایک جداگانہ سانچے کے ساختہ تھے۔ ہندوستان میں ان کی اپنی شناخت تھی جس کا تحریک اسلامی سے میل نہیں رہا۔مولانا کے بہت سے خیالات متنازع رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، لیکن یہ بھی صداقت ہے کہ ایسا اخلاص، ایسا جانباز آج تاریخ کا حصہ ہے۔ مولانا نے جہاد سے متعلقہ آیات کا بالتدبر مطالعہ کیا ہے۔ جہاد کے آغاز سے قبل انسان کو حالات کا تجزیہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ نے اسلامی ریاست کا ایک خاکہ پیش کیا ہے لیکن عملی اعتبار سے سیاست سے دور رہنا پسند کیا۔ مولانا فراہیؒ فلسفی تھے اور قرآن کریم کی حکمتوں سے باخبر تھے۔لیکن سیاسی گلیاروں کے پیچ و خم سے نا آشنا، مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تدبر قرآن کی تکمیل کی لیکن سیاسی میدان میں انھیں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی۔ بہر کیف سیاست اور سیاسی تحریک اسلامی سے تائب کیا ہوئے کہ قرآنیات اور اسلامیات کو بہت کچھ دے گئے۔

مولانا عبدالعلیم صاحب دارالحرب اور سیاسی مسائل سے قطع نظر قرآنی مباحث پر اپنی توجہ مبذول کرتے تو آج قرآنیات کو بہت کچھ دے جاتے۔

دعا ہے کہ ایسے پکے اور اچھے صاحب ایمان کو اللہ خلد بریں عطا فرمائے۔ حیدرآباد بہت دنوں تک ایسے مرد خدا کو یاد کرتا رہے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی ہر پاکیزہ تحریک کو استحکام و استقامت نصیب ہو۔ علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کی چھیڑی ہوئی تعلیمی تحریک کو انھوں نے کسی نہ کسی صورت میں آگے بڑھایا ہے۔ مولانا نے مدرستہ الاصلاح کے نصاب کے طرز پر فہم قرآن کی راہ کو ہموار کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ایک کارواں اس راہ پر گامزن رہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ: مردمومن

(۳۱/جنوری ۱۹۳۴ء-۲۷/ستمبر ۲۰۲۲ء)

ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی

ڈائریکٹر ادارہ دعوت القرآن لکھنؤ

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی عظمت کے نشان، تحریک اسلامی کے جرأت مند وسرگرم کارکن، دین اسلام کے نقیب اور قرآن وسنت کے جلیل القدر عالم تھے۔ مولانا کا تعلق معروف ومشہور ضلع اعظم گڑھ کے گاؤں بندی گھاٹ کے زمین دار گھرانے سے تھا۔ ۳۱/جنوری ۱۹۳۴ء کو بندی گھاٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب محمد نسیم صاحب (۱۹۱۰ء-۲۰۰۲ء) خود بڑے بے باک، جری اور جفاکش آدمی تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے ان کے والد نے عالم اسلام کی ممتاز درسگاہ مدرستہ الاصلاح میں ابتدائی شعبہ کے درجہ سوم میں ۱۹۴۶ء میں داخلہ کرایا۔ پڑھنے میں تیز اور ذہین طالب علم تھے جس کی وجہ سے عربی اول میں چند ماہ پڑھا اور اساتذہ نے ترقی دے کر عربی دوم میں کردیا یعنی ایک ہی سال میں عربی اول اور عربی دوم کا نصاب پاس کرلیا۔ ۱۰/مئی ۱۹۵۳ء میں فضیلت کی سند حاصل کر کے مدرسہ سے فارغ ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی علیہم الرحمۃ اور اس وقت کے دیگر اساتذہ کے نام ملتے ہیں۔ مولانا ابھی درجہ سوم مکتب میں تھے کہ ۱۹۴۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ مدرسہ

سے جماعت اسلامی کے مرکز پٹھان کوٹ جاچکے تھے۔ہم سبق ساتھیوں میں مولانا بشیر احمد اصلاحی، مولانا عبدالمجید اصلاحی جیراجپوری، مولانا شبیر انور اصلاحی اور مولانا وکیل احمد اصلاحی علیہم الرحمۃ وغیرہ کے نام ہیں۔

فراغت کے بعد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم جو اس وقت صدر مدرس تھے، ان کی ہدایت پر دارالاقامۃ (Boarding House) کے طلبہ کی نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔تحقیق وتصنیف سے شغف تھا اور اس میں نمایاں تھے۔اسی تحقیق وتصنیف کی وجہ سے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی لائبریری سے استفادہ کے لئے تقریباڈیڑھ سال اکیڈمی میں قیام کیا۔

سال ۱۹۵۵ء کے آخری چند ماہ الہ آباد میں رہے۔اس کے بعد مظہر العلوم بنارس میں تقریباً پندرہ سال ۱۴؍جنوری ۱۹۵۶ءتا ۱۹۷۰ء وابستہ رہے جہاں استاذ، نگراں، صدر مدرس کے مختلف مناصب پر فائز رہے۔

بنارس کے دوران قیام آپ کی تحریکی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ جماعت اسلامی ہند کے سارے پروگراموں میں شریک رہتے۔ذمہ داران جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی صاحبؒ امیر جماعت، مولانا ملک حبیب اللہ قاسمی صاحب، امیـــر حلقہ مشرقی یوپی اور بالخصوص مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب ناظم علاقہ گورکھپور، بنارس اور مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب مرحوم معاون ناظم علاقہ تمام لوگ بنارس آتے جاتے رہے۔اسی زمانے میں بنارس، غازی پور، چندولی اور اعظم گڑھ وغیرہ میں جماعت کا تعارف ہوا۔فہرست ارکان جماعت اسلامی ہند ۱۹۶۰ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب بنارس کی مقامی جماعت سے بحیثیت رکن وابستہ تھے۔

بنارس کے قیام کے دوران مفتی ابراہیم صاحب سابق مفتی بنارس کے کہنے پر گیان واپی مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دیا۔بنارس سے آپ جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔چند ماہ بحیثیت استاذ قیام کیا کہ ۱۹۷۰ء ہی میں مدرستہ الاصلاح کے ناظم اور دیگر اراکین مدرسہ کے اصرار پر وہ مدرستہ الاصلاح گئے جہاں انہیں صدر مدرس کا منصب تفویض کیا گیا۔

مولانا جب مدرسہ تشریف لائے اپنے ساتھ چند طلبہ کو بھی لائے جس کی تفصیل ان کے خاص شاگرد مولانا نعیم الدین اصلاحی شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح بلریا گنج کو بخوبی معلوم ہوگی اور وہ ان کے متعلق بہترین معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔مولانا مدرستہ الاصلاح میں تین، چار سال رہے پھر ایمرجنسی سے قبل مولانا جلیل احسن اصلاحی ندوی علیہ الرحمۃ کی درخواست پر جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر آندھرا پردیش تشریف لے گئے۔کچھ دنوں بعد یہ جامعہ

۱۹۸۱ء میں پہاڑی شریف حیدرآباد منتقل ہو گیا تو مولانا بھی حیدرآباد آ گئے اور ۱۹۸۹ء تک پوری یکسوئی سے وابستہ رہے۔ یہ ادارہ جماعت اسلامی ہند حلقہ آندھرا پردیش کی زیر نگرانی قائم تھا مولانا کی خواہش اور تحریک پر جون ۱۹۸۸ء میں جامعۃ البنات سعید آباد کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے بانی وناظم مولانا قرار پائے۔

اس دوران وہ جامعہ دارالہدیٰ سے بھی وابستہ رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جامعۃ البنات کی تعمیر وترقی اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے مولانا، ان کی اہلیہ محترمہ اور گھر کے تمام افراد نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ دور دراز سے جماعت کے تمام وابستگان کی بیٹیاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعۃ البنات آتیں، مولانا اور ان کی اہلیہ تمام طالبات کے ساتھ اس طرح شفقت ومحبت اور تعلیم وتربیت کا سلوک کرتے جیسے وہ ان کی اپنی حقیقی بیٹیاں ہوں۔ لڑکیاں مولانا کے گھر میں اس طرح آزادی سے آتیں جاتیں اور کھاتی پیتیں گویا سب اپنے گھر میں رہ رہی ہوں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد بھی یہ طالبات مولانا اور ان کے گھر کو یاد کرتی ہیں۔ مولانا بھی سب کو یاد کرتے تھے۔ میری اہلیہ ام سلمیٰ اعظمی نے جامعۃ البنات میں ۱۹۹۱ء میں داخلہ لیا تھا۔ تب سے ۱۹۹۸ء تک پورے آٹھ سال وہاں رہیں اور اس طویل عرصہ میں مولانا کے گھر ان کی اپنی حقیقی بیٹیوں کی طرح رہیں۔ شادی کے بعد بھی اسی طرح کا برتاؤ اور حسن سلوک کرتے رہے جیسے اپنی بیٹیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی اور غیر معمولی صفت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا سہرا مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ (بڑی امی) کو جاتا ہے جو پورے خاندان اور تمام طالبات کی سرپرست ہیں۔

تحقیق وتصنیف

تعلیم وتدریس وتربیت اور انتظام واہتمام کی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مولانا مرحوم کو تحقیق وتصنیف اور نئے نئے موضوعات پر تحریر وتقریر کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تحریروں میں اختراعی فکر ملتی ہے۔ (ان کی متعدد کتابوں (Original Thoughts) میں ان کی لیاقت، تحریری صلاحیت، فکر ونظر کی گہرائی اور مجتہدانہ بصیرت کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مولانا جہاں براہ راست قرآن مجید، احادیث اور عربی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے، وہیں فقہ واصولِ فقہ، اسرار شریعت، علم کلام، منطق وفلسفہ پر بھی بھرپور گرفت تھی۔ تقریباً ستر سال تک تدریس سے وابستہ رہے۔ ان سب کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی تعلق برقرار رہا۔ ان کی اولین تصنیف ''دارالاسلام اور دارالحرب'' ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آئی تھی اور وہی کتاب مولانا کے تعارف کا ذریعہ بنی تھی۔

اصحاب علم واہل نظر کے لئے غور وفکر کی دعوت دینے والی کتاب جو عرصہ تک موضوع بحث رہی۔ مولانا کی تمام نگارشات مستند اور محکم دلائل پر مبنی ہیں۔ ان کی پوری زندگی عزیمت کی واضح مثال ہے اور ان کی کتابوں میں ان کا یہ موقف بخوبی نمایاں ہے۔

ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

①— دارالاسلام اور دارالحرب
②— نظام خلافت وامارت کی شرعی حیثیت
③— ملت کے دفاع کا مسئلہ
④— بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں
⑤— جاہلیت کے خلاف جنگ
⑥— صحیح اسلامی فکر کیا ہے؟
⑦— سیکولر جمہوری نظام۔ الیکشن۔ تحریک اسلامی
⑧— ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو۔
⑨— مجسموں کا مسئلہ۔ ایک سیر حاصل بحث
⑩— مساجد اللہ
⑪— طاقت کا استعمال۔ قرآن کی روشنی میں
⑫— لا اکراہ فی الدین
⑬— زکوٰۃ کی اہمیت
⑭— راہِ سعادت (طریق الهجرتين و باب السعادتين للعلامة ابن قيم الجوزی)
⑮— وسائل تربیت عربی سے ترجمہ

اوصاف وکمالات

مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم فطری جوش اور عزم محکم کی صفت سے متصف تھے۔ اسلام کی سربلندی اور

احیاء واقامت دین کے لئے ان کی بے مثال قربانیاں تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں ثبت ہیں۔ وہ باطل افکار ونظریات کے خلاف شمشیر براں تھے۔ ملت کی فکری ونظریاتی زبوں حالی پر تڑپ کر رہ جاتے۔ حکمت و مصلحت کے نام پر رہنمایان قوم کی کمزوری پر ماتم کناں رہتے۔ قرآن وسنت کی فکر کے علم بردار اور اس کی عملی تصویر تھے۔ انہوں نے اسلام کے نقیبوں کی ایک ٹیم تیار کی۔ نہایت غیور اور خود دار تھے۔ دین اسلام سے وابستہ افراد سے حد درجہ محبت کرنے والے اور باطل کے علم برداروں کے لئے سخت رویہ اختیار کرنے والے تھے۔ جفاکشی کے عادی، کام کے دھنی اور جہد مسلسل کے پیکر تھے۔ ان کا فیصلہ چٹان کی طرح ہوتا جس کام کو ٹھان لیتے اس کو کسی نہ کسی طرح پورا کرنے میں لگے رہتے اور پھر اپنے موقف سے نہ ہٹتے۔

آپؒ نے خواتین کی دو نسلوں کو علم اور صاف شفاف عقائد سے روشناس اور آراستہ کیا۔ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ نہایت مشکل ترین حالات سے گزرے مگر کبھی سر نہیں جھکایا۔ ہمیشہ سر بلند رہے۔ تاحیات عزیمت کی راہ پر چلے اور اسی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ وہ رخصت کی راہ اختیار کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا ساتھ دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ خوش اخلاق تھے۔ مگر ناپسندیدہ افراد، غیر شرعی عمل اور ناپسندیدہ کاموں کے سلسلے میں ناراضگی کا اظہار کرتے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے مگر دین کے خلاف باتوں کو گوارا نہیں کرتے۔ بھری بزم میں حق کی خاطر پکار اٹھتے اور حق کا اعلان کرتے۔ ان کے بے شمار چاہنے والے ہیں اور چند افراد ایسے بھی رہے جنہوں نے ان سے فیض حاصل کیا مگر بعد میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر یا مصلحت کے نام پر مخالف ہوگئے۔ پوری داستان ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ کبھی کبھی کچھ باتوں کا اظہار کر دیتے، ورنہ صبر وتحمل سے کام لیتے اور غم برداشت کرتے رہتے۔ ان کے عزائم بلند تھے کاموں کا پورا منصوبہ تھا جس کے لئے فکر مند تھے۔ بدقسمتی سے کچھ اس طرح کی صورت حال پیدا ہوئی کہ جامعۃ البنات سے انہیں علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ پھر انہوں نے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو علی حالہ باقی رکھا۔

مولانا خورشید انور ندوی صاحب ان کے پڑوسی اور محرم راز تھے۔ ان کی تحریر کے اقتباس سے مولانا مرحوم کی زندگی کی تصویر سامنے ابھر کر آتی ہے:

> ''اپنی زندگی میں بڑے لوگ دیکھے لیکن عزیمت، استقلال، تقشّف، بے نفسی، دنیا سے عری غیری، بس دو بے نفسوں میں ہی دیکھ سکا۔ ایک مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم اور دوسرے میرے استاذ مولانا شہباز اصلاحی مرحوم (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) دونوں کا پہناوا یکساں، مزاج ایک اور دنیائے دوں کی

غلامی سے دوری ایک جیسی۔ غربت کی معراج میں کئی بے سہاروں کا سہارا۔ بلال حبشیؓ کے والیؓ امت کے والی تھے۔ ان کی اتباع میں مولانا کئی بلالوں کے والی تھے، کسی کی سر پرستی کے بغیر وہ اپنی رائے پر عزیمت رکھتے تھے۔ مولانا آج سے چالیس سال پہلے ہندوستان میں ''فقہ مزاحمت'' کے بانی تھے اور ساری عمر بے خوف اس کے مبلغ رہے۔ اس کی پاداش میں اپنا بیٹا کھویا لیکن وضع دار کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی۔ وہ براہِ راست پولیس کی سفاک گولی کا نشانہ بنا۔ پورا گھر گرفتاری اور مقدمات کا سامنا کرتا رہا لیکن مولانا مرحوم پر ان سب کا کوئی اثر کبھی نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ مؤمنانہ وقار اور گہرے سکوت کی تصویر بنے رہے۔

مولانا چلے گئے۔ اب ان جیسا کوئی نہیں آئے گا، آیا بھی تو میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ اللہ دکھ کی اس گھڑی میں اس گھر کا والی ہو۔ اے نفس مطمئنہ اِرْجِعِیۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً''

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سَو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا — علّامہ اقبالؔ

مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم سے میرا تعلق

ابرار احمد اصلاحی مکی، دہلی
سابق مترجم وایڈمنسٹریٹر رابطہ عالم اسلامی، مکۃ المکرمہ

مدرستہ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، اتر پردیش، قرآن مجید کی امتیازی تعلیم کے لئے پورے ملک میں جانا جاتا ہے۔ سنہ 1970ء میں جب میں اس مدرسے کے شعبہ عربی کا طالب علم تھا، مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب بحیثیت صدر مدرس تشریف لائے۔ اس سے قبل وہ بنارس کے مظہر العلوم نامی دینی مدرسے میں تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا کے بارے میں ہم طلبہ کا پہلا تاثر ان کی کم گوئی، سادگی پسندی اور پرہیزگاری تھی۔ فرض منصبی کی ادائیگی میں مولانا کا رویہ سخت گیری کے بجائے تفہیم اور ترغیب کا ہوتا تھا البتہ غیر معمولی حالات میں سختی کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔

۱۹۷۴ء میں مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد میں نے یوپی عربی و فارسی بورڈ سے عالم کا امتحان دیا اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں بی اے کی تعلیم کے لئے داخلہ لے لیا کیونکہ اس وقت تک مدرستہ الاصلاح کی سند فضیلت کو ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لئے منظوری حاصل نہیں تھی جیسا کہ اب ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی سے بی اے اور دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کی سندیں حاصل کیں اور تلاش معاش میں شملہ، لیبیا کے شہر البیضاء، بن غازی اور طرابلس ہوتے ہوئے سعودی عرب کے دارالحکومت الریاض میں رابطہ عالم اسلامی کے آفس میں مترجم وایڈمنسٹریٹر کے طور پر ملازمت ملی۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اس وقت تک حیدرآباد شہر منتقل ہو چکے تھے اور وہاں انہوں نے مسلم بچیوں کی دینی تعلیم کا ادارہ جامعۃ البنات قائم کر لیا تھا۔ اپنے ادارے کے تعارف کے لئے انہوں نے ریاض شہر کا دورہ

کیا۔ سعودی عرب کے مختلف علاقوں اور شہروں میں حیدرآباد کے لوگ بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ ان میں سے متعدد حضرات مولانا کی علمی وفکری خدمات اور خاص طور پر بچیوں کے دینی تعلیمی ادارے سے واقف تھے۔ مولانا نے ریاض شہر کا دورہ ایک سے زائد بار کیا۔ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد شہر میں مسلم بچیوں کی دینی تعلیم کا ایک معروف ادارہ ہے۔

چونکہ دوران طالب علمی میں میرا شمار مدرستہ الاصلاح کے ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا، لہٰذا مولانا اسی وقت سے میرا خیال رکھتے تھے، اور عام طور پر اساتذہ ایسے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے مختلف علمی وفکری امور پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔

ریاض شہر کے دوروں میں بھی مولانا سے ملت اسلامیہ ہند اور عالمی سطح پر امت مسلمہ کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا۔ متعدد امور پر ہماری رائیں الگ الگ ہوتیں تو مولانا اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مختلف دلائل اور شواہد پیش کرتے۔

ریاض شہر میں ۱۵ سال کے قیام کے بعد میرا تبادلہ مکہ مکرمہ کے شہر میں ہوا تو وہاں بھی مولانا کا دورہ ہوا اور رابطہ عالم اسلامی کے ذمے داروں سے اپنے ادارے کا تعارف کرانے کا موقع ملا۔

مولانا اپنے افکار وخیالات کے بڑے مبلغ تھے اور بہت شدومد سے ان کی ترجمانی کرتے۔ مسلم نوجوانوں کا ایک طبقہ جو اپنی سوچ میں جہاد کو بہت اہمیت دیتا اور ملت اسلامیہ کے مقدسات کے تحفظ اور دفاع کا قائل تھا، مولانا سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔

دین اسلام میں دعوت اور جہاد کی اہمیت اور ضرورت مسلمہ ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کے مخصوص حالات اور تقاضے ہیں۔ میرا میلان ہمیشہ دعوت کے کام کو بڑھانے اور پھیلانے کی طرف ہوتا کیونکہ یہ وہ کام ہے جو اس ملک میں مسلمانانِ ہند کی جانب سے بہت ہی کم انجام دیا گیا اور اسی کی وجہ سے آج مسلمانان ہند مختلف چیلنجز سے دوچار ہیں۔

مولانا سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں نے بحیثیت صدر انجمن طلبہ قدیم مدرستہ الاصلاح حیدرآباد شہر کا دورہ کیا اور اس دورے کا مقصد ملک کی مختلف ریاستوں میں موجود طلبہ قدیم کو باہم مربوط کرنا اور وہاں انجمن کی شاخوں کو قائم کرنا تھا۔ حیدرآباد شہر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی وجہ سے مدرستہ الاصلاح کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک ایسی تعداد موجود تھی جس کے سبب یہاں انجمن کی شاخ قائم کی جاسکتی تھی چنانچہ ان طلبہ کی ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں اکثر طلبہ قدیم نے شرکت کی۔ مولانا نے اپنی علالت

اور کمزوری کے باوجود اپنی ہمت کا مظاہرہ کیا اور اس میٹنگ میں شرکت کی جو میرے لئے بہت حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی۔ میٹنگ میں نوجوان طلبہ قدیم میں سے کوئی وہاں کی شاخ کے صدر کی ذمہ داری کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ ہر شخص وقت کی کمی اور مصروفیت کا عذر پیش کرتا نظر آیا، آخر کار میں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اس ذمے داری کو قبول کرلیں۔ میرے اصرار کے بعد ہی مولانا اس کے لئے آمادہ ہوئے۔

اپنی وفات سے ایک عرصہ پہلے کی بات ہے۔ مولانا کا فون آیا۔ ان کے بجائے ان کے بچوں میں سے کوئی مخاطب تھا۔ کہا کہ مولانا آپ کو بہت یاد کررہے ہیں اور بات کرنا چاہتے ہیں۔ بات شروع ہوئی تو مولانا نے ملک کے حالات اور خاص طور پر حکومت کی سختیوں کی طرف توجہ دلائی کہ حالات ناقابل برداشت ہوتے جارہے ہیں۔ مولانا کے لب ولہجہ اور بات چیت کے مضمون سے بخوبی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ حالات سے کس قدر فکرمند ہیں۔

پھر ایک دن مولانا کے انتقال کی خبر آئی اور تقویٰ وعزیمت کی راہ پر چلنے والی یہ شخصیت رخصت ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین یارب العالمین!

اعلائے کلمۃ اللہ ہی زندگی کا مشن تھا

ایک تأثراتی تحریر

محمد مرسلین اصلاحی، اعظم گڑھ

اِدھر چند برسوں سے مدرسۃ الاصلاح کی چیدہ چیدہ شخصیتیں داعی اجل کو لبیک کہہ رہی ہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی معروف اصلاحی شخصیات کے اٹھ جانے سے ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے۔ ابھی ایک غم سے نکلے ہی نہ تھے کہ دوسرا آ لگا! مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ، مولانا اشفاق احمد اصلاحیؒ، مولانا نظام الدین اصلاحیؒ کے سانحۂ ارتحال سے علمی حلقوں کی فضا سوگوار تھی کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ بھی داغ مفارقت دے گئے۔ آپ کے سانحۂ ارتحال کی خبر سوشل میڈیا کے ذریعہ موصول ہوئی۔ سن کر بڑا رنج ہوا۔ ذہن ماضی کی پہنائیوں میں ڈوب گیا۔ مولانا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ ایسی پرشکوہ اور بے داغ شخصیت کہ جس کا ہر ایک نقش نرالا تھا، یادوں کے کئی دریچے کھلے اور کھل کر بند ہو گئے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت جامع فضل وکمال اور ایمان وعمل کا مجموعہ تھی۔ جن کا قول وعمل یکساں تھا۔ وہ دین کے معاملات میں کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ غیرت دینی کا حال یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسلام کو سربلند اور غالب دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر سرگرمیاں تحریک سے وابستہ تھیں۔ یہ انہیں کا اثر تھا کہ انھوں نے نوجوانوں میں ایک ولولہ اور تحریک پیدا کی۔ اسلامی شعائر کے تحفظ کے لئے ہمہ آن سرگرم عمل رہنے کا جذبہ بیدار کیا۔

آہ! وہ مرد قلندر! جس کی ایمان افروز باتیں آج بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔ مولانا کا شمار مدرسۃ الاصلاح کے ان فرزندوں میں ہوتا تھا جن کا نام علمی وتحریکی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ مدرسۃ

الاصلاح سے آپ کو خاص قلبی لگاؤ تھا، 1970ـ1973 تک مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مولانا جس عہد میں مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھے وہ مدرسہ کا عہد زریں تھا۔ ان دنوں ماہرفن اساتذہ کی پوری ایک جماعت موجود تھی جن سے آپ نے کسبِ فیض کیا اور اپنے دامن شوق میں علم وعرفان کے گوہر نایاب سمیٹے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مرحوم حیدرآباد کے ایک علاقہ سعید آباد میں مدت سے مقیم تھے۔ غالباً یہ 2004ء کی بات ہے کہ اس وقت ہم حیدرآباد دکن میں موجود تھے۔ مولانا کا نام تو عرصۂ دراز سے سن رکھا تھا لیکن کبھی ان سے ملاقات کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایک عزیز کی وساطت سے مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا نے والہانہ استقبال کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرا آپ سے تعارف ہوا۔ مولانا کا اندازِ گفتگو، وضع داری، دینداری، حسنِ اخلاق دیکھ کر میں کافی متاثر ہوا۔ آپ کی شخصیت کا رعب دل پر بیٹھ گیا۔ مولانا دراصل انہیں بزرگوں کی روایات کا ایک عکس جمیل تھے جن کے قصے ہم سنا کرتے تھے۔ ہم آپ کے ہاں تقریباً تین روز تک مہمان رہے، مولانا نے خوب خاطر تواضع کی۔ مجھے آج بھی یاد ہے مولانا ہمارے آرام، کھانے پینے کی بابت فکر مند ہوتے اور دریافت کرتے رہتے کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ آپ کا نرم وشیریں اندازِ کلام بڑا متاثر کن تھا، علمی موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی ہوا، مولانا نہایت مدلل گفتگو کرتے اور معلومات کا دریا انڈیل دیتے۔ نہایت توسع پسند، زندہ دل اور غیور انسان تھے۔ آپ کی زندگی مجاہدانہ گزری۔

مولانا نے بچیوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ نسواں قائم کر رکھا تھا اور اس کا نظم وانتظام خود ہی سنبھالتے تھے۔ جہاں متوازن نصاب تعلیم، دینی ماحول اور اسلامی اقدار کا پورا پورا لحاظ تھا تعلیم وتربیت کا ایسا بہترین نظم قائم کر رکھا تھا کہ بچیوں میں پردے کا اہتمام، ضوابط کی پابندی، اسلامی شعائر کے لحاظ کا جذبہ پیدا ہو۔ مذہبی علوم کے ساتھ عصری علوم کی کتابیں بھی شامل نصاب تھیں۔ مولانا نے تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت پر بڑی اہم باتیں کیں۔ اس ادارے میں بچیوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، جو مولانا کی نگرانی میں زیور علم سے آراستہ ہو رہی تھی۔

ہم ابھی حیدرآباد ہی میں مقیم تھے کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے سب کو ہلا کے رکھ دیا۔ خبر ملی کہ مولانا کے جواں سال بیٹے ''مجاہد سلیم'' گجرات پولیس کی گولیوں سے شہید کر دئے گئے۔ چوں کہ ان دنوں سنٹرل گورنمنٹ نے بعض نوجوانوں کی تنظیم پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور اسی کے تحت اکثر صوبوں میں نوجوانوں کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ حالاں کہ یہ پولیس کی مبینہ دہشت گردی تھی۔ مجاہد سلیم کی شہادت کی خبر پورے

حیدرآباد میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مولانا اس وقت بیرونِ ملک سفر پر تھے۔ اطلاع ملتے ہی اپنا سفر منسوخ کر دیا۔ اس جانکاہ حادثے نے تو جیسے تن بدن میں ایک سنسنی پھیلا دی۔ مولانا کے دولت کدے پر عزیز مندوں کی بھیڑ امڈ پڑی۔ ہمیں اپنے شیڈول کے مطابق منگلور نکلنا تھا اور منگلور سے بنگلور، ملپے، اڑپی اور ہاسن۔ اس حادثہ کے بعد ٹکٹیں منسوخ کر دینی پڑیں اور تقریباً ایک ہفتہ حیدرآباد میں ہی ٹھہر گئے۔ مولانا کے جواں مرگ بیٹے کی شہادت سے ایسا شدید غم پہنچا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے کڑے وقت میں بھی ہم نے دیکھا کہ مولانا عزیمت واستقامت کا پہاڑ ثابت ہوئے۔

مولانا مومنانہ اور مجاہدانہ صفات کے حامل تھے، آپ کی معیت ایمان افروز ہوتی۔ آپ کی بےلوث شخصیت اور اعلیٰ اخلاق نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ مولانا بڑے جری، بے خوف، نڈر اور خوددار تھے آپ کا ہر عمل اسوۂ رسولؐ کی تصویر تھا۔ مولانا عالم، زاہد، حق گو، مجاہد اور زندہ دل انسان تھے۔ قرآن مجید کا گہرا علم رکھتے تھے۔ آپ کا شمار دبستان فراہی اور مدرسۃ الاصلاح کے ہونہار فرزندوں میں ہوتا ہے۔ ملک وملت کے مختلف ابھرتے موضوعات پر آپ کی کئی اہم مطبوعات بھی موجود ہیں، مسئلۂ جہاد پر آپ نہایت واضح موقف رکھتے تھے۔ آپ نے ان موضوعات پر کئی رسالے تحریر کئے مثلاً: ملت کے دفاع کا مسئلہ، بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، سیکولر جمہوری نظام، الیکشن۔ تحریک اسلامی، مجسموں کا مسئلہ، اسلامی فکر کیا ہے؟ اور جاہلیت کے خلاف جنگ وغیرہ۔ یہ ایسے حساس موضوعات ہیں جن پر ان کتابوں میں مولانا نے بڑی حکیمانہ اور غیر مصلحت پسندانہ گفتگو کی ہے۔ غالباً یہی کتابیں جماعت اسلامی سے آپ کے اخراج کا سبب بنیں۔

مولانا نے اپنی گفتگو میں مدرسۃ الاصلاح کی صدارت کے کئی دلچسپ واقعات بھی بیان کئے۔ مدرسہ کے تئیں آپ کا خلوص بے انتہا تھا۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ باشعار، خوش گفتار، اعلیٰ کردار، ذہین وفطین، متین، پرعزم اور عزم بالجزم! مولانا حوصلوں کی چٹان اور حق کا نشان تھے، آپ کی زندگی بڑی سادہ اور مجاہدانہ گزری، تنہا ہوتے تو کسی یونانی فیلسوف کے مانند سوچوں میں غلطاں رہتے، محفلوں میں ہوتے تو علم وحکمت کے موتی بکھیرتے۔ بڑے متحرک اور فعال تھے۔ آپ کی شخصیت کا خاص پہلو یہ بھی تھا کہ جس بات کو حق سمجھتے اسے پورے استقلال واستدلال کے ساتھ پیش فرماتے۔ دین کے معاملے میں کسی طرح کی مصلحت پسندی کے قائل نہ تھے۔ صداقت وایثار کا پیکر تھے۔ قلندرانہ شان وشوکت کے آدمی تھے، زبان پر حق کا کلمہ رواں ہوتا، باتیں ایسی ایمان افروز ہوتیں کہ جوش عمل کا ولولہ بیدار ہو جاتا۔ باطل نظریات وافکار کے لئے شمشیر براں تھے۔

پوری زندگی غلبۂ حق اور اسلام کے احیا کے لئے کوشاں رہے۔ کیا خبر تھی کہ اس مردِ قلندر پر نا گہاں فرشتہ اجل بجلی بن کر کوندا اٹھے گا۔

آہ! مولانا کی وفات ایک حادثہ ہی نہیں بلکہ علمی وتحریکی حلقوں کے لئے ایک بڑا خسارہ بھی ہے۔ کیا خبر تھی کہ ایک عظیم الشان اورنگ خسروی، بوریہ نشیں یوں چلا جائے گا! ایسی شخصیتیں برسوں میں پیدا ہوتی ہیں، جن کا علم، تفقہ، مطالعہ، حمیت دینی، مسلم امہ کے تئیں فکرمندی مقصود اور اعلائے کلمۃ اللہ زندگی کا مشن ہو۔ بقول شاعرِ مشرق!

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

اللہ تعالیٰ مولانا کی خطاؤں کو درگزر فرمائے اور آخرت میں اعلیٰ درجات پر فائز کرے۔
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ!

پیکرِ صدق ووفا: مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

ڈاکٹر عرفات ظفر اصلاحی
شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سال گزشتہ ۲۰۲۲ء کے آخری چند ماہ عالم اسلام کے لیے عموماً اور ملت اسلامیہ ہند کے لیے بطور خاص بڑے المناک ثابت ہوئے۔ معروف ہندوستانی عالم اور تحریک اسلامی کے سرکردہ رہنما مولانا جلال الدین انصر عمریؒ کی رحلت کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ عالم اسلام کی عظیم شخصیت علامہ یوسف القرضاویؒ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس مختصر عرصہ میں وابستگان مدرسۃ الاصلاح کو بھی کئی نامور اصلاحی علماء اور قدآور شخصیات کی وفات کے غم سے دوچار ہونا پڑا۔ ان میں مولانا نظام الدین اصلاحیؒ، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اور استاذی مولانا ابوالفیض اصلاحی مدنیؒ کے اسماء گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت اپنے گوناگوں اوصاف وکمالات کی وجہ سے ممتاز ہے۔ مولانا قرآن کریم کے زبردست عالم تھے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی قرآنی فکر ان کے ذہن ودماغ میں رچی بسی تھی۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں مولانا مودودیؒ کی تحریک اسلامی سے روشناس ہوئے اور پھر غلبۂ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہی ان کی زندگی کا مشن اور مقصد قرار پایا۔ آپ کی زندگی قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس، صحیح اسلامی فکر کی تشریح وتفہیم اور غلبۂ حق کے لیے کوشش اور جدوجہد میں گزری اور یہی آرزو اور تڑپ لے کر وہ ۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوئے۔

دوران طالب علمی مدرسۃ الاصلاح میں اپنے اساتذہ کرام کی زبان سے جن بزرگ اور نامور اصلاحیوں کا ذکر خیر سنا ان میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی علیہ الرحمۃ کی ذات بابرکات بھی تھی۔ سب مولانا کے علم کی گہرائی وگیرائی،

سادگی و بے نیازی، زہد وتقویٰ، فکری صلابت اوران کی رقیق القلبی کے معترف تھے۔ مدرسہ پر ان کے قیام، ان کے زمانۂ صدارت کے بعض واقعات اور مادر علمی سے ان کے مخلصانہ ربط وتعلق کا ذکر ہوتا۔ مدرسہ سے ان کی علیحدگی کو مدرسہ کے حق میں نا قابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا جاتا۔ چونکہ مولانا ایک نظریہ ساز عالم تھے اس لیے بعض مذہبی امور میں ان کے انقلابی افکار وخیالات کی گونج بھی سنائی دیتی۔

لیکن حقیقی معنوں میں مجھے مولانا کی قدر ومنزلت اوران کے تفقہ فی الدین کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں بغرض تعلیم جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی پہنچا اور مجھے اپنے عالی مرتبت استاذ پروفیسر محمد اسلم اصلاحی حفظہ اللہ کی صحبت میسر آئی۔ پروفیسر اصلاحی اپنے جن اساتذہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سرفہرست ہیں۔ وہ جب مادر علمی کا ذکر چھیڑتے تو مولانا کی شرافت ومروت، سادگی وجفاکشی، اشاعت اسلام کے لیے ان کی سرگرمی کے ساتھ مولانا کے تقویٰ، علم، انداز تدریس اور طریقۂ تربیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے اوراس بات کا اعتراف کرتے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں مولانا کے افکار وخیالات اوران کے اخلاق وکردار کا گہرا اثر ہے۔

استاذ گرامی مولانا اصلاحیؒ کی اس رائے کو زیادہ قرین قیاس تصور کرتے ہیں کہ ہندوستان ''دارالحرب'' ہے کیونکہ اولاً تو ''دار الامن'' کی اصطلاح موجودہ دور کی پیداوار ہے، دوسرے موجودہ ہندوستان میں تمام دستوری تحفظات کے باوجود مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں ہے اوراس کا سب سے بڑا ثبوت یہاں پر آئے دن ہونے والے مسلم کش فسادات ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر اصلاحی مولانا کے صبر وتحمل، معاملہ فہمی اور سبھی کے لیے ان کی فکرمندی کا بھی ذکر کرتے اوراس بات کا اعتراف کرتے کہ مولانا کے اصولوں پر عمل کرکے انھیں اپنی زندگی کے بہت سے مسائل کو خوبصورتی سے سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ استاذ محترم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مدرسۃ الاصلاح سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا کریم نگر اور پھر حیدرآباد چلے گئے جہاں وہ جماعت اسلامی کے زیر انتظام لڑکوں کے ایک ادارہ سے بحیثیت استاذ وابستہ ہوئے۔ بعد ازاں انھوں نے ''جامعۃ البنات الاصلاحیۃ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے وہ بانی بھی تھے اور ناظم بھی، مدرس بھی تھے اور سرپرست بھی۔ اس میں دور دراز سے لڑکیاں آتیں اور تعلیم حاصل کرتیں۔ مولانا ان کے لیے صرف استاذ ومربی نہ تھے بلکہ وہ اوران کی اہلیہ محترمہ ان بچیوں کے لیے والدین کا درجہ رکھتے تھے۔ استاذ محترم کے بقول مولانا مدارس کے طلبہ کے عصری جامعات میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنے کے مخالف نہیں تھے بشرطیکہ وہ مدارس کی تعلیم کے حقیقی نصب العین یعنی احقاق حق اور ابطال باطل کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اپنے قول و

عمل سے دین حنیف کی شہادت دیں۔ اسی لیے مولانا نے بچیوں کے اپنے مدرسہ میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کی تدریس کا بھی اہتمام کیا تھا۔ سال ۲۰۱۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران مجھے عثمانیہ یونیورسٹی سے جانچنے کے لیے عربی زبان میں پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ موصول ہوا جس کا عنوان تھا: ''الاسواق فی الجاهلية ودورها في تطوير الادب العربي''۔ اس کا مقدمہ پڑھنے کے بعد میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کی مقالہ نگار استاذ الاساتذہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی دختر نیک اختر ڈاکٹر مثل الربی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید ترقی دے اور ان سے اپنے دین کا کام لے۔ وہ مولانا کے چھوڑے ہوئے کاموں میں ان کی مدد ومعاون ثابت ہوں۔ اس سے نہ صرف تعلیم نسواں کے باب میں مولانا کے نظریہ کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ مولانا کی دوراندیشی اور کشادہ ذہنی پر بھی دلیل ہے۔

۱۹۷۰ء میں مدرسۃ الاصلاح میں اساتذہ کی باہمی چپقلش کے باعث ایک ہنگامہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی اور بعض سینئر اساتذہ کو وہاں سے رخصت کردیا گیا تو ناظم مدرسہ اور دیگر اراکین کی درخواست بلکہ اصرار پر آپ مدرسۃ الاصلاح آ گئے جہاں انھیں صدر مدرس کا عہدہ تفویض ہوا۔

مولانا نے نہ صرف وہاں کے انتظام وانصرام کو چست ودرست کیا بلکہ وہاں پر تعلیمی ماحول کو بحال کیا اور اساتذہ وطلبہ کے اندر سے گروہ بندی اور چپقلش جیسی سماجی برائیوں کے خاتمہ میں بھی اہم رول ادا کیا۔ تعلیم کے اوقات میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے اور یہاں سے فارغ ہوکر اطراف بالخصوص قصبہ سرائے میر میں درس قرآن دیتے اور غیر مسلموں میں دعوتی لٹریچر تقسیم کرتے۔ دیگر مضامین کی تدریس کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں مولانا کو شاہ صاحبؒ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تدریس بھی سپرد ہوئی۔ مولانا کے درس میں حاضر مدرسہ کے ایک قدیم طالب علم مولانا کے انداز تدریس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مجھے استاذ محترم (مولانا عبدالعلیم اصلاحی) سے علمی استفادہ کا موقع ملا۔ جن کتابوں نے اس زمانے میں مجھے ذہنی اور فکری طور پر بہت زیادہ متاثر کیا ان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' کو اولین مقام حاصل ہے۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کی تدریس کی ذمہ داری استاذ محترم کو سونپی گئی۔ اب یہ اس کتاب کے مشمولات کی جذب ومعنویت تھی یا استاذ محترم کے طریقۂ تدریس کی خوبی، مجھے خود پتہ نہیں کہ میں کیوں جوں جوں اس کتاب کو پڑھتا جاتا تھا میرے ناپختہ ذہن ودماغ کے دائروں میں وسعت پیدا ہوتی جاتی تھی اور میرے اندر یہ احساس جاگزیں ہوتا جاتا تھا کہ ہمارے مذہب کا دائرۂ عمل چند رسوم وتقالید کی ادائیگی تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہماری تگ وتاز کا محور صرف عبادات ہی نہیں بلکہ وہ امور ومعاملات بھی ہیں جن سے انسانی تہذیب وتمدن کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ استاذ گرامی کے درس کی یہ بڑی

خوبی تھی کہ وہ خود کو مشکل الفاظ وتراکیب تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہم طلبہ کے دائرہ فہم میں ان افکار ونظریات کو لائیں جن کی تبلیغ وترسیل کے لیے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس فکر انگیز کتاب کو تحریر کیا تھا۔ کتاب کے منطقی طرز استدلال کی وضاحت استاذ محترم کچھ اس قدر پرکشش، پراثر اور سلیس انداز میں کرتے کہ فکر ولی اللّٰہی کے باریک سے باریک گوشے کھل کر ہم طلبہ کے سامنے آجاتے اور ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوجاتی کہ تجلیات حق کے ادراک کے لیے نیز اسرار احکام شریعت کی حقیقی تفہیم کے لیے تزکیۂ نفس اولین شرط ہے۔ کیونکہ شریعت میں مذکور بعض امور غیبیہ کی گرہ کشائی ہمارے لیے اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم اپنی قوت بہیمیہ کو کچل کر ملکوتی صفات سے متصف نہ ہوجائیں[1]۔''

بہر حال بہت جلد مولانا وہاں کے ماحول سے کبیدہ خاطر ہوگئے اور اساتذہ کی اندرونی سیاست سے بددل ہوکر انھوں نے مدرسہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور بالآخر ۱۹۷۴ء میں مدرسہ سے رخصت ہوگئے اس طرح مدرسہ ایک لائق فائق استاذ سے محروم ہوگیا۔

ایمرجنسی سے کچھ قبل مولانا جلیل احسن ندوی کی درخواست پر آپ جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر آندھرا پردیش منتقل ہوگئے۔ یہ ادارہ جماعت اسلامی کے زیر نگرانی چل رہا تھا۔ مولانا نے ۱۹۸۸ء تک پورے انہماک اور لگن سے اس ادارہ کی خدمت کی۔ ۱۹۸۸ء میں مولانا نے جامعۃ البنات سعید آباد کا سنگ بنیاد رکھا۔ ابتداء میں وہ دونوں اداروں سے وابستہ رہے، بعد میں انھوں نے اپنی ساری توجہ جامعۃ البنات سعید آباد پر مرکوز کی۔ مولانا کے علاوہ ان کے خاندان کے دیگر افراد نے بھی اپنی ساری توانائی مدرسہ پر صرف کی۔ ۲۰۱۲ء میں مولانا نے اس مدرسہ کے نام میں ''الاصلاحیۃ'' کا اضافہ کرکے اسے ملک پیٹ منتقل کردیا۔ آج وہ ''اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ'' کا روح پرور منظر پیش کررہا ہے۔ دور دراز سے قوم کی بیٹیاں یہاں آتی ہیں اور دینی تعلیم سے اپنے آپ کو آراستہ کرتی ہیں۔ مولانا کی اہلیہ کے علاوہ ان کی دونوں بیٹیاں ظل ہما اور مثل الربی مولانا کی اس وراثت کو امانت سمجھ کر اس کی خدمت میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔ اللہ سبحانہ انھیں عزم وحوصلہ دے۔

مولانا نے اپنی زندگی کے چالیس پچاس سال دختران ملّت کی تعلیم وتربیت پر صرف کیئے۔ قول رسول ﷺ ہے ''بعثت معلما'' نیز ''بعثت لاتمم مکارم الاخلاق''، مولانا معلم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مربی بھی تھے۔ متعدد ایسی طالبات کو آپ نے اپنے ہاسٹل میں جگہ دی جن کے لیے کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ اس طرح کتنی ہی لڑکیوں کو قادیانیت اور گمرہی کے دلدل سے نکالا اور نہ صرف ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا بلکہ ان کی پوری کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود ان سب کی خبر گیری کرتے اور ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود فون پر ہر ایک کو اس کا نام لے کر پکارتے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی

وفات پر ان کی بعض طالبات نے جس طرح اپنے تاثرات کو بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے شاگردوں کی ان سے ایسی قلبی وجذباتی وابستگی فی زمانہ عدیم المثال ہے۔ آپ کی تربیت یافتہ بچیاں آج ملک کے مختلف حصوں میں دین کی خدمت انجام دے رہی ہیں جوان شاء اللہ روز قیامت مولانا کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گی۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت سادگی، قناعت، درویشی، اللہ پر توکل ویقین، حرارت ایمانی، اخلاص وصداقت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے بے چینی وقربانی سے عبارت تھی۔ مولانا مودودیؒ کی فکر سے ابتداء عمر ہی میں آشنا ہوئے پھر اسے اپنا سرمایۂ حیات بنالیا اور ایک طویل عرصہ تک جماعت سے وابستہ رہے۔ مولانا مودودیؒ سے ان کا رشتہ جذباتی نوعیت کا تھا۔ ایک مدرسے کا نام بھی آپ نے جامعۃ الشیخ المودودیؒ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں فکر مودودیؒ سے انحراف پر سراپا احتجاج بن جاتے۔ مصلحت پسندی مولانا کے یہاں بالکل بھی نہیں تھی۔ اسی لیے بعض ملی مسائل پر مولانا کا موقف نہایت سخت ہوتا بلکہ ہماری دینی جماعتوں کے موقف کے بالکل برعکس ہوتا۔ شاید اسی پس منظر میں جماعت نے مولانا کی رکنیت بغیر کسی پیشگی اطلاع کے رد کردی۔ جس کا مولانا کو سخت ملال تھا۔ مولانا نے جماعت پر ہمیشہ شدید تنقید کی، حتیٰ کہ ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کو گمرہی قرار دیا۔ مولانا کی پوری زندگی تفہیم دین اور تحریک اسلامی کی آبیاری کے لیے وقف تھی۔

لیکن جس چیز کو مولانا کی زندگی کا مابہ الامتیاز یا ان کی حیات مستعار کا سب سے درخشاں پہلو قرار دیا جاسکتا ہے وہ ملت کے لیے ان کی تڑپ اور غلبۂ دین کے لیے ان کا اضطراب ہے۔

مولانا مسلمانوں کی مجبوری، کسمپرسی اور بربادی پر خون کے آنسو روتے، اللہ کے سامنے روتے گڑگڑاتے اور توبہ وانابت کرتے۔ آپ کے مدرسہ کی بچیوں نے شہادت دی ہے کہ گجرات فسادات کے دوران مولانا تین چار بار اثنائے درس زار وقطار رو پڑے۔ مولانا کو جس چیز نے سب سے زیادہ کرب والم سے دوچار کیا وہ ہمارے قومی وملی رہنماؤں کی تن آسانی اور مصلحت پسندی ہے۔ اقبال کی طرح مولانا نے بھی اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ:

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

غلبۂ اسلام کی بات تو سب کرتے ہیں لیکن جب اس کے لیے قربانی دینے یا باطل کے سامنے سینہ سپر ہونے کی بات آتی ہے تو بڑے بڑے سورما راہِ فرار اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ لیکن مولانا کی اس راہ میں قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے جواں سال بیٹے کو بھی اس راہ میں قربان کردیا۔ مرحوم مجاہد سلیم حیدرآباد میں پولیس کی گولی لگنے سے شہید ہوگئے تھے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ بیٹے کی موت کی خبر سن کر

مولانا صبر واستقامت کا پہاڑ بن گئے اور فرمایا کہ ''بھلا شہادت سے بہتر کوئی موت ہوسکتی ہے۔ اللہ کی راہ میں مزید بیٹوں کو قربان کرنے کا موقع ملا تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

مولانا خورشید انور ندوی مولانا اصلاحیؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اپنی زندگی میں بڑے لوگ دیکھے، لیکن عزیمت، استقلال، تقشّف، بے نفسی، دنیا سے ''غوی غیوی'' دو بے نفسوں میں ہی دیکھ سکا، ایک مولانا اصلاحی مرحوم اور دوسرے میرے استاذ مولانا شہباز اصلاحی مرحوم۔ دونوں کا پہناوا یکساں، مزاج ایک اور دنیائے دوں کی غلامی سے دوری ایک جیسی۔۔۔ مولانا آج سے چالیس سال پہلے ہندوستان میں ''فقہ مزاحمت'' کے بانی تھے اور ساری عمر بے خوف اس کے مبلغ رہے۔ اس کی پاداش میں اپنا بیٹا کھویا لیکن وضعدار کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ مومنانہ وقار اور گہرے سکوت کی تصویر بنے رہے۔[۲۱]''

ملت کی زبوں حالی کے علاوہ جس چیز نے انھیں تڑپایا اور بے چین رکھا وہ ان کے اپنے وطن میں شعائر اسلام کی بے حرمتی اور پامالی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت نے ان کے ذہن ودماغ کو بری طرح جھنجھوڑا اور متاثر کیا۔ مولانا کی بیشتر کتابیں ان کی اس تڑپ کی عکاس ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ان ممتاز اصلاحی فضلاء میں سے تھے جو فکر مودودیؒ کے علم بردار ہونے کے ساتھ ساتھ فکر فراہیؒ کے نقیب کی حیثیت سے جانے اور پہچانے گئے۔ قرآنیات سے انھیں گہرا شغف تھا اور آیات ربانی میں غور وتدبر ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ انھیں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عربی ادب، فقہ اسلامی اور اسرار شریعت کا گہرا ادراک تھا۔ لیکن مولانا نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو تعلیم وتدریس، افراد سازی اور انتظام وانصرام جیسے امور پر مرکوز رکھا۔ اسی لیے ان کا علم سینے سے سفینے میں بہت کم منتقل ہوسکا۔ اس کے باوجود انھوں نے جو تحریریں اور رسالے یادگار چھوڑے ہیں ان میں جدت واصالت پائی جاتی ہے۔ وہ مولانا کے گہرے علم اور مجتہدانہ بصیرت کے غماز ہیں اور اپنے قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

ان میں قرآن وحدیث سے استدلال کے ساتھ مروجہ افکار وخیالات سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی چیز مولانا کو ان کے معاصرین سے ممتاز بناتی ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کسی بھی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے چاہے وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، بلکہ وہ ان کے افکار ونظریات کا کتاب وسنت کی روشنی میں جائزہ لیتے تھے۔ مصادر شریعت کے علاوہ مولانا کی نظر حالات حاضرہ پر بھی نہایت عمیق تھی۔ اگر وہ کسی کی تحریر پر محاکمہ یا نقد کرتے تو اس کے دلائل کی کمزوری کے ساتھ ساتھ اس کے فکر کی کجی کی بھی نشاندہی کرتے۔ آپ نے مولانا وحیدالدین خاں

کی متعدد تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔اس میں ان کے فکری انحرافات اور ضعف استدلال کو اجاگر کیا ہے۔

بابری مسجد سے متعلق مولانا وحید الدین خاں کی ایک تحریر کے جواب ہی میں مولانا نے اپنی کتاب ''بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں'' سپرد قلم کی تھی۔ بابری مسجد کے تعلق سے مولانا وحیدالدین خاں مرحوم نے جو سہ نکاتی فارمولہ پیش کیا تھا اس پر مولانا نے سخت تنقید کی ہے اور اسلام میں مسجد کے مقام واہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس سلسلے میں مولانا کا موقف بالکل واضح تھا۔ان کا کہنا تھا کہ بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ہے۔مسجد اللہ کا گھر اور اس کی ملکیت ہے۔اس میں کسی مسلم یا غیر مسلم کو تصرف کا کوئی اختیار نہیں۔ بابری مسجد پوری امت کے لیے مقدس ہے، اس لیے اس کی حفاظت اور دفاع امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح مولانا وحید الدین خاں کی ایک دوسری کتاب ''فکر اسلامی'' کے مطالب کا بھی آپ نے ''فکر اسلامی کیا ہے: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے تجزیہ کیا ہے۔مولانا اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اسلام پسندوں سے بہت سی علمی، عملی، اخلاقی اور فنی کمزوریاں سرزد ہو رہی ہوں گی، جن پر نکیر کرنی چاہیے اور ان کی اصلاح کے لیے واجبی کوشش بھی ہونی چاہیے۔مگر اس کے بجائے یہ مسلمان دانشور مستشرقین یورپ اور فسطائیت اور جارحانہ فرقہ پرستی کے نمائندوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فکر اسلامی کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ یہ فکر ہے......اور گزشتہ تقریباً چار سو سال کے علماء اور مصلحین کو بے خبر اور کتاب وسنت سے نابلد قرار دیا جا رہا ہے۔ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ ظلم وبربریت کا مظاہرہ کرنے والوں پر نگاہ غلط بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اسی سلسلہ کی ایک تحریر برادر محترم مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی ''فکر اسلامی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے چند مباحث کا نوٹس لینا ضروری سمجھا گیا[۳]۔''

اس کے بعد مولانا نے دعوت حق، مسلمانوں کا قائدانہ مقام، سیاست کی اہمیت، اسلام کا اصل مقصد، اقوام متحدہ، امام اور قائد کی حیثیت، شاتم رسول، سیکولرزم، جہاد، بینک کا سود، اسلامی مشن، جنگ میں پہل اور مسلم وغیر مسلم ملک جیسے ذیلی عناوین کے تحت مولانا وحیدالدین خاں کے افکار کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کثرت سے قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے۔

ان کے علاوہ تقریباً ایک درجن رسائل وتصانیف ہیں جو مولانا کے قلم گہر بار سے معرض وجود میں آئے۔البتہ جو کتاب علمی، فکری اور تحریکی حلقوں میں مولانا کے تعارف اور ان کی شناخت کا ذریعہ بنی وہ ان کی اولین تصنیف

''دارالاسلام اور دارالحرب'' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' مولانا کے ملّی درد کی ترجمان ہے۔ مولانا کی ایک اہم کتاب ''طاقت کا استعمال قرآن کریم کی روشنی میں'' ہے۔ اس میں مولانا نے قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے استشہاد کیا ہے۔

افسوس کہ راقم الحروف مولانا کے دیدار سے محروم رہا، حالانکہ ان کی زندگی میں مجھے کئی مرتبہ حیدرآباد جانے اور جامعہ عثمانیہ کے سیمیناروں میں شرکت کا موقع ملا۔ اللہ عزوجل مولانا کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے، ان کی مغفرت فرمائے، انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرے اور ہمیں بھی ان کے جیسی دینی فکر اور ملی تڑپ سے آشنا کردے۔

حوالہ جات

① ملاحظہ ہو زیر مطالعہ کتاب میں شامل پروفیسر محمد اسلم اصلاحی کا مضمون۔
② مولانا کی وفات پر سوشیل میڈیا پر لکھے گئے مولانا خورشید انور کے مضمون سے ماخوذ۔
③ فکرِ اسلامی کیا ہے: ایک تنقیدی جائزہ، ص: ۷۔۸۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
ایثار واستقامت کا پیکر

مولانا ابوسعد اصلاحی اعظمی
ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

فرزندانِ مدرسۃ الاصلاح اور تحریک اسلامی کے کارکنان مولانا نظام الدین اصلاحیؒ کی وفات کے صدمہ سے ابھی جانبر بھی نہ ہو سکے تھے کہ حیدرآباد سے مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی رحلت کی خبر نے انھیں نڈھال کر دیا۔ یکے بعد دیگرے دو عظیم شخصیات کے رخصت ہو جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ قحط الرجال کے اس دور میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت اخلاص وللّٰہیت، ایثار و قربانی اور استقامت و جفاکشی کا ایسا نادر نمونہ تھی جس کی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔ مولانا سے راقم الحروف کی کبھی ملاقات نہیں رہی لیکن ان کا فکر، جذبہ قربانی اور ملت کے حقیقی تصور نے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ مولانا محترم نے مدرسۃ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانے میں فکر وعمل کی جو راہ متعین کی تھی تاحیات اس کے پابند رہے۔ اس کارواں میں شامل افراد کے فکر وخیال میں حالات وزمانہ کے لحاظ سے مثبت تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں، مقصد اور مشن کے حصول کے لیے نت نئے منصوبے تشکیل پاتے رہے لیکن مولانا نے قرآن وسنت کے راست مطالعہ نیز تحریک کے ابتدائی لٹریچر کے تجزیہ کی روشنی میں جو فکر متعین کیا اس سے انحراف کو انھوں نے کبھی درست نہیں سمجھا اور ہمیشہ اسی فکر وعمل کے داعی رہے اور اقامتِ دین یا حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا تصور اور خاکہ تازندگی پیش کرتے رہے۔

مولانا کا اصل وطن اعظم گڑھ کا ایک گاؤں بندی گھاٹ تھا۔ مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد تدریس اور تحریک اسلامی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مختلف شہروں میں قیام کیا اور آخر میں حیدرآباد مستقل سکونت اختیار

کرلی۔ یہاں انھوں نے بنات کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو ماشاء اللہ بہت خوبصورتی سے اپنے فرائض ادا کررہا ہے۔

بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ مدرستہ الاصلاح میں تدریس کے ابتدائی سالوں میں مولانا جس طرح خاموش اور درس ومطالعہ میں منہمک رہتے تھے وہ ان کی بعد کی زندگی کے بالکل برعکس رویہ تھا۔ اس وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا عزم وحوصلہ کی اتنی راسخ چٹان ہیں اور اپنے فکر ونظریہ پر اس قدر مضبوطی سے جمنے والے ہیں۔ لیکن بعد کے حالات نے مولانا کا جو کردار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور ثبات واستقامت کی جو داستان انھوں نے رقم کی اس نے ان کی شخصیت کے ان مخفی پہلوؤں کو اجاگر کردیا۔ اور انھیں نوجوانوں کے لیے رول ماڈل بنادیا۔

ملی اور قومی مسائل پر مولانا کی رائے بیباک ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی بھی معاملہ میں مداہنت کے قائل نہیں تھے۔ بابری مسجد کی بازیابی کے سلسلے میں انھوں نے جو موقف اختیار کیا اس سے نوجوانوں میں انھیں خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ بابری مسجد کی شہادت نے ان کو بے چین کردیا اور اس کی بازیابی کی فکر اور اس کے لیے کوشش اور تگ ودواُن کے خطابات کا خاص موضوع ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے ''بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں'' کے عنوان سے ایک رسالہ بھی قلم بند کیا تھا۔ بابری مسجد تنازع میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کو بھی انھوں نے عدل وانصاف کا خون قرار دیا اور ببانگِ دہل اس عزم کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کو جب بھی موقع ملے گا وہ مسجد کی تعمیر ضرور کریں گے۔

اسی طرح سیکولر جماعتوں نے سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا مولانا کو اس کا بھی شدید قلق تھا۔ جب جماعت اسلامی کے بینر تلے ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کے نام سے ایک سیاسی جماعت کا قیام عمل میں آیا تو مولانا کی طرف سے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ ہوا۔ ووٹ کی شرعی حیثیت، ہندوستان کی اصل حیثیت کی تعیین کے باب میں ان کا موقف بالکل الگ تھا اور وہ پوری مضبوطی کے ساتھ اس کی ترجمانی کرتے تھے۔ ''ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟'' اس موضوع پر باقاعدہ انھوں نے ایک کتابچہ تیار کیا۔ نیز ''سیکولر جمہوری نظام، الیکشن، تحریک اسلامی'' نامی کتابچے میں بھی انھوں نے اپنے موقف کی ترجمانی کی ہے اور اپنے اشکالات پیش کیے ہیں۔

مولانا نے شعوری طور پر فکر وعمل کی جو دشوار گزار راہ اختیار کی تھی اس کا انھیں بخوبی ادراک تھا اور اس راہ میں انھوں نے جو قربانیاں پیش کیں اور مشکلات ومسائل کے سامنے جس ایمانی جرأت اور اسلامی غیرت

وحمیت کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ تقلید ہے۔ اپنے جواں سال بیٹے کی شہادت کے موقع پر مولانا نے استقامت اور صبر وحوصلہ کی جو غیر معمولی مثال قائم کی اس نے اسلاف کی قربانیوں کی یاد تازہ کردی اور اس حقیقت کو مبرہن کر دیا کہ واقعی جب اسلام روح میں اتر جاتا ہے تو اس کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی مومن کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ شروع میں واضح کیا گیا کہ راقم الحروف کی مولانا سے کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی جرأت و ہمت، حمیت وغیرت کے تذکرے سن کر یہ شدید خواہش تھی کہ اگر کبھی موقع ملا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضری ہوگی لیکن ان کی رحلت نے محرومی کے احساس کو دو چند کر دیا ہے۔ ان کی وفات کے موقع پر یوٹیوب پر مولانا کی کئی ویڈیوز سننے کا اتفاق ہوا۔ اندازہ ہوا کہ وہ نوجوانوں کا حوصلہ، ان کی امید وآرزو کا مرکز تھے۔ ڈر، خوف، مایوسی اور پست ہمتی سے وہ نا آشنا تھے۔ درحقیقت وہ قرآن کے طالب علم تھے، مدرستہ الاصلاح میں اس وقت انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی جو اس کی تاریخ کا زریں دور تھا۔ تمام مسائل میں قرآن وحدیث ہی ان کا سہارا تھا۔ ان کے تقریباً ایک درجن رسائل ہیں جن میں مولانا نے اپنے موقف کی مدلل ترجمانی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے رخصت ہونے سے ملک میں تحریک اسلامی کے نوجوان ایک شجر سایہ دار سے محروم ہو گئے۔ اب کون ان کی رہنمائی کرے گا، کون ان کے حوصلوں کو جلا بخشے گا؟! اللہ سے دعا ہے کہ مولانا کی حسنات کو قبول فرمائے، دین کی سربلندی کے لیے ان کی جد وجہد اور کوششوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے، ان کی سیئات سے صرف نظر فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں بہترین مقام عطا فرمائے نیز پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین!

وہ جن سے تھی معطر فضائیں دہر کی

شاہ عالم اصلاحی
نیوز ایڈیٹر روزنامہ انقلاب

مولانا نظام الدین اصلاحیؒ اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح کے ایسے سپوتوں میں سے تھے جنھوں نے اسلام کی سربلندی اور اقامتِ دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ دنیا میں جہالت، انانیت اور خود غرضی کا جوں جوں غلبہ ہو رہا ہے، حق پرست علمائے بارزین ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ ابھی مولانا سید جلال الدین عمریؒ کی جدائی کا غم ہلکا بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا نظام الدین اصلاحیؒ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ مولانا نظام الدین اصلاحیؒ کی خدمات جلیلہ کا ذکر چل ہی رہا تھا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی ملت کو منجھدار میں چھوڑ کر دربارِ خداوندی کی دستک پر لبیک کہہ بیٹھے۔ مذکورہ دونوں شخصیات نے قرآنی علوم کی مرکز، منفرد درسگاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے کسبِ فیض کیا، جہاں علامہ حمیدالدین فراہیؒ نے نظم قرآن کا علم بلند کیا تھا، جس کی گود میں ایسے لعل و گہر پرورش پائے جنھوں نے دنیا میں اپنی منفرد پہچان بنائی اور اپنے کمالِ علم سے باطل طاقتوں کو جھکنے پر مجبور کیا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی دین اسلام کے ایسے نقیب تھے جنھوں نے اسلام کی سربلندی اور احیائے اقامتِ دین کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ ان کی بے مثال قربانیاں تاریخ کے صفحات میں زریں حروف میں ثبت ہیں۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی عزیمت و استقامت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب مولانا کے جواں سال بیٹے کو شہید کر دیا گیا تب بھی ان کے چہرے پر بل نہیں آیا، انھوں نے یہ کہہ کر صبر کیا مجھے فخر ہے کہ میں ایک شہید بیٹے کا باپ ہوں۔

عبدالعلیم اصلاحی مرحوم مدرستہ الاصلاح کے صدر مدرس اور استاد بھی رہے۔ مولانا کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق تھا جو کچھ لکھا بصیرت آموز لکھا۔ مولانا کو مدرسہ سے مستعفی ہونے کا بڑا رنج تھا، جب اس کا ذکر چھڑتا تو مضطرب ہوجاتے تھے۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مولانا نے صدارت بھی کی، قیادت بھی کی اور سیاست بھی کی۔ جرأت وجسارت کی ایسی زندہ مثال تھے کہ ہر میدان میں اپنے اصولوں پر کاربند رہے، حق سے کبھی منہ نہیں موڑا۔

مذکورہ بالا ایسی بااثر تحریکی وعلمی شخصیتوں کے رخصت ہوجانے کے بعد یہ خیال پیدا ہونا فطری ہے کہ اب ملّت اسلامیہ کی قیادت کیسے ہوگی؟ شرپسندوں کے خلاف آواز بلند کون کرے گا۔ باطل طاقتوں کے خلاف لائحۂ عمل کون بنائے گا؟ کیونکہ اس وقت ملّت اسلامیہ کو سب سے زیادہ منافقت کا سامنا ہے۔ امت کا ایک بڑا حصہ باطل طاقتوں کے سامنے بے بس اور باطل کی گائیڈ لائن پر کام کررہا ہے۔ ایسے وقت میں مخلص اور باصلاحیت علمائے کرام کا مسلسل رخصت ہوجانا، ملت اسلامیہ کا عظیم خسارہ ہے۔ ایسے رجال کار اور جید علمائے کرام کے انتقال سے ملت میں یہ تشویش پیدا ہونا فطری ہے کہ اب قائدانہ صلاحیتوں سے آراستہ امت، قحط الرجال کی کیفیت سے دوچار ہے۔

ان بزرگوں کے دنیائے فانی سے رخصت ہوجانے کے بعد ایسے نازک حالات میں اب ہماری اور آپ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق دین اسلام کی خدمت کا بیڑا اٹھائیں اور اس پہلو پر بھی غور کریں کہ آخر کیا وجہ ہے اب اس ادارے یا اس مردم خیز سرزمین پر جہاں علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ نے آنکھیں کھولیں ایسی متحرک وفعال علمی شخصیتیں وجود میں نہیں آرہی ہیں، جو عہدِ حاضر کے فتنوں کا مقابلہ کرسکیں بلکہ اب تو مایوسی ایسی غالب ہوتی جارہی ہے کہ بجا ہوگا کہ اب سبھی کو اپنے حصے کا چراغ خود ہی روشن کرنا ہوگا۔
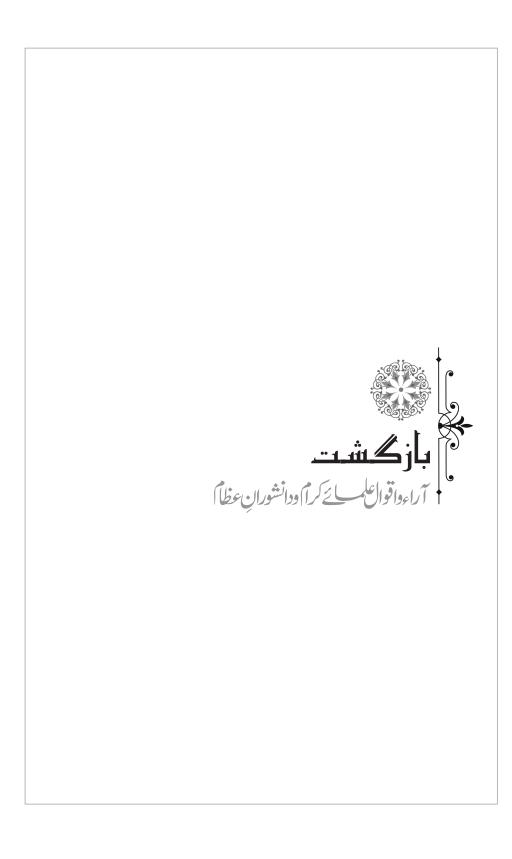
بازگشت
آراء و اقوال علمائے کرام و دانشورانِ عظام

میں اپنی منزل کو پا چکا ہوں

میں اپنی منزل کو پاچکا ہوں
خدا کے ملنے کو آچکا ہوں
اے میری امت کے رہنماؤ!
وفا ہے کیا یہ بتا چکا ہوں

میں انقلابی طریق بھی تھا
جماعتوں کا صدیق بھی تھا
امور حق میں لئیق بھی تھا
جواں دلوں کا رفیق بھی تھا
میں ولولوں میں غریق بھی تھا
معاشرت میں خلیق بھی تھا
یہی تھا میرا قصور کہ میں
اصولِ حق میں عمیق بھی تھا
رہِ خدا میں اسیر ہوکر
صعوبتیں بھی اُٹھا چکا ہوں
میں اپنی منزل کو پا چکا ہوں
وفا ہے کیا یہ بتا چکا ہوں

میں ظلمتوں میں منیر بھی تھا
عزیمتوں کا اثیر بھی تھا
حکومتوں کو نذیر بھی تھا
میں راہِ حق کا اسیر بھی تھا
حقیر بھی تھا فقیر بھی تھا
میں خود ہی اپنا ضمیر بھی تھا
یہی تھا میرا قصور کہ میں
فراعنہ پر نکیر بھی تھا
نظامِ حق کی طلب میں یارو
یہ جان اپنی کھپا چکا ہوں
میں اپنی منزل کو پا چکا ہوں
وفا ہے کیا یہ بتا چکا ہوں

میں دین حق کا وزیر بھی تھا
مشیر بھی تھا سفیر بھی تھا
جو دشمنوں پر نکیر بھی تھا
تو مومنوں پر حریر بھی تھا
جہانِ مسلم کا پیر بھی تھا
امورِ حق میں بصیر بھی تھا
یہی تھا میرا قصور کہ میں
مجاہدوں کا امیر بھی تھا

میں دین احمدؐ کی سربلندی
پہ اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوں
میں اپنی منزل کو پا چکا ہوں
وفا ہے کیا یہ بتا چکا ہوں

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ
کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی
چیئرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ،
ناظم مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہین نگر،
ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

برصغیر میں خطہ اعظم گڑھ عرصہ دراز سے عالمی، ملکی اور ریاستی سطح پر خداداد صلاحیت، انتھک محنت، خدمات اور انقلابات کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔

مشہور شاعر اقبال سہیل اس خطہ کے تعلق سے کہتے ہیں:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

نیز معروف عالمِ دین ومؤرخ قاضی اطہر مبارک پوری رقم طراز ہیں:

''اعظم گڑھ کی مٹی میں زرخیزی اور شادابی کی شان جداگانہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ آج اس کے قریات وقصبات میں علم وعلماء کی جو رونق اور کثرت پائی جاتی ہے اس کی مثال دوسرے پڑوسی اضلاع میں نہیں ملتی۔'' (علماء اعظم گڑھ، ص:۲۹)

اسی خطہ میں جب مغل بادشاہ شاہجہاں کی آمد ہوئی تو یہاں کی علمی فضاؤں کو دیکھ کر شاہجہاں نے کہا تھا ''مملکت پورب شیراز ماست'' خطہ اعظم گڑھ کے قریات وقصبات میں داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر تقریباً

سات آٹھ سو سالوں سے علم اور علماء کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، خطۂ اعظم گڑھ میں شہر اعظم گڑھ کے بالکل متصل ٹونس ندی (تمسا ندی) کے ساحل پر موضع بمھور آباد ہے جس کو متعدد حیثیتوں سے اہمیت حاصل ہے۔ یہ موضع علماء، مصنّفین اور مجاہدین آزادی کا مولد و مسکن رہا ہے۔ اس موضع کے باشندے مختلف مذاہب اور مختلف پیشے سے تعلق رکھتے ہیں، اس موضع کے مشہور عالم دین مولانا شبلی متکلم ندویؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ، مولانا نجم الدین احیائیؒ، مولانا محمد مسلم قاسمیؒ، پروفیسر عبدالوہابؒ اور دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مفتی محمد راشد اعظمی کا تعلق بھی اسی مردم خیز بستی سے ہے۔ نیز مشہور مجاہدین آزادی میں سے شیخ رجب علی کا تعلق بھی اسی قریہ سے ہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے راقم الحروف کی ملاقات غالباً 2006ء میں جامعۃ البنات حیدرآباد میں ہوئی، مولانا کا نام راقم الحروف نے صغر سنی ہی سے سن رکھا تھا۔ ایام طالب علمی میں کچھ تحریریں جامعہ رشیدیہ بمھور اعظم گڑھ اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور اور دارالعلوم دیوبند میں دیکھی تھیں، جس کی وجہ سے مولانا کی علمی قدر ذہن و دماغ میں ثبت تھی، مولانا سے جب ملاقات ہوئی اور انہوں نے ناچیز کا تعارف پوچھا تو موضع بمھور اور والد مرحوم مولانا نجم الدین احیائیؒ کے بتانے پر مولانا زیرِلب بڑی دیر تک مسکراتے رہے اور کہا کہ میرا بچپن آپ کے گاؤں میں گزرا ہے اور بڑی دیر تک مولانا شبلی متکلم ندویؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا نجم الدین احیائیؒ اور اپنے استاذ مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کا ذکر کرتے رہے۔ کاش کہ وہ باتیں ذہن کے صفحات پر یا کتابت کے پنجرے میں قید ہوجاتیں تو اس مضمون کے وقار میں اضافہ ہوجاتا مگر مشیتِ الٰہی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مولانا کا ننھیال اور راقم الحروف کا موروثی گھر دونوں کی دیواریں متصل ہیں، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ موضع بمھور ضلع اعظم گڑھ کے شیخ محمد ایوب کے بھانجے شیخ محمد فریاد، شیخ محمد نثار، شیخ محمد نیاز کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ مولانا نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی خالہ محترمہ بدرالنساء صاحبہؒ کا ذکر کیا اور فرمانے لگے کہ میری تعلیم و تربیت میں میری خالہ کا اہم کردار ہے۔ راقم الحروف کو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ نہ ہی عید تھی اور نہ ہی بقرعید، مگر ہمارے پڑوسی نئے لباس اور نئی امنگ کے ساتھ مسجد کی طرف جارہے تھے اور گھر میں بلکہ یوں کہا جائے کہ پورے محلہ میں خوشی کا ماحول تھا۔ غالباً میں نے اپنی دادی یا والدہ سے پوچھا کہ ہمارے پڑوس میں بہت خوشی نظر آرہی ہے آخر کیا بات ہے؟ کہنے لگیں بدرالنساء پھوپھی (بوبو) بمبئی سے آئی ہوئی ہیں، محترمہ بدرالنساء صاحبہ مرحومہ کو جب میں نے دیکھا نہایت ہی وجیہ، ہاتھوں میں تسبیح، خواتین و حضرات، بچے اور بچیوں سے ایک ہی سوال نماز آپ لوگوں نے پڑھی، نماز کی تلقین کرنا، قرآن شریف کی تلاوت پر راغب کرنا، اچھی بات کرنا،

خیریت پوچھنا، حوصلہ کی بات کرنا۔ وہ بمبئی سے کھانے اور پہننے کی اشیاء کافی مقدار میں لاتی تھیں، جیسا ان کو محسوس ہوتا اسی اعتبار سے تحفہ تحائف تقسیم کرتیں، سبھی کو عزت دیتیں اور سبھی سے عزت پاتیں، خداوند قدوس محترمہ بدرالنساء صاحبہ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، آمین یا رب العالمین!

وقت کی رفتار گزرتی رہی مولانا سے کئی ملاقاتیں کسی پروگرام یا تقریب میں ہوتی رہیں، جب جب ملاقات ہوئی مولانا نے شفقت کا معاملہ فرمایا۔ مولانا سے ملنے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے موسم گرما میں سایہ دار درخت پالیا۔ وطن مالوف اعظم گڑھ یوپی سے میرے برادر کبیر مولانا مساعد ہلال احیائی حیدرآباد آئے ہوئے تھے، ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے شرف ملاقات ہو، راقم الحروف سے یہ بات طے ہوئی کہ کل بعد نماز ظہر یا قبل ملاقات کے لئے جایا جائے گا، ہم لوگ دوسرے دن مولانا سے ملاقات کی تیاری ہی کررہے تھے کہ اسی اثنا میں ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا کے بیٹے مجاہد گجرات کے انسپکٹر کی گولیوں سے شہید ہوگئے، اور شہر حیدرآباد میں حالات خراب ہیں، محلہ سعید آباد حیدرآباد مولانا کے مکان پر پہنچنے کی کوشش کی گئی مگر پولیس کی رکاوٹ حائل ہوگئی، پورا شہر اس واقعہ سے دہل گیا سبھی مغموم تھے۔ دوسرے روز اخبارات میں تفصیل آئی، تعزیت کے لئے ہم دونوں بھائی مدرسہ جامعۃ البنات حیدرآباد پہنچے، مولانا کے چہرے پر فتح کے آثار دکھائی دیئے اور بڑی جرأت سے یہ کہا اللہ کو یہی منظور تھا، مجھے دنیا کی کسی چیز کی ضرورت نہیں اللہ ہی بدلہ دے گا۔ کتابوں میں صحابہ اور مجاہدین کے واقعات کو بہت مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر مولانا ابوالمجاہد سے ملنے کے بعد قدیم بہادروں کے واقعات تازہ ہوگئے۔ دل سے دعا نکلی کہ مولانا اور ان کے گھر والوں کو اللہ رب العزت صبر جمیل دے اور دونوں جہان میں بہترین بدلہ دے۔ آمین!

ہندوستان جمہوری ملک ہے، اس وجہ سے ملک کے سسٹم میں ہر پانچ سال میں عوام اپنا نمائندہ منتخب کرتی ہے، حیدرآباد میں کئی سیاسی جماعتیں ہیں، تقریباً ہر جماعت کے اہم اور خاص ممبران الیکشن کے درمیان مولانا سے دعا اور تائید کے طور پر ملاقات کیا کرتے، ایک یا دو مرتبہ محترم فیصل بن عبداللہ بلعلہ کے ساتھ الیکشن کے دوران ملاقات ہوئی، محبت کی نگاہ سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئے کہ میں دعا گو ہوں جو حق ہو وہی کامیاب ہوجائے۔ مولانا کو شریعتِ الٰہی کے علاوہ کوئی بھی طریقہ مصلحتاً بھی پسند نہیں تھا، اس وجہ سے وہ ووٹ کے معاملہ میں دور رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے مشہور و معروف عالم دین کا مضمون ووٹ کی شرعی حیثیت کے عنوان سے روزنامہ 'منصف' میں چھپا، اسی دن کسی کام کی وجہ سے جانا ہوا تو مولانا سے ملاقات ہوئی، انہوں نے راقم الحروف کے سامنے اخبار کا وہ حصہ جس میں ووٹ کی شرعی حیثیت والا مضمون تھا، کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ

مولانا دیکھئے کیا ہندوستان کے انتخاب کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا جاسکتا ہے؟! کیا اسلام میں جمہوریت ہے؟

مولانا نے میٹھے لہجے میں سوالات کے انبار لگادئے۔ راقم الحروف نے سارے سوالات بغور سنے، اسی اثنا میں مجھے حضرت مفتی صادق قاسمی میرٹھی کے وہ سارے جملے یاد آگئے جو انہوں نے مجھ سے انفرادی طور پر کسی موقع پر کہے تھے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو علومِ قرآن اور تدبرِ قرآن پر یدِطولیٰ حاصل ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کو درسِ نظامی پر دسترس حاصل ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کی فکر وعمل پر ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں شاید و باید ہی کوئی شخصیت ملے، کیوں کہ ان کی فکر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا پرتو نظر آتا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ داخلی اور خارجی دونوں جگہوں میں آزمائشوں میں گھرے رہے مگر انہوں نے پرواہ نہ کی۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مولانا اصلاحیؒ جامعۃ البنات سعید آباد کے ناظم تھے اسے انہوں نے اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا تھا۔ جامعۃ البنات کی شناخت پورے ملک میں مولانا اصلاحیؒ نے کرائی کیونکہ ان کا مشن تھا، معاشرے میں نیک خاتون کی ٹیم (جماعت) تیار کرنا، ایک طرف جماعت اسلامی کے لوگ مدرسہ جامعۃ البنات سے دور ہورہے تھے تو دوسری طرف مولانا اصلاحیؒ کے قریبی رفقاء دور ہونے لگے، پوری صورت حال سے تو صرف اللہ ہی واقف ہے، بہرحال بادلِ نخواستہ مولانا نے جامعۃ البنات سے دوری اختیار کرلی اور جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لئے بڑے حوصلے کے ساتھ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ ان حالات میں مولانا سے ملنے کا موقع ملا، جسمانی طور پر کچھ کمزور دکھائی دے رہے تھے مگر باتوں اور فکروں میں وہی فکری لاوا پک رہا تھا۔ مولانا کم سخن تھے مگر ان کا ایک جملہ سخنوروں پر بھاری ہوتا تھا۔ مولانا نے راقم الحروف کا نام لیتے ہوئے کہا: ''کام تو کرنا ہی ہے۔''

راقم الحروف نے اپنے چند رفیقوں کو ساتھ لے کر انیسویں اور بیسویں صدی کی مشہور شخصیت علامہ شبلی نعمانیؒ کی فکر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اکتوبر 2016ء ''شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد'' کی بنیاد رکھی اور ایک ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کے نام سے شائع ہونے لگا، چند ماہ کے بعد مولانا اصلاحیؒ سے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ملک پیٹ میں ملنے کا موقع ملا، مولانا ٹرسٹ اور ماہنامہ ''صدائے شبلی'' سے واقف ہو چکے تھے۔ مولانا نے کہا کہ ''آپ نے اچھا کام کیا ہے، خلوص اور ہمت سے کام کیجئے۔'' اور علامہ شبلیؒ کے تعلق سے فرمایا کہ ''علامہ نے علی گڑھ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، حیدرآباد کہیں پر بھی اپنی فکر سے سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنے معاونین اور شاگردوں کو عزت دی اور غالباً یہ شعر بھی پڑھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا''

اس دن مولانا سے طویل گفتگو ہوئی، مولانا نے ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کی دو ممبر شپ لیں، ایک اپنے لئے اور ایک مدرسہ کے لئے اور قیمت بھی ادا کروادی۔ مولانا کی حوصلہ افزائی نے ٹرسٹ کے عزائم و مقاصد پورا کرنے میں نئی روح پھونک دی، اللہ تعالیٰ مولانا اصلاحیؒ کو اس کا بہترین بدلہ دے، آمین۔

مولانا نے اسی ملاقات میں اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد اجمل کا بھی ذکر کیا اور کہنے لگے کہ ڈاکٹر اجمل جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کا اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ موضع بمہور میں، میں نے بھی ان سے علاج کے سلسلے میں تشخیص لی ہے۔ ان کے دل میں ملت کی ہمدردی اور انسان کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اللہ رب العزت ڈاکٹر اجمل صاحب کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے آمین۔ اسی ملاقات میں، میں نے مولانا سے کہا کہ آپ مجھے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کا ایک فرد سمجھئے، اس کے بعد جب بھی جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں کوئی پروگرام یا دعوت کا اہتمام ہوتا تو راقم الحروف کو مفتی جاوید قاسمی معلم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے ذریعہ یا کسی معلمہ سے فون کرا کے مولانا مجھے ضرور یاد کرتے۔ ''الاصلاحیۃ'' مجلہ جاری کیا تو ناچیز سے اس پروگرام کی نظامت کروائی، پروگرام کے بعد مسکراتے ہوئے تعریفی کلمات کہے، بڑا آدمی وہی ہے جو ذہنی طور پر بڑا ہو، اور ہر بڑا آدمی دوسرے کو بڑا بناتا ہے، مولانا نے کتنوں کو بڑا بنایا ہے اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔

کووِڈ 19 سے پوری دنیا متاثر ہوئی بالخصوص تعلیم گاہیں بہت متاثر ہوئیں، مدارس کی اس ذہنی مصنوعی یا حقیقی وبا نے کمر توڑ کر رکھ دی۔ حالات کچھ سازگار ہوئے تو کسی کام سے ملک پیٹ جانا ہوا، مولانا سے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں ملاقات ہوئی، عمر اور حالات کی وجہ سے کچھ کمزور دکھائی دے رہے تھے، گفتگو کے وقت بھی کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا، مولانا اس مرتبہ ملت کی فکر میں غرق تھے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد متوجہ ہوئے حال چال پوچھا، گاؤں گئے کہ نہیں، دیکھ رہے ہیں دنیا کیسے کروٹ لے رہی ہے۔ زبان سے الفاظ نکل رہے تھے، مشیتِ الٰہی پر راضی بہ رضا دکھائی دے رہے تھے، اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ہمارا کام ہے محنت اور لگن سے کوشش کرنا۔ چنانچہ انہوں نے ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی اپنے مدرسین، معلّمات، ملازمین کا پورا خیال رکھا۔ راقم الحروف نے اپنی اس مشاہداتی زندگی میں بہت کم ایسے لوگوں کو پایا ہے جو کہ اپنے ناظم

سے خوش رہے ہوں، سابقہ حالیہ مدرسین سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی تو سبھی مولانا کے تعلق سے بڑی اچھی رائے کا اظہار کرتے اور یہ بھی کہتے کہ مولانا وقت پر تنخواہ دیتے ہیں اور بڑے سلیقے سے تربیت اور کام لیتے ہیں۔

سورج ہوں روشنی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

مولانا اصلاحیؒ ۳۱؍جنوری ۱۹۳۴ء موضع بندی گھاٹ، اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب محمد نسیم صاحبؒ کو علاقہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم موضع بندی گھاٹ اور نانیہال موضع بمہور اعظم گڑھ میں ہوئی، بعدہ ملک کی مشہور و معروف درسگاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ سے ۱۰؍مئی ۱۹۵۳ء میں سندِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ مولانا اصلاحیؒ مدرستہ الاصلاح کے ممتاز طلباء میں سے ایک تھے، پڑھنے کے زمانے میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا اور اس عرصہ میں مدرستہ الاصلاح میں ممتاز و مشفق علوم وفنون کے ماہر اساتذہ موجود تھے جن کی خوشہ خرمن سے مولانا اصلاحیؒ نے اپنا دامن بھر لیا جس سے وہ تاحیات مستفید ہوتے رہے، جس کا اظہار مولانا کی زبان سے بار بار ہوتا تھا۔ مولانا مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد چند ماہ مدرسہ میں بحیثیت نگراں رہے، تحقیق وتصنیف کا ذوق مولانا کی گھٹی میں تھا اس وجہ سے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں تقریباً ڈیڑھ سال قیام کیا، تھوڑے عرصے تک الہ آباد میں قیام کیا، اس کے بعد ملک کی مشہور درسگاہ جامعہ مظہرالعلوم بنارس میں پندرہ سال 1956ء تا 1970ء استاذ، نگراں، صدر مدرس کے عہدے پر فائز رہے۔ مولانا نے مدرسہ کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیا اور علاقے میں فرمانِ الٰہی وسنتِ نبویؐ کی نشر واشاعت میں پیش پیش رہے۔ بنارس سے آپ لوگوں کے اصرار پر جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں استاذ مقرر ہوئے۔ بعدہٗ اراکین مدرستہ الاصلاح کے اصرار کی وجہ سے مولانا اصلاحیؒ مدرستہ الاصلاح تشریف لے گئے۔ ذمہ داروں نے آپ کو صدر مدرس کے پروقار عہدہ کی ذمہ داری دی۔ مولانا مدرستہ الاصلاح میں چند سال رہنے کے بعد مستعفی ہوکر ۱۹۷۳ء میں جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر آندھرا پردیش تشریف لے گئے۔ ۱۹۸۱ء میں جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر سے پہاڑی شریف حیدرآباد منتقل ہوگیا تھا تو مولانا بھی حیدرآباد آ گئے۔ جماعت اسلامی کے اراکین اور مولانا کے مشورے سے ۱۹۸۸ء میں جامعۃ البنات کا سعیدآباد میں قیام عمل میں آیا تو مولانا کو مدرسہ کا بانی و ناظم بننے کا شرف حاصل ہوا۔ داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر یہ پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد میں لڑکیوں کی باضابطہ دینی تعلیم کے انتظام کا سہرا مولانا اصلاحی کے سر جاتا ہے۔ خداوند قدوس اس کاوش پر آپ کو بہترین بدلہ دے گا، کیوں کہ اس کے بعد آندھرا پردیش اور ملک میں اس نہج کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے ملت کے متفکرین چراغ سے چراغ جلا رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری وساری

ہے۔ مولانا ان کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات قلمبند کرتے رہے جس کی وجہ سے ان کی تقریباً ۱۵ر کتابیں منظرعام پر آئیں۔ جن سے ان کی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کتابوں کے علاوہ مولانا اصلاحیؒ کے بہت سے مضامین رسائل و جرائد اور روزناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ راقم الحروف نے کئی مرتبہ ان کے شائع مضامین کا مطالعہ کیا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کے کمالات و اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل کام ہے، بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ''رجلان تحابا فی اللّٰہ اجتمعا علیه و تفرقا علیه'' پر عمل پیرا تھے۔ اچھی طرح ملنا، بامقصد باتیں کرنا، کام آنا اور مہمان نوازی ان کا طرۂ امتیاز تھا، مولانا چند ماہ سے مسلسل بیمار چل رہے تھے، آخر وہ وقت آہی گیا۔ ۲۷ر ستمبر ۲۰۲۲ء کی تاریخ تھی، عصر سے کچھ قبل موبائل میں میسیج چیک کررہا تھا تو اس میں جگہ جگہ مولانا کے انتقال کی خبر تھی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔

تھوڑی دیر یہ سوچتا رہا آہ مولانا اصلاحیؒ! آپ کی شفقتیں، محبتیں، علمی و جوشیلی باتیں یاد آنے لگیں۔ بعد نماز مغرب راقم الحروف تعزیت کے لئے مولانا کے مکان پر پہنچا، مولانا کے صاحبزادے معتصم باللہ اور مولانا کے نواسے، محبین، متعلقین، اعزہ واقارب اور پورا سعید آباد مجسم غم بنا ہوا تھا۔ مولانا کا دیدار ہوا، دیکھ کر محسوس ہورہا تھا کہ مولانا نفس مطمئنہ کی طرح سوئے ہوئے ہیں، بہت کم لوگوں میں یہ کیفیت دکھائی دیتی ہے، مولانا کا چہرہ مالکِ حقیقی سے ملنے کے بعد نور بکھیر رہا تھا۔ راقم الحروف اپنی دلی کیفیات کو ضبط تحریر نہیں کرسکتا۔ معتصم باللہ اور نواسوں کو تسلی دی، مشیتِ الٰہی پر راضی بہ رضا ہوتے ہوئے دعاؤں کا اہتمام کرنے کے لئے کہا۔ اس وقت یہ بھی احساس ہوا کہ ابھی مولانا مسکراتے ہوئے کہیں گے محامد بیٹھئے۔ ۲۸ر ستمبر ۲۰۲۲ء بعد نمازِ فجر شہر کی مشہور مسجد، مسجد اُجالے شاہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی، سعید آباد روڈ سے متصل قبرستان میں تدفین ہوئی۔ جب مولانا کی قبر پر مٹی ڈالی جارہی تھی تو احساس ہوا کہ ہم مٹی ضرور ڈال رہے ہیں مگر آپ کی فکر اور آپ کا کام ان شاء اللہ پسِ مرگ زندہ ہونے کی یاد دلاتا رہے گا۔ تدفین کے بعد قبلہ رخ کھڑے ہوکر حاضرین دعائیں اور ایصالِ ثواب کررہے تھے اور سبھی زبان حال وقال سے گویا تھے کہ اے اللہ! مولانا کی مغفرت اور ان کو اعلیٰ درجات نصیب فرما، پسماندگان، ان کی اہلیہ، فرزند، دختران، نواسے، نواسیاں اور سبھی متعلقین کو صبر جمیل دے اور مولانا کی فکروں کو وسعت دینے کی توفیق دے، آمین یارب العالمین۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آہ! مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ

خورشید انور ندوی، حیدرآباد

دل جس قدر بھی کسی ہونے والے واقعے کی حقانیت کا یقین رکھے، جب وہ ہو جاتا ہے تو دل فگاری کم نہیں ہوتی۔ ہم میں سے کس کو فنا نہیں، سب کو ہے۔ کس کو اس حقیقت جبری کا ادراک نہیں، سب کو ہے۔ خدا کا منکر بھی موت کا منکر نہیں ہوتا۔ ہاں کچھ پاک نفس قدسی خلق ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی میّت کے سرہانے کھڑے ہو کر، سرد پیشانی چھو کر بھی جذبات کی دنیا اس سے انکاری رہتی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ ہو چکا ہے۔

دیر سے موبائل کو ہاتھ لگایا تو برادر گرامی ظفر مسعود صاحب (سابق منیجر لفتھانسا ایرویز ریاض/ دمام/ بحرین) کی اطلاع تھی کہ مولانا اصلاحی صاحب نہیں رہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!......رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ......

دوسری طرف کئی گروپس میں یہ خبر زیر گردش تھی۔ مولانا مرحوم کا مکان میرے مکان سے ایک گلی دوری پر ہے اور ان کا وجود میری شہ رگ سے قریب تر، پھر بھی یہ حوصلہ کرنے میں وقت لگا کہ میں فوراً روانہ ہو سکوں۔ مجھے پتہ ہے کہ ہمارے تعلقات کی نوعیت ایسی رہی ہے کہ ہر آنے والے کی نظر مجھے ڈھونڈتی ہوگی۔ پھر بھی ہمت نہیں تھی کہ اٹھوں اور چلا جاؤں۔ میں رنج وغم میں تھا کہ پاکستان سے میری اہلیہ نے فون کیا اور اطلاع دی ساتھ یہ بھی استفسار کیا کہ آپ کو پہلے اطلاع مل چکی؟ اٹھا اور بے روح لاشے کی طرح روانہ ہوا۔ گھر پہنچا، دس منٹ بیٹھا اور مولانا کے فرزند عزیزم معتصم سلمہ کے ہمراہ آخری دیدار کیا اور پھر گھر واپس آ گیا۔ جاتے وقت دکھ کا بوجھ تھا، آتے وقت چالیس سال کی بھاری اور تہ دار یادوں کا۔ یادوں کی پرتیں کھلیں تو سرشانے پر بھاری لگنے لگا۔ اف یہ زندگی اور اس کی گراں باری.... اگر مرنے کے بعد بندۂ مومن کو خدا کے قرب اور رسول اللہ کی معیت کا سہارا نہ ہو تو یہ وسعت افلاک قبر کی وحشتوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی زندگی میں بڑے لوگ دیکھے لیکن عزیمت،

استقلال، تقشف، بے نفسی، دنیا سے ''غری غیری'' دو بے نفسوں میں ہی دیکھ سکا۔ ایک مولانا اصلاحی مرحوم اور دوسرے میرے استاد مولانا شہباز اصلاحی مرحوم۔ دونوں کا پہناوا یکساں، مزاج ایک اور دنیائے دوں کی غلامی سے دوری ایک جیسی۔ غربت کی معراج میں کئی بے سہاروں کا سہارا۔ بلال حبشیؓ کا والی امت کا والی تھا، اس کی اتباع میں مولانا کئی بلالوں کے والی تھے۔ کسی سرپرستی کے بغیر وہ اپنی رائے پر عزیمت رکھتے تھے۔ مولانا آج سے چالیس سال پہلے ہندوستان میں ''فقہ مزاحمت'' کے بانی تھے اور ساری عمر بے خوف اس کے مبلغ رہے۔ اس کی پاداش میں اپنا بیٹا کھویا لیکن وضع دار کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی۔ وہ براہ راست پولیس کی سفاک گولی کا نشانہ بنا، پورا گھر گرفتاری اور مقدمات کا سامنا کرتا رہا لیکن مولانا مرحوم پر ان سب کا کوئی اثر کبھی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مومنانہ وقار اور گہرے سکوت کی تصویر بنے رہے۔ ساری عمر تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ جامعۃ البنات حیدرآباد اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

مجھے اس بات کا قلق رہے گا کہ سعودی عرب سے واپسی کے بعد مولانا کے بہت اصرار کے باوجود میں تعلیمی سرگرمیوں میں دوبارہ اُن کا شریک نہ بن سکا اور میری جسمانی صلاحیت اور ادارہ جاتی مصروفیات نے مجھے اس قابل بھی نہیں رکھا تھا۔ کوئی پانچ چھ دن پہلے عیادت کے لئے گیا تھا تو مولانا نیند میں تھے اور میری ملاقات نہ ہوسکی اور آج اسی چوکھٹ پر آخری دیدار کے لئے آیا ہوں۔ مولانا چلے گئے اب ان جیسا کوئی نہیں آئے گا، آیا بھی تو میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ اللہ دکھ کی اس گھڑی میں اس گھر کا والی ہو۔ اے نفس مطمئنہ اِرْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
تحریکی رہنما، مفکر، دانشور

محمد عارف اقبال
ایڈیٹر اردو بک ریویو، نئی دہلی

مشہور عالم دین، تحریک اسلامی کے رہنما، استاذ الاساتذہ، مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ تقریباً 90 سال کی عمر میں 27 ستمبر 2022ء بروز منگل 4 بجے شام حیدرآباد کے ایک ہاسپٹل میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

نمازِ جنازہ 28 ستمبر کو بعد نماز فجر مسجد حضرت اجالے شاہ، سعید آباد میں ادا کی گئی، نماز جنازہ مولانا مرحوم کے داماد عزیزم ڈاکٹر انیس احمد فلاحی نے پڑھائی اور متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ، پانچ دختران اور ایک فرزند انجینئر معتصم باللہ ہیں۔ ان کے بڑے فرزند مجاہد سلیم 2004ء میں حیدرآباد میں گجرات پولیس کی فائرنگ میں شہید ہوگئے تھے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب 31 جنوری 1934ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک قریہ بندی گھاٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کے والد محترم محمد نسیم صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے 1945ء میں ان کو مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ دلوایا۔ مدرسۃ الاصلاح کے مکتب میں درجہ تین میں داخلہ ہوا۔ دو سال مکتب میں پڑھنے کے بعد عربی اول اور اسی سال عربی دوم مکمل ہوگیا۔ مدرسۃ الاصلاح سے فراغت 10 مئی 1953ء کو حاصل کی۔ اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا عبیداللہ صاحبؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے تاسیسی ممبران میں سے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پہلا مشاورتی اجلاس الٰہ آباد میں ہوا، اس کے بعد اعظم گڑھ میں جماعت کا پہلا اجتماع ہوا، جس میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ شریک تھے۔ پہلا کل ہند اجتماع رامپور میں ہوا تو وہ بحیثیت رکن شریک تھے۔ جماعت اسلامی کا پہلا مرکز مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ تھا۔

1953ء میں مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد مولانا اختر احسن اصلاحی صاحبؒ کے حکم پر ایک سال مدرسۃ الاصلاح کی بورڈنگ کے نگران رہے، اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال شبلی منزل دارالمصنّفین سے استفادہ کے لیے اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ اس دوران شاہ معین الدین صاحب ندوی، صباح الدین صاحب اور مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ اسی قیام کے دوران ''بڑہریا'' کے عبدالعزیز خان صاحب نے جو وحید الدین خان کے بڑے بھائی تھے، مولانا عبدالعلیم اصلاحی سے اپنے لڑکوں اور وحیدالدین خان کو پڑھانے کی درخواست کی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ تقریباً ایک سال تک وحیدالدین خان صاحب نے مولانا سے عربی سیکھی۔ دارالمصنّفین کے بعد ان کا قیام کچھ دنوں تک الٰہ آباد میں پھر بنارس مظہر العلوم میں رہا۔ وہ ''مظہر العلوم بنارس'' میں تقریباً 14/جنوری 1956ء سے 1970ء تک وابستہ رہے۔ وہاں انھوں نے مختلف ذمہ داریوں کو انجام دیا۔ بنارس قیام کے دوران ایک مرتبہ مفتی ابراہیم صاحب جو مفتیٔ بنارس تھے، ان کے کہنے پر گیان واپی مسجد میں امامت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ 1970ء میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو پھر مدرسۃ الاصلاح بلایا گیا اور ان کو مدرسۃ الاصلاح کا صدر مدرس مقرر کیا گیا۔ اس وقت مدرسۃ الاصلاح شدید مالی بحران کا شکار تھا، کئی مہینے سے اساتذہ کی تنخواہیں نہیں دی گئی تھیں۔ بہر حال ان کی کوششوں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ اس طرح آپ مدرسۃ الاصلاح میں انتظامی امور کے ساتھ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں جامعۃ الفلاح میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔

ایمرجنسی سے قبل مولانا جلیل احسن ندویؒ کی درخواست پر جماعت اسلامی کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر تشریف لائے اور پھر یہ مدرسہ حیدرآباد منتقل ہوا تو حیدرآباد میں بھی 1988ء تک اس مدرسہ سے مستقل طور سے وابستہ رہے۔ انھوں نے جون 1988ء میں لڑکیوں کا مدرسہ جامعۃ البنات حیدرآباد قائم کیا تو جامعہ دارالہدیٰ میں ایک ڈیڑھ سال تک جز وقتی کام کیا۔ جامعۃ البنات حیدرآباد کے قیام کے بعد مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے اپنی تمام صلاحیت اور قوت بروئے کار لاکر جامعہ کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ وہ مدرسہ کے بانی و ناظم بھی تھے اور جامعہ میں تدریسی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ وہ مسلسل جامعۃ البنات حیدرآباد کی خدمت میں مصروف رہے یہاں تک کہ 2012ء میں کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئے تو انھوں نے

جامعہ کی بلڈنگ کو چھوڑ کر مدرسہ کے نام میں الاصلاحیۃ کا اضافہ کر کے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کو ملک پیٹ میں منتقل کر دیا اور تادم آخر یعنی 26؍ستمبر 2022ء تک اس مدرسہ کے بانی و ناظم کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ تقریباً 70 سال درس و تدریس سے وابستہ رہے اور ملک بھر کے ہزاروں طلبہ و طالبات نے ان کے علم سے استفادہ کیا۔

جماعت اسلامی سے عبدالعلیم صاحب کی وابستگی دوران تعلیم ہی قائم ہوگئی تھی۔ جماعت کے تمام اہم اجلاسوں میں وہ شریک رہتے تھے۔ بنارس قیام کے دوران 1956ء سے 1970ء تک تقریباً پندرہ سال وہ امیر مقامی بنارس رہے اور تن من دھن جماعت اسلامی کے لیے لگا دیا۔ اس کے علاوہ تین سال امیر مقامی سرائے میر، اعظم گڑھ بھی رہے۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران جماعت اسلامی کی درسگاہ جامعہ دارالہدیٰ سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد کے 1991ء کے فسادات کے بعد ایک کتاب ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' تحریر کی جس سے جماعت اسلامی میں ہلچل مچ گئی اور ان کو امیر مقامی حیدرآباد نے اپنے اختیارات سے بالاتر ہو کر معطل کر دیا۔ پھر مولانا سراج الحسن صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے اس معطلی کو ختم کیا۔ جماعت اسلامی کی طرف سے بارہا معطل کرنے اور اخراج کرنے کی کوشش ہوتی رہی، یہاں تک کہ جون 2001ء میں تحریک تحفظ شعائر اسلام کی سرپرستی قبول کرنے کی پاداش میں دفعہ 68 کے تحت معطلی اور اخراج کا فیصلہ کیا گیا حالانکہ اس سے ایک ماہ قبل ہی مئی 2001ء میں ان کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ حیدرآباد کا ممبر منتخب کیا گیا تھا۔ معطلی کے فیصلہ کے خلاف مرحوم نے قیم جماعت کو ایک تفصیلی وضاحتی تحریر ارسال کی مگر امیر جماعت نے اسے قابل اعتناء نہ جانا اور ان کی ساٹھ سالہ ممبر شپ کو یکلخت ختم کر دیا جس کا مرحوم کو بے حد صدمہ رہا۔ ان کا جماعت اسلامی سے الیکشن کے مسئلہ پر ہمیشہ اختلاف رہا۔ جماعت کی پالیسیوں میں الیکشن کو لے کر جس طرح تبدیلیاں ہوئیں وہ اسے جماعت کے آئین اور مولانا مودودیؒ کے اصولوں کی خلاف ورزی سمجھتے تھے اور ہمیشہ ایسی تحریروں اور پالیسیوں کو ہدف تحقیق و تنقید بناتے رہتے تھے۔ وہ الیکشن میں حصہ لینے کو شرک فی الحکم بتاتے اور مسلسل اس مسئلہ پر تحریر کرتے رہے۔ جب 1985ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ 15 تا 21؍فروری 1985ء میں چند شرائط کے ساتھ ارکان جماعت پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھائی گئی اس وقت سے وہ اس فیصلہ کے خلاف سراپا احتجاج رہے اور بار بار ذمہ داروں سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لیے اصرار کرتے رہے۔

مولانا عبدالعلیم صاحبؒ نے جہاں تعلیم و تدریس کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا، وہیں تصنیفی میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں اور ایسی کتابیں تصنیف کیں جو سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کتابوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش سیاسی و دینی مسائل اور ان کے حل میں فکری رہنمائی موجود ہے۔

عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب انتہائی صابر و شاکر انسان تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی دین اسلام کی خدمت اور ملت کی رہنمائی میں کھپا دی اور طلبہ و طالبات کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جو دین اسلام کے غلبہ کا جذبہ رکھتی ہے۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے چند تذکرے

ڈاکٹر مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

ادھر چند سالوں میں علم وعمل کے ستارے بڑی تیزی کے ساتھ ٹوٹتے چلے گئے۔ جن علماء کی علمی بصیرت، ورع وتقویٰ، ان کی دینی حمیت وغیرت اور ان کی رہنمائی پر امت کو یقین اور اعتماد تھا، کرونا وائرس کے زمانے سے ان کے جانے کا جو سلسلہ شروع ہوا اب تک ختم نہیں ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا رب ہم سے ناراض ہے، ہمیں بے سہارا کرنے کے لئے ایک ایک کرکے تمام سہاروں کو چھینتا جارہا ہے، جن کی آہ سحر گاہی سے رحمتیں نازل ہوتی تھیں اور مسلمان چین کی نیند سوتے تھے اب انہیں بے چین کرنے کے لئے اصحابِ فضل وکمال اور خدا ترس شخصیتوں کو اپنے پاس بلا کر عام مسلمانوں کو ان کے عصیان اور نافرمانی کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اضطراب اور آزمائشوں کی راہیں کھلتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ہمارا بے قرار دل بار بار پکار رہا ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء، حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤوسًا جهالًا، فسئلوا فأفتوا بغیر علم، فضلوا واضلوا۔ (صحیح بخاری:۱۰۰)

''اللہ تعالیٰ بندوں کے سینوں سے یکبارگی علم کو سلب نہیں کرتا البتہ علماء کو اٹھا کر علم ختم کردے گا، یہاں تک کہ جب اس سرزمین پر کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں اور بے دینوں کو اپنا سرغنہ اور امیر متعین

کرلیں گے جن سے وہ مسائل معلوم کریں گے، جو خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء و صلحاء کا یکے بعد دیگرے امت کے درمیان سے اٹھ جانا نیک فال نہیں ہے۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہے کہ اہلِ علم دنیا سے رفتہ رفتہ چلے جائیں گے اور پھر ان کی جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بظاہر لوگ آتے رہیں گے اور کام چلتا رہے گا لیکن روحانیت سے دنیا خالی ہوتی چلی جائے گی۔ علم و تحقیق اور پختہ صلاحیت کی روشنی میں شریعت کے احکام کی رہنمائی سے لوگ محروم ہوجائیں گے۔ یہ دور مسلمانوں کے لئے افسوسناک دور ہوگا جس سے بہر حال گذرنا مقدر کردیا گیا ہے اور ان دنوں اصحابِ علم و فضل کے اس قدر تیزی سے رخصت ہونے سے دل و دماغ میں کئی اندیشے پیدا ہورہے ہیں۔

ان دنوں جن علمائے کرام کے جانے سے مسلمان سخت مایوس ہیں ان میں حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بانی و ناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ملک پیٹ حیدرآباد کا نام بھی شامل ہے جو ملک کے مشہور اور نامور علماء میں سے تھے۔ اپنی پختہ صلاحیت، فکر و نظر اور علمی قابلیت کے لحاظ سے وہ ریاست اور بیرونِ ریاست ہر جگہ ممتاز اور فائق نظر آتے تھے۔ قوتِ استدلال اور کسی موقف کو ثابت کرنے کے منہج تحریر سے علم کا چشمہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا بالخصوص جب کسی سے کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تو وہ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے قرآن و احادیث پر مشتمل دلائل سے جو مضمون اور تحریر لکھتے وہ یقینا پڑھنے کے قابل ہوتی، اس سے اہلِ علم کو بڑی روشنی ملتی، کئی اہم نکات ملتے اور ذہن و فکر کو جلاء ملتی تھی۔

ان کی قوتِ استدلال اور مستحکم گفتگو کے سبب مخالفین اپنا نقطۂ نظر چھوڑنے اور ان کی علمی صلاحیت کو ماننے پر مجبور ہوجاتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے کسی مسئلے میں دلائل کی بنیاد پر اپنی ایک رائے کا اظہار کیا، اخبارات میں جب تحریر شائع ہوئی تو اعتراضات ہوئے، لوگوں نے چیلنج کیا مگر مولانا اپنی رائے پر ڈٹے رہے اور مدلل گفتگو کی روشنی میں اپنے موقف کو ثابت کردکھایا۔ کبھی یہ سلسلہ طویل ہوجاتا اور علمی بحث چلتی رہتی، قارئین کو ان کے مضامین کا انتظار رہتا، بعض لوگ سوچتے کہ اب شاید مولانا عبدالعلیم صاحبؒ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے اور اب وہ تھک جائیں گے لیکن اخبارات و رسائل کی فائلیں شاہد ہیں کہ وہ تعب و تھکن سے کبھی آشنا ہی نہیں ہوئے۔

عمر کی زیادتی اور ضعف کے باوجود نئے آب و تاب کے ساتھ عالمانہ اور فاضلانہ جواب دیتے۔ اس پر بھی کوئی اعتراض ہوتا تو پھر جواب دیتے، محسوس ہوتا تھا کہ ان کا قلم ابھی شبابیت کے دور سے گذر رہا ہے اور انہیں علمی بحث و تمحیص میں لطف حاصل ہورہا ہے۔ معترض یا تو شکست تسلیم کرلیتا یا پھر ادارہ کو فریقین سے معذرت

کرنی پڑتی، پھر یہ بحث کہیں ختم ہوتی تھی۔

وہ صاحبِ طرز ادیب ہونے کے ساتھ محقق، مصنف، معلم، مربی اور کامیاب انشاء پرداز تھے۔ قلم میں بڑی طاقت تھی، ان کی تمام تحریروں میں بلا کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ وہ کسی کی نقالی کرنے اور جمود وتعطل کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی اپنی فکر تھی، اپنی سوچ تھی، دوررس نظــــر رکھتے تھے، قوتِ فیصلہ اور خود اعتمادی میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ کم گو اور خاموش مزاج تھے، ضرورت پر بولتے مگر قیمتی اور نایاب گفتگو ہوتی تھی۔ جامعیت ان کی گفتگو کا امتیاز تھا۔ اختراعی ذہن کے حامل تھے۔

ایک بات سوچتے، اس کے نتائج پر غور کرنے کے بعد جب فیصلہ کر لیتے تو کسی کی پرواہ کئے بغیــر تنہا چل پڑتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا قافلہ ان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ بعد میں رفقاء کو احساس ہوتا کہ مولانا کا فیصلہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور بروقت تھا۔ اگر اســـ پر عمل نہ ہوتا تو شاید ناموافق اور افسوس ناک صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا۔

مولانا کی زندگی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ مدلل گفتگو کے عادی تھے۔ الل ٹپ کوئی بات نہیں کہتے، خانہ پری کا مزاج نہیں تھا، جب بھی وہ تقریر کرتے یا چھوٹے سے چھوٹا مضمون لکھتے تو دلائل کا انبار لگا دیتے، مرتب گفتگو کے ساتھ جب استدلالی قوت سے مزین ہوتی تھی تو سننے اور پڑھنے والے ان کی صلاحیتوں کے معترف ہو جاتے۔ قرآن واحادیث سے دلائل پیش کرتے، نصوصِ شرعیہ ان کی گفتگو کا محور ہوتا جس سے تحریر وتقریر میں جان پیدا ہو جاتی۔ وہ بے باک زبان وقلم کے مالک تھے، مرعوبیت کا کہیں شائبہ نظر نہیں آتا تھا، جس کو وہ صحیح سمجھتے پوری قوت کے ساتھ اس کا اظہار فرماتے، علمی گفتگو میں کسی سے ڈرتے اور نہ بڑے سے بڑے صاحبِ علم وفضل سے مرعوب ہوتے۔ حالات سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، اچھے اچھے لوگوں کو میں نے ہواؤں کے رخ پر بہتے دیکھا ہے لیکن ان کا عزم وحوصلہ قابل رشک تھا، ملک کے سخت سے سخت حالات میں بھی وہ شریعت کی باتوں کی تبلیغ کرتے اور اس کے پیغامِ حق کو دوسروں تک پہنچاتے، ان کے مجاہدانہ کردار کی طویل داستان ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ لوگ جو مولانا کی زندگی سے معمولی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان پر سنگین حالات آئے، آزمائشوں سے انہیں گذرنا پڑا مگر ان کے ایمان اور پائے استقامت میں موت تک کوئی تزلزل نہیں آیا، کبھی وہ حالات سے نہیں گھبرائے، وہ جانتے تھے کہ مسافرانِ حق کی راہیں ہمیشہ خاردار ہوتی ہیں اور ان پر چلنا ہی عزیمت اور قربِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے وقت بلاخوف وخطر مسلسل مؤثر تحریریں لکھتے رہے اور مسلمانوں کی غیرت کو للکارتے رہے۔ وہ مردِ مجاہد تھے، ایمانی قوت کا ان کے پاس سرمایہ تھا اور بس...... سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے اپنا قیمتی خون دے کر اسلام کو سینچا ہے، انہیں وہ یاد کرتے اور سمجھتے

تھے کہ اس راہ میں سب کچھ قربان کر کے بھی ان کی گرد پا کو ہم نہیں پا سکتے۔

وہ بہت غیور تھے، ان کی ہر تحریر سے غیرت ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ حالات جب ناموافق ہوتے ہیں تو صلح حدیبیہ کا حوالہ دے کر بڑے بڑے قائدین اپنی جان و مال کے تحفظ میں لگ جاتے ہیں لیکن مولانا کا موقف یہ تھا کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد اور غزوات سے بھری ہوئی ہے اور صلح حدیبیہ حیاتِ نبوی کا صرف ایک ورق ہے۔ جب تک بدر و اُحد کا سبق یاد نہ کیا جائے صلح اور امن کے لئے راستہ ہموار نہیں ہوسکتا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ اتحادِ امت کی دعوت دیتے رہے، کبھی انہوں نے مسلکی اختلاف کو موضوع بحث نہیں بنایا، ان کا کہنا تھا کہ ہر جماعت اور مسلک والے کے پاس دلائل کی قوت ہے، جس کی روشنی میں اس کے پیروکار راستہ طے کر رہے ہیں اور وہ اس میں مخلص ہیں ہمیں ان کی نیتوں پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلکی اور فروعی اختلاف میں پڑ کر اپنی قوت و طاقت کو گنوانا کوئی دانشمندی نہیں ہے اور نہ ملک کے حالات سازگار ہیں کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ ابھی باطل کے خلاف منظم کوشش کی ضرورت ہے جو باہمی اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔

مولانا کو ان افراد سے بڑی شکایت تھی جو ملک اور عالمی ناموافق حالات کے باوجود اپنے مسلک اور اپنی جماعت کے ایجنڈوں کے تحفظ میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے لئے اپنی دولت اور سرمایہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ وہ ملت کے تئیں دردمند دل رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان شان و شوکت کے ساتھ سر اٹھا کر زندگی گزاریں، جن کے پاس قرآن جیسا دستورِ حیات اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نظامِ زندگی ہو وہ مغلوب ہو کر زندگی گزاریں، یہ بزدلی اور اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے۔

مولانا کی کوششوں کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ خاص طور پر وہ عورتوں میں تعلیم کے فروغ کے قائل تھے، کیوں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کی کوشش اور محنت کا دخل ہوتا ہے۔ اگر عورت تعلیم سے آراستہ ہو جائے تو پورا گھر اور معاشرہ صحیح سمت کی طرف چل پڑے گا۔ ماں کی گود بچوں کا پہلا مکتب ہوتا ہے، ماں کی کوششوں اور اس کے پاکیزہ خیالات کے اولاد کی زندگی پر مثبت اور حیران کن اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لئے انہیں علم کے زیور سے بہر حال آراستہ ہونا چاہئے۔ کم و بیش دنیا کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اس لئے بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی یہی وہ سوچ تھی جو ان کے لئے محرک بنی کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک معیاری مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کے نظم و ضبط کو انہوں نے مثالی

بنا کر بنات کے تمام مدارس کے ذمہ داروں کو ایک نئی جہت عطا کی۔

طالبات کا درد اُن کے جگر میں پنہاں تھا اس لئے وہ ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتے، ان کی باتیں سنتے اور جائز مطالبات پورے کرتے۔ معلّمات کی حوصلہ افزائی کرتے، ان کو وقت پر تنخواہ دیتے اور ان کے مسائل میں ہاتھ بٹاتے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ان کا مدرسہ ترقی کرتا ہوا شہر کے ممتاز اور بڑے مدارس کی صف میں شامل ہو گیا اور اب مولانا کے جانے کے بعد امید ہے کہ ان کے سچے وارثین اس علمی میراث کو حسن و خوبی کے ساتھ آگے بڑھائیں گے اور ان کے مشن کو صرف زندہ ہی نہیں بلکہ مزید استحکام عطا کریں گے۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا کی، تقریباً نوے (90) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ فراغت کے بعد سے ہی قرآن وحدیث کی تعلیم و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور کسی انقطاع کے بغیر یہ سلسلہ آخری سانس تک باقی رہا، کم و بیش ان کی ہمہ جہتی خدمات 70 سالوں پر محیط ہیں جو کسی بھی مردِ مومن کے لئے بیش بہا زادِ راہ ہے۔

رسول اکرم ﷺ سے کسی نے ایک موقع پر سوال کیا کہ بہتر شخص کون ہے؟ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''من طال عمره و حسن عمله''۔ ''جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو۔'' (ترمذی:۲۳۳۰)

مولانا نے طویل عمر پائی اور اپنی پوری زندگی کارِ خیر میں گزاری، جس سے ان کی مغفرت اور بخشش کا غالب گماں ہوتا ہے۔ وہ دنیا سے چلے گئے مگر ان کے کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو ان کے لئے ثواب جاریہ بنائے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی توفیق دے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

وہ بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے

محمد نعمان بدر القاسمی ندوی
ناظم دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد

موت ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ہر دن بے شمار جانیں جاتی ہیں جنہیں لوگ اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کرتے ہیں اور ان کی میراث تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ان میں بیشتر افراد ایسے ہوتے ہیں، جن کے جانے پر وقتی طور پر افسوس ہوتا ہے اور پھر انہیں بھلا دیا جاتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کی موت سے پورا شہر اور پورا علاقہ متاثر ہوتا ہے، ہزاروں لوگ ان کے جانے پر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کے اخلاق اور خدمات کو یاد کرتے ہیں، لیکن یہ سلسلہ کچھ ہی دنوں کے بعد ختم ہو جاتا ہے، پھر بعد میں انہیں کوئی یاد کرنے والا نہیں ہوتا، البتہ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کی موت پر صدیاں گذر جاتی ہیں لیکن وہ اپنے عظیم کارناموں کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں، طویل زمانہ گذر جانے کے بعد بھی ان کا نام روشن ستارے کی طرح چمکتا رہتا ہے، جب بھی ان کا نام لیا جاتا ہے لوگوں کی نگاہیں عقیدت اور ادب واحترام سے جھک جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایسے خوش نصیب افراد کو دیرپا زندگی کی بشارت دی گئی ہے۔

ارشاد باری ہے:

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَّأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ... (الرعد:۱۷)

''جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے، اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔''

امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ جیسے ہزاروں فقہاء و محدثین اور اہلِ علم ہیں جن کی موت پر کئی صدیاں گذر گئیں لیکن ان کا نام آج بھی زندہ ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قیامت تک زندہ رہے گا۔ یہ ان کے کارناموں اور عظیم خدمات کا صلہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کے خدام بظاہر نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں، ان کی تجہیز و تکفین ہوجاتی ہے لیکن حقیقت میں وہ زندہ ہوتے ہیں، ان کی خدمات اور قربانیوں کے اعتبار سے لوگ انہیں یاد رکھتے ہیں، دل و دماغ میں ان کی یادیں ایسی بس جاتی ہیں کہ ان کے تصور سے کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ ملک کے نامور عالم دین حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو جانے کے بعد بھی زندہ ہیں اور انشاء اللہ وہ اپنی دینی حمیت و غیرت، ورع و تقویٰ، حق گوئی و بے باکی، پختہ صلاحیت اور ہمہ جہتی خدمات کے سبب تادیر زندہ رہیں گے۔ ان کی علمی، دینی و دعوتی سرگرمیوں سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اشاعتِ دین اور دفاعِ شریعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اخلاص سے اپنے مشن کی طرف چلتے رہے، راہوں میں بڑی سے بڑی رکاوٹیں آئیں، طوفان آیا، اپنوں اور غیروں کی جانب سے تنقیدیں کی گئیں، ان کے اٹھتے قدم کو روکنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ دین کا سچا رہنما کسی کی پرواہ کیے بغیر چلتا رہا اور حق کی آواز لگاتا رہا۔ نہ تو اربابِ اقتدار کے سامنے کبھی جھکے اور نہ مخالفین سے انہوں نے باطل پر کبھی سمجھوتہ کیا۔

یہ ان کے اخلاص کی برکت اور عنداللہ قبولیت کی بات ہے کہ اس مردِ مجاہد نے اپنی پوری زندگی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں گزار دی۔ مادیت پرستی نے کبھی ان کے دامن کو داغ دار نہیں کیا اور نہ کبھی عہدہ اور منصب یا شہرت و عزت کی تمنا نے ان کی زبان و قلم پر بندش لگائی۔ قدرت نے لکھنے کا خوب ہنر دیا تھا، وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں لکھتے، آسان لب و لہجہ استعمال کرتے، سادہ اور عام فہم لکھتے، تحریر میں تسلسل ہوتا کہ شروع سے اخیر تک پڑھ ڈالیے لیکن کہیں انقطاع کا احساس نہیں ہوگا۔ عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو ہوتی، خانہ پری اور اخبارات میں چھپنے کے لیے کبھی نہیں لکھتے، ضرورت پر لکھتے اور خوب لکھتے۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے اور نہ حق بات میں کسی کے آگے سپر ڈالتے۔ تحریر میں درد ہوتا اور ضمیر کی آواز قائدین اور رہنماؤں تک پہنچانے کی سعی کرتے کہ شاید حالات میں کچھ تبدیلی آئے اور مسلمانوں کے حق میں کوئی اچھا فیصلہ آسکے۔ بعض موقعوں پر ان کی تحریروں پر اعتراضات بھی کیے گئے جن کا انھوں نے مسکت اور مدلل جواب دیا، حکمت اور مصلحت کے نام پر بزدلی انہیں نہیں آتی تھی۔ جوش و ولولہ اور عزم و ہمت کے پہاڑ تھے۔

ان کے شب و روز سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عیش و عشرت سے انہیں سخت نفرت ہے، پہاڑوں اور بیابانوں میں گذرگاہیں تلاش کرنا ان کا مزاج تھا۔ ان کی تصنیف کردہ کتابیں اور رسائل صفحات کی تعداد کے اعتبار سے

چھوٹے ہی سہی مگر قلب و دماغ کو جھنجھوڑنے کے لیے بیش قیمت تحریر پر مشتمل ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر مکمل اور دلائل سے پرُ ہیں، خاص طور پر ان کی تصنیفات میں دارالاسلام اور دارالحرب، ملت کے دفاع کا مسئلہ، بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں، طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، اسلام اور سیکولر جمہوری نظام، مجسّموں کا مسئلہ......اسلامی فکر کیا ہے اور جاہلیت کے خلاف جنگ بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ان کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی اور عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اصلاح اور سماج کو بہتر بنانے میں عورتوں کا بڑا دخل ہے، اگر عورت دین دار اور نیک ہو تو افرادِ خانہ اور اس سے جڑے تمام افراد پر اس کے بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بڑی تیزی سے نیکی کا ماحول ساز گار ہوتا ہے اور اگر اس کا کردار صحیح نہ ہو تو اس کے قریب میں رہنے والے تمام افراد منفی خیالات اور مختلف جرائم کے شکار ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس طرح مسلمان مردوں پر تعلیم حاصل کرنا فرض ہے، عورتوں پر بھی اس کو فرض کیا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کی تعلیم پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جس کے سبب آج بھی مسلمانوں میں تعلیم کی شرح بہت کم ہے اور بیشتر جرائم میں مسلمان ملوث ہیں۔

تقریباً دنیا کی نصف آبادی عورتوں کی ہے، انہیں نظر انداز کر کے سماج کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا، کچھ لوگوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اب بنات کے تعلیمی ادارے کھول رہے ہیں اور عصری تعلیم کے ساتھ ان کے لئے مختلف شہروں میں دینی تعلیم کا انتظام کیا جارہا ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اس بارے میں بہت سخت موقف رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماں کی گود بچہ کے لیے پہلا مکتب ہوا کرتا ہے، صالحیت وہیں سے سب سے پہلے اس میں منتقل ہوتی ہے اور افراد سے سماج تشکیل پاتا ہے۔ افراد صحیح ہوں گے تو معاشرہ خود بخود صحیح ہوجائے گا اور افراد بگڑ گئے تو معاشرہ بھی بگڑ جائے گا، اس لئے بعض اعتبار سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں تعلیم وتربیت کی زیادہ ضرورت ہے۔ ماہرین نے صحیح لکھا ہے کہ ایک مرد کی تعلیم سے معاشرہ کا ایک فرد تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور ایک عورت کے تعلیم یافتہ ہونے سے پورا گھر تعلیم یافتہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے مولانا نے اپنی زندگی میں لڑکیوں کی تعلیم پر بڑی توجہ دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک عورت پردہ اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ترقی کی تمام منزلیں طے کرسکتی ہے۔ شریعت اسلامی نے اس کی اجازت بھی دی ہے تو پھر کیوں اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مولانا کی یہی وہ بنیادی فکر تھی کہ انہوں نے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ملک پیٹ کی بنیاد رکھی اور تمام سہولتوں کے ساتھ لڑکیوں کی معیاری تعلیم کا نظم کیا، وہ طالبات کے حق میں مشفق تھے، ان کے مسائل کو حل کرتے اور انہیں اپنے خطاب اور نجی گفتگو کے ذریعے پختہ صلاحیت پیدا کرنے پر ابھارتے رہتے اور صالح معاشرہ کی تشکیل میں

بہتر کردار ادا کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ حالات میں جب کہ جگہ جگہ ایمان سوز فتنے پیدا ہو رہے ہیں اور مختلف انداز میں نئی نسلوں سے ایمان چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے، ان کے ایمان کی بقاء کے لیے عورتوں کا ایمان مستحکم اور مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے، عورتیں بہت جلد کسی کے بہکاوے میں آجاتی ہیں اگر ان ہی کے ایمان میں کمزوری رہی تو ان سے وابستہ افراد کے ایمان کا تحفظ انتہائی دشوار ہوگا۔ لڑکیوں کی تعلیم کو عام کرنے کے حوالے سے ان کی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔

مولانا پختہ صلاحیت کے حامل تھے۔ قرآن و احادیث پر ان کی گہری نظر تھی، ائمۂ فقہ اور ائمۂ احادیث سے انہیں غیر معمولی عقیدت و محبت تھی۔ وہ اسلاف و اکابر کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو انھوں نے اپنی علمی و عملی سرگرمیوں کا محور بنالیا ہے اور ان ہی کے نقشِ قدم پر وہ چل رہے ہیں۔ بہر حال مولانا مختلف الجہات صلاحیتوں کے مالک تھے، بلند پایہ عالم دین، بہترین معلم و مربی اور فکر مند داعی ہونے کے ساتھ مصنف و مؤلف، واعظ و خطیب اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ مزاج میں تواضع اور سادگی تھی، لب ولہجہ نرم اور ملائم تھا، احکامِ شریعت کے پابند بالخصوص سنن و نوافل کا اہتمام کرتے تھے۔ خوش مزاج اور ملنسار تھے، تکبر اور شہرت سے کوسوں دور رہتے تھے۔ مہمان نواز اور خورد نواز تھے۔ اپنے ماتحتوں سے بھی حسنِ اخلاق سے ملتے تھے، ملاقات کے وقت محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم دین اور مصنف یا صاحبِ قلم ہیں۔ شریعت کے فیصلے پر اٹل رہتے تھے، سارا زمانہ ساتھ چھوڑ دے مگر وہ تنہا اس راہ پر چلتے رہتے جس کو انہوں نے شریعت کی روشنی میں صحیح سمجھا ہے۔ جب کہیں دین کے ساتھ مداہنت ہوتی اور حق کو دبایا جاتا تو پھر ان کا تیور قابلِ دید ہوتا، ان کا قلم تلوار بن جایا کرتا تھا، بڑی خوبیوں کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں دین کی خدمت کے لئے منتخب کرلیا تھا، آخری دم تک وہ دین کا کام کرتے رہے۔

شہر حیدرآباد ہمیشہ سے زرخیز علاقہ رہا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ قلم، علماء، شعراء اور ادباء یہاں پیدا ہوئے ہیں اور آج بھی اہلِ علم کا شہر کہلاتا ہے لیکن ان سب میں انہوں نے یہاں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر امتیاز اور ایک شناخت بنائی تھی۔ شہر کے معروف اور ممتاز علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی وفات سے ریاست کی علماء برادری خاص طور پر صدمہ سے دوچار ہوئی اور انہیں بڑے دکھ کا احساس ہوا۔ مولانا مرحوم قضائے الٰہی سے ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئے لیکن وہ اپنے کارناموں اور خدمات کے تئیں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ذکیہ کوثر
صدر معلمہ جامعہ ریاض البنات، ملک پیٹ، حیدرآباد

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس کا سامنا ہر جاندار کو کرنا ہے، اس دنیا میں آنے جانے کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا تاہم کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں جو تعلیم و تربیت، جرأت و بے باکی، عزم وحوصلہ، انتظام و انصرام، علم وعمل، اخلاق وکردار اور تحریر وتقریر کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان ہی عظیم شخصیتوں میں ایک نام مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا بھی ہے، جنھیں ہم لوگ ''مولانا عبدالعلیم اصلاحی، بانی وناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ'' کے نام سے جانتے ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک عالمِ دین ہی نہیں بلکہ شہر حیدرآباد کے مشہور ومعروف، مؤقر عالمِ دین، تحریکِ اسلامی کے داعی اور استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ نے ۲۷ رستمبر ۲۰۲۲ء بروز منگل، ۴ بجے شام، حیدرآباد کے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت کرے، سیئات پر پردہ ڈال دے، اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اپنے محبوبین ومقربین میں شامل فرمالے، آمین یارب العالمین!

آپ نے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے علاوہ ملک کی کئی قدیم ومشہور دینی درسگاہوں میں تدریسی وانتظامی خدمات انجام دیں، خاص طور پر مدرسۃ الاصلاح اور مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں آپ کے انتظام وانصرام کی صلاحیت نمایاں طور پر دیکھنے کو ملی۔ اس کے علاوہ آپ نے جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کی محنت ولگن، جوش وجذبہ، دینی وایمانی تڑپ، تعلیمی وتربیتی فکرمندی اور انتظامی صلاحیت کو

دیکھتے ہوئے آپ کے استاذِ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ نے ایمرجنسی سے کچھ قبل جماعت اسلامی کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ دارالہدیٰ، کریم نگر کی خدمت کے لیے بلایا تو آپ یہاں تشریف لے آئے۔ یہی مدرسہ جب ضلع کریم نگر سے حیدرآباد منتقل ہوا، تو آپ بھی حیدرآباد منتقل ہوگئے اور ۱۹۸۹ء تک مستقل طور پر وابستہ رہے، اس طرح آپ نے اپنے وطن اترپردیش سے دور دراز آندھرا پردیش (موجودہ تلنگانہ) کا رختِ سفر باندھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہیں کے لیے منتخب کرلیا۔

۱۹۸۸ء میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے حیدرآباد میں جامعۃ البنات کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کی ترقی میں اپنی پوری توانائی صرف کردی، لہٰذا بہت کم وقت میں اس جامعہ نے اپنی ایک منفرد پہچان بنالی۔ تاہم ۲۰۱۲ء میں کسی وجہ سے وہاں سے علیحدہ ہوکر جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے ملک پیٹ، حیدرآباد میں ایک الگ ادارہ قائم کیا اور وفات تک بانی و ناظم کی حیثیت سے اپنی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ مدرسہ قائم کرنا اور اسے بحسن و خوبی چلانا بالخصوص لڑکیوں کا مدرسہ، کوئی آسان کام نہیں ہے، اس میں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اگر اخلاصِ نیت کے ساتھ قدم بڑھایا جائے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ساتھ ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے عزم و حوصلہ عنایت کیا تھا۔ وہ اپنے ارادے کے پختہ اور مضبوط تھے ہمت ہارنا نہیں جانتے تھے بلکہ ان کے اندر ایک خاص انداز کا حوصلہ، جوش و ولولہ، کام کرنے کی دھن اور لگن تھی۔ انھوں نے متعدد اداروں کو اپنے خون پسینہ سے سینچا، تقریباً ۷۰ رسالوں تک درس و تدریس، تعلیم و تربیت اور انتظام و انصرام کے میدان میں مختلف جگہوں پر رہے، بہت سرد گرم دیکھا، کوہِ گراں بن کر حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور امت کی اصلاح کے لیے فکرمند رہے۔ اس طرح تعلیم و تربیت کے فضائل کا حصول آپ کا مقدر بنا۔
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو دردمند دل، مزاج میں سنجیدگی و متانت، گفتگو کا خاص انداز اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ عنایت کیا تھا جس کا مشاہدہ لوگوں نے کیا۔ اسے دین کی محبت اور اصلاح کا جذبہ ہی کہا جائے گا کہ استاذِ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ کی دعوت پر اپنے وطنِ عزیز کو چھوڑ کر چلے آئے اور ایسا آئے کہ یہیں کے ہوکر رہ گئے اور متعدد اداروں کی ترقی کا ذریعہ بنے۔ اب مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور ان شاء اللہ ہزاروں طلبہ و طالبات ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہوں گے۔ ہم یہی دعا کرتے ہیں کہ

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ہوا کے رخ پہ روشن رہا وہ چراغ

رضوان احمد فلاحی، لندن

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ سے واقفیت کب ہوئی اور انہیں پہلی بار کب دیکھا، قطعیت سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم قیاس ہے کہ مولانا جب مدرسۃ الاصلاح پر تھے، تو والد مرحوم مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سے ملنے آتے رہے ہوں گے۔ سرائے میر سے پھول پور کا فاصلہ ہے ہی کتنا۔ سن ۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں جامعۃ الفلاح میں زیرِ تعلیم تھا۔ بلریا گنج میں جماعت اسلامی کا ضلعی اجتماع تھا۔ اس میں ایک مذاکرہ رکھا گیا تھا۔ موضوع تھا ''خدمت کے لیے اجتماعیت ضروری ہے۔'' ابتدا ہی میں مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا نام پکارا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر مجھے کسی کو ایک گلاس پانی پلانا ہو تو میں تنہا یہ خدمت انجام دے دوں گا۔ اس کے لیے کئی افراد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ موضوع ہونا چاہیے تھا: ''خدمت دین کے لیے اجتماعیت ضروری ہے۔'' مولانا کی اس گرفت پر حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ یہ مولانا سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی جس کا نقش تا حال ذہن پر تازہ ہے۔

مولانا مظہر العلوم بنارس اور پھر مدرسۃ الاصلاح کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے۔ مدرسۃ الاصلاح اور حیدرآباد کے درمیان مرحوم کا اور بھی کوئی پڑاؤ رہا، راقم الحروف اس سے ناواقف ہے۔ ان کے حیدرآباد قیام کے دوران، ان کی خیریت وقتاً فوقتاً برادرم مولانا نعیم الدین اصلاحی سے ملتی رہی۔ مولانا مرحوم سے دوسری ملاقات، فروری ۱۹۸۱ء میں، حیدرآباد میں منعقد چھٹے آل انڈیا اجتماع کے موقع پر ہوئی تھی بلکہ اس موقع پر مرحوم کو قدرے جلال کے عالم میں دیکھا۔ ہوا یہ تھا کہ اجتماع کے دوسرے دن کھانے کے معاملے میں کسی قدر بدانتظامی ہوگئی۔ مولانا قدرے برہمی کے عالم میں ارکانِ شوریٰ کی قیام گاہ میں داخل ہوئے اور بلند آواز سے کہا: 'ارکان

شوریٰ یہاں آرام کررہے ہیں اور باہر افراتفری مچی ہے'، یہ سنتے ہی ارکانِ شوریٰ باہر نکلے حالات کو سنبھالنے کے لیے۔ جو الحمدللہ جلد ہی سنبھل گئے۔ میں مولانا ابواللیث اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں ان جگہوں پر گیا اور مولانا نے حالات کو سنبھالا۔ اس موقع پر والد مرحوم کی طبیعت بہت خراب تھی، یہاں تک کہ انہیں اسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم سے آخری بالمشافہ ملاقات اپریل ۲۰۰۶ء میں، مدرسۃ الاصلاح پر منعقد سہ روزہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سیمینار کے موقع پر ہوئی تھی۔ حسن اتفاق تھا کہ جس سیشن کی صدارت مولانا نے فرمائی تھی اسی میں میں نے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ سیمینار کے اختتام پر چند احباب کے ساتھ مولانا سے ملاقات رہی۔ اس ملاقات میں میں نے شرارتاً مولانا سے کہا کہ میں ان کا ہم مسلک ہوں۔ مولانا نے وضاحت چاہی تو عرض کیا کہ جو رشتہ آپ کا بندول سے ہے وہی رشتہ میرا بھی ہے۔ مرحوم میرے اس شرارت آمیز جملے سے خاصا محظوظ ہوئے۔ اسی سال دو تین ماہ کے بعد میری مرتب کردہ والد مرحوم کی سورہ فاتحہ اور بقرہ کی تفسیر طبع ہوئی۔ میں نے کسی ذریعہ سے اس کا ایک نسخہ مولانا مرحوم کی خدمت میں بھجوایا۔ لندن پہنچ کر فون سے اطمینان کرنا چاہا کہ 'تیسیر القرآن' ان تک پہنچ گئی ہے۔ مولانا نے اس کے مل جانے کا ذکر کیا اور راقم کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔

مولانا مرحوم سے ایک بار نصف ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کا ایک خط والد مرحوم کے نام دیکھا۔ اس میں مرقوم تھا کہ ان دنوں وحیدالدین خاں کو دوبارہ شامل جماعت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ درمیان میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ہیں۔ میں نے اس کی روشنی میں مولانا عبدالعلیم صاحبؒ سے کچھ مزید تفصیلات جاننی چاہیں۔ انہوں نے لکھا کہ اعظم گڑھ کے رفقاء کوشاں تھے۔ لیکن نتیجہ حسبِ خواہش برآمد نہ ہوا۔ ایک نشست میں حاضرین کو محسوس ہوا کہ خان صاحب کچھ مائل سے ہیں۔ ان میں سے کسی نے ان سے دریافت کیا کہ جماعت کے خلاف 'الفرقان' میں ان کی جو تحریریں شائع ہو رہی ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ بولے: ''وہ ایک دوسرے مضمون سے ہوا ہو جائیں گی''۔ اس جملے سے کہنے والے کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالعلیم صاحبؒ جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ انہوں نے جس چیز کو صحیح سمجھا اسے پوری سختی سے اپنایا۔ بعض افکار و آراء، جنہیں وہ اپنے علم کی بنیاد پر بالکل صحیح سمجھتے تھے، مصلحت کا کوئی جھونکا انہیں ان سے برگشتہ نہیں کر سکا۔ موقف کی صلابت کی وجہ سے جماعت سے ان کی وابستگی ختم کر دی گئی۔ لیکن وہ اپنے اختیار کردہ موقف پر ثابت قدم رہے۔ اس کے لیے انہیں قربانیاں بھی دینی پڑیں جن میں سب سے بڑی قربانی جو اں

سال بیٹے کی شہادت تھی۔ تاہم ان کے پائے استقامت کبھی لغزش آشنا نہیں ہوئے۔ ان کا دیا آندھیوں کے مقابلے میں ٹمٹماتا ہی رہا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا کا ایک بہت بڑا کارنامہ ان کا لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے 'جامعۃ البنات الاصلاحیۃ' کا قیام ہے۔ مختلف ذرائع سے اس ادارے کے معیار و منہاج کے بارے میں جو معلومات ملتی رہیں، وہ مجموعی طور پر قابلِ اطمینان ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کی تعلیمی تربیت اور تحریک اسلامی کی تحریکی تربیت کے حامل بانیٔ مدرسہ کا معیار باعثِ اطمینان ہونا ہی چاہیے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشینوں سے مرحوم کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کرتے رہنے کی توقع رکھنا کہ وہ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ کا منظر پیش کرنے لگے، بے جا نہیں ہوگا۔

تغمده الله برحمته وأسكنه فسيح جناته۔

عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
ایک مردِ مجاہد

مولانا محمد اسمٰعیل فلاحی
سابق شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح
بلریا گنج، یوپی

سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں قرآن نے اہل کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اہل کتاب اپنے آپ کو اللہ کی محبوب اور چہیتی قوم سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآءُهٗ''۔ ان کا خیال تھا کہ جنت میں صرف ہم جائیں گے اور ہمارے باہر کا کوئی آدمی نہیں جا سکے گا۔ قرآن نے ان کے سامنے ان کی اپنی تاریخ رکھی ہے کہ اگر تم اپنے کو اللہ کی لاڈلی اور چہیتی قوم سمجھتے ہو تو اللہ بار بار تمہیں پیٹتا کیوں رہا ہے؟ قرآن نے انھیں مخاطب کر کے کہا ہے کہ ''ہم نے تمھاری کتاب میں تمہیں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے اور ہر بار ہم تمہیں سخت سزا دیں گے۔'' یوں تو ان کے فساد اور سرکشی کی تاریخ بڑی طویل ہے اور خدا کا تازیانہ بھی بار بار ان پر برستا رہا ہے لیکن قرآن نے ان کی بڑی سرکشی کے نتیجے میں دو بڑی تباہیوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ ایک بار تو بابل کا بادشاہ بخت نصر ۵۹۸ قبل مسیح میں ان پر عذابِ الٰہی بن کر ٹوٹا ہے، دوسری بار رومی بادشاہ ٹائیٹس (TITUS) نے ۷۰ عیسوی میں ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ حملہ آور ان کے گھروں کے اندر داخل ہو گئے۔ نہ عزتیں سلامت رہیں، نہ مال محفوظ رہا، نہ جان کو امان ملی۔

ہیکل سلیمانی زمین بوس کر دیا گیا۔ ایک لاکھ تینتیس ہزار افراد کا قتل عام ہوا۔ ۶۷ ہزار غلام بنا کر لے جائے گئے اور حسین و دراز قامت لڑکیاں فاتحین نے اپنے لئے چن لیں۔ قرآن نے بار بار ان کا جرم یہ بتایا ہے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑا تھا۔ امانت میں خیانت کی تھی۔

جس کی سزا کے طور پر ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی۔

قرآن کریم میں یہ داستان مسلمانوں کو سنائی گئی اور اسے محفوظ کر دیا گیا کہ مسلمان ان کی تاریخ سے عبرت حاصل کریں۔ اس تاریخ کو دہرائیں نہیں۔ ورنہ ان پر بھی تازیانۂ عذاب اسی طرح برسے گا اور وہ اللہ کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں عدل کے دو پیمانے نہیں ہیں۔ ایک ہی پیمانہ ہے جس سے بے لاگ طریقہ سے تمام قوموں کو ناپتا اور ان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

موجودہ امت مسلمہ کی اب تک کی تاریخ بھی بار بار کے فساد اور اس کے نتیجہ میں خدا کے عذاب سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو تار تار کر دیا۔ اس کی کتاب قرآن مجید کو پس پشت ڈال دیا۔ آج امت مسلمہ پھر ایک بار اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی ہے۔ اس کے دینی اور تہذیبی تشخص کی بقا کا سوال ہے بلکہ آگے بڑھ کر اس کا وجود ہی خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے دانشور حیران ہیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا حکمتِ عملی وضع کی جائے۔

ایسے حالات میں ملت اور عام انسانیت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ جنھوں نے خود اپنی تہذیب اور اپنا تزکیہ کر لیا ہے اور مسلسل کر رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھیں اور نئی نسل کی تعمیر، نبویؐ بنیاد پر کریں۔ آج مدارس دینیہ بڑی تعداد میں ہیں، تحریکاتِ اسلامی بھی سرگرم دکھائی دیتی ہیں لیکن صحیح معنوں میں یہ مردم گری کا کام نہیں ہو رہا ہے، جبکہ یہی کام ملت کی، انسانیت کی اور اس دور کی سب سے بڑی ضرورت اور خدمت ہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اس پہلو سے ممتاز علماء اور قائدین میں ہیں۔ جنھوں نے تدریس کے ساتھ تربیت کا نبوی منہاج اختیار کیا اور کوشش کی کہ ایسے رجال تیار ہوں جو سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں، جو آگے بڑھ کر اس ملت کے ڈوبتے جہاز کو ساحل مراد پر پہنچا سکیں۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو مظہر العلوم بنارس سے لے کر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر تک۔ ان کا یہ وصف بہت ابھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شریر سے شریر بچوں کی تربیت کر لینے، ان کے اندر دین سے محبت پیدا کرنے اور دین کے سانچے میں ڈھالنے کی تڑپ پیدا کرنے میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے اس دور کے پڑھائے ہوئے طلبہ اکثر و بیشتر تحریک اسلامی کے علم کو اٹھائے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر حیدرآباد کی مختلف درسگاہوں میں ان کا یہ کردار نمایاں ہے۔

انھوں نے لڑکیوں کی درسگاہ قائم کر کے اس طرح ان کی تربیت کی کہ آج وہ طالبات جہاں بھی ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے بس اللہ کی بندگی اور اس کے کلمہ کا احیاء ہے اور دوسری کوئی چیز نہیں۔ وہ طلبہ اور طالبات سے

شفقت ومحبت کا معاملہ کرتے۔ان کے مسائل حل کرنے اوران کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے فکرمند رہتے۔ وہ شریر طلبہ کے اخراج کے بجائے ان کی تربیت کی فکر کرتے اوراس میں کامیاب رہتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیرِتدریس وتربیت طلباء ہوں یا طالبات سب کے دل ان کی عقیدت اورمحبت سے لبریز نظر آتے ہیں۔

وہ ایک اچھے اور باصلاحیت استاذ تھے،نحو وصرف،عربی ادب اورقرآن پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ تعلیم دینے اورتربیت کرنے کا اچھا ملکہ رکھتے تھے،جس کا ثبوت وہ طلبا اور طالبات ہیں جنہیں ان سے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ان کے دورِصدارت نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ایک اچھے مربی اور استاد ہونے کے ساتھ اچھے منتظم بھی تھے۔

تعلیم وتربیت اورتحریک کی راہ میں انھیں بڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا،سخت حالات آئے لیکن ان کے عزم وحوصلہ میں فرق نہیں آیا،اگرایک خرمن جلایا گیا تو دوسرا خرمن انھوں نے تیار کرلیا۔

اس ملک کے اندر رہنے اورکام کرنے کے سلسلہ میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ایک مخصوص سوچ تھی،ملک کے داخلی احوال وکوائف کا ان کا ایک مطالعہ تھا،ان حالات میں کام کرنے کی جو حکمت عملی اپنے علم کے مطابق انھیں مناسب نظر آئی اس کا اظہار کیا اوراس پر جمے رہے۔اس معاملہ میں ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا لیکن اپنی سوچی سمجھی رائے سے ہٹنا انھوں نے گوارا نہیں کیا،اپنی رائے پر ڈٹے رہے اور برملا اس کا اظہار کرتے رہے۔ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مجتہد کا اجتہاد اگرصحیح ہے تو اسے دوہرا اجر ملتا ہے اوراگر اس سے اجتہاد میں غلطی ہوجاتی ہے پھر بھی اس کے لیے ایک اجر ہے۔موجودہ منظر نامہ ایسا ہی ہے۔جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا کہ اچھے اچھوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نوجوانوں کوخصوصی اہمیت دیتے اس لیے کہ وہی ملک وملت کا مستقبل ہیں۔ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد ان کو اپنا مربی اورسرپرست سمجھتی رہی ہے اور مولانا ان نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن رہے ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے اپنی پوری زندگی عنفوانِ شباب ہی سے اسلام اورملت اسلامیہ کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔میرے سامنے جماعت اسلامی ہند مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی رپورٹ کاپی ہے،اس میں صفر 1366ھ میں مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا نام ہمدردوں کی فہرست میں ملتا ہے،1368ھ رجب میں اس کاپی کے مطابق وہ رکن کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔علمی تیاری کے سلسلہ میں ایک مجلس بنتی ہے جس میں دوسرے ناموں کے ساتھ مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا نام نظر آتا ہے۔مضافات میں کام کے سلسلہ میں اس کاپی

میں چار گروپ نظر آتے ہیں۔ جس میں میرے والد محمد عالم صاحبؒ اور چچا مولانا شہباز اصلاحیؒ کے ناموں کے ساتھ مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا نام درج ہے۔ ان بزرگوں اور ان کے ساتھیوں نے بڑی محنت سے مضافات میں دعوت واصلاح کا کام کیا ہے۔ اس علاقہ کی جماعت کی تاریخ ان بزرگوں کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔

راقم کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی مدرسی کے زمانے میں ان سے بار بار ملاقات کی سعادت حاصل رہی ہے۔ وہ فلاح آتے تو مجھے تلاش کرتے، مجھے خبر ہوتی میں خود پہنچ جاتا بڑی محبت فرماتے۔ اس کی جو وجہ بھی رہی ہو لیکن ایک وجہ شاید یہ تھی کہ وہ میرے والد اور والد سے بڑھ کر میرے چچا مولانا شہباز اصلاحیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور انھیں اپنا مربی سمجھتے تھے۔ اور تھے بھی وہ مولانا شہباز اصلاحیؒ کی طرح سادگی، جفاکشی، محنت، حق گوئی اور جرأت و بے باکی کا پیکر، دکھاوا، ٹیپ ٹاپ اور کروفر سے دور درویش صفت مرد قلندر، ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی، نرم خوئی، محبت اور حسن سلوک کا پیکر۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

ان کا حال یہ نہیں تھا کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ہمارے نزدیک بڑے قیمتی انسان، سادہ فطرت، پاکباز، منکسر المزاج، مردم ساز شخصیت کے حامل تھے۔ ہمارے درمیان سے ان کا اٹھ جانا ایک بڑا خسارہ ہے جس کی ٹیس عرصہ تک محسوس کی جائے گی۔ لیکن مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ، ہم خدا کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ وہ اپنے حصہ کا کام کر کے خدا کے حضور پہنچ گئے۔ ہم سب ابھی امتحان ہال میں اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ لیکن اس امتحان کی ایک حد اور اس کا ایک وقت مقرر ہے جس سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے، ہمیں بھی اپنے وقت موعود پر اس کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔ ہمیں اس کی فکر ہونی چاہیے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ علم و معرفت اور مردم سازی کا جو چراغ انھوں نے جلایا ہے اس کی لو میں اضافہ کرے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے، ان کا کفیل ہو اور ہمارا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

محمد مصطفی علی سروری
اسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ ترسیل عامہ وصحافت،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مرحوم اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن وہ مسائل اور چیلنجز بدستور برقرار ہیں بلکہ ان کی نوعیت مزید سنگین شکل اختیار کرگئی جن کا مقابلہ کرنے اور جن سے بچاؤ کے لیے مولانا محترم نے اپنی ساری زندگی تلقین کی، ترغیب دی اور تحریک چلائی۔

یوں تو شہر حیدرآباد اور ریاست آندھرا پردیش میں ایسی کئی شخصیات گزری ہیں اور موجود ہیں جنھوں نے بیرون شہر، بیرونِ ریاست سے آکر یہاں دینی تعلیم کے مراکز اور اسلامی مدارس کا آغاز کیا۔ مدارس بھی خوب پھلے پھولے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ان ذمہ داران نے ترقی کی، مال، جائیداد اور اثاثے کھڑے کیے یہاں تک کہ جب بعض مدارس کے ذمہ داران اس دارِفانی سے کوچ کر گئے تو ان کے ورثا میں ان کے اثاثوں کو لے کر اختلافات اٹھے، عدالتی کشاکش کی بھی نوبت آئی۔

لیکن مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت ایسی کسی طرح کی بیماریوں سے پاک تھی، آپ کا ظاہر و باطن ایک رہا۔ حالانکہ مولانا محترم سے میری شخصی ملاقاتیں چند ایک رہیں، لیکن مولانا محترم کے بارے میں پڑھنے سننے اور غور کرنے کے جتنے کچھ بھی مواقع میسر آئے تو مولانا کی شخصیت ان سب روایاتی مدارس کے ذمہ داران سے قطعی مختلف نظر آتی گئی۔

تحریک تحفظ شعائر اسلام کے سرپرست کی حیثیت سے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت دورِ

حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کی ہر طرح سے رہبری اور رہنمائی کرتی رہی۔ مولانا کے مدارس سے فارغ طالبات جب عصری تعلیم کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترسیل عامہ وصحافت میں داخل ہوئیں تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مولانا محترم خواتین اور لڑکیوں کو کس طرح مضبوط بنیادوں پر دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہے ہیں کہ وہاں کی فارغ طالبات جب عصری تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا رخ کر رہی ہیں تو یہاں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا کا مشن آگے بھی جاری رہے گا۔

مسلمانانِ ہند کو درپیش سیاسی دینی مسائل کو حل کرنے کے میدان میں مولانا محترم کی کمی کو عرصہ دراز تک محسوس کیا جائے گا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مولانا محترم کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے شاگردوں و متعلقین کو آپ کے چھوڑے ہوئے مشن کو آگے بڑھانے میں استقامت نصیب فرمائے، آمین یا رب العالمین!

میرِ کارواں
مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحیؒ

احمد علی
مؤظف کیوریٹر،
سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مضمون نویسی آسان ہے اور وہ بھی کسی ایسی شخصیت پر جو ہمہ گیر اوصاف کی حامل ہو جیسے مبلغ، مصلح، منتظم و معلم۔ تقریباً ایک ہفتہ اسی فکر میں گزر گیا کہ کس موضوع یا پہلو پر قلم اٹھایا جائے۔ آخر کار راقم اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجتہد العصر مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحیؒ کی تدریسی و تنظیمی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی جائے۔ جو ملت اسلامیہ کے لیے انھوں نے انجام دی ہیں۔ اب اس موضوع سے متعلق نکات و یادیں میرے ذہن پر یلغار کرنے لگیں۔ ذہن کے پردے پر اس کے عکس گزرنے لگے یہی نہیں بلکہ ان کے اوصاف یہ اصرار کرنے لگے کہ پہلے مجھے قلمبند کرو۔ تب راقم نے یہ طے کیا کہ ان کے اوصاف کو تاریخ وار تحریر کروں، اس ابتدائیہ کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ قارئین کو ہند میں اسلام کی آمد اور مسلم قوم میں پیدا ہونے والی فرسودہ رسوم و رواج کا بھی جائزہ پیش کروں تا کہ لوگ اس تاریخ سے واقف ہو سکیں۔

فرمانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''لا نبی بعدی'' کے بعد صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے گروہ ہندوستان پہنچنے لگے چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد تک ایک اچھی خاصی تعداد میں مسلمان سندھ کے علاقہ میں آباد ہو چکے تھے اور اپنے قول و عمل کے ذریعہ دین حق کی تبلیغ کرنے لگے، اس طرح حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے حکم پر مہلب ابن کبیشہ ابی صفرہ کی قیادت میں ایک لشکر کابل کے راستہ ملتان میں داخل ہوا۔ بعد ازاں خلیفہ ولید کے عہد میں

محمد بن قاسمؒ ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقوں کو فتح کر کے چتوڑ اور گنگا تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔ مقامی لوگ ان کے قول و عمل سے بے حد متاثر ہوئے اور اسلامی تعلیمات قبول کرنے لگے۔ کیوں کہ سندھ میں تمیمی خاندان نے ۳۰۰ سال حکمرانی میں اپنی چھاپ چھوڑی تھی۔ اس طرح محمد بن قاسمؒ کی حکمرانی مکھران سے پنجاب تک وسیع ہوگئی۔ محمد بن قاسمؒ نے دیبل کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جس میں اسلامی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا۔

جنوبی ہند کی موجودہ ریاست کیرالہ میں ضلع کولم کے مقام کوڈنگلور پر ایک چھوٹی سی سلطنت تھی اس کے حکمران چیرامن نے رسول اکرمؐ کے بعثت کی خبر پا کر فیضیاب ہونے کی غرض سے حجاز کا رخ کیا اور مشرف بہ اسلام ہو کر سمندری راستہ سے لوٹ رہا تھا کہ جاں بحق ہوگیا اس نے وصیت کی کہ کوڈنگلور میں مسجد تعمیر کی جائے چنانچہ یہ مسجد آج بھی موجود ہے۔

محمد بن قاسمؒ کے بعد رفتہ رفتہ مقبوضہ علاقے اغیار کے تسلط میں چلے گئے اور محمود غزنویؒ کی فتوحات کے بعد ۱۰۰۱ء میں قطب الدین ایبک کے عہد میں کئی ایک مکاتبِ اسلامیہ/ مساجد کا قیام عمل میں آیا کیونکہ دونوں مذاہب کے باہمی اختلاط سے مسلمان متاثر ہونے لگے تھے دیگر ابنائے وطن کی بیہودہ اور فرسودہ رسومات کو اختیار کرنے لگے تھے کہ اسلامی ثقافت اور تشخص ختم ہونے لگا چونکہ اصلاحِ قوم کی ذمہ داری اب اُمتِ مسلمہ پر ہی تھی اور ہر دور میں اللہ کے ایسے نیک بندے پیدا ہوتے رہے جو معاشرہ کی اصلاح خرافات و بدعات کے ازالہ کا بیڑہ اٹھاتے رہے چنانچہ شہنشاہ اکبر نے جب دینِ الٰہی کا فتنہ پیدا کیا تب مجدد الف ثانیؒ نے اس کو ردّ کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اس دور میں دیگر ادیان کی رسوم مسلم معاشرہ میں تیزی سے داخل ہوئیں اور مسلمان اسے مذہب کا لازم جزء سمجھ کر عمل پیرا ہوئے۔ پیدائش سے لے کر روزمرہ کے امور شادی بیاہ، حتیٰ کہ تجہیز و تکفین میں تک غیر اسلامی طریقوں کی تقلید کی جارہی تھی چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اصلاح و اجتہاد کا درس دیا۔ مابعد مفکرین قوم نے مکاتب و مدارس اور جامعات کا قیام عمل میں لایا۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے سہارنپور میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام ہوا، اس طرح ملک کے مختلف حصوں میں مکاتیب و مدارس قائم ہوتے گئے۔

اعظم گڑھ کی سرزمین جہاں علامہ شبلیؒ اور سلیمان ندویؒ جیسی شخصیات پیدا ہوئیں۔ اسی سرزمین میں ۱۹۳۴ء میں تحریک اسلامی کے اہم رہنما مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحی کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے مدرسۃ الاصلاح میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اور مولانا ابواللیث اصلاحیؒ صاحبان سے کسب فیض کیا۔ ان کی تنظیمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ذمہ داران مدرسہ ہذا نے دارالاقامہ کے نگراں کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں۔ موصوف نے بحسن و خوبی اسے انجام دیتے ہوئے دارالمصنّفین سے بھی استفادہ کیا۔ وہ حریت پسند شخصیت کے

حامل تھے۔ ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نظریات پر عمل پیرا رہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری ان کا شیوہ رہا، ریاکاری سے اجتناب کرتے، مولانا مودودی صاحبؒ کی تصانیف ان کے لیے مشعل راہ تھیں۔

۱۹۵۶ء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہجرت کی تکمیل کے لیے بنارس پہنچے اور مظہر العلوم میں شرعِ دین متین کی اشاعت انجام دی اور مظہر العلوم کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے گیان واپی مسجد کی امامت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ ان کی تدریسی اور تنظیمی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ داران نے ۱۹۷۰ء میں انھیں صدارت کی پیش کش کی۔ موصوف نے اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے اس مدرسہ کی ترقی کے لیے کئی نمایاں کام انجام دیئے۔ موصوف کے ایسے ہی کارہائے نمایاں کے سبب جماعتِ اسلامی آندھراپردیش نے موصوف کو جنوبی ہند کے ضلع کریم نگر میں جامعہ دارالہدیٰ کی تدریس کی ذمہ داری سونپی، پھر جب جامعہ حیدرآباد منتقل ہوا تو موصوف بھی حیدرآباد تشریف لے آئے۔ اس وقت حیدرآباد میں عقائد صحیحہ کے دو مدارس کام کرتے تھے ایک تو مجلس دعوۃ الحق ہردوئی کے تحت مدرسہ فیض العلوم جہاں حفظ قرآن کا نظم تھا، دوسرا دارالعلوم الرحمانیہ جہاں درسِ نظامی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ موصوف تدریسی اور تنظیمی امور میں وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں جامعہ دارالہدیٰ کی تعمیر وترقی کی راہ میں وقف کردیں۔ الحمدللہ اس وقت آپ کو عبدالرزاق لطیفی صاحب کی سرپرستی اور ڈاکٹر بشیر صاحب، جناب عباداللہ صاحب، ایڈوکیٹ عبدالباری صاحب اور جناب مرتضیٰ صاحب وغیرہ جیسے مخلصان کارکا ساتھ حاصل رہا، جس کی وجہ سے جامعہ دارالہدیٰ ایک اعلیٰ معیاری دینی درسگاہ کی حیثیت سے مشہور و معروف اور مقبول ہوگیا۔

حیدرآباد ہجرت کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم معاشرہ میں اسلامی ثقافت ختم ہورہی ہے، اغیار کی رسومات اور بدعات کو شریعت سمجھ کر لوگ عمل پیرا ہیں۔ موصوف چونکہ قوم کے ایک اچھے نباض تھے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان فرسودہ رسومات اور بدعات کا ازالہ اسی وقت ممکن ہے جب لڑکیوں اور خواتین کو حقیقی اسلامی تعلیمات سے روشناس کیا جائے کیونکہ ایک لڑکی کل ماں ہوگی اور بچے کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتا ہے۔ صالح معاشرہ کی تشکیل کے لیے لازمی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک جامعہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اللہ رب العزت نے ان کے نیک ارادے کو عملی شکل دی اور سعید آباد میں جامعۃ البنات کا قیام عمل میں آیا اور یہ ننھا سا پودا مختصر سے عرصے میں ایک سایہ دار درخت بن گیا، جہاں دختران ملت زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہونے لگیں، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بساط الٹ گئی، مہرے تتر بتر ہونے لگے اور جامعۃ البنات اقتدار کی کشاکش میں دو حصوں میں

منقسم ہوگیا۔ مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحیؒ نے جامعہ کی ساکھ کو بچانے، اس کی بقاء کا بیڑہ اٹھایا، نامساعد حالات کے باوجود بفضل تعالیٰ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک پیٹ کے محلہ میں از سرنو جامعۃ البنات الاصلاحیۃ قائم کیا۔ اور مختصر سے عرصے میں ہی یہ جامعہ پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی کارکردگی انجام دینے لگا۔ موصوف حساس طبیعت کے حامل تھے، احساسِ ذمہ داری ان کی گھٹی میں پڑا تھا جب کسی ذمہ داری کو قبول کرتے تو تندہی کے ساتھ مکمل کرتے، بفضل خدا ان کی کاوشوں سے جامعۃ البنات الاصلاحیۃ شہر میں خواتین اور لڑکیوں کی اسلامی تعلیم کا ایک حقیقی مرکز بن گیا ہے۔

ملّت کے حساس مسائل جیسے بابری مسجد، یکساں سول کوڈ، شریعت میں مداخلت اور گیان واپی مسجد پر وہ بے چین رہتے۔ گیان واپی مسجد سے تو موصوف کی وابستگی عرصہ دراز سے تھی اور ان کی وفات سے عین قبل یہ مسئلہ ایک تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اللہ رب العزت اس کا تصفیہ مسلمانوں کے حق میں فرمائے۔

موصوف قول وفعل کے پکے اور اصولی انسان تھے، عادات واطوار ایسے تھے کہ شاید ہی کسی میں نظر آئیں۔ صاف سیدھی زندگی گزارتے تھے، ریا کاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ان کی دینی حمیت ولگن طلبہ کے آتشِ ذوق کو بھڑکاتی اور انھیں رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کی راہ دکھاتی۔ موصوف کے عزائم اور حوصلے نوجوانوں میں جوش وجذبہ پیدا کرتے۔ موصوف خالی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وقت کے ایک ایک لمحے کو بامقصد اور کارآمد بناتے تھے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے ایک طویل عرصہ نونہالانِ ملت کی آبیاری کی، ۲۰۲۲ء میں غریقِ رحمت ہوئے، اب ان کی صاحبزادی ظل ہما سلمہا جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کی زمام سنبھالے ہوئے ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ انھیں کما حقہ اہتمام کی قوت عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ.

مولانا اصلاحیؒ کے ساتھ ایک ملاقات

مولانا محمد مصدق القاسمی
صدر دعوہ اسلامک اکیڈمی،
کرما گوڑہ، سعید آباد، حیدرآباد
و سکریٹری سٹی جمعیۃ علماء ہند

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس دنیائے فانی میں جس کسی نے آنکھ کھولی ایک دن ضرور دارِ ابد جانے کے لیے وہ بند بھی ہوگی۔ ''موت آئی گر حیات گئی'' کے مصداق ہر دن ہزاروں اس جہاں میں پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح ہزاروں دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں؛ لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے جانے پر سینکڑوں سوگوار ہی نہیں بلکہ ان کی علمی زندگی سے فائدہ اٹھانے والے بڑے مضطرب اور بے چین بھی ہو جاتے ہیں، ایسے ہی خاص بندوں اور شخصیتوں میں سے حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ بھی تھے۔

بندہ نے انہیں جب بھی دیکھا طبیعت میں انتہائی سادگی، نرم مزاجی، انداز پُر وقار اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا۔ مولانا مرحوم الحمدللہ نرم مزاجی اور نرم خوئی سے متصف تھے، نرم مزاجی کو حدیث پاک میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا: امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تم کو نہ بتلاؤں؟ وہ شخص کون ہے؟ جو آگ پر حرام ہو اور جس پر آگ حرام ہوگی؟ تو سنو! دوزخ کی آگ اس شخص پر حرام ہوگی، جو نرم مزاج، نرم طبیعت، لوگوں سے نزدیک اور نرم خو ہو۔''

مولانا مرحوم میں جہاں گہرا علم پنہاں تھا، وہیں طبیعت میں بلند حوصلگی، صبر واستقامت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، انہیں سخت سے سخت حالات و آزمائشوں میں پہاڑ جیسا دل، رب کریم نے عطا فرمایا تھا۔

ان کے ساتھ میرا کوئی قریبی تعلق نہ تھا اور نہ ہی آنا جانا تھا؛ لیکن ان کی شخصیت سے ضرور باخبر تھا، صرف ایک دفعہ مولانا مرحوم سے 'جامعۃ البنات سعید آباد' کسی کے داخلہ کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی اور اسی وقت کچھ دیر بیٹھ کر دینی، سماجی اور ادارہ سے متعلق گفتگو ہوئی، دورانِ گفتگو مدارس میں تعلیمی انحطاط پر بڑے دکھ کا اظہار کررہے تھے، بطور خاص نحو، صرف کے سلسلہ میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ان کے اس احساس سے اندازہ ہوا کہ مولانا دینی علوم اور نظامِ تعلیم اور مدارس کی علمی تنزلی کو دور کرنے کی فکر میں کتنے سرگرداں ہیں!

اس ایک ملاقات نے مولانا کے علمی رتبہ ومقام کو دل میں پیوست کر دیا، اس وقت سے زبان ان کی تعریف کرتی رہی، جس وقت واٹس ایپ پر ان کی رحلت کی اطلاع ملی، ان کی ملاقات کا وہ دن یاد آ گیا اور طبیعت نے تمام مصروفیات کو ختم کر کے اس خدا رسیدہ عالم باکمال کے جنازہ میں شرکت کو ضروری سمجھا اور الحمدللہ شرکت اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کا موقع فراہم ہوا۔ لوگوں کی بڑی تعداد کی شرکت سے مولانا کی مقبولیت کا اندازہ بھی ہوا۔

برادرِ محترم مولانا محمد جاوید اختر صاحب قاسمی (استاذ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ) کی توجہ دہانی پر دلی جذبات سے بھری یہ چند سطریں سپرد قرطاس ہوسکیں۔ اللہ مولانا مرحوم کو ان کے دینی کاموں کا شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے اور جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرے اور ان کے قائم کردہ جامعہ کو ترقیات سے نوازے۔ (آمین)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
علم و عمل کا ایک روشن چراغ

مولانا ارشد مدنی اعظمی
مدرس مظہر العلوم، بنارس

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا ذکر خیر احقر نے آج سے چالیس بیالیس سال پہلے جامعہ مظہر العلوم بنارس میں پہلی بار اُس وقت سنا جب ۱۹۸۰ء میں احقر کا جامعہ سے تدریسی تعلق قائم ہوا، اور جس کا سلسلہ ابتدائی چند سالوں کے استثناء کے ساتھ بحمدللہ تادم تحریر جاری ہے۔ جامعہ مظہر العلوم کے سابق اساتذہ و مدرسین میں سے جن بزرگوں کا ذکرِ خیر اساتذہ کی مجلسوں میں اکثر زبانوں پر آجاتا تھا ان میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی اور مولانا ضیاء الحسن مئوی رحمہا اللہ کے نام سرفہرست ہیں۔

جامعہ کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا عبدالمغنی مظہری، گھوسویؒ، جن کی صدارت کا زمانہ بہت طویل رہا، اور جو اپنی مخلصانہ خدمات کے لیے آج بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ کے زمانہ مظہر العلوم کے اولین شاگردوں میں سے تھے اور اکثر بڑی محبت وعظمت سے ان کا ذکر خیر فرماتے۔ ان کی تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں کو سراہتے۔ مولانا مرحوم کے متعدد مقامی تلامذہ کی زبانوں سے بھی ان کا تذکرہ بار بار سننے کو ملا جو یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ مولانا مرحوم کا جامعہ مظہر العلوم میں سولہ سالہ زمانہ تدریس (جس کا بیشتر حصہ انہوں نے صدر مدرس کی حیثیت سے گزارا)، تعلیم وتربیت کی سرگرمیوں سے معمور تھا، اور انہوں نے اپنے

شاگردوں کے دل ودماغ پر گہرے نقوش ثبت کئے تھے۔

یقیناً سولہ سال کی مدت تدریس میں مولانا مرحوم سے پڑھنے والے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہوگی، لیکن جن شاگردوں کو احقر اچھی طرح جانتا ہے ان میں مرحومین میں سے حضرت مولانا عبدالمغنی مظہریؒ کے علاوہ مولانا حیدرعلی مظہری بنارسیؒ مدرس ونائب مفتی جامعہ مظہرالعلوم بنارس، مولانا الطاف الرحمن مظہری گھوسویؒ سابق صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم گھوسی، مولانا عبدالقیوم مظہری بنارسیؒ سابق ناظم انتظامیہ جامعہ مظہر العلوم، مولانا سراج احمد قاسمی بنارسیؒ سابق استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور مولانا عبدالجبار مظہری بنارسیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا مرحومؒ سے تلمذ کی نسبت رکھنے والے وہ حضرات جو ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں، اللہ ان کو سلامت رکھے، ان میں حضرت مولانا عبدالباقی صاحب مدظلہ (دارانگر بنارس) سابق ناظم اعلیٰ جامعہ مظہرالعلوم بنارس، مولانا محمد شریف صاحب مظہری بنارسی، مولانا محمد صابر فلاحی صاحب، رکنِ شوریٰ جماعت اسلامی اترپردیش، مولانا افتخار احمد مظہری استاذ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، مولانا نعیم الدین اصلاحی استاذ تفسیر جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اور مولانا امین الدین مظہری سابق شیخ الحدیث مدرسہ دارالعلوم حسینیہ، چلّہ، امروہہ کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔

نیز مولانا مرحوم کے شاگردوں میں دو اہم شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ایک مولانا مفتی نیاز احمد بنارسی، امام وخطیب جمعہ مسجد جامعہ مظہرالعلوم بنارس، جو ایک طویل عرصہ تک جامعہ مظہرالعلوم بنارس کے مدرس، مفتی اور ذمہ دار محکمہ شرعیہ کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ دوسرے مولانا رفیق احمد مظہری، بنارسی، جو جامعہ کے قدیم ترین اساتذہ میں سے ہیں اور اس وقت بھی شعبہ عربی نسواں میں صحیح بخاری جلد ثانی، صحیح مسلم اور ہدایہ اول وغیرہ پڑھا رہے ہیں۔

ایک اور نام مولانا ابوالمحمود مظہری بنارسی مرحوم کا ہے، جو جامعہ حمیدیہ رضویہ مدنپورہ بنارس کے پرنسپل اور شہر کے معروف علماء میں سے تھے۔ مسلک کے اختلاف کے باوجود مولانا مرحوم کے بے حد معتقد ومداح اور ان کے علم وفضل واخلاص کے معترف تھے۔ مولانا مرحوم کی رہنمائی میں انہوں نے متن عقائد نسفیہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو اس وقت طبع بھی ہوا تھا۔

مولانا مرحوم کا غائبانہ ذکر خیر سن سن کر نہاں خانۂ دل میں ان کی عقیدت ومحبت گھر کر چکی تھی، لیکن ملاقات کی سعادت ایک مدت کے بعد غالباً ۲۰۰۰ء میں اس وقت حاصل ہوئی جب مولانا حیدرآباد سے اپنے وطن جاتے ہوئے یا واپسی میں ایک دو دن کے لیے جامعہ مظہرالعلوم میں تشریف لائے تھے۔ اس ملاقات نے محبت

وعقیدت کے نقش کو اور گہرا کر دیا۔ مولانا کی سادگی، تواضع و بے نفسی، شفقت ومحبت، عالمانہ وقار، اور ان کا دلنواز تبسم ہمیشہ کے لئے لوحِ دل پر مرتسم ہو گیا۔

مولانا سے دوبارہ ملاقات ۲۰۰۵ء یا ۲۰۰۶ء میں جامعۃ البنات حیدرآباد میں ہوئی اور اس کا سلسلہ تقریباً ایک ماہ تک رہا، جس کا باعث یہ ہوا کہ میرے ہم وطن عزیز دوست، رفیق درس مولانا محمد سہیل معروفی فاضل ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ نے جو جامعۃ البنات حیدرآباد میں استاذ تھے، مجھ سے اصرار کیا کہ میں ماہ شعبان میں حیدرآباد آکر ان کی زیرِ درس کتابوں کے مقررہ نصاب کی تکمیل کرادوں، کیونکہ ان کو مولانا مرحوم کے ہمراہ کویت وغیرہ کا ضروری سفر درپیش ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے اسباق کی تکمیل کے بعد جامعہ مظہر العلوم کے ذمہ داران سے اجازت لے کر میں نے حیدرآباد کا سفر کیا اور اس طرح جامعۃ البنات کے پاکیزہ علمی ماحول میں رہ کر جامعہ کی ذہین و باشعور طالبات کو چند اسباق پڑھانے کا موقع ملا۔ (جو کتابیں میں نے پڑھائیں ان میں شرح ابن عقیل اور البلاغۃ الواضحۃ کا پڑھانا یاد ہے) یہ تجربہ میرے لیے مسرت بخش تھا، کیونکہ میں نے طالبات کے اندر طلبِ علم کا ذوق وشوق اور کچھ حاصل کرنے کی لگن دیکھی۔ ان میں کئی ایک کے سوالات سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف درسیات ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ وہ ملک کے حالات اور ان کے تقاضوں سے باخبر ہیں، عالمِ اسلام میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس علمی و دینی ماحول وفضا کا نتیجہ تھا جس کو بنانے میں مولانا مرحوم کی بافیض شخصیت اور ان کی مخلصانہ جدوجہد کا سب سے زیادہ دخل تھا۔

حیدرآباد میں میرا ایک مہینے سے کچھ کم ہی قیام رہا، اس عرصہ میں مولانا سے بار بار ملاقات ہوئی اور ان کو قریب سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ میرے نزدیک وہ علماء آخرت میں سے تھے۔ یہ علماء کی وہ جنس گراں مایہ ہے جو اس زمانے میں کمیاب ہوتی جارہی ہے۔ مولانا کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی رضا جوئی کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہر دشوار گذار گھاٹی کو عبور کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے، اور ہر قربانی کے لیے مستعد رہتے تھے۔ حق گوئی و بے باکی ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی۔ کوئی خوف یا طمع ان کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ ملت اسلامیہ کے مسائل زندگی بھر ان کی سوچ اور فکر کا محور رہے اور ان ہی موضوعات پر انہوں نے قلم بھی اٹھایا اور جو صحیح سمجھا اس کا برملا اظہار کیا، تنقید ومخالفت کی پرواہ نہیں کی۔

وہ بے حد خوش اخلاق اور بڑے دل کے مالک تھے۔ مخالفین سے خود ملنے جاتے اور ہنس کر ملتے۔ تعلقات

کو نبھانا اور باقی رکھنا ان کا مزاج تھا۔ جامعہ مظہر العلوم کی تدریس کے زمانے میں مولانا محمد احمد مظہری استاذ جامعہ مظہر العلوم کے والد حاجی نور الحق مرحوم (جو علماء سے تعلق ومحبت رکھنے میں معروف تھے) کے گھرانے سے مولانا کا گھریلو تعلق قائم ہوگیا تھا۔ آخر تک یہ تعلق قائم رہا اور اب تک ہے۔ مولانا عبدالمغنی صاحب مرحومؒ آخر عمر میں جب بیمار ہوئے اور بیماری لمبی ہوگئی تو مولانا حیدرآباد میں رہ کر ان کے حالات سے واقفیت رکھتے تھے اور وہاں سے مالی تعاون بھی بھیجا جسے مولانا عبدالمغنی صاحب نے قدرے تامل کے بعد مولانا کے جذبہ خلوص سے مجبور ہوکر قبول کیا۔

مولانا ایک بڑے عالم تھے۔ ان کا علم گہرا تھا۔ دعوتی وانتظامی ذمہ داریوں میں مشغول ہوجانے کے بعد اکثر لوگوں کی علمی ترقی رک جاتی ہے اور علم کا پہلو کمزور ہونے لگتا ہے، لیکن مولانا کا علم ہمیشہ تازہ اور کتابوں سے ان کا رشتہ قائم رہا۔ جامعہ مظہر العلوم میں تفسیر، اسرار شریعت، نحو وصرف وادب عربی کی کتابوں کے ساتھ حدیث کی کتابیں بھی ان کے زیر درس رہیں۔ مولانا کے ایک شاگرد کے بیان کے مطابق انہوں نے صحیح مسلم بھی پڑھائی ہے۔ اُن کے شاگرد اُن سے ہمیشہ مطمئن رہے، اور آج بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

مولانا کے علم کی گہرائی کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب انہوں نے جامعۃ البنات میں تعلیمی وقفہ کے درمیان جس میں اکثر ملاقات ہوتی تھی، ایک حدیث کے ایک جملہ کے بارے میں سوال کیا۔ یہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مشہور ومتفق علیہ حدیث تھی جو مشکوٰۃ شریف کتاب الایمان میں بھی ہے، اور جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک بار نبی کریم ﷺ عید کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ کو خیال ہوا کہ شاید عورتوں تک آپ کی آواز نہیں پہنچی، چنانچہ آپ عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے اور ان کو خصوصی خطاب اور وعظ ونصیحت سے سرفراز فرمایا۔ اس حدیث میں ایک جملہ "ما رأیت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن" آیا ہے، مولانا کا سوال من ناقصات عقل و دین کی نحوی ترکیب اور اس کے معنی مراد کے بارے میں تھا۔ درحقیقت اس مقام پر مجھے بھی اشکال پیش آچکا تھا، شارحین نے اس کا جواب دیا ہے اور اس کی ترکیب نحوی بھی بیان کی ہے لیکن کما حقہ تشفی نہیں ہوتی۔ میں نے جواب میں جو کچھ اس وقت مستحضر تھا پیش کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ مولانا میرے جواب سے کتنا مطمئن ہوئے لیکن مجھ کو مولانا کی دقت نظر اور ان کے گہرے مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔

مولانا کو اللہ نے ایک طویل عمر عطا فرمائی۔ وہ "خیر کم من طال عمرہ وحسن عملہ"

کے مصداق تھے۔ انہوں نے پوری زندگی دین کی خدمت، اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدو جہد اور حق کی نصرت وحمایت میں گزار دی۔ مصائب کے طوفان میں ثابت قدم رہے، آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور "قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حق تعالیٰ شانہ مولانا کی مغفرت فرمائے، ان کے اعمالِ صالحہ کو قبول فرمائے اور ان پر رحمتوں کی بارش برسائے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
فکرِ اسلامی کے ترجمان

مفتی حبیب الرحمن قاسمی
استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ شہر حیدر آباد میں لڑکیوں کی دینی تعلیم و تربیت کے عظیم ادارہ جامعۃ البنات حیدر آباد کے بانی و ناظم تھے، وہ ایک کامیاب مدرس، باکمال مصنف اور فکرِ اسلامی کے داعی تھے۔ ان کی زندگی صبر و استقامت کی ایک عظیم مثال ہے۔ فکرِ اسلامی کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔ اس راہ میں انہوں نے طرح طرح کے مصائب و تکالیف کا سامنا کیا، دنیا کی چمک دمک ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکی، سادگی، قناعت اور فکرِ آخرت ہی ان کا سرمایہ تھا۔

بندۂ ناچیز حیدر آباد کے علاقہ سعید آباد میں برسوں سے مقیم ہے، یہیں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بارہا ان سے دینی و علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی، خاص طور پر عالمِ اسلام میں نفاذ شریعت اور دنیا میں اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت مسلمہ کی مظلومیت و بے بسی جیسی صورت حال پر بارہا ان سے گفتگو ہوتی۔ ان کی گفتگو سے یہ احساس ہوتا کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے دینی غیرت و حمیت کی بیش بہا دولت سے مالا مال کیا تھا، ایک ایسے دور میں جب دنیا کی مادی چمک دمک باصلاحیت علماء و فضلاء کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور باطل قوتیں امت کے خواص کو ڈر اور خوف کے ذریعہ اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کرتی رہی ہیں، مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے اپنی دینی غیرت و حمیت کے ذریعہ سخت آزمائشی حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور

ہمیشہ صبر واستقامت کی راہ پر چلے، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین!

مولانا اصلاحی صاحبؒ جامعہ میں نظامت کی ذمہ داریاں بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے، اپنی عمر کے آخری چند برس قبل تک جامعۃ البنات حیدرآباد اور آخری سانس تک جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں بہ حیثیت ناظم اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ دینی ادارہ میں نظامت کا کام بڑی عرق ریزی کا متقاضی ہوتا ہے، مولانا بڑے صبر وضبط اور انتظامی مہارت کے ساتھ نظامت کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ مولانا اصلاحی صاحبؒ جامعات کی نظامت کرتے ہوئے دینی علوم وفنون کی تدریس زندگی بھر بڑی مہارت سے انجام دیتے رہے، تدریسی امور کی نگرانی بہت اہتمام سے فرمایا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے دور نظامت میں تعلیمی معیار کافی بلند تھا۔ شہر حیدرآباد میں اور صوبہ آندھرا و تلنگانہ اور دیگر ریاستوں سے بھی طالبات یہاں حصول علم کے لئے رجوع ہوتیں، آج دونوں جامعات سے فارغ سینکڑوں طالبات شہر حیدرآباد اور تلنگانہ و آندھرا و مہاراشٹرا وغیرہ میں دینی تعلیم وتربیت سے وابستہ ہیں، اور دینی اداروں میں تدریسی خدمات بڑی مہارت اور ذوق کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا اصلاحی صاحبؒ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا خاص ہنر عطا فرمایا تھا، وہ طالبات کے اندر تعلیمی لیاقت کے ساتھ ساتھ دعوتی وفکری رجحان بھی پیدا کرتے تھے، تاکہ تعلیم وتربیت کے مقاصد پورے ہوں اور طالبات تعلیمی مقاصد سے آگاہ رہیں اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے اہم کردار ادا کرنے والی بنیں۔ طالبات کے اندر علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ دعوتی رجحان بھی ہو تو وہ نہ صرف اپنے گھر اور خاندان کے اندر دینی شعور پیدا کریں گی بلکہ معاشرہ کی اصلاح میں بھی وہ اہم کردار ادا کریں گی، چنانچہ جن طالبات نے مولانا اصلاحی صاحبؒ سے تعلیم وتربیت کے شعبہ میں کسبِ فیض کیا ہے انہوں نے اپنے خاندان اور گھر کے اندر دینی شعور کو کافی حد تک بلند کیا ہے۔

مولانا اصلاحی صاحبؒ دعوتی رجحان رکھتے تھے اور فکری تربیت کا ذوق بھی انہیں حاصل تھا، اس لئے ان سے دعوتی، فکری اور تعلیمی استفادہ کنندگان میں ایک بڑی تعداد عصری تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے امت کے نوجوانوں کی بھی ہے، وہ مولانا کے دروس قرآن میں دلچسپی سے شریک رہتے، مولانا امت مسلمہ کی سربلندی اور دین وشریعت کے نفاذ کے بارے میں عالم اسلام کی صورتحال سے لوگوں کو آگاہ کیا کرتے تھے۔

علماء دین کی اہم خصوصیات وامتیازات میں سے یہ ہے کہ ایک عالم دین فکر اسلامی کا ترجمان و پاسبان ہو، خصوصاً ایک ایسے دور میں جب الحاد ولادینیت اور مغربی تہذیب عالم اسلام میں اپنے پنجے گاڑ رہی ہو اور جدید استشراق

نئے فارغین مدارس کو مادی حرص وطمع کا شکار بنا رہا ہو، مولانا اصلاحی صاحبؒ میں یہ عالمانہ صفت پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ لادینیت کے ماحول میں فکر اسلامی کے ترجمان نظر آتے ہیں، الحادی قوتوں کے سامنے وہ سینہ سپر نظر آتے ہیں، دین میں مداہنت کی کوئی صورت انہیں گوارہ نہیں، صبر واستقامت کی راہ میں انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں، راہ حق میں ان کے جواں سال فرزند کی شہادت بھی ہوئی، اس پر وہ صابر وشاکر رہے۔ اللہ تعالیٰ راہِ حق میں ان کی اور ان کے اہلِ خانہ کی قربانیاں قبول فرمائے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے فکر اسلامی کی ترجمانی اور اس کی اشاعت کے لئے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جس طرح وہ اپنی طبیعت میں کم گو واقع ہوئے تھے، بہت مختصر اور جامع گفتگو کیا کرتے تھے، اکثر خاموش لیکن غلبۂ دین کے لئے متفکر نظر آتے تھے، اسی طرح ان کی علمی تحریروں میں اختصار اور جامعیت نظر آتی ہے۔ دینی فکری موضوعات پر جیسے لا اکراہ فی الدین، بابری مسجد کا قضیہ، دارالحرب اور دارالاسلام جیسے موضوعات پر متعدد تحریریں طبع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں، اور علمی حلقوں میں انہیں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ آج کا دور ایسے علماء کی قلت محسوس کر رہا ہے جو "لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" ہوں یعنی جو صرف اللہ سے ڈرنے والے ہوں، اللہ کے سوا کسی کا خوف ان کے دل میں نہ ہو، مولانا اصلاحی صاحبؒ یقیناً یہ شان رکھتے تھے۔ ان کو دنیاوی جاہ و منصب اور شہرت سے کوئی غرض نہ تھی وہ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے، اس لئے دنیا سے بے خوف زندگی گزارتے تھے۔ مولانا اصلاحی صاحبؒ نے نئی نسل کے نوجوانوں کی جو ٹیم تیار کی ہے ان سے قوی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مولانا اصلاحی صاحبؒ کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں ایمانی قوتوں اور جذبوں کے ساتھ روبہ عمل لائیں گے اور فکر اسلامی کی ترجمانی اور غلبۂ دین کا مشن جاری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ مولانا اصلاحی صاحبؒ کے حسنات کو قبول فرمائے، لغزشوں سے درگذر فرمائے اور صبر واستقامت کی راہ میں ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔

آمین یارب العالمین۔

تحریکِ اِسلامی کا عظیم مردِ مجاہد

ابوالاعلیٰ سید سبحانی
صدر انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم تحریک اسلامی ہند کے ایک عظیم مرد مجاہد تھے، مولانا مرحوم ایک زبردست فکری شخصیت کے حامل تھے اور قرآن مجید پر گہری نظر رکھنے والے عالم دین تھے۔

مولانا کے یہاں علمی اور عملی سرگرمیوں کا بہت ہی حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ مولانا علمی دنیا میں جہاں بہت ہی اونچا مقام رکھتے تھے وہیں عملی میدان میں بھی ایک نمایاں، سرگرم اور متحرک رول رکھتے تھے۔

مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو بہت ہی دل آویز ہے:

مولانا ایک زمانے تک جماعت اسلامی ہند کے ایک سرگرم رکن رہے اور جماعت کی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور جماعت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ جہاں جہاں اور جس جس انداز سے تحریک کی خدمت کا موقع ملا، مولانا نے تحریک سے وابستگی کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ بنارس میں رہے تو وہاں تحریکی ذمہ داریاں ادا کیں، سرائے میر رہے تو وہاں بھی جماعت کے ذمہ دار بنائے گئے، حیدرآباد منتقل ہوئے تو وہاں بھی جماعت کی مقامی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی اور آپ ایک عرصے تک اس کو انجام دیتے رہے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر 2001 کے بعد تحریک کے ساتھ رکنیت کا تعلق باقی نہیں رہ سکا، جس کا مولانا کو شدید قلق بھی رہا۔ اور کیوں نہ قلق رہتا کہ تاسیس کے وقت تحریک سے شعوری طور پر وابستہ ہوئے تھے اور زائد از پانچ دہائیوں تک تن من دھن سے تحریک کی خدمت کے لیے خود کو یکسو کر رکھا تھا!

مولانا طالبات کے ایک مدرسے کے بانی تھے، مولانا اس مدرسے کو ایک با مقصد، مثالی اور معیاری مدرسہ

بنانے کا خواب رکھتے تھے۔ مولانا کے مدرسے سے فارغ طالبات آج ملک کی مختلف ریاستوں میں دینی مشن کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور مولانا کے لیے صدقۂ جاریہ بنی ہوئی ہیں۔ مدرسے کی فارغات مولانا سے ایک عجیب وغریب روحانی اور قلبی تعلق رکھتی ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کرتی رہتی ہیں۔

مولانا ایک عظیم فکری رہنما تھے، مولانا تحریکی فکر کے ایک مخصوص رجحان کی نمائندگی کرتے تھے اور بہت ہی مضبوط نمائندگی کرتے تھے۔ مولانا کی فکر اور مولانا کی تحریروں کے اپنے اثرات تھے جو بالخصوص نوجوانوں پر دیکھے جاسکتے تھے۔ اس فکر اور اس رجحان سے اتفاق کرنے والے اتفاق کرتے تھے اور اختلاف رکھنے والے اختلاف رکھتے تھے، لیکن اس بات سے ہر کسی کو اتفاق ہوگا کہ مولانا نے جس فکر کو سوچ سمجھ کر کئی دہائیوں قبل اختیار کیا تھا، اس فکر پر تادم زیست مضبوطی سے جمے رہے، خطرناک سے خطرناک حالات بھی مولانا کے پائے ثبات کو متزلزل نہ کرسکے۔

مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے مایہ ناز فرزندوں میں شمار ہوتے تھے، اور مدرسہ اور اس کی شخصیات سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سیمینار کے لیے ٹکٹ کی بکنگ نہیں ہوسکی تو مولانا جنرل کلاس سے ہی حیدرآباد سے اعظم گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ یہ مادر علمی اور اپنی شخصیات سے گہری محبت اور تعلق کی ایک بہت ہی اعلیٰ مثال ہے۔

مولانا جامعۃ الفلاح سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے، شاید اس کی وجہ جامعۃ الفلاح کی تحریکی نسبت تھی۔ جامعۃ الفلاح میں داخلی سیاست اور وہاں موجود انتشار پر مولانا کافی بے چین رہا کرتے تھے۔ مولانا جامعہ کو ایک خالص علمی وتحریکی درسگاہ کے طور پر آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

اصلاح یا فلاح سے متعلق افراد جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بالکل ایسا محسوس کرتے کہ اپنے ایک سرپرست اور ایک مربی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، بہت ہی شفقت، بہت ہی محبت، اور بہت ہی دلنوازی کا معاملہ کرتے۔ مہمان نوازی بھی مولانا کی خوب ہوتی تھی، اس میں کچھ مولانا کے مزاج کا دخل تھا اور کچھ مولانا کے خاندانی کلچر اور روایات کا حصہ تھا۔ گھر پر جو بھی آیا اس کی خاطر خواہ ضیافت ہوتی تھی۔

ملت کا شیرازہ متحد رہے اور صلاحیتیں مثبت رخ پر لگی رہیں، اس پر مولانا خاص توجہ دیتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مولانا حیدرآباد میں طالبات کا مدرسہ چلاتے تھے۔ یہ مدرسہ مولانا نے خون پسینے سے سینچا تھا۔ مولانا کے لیے یہ مدرسہ خوابوں کی ایک دنیا سے کم نہ تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا کے قائم کردہ مدرسے پر کچھ دوسرے لوگ قابض ہوگئے، نہ صرف قابض ہوئے بلکہ بہت سی ناروا حرکتیں بھی کی گئیں،

اور صحیح معنوں میں کشمکش کی ایک عجیب وغریب صورت بننے لگی، مولانا نے اس وقت بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ تصادم اور کشمکش کے تمام امکانات کو کنارے لگادیا اور ایک دوسرے مدرسے کا آغاز کردیا اور اس مدرسے کے ذریعہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔

مولانا سے ہمارے تعلق کی نوعیت کچھ الگ ہی تھی۔ مولانا والد محترم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی حفظہ اللہ کے ایک بہت ہی مخلص اور بہت ہی عزیز دوست تھے۔ دونوں ہی بزرگ ایک دوسرے کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محترم کی ایک صاحبزادی کی شادی ہمارے پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر انیس فلاحی سے ہوئی، اس طرح ہماری قربت اور ہمارے گھریلو تعلق میں مزید اضافہ ہوگیا۔ حیدرآباد جب بھی جانا ہوتا تھا کوشش رہتی تھی کہ مولانا کی خدمت میں ضرور حاضری ہو، مولانا کی دعائیں حاصل کی جائیں اور مولانا کے تحریکی تجربات سے مستفید ہوا جائے۔

مولانا سے آخری ملاقات کورونا کی آمد سے کچھ قبل سی اے اے موومنٹ کے دوران ہوئی تھی۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ میں ایس آئی او دہلی کا صدر ہوں اور سی اے اے موومنٹ میں اپنی حد تک متحرک بھی ہوں تو فرمانے لگے، ''دیکھو؛ نوجوانوں کا اپنا مزاج اور ان کی اپنی سرگرمیاں ہوتی ہیں، بزرگوں کا اپنا مزاج اور ان کی اپنی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ تم لوگ نوجوان ہو نوجوانوں والی سرگرمیاں انجام دو، بزرگوں کو اپنا کام کرنے دو۔''

واقعہ یہ ہے کہ مولانا حقیقی معنوں میں ایک مرد مجاہد تھے، دین کے سچے علمبردار تھے، اور قرآن کے شیدائی تھے، اللہ رب العزت مولانا کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کو قبول فرمائے، آمین یارب العالمین!

جو جُھکا نہیں، جو بِکا نہیں

ڈاکٹر عین الحق قاسمی
سابق استاذ جامعۃ الفلاح و مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ

وہ بھولی بھالی صورت، گورا رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، میانہ سے کچھ زیادہ قد۔ کسا ہوا جسم، لباس سادہ، کرتا پائجامہ، سر پر اصلاحی ٹوپی۔ ایک عرصے تک کندھے میں لٹکتا ہوا کپڑے کا تھیلا۔ جسے اصلاحی پہچان بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر عالمانہ وقار اور سنجیدگی نمایاں، کچھ ایسے ہی تھے مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

وہ صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں بندی گھاٹ کی خاک سے اٹھے تھے۔ بندی گھاٹ جو قصبہ محمد آباد گوہنہ سے تقریباً سات کلومیٹر اتر پورب میں ٹونس ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہ غیور، صاف گو، صحیح العقیدہ اور جرأت مند کاشتکار مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس میں مولانا اصلاحی مرحوم کا خاندان بھی ایمانی غیرت سے سرشار رہا ہے۔ میں نے مولانا مرحوم کے والدمحترم کو زندگی کے آخری ایام میں جب وہ صاحبِ فراش تھے دیکھا تھا، وہ بابری مسجد کی شہادت پر کافی مضطرب اور مسلمانوں کی بے بسی پر ماتم کناں تھے۔

میں نے جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں تدریس کے دوران مولانا مرحوم کے بارے میں سنا اور جانا، وہ کبھی کبھی جامعۃ الفلاح آتے تو لوگوں کی زبانوں پر ان کے تذکرے اور چرچے ہوتے، پھر ان کی کچھ تحریریں پڑھیں تو مزید واقفیت حاصل ہوئی۔

ان کی فکر، ان کا کردار، ان کی حق گوئی و بے باکی، ان کی سادگی، ان کی بے لچک اور بے آمیز مجاہدانہ زندگی نے ان کی ایک الگ پہچان قائم کر دی تھی۔ وہ ہر رنگ میں ڈھلنے والے انسان نہیں تھے بلکہ ان کا اپنا ایک ہی

رنگ تھا۔ صبغۃ اللّٰہ (اللہ کا رنگ) اس کے علاوہ انھیں کوئی رنگ قبول نہیں تھا۔ بقول ایک بڑے عالم ''مولانا کے ہاں کبھی موسم بدلتا نہیں ہے، ہمیشہ ایک ہی موسم رہتا ہے۔'' اس طرح کے تبصروں کا ان کی صحت پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں تھا اور نہ ہی پڑا۔ وہ جس سوچ وفکر کے حامل تھے اس کا ساتھ دینا سب کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں انھیں غربت و اجنبیت گوارا تھی مگر حق گوئی و حق نویسی سے سمجھوتا گوارا نہ تھا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت میں اقبالؒ کے ''مردمومن'' کی جھلک ملتی ہے۔ وہ زبان وقلم کے ساتھ ساتھ کردار کے بھی غازی تھے۔ ان کے قول وعمل میں تضاد نہ تھا۔ وہ اخلاص فی الدین کی دولت سے مالا مال تھے۔ وہ جسے حق سمجھتے اس کا برملا اظہار فرماتے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں ادنیٰ مداہنت انھیں برداشت نہیں تھی۔ وہ اس شعر کی عملی تعبیر تھے:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مولانا مرحوم کو اپنے گاؤں بندی گھاٹ سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ آخر عمر تک حیدرآباد سے اپنے گاؤں آتے جاتے رہے۔ گاؤں کے لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لئے فکر مند رہتے۔ گاؤں سے متصل ٹونس ندی گزرتی ہے وہ گاؤں کی عورتوں کو بھی تیراکی سیکھنے پر ابھارتے۔ میں نے گاؤں کی مسجد میں ایک دو بار ان کی گفتگو سنی ہے۔ دھیما مگر بولڈ لہجہ۔ چھوٹے چھوٹے جملے۔ ایک بار وہ لوگوں سے اس طرح مخاطب تھے ''میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ چہرے نظر نہیں آرہے ہیں۔ وہ اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے جو لوگ موجود ہیں وہ اپنی فکر کریں۔''

دو تین ملاقاتوں کے بعد مولانا مرحوم مجھے پہچاننے لگے تھے۔ وہ جب اپنے گاؤں آتے تو ان کے گاؤں گھر کے لوگ مجھے مطلع کر دیتے اور میں ان سے ملنے پہنچ جاتا۔ اس دوران انھوں نے اپنے علاقے میں خاص طور سے محمد آباد گوہنہ میں لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے ایک معیاری مدرسہ قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ کچھ کوششیں بھی کیں۔ اس کے لئے ایک دو میٹنگیں بھی بلائیں جن میں میں بھی شامل تھا۔ اس کے لئے جناب عمیر صاحب جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں کی سرپرستی میں کئی بار سر جوڑ کر بیٹھا گیا مگر مولانا کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

مولانا مرحوم سے آخری ملاقات محمد آباد گوہنہ میں عزیزم غلمان سلمہ (پردھان) ابن عرفان احمد مرحوم کے گھر پر ہوئی۔ مولانا نے اشارہ سے مجھے قریب بلایا پھر دھیرے دھیرے وہاں موجود سبھی لوگوں سے مخاطب رہے۔ وہ فرما رہے تھے کہ: ''جس طرح آپ اپنے بال بچوں، کاروبار اور کھیتی باڑی وغیرہ کی فکر کرتے ہیں اسی طرح اپنے دین وملت کی فکر کیجیے۔'' مولانا مرحوم کے ذہن ودماغ پر اپنے دین وملت کی فکر غالب تھی۔ اسی فکر کو لے کر انھوں نے تحریریں لکھیں، تقریریں کیں، تدریسی کام بھی کیا، اور مسلم بچیوں کا مدرسہ کھول کر ان کی تعلیم و

تربیت کا انتظام کیا۔ انھوں نے تصنیف کتب کے ساتھ ساتھ تصنیف رجال بھی کیا۔ وہ تحریکی اور ملی سرگرمیوں میں برابر شامل رہے۔ جو کچھ کیا وہ سب ملی ضرورت کے لئے کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنوں سے زیادہ غیروں نے انہیں پہچانا۔ یہی وجہ ہے کہ:

ع ''وہ کھٹکتا تھا دلِ شیطاں میں کانٹے کی طرح''

مولانا مرحوم بڑے صبر آزما حالات سے گزرے، مگر کہیں بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ جرأت و بے باکی تو ان کی فطرت میں شامل تھی۔ انھوں نے بلاخوف لومۃ لائم اپنا کام جاری رکھا۔ اپنوں کی ایذا رسانیاں اور غیروں کے مظالم بھی سہے۔ وہ کسی خوف اور لالچ میں کبھی نہیں آئے، اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

ع ''نہ جھکے کبھی نہ بکے کبھی''۔

مولانا کی وفات کی خبر سن کر میرے دل سے یہ دعا نکلی:

اے غریب وطن اور غریبِ اسلام، ہند میں سرمایہ ملت کے نگہباں، داعی دین اور شہید حق! جا اور اپنے رب کے جوارِ رحمت میں آرام کر۔ دنیا تجھے بہت ڈھونڈے گی مگر کبھی نہ پائے گی، پھر رب کے فرمان کے مطابق: ''اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اِس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں''۔

(الفجر: ۲۷-۳۰)

آہ! ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ اور میرے تاثرات

مفتی محمد شوکت علی قاسمی
ناظم جامعہ دارالہدیٰ، وادیٔ ہدیٰ، حیدرآباد

موت اور زندگی نظامِ قدرت کا ایک حصہ ہے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مخصوص حکمت کے تحت ایک متعین مدت تک کے لیے اپنا کام کر رہی ہے جس طرح قوموں کے عروج و زوال کا وقت مقرر ہے، اسی طرح فرد کی موت کا بھی وقت مقرر ہے۔ یہاں کسی کو دوام و بقاء نہیں ہے۔ لیکن بعض شخصیات دنیائے فانی سے جانے کے بعد بھی اپنی خصوصیات و کمالات کی وجہ سے یاد کی جاتی ہیں ان ہی میں سے مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم بھی ہیں۔ جائے پیدائش اتر پردیش کا ایک علمی شہر اعظم گڑھ ہے مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کرنے کی مناسبت سے اصلاحی لکھتے تھے۔ ذاتی صفات و کمالات میں بے باکی، حق گوئی، حاضر جوابی، تواضع، انکساری، سادگی، دینی حمیت وغیرت سے سرشار تھے۔ شخصیت پر عالمانہ وفاضلانہ ومحققانہ رنگ تھا، تبحر علمی نے آپ کو علمی حلقے میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا، فن نحو وصرف میں ماہر تھے، صرفی ونحوی قواعد وتعلیلات طلباء وطالبات کو یاد کرانے کا منفرد انداز تھا۔ فن نحو وصرف کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا تدریس کا اچھا ملکہ تھا۔ تقریر آپ کی مختصر اور جامع ہوتی تھی، کم گو تھے لیکن گفتگو جامع کلمات سے کرتے، اندازِ تفہیم نرالا تھا۔

ملک وملت کے سلگتے ہوئے مسائل پر قلم اٹھاتے، سلیس اور مدلل وجرأت مندانہ مضامین لکھتے، کسی قسم کی مداہنت کو پسند نہ کرتے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ احساسِ ذمہ داری کا حال یہ تھا کہ اپنے ماتحت اساتذہ، معلّمات، طالبات اور ملازمین کا پورا خیال رکھتے۔ حاجات وضروریات انتظامیہ سے رجوع ہو کر مطالبہ

کر کے پوری کرانے کی کوشش کرتے، جس بات کو حق سمجھتے اس حق بات پر پوری قوت سے قائم رہتے۔ لوگ آپ کو متشدد سمجھنے لگتے لیکن آپ متشدد نہیں تھے۔ فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کو فرض عین سمجھتے اور عمل آوری کی پوری کوشش کرتے۔

راقم الحروف کو آپ سے بار بار ملنے کا موقع ملا۔ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، جامعۃ الشیخ المودودیؒ کے سالانہ جلسہ میں اور دیگر مقامات پر ہمیشہ خندہ پیشانی، شفقت ومحبت سے گفتگو فرماتے۔ چونکہ احقر کی خدمات جامعہ دارالہدیٰ میں جاری تھیں اور آپ بھی آندھرا پردیش حیدرآباد تشریف لانے کے بعد جامعہ دارالہدیٰ میں کافی دنوں تک علمی خدمات انجام دیتے رہے تھے اس لیے جامعہ کے احوال وکوائف کا تذکرہ کرتے، تعلیمی نصاب و تربیتی نظام کے بارے میں پوچھتے۔ شعبۂ عالمیت کے نصاب، طلبہ کی تعداد، اساتذہ کے احوال کے بارے میں دریافت کرتے اور اپنے سابقہ احوال سے واقف کراتے۔ ایک مرتبہ اپنی علالت کے دوران مولوی محمد شوکت صاحب استاذ جامعۃ الشیخ المودودیؒ سے کہا ''مجھے مفتی محمد شوکت علی قاسمی سے ملاقات کرنی ہے بلا کر لائیے''۔ مجھ احقر کو اطلاع ملی بلا تاخیر مولوی محمد شوکت کی رفاقت میں مولانا کے دولت خانہ سعید آباد پہنچا، عیادت کا شرف حاصل ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد جامعہ دارالہدیٰ کے بارے میں معلومات حاصل کیں، مولانا سے احقر کی یہ آخری ملاقات تھی۔

اللہ سے دعا ہے کہ مولانا کی علمی خدمات وعملی کاوشوں کو شرفِ قبول سے سرفراز فرمائے۔ آمین!

سرگزشت جادہ ومنزل
انعکاسات حلقۂ یاراں

میرا اندازِ پاسِ وفا یہ رہا
طاق دل پہ سدا
شوقِ جنت کی شمع فروزاں رہی
دل تو دل ہی تھا، زخم اس نے کھانے ہی تھے
روح لیکن مری پھر بھی شاداں رہی
میرے مالک نے مجھ کو بھری بزم میں
اس طرح سے چنا
غازیوں کی طویل ایک فہرست میں
فرطِ رحمت سے روشن نشاں کر دیا
حبِ احمد میں رطب اللسان کر دیا
پیکر خاک تھا، خاک میں جب ملا
رحمت حق تعالیٰ سے مسکن مرا آسماں ہو گیا
اک ستارہ تھا میں، کہکشاں ہو گیا۔

دوستو، غازیو! عشق کی ایک ہی جست میں
میں نے چودہ قرن کی مسافت کو طے اس طرح سے کیا
دل میں طائف کا منظر بسا جب لیا
خلق میرا نسیم سحر ہو گیا
اور بدر واحد کا سبق جب پڑھا
عزم قطرہ تھا میرا...... بحر ہو گیا
میں نے اسلاف کی ہر نشانی کے مٹنے کے اس دور میں
اجنبیت کے پرچم کو اونچا کیا
میں نے حق وصداقت کے روشن دیے
خون دل سے بھرے
دل وہ جس میں ہمیشہ سے چاہت رہی
ہر کسی کے لیے
لب وہ جن پر سدا مسکراہٹ رہی
ہر شناسا، ہر اک اجنبی کے لیے!
اس طرح بھی ہوا
حلقۂ دوستاں میں کسی طور بھی
وسعتِ قلب کی جب کمی ہو گئی
دامنِ دل وہاں اپنا پھیلا دیا
سب کو بتلا دیا
حق کی راہوں میں مرنا تو آسان ہے
جینا مشکل ہے، جی کر بھی دکھلا دیا!
میرے کردار کا، میرے اخلاص کا
ایک اک نقشِ پا، صدقۂ جاریہ
عشق راہوں میں یوں جاوداں ہو گیا
اک ستارہ تھا میں، کہکشاں ہو گیا

ساتھیو! زخم سینے پہ کھاتے چلو
رب سے ملنا ہے تو مسکراتے چلو!
حبِّ احمدؐ کی شمع جلاتے چلو
تم نے سیکھا ہے جو کچھ سکھاتے چلو

☆☆☆

آہ! مولانا اصلاحیؒ صاحب

ضیاءالدین صدیقی
امیر وحدتِ اسلامی ہند

اتنی آہستگی سے بھی کوئی گزر جائے گا یقین نہیں آتا۔ یوں تو مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ چند سالوں سے علیل ہی چل رہے تھے لیکن سانسوں کی آمد و رفت بھی کبھی زندگی کو برتنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ علالت کے دوران بھی کئی مرتبہ مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کبھی بیماری کی وجہ سے کچھ سنا اور کبھی کچھ کہا بھی۔ آخری دنوں کی ملاقاتوں میں وہ سنتے ہی رہے کہہ کچھ نہ سکے۔

شہر حیدرآباد بچپن میں رشتہ داریوں، غم و خوشی کے مواقع اور ان میں شرکت سے ہمیشہ شناسا رہا۔ شعور کچھ بڑھا تو ''مسلمانوں کی حکومت'' کے حوالے سے انسیت پیدا ہوئی۔ نظام دکن کی تعلیمی خدمات اور ان کی شاہانہ روایات متاثر کن تھیں، لیکن سقوطِ حیدرآباد کا سانحہ، اس سے جی میں ہمیشہ کڑواہٹ ہی رہی، شعور مزید کچھ اور بڑھا، فکرِ اسلامی یا تحریکِ اسلامی کی فکر و نظر سے حیدرآباد میں مولانا مودودیؒ کے حوالے سے دو شخصیتیں تھیں جو ہمارے لیے کشش رکھتی تھیں ان میں ایک مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کی شخصیت تھی، اب انھیں مرحوم لکھتے ہوئے طبیعت مشکل سے تسلیم کر پا رہی ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد علم و فکر، عمل و جہد مسلسل کی تعبیریں تلاشنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

مولانا اصلاحیؒ نرم دم گفتگو، اپنا مدعا بڑی خوبی سے رکھ دیتے تھے۔ وہ اپنی بات آہستگی اور نرم لہجے میں رکھا کرتے تھے۔ لیکن ان کی رائے پختہ اور شریعت کو بنیاد بنائے ہوا کرتی تھی۔ ہم انھیں مربی، مجتہد اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ فکرِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی کی بنیادی سوچ کے امین اور علمبردار تھے اور وہی ہمیں

بھی سمجھاتے تھے۔ بابری مسجد، افغانستان کے مجسموں کا مسئلہ اور ملتِ اسلامیہ کے دفاع کے لیے ان کی آراء مجتہدانہ تھیں۔ میدانِ کارزار میں استقامت سے کھڑے رہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹے مجاہد سلیم کی شہادت پر کفِ افسوس ملنے کے بجائے انتہائی صبر وضبط کا مظاہرہ فرمایا اور صرف اتنا کہا کہ جس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی ہے مجھے کسی سے کوئی گلہ ہے نہ شکوہ۔ اللہ اکبر!

مولانا اصلاحیؒ بابری مسجد کو ایک مسجد کا مسئلہ نہیں مانتے تھے بلکہ اُسے امت کی شناخت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ آپ مرحوم نے اس سلسلے میں کافی جدوجہد بھی کی۔ اپریل 2001ء میں تحریک تحفظ شعائر اسلام کا قیام عمل میں آیا اس کے پیچھے اور بنیاد میں مولانا اصلاحیؒ صاحب کا اہم رول رہا ہے۔ اس میں کافی دلچسپی لے کر اُسے آگے بڑھانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ محترم رضوی صاحب (سابق ایڈیٹر ریڈینس)، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب، مولانا عبدالوہاب خلجی صاحب، نور اللہ خان صاحب، پی ایم اے سلام صاحب اور ان جیسی کئی اہم شخصیات کے تعاون اور تائید سے تحریک تحفظ شعائر اسلام چند ہی مہینوں میں بھارت میں اہم ریاستوں میں اپنی شاخیں بنا چکی تھی۔ واضح رہے کہ تحریک تحفظ شعائر اسلام بابری مسجد کی حصول یابی کے لیے کل ہند جماعت کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی۔ تمام مکاتبِ فکر ومسالک کے اہم اداروں سے اس سلسلے میں فتاویٰ بھی حاصل کئے گئے تھے۔ جو بعد میں سلطانی عتاب کی نذر ہوگئی۔

غالباً 2000ء کی بات ہے سعودی حکومت نے میدانِ بدر کا مشاہدہ کرنے والے سیاحوں پر پابندی لگادی تھی۔ ہم لوگوں نے جگاڑ لگا کر میدانِ بدر جانے کا فیصلہ کیا۔ ساتھ میں مولانا اصلاحیؒ بھی تھے۔

بدر میں جہاں نبی کریم ﷺ کا خیمہ لگا ہوا تھا اب تو وہاں عالیشان مسجد تعمیر کی گئی ہے جس کا نام مسجدِ عریش ہے، دو رکعت نفل پڑھ کر مسجد کے سامنے ہم کچھ احباب کھڑے تھے۔ مولانا اصلاحیؒ نے زمین کی طرف جھک کر اپنی مٹھی میں وہاں کی خاک اٹھائی اور میرے سر پر ملنے لگے۔ کچھ دعائیں بھی پڑھ رہے تھے۔ میں نے انھیں اس سے قبل اتنا جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی بعد میں دیکھنے کا موقع ملا۔ مسجد عریش کے سامنے بابری مسجد کا ذکر کرتے جارہے تھے اور چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ میں بھی اس عمل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس وقت تو میری نظریں صدیوں قبل معرکہ بدر کا طواف کر رہی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا خیمہ یہاں ہے۔ یہیں معرکہ سے قبل آپ ﷺ سجدہ ریز ہو کر دعائیں فرمارہے تھے، کندھے سے چادر گری گری جاتی تھی۔ آپ ﷺ کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ اُسے ٹھیک کردیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے آنسو موتی کی لڑی بن کر اس خاک میں جذب ہو گئے ہوں گے۔ اگر نہیں تو آپ ﷺ کے ہاتھ اور جسم کا کوئی حصہ اس خاک سے

چھو کر میرے نصیب میں آیا ہوگا یا کم از کم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدومِ مبارک اس خاک سے آلودہ ہوئے ہوں گے۔ صدیوں کے فاصلے اور زمان ومکاں کی پابندیوں کے باوجود خاک عریش اپنی خوش نصیبی پہ ناز کرتی ہوگی اور ہوسکتا ہے اس خاک کا کوئی ایک ذرہ میرے سروجبیں پر کوہ نور کی طرح جگمگا گیا ہوگا۔

مولانا اصلاحیؒ صاحب خاکِ عریش میرے سر پر مل رہے تھے اور میں اپنی گناہ گار نظروں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدومِ مبارک سے لپٹی ہوئی خاک کے ذرّہ کو اپنے لیے سعادت واعزاز اور ذمہ داریوں سے بھری راہ کو تک رہا تھا۔ وہ لمحے تھے لیکن جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہم اپنے آپ میں نہ رہے۔ ایک بے خودی کا سا سماں اور کچھ کرنے کی تمنا۔ حالات کی نزاکتوں کے ساتھ اپنی کم مائیگی کا علم اور اپنی ٹوٹی پھوٹی سرگرمیوں کا بھرم سب کچھ ایک ساتھ کسی فلم کی طرح اس دورانیہ میں چل رہا تھا۔

ہم اسی حالت میں میدانِ بدر سے جدہ کی جانب بوجھل قدموں سے روانہ ہوئے۔ بدر سے لوٹتے ہوئے جذبات کا تلاطم اب بھی بے خودسا کر دیتا ہے۔ میدانِ بدر میں مولانا اصلاحیؒ صاحب کا ساتھ اور جو کچھ وہاں ہوا زندگی کا عظیم سرمایہ ہے جو بھلایا نہیں جا سکتا۔

ہم دعا گو ہیں کہ پروردگار مولانا کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے۔ ان کے وارثین، متعلقین اور متوسلین کو صبر جمیل سے نوازے اور مولاناؒ کے مشن کو جاری وساری وآباد رکھے۔ آمین!

یقیں محکم، عمل پیہم کی زندہ مثال

ایم اجمل، دہرہ دون
رکن مرکزی مجلس شوریٰ
وحدتِ اسلامی ہند

حضرت محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب مرحوم اس زمانۂ فتنہ و آزمائش میں امت مسلمہ کے لیے خصوصاً اور پوری انسانیت کے لیے عموماً ایک مینارۂ نور تھے۔

محترم مولانا نے اسلام کے ابدی، آفاقی اصولوں کی ہر بڑی سے بڑی قربانی دے کر اور قیمت چکا کر تبلیغ کی۔ اور کسی خوف و اندیشہ و لالچ کا شکار نہیں ہوئے۔ سلطان جابر کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ اسلام کی ابدی آفاقی فکر کو حکمت عملی کے تابع کرنے کے بجائے حکمتِ عملی کو شریعت کے تابع اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونہ پر چلانے کے داعی تھے۔ اس زمانۂ ابتلاء و آزمائش میں علماء میں یہ عزیمت، شجاعت، سادگی، بے خوفی مکمل عنقاء ہے۔

راقم السطور کو بے شمار مواقع پر مولانا مرحوم سے مجلسوں، مشوروں میں استفادہ کا موقع ملا۔ اقبال کے شعر یقیں محکم، عمل پیہم کی زندہ مثال پایا۔ انتہائی نامساعد، کمر توڑ، آزمائشی حالات میں بھی فکر اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ حق کی شہادت اور گواہی بڑے بڑے جوکھم اٹھا کر دیتے رہے۔ اس زمانے میں یقیناً یہ دین کی سب سے بڑی خدمت تھی کہ اللہ کی ربوبیت، حاکمیت کو بلاکم و کاست اجاگر کیا جائے، وہ مولانا محترم نے ہر موقع پر

کیا۔ مولانا اپنی ذاتی زندگی میں سادگی پر عمل کرتے تھے، تصنع و تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔ خورد و کلاں سے یکساں طور پر گھل مل جاتے تھے۔ جو بھی مشورہ، تنقید یا اعتراض ہوتا وہ صاحبِ معاملہ سے براہِ راست کرتے تھے۔ ماں باپ کے لیے جوان بیٹے کی شہادت باعثِ سعادت ہے مگر غم وصدمہ بھی لازمی فطری امر ہے۔ مولانا نے اس سعادت اور غم کو پوری طرح اسلامی جذبہ سے جیا۔

اللہ پاک مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ کو اپنے خاص کرم سے قبول فرمائے۔ اہلِ خانہ واعزہ کو اجر سے نوازے اور امتِ مسلمہ و پوری انسانیت کے لیے اللہ کی مکمل بندگی کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

شیدائے قرآن وفدائیِ حق

عبدالبر اثری فلاحی
ڈائرکٹر القرآن اکیڈمی، ممبئی

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے بار ہا صحبت رہی۔ میز بانی اور مہمانی کا بھی شرف حاصل رہا۔ مختلف مجالس میں استفادہ کا بھی موقع نصیب ہوا۔ ہر موقع پر جہاں انہوں نے نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کی چھاپ چھوڑی وہیں قرآن سے بے پناہ شغف اور حق کی خاطر سینہ سپر رہنے کے بھی نقوش ثبت کئے۔ ہمیشہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولانا ہمہ آن قرآن میں تفکر وتدبر میں غرق رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی سوال کیا جاتا تو فوراً قرآنی آیات کا حوالہ دے کر جواب مرحمت فرماتے۔ مطالعہ قرآن کی مجالس میں ایسے ایسے باریک نکات کی طرف نشاندہی فرماتے کہ قرآن مجید کے اعجاز وایجاز پر دل ودماغ عش عش کرنے لگتا اور خواہش پیدا ہونے لگتی کہ ایسی ہی مجالس میں پوری زندگی گزار دی جائے۔ آپ کے اس جولانی کی غماز آپ کی وہ ساری تحریریں ہیں جو مختلف موضوعات پر کتابوں کی شکل میں منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ بطور مثال ''مجسّموں کا مسئلہ ایک سیر حاصل بحث'' نامی کتابچہ کو پڑھ کر بھی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس طرح کج روی اختیار کرنے والے علماء ودانشوران کے بودے دلائل کا قرآنی استدلالات کے ذریعے پرخچے اڑائے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اسی طرح ''لا اکراہ فی الدین'' نامی آپ کی کتاب بھی اسی طرح کی ایک شاہ کار کتاب ہے جس میں عصر حاضر کی بہت سی فکری گمراہیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور بالخصوص ان آیات قرآنی کا صحیح تناظر اور حقائق واشگاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے نہیں سمجھنے کی وجہ سے عام لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عزلت گزینوں اور عافیت پسندوں کو یہ کتاب ضرور پڑھوانی چاہیے۔

''ڈائرکٹری فارغین مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ'' مرتبہ ڈاکٹر عتیق الرحمن اصلاحی سے معلوم ہوا کہ مولانا کا ایک مسودہ ''کیف نتعامل مع القرآن'' کے نام سے موجود ہے لیکن وہ کیوں زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا مجھے نہیں معلوم، البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اب پہلی فرصت میں وہ شائع ہو جانا چاہئے تا کہ تشنہ لب اس سے شادکام ہوسکیں۔ اور یہ بھی عملی طور پر ان کے لئے ایک صدقہ جاریہ بن جائے۔

مولانا مرحوم بلا خوف لومۃ لائم حق پرستی کا اعلیٰ پیکر تھے۔ حق کے سامنے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اظہارِ حق میں کہیں بھی انہیں کوئی باک نہیں رہا۔ ایک مرتبہ ایک سیمینار میں انہیں ایک مجلس کی صدارت سونپی گئی بیشتر مقالہ نگاران نے یک رخا پن اختیار کر رکھا تھا اور کسی قدر کتمانِ حق کے مرتکب ہو رہے تھے۔ جب آپ کے صدارتی کلمات کی باری آئی تو آپ نے بڑے جبہ و دستار والوں کی پرواہ نہیں کی وہاں آپ کے بعض اساتذہ اور احباب بھی جلوہ افروز تھے سب کے سامنے آپ نے حقائق کھول کر رکھ دیئے۔ سب نے ناک بھوں تو چڑھائی لیکن کسی کے پاس یارا نہیں تھا کہ آپ کی باتوں کی نفی کر سکے۔

آپ ابتدائی دور سے تحریکِ اسلامی کے راہ رو تھے اور فکری صلابت میں اپنی مثال آپ تھے۔ جب جب آپ نے کسی طرح کی کوئی کمزوری محسوس کی تو بہانگ دہل آپ نے اس کا اعلان کیا اور راہ حق سجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ''سیکولر جمہوری نظام، انتخابات اور اسلام'' نامی کتابچہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ ''اسلامی فکر کیا ہے۔ ایک تنقیدی جائزہ'' نامی کتاب بھی آپ کی اسی خوبی اور فکر مندی کی عکاسی کرتی ہے۔ اس حق پرستی کے لئے آپ نے کتنے مناصب اور تعلقات کو قربان کیا اس کی موٹی موٹی مثالیں تو دی جاسکتی ہیں لیکن ہر چیز کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ کو فدائی حق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

کبھی ذخیرہ روایات میں پڑھا تھا کہ ''مَن کَانَ لِلہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ'' جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ لیکن انبیاء ورسل کے علاوہ اوروں کے ساتھ یہ کیسے ہوتا ہے اس کی تصویر بہت واضح نہیں تھی لیکن دو چار مواقع پر جب آپ کے احوال سے آگاہی ہوئی تو عملی تصویر بھی بالکل واضح ہوگئی اور اللہ پر یقین بھی دوبالا ہوگیا۔ اب یہ فیوض و برکات کن کی صحبتوں سے میسر آسکیں گی یہ سوچ کر ہی دل ٹوٹنے لگتا ہے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قرآن نے مومن صادق کی جو تصویر کشی کی ہے وہ سب جھلکیاں آپ کے سراپا میں مجسم تھیں، کیا غیرتِ ایمانی، کیا غیرتِ ملی، کیا طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنا، کیا اپنوں کے لئے شفقت و رحمت نچھاور کرنا، کتنے ٹوٹے دلوں کو انہوں نے جوڑا اور سہارا دیا وہ اور ان کا خدا جانتا ہے! سمجھ میں نہیں آرہا کیا کیا گنواؤں، بس میرے محترم بزرگ دوست سرفراز فلاحی بزمی کی زبان میں سمجھ لیں:

غرض کیا بتاؤں وہ کیا شخص تھا
وہ افکار قرآں کا اک عکس تھا

ہجوم میں تھا و لیک تنہا

مولوی محمد یٰسین پٹیل فلاحی، دہلی

"اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" جب محبوبِ خدا ﷺ بھی ایک قلیل عرصہ کے لئے ہی دنیا میں جلوہ فگن رہے تو دوسرے تو بدرجہ اولیٰ اسے چھوڑ کر جانے والے ہیں۔ البتہ اس مدت عمل میں کیا دفتر عمل چھوڑا وہی حاصل زندگی بنتا ہے۔ مشفق و محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کی وفات ملت اسلامیہ کا ایک ایسا خسارہ ہے جس کا صحیح ادراک شاید ان کو بھی نہ ہو جنھوں نے خراجِ عقیدت میں زبردست صدارتی و تعزیتی خطاب پیش کئے۔

جمہوریت وسیکولرزم و دستوریت کے زیر سایہ دعوتی سفر کے فتنۂ ہمہ گیر کو پہچان کر اس کے واحد تریاق کے بے باکانہ اظہار اور اس کی تفہیم و تبلیغ کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑا کہ جس تحریک سے وہ نوعمری سے جڑے ہوئے تھے اور جس کے لئے اپنی علمی و عملی تگ و دو میں پوری جوانی گزار دی تھی وہاں سے بعذر لنگ بیک بینی دوگوش نکال دیئے گئے۔ جو لوگ جمہوریت کی ٹھنڈی چھاؤں میں دعوت دعوت کھیل کر "راضی رہے صیاد بھی" کی روش پر چل پڑے تھے انہیں کیسے چین آ سکتا تھا! نوجوانوں میں بڑھتی مقبولیت اور ان کے تربیتی اجتماعات میں شرکت کو بہانہ بنا کر ان کا اخراج کر دیا گیا۔ کتنی عجیب بات ہے یہ کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے دعویدار جب مرضِ خوف میں مبتلا ہوئے تو ان کی تلواروں کا رخ باطل سے ہٹ کر خود اپنے ہم مشربوں کی طرف ہو گیا۔ آر ایس ایس سے دعوتی روابط ہونا قابلِ فخر قرار پایا، پرامن بقائے باہم کی خاطر تار کے کنڈے کے استعمال کی گنجائش بھی نکالی۔ اسلام دشمن اور خدا بیزار کانگریس کی مسیحائی کے قصیدے بھی پڑھے گئے لیکن اپنے ہم فکر و ہم مشرب لوگوں سے تعلقات اور ان کے اجتماعات میں جا کر قرآن وسنت کی روشنی میں افہام و تفہیم قابلِ دست اندازیٔ قانون ٹھہرا۔

بابری مسجد کے معاملہ میں مولانا کا موقف سب سے زیادہ شرعی، جرأت مندانہ اور عاقلانہ تھا لیکن جس

اجتماعیت سے وہ وابستہ تھے اس کا موقف سب سے لچر تھا۔ مولانا مرحوم کا کہنا تھا کہ اللہ کے گھر سے دست برداری عملاً ہر حق سے دست برداری پر منتج ہوگی اور یہ صرف ایک مسجد کا معاملہ نہیں بلکہ اس کے بعد ایک نہ رکنے والا سلسلہ ہوگا۔ اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو آئندہ اپنی عصمت وعفت کی حفاظت سے بھی ہم قاصر رہیں گے۔

عدالتی انصاف کے سراب کے پیچھے بھاگنے والوں نے انہیں جذباتی اور دیوانہ قرار دے دیا۔ لیکن مولانا اپنے موقف سے سرمو دستبردار نہ ہوسکے۔ کیونکہ یہ موقف ''عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیۡ'' کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔ ایک ایمان والا کسی بھی معاملہ میں اپنا موقف قرآن وسنت کی بنیاد پر ہی قائم کرتا ہے نہ کہ غیر شرعی مصالح کی بنیاد پر۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اپنی کمزوری کے سبب اس پر عمل درآمد ممکن نہ ہوسکے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ شرعی موقف کو تبدیل کرلے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا ادبار سن سینتالیس سے بھی زیادہ تیزی سے ہوا ہے اور آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔

سب سے بڑی خوبی مولانا مرحوم کی یہ تھی کہ موقف کی صلابت کے باوجود آپ کا انداز ہمیشہ علمی ہی رہتا۔ گفتگو انتہائی نرم کبھی آواز کے دم پر کسی پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اپنا موقف علمی دلائل سے رکھا اور پھر مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ ملک اور بیرون ملک کئی بار ساتھ رہنے کا موقعہ ملا اور ہر جگہ ایک ہی انداز دیکھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مولانا سے بہت زیادہ انسیت ہوگئی تھی۔

سب سے زیادہ دل کی گہرائیوں میں اس وقت اتر آئے جب جواں سال، جواں عزم اسم با مسمّٰی بیٹے مجاہد کو گجرات پولیس نے شہید کردیا۔ اصولوں اور موقف کی کھری پہچان ایسی ہی گھڑی میں ہوتی ہے۔ انتہائی غم واندوہ کے باوجود مولانا محترم نے باطل سے کسی طرح کی چارہ جوئی سے انکار کردیا اور اپنا پورا معاملہ اللہ کے حوالہ کردیا۔

اس وقت مولانا سے فون پر جو گفتگو ہوئی اس کا اثر اب بھی اس قدر مستحضر ہے کہ غم کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ باطل کو باطل سمجھ کر ہی اس کا مقابلہ ممکن ہے اور باطل کو باطل کا سہارا لے کر شکست دینے کا خواب دیکھنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ اس دن یہ عملی سبق سمجھ میں آیا کہ صبر یہ ہے کہ سب کچھ لٹ جانے کے باوجود اپنے موقف پر آدمی قائم رہے۔ یہ صبر نہیں ہے کہ اپنا مادی وجود بچانے کی خاطر دین کے اور اصولوں کے پرخچے اڑتے دیکھ کر بھی آدمی خاموش رہے بلکہ آگے بڑھ کر اس کے لئے شرعی دلائل بھی ڈھونڈتا پھرے اور بے غیرتی کو صبر کا نام دے دے۔ حالات کی سختی اور دشمنوں کے شکنجے کستے چلے جانے کے سبب ملت اسلامیہ ہند غلامی اور شکست خوردگی کے اس درجہ پر پہنچ گئی ہے جہاں مولانا جیسی ٹھوس علمی فکر رکھنے والا شخص غیر تو

غیر اپنوں کے لئے بھی نا قابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ میری گنہ گار آنکھوں نے وہ منظر دیکھا ہے جب وہ ایک اجتماعیت سے کاٹ دیئے جانے کے بعد اپنی ہم فکر دوسری اجتماعیت سے وابستہ ہوئے مگر وہاں بھی وقتی مصلحتوں اور حالات کی نزاکتوں کے باعث ان کو غیر اعلانیہ طور پر الگ تھلگ کردیا گیا۔ ایک تربیتی اجتماع میں میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور ان کی گفتگو کے بعد حماس کے موضوع پر میری گفتگو ہونی تھی۔ میں اسی کے تانے بانے بننے میں لگا تھا اس لئے مجھے ٹھیک سے ان کا موضوع گفتگو تو یاد نہیں لیکن اس کا جس طرح اختتام ہوا وہ نا قابلِ فراموش ہے۔ مولانا نے گفتگو کے اختتام پر اپنے اس موقف کو دہرایا کہ اسلام کی بقا کے لئے اسلام کے غلبہ کو یقینی بنایا جائے اور اس کے لئے واحد شرعی راستہ ایک ہی ہے۔ مولانا ابھی اپنی گفتگو ختم کر کے پوری طرح کمرے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس اجتماعیت کے روح رواں کود کر اسٹیج پر آئے اور بہت ہی تلخ لہجہ میں مولانا کی بات کا رد کرتے ہوئے ہندوستان کے حالات کا حوالہ دے کر اسے غیر عملی قرار دے دیا۔ مجھے یہ بات بہت بھونڈی لگی اور صاف محسوس ہوا کہ پہلے سے طے شدہ راستوں کے علاوہ فکری اور نظریاتی سطح تک پر دوسری فکر کو انگیز نہیں کیا جاسکتا۔ افراد کی شہادت کو قابلِ فخر گردانںے والے اجتماعیت کی شہادت کے خوف سے اپنوں کو ہی کاٹ کر پھینکنے لگے۔ تاریخ کا پہیہ پھر الٹا گھوم گیا اور پھر میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس دائرہ میں بھی مولانا کی افادیت کم ہوتی چلی گئی۔ ظاہر ہے مولانا جذباتی جو تھے۔ صرف علمی دلیلوں سے کب کام چلتا ہے عملی ہونا بھی تو ضروری ہے۔ اس کے بعد مولانا کئی بار اپنی بیٹیوں کے پاس دہلی تشریف لائے اور ہر بار مجھے یاد کر کے بلایا۔ بس محبت سے دیکھ کر خوش ہولیتے، کچھ ادھر ادھر کی بات ہوتی لیکن صاف محسوس ہوتا کہ مولانا کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر کبھی کچھ نہ کہا۔ ایک شریف النفس، علم ربانی کا حامل اور عامل دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے آپ میں سمٹتا چلا گیا۔ شاید یہ اسی کی عکاسی تھی کہ

بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء۔

اے اللہ! ہجوم میں رہ کر بھی اپنی فکر کی وجہ سے الگ تھلگ رہ جانے والے کے لیے اپنی رحمت سے طوبیٰ مقدر کردے۔ آمین! یا رب العالمین وصل علی النبی ﷺ۔

ایّامِ اسیری کی کچھ یادیں اور مولانا محترم

اشرف جعفری، دہلی
صدر تحریک احیائے امت و سابق صدر ایس آئی ایم

مجھے یاد نہیں آرہا کہ مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی لیکن پہلی ملاقات میں مولانا محترم کا جو نقش قائم ہوا وہ آخر تک قائم رہا، نصب العین اور طریقۂ کار نیز فکری ہم آہنگی کے نتیجے میں مولانا کے ساتھ جو قربت قائم ہوئی وہ الحمدللہ اب تک قائم ہے۔

میں اپنی تحریکی زندگی میں جن بزرگوں سے متاثر ہوا مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ بھی ان میں شامل ہیں، سب سے پہلے جس شخصیت نے مجھے متاثر کیا وہ مولانا سید احمد عروج قادری صاحبؒ کی ہے۔ آپ کی سادگی، تقویٰ، طہارت، انابت کے ساتھ قرآن کریم پر گہری نظــر اور مسائل میں اعتدال پسندی کے اثرات میں آج بھی محسوس کرتا ہوں اور بہت سے مسائل میں مولانا محترم کے طریقہ پر عامل ہوں۔

دوسری شخصیت جن سے استفادہ کا موقع بھی بہت ملا اور ان کی شخصیت نے بہت متاثر کیا وہ مولانا سید حامد علی صاحبؒ کی ہے۔ آپ کی ذہانت، سادگی، اعلیٰ ظرفی اور اردو زبان کے معاملے میں حساسیت نے مجھے بہت متاثر کیا بعد میں مولانا مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے جناب راشد حامدی صاحب سے میری بہن کا عقد ہوا اور اس طرح مولانا محترم حامد علی صاحبؒ سے قریبی رشتہ قائم ہو گیا اور آخر وقت تک ہم مولانا محترم سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

تیسری شخصیت جن سے میں متاثر ہوا وہ مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحب مرحوم و مغفور کی ہے۔ تیسری شخصیت اس اعتبار سے کہ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے بعد اصلاحی صاحبؒ سے متعارف ہونے کا موقع ملا، مولانا

محترم سے متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ نصب العین کے حصول میں طریقۂ کار کی اہمیت پر مولانا محترم کی ثابت قدمی اور ساری مصیبتوں اور آزمائش کے باوجود ثابت قدمی، نیز سادگی اور جفاکشی نے مجھے بہت متاثر کیا اور یہ نقوش ابھی تک قائم ہیں۔ تحریکی دوروں پر جب بھی حیدرآباد جانا ہوتا مولانا محترم سے ملاقات ضرور ہوتی بلکہ طعام بھی مولانا محترم کے ساتھ ہوتا۔

1998 میں ایک پروگرام میں شرکت کے لیے حیدرآباد جانا ہوا جمعہ کا خطبہ بھی پروگرام میں شامل تھا مولانا محترم عاقل حسامی صاحبؒ کی مسجد میں خطبہ ہوا اور نماز کے بعد مولانا محترم کے گھر پر حاضری دی، کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ پولیس کی ایک بڑی نفری نے ریڈ کیا اور جو احباب موجود تھے مولانا محترم کو چھوڑ کر باقی سبھی ساتھیوں کو جو غالباً سات تھے گرفتار کرلیا گیا لیکن گرفتاری اتوار کے روز دکھائی گئی۔ ان سات میں مولانا محترم کے بڑے صاحبزادے مجاہد بھی ہمارے ساتھ تھے اللہ تعالیٰ مجاہد کی قبر کو نور سے بھر دے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین۔

مرحوم مجاہد مجھ سے بہت بے تکلف تھے اور محبت کا تعلق تھا اور یہ شہادت تک قائم رہا۔ الحمدللہ! اس موقع پر ہم سبھی ساتھیوں نے تقریباً بارہ روز تک سنت یوسفی ادا کی۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لئے توشۂ آخرت بنائے آمین۔ رہائی کے بعد سب سے پہلے مولانا محترم کے گھر پر حاضری دی مولانا محترم کی خوشی دیدنی تھی، اس کے بعد 2002 کے ماہ مئی میں ایک میٹنگ دہلی میں رکھی گئی تھی جس میں سورت میں گرفتار 125 ساتھیوں کے بارے میں مشورہ کرنا تھا۔ اس میں مولانا محترم تشریف لائے تھے اور میں بھی حاضر ہوا تھا، سورت کے ساتھیوں کی رہائی کے لئے قانونی طریقۂ کار پر غور وخوض ہوا اس میٹنگ میں یٰسین پٹیل اور ایڈوکیٹ خالد بھی شریک ہوئے تھے۔ میٹنگ کے بعد میں سونے کی غرض سے یٰسین پٹیل کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا، ابھی سونے کے لئے لیٹنا چاہا، یٰسین کہنے لگے کہ آپ راشد حامدی صاحب کے گھر چلے جائیں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ آج بارات آسکتی ہے، لیکن میں نے کہا کہ میں بہت تھک گیا ہوں اور کہیں جانے کی ہمت نہیں، یہ کہہ کر میں فرش پر لیٹ گیا ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ واقعی بارات آگئی۔ پولیس کی بھاری جمعیت نے ریڈ کیا اور مجھے اور یٰسین پٹیل کو گرفتار کرلیا۔ گویا یہ گرفتاری بھی مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے شرف ملاقات کے بعد ہی ہوئی، سورت میں گرفتاری سے میں ایک دن لیٹ پہنچنے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔

لیکن اس کے چند ماہ بعد دہلی میں گرفتاری ہوگئی اور اس مرتبہ بھی آخری ملاقات مولانا محترم سے ہوئی اس طرح کہ مولانا محترم خود دہلی تشریف لائے تھے، سورت کے احباب اور بزرگ تقریباً ایک برس بعد رہا ہوئے اور

ہم تقریباً ڈھائی برس بعد رہا ہوئے اور عجیب اتفاق یہ کہ اس مرتبہ بھی رہائی حیدرآباد سے ہی ہوئی اور رہائی کے بعد پہلی ملاقات مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے ہوئی اور دورات قیام بھی مولانا محترم کے ساتھ رہا۔ اس موقع پر مجاہد مرحوم نہایت اصرار کر کے مجھے بازار لے گئے اور میرے لئے ایک پٹھانی سوٹ خریدنا چاہا لیکن کوئی بھی پٹھانی سوٹ مجھے اس لیے پسند نہیں آیا کہ سب نہایت کڑھے ہوئے تھے اور میں سادہ لباس پسند کرتا ہوں۔ مجاہد مرحوم کا اصرار کہ میں لازماً قبول کرلوں، آخر میں نے مجاہد سے کہا اگر میں آپ کے اصرار سے قبول کر لوں گا تو رکھا ہی رہے گا استعمال نہیں ہوگا، بالآخر مجاہد نے ہار مان لی اور ہم خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ لیکن مجاہد مرحوم ہار ماننے والے کہاں تھے مجھے گھر پہنچا کر دوبارہ مارکیٹ چلے گئے اور میرے لئے ایک سفری بیگ خرید کر لائے۔ وہ بیگ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور اس کو دیکھ کر مجاہد کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ دورات مولانا محترم کے گھر قیام کے بعد مجھے ڈاکٹر محمد انیس صاحب کے ساتھ دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اس موقع پر مجاہد نے مولانا محترم سے اجازت لے کر ہمارے ساتھ دہلی جانے کا پروگرام بنالیا اور میں مجاہد کی رفاقت میں دہلی پہنچ گیا۔ دہلی پہنچ کر ناشتہ بھی ساتھ کیا اس کے بعد مجاہد اپنی ہمشیرہ کے یہاں چلے گئے اور میں اپنے گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس ملاقات کے بعد پھر ملاقات کا موقع نہیں مل سکا اور مجاہد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جوان بیٹے کی شہادت پر مولانا محترم کا صبر ہر اس شخص کے لیے مثال ہے جو آخرت کا آرزومند ہو۔ جہاد، شہادت کی باتیں کرنا، مضامین لکھنا، تقاریر کرنا اور بات ہے اور جوان بیٹے کی شہادت کے بعد بھی جہاد وشہادت کے راستے پر ثابت قدمی سے رواں دواں رہنا اور بات۔ اللہ تعالیٰ بیٹے کی شہادت اور والد صاحب کی ثابت قدمی کو دونوں کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین!

میری دوسری گرفتاری دہلی سے اور گرفتاری سے قبل آخری ملاقات مولانا محترم سے اور رہائی حیدرآباد سے اور رہائی کے بعد پہلی ملاقات مولانا محترم سے، کیسا عجیب اتفاق ہے! اور یہ اتفاق اس طرح پیش آیا کہ دہلی میں ہائی کورٹ سے ہماری ضمانت ہوگئی اور ہم دونوں کو مجھے (اور یٰسین پٹیل کو) وارڈ سے نکال کر ڈیوڑھی لایا گیا لیکن ڈیوڑھی میں فائل چیک ہونے کے بعد پتہ چلا کہ میرا حیدرآباد کورٹ سے وارنٹ ہے، اس لیے رہائی نہیں ہوگی۔ لہٰذا مجھے واپس ہائی سیکیوریٹی کے وارڈ میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد دہلی پولیس کے سات جوان مجھے لے کر حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے، 32 گھنٹے کے سفر کے بعد میں حیدرآباد پہنچا اور مجھے کورٹ میں پیش کیا گیا

کورٹ میں، میں تقریباً چھ گھنٹے رہا۔

ان چھ گھنٹوں میں، میں یہ سوچتا رہا کہ کسی طرح مولانا محترم کو میرے حیدرآباد جیل آنے کی اطلاع ہوجائے، ایک پولیس کانسٹیبل کی نیم پلیٹ سے اس کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو میں نے اس سے بات کی اور مولانا محترم کا پتہ اس کو نوٹ کرایا، لیکن یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ مولانا محترم سے ملاقات کر ہی لے گا اور جلدی ملاقات ممکن ہوگی۔ ہمارے گھر والوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ مجھے حیدرآباد روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں کتنے دن حیدرآباد جیل میں رہنا ہوگا، دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کر لی اور مجھے انتہائی خوشگوار حیرت ہوئی کہ نہ صرف یہ کہ دعا قبول ہوئی بلکہ بہت جلدی رہائی کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔

ہوا دراصل یہ کہ جس روز مجھے کورٹ میں پیش کیا گیا، اسی روز حیدرآباد کے کسی ساتھی کی پیشی تھی جن سے ملاقات کی غرض سے ڈاکٹر محمد انیس صاحب اور مولانا محترم عبدالعلیم صاحب کے چھوٹے صاحبزادے معتصم اور کچھ احباب کورٹ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ مجھے کورٹ میں پیش کرنے کے بعد میرے محافظ مجھے ہوٹل میں کھانا کھلانے کے لئے لائے ابھی میں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک بچہ دوڑتے ہوئے میری میز پر آیا اور بس ایک سوال مجھ سے پوچھا کہ آپ اشرف جعفری ہیں اور جب تک میرے محافظ اس کو روکتے وہ واپس لوٹ چکا تھا۔ میں اس کو نہیں پہچان سکا چند منٹ بعد وہ بچہ ڈاکٹر انیس اور ایک ایڈوکیٹ کے ساتھ دوبارہ ہوٹل میں آیا اور سب سے ملاقات ہوئی۔ وکیل صاحب نے وکالت نامہ پر دستخط کرائے اور اس طرح اگلے ہی روز ضمانت بھی ہوئی اور رہائی بھی۔ مولانا محترم کے چھوٹے صاحبزادے معتصم کی اعانت سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔

مولانا محترم تصنیف و تالیف کے میدان کے شہسوار تھے اور ان کی بہت سی تحریروں میں موجودہ حالات کے لئے بڑی رہنمائی ہے خاص طور سے مولانا کی ایک بک لیٹ جو ملت کے دفاع کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو بڑی تعداد میں اور مختلف زبانوں میں شائع اور تقسیم کیا جائے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور ، مجاہد کی اذاں اور

ہمارے محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحب مرحوم و مغفور عالم دین تھے اور مجاہد بھی، اور مجاہد شہید کے والد محترم بھی۔ اللہ تعالیٰ مولانا محترم کی قبر کو نور سے بھر دے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ہمیں آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

سلامتِ فکر کا استعارہ اور عزیمت کا ہمالہ تھے
ہمارے پیارے مولانا

خلیل عابدی، ممبئی

ان کو سنتے تو فکر کو تازگی ملتی
ان سے ملتے تو ایمان کو زندگی ملتی

بلاشبہ تحریک اسلامی ہند کی سب سے زیادہ بلند قامت ہستی تھی آپ کی۔ آنکھیں تو بند ہوتیں پر بصیرت کی نگاہوں سے گفتگو کرتے، ٹھہر ٹھہر کر تکلم فرماتے گویا قلب و دماغ کی گہرائیوں سے انمول موتی چن چن کر نکال رہے ہوں اور موضوع اگر فکر باطل ہو تو یوں محسوس ہوتا کہ جم کر نشتر لگا رہے ہیں۔ آپ ہند میں فکر مودودیؒ کے تنہا امین اور مجاہد تھے۔

ملتے بڑے تپاک سے قلبی ارتباط سے

موت تو برحق ہے اور بروقت ہے، فکر اس بات کی ہے کہ اس عظیم خلا کو کون پورا کرے گا؟ کر بھی سکے گا؟! بالخصوص آج کے فکری بلنڈرس کے دور میں کوئی آئینہ دکھانے والا نہیں رہا۔ انحرافات کی خبر اب کون لے گا؟ یہ ہے اصل حادثہ جو مولانا کے انتقال کی وجہ سے رونما ہوا۔ لیکن شاید اس کا احساس بھی اب مرتا جا رہا ہے۔

مولانا تو رب کی جوار رحمت میں جا پہنچے اور خوب عیش میں ہوں گے مگر ہم کو فکری یتیم کر گئے، اب ہمیں کون حوصلہ دے گا؟!

مولانا محترم کے حوالے سے میری کچھ یادیں

عبداللہ دانش، علی گڑھ

بچپن سے ہی والد محترم کی زبانی محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کا تذکرہ سنتا رہا۔ اس تذکرہ میں سنے جانے والے مولانا کی زندگی کے مختلف واقعات آج بھی ازبر ہیں۔ جب مولانا کی کتاب 'جاہلیت کے خلاف جنگ' کو پڑھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی جاہلیت کے خلاف جنگ سے عبارت تھی۔

ہمارا تعلق دلت (اچھوت) خاندان سے تھا، گاؤں میں زیادہ تر زمیندار مسلمان تھے اور ان کا دلتوں کے ساتھ رویہ کم وبیش ہندو زمینداروں جیسا ہی تھا۔ دلت زمینداروں کی چار پائی پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اگر زمیندار اپنی چار پائی پر بیٹھانے پر معترض نہ بھی ہو تو بھی دلت ان کی چار پائی پر بیٹھنے کو خلافِ ادب سمجھتے تھے۔ اگر وہ بیٹھنے کے لیے تیار بھی ہوتے تو سرہانے کی طرف نہیں بیٹھتے تھے بلکہ پائینتی کی طرف بیٹھتے تھے۔

والد محترم سے معلوم ہوا تھا چونکہ وہ تعلیم کے زمانے کے کسی مرحلہ میں مولانا مرحوم کے ساتھی رہے تھے کہ والد محترم کو مولانا مرحوم اپنی چار پائی پر بیٹھاتے، ان کے ساتھ عزت اور احترام کا معاملہ فرماتے۔ اسی طرح میری والدہ مرحومہ کی بھی مولانا کے گھر میں بڑی عزت تھی، وہ پورے گاؤں میں گرو جی کے نام سے مشہور تھیں۔ اکثر ان کے گھر جاتی رہتی تھیں۔ والد محترم کے دین اسلام سے متاثر ہونے میں مولانا کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ والد محترم کے مطابق مولانا نے معاشرہ کے مروجہ جاہلانہ رسوم کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

والد محترم نے ہمیں ایک واقعہ سنایا تھا کہ مسلمانوں کے یہاں اپنی بہن بیٹی کے گھر تیوہاروں کے موقع پر تیوہاری (عیدی) بھیجنے کی رسم رہی ہے۔ عام طور سے تیوہاری لے کر جانے والے قبائلی (بعض اوقات مسہر) ہوا کرتے تھے جو مسلمانوں کے گھر کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے، جب وہ عیدی لے کر کسی کے یہاں پہنچتے تو خود پکا کر کھاتے تھے۔ اس گھر کے لوگ ان کو کھانا پکانے کے لیے مٹی کے برتن، راشن اور ایندھن دیا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کی موجودگی میں ان کے گھر ایسا ہی ایک فرد عیدی لے کر آیا۔ اسے معروف طریقہ سے کھانا پکانے کا سامان دیا گیا۔ وہ شخص کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے بعد بچا ہوا کھانا پھینکنے کے لیے جا رہا تھا، مولانا نے

اسے دیکھ کر روک لیا اور اس کے ہاتھ سے کھانے کی ہانڈی لے لی اور اپنے گھر لے گئے اور اپنی والدہ محترمہ کے حوالے کیا تاکہ اسے استعمال کرلیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ''اس قبائلی کا کھانا کون کھائے گا؟'' تو مولانا نے کہا کہ ''میں کھاؤں گا۔'' اور کھانا شروع کردیا۔ آپ کی والدہ نے کہا کہ ''پھر میں بھی کھاؤں گی۔'' اس طرح مرحوم نے چھوت چھات کے تصور کی اصلاح فرمائی۔

ملک میں کفو سے متعلق جو تصورات رائج ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومسلم مرد خاندانی مسلمان عورت کا کفو نہیں ہے اور نومسلم کا بیٹا بھی خاندانی مسلمان عورت کا کفو نہیں ہے۔ ہاں اس کا پوتا خاندانی مسلمان عورت کا کفو ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر نومسلم مرد دلت بھی ہو تو ان جاہلی تصورات کے مطابق اس کا جوڑا ملنا مشکل تر ہوجائے گا۔ مولانا مرحوم نے ایسے خاندان میں رشتہ کی پیشکش کرکے نومسلم اور دلت کے سلسلہ میں جاہلی تصورات کو عملاً رد کیا۔

ہمارے گاؤں بندی گھاٹ میں کبھی بھی اسلامی احکامات کی خلاف ورزی کرنے کی ہمت کسی شخص کو نہیں تھی۔ ہمیشہ اصلاح کمیٹی سرگرم رہی۔ اخلاقیات پر بھی بہت زور دیا جاتا تھا۔ ایسے میں ایک شخص کے بارے میں پتہ چلا کہ شراب نوشی کی لت لگا کر بمبئی سے لوٹے ہیں۔ مولانا گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ آپ کو جب اس شخص کے منکر عمل کے بارے میں معلوم ہوا تو آپ نے نوجوانوں سے اس کو لاکر پیش کرنے کا حکم دیا جب اس شخص کو معلوم ہوا کہ مولانا نے بلایا ہے تو وہ شخص بھاگ کھڑا ہوا اور باہر ہی باہر بمبئی چلا گیا۔ بعد میں شراب نوشی ترک کرکے نمازی بن کر گاؤں واپس آیا۔

گاؤں میں مولانا کا ایک مشہور اور بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ ستر کے دہے میں گاؤں کے دو متمول خاندانوں میں تنازعہ پیدا ہوگیا تھا۔ یہ تنازعہ اس حد تک پہنچ گیا کہ دونوں خاندانوں کے دروازے پر لوڈ کی ہوئی بندوقیں رکھی رہتی تھیں۔ اور اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت خون خرابہ ہوسکتا ہے۔ گاؤں میں مولانا کی اتنی عزت تھی اور آپ کا اتنا احترام تھا کہ آپ کی کہی ہوئی بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ آپ کی کہی ہوئی ہر بات مان لی جاتی تھی۔ اس موقع پر آپ نے برسرپیکار دونوں خاندانوں کو بلایا اور صلح کروائی۔ جو پائیدار صلح ثابت ہوئی۔

راقم الحروف جب ۱۹۸۱ء میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعۃ الفلاح، بلریا گنج گیا وہاں مولانا کے چاہنے والے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگ مولانا کی خیریت پوچھتے تھے اور مولانا کو یاد کرتے تھے۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے بتایا کہ مدرسۃ الاصلاح میں مولانا کی شرافت کے چرچے تھے اور لوگ مولانا کو 'اللہ میاں کی گائے' کہا کرتے تھے۔ یہ تشبیہ آپ کی بے ضرر اور معصوم شخصیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے دی جاتی تھی۔ جامعۃ الفلاح کے ذمہ داران چاہتے تھے کہ مولانا جامعۃ الفلاح آجائیں، اس

وقت کے جامعۃ الفلاح کے صدر مدرس مولانا عبدالحسیب صاحب نے مجھ سے مولانا کی خیریت معلوم کی اور ارادہ ظاہر کیا کہ مولانا کو جامعۃ الفلاح میں بحیثیت استاذ لانا ہے۔ حکیم ایوب صاحب جو علاقہ کے مشہور طبیب اور بااثر شخصیت تھے، غالباً وہ اس وقت مدرسہ کے ناظم بھی تھے، انھوں نے بھی کوشش کی کہ مولانا کو مدرسہ لایا جائے۔ وہ اس سلسلہ میں دو مرتبہ بندی گھاٹ بھی تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ تو خاص مولانا سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تھے۔

مولانا کی زندگی بڑی سادہ تھی، ڈاکٹر زاہد صاحب نے مولانا کے بنارس قیام کے دوران کا ایک واقعہ سنایا کہ مولانا جامعہ مظہر العلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، سخت جاڑے کے موسم میں بھی مولانا بغیر لحاف کے سوتے تھے۔ سردی کی وجہ سے ساری رات ٹھٹھرتے رہتے تھے، لیکن لحاف نہیں بنواتے تھے۔ یہ دیکھ کر آپ کے ایک شناسا نے لحاف بنوانے کی ایک ترکیب نکالی۔ انھوں نے مولانا سے کچھ پیسے مانگے، مولانا نے لیٹے لیٹے ہی کمرے میں پڑے ایک باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں سے لے لیجیے۔ آپ کے شناسا نے لحاف بنوانے کے بقدر پیسے لے لیے اور ایک لحاف بنوا کر آپ کے کمرے میں لے آئے۔ آپ نے احتجاج کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے تو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ آپ نے یہ زحمت کیوں کی۔

ایک زمانے میں جب ٹرین میں سلیپر کلاس نہیں ہوا کرتا تھا اور سیکنڈ کلاس اور سلیپر کے کرایہ میں صرف ریزرویشن چارج کا فرق تھا۔ مولانا بغیر ریزرویشن کے جنرل ڈبے میں یا سلیپر میں سفر کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ معمولی کرتا، پائجامہ، ٹوپی اور ہوائی چپل میں رہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی سفر میں صدری بھی پہن لیا کرتے تھے۔

آپ کے بڑے بیٹے مجاہد سلیم اکثر میری دہلی رہائش گاہ پر آیا کرتے تھے۔ میرے بچوں کو جب انھوں نے دفتر میں جھاڑ و پونچھا کرتے ہوئے دیکھا تو بتایا کہ ہم بھی اسی طرح مدرسہ میں صفائی کیا کرتے ہیں۔

یوں تو مولانا خاموش طبع اور کم سخن تھے اور ملکی سطح پر بہت نمایاں شخصیت کے مالک نہیں تھے لیکن فکر کی پختگی اور اپنی دوٹوک رائے ظاہر کرنے میں بہت نمایاں تھے اور کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ گاؤں کے ایک بھائی علی گڑھ سے وکالت پڑھ کر آئے تھے اور مولانا سے بات کرتے ہوئے روشن خیالی کا اظہار کر رہے تھے تو مولانا نے برملا ان سے کہا کہ ایسے ہی خیالات کے حامل افراد کو منافق کہا جاتا تھا۔

دہلی میں ۱۹۹۴ء میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس کا مرکزی موضوع تھا ”شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے سیاسی عمل میں شرکت“ اس سیمینار میں فضل الباری صاحب جو یوپی قانون سازیہ کے دو مرتبہ رکن منتخب ہوئے تھے شریک تھے۔ فضل الباری صاحب خود انتخابی سیاست میں تو شریک ہوتے تھے اس سے آگے بڑھ کر جو لوگ انتخابی سیاست میں شرکت کے خلاف تھے، اُن کو وہ منافق قرار دیتے تھے۔ اس سیمینار میں مولانا بھی

اپنے مقالہ کے ساتھ تشریف لائے تھے۔آپ نے مقالہ مکمل پڑھنے کے بعد فضل الباری صاحب کے سوالات کا دوٹوک اور مسکت جواب دیا۔

مولانا کا ایک بہت ہی اہم رسالہ ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' ہے۔اس کتاب کا پس منظر ہندوستان میں ہونے والے فسادات جیسے بھاگلپور، ہزاری باغ، نیلی (آسام)، مرادآباد اور میرٹھ میں ملیانہ اور ہاشم پورہ کے قتل عام اور حیدرآباد کا فساد تھا۔آپ نے اس رسالہ میں ملت کے دفاع کی صورتحال کا بے باک جائزہ لیا ہے۔ان خوں ریزیوں میں ریاست اپنی تمام نیم فوجی دستوں کے ہم راہ قتل عام میں ملوث تھی اور ان پر قانونی کارروائیاں بھی نہیں ہوتی تھیں۔اس وقت کی حکمراں جماعت مجرم نیم فوجی دستوں کے اہلکاروں کی پشت پناہ رہی اور کسی کو بھی جرم کی سزا نہیں دی گئی۔آپ نے اس رسالہ میں یہ واضح کیا کہ ایسی صورتحال میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جارح کون ہے، قصوروار اور بے قصور کون ہے؟ بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سا شخص اپنی قوم سے تعلق رکھتا ہے اور کون متحارب قوم سے۔متحارب قوم کا ہر فرد قصوروار مانا جائے گا۔اس سلسلے میں آپ کا ایک اہم فتویٰ یہ ہے کہ جہاد کے لیے امیر کی امارت لازم نہیں ہے۔آپ کا یہ فتویٰ معاصر زعماء اور علماء کی رائے کے برعکس ہے، جس میں مظلوم بن کر مرجانے کو ترجیح حاصل نہیں ہے۔

آپ کا ایک اور اہم رسالہ ''مساجد اللہ'' ہے۔اس رسالہ کا پس منظر بابری مسجد کی شہادت ہے، بابری مسجد کے سلسلے میں یہ موقف ہے کہ بابری مسجد مسجد تھی، مسجد ہے اور قیامت تک مسجد رہے گی۔آپ کی مستقل رائے یہ تھی کہ جس طرح بیت اللہ میں بتوں کی موجودگی کے باوجود وہ بیت اللہ رہا اور وقت آنے پر اسے بتوں کی نجاست سے پاک کر دیا گیا اسی طرح بابری مسجد میں بت رکھے جانے کے باوجود وہ مسجد ہے اور اس کی یہ حیثیت باقی رہے گی اور وقت آنے پر اسے بتوں سے پاک کر دیا جائے گا۔اس پس منظر میں شرک کے خلاف مہم چلائی گئی تھی۔مولانا نوجوانوں کو شرک کے خلاف مہم چلانے کے لیے ابھارتے رہے۔آپ کی رائے میں اس وقت سب سے اہم کام یہی تھا۔آپ نے راقم کو بھی یہ نکتہ سمجھایا تھا، اس سلسلہ میں راقم کی رائے بھی یہی تھی کہ شرک کا ابطال ہمہ گیر نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے۔آپ سے گفتگو کے نتیجہ میں راقم نے 'مومنٹ' میں دو مضامین ''شرک ایک ظالمانہ نظام زندگی'' اور ''شرک، ظلم اور مندر'' کے عنوان سے لکھے۔

دعا یہی ہے کہ مولانا نے جو رہنمائی ملت کی کی ہے، اللہ اسے عام کرنے کی راہیں ہموار کرے اور مولانا کی خدمات جلیلہ کو قبول فرما کر بہترین اجر و ثواب سے انھیں نوازے۔آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
امتیازی اوصاف

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، دہلی
سکریٹری شریعہ کونسل، جماعت اسلامی ہند

تحریکِ اسلامی ہند سے وابستہ جن شخصیات نے ہمہ جہت خدمات انجام دی ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے بڑے پیمانے پر خلقِ خدا کو فیض پہنچایا ہے، ان میں سے ایک نمایاں نام مولانا عبدالعلیم اصلاحی (م ۲۷ر ستمبر ۲۰۲۲ء) کا ہے۔ ان کی شخصیت کا جائزہ لیں تو تین بہت ابھرے ہوئے پہلو نظر آتے ہیں: تدریس، تحریک اور تصنیف۔ آئندہ سطور میں انھی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔

① تدریس

مولانا اصلاحی کا تعلق ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے قصبہ بندی گھاٹ سے تھا۔ وہاں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں آپ کا داخلہ مشہور دینی درس گاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں ہو گیا تھا، جہاں آٹھ برس تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں آپ کی فراغت ہوئی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث ندوی اصلاحیؒ اور مولانا جلیل احسن ندویؒ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اصلاح سے فراغت کے بعد آپ کی پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گزری۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

انما بعثت معلمًا (ابن ماجہ: ۲۲۹) ''میری بعثت معلم کی حیثیت میں ہوئی ہے۔''

مولانا اصلاحی زندگی بھر یہ کارِ نبوت انجام دیتے رہے۔ مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد ایک برس

وہیں ہاسٹل کے نگراں کی حیثیت سے رہے۔ مزید دو برس اعظم گڑھ میں قیام کرکے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے استفادہ کیا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں جامعہ مظہر العلوم بنارس چلے گئے، جہاں ۱۹۷۰ء تک مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو مدرسۃ الاصلاح بلالیا گیا اور صدر مدرس بنادیا گیا۔ وہاں آپ نے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے ساتھ تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ کچھ دنوں جامعۃ الفلاح میں بھی درس وتدریس کا کام کیا۔

ملک میں ایمرجنسی (آغاز ۲۵/جون ۱۹۷۵ء) نافذ ہونے سے قبل آپ جماعت اسلامی ہند کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر تشریف لے گئے۔ پھر یہ مدرسہ حیدرآباد منتقل کردیا گیا تو وہاں آگئے اور مستقل اس کی تعمیر وترقی میں لگے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں حیدرآباد میں مولانا کی نظامت میں لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعۃ البنات کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے اس کے نشو ونما اور استحکام کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کردیں، اس کے انتظامات میں دلچسپی لے کر اور ان کی نگرانی کرکے اسے بامِ عروج پر پہنچایا اور اس میں تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ اس طرح جامعۃ البنات کا شمار ملک میں لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے ممتاز اداروں میں ہونے لگا۔ لیکن ۲۰۱۲ء میں جامعہ کے بارے میں بعض تنازعات پیدا ہونے کی وجہ سے مولانا نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایک دوسرا مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے قائم کیا جس سے زندگی کی آخری سانس تک وابستہ رہے اور بہ حیثیت ناظم خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تفصیل سے بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی کی پوری زندگی تعلیم وتدریس میں صرف ہوئی۔ انھوں نے ہزاروں طلبہ وطالبات کو فیض پہنچایا۔ ان کے شاگرد نہ صرف پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، بلکہ خاصی تعداد بیرونِ ملک بھی دینی، سماجی اور رفاہی خدمات انجام دے رہی ہے۔

② تحریک

تحریکِ اسلامی ہند سے مولانا اصلاحی کی وابستگی بالکل ابتدائی زمانے میں ہوگئی تھی، جب وہ مدرسۃ الاصلاح میں طالب علم تھے۔ اس زمانے میں سرائے میر واطراف میں منعقد ہونے والے تمام اجتماعات میں وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی ہند کے جو ارکان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کا مشاورتی اجلاس اپریل ۱۹۴۸ء میں الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ اس کے بعد پہلا اجتماع اعظم گڑھ میں منعقد ہوا تو مولانا اصلاحی اس میں شریک تھے، البتہ اس وقت تک انہیں رکنیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں جماعت کا کل ہند اجتماع رام پور میں ہوا تو اس میں انھوں نے بہ حیثیت رکن جماعت شرکت کی۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک جب مولانا جامعہ مظہر العلوم بنارس میں استاد تھے، وہ شہر کے امیر مقامی رہے۔ اس زمانے میں

انھوں نے جماعت کی توسیع کے لیے خوب جدوجہد کی۔

اس کے بعد جن دنوں وہ مدرستہ الاصلاح میں صدر مدرس تھے، سرائے میر کی مقامی جماعت کی امارت بھی ان کے ذمہ تھی۔ حیدرآباد میں اپنے زمانہ قیام میں بھی مولانا تحریکی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی شخصیت وابستگان تحریک کے لیے فکری رہ نما کی سی تھی۔ ساتھ ہی وہ عملی کاموں میں بھی نہ صرف شریک، بلکہ پیش پیش رہتے تھے۔ کسی زمانے میں مولانا کو شہر حیدرآباد کی مقامی جماعت کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔

مولانا اصلاحی جماعت اسلامی کی نظریاتی اساس کے بارے میں سخت اور بے لچک موقف رکھتے تھے۔ الیکشن کے موضوع پر جماعت کی بدلتی پالیسیوں پر وہ ہمیشہ نا قدر ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جب مرکزی مجلس شوریٰ نے چند شرائط کے ساتھ ارکان جماعت سے ملکی الیکشن میں ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھالی تو مولانا نے اس سے اپنے اختلاف کا برملا اظہار کیا۔ بعض دیگر امور و معاملات میں بھی مولانا اپنی ایک رائے رکھتے تھے اور بغیر کسی تکلف اور لاگ لپیٹ کے کھل کر اس کا اظہار کرتے تھے، چاہے اس کی زد مقامی جماعت یا حلقہ یا مرکز کی طے شدہ پالیسیوں پر پڑے۔ ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد میں فسادات ہوئے تو ان سے نپٹنے اور ملت کے دفاع و تحفظ کے لیے انھوں نے ایسی آراء پیش کیں جن سے مقامی جماعت کو اتفاق نہ تھا، چنانچہ مولانا کے خلاف کارروائی کی گئی اور ان کی رکنیت معطل کر دی گئی لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے بحال کر دیا گیا۔

بابری مسجد کی شہادت (۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء) کے بعد مسلمانوں کی جانب سے اس کی بازیابی کے لیے متعدد تحریکیں چلائی گئیں۔ اس معاملے کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے ہاتھ میں لیا اور سپریم کورٹ میں اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ جماعت اسلامی ہند بھی اس معاملے میں اپنا ایک موقف رکھتی تھی اور اس کے مطابق حسب ضرورت اور حسبِ توفیق سرگرمیاں انجام دیتی تھی۔

اس پس منظر میں ۲۰۰۱ء میں ملک کے بعض حضرات نے تحریک تحفظ شعائر اسلام کے نام سے ایک گروپ تشکیل دیا اور کچھ عملی اقدام طے کیے۔ مولانا اصلاحی نے اس گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔ جماعت کے ذمہ داروں کی رائے تھی کہ بابری مسجد اور دیگر شعائر اسلام کے تحفظ کے لیے الگ سے کسی گروپ کو تشکیل دینے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیے جماعت کے پلیٹ فارم کے تحت اور اس کی پالیسیوں کے مطابق ہی سرگرمیاں تجویز کی جائیں اور انھیں انجام دیا جائے۔ اس لیے مولانا سے خواہش کی گئی کہ وہ نئی قائم ہونے والی تحریک سے لاتعلقی ظاہر کریں۔ لیکن مولانا اس کام کو اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے علیحدگی پر آمادہ نہیں ہو

سکے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ان کے خلاف نظم جماعت کی طرف سے کارروائی کی گئی اور اس نئی تحریک سے وابستگی اختیار کرنے والے ارکان جماعت کا اخراج عمل میں آیا، جن میں سے ایک مولانا بھی تھے۔

جماعت اسلامی ہند کی رکنیت سے اخراج ایک ضابطہ کا معاملہ تھا، ورنہ تحریک اسلامی کی بنیادی فکر تو مولانا کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس سے وابستگی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہی اور وہ اس فکر کو برابر دوسروں میں منتقل کرتے رہے۔

(۳) تصنیف

مولانا اصلاحی نے تعلیم وتدریس میں ہمہ وقت مصروف رہنے اور تحریک اسلامی کی عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی دلچسپی لی۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر آپ کی ایک درجن سے زائد تصنیفات زیورطبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔

جس زمانے میں مولانا جامعہ مظہر العلوم بنارس سے وابستہ تھے، آپ کا ایک کتابچہ دارالاسلام اور دارالحرب کے عنوان سے طبع ہوا تھا۔ اسے علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے جریدہ 'صدق جدید' لکھنؤ میں اور مولانا عامر عثمانیؒ نے ماہ نامہ 'تجلی' دیوبند میں اس پر گراں قدر تبصرے کیے تھے اور اس کی ستائش کی تھی۔ اس کتابچہ میں مولانا نے قدیم فقہی لٹریچر کے حوالوں سے دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات کی وضاحت کی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

> ''ان وجوہ سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا، مگر جیسا کہ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں، دارالحرب کے احکام لاگو ہونے کے لیے مسلمانوں کا مکمل جہادی پوزیشن میں ہونا بھی شرط ہے اور یہ شرط یہاں مفقود ہے، اس لیے موجودہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت سے دارالحرب کے اکثر احکام لاگو نہ ہوں گے۔'' (ص:۶۵)

مولانا کا ایک کتابچہ 'سیکولر جمہوری نظام، الیکشن، تحریک اسلامی' کے نام سے ہے۔ اس موضوع پر ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے ترجمان ماہ نامہ 'زندگی نو' میں پروفیسر عمر حیات خان غوری، ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری اور جناب ریاض احمد خاں کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین میں جماعت کی الیکشن پالیسی زیر بحث آئی تھی۔ ان حضرات کی تحریریں جماعت کی پالیسی کی تائید میں تھیں۔ اس کتابچہ میں مولانا نے ان حضرات کی آراء کا محاکمہ کیا ہے۔ مولانا کے نزدیک الیکشن میں کسی بھی طرح سے حصہ لینا عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔

مولانا اصلاحی کی ایک کتاب 'جاہلیت کے خلاف جنگ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے تصورِ جہاد سے بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک فریضہ جہاد کسی بھی زمانے میں ساقط نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے

اسلامی ریاست اور مسلم حکمراں ہونا ضروری نہیں ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو اور انھیں اسلام پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہو تو وہ ایک گروپ بنا کر جنگی کارروائی کر سکتے ہیں۔

وہ حضرت ابوبصیرؓ کے واقعہ کو بیان کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

''آج ابوالبصیر کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ، کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنانِ دین وملت کو نشانہ بنائے تو کیوں کر غلط ہو سکتا ہے۔'' (ص:۴۰)

مولانا کے کچھ اور کتابچے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: نظامِ خلافت وامارت کی شرعی حیثیت، ملت کے دفاع کا مسئلہ، بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں، صحیح اسلامی فکر کیا ہے؟، ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ مجسموں کا مسئلہ، مساجد اللہ، طاقت کا استعمال: قرآن کی روشنی میں، لا اکراہ فی الدین، زکوٰۃ کی اہمیت۔ یہ تمام کتابچے مکتبہ الاقصی، سعید آباد، حیدر آباد سے شائع ہوئے تھے۔

مولانا اصلاحی کے افکار پر محاکمہ کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ موقع اس کا متحمل نہیں ہے۔ خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آراء سے اتفاق نہ ہو تب بھی ان کے تحقیقی انداز بیان اور سنجیدہ اسلوب کی ستائش نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے ان کے ایک رسالے پر تبصرہ کرتے ہوئے جو بات کہی تھی وہ ان کی تمام تحریروں پر صادق آتی ہے:

''اندازِ بیان مناظرانہ نہیں، بلکہ تحقیقی سنجیدہ اور سلجھا ہوا، جس کی توقع ہر اصلاحی اور ہر ندوی سے کی جا سکتی ہے۔ مدلل رسالہ، موافق اور مخالف ہر فریق کے ہاتھ میں جانے کے قابل اور سنجیدگی سے غور وفکر کا مستحق ہے۔''

اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، انھیں ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے، ان کی مغفرت کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین یارب العالمین۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو!
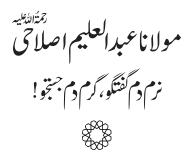
ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد
سابق اسوسی ایٹ پروفیسر سیاسیات، حیدرآباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا سانحۂ ارتحال ملت اسلامیہ اور بالخصوص تحریک اسلامی کے وابستگان کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے۔ قضاء وقدر کے فیصلے من جانب اللہ ہوتے ہیں۔ اسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت روک نہیں سکتی۔ وقت موعود آنے پر ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ قرآن مجید میں زندگی سے پہلے موت کا تذکرہ کیا گیا۔ سورہ ملک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔''

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ساری حقیقتوں سے واقف کراتے ہوئے یہ بتادیا کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے۔ کوئی اور قوت اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی وضاحت سے بیان کر دی گئی کہ یہ عارضی زندگی دراصل ایک امتحان ہے، جہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ کون بہتر عمل کر رہا ہے اور کون برائی کا خریدار بن رہا ہے۔ جو لوگ نیکی کو اختیار کریں گے انہیں جنت کی بشارت دی گئی اور جو برائی کے خوگر ہوں گے ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ خوش نصیب اور کامیاب ہیں وہ ہستیاں جو اپنی حیاتِ مستعار میں نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتی ہیں۔ مولانا مرحوم کا شمار بھی خدا کے ان نیک بندوں میں ہوتا ہے جنہوں نے سخت آزمائشوں کو برداشت کرتے ہوئے بھی نیکیوں کے راستے سے انحراف نہیں کیا۔ وہ اس پُر خار راہ پر آخری وقت تک چلتے رہے جہاں مصائب اور مشکلات ہی اہلِ حق کے انتظار میں ہوتی ہیں۔

مولانا عبدالعلیمؒ، ایک عالم باعمل تھے، قحط الرجال کے اس دور اضطراب میں ان کا اس دار فانی سے دار البقاء کی جانب کوچ کر جانا ایک عالَم کی موت ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ قیامت کے قریب علم اٹھالیا جائے گا۔ علماءِ حق کی وفات دنیا سے علم اٹھ جانے کی علامت ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "موت العالِم موت العالَم"، یعنی عالِم کی موت عالَم کی موت ہے۔ مولانا محترم کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک جید عالم دین، ایک بہترین مربی، تجربہ کار منتظم کے ساتھ ساتھ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے۔ مولانا کو ایک مردِ مجاہد بھی کہنا کوئی مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں بھی حق وصداقت کے لئے اپنی جان نچھاور کر دینے کا جذبہ ان میں ماند نہیں پڑا تھا۔ مولانا کے انتقال سے علمی اور تحقیقی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پر نہیں ہوسکتا۔ لیکن سخت ترین حالات میں اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف ڈٹ جانے کا جو حوصلہ انہوں نے اپنے چاہنے والوں میں پیدا کیا تھا، اب ایسا حوصلہ دینے والے کم ہی باقی رہ گئے ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ نے برسوں درس وتدریس کے ذریعہ نوخیز نسل کی دینی آبیاری کی۔ پہلے جامعہ دارالہدیٰ، پھر جامعۃ البنات اور آخر میں جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے بانی اور ناظم کی حیثیت سے انہوں نے لاکھوں لڑکیوں کو علمِ دین سے آراستہ کرتے ہوئے نسلوں کی تعمیر کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا نے اپنے آپ کو صرف پڑھنے پڑھانے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ دین کی اقامت کے لئے اپنی زندگی کے قیمتی سال لگا دیئے۔ جماعت اسلامی ہند سے مولانا کی وابستگی کا دور اُن کی زندگی کا ایک یادگار دور رہا۔ مولانا اس دوران جماعتی حلقوں میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ہزاروں کارکنوں اور متفقین کی انہوں نے تربیت کی اور انہیں دین کا صحیح شعور عطا کیا۔ دینی امور میں مولانا کا ایک خاص نقطۂ نظر رہا۔ وہ اپنے موقف کو قرآن وحدیث کے دلائل اور فقہی اصولوں کے ذریعہ ثابت بھی کرتے تھے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ دین کے معاملے میں کسی مداہنت کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ باطل نظریات کے علمبردار جب اپنے غلط افکار کو بزورِ طاقت دوسروں پر مسلط کرنے کی ہمت کر رہے ہیں تو پھر حاملینِ دین کو کس بات کا ڈر وخوف ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو بلاکم وکاست دنیا کے سامنے پیش نہ کریں۔ 90 کے دہے میں جب بابری مسجد کی بازیابی کا مسئلہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ مسلمانوں کی مسلمہ تنظیمیں اور جماعتیں اس مسئلہ کو عدالت کے ذریعہ حل کرنے پر زور دے رہی تھیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا یہ اٹل موقف تھا کہ جس طرح بابری مسجد کو دہشت گردی کے ذریعہ شہید کر دیا گیا اور مسلمانوں کی عبادت گاہ چھین کر اسے بتکدہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے، مسلمان بھی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دوبارہ حاصل کریں۔ مولانا کا ماننا تھا کہ مسلمان، قانون، عدالت، پارلیمنٹ، حکومت یا کسی اور پر بھروسہ کر کے بابری مسجد کو بازیاب نہیں کر سکتے۔ مولانا کے یہ اندیشے اس وقت صحیح ثابت ہو گئے جب ملک کی

سپریم کورٹ نے ''آستھا'' کے نام پر فیصلہ ہندوؤں کے حق میں دے دیا۔ مسلمان سارے تاریخی ثبوت اور شہادتیں رکھتے ہوئے ناکام ہو گئے۔ مولانا نے بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ بابری مسجد کی شرعی حیثیت کو مسلمانوں کے سامنے لانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن مولانا کی یہ دل کی آواز صدا بہ صحرا ہو گئی۔

مولانا اصلاحیؒ، قرآن وحدیث کے علاوہ اصولِ فقہ پر بھی کافی دسترس رکھتے تھے، اس لئے علماء کے درمیان ان کی باتوں کو اہمیت تو دی جاتی تھی لیکن مختلف وجوہ کی بناء پر ان کی رائے کو قبول کرنے سے گریز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا جواب علماء ہی دے سکتے ہیں کہ آخر مولانا کے موقف کو تسلیم کیوں نہیں گیا؟ مولانا ایک مجتہد تھے، اور جب تک اجتہاد کا دروازہ بند نہ ہو کسی کو حق نہیں کہ قرآن وسنت کی بنیاد پر دی جانے والی رائے کو مصلحت وقت کی آڑ میں رد کر دیا جائے۔ مولانا کی زندگی کے آخری دور میں ان کے ساتھ یہی ہوا۔ لوگ ان کے پاس آنے سے بھی کترانے لگے تھے۔ اس لئے کہ حاکمِ وقت نے بھی ان پر نظریں گاڑ لیں تھیں۔ راہ حق کے اس مسافر کو حکومت کی ایجنسیوں کی جانب سے ستانے، ڈرانے، ہراساں کرنے کے علاوہ جھوٹے مقدمات میں ماخوذ کرنے کی بھی گھٹیا حرکتیں ہوتی رہیں۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے دین پر پوری استقامت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی زندگی گزاری۔ وہ نہ آزمائشوں سے گھبرائے اور نہ کسی لالچ کا شکار ہوئے، یہی ان کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہوگا۔

مولانا نے اپنے جواں سال بیٹے کو بھی اس راہ میں کھو یا لیکن کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ وہ ہر حال میں راضی بہ رضا رہے۔ مولانا کے علم، ان کے اخلاص، ان کی للّٰہیت، اور ان کی قربانیوں کو تہہ دل سے تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی ایک انسان تھے۔ بعض بشری کمزوریوں کی وجہ سے مولانا میں شدت پسندی کا عنصر ان کی زندگی کے آخری دور میں غالب آ گیا تھا۔ وہ ہر مسئلہ میں اپنے اٹل موقف پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ سنگین حالات میں بھی وہ چھوٹے ضرر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بہر حال مولانا کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن مولانا کا ہمارے درمیان میں سے اٹھ جانا ایک جانکاہ حادثہ ہے۔ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں بار بار منصۂ شہود پر نہیں آتیں۔ ہزاروں سال نرگس کو آنسو بہانا پڑتا ہے تب کہیں چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔

مولانا نے جس تندہی اور اخلاص کے ساتھ اسلامی فکر کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور اپنے علم سے ایک دنیا کو سیراب کیا، امید ہے کہ ان کے جانشین مولانا کے مشن کو اور آگے بڑھائیں گے اور دین کی خدمت اور امت کی اصلاح کے لئے فکرمند رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی دینی، ملی، تحریکی اور علمی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا کرے اور اس کا بہترین اجر انہیں روزِ آخرت دے اور ملت کو ان کا نعم البدل ملے۔ آمین!

آئینہ تھا ترا کردار، پُراسرار نہ تھا

(مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ: طلبہ تحریک 'ایس آئی ایم' کے تناظر میں)

نعمان بدر فلاحی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو حکومت ہندوستان کے ذریعہ کالعدم قرار دیئے جانے سے قبل اپنی عملی زندگی کے آخری چند سالوں میں طلبہ تحریک ایس آئی ایم اس بات کی کوشش کرتی رہی کہ کفر و شرک کے اس گہوارے میں اسلامی عقیدے اور فکر کی بنیاد پر امتی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اکابرین ملت اسلامیہ سے مختلف مواقع پر ملاقاتوں، تبادلہ خیالات اور استفادہ کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اس ضمن میں حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے بزرگوں اور اکابرین ملت میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری جناب عبدالرحیم قریشی، مولانا سلیمان سکندر (نائب صدر کل ہند تعمیر ملت) اور جناب عبدالحفیظ خان (مدیر ماہنامہ رہگذر) وغیرہ کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی کا نام سرفہرست ہے۔

ایس آئی ایم کے قیام سے قبل تحریکی نوجوانوں سے ربط و تعلق

ایمرجنسی کے دوران کل ہند طلبہ تحریک کے قیام سے قبل ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک کا تین سالہ دور یوپی میں طلبہ اور نوجوانوں کے کام کا سنہری دور تھا۔ یوپی کی سطح پر شعبۂ طلبہ جماعت اسلامی یوپی کے ذمہ دار راؤ عرفان احمد خاں صاحب کی نگرانی میں قائم رابطہ کمیٹی کی کوششوں سے ۱۹۷۰ء میں یوپی کے تقریباً ۴۰ مقامات پر طلبہ کی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں وجود میں آ گئی تھیں۔ اس دوران مختلف شہروں میں یکے بعد دیگرے متعدد اجتماعات منعقد ہوئے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اُس زمانے میں نوجوان تھے اور بنارس کے ایک مدرسے میں تدریسی خدمات

انجام دے رہے تھے۔ ایس آئی او علی گڑھ کے ترجمان اور اسلامک لائبریری شمشاد مارکیٹ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ 'خبرنامہ' کی ابتدائی فائلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ علی گڑھ کی طلبہ تنظیم 'ایس آئی او' کے رابطے میں تھے۔ رابطہ کمیٹی کے ذمہ دار راؤ عرفان احمد خاں صاحب کے منصوبے کے مطابق ۷/۸ رجون ۱۹۷۰ء کو جامعہ مظہر العلوم، بنارس میں مشرقی یوپی کے طلبہ اور نوجوانوں کے لیے پہلا دوروزہ تربیتی اجتماع منعقد ہوا جس میں گورکھپور، گونڈا، بستی، لار، اعظم گڑھ اور الہ آباد وغیرہ سے بڑی تعداد میں نوجوان شریک ہوئے تھے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ مشرقی اتر پردیش کے اس پہلے ۲روزہ تربیتی اجتماع کے آرگنائزر تھے۔

۱۹۷۲ء میں تنظیم نے ''اسلامی تحریک'' کے مرکزی عنوان پر اپنے مجوزہ سالانہ اجتماع کے لیے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مولانا سید حامد حسین، مولانا سید حامد علی، مولانا سید جلال الدین عمری، مولانا صدرالدین اصلاحی، امیر جماعت اسلامی مولانا محمد یوسف اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے بھی ایک مقالہ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ (خبرنامہ، ۲۵/اگست ۱۹۷۲ء، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ)

دسمبر ۱۹۷۲ء میں گورکھپور میں طلبہ ونوجوانوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا تو اس میں مولانا کا مقالہ بعنوان'' اسلامی معاشرہ کیسے پیدا ہوتا ہے'' پڑھا گیا۔ (خبرنامہ، ۷ جنوری ۱۹۷۳ء، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ)

حیدرآباد میں وابستگان ایس آئی ایم کی فکری رہنمائی اور تربیت

حیدرآباد میں اپنے لہو سے فکر اسلامی کے چراغ کو روشن کرنے والے ایس آئی ایم کے سابق انصار خواجہ رفیع الدین، سابق ممبر برادر فصیح الدین اور تنظیم کے ہمدرد میر محمود علی کی ذہنی، فکری اور نظریاتی تربیت میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

۱۲/جون ۱۹۹۳ء کی شب آندھرا پردیش کی متعصب پولیس نے حیدرآباد کے مضافات میں اسلام پسند، صالح، باکردار، جذبۂ ایثار وقربانی سے لبریز اور اصلاح معاشرہ کی تحریک میں پیش پیش ان تینوں نوجوانوں کو فرضی انکاؤنٹر میں شہید کر دیا تھا۔ (اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ شَھَادَتَھُمْ فِیْ سَبِیْلِکَ)

سائنس میں گریجویٹ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم خواجہ رفیع الدین زونل سطح کے ایک متحرک اور فعال انصار تھے۔ ۱۹۸۷ء میں انہیں برادر صلاح الدین صاحب کے ساتھ زونل صدر برادر عزیز اللہ کا معاون بنایا گیا تھا۔ فروری ۱۹۹۳ء میں ایس آئی ایم سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔

ضلع نلگنڈہ کے رہنے والے برادر محمد فصیح الدین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی (M.sc) کیا تھا۔ ایک صالح، متحرک اور ملی غیرت وحمیت سے سرشار نوجوان کی حیثیت سے تمام دینی وملی حلقوں میں یکساں

مقبول تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست ہو یا پولس کی سرپرستی میں شہر حیدرآباد کے ایک مخصوص علاقہ سے جسم فروشی کے اڈوں کے خاتمہ کی مہم ہو،اُن کی فعالیت کے سب معترف تھے۔

میر محمود علی شہید پیشے کے اعتبار سے میکینک تھے مگر ملی حمیت اور دینی ودعوتی جذبہ سے سرشار ہمیشہ خدمت خلق کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔

منتخب انصار تزکیہ کیمپ، ناگپور میں شرکت

مرکزی منصوبہ کے مطابق ایس آئی ایم کے انصار کیڈر کی فکری، نظریاتی اور عملی تربیت وتزکیہ کے لیے ۹ تا ۱۵ راگست ۱۹۹۵ء کوسنگتروں کے شہر ناگپور میں منتخب انصار کا ہفت روزہ کیمپ منعقد ہوا جس کا مرکزی موضوع تھا ''ہندوستان اورامت مسلمہ کے پس منظر میں تحریک اسلامی اور دور جدید''۔

مرکزی عنوان کے تحت تقاریر، گروپ ڈسکشن، موڈریشن، مذاکرہ اور سوالات وجوابات کے ذریعہ ملک کے مختلف مقامات سے آنے والے طلبہ اورنوجوانوں کی رہ نمائی کی گئی۔ اہم شخصیات جو کیمپ میں شریک ہوئیں اور جن سے استفادہ کیا گیا وہ درج ذیل ہیں۔

جناب امین الحسن رضوی علیگ (سابق مدیر ریڈینس، دہلی) مولانا سعود عالم قاسمی (استاذ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) جناب اشرف جعفری (صدر تحریک احیاء امت) ڈاکٹر یوسف امین (استاذ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مولانا عبدالبراثری (رکن مرکزی مجلس شوریٰ) پروفیسر جواہراللہ (تمل ناڈو) ڈاکٹر محمد اجمل فاروقی (دہرہ دون) مولانا عبداللطیف آئمی، جناب جمیل احمد صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک دعوہ مشن) صدر تنظیم مولانا عبدالعزیز سلفی کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی شریک ہوئے اور'ہندوستانی نظام اورتحریک اسلامی' کے موضوع پر ایک مدلل اور علمی گفتگو کی۔

وادی السلام (کیرلا) میں منعقد اسرہ کیمپ میں شرکت

مرکزی وصوبائی ذمہ داران کی تربیت وتزکیہ کے لیے اخوان المسلمون کے طرز پر اسرہ نظام تربیت سے ماخوذ اہم ترین مرکزی پروگرام یکم تا ۵ رجون ۱۹۹۸ء کو وادی السلام (کیرلا) میں منعقد ہوا تو دیگر مربی، مذکر اور مقرر حضرات کے ساتھ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب بھی کیمپ میں شریک ہوئے اور''نظام باطل اور جہاد فی سبیل اللہ'' کے موضوع پر ایک پرمغز گفتگو کی۔

حیدرآباد ریجنل ٹریننگ اسکول میں شرکت

ایس آئی ایم سینٹر کی جانب سے ۲-۶ جون ۱۹۹۹ء کو ایک بار پھر ریجنل ٹریننگ اسکول (R.T.S) کا انعقاد

ہوا تا کہ کرناٹک، آندھرا اور مہاراشٹرا کے بعض علاقوں کے نئے رفقاء صالحین کی صحبت اور تقریروں سے اپنا تزکیہ کر سکیں۔ اس ریجنل ٹریننگ اسکول میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے بطور خاص استفادہ کیا گیا۔

اورنگ آباد اخوان کانفرنس میں شرکت اور خطاب

"فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْن" کے مرکزی عنوان پر ۵، ۶، ۷ نومبر ۱۹۹۹ کو اورنگ آباد کے مولانا آزاد ہائی اسکول میں منعقد ہونے والی دوسری ریجنل اخوان کانفرنس میں مولانا مجیب اللہ ندوی (ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ) مولانا عطاء الرحمان وجدی، شیخ محبوب علی (امیر درسگاہ جہاد وشہادت حیدرآباد) مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی (مفتیٔ پنجاب) سابق صدر تنظیم جناب اشرف جعفری، سابق سکریٹری جنرل جناب ضیاء الدین صدیقی اور جناب جمیل احمد صدیقی، صدر تنظیم انجینئر صلاح الدین احمد، جناب مقبول جنیفر (سری لنکا) جناب عبدالرحمان انصاری کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی تھے۔

اس کانفرنس میں مہاراشٹر کے علاوہ گجرات، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش کے تقریباً ۷ ہزار مندوبین شریک ہوئے۔

مَلاَّ پورم (کیرلا) اخوان کانفرنس میں شرکت

"فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْن" کے مرکزی عنوان کے تحت تیسری ریجنل اخوان کانفرنس کیرلا کے شہر مَلاَّ پورم سے ۳ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع کوٹی لنگاڈی ((Koottilangadi کے مقام پر ایک اسکول گراؤنڈ میں ۱۲، ۱۳، ۱۴ نومبر ۱۹۹۹ء کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں کیرلا کے علاوہ تمل ناڈو سے بھی بڑی تعداد میں طلبہ ونوجوان اور طالبات واخوات شریک تھے۔ شرکاء کی مجموعی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ کانفرنس گراؤنڈ کے صدر دروازے پر بابری مسجد کے تینوں گنبد بنائے گئے تھے۔

سید قطب شہیدؒ کی تفسیر فی ظلال القرآن کے ملیالی مترجم سابق زونل صدر جناب کنجو محمد پُلوت نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ دیگر مقررین میں سابق سکریٹری جنرل پی ایم عبدالسلام، ضیاء الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد انیس، سابق صدر جناب اشرف جعفری، استاذ جامعۃ البنات جناب حمایت المقیت، ناظم جامعۃ البنات حیدرآباد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ، صدر تنظیم انجینئر صلاح الدین احمد، رکن شوریٰ ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی اور سری لنکا میں اسلامی طلبہ تنظیم کے نمائندے جناب مقبول احمد جنیفر قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد انصار میٹ میں شرکت

انجینئر صلاح الدین احمد صاحب کی میقات کے آخری ایام میں ۲۸-۳۰ رجنوری ۲۰۰۰ء کو کل ہند انصار میٹ

حیدرآباد کے مضافات میں ایک دیہاتی علاقے میں منعقد ہوئی۔ مرکزی ذمہ داران، اراکین مجلس شوریٰ اور مجلس نمائندگان، زونل ذمہ داران اور زونل شوریٰ کے علاوہ انصار کی ایک بڑی تعداد شریک اجلاس رہی۔ میٹنگ کے دوران مختلف مواقع پر تذکیر اور درس قرآن وحدیث کے لیے ایس آئی ایم کے سابق ذمہ داران کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شرکت اہمیت کی حامل تھی۔

پابندی سے قبل مرکز ایس آئی ایم میں قیام

اپریل ۲۰۰۱ء میں تحریک تحفظ شعائر اسلام کے اجتماع (بمقام جامعہ ہمدرد، دہلی) کے موقع سے ہندوستان کی چیدہ چیدہ ملی شخصیات مرکز ایس آئی ایم تشریف لائیں۔ اس موقع پر جن اکابرین اور بزرگوں سے استفادہ اور ان کی میزبانی کا شرف مرکز کو حاصل ہوا ان میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ، مولانا طاہر مدنی، مولانا عطاء الرحمن وجدی، شیخ محبوب علی (حیدرآباد) اور سابق صدر تنظیم ڈاکٹر محمد سلیم خاں جیسی ہستیاں قابل ذکر ہیں۔

تصنیفات اور مضامین

مولانا کی متعدد تصنیفات کو ایس آئی ایم کے حلقے میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ ۲۷؍نومبر تا ۶؍دسمبر ۱۹۹۸ء 'بابری مسجد بنام شرک' عوامی بیداری مہم کے دوران ان کی کتاب 'مساجد اللہ' نیز 'بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں' کا ملک گیر سطح پر خوب استعمال کیا گیا۔ مولانا کی تحریروں سے قبل بالعموم بابری مسجد کو ایک قومی اور ملی مسئلہ سمجھا جاتا تھا، مگر مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے مذکورہ بالا کتابیں لکھ کر محکم دلائل سے یہ واضح کیا کہ یہ ایک خالص مذہبی اور شرعی مسئلہ ہے۔ یہ توحید اور شرک کے درمیان جنگ ہے۔

کل ہند طلبہ تحریک ایس آئی ایم پر پابندی سے قبل آخری چند سالوں میں ان کے متعدد مضامین ماہ نامہ اسلامک موومنٹ اردو اور ہندی میں شائع ہوئے۔ مولانا کی تصنیفات میں 'جاہلیت کے خلاف جنگ' نامی کتاب نظریاتی اور فکری اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل ماہ نامہ اسلامک موومنٹ اردو میں جولائی ۱۹۹۷ء تا جولائی ۱۹۹۸ء قسط وار شائع ہوئی تھی۔

سابق امیر جماعت اسلامی ہند ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم کا ایک مضمون ماہ نامہ 'زندگی نو' کے جون ۱۹۹۸ء کے شمارے میں 'سیکولرزم، جمہوریت اور انتخابات' کے عنوان سے شائع ہوا تو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے 'بنیادی فکر اور عقیدۂ توحید کی خلاف ورزی' کے عنوان سے ایک جوابی مضمون لکھا جو ماہ نامہ اسلامک موومنٹ اردو کی اپریل اور مئی ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں موجود ہے۔

مولانا وحید الدین خاں نے جب اپنے مجلہ 'الرسالہ' میں سہ نکاتی فارمولہ پیش کر کے مسلمانوں سے بابری مسجد پر اپنا دعویٰ ترک کرنے اور احتجاجی مظاہروں کوختم کرنے کی اپیل کی تو مولانا کا غیرت مند قلم فوراً حرکت میں آیا اور انہوں نے ''بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں'' کے عنوان پر ایک مقالہ تحریر کیا جو ماہ نامہ اسلامک مومنٹ اردو کے دسمبر ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جون ۲۰۰۱ء کے شمارے میں مولانا کا دوسرا مضمون 'دعوت اور محاذ آرائی' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ماہ نامہ اسلامک موومنٹ کا آخری شمارہ جو لوگوں تک پہنچ سکا ستمبر ۲۰۰۱ء کا شمارہ تھا۔ اکتوبر کا شمارہ شائع ہو چکا تھا، چند کاپیاں مرکز آ گئی تھیں، مگر بقیہ ہزاروں نسخے ۲۷ر ستمبر ۲۰۰۱ کو پریس سے ہی پولیس نے ضبط کر لیے۔ ستمبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں 'نقش دیوار' کے تحت مولانا کی کتاب ''مساجداللہ'' کا ایک اقتباس شائع ہوا ہے:

> ''ملک کی ترقی، بھلائی اور نجات کا دار و مدار نہ بائیں بازو کی حکومت پر ہے، نہ دائیں بازو کی حکومت پر ہے۔ اسی طرح نہ ہندوتوا کے برسر اقتدار آنے پر ہے اور نہ سیکولر گروپ کے گدی سنبھالنے پر ہے۔ بلکہ سارا دارو مدار صرف اس پر ہے کہ ملک میں انسانی اور اخلاقی اقدار پروان چڑھیں اور امانت، دیانت اور عدل وانصاف کا بول بالا ہو، ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلے۔ اللہ کا نام لینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور عبادت گاہیں محفوظ رہیں۔''

۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والی کتاب 'ملت کے دفاع کا مسئلہ۔ شریعت کی روشنی میں، نیز دارالاسلام اور دار الحرب بھی مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ایسی کتابیں ہیں جن سے بطور خاص وابستگان ایس آئی ایم کی بڑی تعداد نے خوب استفادہ کیا ہے۔

جامعۃ الازہر، قاہرہ کے ایک معروف تحریکی اسکالر ڈاکٹر علی عبدالحلیم محمود کی تصنیف ''وسائل التربیة عند الاخوان المسلمین'' کا اردو ترجمہ اور اس کی تلخیص مولانا کے قلم سے 'وسائل تربیت' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آئی تو وابستگان ایس آئی ایم نے اس کتاب سے بطور خاص فائدہ اٹھایا۔ اخوان کے تربیتی ذرائع اور ان کے اسرہ کے نظام کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ایس آئی ایم کے اشاعتی ادارے نے اس کتاب کی تقسیم اور نشر و تبلیغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔

افغانستان میں گوتم بدھ کے مجسموں کے انہدام کا مسئلہ

مارچ ۲۰۰۱ء میں افغانستان کے علاقے بامیان میں طالبان حکومت کے ذریعہ 'گوتم بدھ' کے قوی الہیکل مجسّموں کو ڈائنامائٹ کے ذریعہ تباہ کر دیے جانے کے بعد اسلامی حلقوں میں ایک بحث چل پڑی کہ آیا طالبان کا یہ

اقدام اسلام کی رواداری کی تعلیم اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں اور ان کے شعائر کے احترام کے نظریہ کے خلاف تو نہیں ہے؟ ماہ نامہ 'رفیق منزل' دہلی اور 'زندگیِ نو' کے مدیران نے طالبان کے اس اقدام کو دینی روایات، شرعی احکامات اور اسلامی مزاج کے خلاف قرار دیا تھا۔ اس موقع پر مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے 'مجسّموں کا مسئلہ' نامی کتاب لکھ کر شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا اور ایس آئی ایم کے موقف کی تائید اور طالبان کے اقدام کو درست قرار دیا تھا۔

طلبہ، طالبات اور نوجوانوں سے مولانا کو خاص طور پر بڑی اُنسیت تھی۔ ایس آئی ایم کے نوجوانوں اور ذمہ داران سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مولانا گو اپنی فکر میں انتہائی پختہ اور نظریاتی اعتبار سے بہت مضبوط انسان تھے مگر کیونکہ وہ شعلہ بیان خطیب نہیں تھے اور اسٹیج پر عوام وخواص کو مطلوب شخصیت کے رائج الوقت پیمانے اور معیار پر شاید پورے نہیں اترتے تھے اس لیے انہیں باوجود اپنی زبردست علمی اور تحریکی صلاحیتوں کے اس انداز کی عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی جیسی کہ اس پایے کی کسی علمی، فکری اور عملی شخصیت کو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ مسلسل کام کرتے رہنے پر یقین رکھتے تھے۔ اپنے کاموں کی تشہیر انہیں پسند نہیں تھی۔ انقلابی جذبات رکھنے والے، نیک، صالح اور جواں سال بیٹے مجاہد کی شہادت کے علاوہ دیگر مواقع پر 'صبر جمیل' کی قرآنی اصطلاح کا عملی پیکر بن کر ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔

ایس آئی ایم کے سابق ذمہ دار افراد کے تاثرات

ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی (سابق صدر) کے مطابق:

''حیدرآباد اور آندھرا پردیش کی حد تک تو یقینی طور پر آغاز سے ہی رفقائے ایس آئی ایم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے دروس قرآن وحدیث سے علمی وفکری غذا حاصل کرتے اور ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر فیض حاصل کرتے تھے، مگر مرکز کی سطح پر اُن سے استفادہ کا رجحان انجینئر سید صلاح الدین صاحبؒ کے مرکزی ٹیم میں آنے کے بعد ۱۹۹۵ء میں اس وقت پیدا ہوا جب جماعت اسلامی سے وابستہ بیشتر ذمہ داران اور اکابرین نے ایس آئی ایم سے دوری بنائی اور تربیتی اجتماعات میں بحیثیت مربی اور مقرر شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

مولانا کی گفتگو کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ بنیادی طور پر مقرر نہیں تھے، مگر ان کی فکر اور رُخ سے متاثر افراد ذاتی حیثیت میں اس سے خوب استفادہ کرتے تھے۔ نظریاتی معاملات اور فکری موضوعات پر ان کی مدلل گفتگو اور علمی تحریروں کا وزن اہل علم کے حلقوں میں ہر جگہ محسوس

کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مئی ۲۰۰۰ء میں بنگلور کے قریب ایک پرفضا مقام پر ایس آئی ایم کا آل انڈیا کیڈر کیمپ منعقد ہوا تھا جس میں دفاع کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے سابق صدر جناب اشرف جعفری صاحب نے مولانا کی تصنیف ''ملت کے دفاع کا مسئلہ شریعت کی روشنی میں'' کے اندر اختیار کیے گئے مولانا کے موقف اور بعض خیالات سے جزوی طور پر اختلاف کیا تھا۔ حالاں کہ کیمپ میں مولانا بنفس نفیس شریک نہیں تھے مگر ان کی تصنیف زیر بحث رہی تھی۔'' (گفتگو بتاریخ: ۲۲ مئی ۲۰۲۳ء)

۱۹۸۹ء میں مرکز کی جانب سے حافظ محمد محفوظ خاں فلاحی کو آندھرا و کرناٹک زون کا ذمہ دار بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے وہاں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سے بطور خاص استفادہ کیا اور ان سے متاثر ہوئے۔ اس سے قبل جناب عزت علی صاحب (شاہ آباد، رامپور) بھی مرکز کی جانب سے آندھرا پردیش میں ذمہ دار بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والی 'اقدام امت کانفرنس' سے قبل حیدرآباد کے اندر نوجوانوں کے مختلف پروگراموں میں مولانا کو مدعو کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد محمد ساجد صحرائی صاحب جب مرکز کی جانب سے حیدرآباد بھیجے گئے تو وہ بھی مولانا سے قریب رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ برادر مکرم محمد ساجد صحرائی کا احساس ہے کہ

''مولانا عبدالعلیم اصلاحی ایک بلند پایہ عالم باعمل تھے اور دینی و شرعی امور میں اپنی واضح، دوٹوک اور غیر مصلحت پسندانہ بے باک رائے کا کھل کر اظہار کرتے تھے۔ 'احقاق حق' اور 'ابطال باطل' کے فریضہ کی ادائیگی میں کبھی مداہنت اور مصالحت کی روش اختیار نہیں کی۔ فکری انحراف خواہ شخصیات کی جانب سے ہو یا جماعتوں اور تحریکوں کی جانب سے، مولانا نے کبھی اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔

جماعت اسلامی ہند کے رکن ہوتے ہوئے اپنی ہی جماعت اور اس کے متعدد ذمہ داران سے مختلف فیہ مسائل اور نظریاتی وفکری معاملات میں نہ صرف یہ کہ برملا اختلاف کیا بلکہ تحریری شکل میں کتابچہ یا مضمون لکھ کر محاسبہ کیا۔ بروقت قلم اٹھاتے اور دلائل و براہین سے اپنے موقف کی بے باکانہ وضاحت کرتے۔ مولانا وحیدالدین خان، مولانا شفیع مونس، ڈاکٹر عبدالحق انصاری، ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی، اور مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحبان کی مختلف تحریروں اور مضامین پر انہوں نے دینی نقطۂ نظر سے تنقید کرتے ہوئے باضابطہ محاکمہ کیا ہے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی وقار اور فکری بلندی کے سبھی اہل علم اور دانشوران ملت قائل تھے مگر بدقسمتی سے سماجی اور ملی سطح پر ان کو وہ مقام اور مرتبہ نہیں دیا گیا جس کے وہ صحیح معنوں میں

مستحق تھے۔صبر و برداشت،توکل، استغناء اور سادگی کی صفت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ جرأت مندی، بہادری اور بے باکی ان کی نمایاں ترین صفت تھی جسے بطور خاص انہوں نے طلبہ وطالبات اور نوجوانوں کے اندر پروان چڑھانے کی شعوری کوشش کی، اور الحمدللہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ بنارس میں قیام کے دوران گیان واپی مسجد کے امام مفتی عبدالباطن صاحب سے مولانا اصلاحیؒ کے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ غالباً مولانا کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ مفتی صاحب نے مختلف مواقع پر جرأت، بہادری اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وابستگان ایس آئی ایم سے انہیں بے پناہ محبت تھی، جب بھی کسی پروگرام کے لیے مدعو کیا جاتا ہمیشہ تیار رہتے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ حیدرآباد میں اپنے قیام کے دوران مجھے ان کی خدمت اور استفادے کا موقع نصیب ہوا۔'' (گفتگو بتاریخ: ۲۸ مئی ۲۰۲۳ء بذریعہ موبائل فون)

حیدرآباد کے باشندے اور ایس آئی ایم کے سابق انصار محمد فاضل علی راشد (مقیم کینیڈا) نے مجھے بتایا:

''مولانا اصلاحی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۹ء میں صدر ایس آئی ایم جناب اشرف جعفری صاحب کے دورے کے موقع پر منعقد ایک خصوصی نشست میں ہوئی تھی۔ اس وقت ریاست آندھرا و کرناٹک کے ذمہ دار حافظ محفوظ خان فلاحی بھی ان کے ہم راہ تھے۔ مولانا نے ہمیشہ ایس آئی ایم کے نوجوانوں کا اپنے گھر میں پرتپاک خیرمقدم کیا۔

اس زمانے میں جب حیدرآباد اور آندھرا پردیش میں طلبہ تحریک ایس آئی ایم کی حمایت، رہنمائی اور سرپرستی کرنے والی شخصیات ناپید تھیں اور جماعت اسلامی ہند کے بیشتر ذمہ داران کا رویہ ہمارے ساتھ سردمہری اور عدم تعاون کا تھا' مولانا عبدالعلیم اصلاحی ہمارے پشتیبان بنے رہے۔ انہوں نے ہر موقع پر ہمارا مکمل سپورٹ، تعاون، رہنمائی اور اخلاقی سرپرستی کی۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والی 'اقدام امت کانفرنس' کے موقع پر جب جماعت اسلامی نے اپنے ارکان و ذمہ داران پر کانفرنس میں تقریر اور خطاب کی پابندی لگائی تو مولانا عبدالعلیم اصلاحی اس فیصلہ سے سخت ناراض ہوئے اور امیر جماعت مولانا سراج الحسن صاحب کو باضابطہ خط لکھ کر یہ فیصلہ واپس لینے کی گذارش کی۔ حیدرآباد اور آندھرا کے مختلف علاقوں میں خالص اسلامی فکر کی آبیاری اور نشونما میں ان کا بہت بنیادی کردار ہے۔''

(گفتگو بتاریخ: ۲۸ مئی ۲۰۲۳ء بذریعہ موبائل فون)

چند برس قبل غالباً ۲۰۱۶ء میں مجھے حیدرآباد میں مولانا سے ملاقات اور استفادہ کا موقع ملا تھا۔ اپنے زیر اہتمام چلنے والے طالبات کے مدرسے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

''طلبہ تحریک ایس آئی ایم نے باطل کے مقابلے میں اپنا لب ولہجہ اور طرز فکر تبدیل نہیں کیا۔ دبا دیئے گئے، مگر فکری انحراف نہیں کیا۔ ایمان، اسلامی شعائر کے تحفظ اور مزاج اسلامی کی بقا کے لیے قربان ہوجانا تو عین تقاضائے ایمانی ہے۔ بابری مسجد کے مسئلے پر طلبہ تحریک کا موقف اس کا ایک بڑا کارنامہ اور امتیازی خصوصیت ہے۔ حیدرآباد میں 'سم' کے علاوہ بشمول جماعت اسلامی، جمعیۃ العلماء، تعمیر ملت وغیرہ کسی بھی دینی وملی تنظیم نے بابری مسجد کے عنوان پر جلسہ نہیں کیا۔ لیکن 'سم' کے لوگوں نے تمام دنیاوی مصالح کو درکنار کرتے ہوئے اس معاملے میں اقدام کیے جو فسطائی طاقتوں کو گوارا نہ تھے۔''

'تحریک تحفظ شعائر اسلام' سے وابستگی

اپریل ۲۰۰۱ء میں ایس آئی ایم آف انڈیا اور اس کے سابق ذمہ داران کی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان میں اسلامی شعائر کے تحفظ اور بالخصوص بازیابی بابری مسجد کے لیے عوامی سطح پر بیداری اور مسلمانوں کے اندر تحریک پیدا کرنے کی غرض سے ملک گیر فورم 'تحریک تحفظ شعائر اسلام' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی بعض دیگر ارکان جماعت اسلامی کے ساتھ فورم سے وابستہ ہوئے تو انہیں مرکز جماعت اسلامی نے وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا، اور پھر بالآخر ان کی رکنیت منسوخ کردی گئی۔

ایس آئی ایم کے سلسلے میں مولانا کے تاثرات

۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کی حکومت نے ملک گیر طلبہ تحریک ایس آئی ایم پر پابندی عائد کی تو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے کچھ دنوں کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''طلبہ تحریک نے باطل کے مقابلے میں اپنا لب ولہجہ تبدیل نہیں کیا، دبا دیئے گئے، مٹا دیئے گئے مگر مداہنت نہیں اختیار کی۔ فکری انحراف نہیں ہوا، انہوں نے خود کو قربان کرکے اپنی تاریخ بنالی۔ خود کو بچا کر اپنے موقف سے دست بردار ہوجانا تحریکی موت ہے۔ نظریہ کی حفاظت نیز فکر کی آبیاری اور پرورش کرتے ہوئے اگر قید و بند کی صعوبتیں آئیں تو یہ کوئی غم کی بات نہیں۔ طلبہ تحریک نے تحریک اسلامی کی مندرجہ ذیل خصوصیات کو قائم رکھا۔

۱۔ اقامت دین کے لیے جتھا تیار کرنا۔

۲۔ باطل اور طاغوت سے اجتناب۔

۳۔ ایمان کے تقاضوں کا مظاہرہ۔‘‘

میری ناقص رائے میں مندرجہ ذیل اشعار مولانا کی شخصیت کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں

جوش حق دل میں مگر منکسر وسادہ مزاج
وہ خدا مست تھے‘ مست مئے پندار نہ تھے
حکمتِ دین خدا پر تھیں نگاہیں ان کی
حلقۂ دام سیاست میں گرفتار نہ تھے

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

ثابت قدمی کی راہ دکھانے والی ایک منفرد شخصیت جو گذر گئی

ایاز احمد اصلاحی، لکھنؤ
مدیر ماہنامہ ''ادراک نو''

سال ۲۰۲۲ء میں جن مخصوص افراد کی جدائی نے ہمیں حد درجہ غم زدہ کیا ہے ان میں سے ایک مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم بھی ہیں۔ وہ ایک حد درجہ متحرک شخصیت اور انقلابی سوچ کے مالک تھے۔ پیدائشی وطن یوپی کا ایک معروف و زرخیز ضلع اور شبلی و فراہی کا مولد اعظم گڑھ ہے۔ بعد میں وہ تدریس، تحریک اور دوسرے مقاصد سے حیدرآباد منتقل ہوگئے اور پھر ہمیشہ کے لیے وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ میں نے یہ اچھی طرح محسوس کیا ہے کہ اس شہر کے لوگ ان سے جتنی محبت و گرویدگی رکھتے ہیں اس کی مثال دیکھنے کو کم ہی ملتی ہے۔ وہ حیدرآباد آئے تو تھے تدریس کی غرض لے کر لیکن فی الواقع تعلیم و تحریک کے میدان سے فکر اسلامی کی توسیع و اشاعت، ملت مسلمہ کے دینی وجود کا تحفظ و بقا اور مسلم نوجوانوں میں غیرت اسلامی کو بیدار کرنے کی مسلسل جدوجہد ہی ان کی زندگی کا اصل ہدف بن گیا تھا۔ یہاں رہ کر جو حرکی (ڈائنمک) نمونہ انھوں نے پیش کیا وہ ایک بے مثال نمونہ ہے۔ اس شہر میں رہ کر ایک پختہ فکر اور بالغ نظر معلم اور ایک مسلمان داعی و مربی کی شکل میں انھوں نے اپنے بس بھر اپنی جو خدمات انجام دیں اس نے بتا دیا کہ ان کی ہجرت حیدرآباد بے کار نہیں گئی بلکہ وہ ایک بڑے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے یہاں رہ کر جو کچھ کیا اور دین و ملت کی نسبت سے جو بھی تگ و دو کی اس نے ان کی زندگی کے طویل سفر کے ہر سنگ میل پر ایک ہی جملہ رقم کیا اور وہ ہے:

''میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی''

طالب علمی کا دور

مولانا عبدالعلیم اصلاحی کی وفات ۲۷ ستمبر ۲۰۲۲ء کو حیدرآباد میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ہوئی۔ ان کی ولادت ۳۱؍جنوری ۱۹۳۴ء کو اعظم گڑھ کے معروف گاؤں بندی گھاٹ میں ہوئی، اس بستی کے ایک معزز گھرانے سے ان کا تعلق تھا، دین اور زبان و بیان کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ کی عام روایت کے مطابق اپنے گھر اور گاؤں میں ہی مکمل کی، اس کے بعد والدین نے علوم اسلامیہ عربیہ کی اعلیٰ و مستند تعلیم کے لیے انھیں ۱۹۴۵ء میں اسی ضلع کی ایک معروف درس گاہ 'مدرسۃ الاصلاح'، جو اپنی قرآنی تعلیم و تدریس کے لیے عالم میں ممتاز ہے، میں داخل کیا۔ یہاں انھوں نے فاضل تک کا پورا نصاب مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں سند فراغت حاصل کی۔

ان کی طالب علمی کا دور مدرسۃ الاصلاح کا زریں دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مولانا فراہیؒ کے شاگردوں کی نگرانی میں یہاں روایتی مدرسی تعلیم سے زیادہ قرآن کریم کے تحقیق و مطالعہ کی مسندیں سجتیں اور تفسیر و حدیث کے نصاب کی تکمیل اور تقسیم اسناد سے زیادہ کلام الٰہی سے فکر و نظر کی کیفیات بدلنے کا کام لیا جاتا۔ یہ اسی دور کی خاصیت رہی ہے کہ جو بھی اس کے سائے میں استاذ یا شاگرد کے طور سے تھوڑی دیر کے لیے اپنا پڑاؤ ڈالتا اسے ایک خاص کشش بہت جلد قرآن مجید کے مدار میں پہنچا دیتی۔

اگرچہ مولانا فراہیؒ کے دو نمایاں ترین شاگردوں میں سے ایک کو، یعنی مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴-۱۹۹۷ء) کو، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی فکر اور مشن کی مقناطیسیت نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور وہ ان کے ساتھ پاکستان چلے گئے، لیکن ان کا ایک اور عظیم شاگرد ابھی فکر فراہی کی اس انجمن کو آباد کیے ہوئے تھا اور یہ مرد درویش اس خرابے کو اپنی آخری سانسوں تک بہارستان بنائے رہا اور اپنے استاذ کی بخشی ہوئی قندیل رہبانی سے نہ صرف ''الاصلاح'' کے زمین و آسمان کو بلکہ ملک بھر میں قرآن کے طالب علموں کے قلب و ذہن کو منور کرتا رہا۔

یہ مدرسۃ الاصلاح کے سابق صدر مدرس اور جماعت اسلامی ہند کی مرکزی شوری کے سابق رکن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۱-۱۹۸۵ء) تھے جو ایک طرف جماعت اسلامی میں شامل ہو کر اقامت دین کے مشن کی تکمیل میں ایک نمائندہ کردار ادا کر رہے تھے تو دوسری طرف قرآنی زمزموں سے معمور اس بستی کا سب سے روشن چراغ بن کر امام فراہیؒ کی شاگردی کا پورا پورا حق ادا کر رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مدرسۃ الاصلاح ہندوستان کا وہ واحد مدرسہ تھا جس نے ان کی قیادت میں اپنے قرآنی مشن کے ساتھ تحریک اسلامی کی فکری جڑوں کو مضبوط کرنے میں ایک یادگار تاریخی رول ادا کیا، دوسری جانب انھوں نے تنہا اپنی عملی و انتظامی لیاقت سے مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ و اساتذہ میں علامہ فراہیؒ کی چھوڑی

ہوئی فکری میراث منتقل کرنے کے لیے علم وجستجو کی ایک ایسی کہکشاں تعمیر کی جس نے بے شمار انسانوں کو نظام القرآن کی ملکوتی روشنی کے نئے جھماکوں سے پہلی بار آشنا کیا۔

آپ تصور کرسکتے ہیں کہ اگر کسی کو مبدأ فیض سے طبع سلیم ملی ہو اور ساتھ ہی اسے ایسی کسی درسگاہ یا انجمن فکر و نظر کی صبح و شام میں خود کو رنگنے کا موقع مل جائے تو اس کے بخت کا ستارہ کتنی بلندیوں پر ہوگا! بے شک مولانا عبدالعلیم اصلاحی بھی ایسے ہی خوش بختوں میں سے ایک تھے جنھیں مدرسۃ الاصلاح کی اس مخصوص فضا میں پروان چڑھنے اور نشونما پانے کا بھر پور موقع ملا۔

جیسا کہ بتایا گیا، جس وقت مولانا عبدالعلیم مرحوم کو ایک طالب علم کے طور پر مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ ملا تھا اس وقت اس چمن کی بہار اپنے جوبن پر تھی، اس زمانے میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ مدرسہ کے صدر مدرس تھے، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے دیگر اساتذہ کی فہرست میں جو بھی نمایاں نام تھے ان میں بیشتر براہ راست یا بالواسطہ طور سے مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی رحمہ اللہ مولانا عبدالعلیم رحمہ اللہ کے استاذ ہی نہیں سرپرست بھی تھے، ان کے علاوہ ان کے اساتذہ میں مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا شبلی متکلم رحمہم اللہ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ بعد کے یہ سارے افراد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے شاگرد اور ان کے فیض یافتہ تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے پٹھان کوٹ منتقل ہونے سے قبل اس طالب علم کو مدرسہ میں ان کا بھی زمانہ ملا تھا لیکن شاید انھیں براہ راست ان سے سبق پڑھنے اور ان کے درس میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملا۔

ایک معلّم و مدرس کی زندگی

وہ ایک قابل طالب علم تھے، یہی وجہ ہے کہ مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے انھیں مدرسہ میں ہی قیام کرنے کی ہدایت کی، کچھ دنوں تک ان کا وہیں قیام رہا، اس دوران انھیں مقیم طلبہ کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی، اس کے بعد وہ سال ڈیڑھ سال دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں مقیم رہے جہاں رہ کر انھوں نے اپنے مطالعہ و تحقیق کو آگے بڑھایا۔ تعلیم و تدریس ان کی زندگی کا ایک اہم عنصر تھا، اور زندگی بھر کسی نہ کسی شکل میں وہ اسی دنیا سے وابستہ رہے۔ مدرسۃ الاصلاح سے فارغ ہونے کے بعد الہ آباد، مظہر العلوم بنارس (۱۹۵۶-۱۹۷۰)، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ (صرف چھ ماہ کے لیے)، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ (۱۹۷۰ تا ۱۹۷۳) جامعہ دارلہدیٰ، (کریم نگر آندھرا پردیش: ۷۰ کی دہائی میں)، جامعہ دارالہدیٰ (حیدرآباد: ۱۹۸۱ تا ۱۹۸۸)، جامعۃ البنات، حیدرآباد (۱۹۸۸ تا ۲۰۱۲) اور جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، حیدرآباد (۲۰۱۲ تا ۲۰۲۲)

میں علوم اسلامیہ عربیہ کی تدریس کی ذمہ داری مختلف حیثیتوں میں ادا کرتے رہے۔ وہ بنارس کے مظہر العلوم کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح جیسی عظیم تعلیم گاہ کے بھی صدر مدرس رہے ہیں، اس دور میں مدرسۃ الاصلاح جیسی ایک ممتاز و معیاری درسگاہ کے لیے مدرسی وصدر مدرسی کے لیے کسی کا تقرر ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی، یہ نصیب صرف انھیں کا ہوتا جن کی صلاحیتیں بھی اس مدرسہ کی طرح ممتاز و معیاری ہوا کرتی تھیں۔ یہاں وہ تقریباً دو سال تک صدر مدرس رہے اور اپنی مدت کارکردگی میں اپنی اس مادر علمی کو سنوارنے کی حتی الوسع کوشش کی جو ان کے وہاں پہنچنے سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک بڑے خلفشار سے گذر چکی تھی۔

جامعہ دارالہدیٰ، حیدرآباد جہاں وہ جماعت اسلامی کے اپنے بعض رفقاء اور اپنے بعض اساتذہ کے مشورے پر بحیثیت مدرس گئے تھے، کی تعمیر وترقی میں بھی ان کا کافی اہم رول تسلیم کیا جاتا ہے، یہاں جن طلبہ کو ان کی تعلیم وتربیت میں پروان چڑھنے کا موقع ملا ان میں سے اکثر افراد میں میں نے دین پسندی اور غیرت ملی کی وہی روح دیکھی ہے جو خود ان کے اندر ہم نے محسوس کی تھی۔

ایک مدت تک دارالہدی کی تزئین وتعمیر میں اپنا خون جگر نچوڑنے کے بعد، اپنے بعض رفیقوں کی مدد سے انھوں نے جامعۃ البنات نام کے ایک نسواں مدرسہ کی تاسیس میں اپنا کلیدی رول ادا کیا، یہ جامعہ جس کے وہ معمار، مدرس اور ناظم سب کچھ تھے، ان کی خصوصی توجہ سے بہت جلد شہرت وترقی کے عروج پر پہنچ گیا اور وہ اعتبار حاصل کیا جو ملک کے دوسرے نسواں مدارس کو کم ہی مل سکا۔ لڑکیوں کا مدرسہ چلانا ایک بڑا ہی نازک اور ذمہ داری کا کام ہوتا ہے، لیکن اپنی تمام تر علمی وانتظامی صلاحیتیں بروئے کار لاکر اس مدرسہ کو چار چاند لگانے میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور اپنی مخلصانہ محنت وجانفشانی سے اسے ہندوستان کے نسواں مدارس میں ایک ممتاز مقام پر پہنچا دیا۔ جو لوگ اس مدرسہ کے کوائف سے آگاہ ہیں ان پر یہ بات اچھی طرح عیاں ہے کہ تحریک اسلامی کے ترجیحات پر مبنی اس مدرسہ کے مخصوص نظام تعلیم اور نصاب تعلیم اور اس کے معتبر اسلامی طرز تربیت کی تشکیل میں شروع سے آخر تک سب سے نمایاں حصہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا ہی رہا ہے، اور یہ وہی تھے جن کی وجہ سے اس مدرسہ کو وہ اعتبار حاصل ہوا کہ جماعت اسلامی اور جماعت اسلامی کے باہر ملک کے ہر گوشے سے والدین اپنی بچیوں کو اس مدرسے میں اس یقین کے ساتھ ڈال جاتے تھے کہ یہاں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی خالص مومنانہ تربیت اور پدرانہ سرپرستی میں ان کی پری زادیاں فاطمہ وعائشہ بن کر نکلیں گی اور اس ملک میں مثالی مومن ماؤں اور بہنوں کا کردار ادا کریں گی۔ مولانا اصلاحیؒ نے ان کے اس یقین کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔

لیکن اس دنیا میں ہمیں اس کا بھی تجربہ ہے کہ جو لوگ صبر وقربانی اور حق وصداقت کی راہ پر چلتے ہیں وہ

اپنوں کے بیچ ہوں یا بیگانوں کے، انھیں ہر جگہ امتحانات سے گذرنا پڑتا ہے، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو بھی اپنے بنائے ہوئے اس چمن میں بہت جلد ایک نئے امتحان سے گذرنا پڑا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب ہندوستان کے عام اسکولوں اور مدارس کی طرح یہاں بھی مفادات کی ہوس نے دینی خدمت پر غلبہ پالیا اور جلد ہی ایک ایسے ادارے میں جو محض دینی تعلیم وتربیت کے لیے قائم کیا گیا تھا، اختیار و اقتدار کی کشمکش جاری ہوگئی۔ عبدالعلیم اصلاحیؒ کا خمیر چونکہ اس دنیا سے کچھ مختلف تھا اس لیے ان کے لیے یہاں مزید ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ جب اس مخلص بندے نے یہ دیکھا کہ مقصد کے لحاظ سے مدرسے کا قبلہ بدل رہا ہے اور ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'' تو انھوں نے اپنا آشیانہ ہی بدل دیا اور اسی طرز پر لڑکیوں کی تعلیم وتربیت (جس کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند رہتے تھے) کی غرض سے حیدرآباد کے ایک علاقے ملک پیٹ میں جامعۃ البنات الاصلاحیۃ، کے نام سے ایک دوسرے مدرسہ کی داغ بیل ڈالی اور ایک بار پھر ایک نئے نسواں مدرسہ کی چمن کاری میں اپنی ساری توانائیاں نچوڑ دیں، اور اللہ کی مدد سے وہ اسے بھی لڑکیوں کی ایک معیاری دینی تعلیم گاہ کے طور سے ترقی دینے میں کامیاب وکامراں ہوئے۔

ایک کامیاب اور ایمان پرور مربی

عبدالعلیم اصلاحیؒ کے اندر ایک مخصوص ومنفرد صلاحیت یہ تھی کہ انھیں اپنے طلبہ اور قریب آنے والے نوجوانوں کے دلوں میں دینی حمیت اور ملی غیرت جگانے اور ٹھوس اسلامی خطوط پر ان کی ذہن سازی کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا، اس لیے بنارس سے حیدرآباد تک جہاں جہاں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں وہاں ان کی انمٹ نشانی کے طور سے ایسے سینکڑوں شاگردوں کی کمی نہیں ہے جو ان سے صداقت اور شجاعت کا سبق پڑھ کر آج اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی سطح پر فکر اسلامی کی سچی نمائندگی کر رہے ہیں اور ان کی اجتماعی وعملی زندگی میں اسلام کی دھار کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ حقائق اور تجربات کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تربیت وذہن سازی کے میدان میں انھیں ایک حیرت انگیز اختصاص حاصل تھا۔

اس پہلو سے اگر مولانا مرحوم کی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اگر چہ ان کی سماجی اور تعلیمی زندگی میں معلمی کا عنصر غالب ہے لیکن یہ واضح رہے کہ وہ عام اساتذہ کی طرح تدریس سے صرف بطور پیشہ نہیں جڑے تھے بلکہ تدریس سے زیادہ وہ اپنے طلبہ کی تربیت اور تعمیر شخصیت پر توجہ مرکوز رکھتے تھے، اور بے شک اس محاذ پر ایک مشن کی طرح وہ اپنی طویل اجتماعی زندگی میں وہی نتیجہ حاصل کرنے میں اور کچھ ویسے ہی اثرات مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو دیگر حضرات اپنی قیادت یا تصنیف وتحقیق کے وسیلہ سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے تعلق سے میری یہ رائے یوں ہی نہیں بن گئی بلکہ شمال سے جنوب تک میں نے ان کے شاگردوں

میں اسلامی سانچے میں ڈھلی فکر و نظر کی ایک تیز برقی رو دیکھی ہے جو سخت ترین حالات میں بھی حق پرستی کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہیں، اور جو اس دور آزمائش میں بھی حق و باطل میں تمیز کرتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت کے صریح منکر ہیں۔ ان کے شاگردوں کی زندگی کا یہ حسن اصلاً انھیں کا مرہون منت ہے اور اس میں ان کا ہی عکس نمایاں ہے۔

اس لحاظ سے جہاں تک میں نے انھیں جانا اور سمجھا ہے اس کے مطابق دین وملت کے لیے ان کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس خاص میدان میں ان کی جو مخصوص خدمات ہیں اس میں جدید ہندوستان میں کم ہی لوگ ان کی برابری کر سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو اسلام اور حق کا صرف کتابی سبق نہیں پڑھاتے بلکہ وہ خود ان کے سامنے حق کے لیے سرفروشی اور جاں نثاری کی مثال بن کر رہتے تھے تاکہ انھیں راہ حق کے تقاضوں کا عملاً احساس ہو سکے۔ چنانچہ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے ایک سینئر استاذ اور اسلامی اسکالر مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے میرے ساتھ اپنی ایک گفتگو میں اپنے استاذ کے انھیں اثرات کی وجہ سے انھیں بہ تکرار اپنا ''محسن اعظم'' کہا اور اعتراف کیا کہ وہ نہ ہوتے تو شاید میں مدرسۃ الاصلاح جیسی منفرد درس گاہ کا فاضل بھی نہ بن پاتا۔ ان کے ایک دوسرے شاگرد (برادرم مرزا خالد بیگ، حیدرآباد) نے اپنے استاذ و مربی کے تعلق سے مجھے اپنا جو تاثر بھیجا ہے اس میں بھی اس بات کی بھرپور شہادت موجود ہے: وہ لکھتے ہیں ''جامعہ دار الہدیٰ (کریم نگر) میں مع اہل وعیال مولانا کی خود دار مجاہدانہ اور زہد و بے نیازی کی زندگی سے ہزاروں طلبہ و اساتذہ کی زندگیوں کو خدا ترسی اور آخرت طلبی کی تربیت ملی کیونکہ (مختلف) مضمون کے ماہر اہل علم تو کثرت سے مل جائیں گے لیکن اپنی زندگی سے مثال پیش کرنا کچھ ہی مومن بندوں کی شان ہوتی ہے، مولانا اصلاحی ایسے ہی معدودے چند مومنین صالحین میں سے تھے۔'' ان کی وفات کے بعد ان کی اس خصوصیت کے بارے میں ان کے ایک دوسرے شاگرد (برادرم سیف الاسلام، حیدآباد) کی ٹویٹ کی گئی گواہی یہ ہے: ''مولانا عبد العلیم اصلاحیؒ ۱۹۸۵ء میں میرے استاذ رہے جنھوں نے سینکڑوں طلباء وطالبات کو عربی لغت ونحو پڑھا کر ان کے اندر قرآن مجید اور احادیث کو راست سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی اور انھیں فریضہ اقامت دین کے سلسلے میں ہمیشہ حق پر ڈٹے رہنے کی تربیت دی۔''

طلبہ کی طرح مولانا کی شاگردات کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے، اور وہ جہاں بھی ہیں ان کی شخصیت پر مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی اسلامی تعلیم وتربیت کے گہرے اثرات نقش سنگ کی طرح ثبت نظر آتے ہیں، اس کا اندازہ ہمیں اس وقت زیادہ ہوا جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کی درجنوں شاگردات نے مختلف شکلوں اور پیرایوں میں انتہائی دل سوزی کے ساتھ اپنے استاذ کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے زخمی

احساسات کی تپش بتا رہی تھی کہ انھیں چمکانے اور یہاں تک پہنچانے میں ان کے استاذ کا کتنا حصہ ہے۔ ان کی توجہ صرف ان طالبات کی تعلیم وتربیت تک ہی محدود نہیں رہتی تھی بلکہ وہ ان پر اپنا سب کچھ وارے رہتے، اپنے محدود معاشی وسائل کے باوجود ان کا گھر ان طالبات کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا اور اس میں وہ بلاتفریق اس طرح رہتیں اور آتیں جاتیں جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہو۔ ان بچیوں کو مولانا صرف تعلیم ہی نہیں دیتے بلکہ انھیں امانت سمجھ کر ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پر مولانا کی اس قدر شفقت ومحبت رہتی کہ ان کے گھر میں آنے والے کسی نئے مہمان کے لیے ان طالبات میں اور مولانا کی اپنی بیٹیوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ مولانا کی ایک شاگردہ خان مبشرہ فردوس سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے مدرسہ جامعۃ البنات میں پڑھنے والی لڑکیاں مولانا کے گھر میں ان کی بیٹیوں اور فیملی ممبر کی طرح رہتی تھیں؟ تو انھوں نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: ''مولانا کا باورچی خانہ ہاسٹل کی ہر بچی کے لیے کھلا ہوتا تھا، تمام طالبات فیملی ممبر کی طرح پوری آزادی سے رہتیں، وہ جو چاہیں بنائیں اور جو چاہیں کھائیں۔'' خبر رکھنے والوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ صرف مولانا مرحوم ہی نہیں بلکہ ان کا پورا گھر ان طالبات کی خدمت میں لگا رہتا، خصوصاً ان کی اہلیہ سے مدرسہ کی طالبات اتنی ہی مانوس اور قریب رہا کرتیں جتنی وہ خود اپنے استاذ سے ہوتیں۔

مولانا اصلاحیؒ کی اجتماعی زندگی کا ایک اور خوبصورت اور قابلِ رشک پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہت سے ایسے بدقسمت خادموں کی طرح نہیں تھے جن کا مشن زندگی بھر خود ان کے اپنے گھر میں اجنبی بنا رہتا ہے، مولانا اصلاحی تو اپنے گھر میں اپنے مشن، اپنی فکر اور اپنی دینی حمیت کے ساتھ کبھی تنہا اور اجنبی نہیں رہے۔ بلکہ انھیں اپنی فکری وعملی زندگی کے ہر مرحلے پر اپنی وفاشعار بیوی اور صالح اولاد کا بھرپور ساتھ حاصل تھا۔ ان کا یہ کنبہ نہ صرف ان کے حق بجانب فیصلوں میں قدم قدم پر ان کے ساتھ ہوتا بلکہ ان کے مشن کی تکمیل میں بھی ہر ممکن حد تک ان کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا پورا گھرانہ بڑی سے بڑی صبر آزما صورت حال میں بھی ان کے اٹل فیصلوں اور ناقابل شکست عزائم کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس حقیقت کا عملی نمونہ اس دنیا نے اس وقت دیکھا جب ان کے ایک نوجوان بیٹے نے دین وملت کی راہ میں اور باپ کے اصولوں کی پیروی میں پولیس کی گولیاں کھا کر جام شہادت نوش کیا، اس وقت مولانا کے ساتھ ان کی بیوی بچوں نے بھی صبر وثابت قدمی کا ایسا بے مثال مظاہرہ پیش کیا جس کی نظیر مشکل سے ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس دل شکن اور المناک سانحے کے بعد اپنے مولیٰ سے شکوہ سنج ہونے کے بجائے اس گھر کا ہر فرد ان کے ساتھ اپنے رب کی رضا کے آگے سربہ سجود نظر آیا۔ نہ تو ان کے اجتماعی وعائلی وجود پر کہیں کسی دم جابر وظالم قوتوں کے خوف کا سایہ دکھائی دیا اور نہ ہی جواں سال بیٹے کی موت کا عظیم صدمہ ایک پل کے لیے بھی ان سے ان کی

مومنانہ زندگی کا یقین چھین سکا۔ یہ تفصیلات ان کی اخلاقی شان ہی نہیں ان کے حقیقی مقصد زندگی سے بھی ہمیں روشناس کرنے کے لیے کافی ہیں۔

راہ عزیمت کا مسافر

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جن سالوں میں مدرسۃ الاصلاح میں زیرِ تعلیم تھے، وہ تحریک اسلامی کی تاریخ میں اس طور سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ انھیں دنوں میں (۲۶؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کو) جماعت اسلامی ہند کا ایک مستقل جماعت کے طور سے بھارت میں قیام عمل میں آیا، اور ۱۹۵۶ء میں اس کے دستور کا نفاذ ہوا۔ اس وقت تک اس مدرسہ کے تمام معروف و مقبول اساتذہ، جیسے مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی رحمہم اللہ وغیرہ، جماعت اسلامی کے رکن بن چکے تھے بلکہ وہ تمام جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں شامل تھے۔ ہندوستان میں جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے بعد جو شخص اس کا پہلا امیر بنا وہ کوئی اور نہیں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ تھے اور وہ کہیں اور کے نہیں اسی مدرسہ کے ایک اہم استاذ تھے۔ اس طور سے مدرسۃ الاصلاح کا رشتہ تحریک اسلامی سے بہت گہرا تھا اور امیر جماعت اسلامی کے یہاں مقیم ہونے کی وجہ سے اسے کچھ دنوں کے لیے جماعت اسلامی ہند کا پہلا دفتر یا مرکز ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس وقت یہاں کے اساتذہ وطلبہ کی اکثریت تحریکی مشن سے دل وجان سے وابستہ تھی، اور سچ تو یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ کے ذریعہ یہاں افکار قرآنی کا جو بیج بویا گیا تھا یہاں کے لوگوں نے علامہ مودودیؒ کے فکر اسلامی کو اسی کا ایک حصہ سمجھا اور یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت اور منھ بولتا سچ ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی کی فکری و تعلیمی اٹھان اسی ماحول میں ہوئی تھی، چونکہ وہ یہاں کے ایک ذہین اور لائق و فائق طالب علم رہے ہیں اور اس کے علاوہ وہ ایک حساس طبیعت اور بیدار دل و دماغ کے بھی مالک تھے اس لیے اس مشن کی آواز نے بہت جلد ان کے دل پر بھی دستک دی اور وہ بھی اس کے ابتدائی ارکان میں شامل ہو گئے۔ جماعت کا رکن بننے کے بعد انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (تقریباً ۷۰؍سال) اسی کی نذر کر دیا۔ اپنے تحریکی سفر میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہو کر وہ بنارس، اعظم گڑھ اور حیدرآباد میں اس کی مختلف ذمہ داریوں پر مامور رہے۔ جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی رسماً نہیں بلکہ روح کے رشتہ اور جذبۂ خالص کے ساتھ ہوئی تھی جس کی جھلک ان کی زندگی کے ہر زاویے میں موجود تھی اور کوئی بھی شخص اسے بآسانی محسوس کر سکتا تھا؛ فی الواقع ان کی پہچان یہی جادۂ تحریک اور اس کا خالص و بے آمیز فکر اسلامی تھا۔

بابری مسجد کی شہادت نے بہت سے حساس و بیدار مسلمانوں کی طرح ان کے دل و دماغ پر بھی گہرا اثر

چھوڑا، اس پر مستزاد ملک کے بدلتے حالات تھے؛ جو باخبر ہیں انھیں اس کا علم ہے کہ اس نئی فضا میں ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کے دفاع وتحفظ اور اس کے مستقبل کے تعلق سے ان کی فکرمندیاں ان کے فکر وخیال کا ہی نہیں ان کی گفتگو، ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں، ان کی تعلیمی وتربیتی اور تحریکی ترجیحات اور ان کے علمی وتصنیفی کاموں کا لازمی جز بن گئی تھیں۔ ان کی بعض چھوٹی بڑی کتابیں، جیسے ''بابری مسجد سے دست بر داری شرعا جائز نہیں''، ''جاہلیت کے خلاف جنگ''، ''ملت کے دفاع کا مسئلہ''، ''نظام خلافت وامارت کی شرعی حیثیت''، وغیرہ میں بھی ان کا یہی درد جھلکتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی سیکولرزم، جمہوریت اور الیکشن کے نام پر اقامت دین کے اپنے بنیادی اصول وآئین اور احیائے اسلام کے اپنے حقیقی نصب العین سے ذرہ برابر بھی منحرف یا بے توجہ ہو، ان کی تحریروں میں پورا زور انھیں باتوں پر ہوا کرتا تھا جو بالعموم شرعی وعقلی دلائل اور مخلصانہ نقد واحتساب پر مبنی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ان کے مجاہدانہ ودلیرانہ نقطہ نظر اور ان کے حق پرست مزاج کا ایک بہتر استعمال کرنے کے بجائے حیدرآباد کی مقامی جماعت کے اس وقت کے ذمہ داروں نے اپنے آپ کو ممکنہ مشکلات سے محفوظ کرنے کے لیے الٹا انھیں ہی نشانہ بنانا شروع کر دیا، اور مقامی ذمہ داران جماعت کی ناعاقبت اندیشی یا عجلت پسندی کی وجہ سے انھیں اس دوران کئی بار معطل کیا گیا، تاہم جماعت کی تاریخ میں یہ سچ بھی محفوظ ہے کہ مرکز جماعت جو اپنے اس رکن کے اخلاص وتقویٰ اور اس کی بے لوث خدمات کی اہمیت سے آگاہ تھا، ان کے تعلق سے مقامی ذمہ داروں کی اخراج ومعطلی کی سفارشات مولانا ابواللیث اصلاحی سے لے کر مولانا سراج الحسن صاحب کی امارت تک مسترد کرتا رہا۔ وہ ایک انتہائی مستقل مزاج انسان تھے، اس لیے ان منفی سرگرمیوں سے ان کے فکر وعمل پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنا نصب العین بنا کر تحریک اسلامی میں شامل ہوئے تھے، چنانچہ ہر طرح کے نشیب وفراز کے باوجود وہ پوری زندگی اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی کی اصل غرض وغایت یہی تھی اس لیے وہ اس سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ بلکہ اقامت دین اور شہادت حق کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ لگا دیا اور جا بجا اپنوں اور غیروں سے ملنے والے ان گنت زخموں کے باوجود یہی جدوجہد ان کے لیے ہمیشہ ذہنی وقلبی سکون وطمانیت کا باعث بنی جس کا صلہ بندوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے۔ یہی ان کا وہ پسندیدہ پڑاؤ تھا اور یہی ان کی وہ محبوب اجتماعیت تھی جس سے وہ اپنے اخراج کے سال (۲۰۰۱ء) تک اپنی دل کی ساری دھڑکنوں اور خدمت دین کے اتھاہ جذبات وعزائم کے ساتھ وابستہ رہ کر پابند وفا بنے رہے اور جب انھیں ان کی خواہش کے علی الرغم اس سے الگ

کیا گیا تب بھی انھوں نے نہ تو اقامت دین کی جدوجہد چھوڑی اور نہ ہی ان کے جہادِ زندگانی کی ترجیحات بدلیں۔ دین کی سرفرازی کا وہ عہد جو انھوں نے شعور کی منزل پانے کے بعد سے ہی اپنے لیے طے کرلیا تھا اپنی آخری سانس تک پوری بے خوفی کے ساتھ نبھاتے رہے اور اپنے عمل سے ہم سب کے لیے اور مسلمانوں کی نسلِ نو کے لیے ایک قابل رشک نمونہ چھوڑ گئے۔ دوسرے لفظوں میں وہ راہ عزیمت جس کا انتخاب انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اس پر وہ زندگی بھر استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہے، اور اس شان سے چلے کہ مشکل سے مشکل مرحلے بھی ان کے ارادوں کو نہ تو کمزور کر سکے اور نہ ہی ان کی منزل کھوٹی کرنے میں کامیاب ہوئے۔

علمی و تصنیفی خدمات

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ایک معلم اور ایک داعی کے ساتھ ایک اچھے مصنف اور صاحب قلم بھی تھے۔ اسلام کے معروف مفکرین و مجتہدین کی کتابیں برابر ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔ انھوں نے فکر فراہیؒ اور فکر مودودیؒ سے براہ راست استفادہ کر کے اپنے فکر اسلامی کو مستحکم کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں کہ تاریخ اسلام کے مشہور و معروف فقہاء و ماہرین شریعت جیسے ابن تیمیہ، رازی و غزالی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ وغیرہ سے انھوں نے بھرپور اخذ و استفادہ کیا تھا۔ اپنے علمی آثار میں انھوں نے اپنے پیچھے ایک درجن سے زائد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کی تصنیف و تالیف کا اصل مقصد وہی تھا جو ان کا اپنا مقصد حیات تھا۔ ان کتابوں میں سے بعض کا ذکر سابقہ سطروں میں آچکا ہے۔ ان کی کتابوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حسبِ توقع ایک مقصدی روح پائی جاتی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنی بیشتر کتابیں ایک خاص تحریکی و ملی پس منظر میں لکھی ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان کے نقطہ نظر سے اپنے دینی وجود کے تعلق سے مسلمانوں کا اسلامی ہدایات و تعلیمات سے ہم آہنگ جو واضح و غیر مبہم موقف ہونا چاہیے ان کتابوں میں انھوں نے اس کو پوری مضبوطی سے پیش کیا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب بھی انھیں اپنے کسی موقف کی تفہیم و تشریح قوم و ملت کے مستقبل کے لحاظ سے ضروری معلوم پڑتی اس کے استدلال میں وہ کوئی نیا رسالہ قلمبند کر دیتے۔ اس سلسلے میں ان کی یہ کتابیں بالخصوص قابل ذکر ہیں: دارالاسلام اور دارالحرب، صحیح اسلامی فکر کیا ہے؟، جاہلیت کے خلاف جنگ، ملت کے دفاع کا مسئلہ، طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، سیکولر جمہوری نظام۔ الیکشن۔ تحریک اسلامی، ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟، بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، نظام خلافت و امارت کی شرعی حیثیت، مساجد اللہ۔ ان میں سے بعض کتابیں وہ ہیں جن سے داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر بارہا احباب اور اغیار دونوں کی پیشانیاں شکن آلود ہوئیں اور ان دونوں کے لیے اس کی الگ الگ وجہیں تھیں، یعنی

ان سے ان کے اپنے اور بیگانے دونوں ناخوش نظر آئے لیکن اس سے ان کے سوچے سمجھے موقف پر کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔

ان کی ان تحریروں کے تعلق سے جہاں کچھ گوشوں میں مصلحتاً تحفظات کا مظاہرہ کیا گیا وہیں بہت سے مسلم نوجوانوں کو ان سے نیا عزم و حوصلہ ملا ہے۔ میرے نزدیک ان کتابوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسی کتابیں طباعتی دنیا کی شماریات بڑھانے کے بجائے نئے مباحثوں کی بنیاد اور غور وفکر کی ایک نئی طرح ڈالتی ہیں اور عام انسانوں کو حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کا معقول طریقہ سکھاتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ان کی کتابوں کو اور اس کے مصنف کے دلائل اور جذبہ اخلاص کو اسی اسپرٹ سے دیکھا جاتا تو شاید بہت سی ایسی غلط فہمیاں اپنے آپ رفع ہو جاتیں جو انسانوں کے اپنے تحفظات کی پیداوار ہوتی ہیں۔

ان کی تصنیفات کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی ساری کتابیں ایک سنجیدہ اور مدلل طرز اسلوب کی حامل ہیں اور ان میں مصنف نے ایک طرف اپنے موقف کی تائید میں براہ راست قرآن وسنت سے دلائل فراہم کیے ہیں وہیں معروف ومعتبر مفکرین اسلام کی رایوں سے بھی اپنے نتائج فکر کی صحت کو ثابت کیا ہے۔ فی الواقع ان کتابوں کا سنجیدہ علمی جائزہ ایک مستقل اور مفصل بحث کا متقاضی ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، اس لیے یہاں مزید تفصیلات اور مثالوں سے قصداً گریز کیا جا رہا ہے۔ البتہ ان کتابوں کے بارے میں یہاں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ مولانا کی مجاہدانہ زندگی اور ان کے مخصوص طرز تعلیم و تربیت کی طرح ان کی یہ کتابیں بھی ایمان وعزیمت اور اسلامی حمیت کے پیغام کی حامل ہیں۔

جاہلیت کے خلاف جنگ کا وہ سپہ سالار نہیں رہا

عبدالعلیم اصلاحیؒ کی حیات مستعار کا تجزیہ کرنے والے شاید ہی اس حقیقت کو نظر انداز کر سکیں کہ وہ زندگی بھر باطل اور جاہلیت کے خلاف لڑتے رہے جس کی گواہ ان کی کتاب ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' سے زیادہ وہ مثالیں ہیں جو انھوں نے اپنی عملی زندگی میں پیش کی ہیں۔ جدوجہد کی اس راہ میں ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ خوف ناک حالات کا کوئی بھی حوالہ اور بڑھتے خطرات کا کوئی بھی دباؤ انھیں حق کی علم برداری سے دست بردار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک درویش اور مجاہد کی زندگی گذاری جو سراپا صبر و قربانی سے عبارت تھی۔

حق کے لیے مزاحمت، نہ کہ باطل سے مداہنت یہی ان کا شیوہ تھا اور یہی ہر اس شخص کا شیوہ ہوتا ہے جو طاغوت کے مقابلے میں ایک اللہ کو اپنا ولی و کارساز بناتا ہے۔ اپنی اسی اخلاقی خصوصیت سے وہ ہمیشہ پہچانے گئے۔ کچھ سال پہلے جب اس راہ میں اپنا جواں سال بیٹا قربان کیا تب بھی ہم نے نہ تو ان کے صبر کو کمزور پڑتے

دیکھا اور نہ ہی کسی مرحلے پر انھیں مایوس و دل شکستہ پایا۔ جب وقت موعود آیا تو وہ اس جہان فانی سے ایک مومن کی طرح ''رَاضِیَا مَّرْضِیًّا'' رخصت ہوئے۔ وہ جب تک جماعت اسلامی میں رہے اپنی جگہ اپنی بساط بھر اسے گرم و توانا رکھا، اور اپنے بے باک طرز عمل سے ہر ایک پر یہ ثابت کر دیا کہ اپنے ہوں یا غیر، کبھی کوئی ان سے زہر ہلاہل کو قند نہیں کہلوا سکا۔ حیدرآباد میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ان کا قائم کردہ لڑکیوں کا مدرسہ، جامعۃ البنات اور جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ہے۔ یہ مخصوص نسواں مدارس بھی ان کے لیے تعلیمی تجارت کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کے دینی و ملی مشن کا حصہ تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کے قائم کردہ ان مدارس کی تاریخ بھی ان کے ایثار و قربانی کی سراپا داستان ہے، ان کے بارے میں معروف ہے کہ وہ اپنی تعلیم گاہوں میں اپنے طلبہ کو نری کتابیں پڑھانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے خصوصی انداز سے ان کے قلب و ذہن کو فکر اسلامی کے سانچے میں ڈھالنے کا بھی کام کرتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے۔

اس بات کی شہادت حیدرآباد میں جامعۃ البنات، الاصلاحیۃ اور جامعہ دارالہدیٰ میں ان کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے وہ ہزاروں طلبہ و طالبات ہیں جنھیں انھوں نے تب و تاب زندگانی سے متعارف کیا اور جو ان کی تربیت میں نکھرے اور لعل و گہر بن کر اپنے استاذ و مربی کی ہی طرح اپنی اپنی جگہ جاہلیت کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں اور راہ حق میں مشعل برداری کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

ان کی کتابیں، ان کی تعلیم گاہیں اور ان کے ہزاروں طلبہ ان کی انمٹ یادگار کے طور سے آج بھی اپنی اپنی جگہ موجود ہیں مگر افسوس کہ اب خود وہ سپہ سالار نہیں رہا جو انھیں قدم قدم پر مہمیز کرتا اور اپنے جری و بیباک وجود سے ان کے حوصلوں میں نئی جان پیدا کرتا تھا۔ وہ نہیں ہے لیکن اپنے پیچھے انہوں نے جو تابناک نقوش چھوڑے ہیں وہ ان شاء اللہ ہمیشہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنے رہیں گے۔

ذات باری سے ہمیں یہ امید ہے کہ وہ اپنے اس صالح و صادق بندے کو اپنے قرب سے ضرور نوازے گا اور اس کی قربانیوں کا اسے بیش از بیش صلہ دے گا۔

اللہ کی ہزاروں رحمتیں ہوں اُس پر، اس کی ملت پر اور اس کے اہلِ خاندان پر۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
چند یادیں

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی
ریسرچ اسوسی ایٹ مرکز فروغ تعلیم وثقافت مسلمانانِ ہند،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ستمبر 2022 کی 27 کو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون
مولانا اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی گھاٹ میں پیدا ہوئے اور مدرسۃ الاصلاح سے اس وقت کسب فیض کیا جب وہاں نہایت قدآور اہل علم کی ایک کہکشاں آباد تھی۔ ان کے اساتذہ میں شبلی متکلم ندویؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا نجم الدین اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ ندوی اور مولانا صدر الدین اصلاحیؒ رحمہم اللہ وغیرہم شامل ہیں۔ اصلاح سے فراغت کے بعد تدریس کے لیے مختلف اداروں میں خدمات انجام دیں۔ آخر میں حیدرآباد منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے دختران ملت کے لیے ایک عربی درسگاہ ''جامعۃ البنات الاصلاحیۃ'' قائم کی۔ مختلف دینی و ملی سرگرمیوں میں شامل رہے اور شدید آزمائشوں سے گذرے۔ ساتھ ہی قلم وقرطاس سے بھی تعلق قائم رکھا۔ مولانا ایک اچھے معلم ومربی ہی نہیں بلکہ ایک مفکر اور صاحب رائے انسان تھے۔ ان کی آراء سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کے خلوص، متانت اور اولوالعزمی واستقامت اور تقویٰ وپرہیزگاری کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ چونکہ مولانا کی سوانح وعملی خدمات تو امید ہے کہ اس مجلہ میں شامل دوسرے مضامین بخوبی کور کریں گے اس لیے یہاں ہم صرف ذاتی یادوں تک اپنی گفتگو مرکوز رکھیں گے جس میں بعض نظریاتی پہلوؤں پر بھی تبصرہ آجائے گا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم کا نام نامی غالباً پہلی بار اس وقت سنا جب راقم دہلی کے جامعہ اسلامیہ سنابل سے عالمیت کرنے کے بعد رمضان کی چھٹیاں گزارنے جامعۃ الصالحات رامپور پہنچا۔ رامپور میں میں نے ایک مقامی مسجد میں قرآن سنایا اور قیام والد ماجد کے ساتھ ان کے کوارٹر میں تھا۔ اُس وقت والد ماجد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ جامعۃ الصالحات میں حدیث کے استاد تھے۔ وہیں ان کے رفیق حبیب استاد محترم مولانا صغیر احسن اصلاحی مرحوم تشریف لائے۔ انہوں نے والد صاحب کو مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کا ایک کتابچہ لا کر دیا ''ملت کے دفاع کا مسئلہ''۔ اس کتابچہ میں انہوں نے جو رائے قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں دفاع ملت کے حوالہ سے بیان کی تھی وہی رائے تقریباً والد ماجد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ کی بھی تھی۔ یاد رہے کہ وہ تو بنوٹ، شمشیر زنی اور گھڑ سواری کے ماہر تھے۔ انہوں نے میرٹھ شہر کی مقامی جماعت کے سامنے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ وہ اگر مسلم نوجوانوں کو دفاعی سرگرمیوں کے لیے تیار کرتی ہے تو وہ اس کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات انجام دیں گے۔ مگر جماعت نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ بہر حال والد صاحب نے نہ صرف کتابچہ پڑھ کر اس کی تعریف وتحسین کی بلکہ اس کی تائید بھی کی اور غالباً جامعۃ الصالحات کی انتظامیہ کی ایماء پر مولانا اصلاحی مرحوم کو جامعۃ الصالحات تشریف لانے اور وہاں تدریسی خدمات انجام دینے کی درخواست بھی کی۔ عید کے بعد میں تو مولانا صغیر احسن اصلاحی کی سرپرستی میں مزید تعلیم کے لیے جامعۃ الفلاح چلا گیا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جامعۃ الصالحات تشریف لائے یا نہیں، اس کے کچھ عرصہ بعد والد ماجد بھی جامعۃ الصالحات سے چلے گئے۔

اس کے بعد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی گفتگو پہلی بار اعظم گڑھ شہر میں اُس وقت سنی جب وہاں آج سے کوئی 25 سال پہلے شہر میں جماعت اسلامی کا صوبائی یا زونل دوروزہ تربیتی اجتماع ہوا۔ اُس میں جامعۃ الفلاح سے بہت سے طلبہ شریک ہوئے تھے۔ میں بھی اس وقت فضیلت کا طالب علم تھا۔ وہیں بہت سے مقررین کو سنا جن میں جماعت اسلامی کے حیدرآباد کے مشہور مقرر مولانا عبدالعزیز صاحب بھی تھے۔ اجتماع میں ایک پینل ڈسکشن بھی تھا جس کا موضوع غالباً ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی لائحہ عمل سے متعلق تھا۔ تمام جماعتی مقررین نے تقریباً یکساں باتیں کیں۔ آخر میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے اپنی سادہ سی تقریر میں ملک وملت کے بارے میں کچھ الگ ہی باتیں کیں اور گفتگو کے انداز میں سامعین کے سامنے چند سوالات رکھے اور ان کے جواب کے لیے سامعین سے سوچنے کے لیے کہا اور خود اپنی بھی رائے ظاہر کی کہ مسلمانوں کو خود حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اپنے سیاسی لائحہ عمل پر نظرثانی کرنی چاہیے۔

ان کی تقریر پر جماعتی حضرات میں عام طور پر ناخوش گواری کا تاثر تھا۔ بعد میں لڑکوں نے کلاس میں کچھ بحث کی اور ایس آئی او سے وابستہ کسی طالب علم نے ان کے اٹھائے گئے نکات پر اعتراض بھی کیا تو استاد محترم مولانا محمد طاہر مدنی مدظلہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا اصلاحی اصلاً تقریر کے آدمی نہیں ہیں۔ وہ تو اصل میں مدرس اور صاحب فکر انسان ہیں، مگر ان کی باتوں میں وزن ہے۔ وہ اصل میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت آپ کے اصول پر عمل کرنا چاہیے اور اپنے موجودہ سیاسی رویوں پر قرآن کی رہنمائی میں نظر ثانی کرنا چاہیے اور اپنا ایک اسلامی سیاسی وژن تلاش کرنا چاہیے۔ یاد پڑتا ہے کہ اسی موضوع پر مولانا کا ایک رسالہ بھی شائع ہوا ''ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟'' جس میں انہوں نے مسلمان تنظیموں اور تحریکوں کے سیاسی رویوں اور کارکردگی پر تنقید کی ہے۔

ندوۃ العلماء سے عربی ادب میں فضیلت اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد راقم دہلی میں مقیم ہوگیا جہاں جامعہ ملیہ سے پی ایچ ڈی کے ساتھ معاش کے لیے مختصر مدت کے لیے ماہنامہ 'ملی ٹائمز' جوائن کرلیا۔ اُس وقت تک مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے کئی کتابچے مطالعہ میں آچکے تھے۔ ایک رسالہ میں انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کے اس موقف پر فقہ حنفی کی روشنی میں تنقید کی تھی کہ ہندوستان دارالاسلام ہے۔ خالص فقہی قاعدوں کی رو سے تو یہ تنقید اچھی تھی مگر فقہ اصل نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت اصل ہیں۔ فقہ ان کی زمانی تعبیر کا نام ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا اکبرآبادی زیادہ آگے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور مولانا اصلاحی کا ذہن فقہی اصطلاحات سے اوپر اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہے جیسا کہ ان کے شاگرد مولانا سلطان احمد اصلاحی نے یہی تبصرہ کیا تھا۔ راقم خاکسار کے نزدیک موجودہ زمانے میں دارالحرب اور دارالاسلام وغیرہ فقہی اصطلاحیں اب اپنا relevance کھوچکی ہیں۔

اس زمانے میں ملی ٹائمز کے مدیر محترم (اب پروفیسر) راشد شاز صاحب ملت اسلامیہ کے سامنے ایک نیا سیاسی بیانیہ رکھ رہے تھے اور انہوں نے کوشش کی تھی کہ مسلمان ایک ملی سیاسی پارٹی کے قیام کا ڈول ڈالیں اور قرآن کو اس کا منشور بنائیں۔ فی الجملہ مولانا اصلاحیؒ کی تائید ان کو حاصل تھی مگر مولانا اصلاحی اس وقت جماعت اسلامی کے رکن تھے اور جماعت کے نظم نے ان کو پابند کررکھا تھا کہ عملاً کسی دوسری تحریک یا ملی سرگرمی میں شریک نہ ہوں۔ ایک موقع پر مولانا دہلی آئے ہوئے تھے اور ذاکرنگر میں واقع ایس آئی ایم کے سینٹر میں قیام تھا میں نے ان سے ملاقات کی اور جناب راشد شاز کی طرف سے ان کو ملاقات اور ماحضر تناول کرنے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کرلی۔ مگر وہ شام کو تشریف نہیں لاسکے کیونکہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔

مولانا محترم کی مختصر کتابوں میں ایک کتاب مولانا وحیدالدین خاں کی معروف کتاب ''فکر اسلامی'' کے نقد و جائزہ پر مشتمل ہے۔ جس میں سچی بات یہ ہے کہ ان کا جائزہ زیادہ تر فقہی بنیادوں پر اور جذباتی شدت لیے ہوئے ہے۔ معروضی تجزیہ و جائزہ کی اس میں کمی ہے۔

اسلام پسند نوجوانوں سے مولانا اصلاحیؒ بڑی محبت فرماتے اور ہر وقت ان کے تربیتی پروگراموں میں شرکت کے لیے تیار رہتے۔ جماعت اسلامی نے جب ایس آئی ایم سے آفیشلی قطع تعلق کر لیا اور ارکان پر ان کے جلسوں اور تربیتی کیمپوں میں شرکت پر بھی پابندی لگا دی تھی تب بھی مولانا نے اس پابندی کی کوئی پروانہ فرمائی کیونکہ ان کی نظر میں شرعاً اس کا جواز نہ تھا۔

چِکل دھرا کیمپ میں

چنانچہ مولانا سے راست استفادہ کا ایک موقع اس وقت میسر آیا جب مہاراشٹرا کے پُرفضا مقام چکل دھرا میں ایس آئی ایم کے منتخب ارکان و ذمہ داران کا ایک ہفت روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا۔ اس میں رسورس پرسن کے طور پر بہت سی شخصیات کو دیکھا اور سنا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہو اس بارے میں ڈاکٹر مولانا سعود عالم قاسمی ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ دونوں کے دو الگ الگ موقف سامنے آئے۔ مولانا اصلاحیؒ نے فرمایا تھا کہ بابری مسجد کا سانحہ مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن تھا۔ مسجد کے انہدام کے وقت ان کو باہر نکل کر فرقہ پسند قوتوں اور منافق مرکزی اور فسطائی صوبائی حکومتوں دونوں کے خلاف میدان میں نکلنا اور اعلان جہاد کرنا چاہیے تھا۔ جس میں وہ ناکام رہے۔ کیا ہوتا اگر وہ ایسا کرتے؟ دس بارہ لاکھ مسلمان مارے جاتے مگر ان کے ذریعہ خدا کی حجت باشندگان ملک پر پوری ہو جاتی اس سے کہیں زیادہ تو وہ ویسے بھی مارے جا رہے ہیں۔ مولانا سعود عالم صاحب کا کہنا تھا کہ فی زمانہ مسلمان اس طرح کا کوئی اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ ان کی ہند میں حالت حبشہ کے مسلمانوں کی حالت سے مشابہ ہے۔ جہاں مسلمانوں نے حبشہ کی عیسائی حکومت کے زیر سایہ نہ صرف زندگی گزاری بلکہ ایک مرحلہ پر دشمن کے مقابلہ میں اس حکومت کے دفاع کی خدمت بھی انجام دی۔ عقلی بنیادوں پر سعود عالم صاحب کا موقف زیادہ مضبوط لگتا تھا مگر آخری تجزیہ میں مولانا اصلاحی کے موقف کے وزن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کئی سالوں بعد مولانا مرحوم سے ایک انٹرایکشن قلمی بھی ہوا۔ ہوا یوں کہ جب خاکسار ماہنامہ ''افکار ملی، دہلی'' کی ادارت کر رہا تھا تو اس میں تبصرہ کے لیے مولانا یحییٰ نعمانی نے اپنی کتاب ''جہاد کیا ہے؟'' بھجوائی۔ حسب روایت راقم نے اس پر تبصرہ کیا اور فی الجملہ مصنف کی رائے اور استنتاج کی تائید کی۔

مولانا نعمانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاد ہجوم کا مقصد کفر کو مٹانا (بعض قدیم فقہاء کا موقف) یا شوکتِ کفر کو ختم کرنا نہیں جو کہ مولانا مودودیؒ کا مسلک ہے۔ بلکہ جہاد ظلم وعدوان کے خلاف کیا جاتا ہے۔ اب اس موضوع پر اردو میں بہت سا لٹریچر منظر عام پر آ چکا ہے۔

اس کتاب اور اس پر تبصرہ کے جواب میں مولانا اصلاحی کی لائق وفائق صاحب زادی ڈاکٹر ظلِ ہما صاحبہ نے ایک آتشیں مضمون سپرد قلم فرمایا ''ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب۔'' راقم نے اس کے جواب میں کچھ معروضات پیش کیں۔ تو مولانا اصلاحیؒ نے نعمانی صاحب کے موقف کے رد میں خود ایک مضمون قلم بند فرمایا۔ افکار نے اس کو شائع کیا اور اس کے جواب میں مولانا نعمانی کی مختصر تحریر کو بھی۔ نیز اس پر مولانا یٰسین پٹیل فلاحی صاحب کا بھی ایک تردیدی مضمون شائع ہوا جس کے جواب میں راقم نے بھی کچھ تحریر کیا تھا۔ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے بعض قارئین کے مطالبہ پر یہ بحث افکار کے صفحات میں ختم کر دی گئی۔ لیکن اس ردوکد سے خاصے مباحث ابھر کر سامنے آ گئے۔ مرحوم ''افکارِ ملّی'' کے صفحات میں یہ تمام مباحث دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں ملی مسائل کے سلسلہ میں مولانا کے اندازِ فکر ''کو فقہ مزاحمت'' کا نام بعض اہل علم دے رہے ہیں۔ خاکسار کے نزدیک فقہ مزاحمت یا فقہ تعامل اس ملک میں ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ جس کے بغیر مسلم ملت اپنا وجود و تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی۔

حرفِ آخر

مولانا اصلاحی مرحوم نوجوانی سے لیکر بڑھاپے تک زندگی بھر جماعت اسلامی کے قافلہ میں شامل رہے مگر جب جماعت نے نظراً وعملاً اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کر لی تو جماعت کے بدلے ہوئے موقف سے وہ شدت سے اختلاف کرتے رہے اور اسی کے سبب جماعت سے اپنا اخراج گوارا کر لیا مگر اپنے جس موقف کو وہ قرآن وسنت کی روشنی میں برحق سمجھتے تھے اس سے ایک سرِ مو دست برداری گوارا نہیں فرمائی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اصلاحی ایک عزیمت پسند انسان تھے۔ جو رائے بھی انہوں نے قرآن وسنت کی بنیاد پر اختیار کی اُس پر جم گئے کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کی۔ گویا: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کی تفسیر مجسم۔

جب تک جماعت اسلامی میں باضابطہ رہے اُس کے نظم کی پابندی کرتے رہے۔ مگر اپنی آراء اور افکار کے بارے میں اپنے لب ہمیشہ آزاد رکھے۔ اپنے جواں سال فرزند (مجاہد اصلاحی) کی شہادت کا غم بڑھاپے میں

اٹھایا مگر ان کے پایہ استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ کسی کو ان کی فکر سے ان کی کسی رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کے اخلاص للہ، ملت کے لیے ان کے غم، ان کی ہمت مردانہ، جرأت رندانہ، حمایت حق کے جذبہ اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو باطل کہنے کے حوصلہ سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

مقدور ہوتو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

امید ہے کہ مولانا مرحوم کے صلبی و معنوی جانشین ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو آگے بڑھائیں گے اور یہ یادگاری مجلہ ان کے افکار و خیالات کی تنقیح مزید کا راستہ ہموار کرے گا۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

مشتاق ملک
صدر تحریک مسلم شبان، تلنگانہ

ہندوستان دنیا کے نقشہ میں مسلم آبادی والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اب تو خبریں آرہی ہیں کہ ہندوستان آبادی کے لحاظ سے چین کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔ الحمدللہ! ہمارے ملک میں پچیس کروڑ مسلمان سانس لیتے ہیں یہاں علماء، مدارس دینیہ اور مساجد کی کمی نہیں ہے۔ ہر ریاست، ہر ضلع اور ہر محلہ میں الحمدللہ مدارس اور مساجد مل جائیں گی۔ پھر مسلمانوں کی ملّی، دینی، سماجی اور رفاہی تنظیموں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ ہے۔ اپنی جھوٹی شان وشوکت کے مظاہروں میں بھی ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہماری دعوتیں، شادیاں، سالگرہ پارٹیاں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ حیدرآباد تو ماشاء اللہ نمبر ون پر ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علماء کرام، مشائخین عظام، سیاسی و دینی تنظیمیں، قائدین ولیڈران، سماجی جہدکار، دینی مدارس اور مساجد جب سب موجود ہیں تو پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت دگرگوں کیوں ہے؟ یہ توحید خالص پر ایمان رکھنے والے رسوا اور بے آبرو کیوں ہورہے ہیں؟ اس سوال کے جواب پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحتوں کے پجاری بہت ہیں اور حق اور فکر صحیح کو بلاخوف وخطر پیش کرنے کی ہمت رکھنے والے خال خال ہیں۔

قحط الرجال کے اس زمانے میں بےخوف، زندہ ضمیر، خوفِ الٰہی کو سینے میں رکھنے والے ہمارے بزرگ اور رگوں میں سرد اور منجمد خون کو گرم اور رواں کردینے والے حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا وجود ہمارے درمیان ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ جو پیکر صبر واستقامت تھے۔ بڑے بڑے طوفان جن کو ہلا نہ سکے۔ بظاہر نحیف نظر آنے والی یہ شخصیت ایمانی اعصاب میں بے پناہ مضبوط تھی۔ میری ملی زندگی کا سفر تعمیر ملت سے شروع ہوا۔ میں نے

قائد محترم سید خلیل اللہ حسینیؒ کو دیکھا تھا، جسامت میں کمزور اور ایمان بڑا مضبوط۔ جس کا ایمان طاقتور ہوتا ہے اس کے اعصاب بھی بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ مولانا بھی طاقتور ایمان رکھنے والی ایک شخصیت تھے۔

مجھے اصحاب نبی کریم ﷺ کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعلق سے فرمایا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ طاقتور ابوبکر ہیں۔ جبکہ جسمانی اعتبار سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کمزور نظر آتے تھے۔ مگر تمام صحابہ میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا ایمان بہت طاقتور تھا۔ رسول ﷺ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جب جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوا، حالات کے پیشِ نظر دیگر صحابہؓ اور حضرت عمرؓ تک نے کہہ دیا تھا کہ فی الوقت مانعینِ زکوٰۃ کے مسئلہ کو نظر انداز فرمائیں۔ لیکن سیدنا ابوبکرؓ نے بلاتردد فرمایا کہ خدا کی قسم اگر کوئی ایک رسی کا بھی انکار کرے گا تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ یہ ایمان کے قوی ہونے کی وجہ سے اعصاب کی مضبوطی کا بہت بڑا اظہار ہے۔ میں نے حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے قوی ایمان اور مضبوط اعصاب کا بارہا مشاہدہ کیا جب باطل طاقتوں کا طوطی بول رہا ہوتا اور بڑے بڑے ادارے اور شخصیتیں مصلحت کا درس دیتے ہوئے مسندوں پر براجمان ہوتے، ایسے وقت مولانا محترم پوری قوت اور طاقت کے ساتھ مضبوط صحیح اسلامی فکر اور پرچم حق کو بلند کرنے کی تلقین کرتے۔

حضرت مولانا مرحوم نے اپنے ایک کتابچہ ''مساجد اللہ'' کی ابتداء میں لکھا کہ:

> ''ملک کی ترقی، بھلائی اور نجات کا دارومدار نہ بائیں بازو کی حکومت پر ہے نہ دائیں بازو کی حکومت پر ہے، اسی طرح نہ ہندوتوا کے برسراقتدار آنے پر ہے اور نہ سیکولر گروپ کے گدی سنبھالنے پر ہے، بلکہ سارا دارومدار صرف اس پر ہے کہ ملک میں انسانی اور اخلاقی اقدار پروان چڑھیں......امانت، دیانت اور عدل وانصاف کا بول بالا ہو......ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو ......اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلے......اللہ کا نام لینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور عبادت گاہیں محفوظ رہیں۔''

اس ایک مختصر سے اقتباس میں حضرت نے اسلام، قرآن اور شریعتِ محمدی کا پورا نقشہ کھینچ ڈالا ہے۔ اور اسلامی حکومت کے نفاذ کے بنیادی مقاصد کی تشریح فرمادی ہے۔ حضرت کی جو فکر اور تڑپ اس چھوٹی سی تحریر میں جھلکتی ہے اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

بابری مسجد کی شہادت کا غم تو یقیناً ساری امت کو ہے اور حق پرست اس کی بازیابی کی سعی اور پرچم حق کو بلند کرنے کی سعی میں جٹے ہوئے ہیں لیکن بابری مسجد کی شہادت اور پھر مندر کی تعمیر کے فیصلہ نے کئی چہروں سے

نقاب الٹ دیئے ہیں۔ کئی مسندوں کے غازیوں کو اپنی فکر اور زبان وقلم کو رہن رکھتا میں نے خود دیکھا ہے، مگر حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی فکر کبھی ماند نہ پڑی، نہ حالات کا کوئی خوف ان کے اندر کبھی دیکھا گیا، وہ اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور آخری سانس تک وہی مضبوطی ہمیں نظر آتی رہی۔ انھوں نے کتاب لکھی ''بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں'' یہ کتاب انھوں نے مختلف گمراہ کن فارمولوں اور امن وسلامتی کی بانسری کی دھن کے درمیان لکھی۔ بابری مسجد کے اپنے موقف پر وہ کبھی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ واضح کہا کرتے تھے کہ ''حالات کے بدلنے سے شریعت اور ذمہ داری نہیں بدلتی، ہاں طریقۂ کار بدل سکتا ہے۔''

جوان بیٹے مجاہد سلیم کو گجرات کے ظالم پولیس آفیسر نے حیدرآباد میں گولی ماردی۔ وہ شہید ہوگیا۔ مگر حضرت مولانا اصلاحیؒ کی جبین پر شکن نہیں آئی اور نہ ان کے اور ان کے بچوں اور بچیوں کی استقامت میں کوئی جنبش آئی، وہ ثابت قدمی کے ساتھ رضائے رب پر راضی رہے۔ اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور ابھی تک کررہے ہیں۔ ایسے باپ اور ایسی اولاد اللہ کی رحمت ہی کی دین ہوتی ہے۔ سارے دباؤ کو اللہ کی خوشنودی کہہ کر سہہ لینا اور کسی سے کوئی گلہ نہ کرنا بلاشبہ ایسا صرف وہ کرسکتے ہیں جنھیں صرف اللہ کی رضا اور نعمتوں کی تمنا ہوتی ہے۔

اللہ حضرت مولانا مرحوم کو اپنی خاص جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جو ورثہ اپنی فکر، استقامت اور نفاذِ شریعت کی جدوجہد کا انھوں نے چھوڑا ہے اس کو پورا کرنے کا حوصلہ نوجوانوں میں پیدا فرمادے۔ آمین!

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

نورالعارفین، حیدرآباد

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی مَیں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

''کم گوئی'' کے ساتھ تکلم اگر کوئی ہنر ہے تو دورِ حاضر کی شخصیات میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اس کی بہترین مثال ہیں۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی زبان سے الفاظ کم نکلتے ہیں لیکن ان کی سوچ وفکر سامعین پر حاوی ہوتی ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جس کسی محفل یا جلسے میں موجود ہوتے تو ان کی موجودگی ہی ان کی سوچ وفکر کی عکاسی کر رہی ہوتی۔

درسِ قرآن کی مجلس ہو یا کوئی جلسہ عام مولانا محترم کسی گوشے میں عام سامعین کے ساتھ متمکن ہوتے، ذمہ داروں کی جانب سے آپ کو صدارت وسرپرستی کی مسند تک مدعو کیا جاتا۔ بھلے ہی صدر ونگران کار کا لقب نہ ہو لیکن حاضرینِ مجلس جانتے تھے کہ ان کی موجودگی میں جو بات بھی ہوگی حق وصداقت کی آئینہ دار ہوگی۔ کسی مقرر نے خودساختہ مصلحت کوشی کا مظاہرہ کر دیا تو یہ بھی مولانا کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ان کی ہجو کئے بغیر بلکہ ان کی گفتگو کو راست نشانہ بھی نہ بناتے لیکن اس مصلحت کی قلعی کھولتے اور بتاتے کہ یہ مصلحت نہیں مداہنت ہے۔

مولانا کے ہاں کسی بات کی قبولیت کا معیار نص قطعی تھا پھر حدیث وسیرت اور پھر صحابہ کرامؓ کے اقوال اور پھر اجماع۔ اگرچہ امت میں بھی یہی تسلسل مشہور ہے لیکن فی زمانہ یہ ترتیب عملاً برقرار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس حدیث کو سبھی اسناد کے اعتبار سے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ

''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس دین کی خاطر قیامت تک (باطل کے خلاف) برسر پیکار رہے گی۔'' (صحیح مسلم، مسند احمد، طبرانی)

حدیث شریف میں یُقَاتِلُ عَلَیهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِینَ کے عربی الفاظ ہیں جس میں واضح طور پر جہاد بالسیف کا تذکرہ ہے۔ لیکن دنیا میں کہیں جہاد کی کوئی شکل نظر آئے تو یہ امت بالاتفاق اسے نہ صرف مسترد کر دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتی ہے بلکہ اسے غیر اسلامی اور دہشت گردی و بغاوت قرار دینے کے دلائل ڈھونڈ نکالتی ہے۔ ان کے پاس اب نہ نص کی دلیل ہوتی ہے نہ حدیث کا متن، سیرت سے صرف نظر کرتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ''مصلحت آمیز'' بیان شروع ہو جاتا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جس گروہ پر بغاوت و انتہا پسندی کا لیبل لگایا جا رہا ہے وہ جہاد کے مفہوم سے نا آشنا ہے تو پھر حدیث شریف کی روشنی میں کوئی تو گروہ ہر دور میں ہونا چاہیے جو حق کے لئے باطل سے برسر پیکار ہو۔ اس گروہ کی نشاندہی کون کرے؟ اگر نہ کرنا چاہے تو کسی مرد میدان کے خلاف فتاویٰ سے گریز تو کیا جا سکتا ہے کہ امت خود اس کے بارے میں فیصلہ کر لے لیکن بھلا ہو زمانے کی حکمت پسندی و مصلحت پرستی کا کہ دنیا میں کہیں بھی حق کو برسر پیکار دیکھنے کو تیار نہیں اور ہر زبان پر بس یہی تکرار ہے ''یہ سلامتی کا دین ہے۔'' یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بانگ دہل سلامتی کی تشریح کرتے ہوئے بتاتے کہ جو اس دین میں آ جائے اسے سلامتی ہے، جو اس دین کی دشمنی ترک کر دے اسے سلامتی ہے، جب ظلم و ستم غضب ڈھانے لگے تو ظالم کی سرکوبی سلامتی ہے، مظلوم کی حمایت سلامتی ہے اور دین کو غالب کرنے کی کوشش فرض کفایہ ہے تاکہ دنیا کو امن و سلامتی نصیب ہو۔ اس موضوع پر کہیں گفتگو چھڑ جاتی اور وہاں مولانا مرحوم موجود ہوتے تو میں نے محسوس کیا کہ عوام میں معروف حکمت و مصلحت کے نام پر اظہارِ خیال سے ہر کوئی اجتناب کی کوشش کرتا کیونکہ وہ بخوبی جانتا کہ مولانا کے دلائل کے آگے وہ ٹک نہیں سکے گا۔ مولانا کی نگرانی میں کوئی جلسہ ہوتا تو اس میں ایسے اہلِ دانش ہی شریک ہوتے جن کے دلوں میں فکرِ اسلامی کی آبیاری کی تمنا مچل رہی ہوتی۔ باطل طاقتیں جب یک جٹ ہو کر حق پرستوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے امڈ پڑیں تو شاید ہی کوئی عالم و دانشور ہوگا جو حق کا دامن تھامے باطل کی شکست فاش کی بشارت سنا رہا ہوگا۔ ہر طرف سے حق پرستوں پر ان مشوروں کی یلغار ہوتی ہے کہ اسلام اپنے آپ کو مٹا دینا نہیں سکھاتا، خود کو بچانے کی تدبیر کا نام حکمت و مصلحت ہے جو اسلامی تعلیمات کا خاصہ ہے۔ پھر کہاں حق کو غالب دیکھنے کی تمنا دفن ہوئی اور قلوب مداہنت سے زنگ آلود ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا۔!!! ایسے مایوس کن حالات میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جیسے چند ہی نفوس ہیں جو امت کو سورۃ الاحزاب کی اس آیت کی یاد دہانی

کرار ہے ہوتے ہیں:

''اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انھوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے صاحب فی ظلال القرآن لکھتے ہیں:

''اس جنگ میں مسلمان جس خوف سے دوچار ہوئے وہ اس قدر عظیم تھا اور اس غزوہ میں جو دکھ ان کو پہنچا اس قدر شدید تھا اور اس واقعہ میں وہ جس بے چینی کا شکار ہوئے وہ اس قدر سخت تھی کہ وہ ہلا مارے گئے اور قرآن نے اس کے لئے زلزالاً شدیداً کا لفظ استعمال کیا ہے۔''

اگر احزاب کی موجودہ دور میں تفسیر کی جائے تو اقوام عالم ہی کرنا پڑے گا جس کے لئے اقوامِ متحدہ کی بنیاد پڑی ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ مذکورہ آیت اسی قرآن کا حصہ ہے جس کا درس دیتے ہوئے تحریک اسلامی نے توانائی حاصل کی لیکن آج اسی تحریک کے بڑے بڑے دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ ہلا مارے جانے سے پہلے ہی اَدھ مرے ہوئے جاتے ہیں۔ بھلا ہو ان اصلاحیوں کا کہ ان حالات میں بھی قرآن کی ٹھیک ٹھیک رہنمائی سے امت کو روشناس کرواتے ہیں۔

عام طور پر اس قدر گہرا تدبر اور مضبوط فکر کے حامل افراد جذباتی ہوتے ہیں لیکن مولانا اصلاحیؒ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے جذبات کو کبھی استدلال اور تفہیم پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ ناقدین کی ہر بات کو صبر و تحمل سے سنا اور ایسا مسکت جواب دیا کہ بالآخر وہ بزبان خود مولانا کے ترجمان بن گئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ جذباتی مسائل پر خندہ پیشانی سے گفتگو اور ناقدین کو قائل کروانے کے سلسلہ میں احقر کی موجودگی میں پیش آیا۔

کافی عرصہ میرا معمول رہا کہ میں چنچل گوڑہ سے سعید آباد آتا، مولانا اپنے مکان کی گلی کے باہر نکڑ پر منتظر ہوتے، پھر ہم آگے بڑھتے اور وہاں سے مشہور قد آور (علم کے ساتھ جسمانی طور پر بھی قد آور ہی تھے) شاعر و ادیب جناب مضطر مجاز مرحوم بھی ہمراہ ہو جاتے اور تینوں قبا کالونی کے قریب ایک ہوٹل میں چائے نوشی کرتے۔ درمیان میں مختلف موضوعات پر علمی گفتگو چلتی رہتی۔ چہل قدمی میں میرے ہم قدم ہونے کے پس پشت علمی مباحث سے فیض حاصل کرنا ہی مقصد ہوتا تھا۔ مضطر مجاز مرحوم بڑے پرُ مزاح آدمی تھے۔ بہترین ناقد بھی تھے۔ طرزِ استدلال میں کمال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ماہ دسمبر کے موقع سے بابری مسجد کا موضوع چھڑ گیا جس سے مولانا اصلاحیؒ کی ذہنی وجذباتی

وابستگی اظہر من الشمس تھی۔ مجاز صاحب نے چھیڑخوانی شروع کی اور کہا کہ مولانا میں سمجھتا ہوں کہ ملاؤں نے خواہ مخواہ اس مسئلے کو اپنے گریباں سے باندھ رکھا ہے اب اس مسئلے کو بھلا دینا چاہیے۔ میں بھڑک اٹھا اور کہا کہ کیسے بھلا سکتے ہیں، اور بھی کچھ کہا لیکن مجاز صاحب نے مجھے نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کا اصل ہدف تو مولانا تھے۔ کہا ''مولانا آپ کی کیا رائے ہے؟'' مولانا بھانپ گئے اور مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے مجاز صاحب کے دلائل سے محظوظ ہونے لگے کہ مسلمانان ہند کی عافیت اس میں ہے کہ وہ بابری مسجد کو بھلا دیں۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ مولانا کی خاموشی سے تنگ آ کر مجاز صاحب نے مولانا سے راست ردعمل جاننے کی کوشش کی۔ مولانا اصلاحیؒ نے کہا کہ ''پھر مسلمانوں کی عافیت کے لئے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔''

مجاز صاحب نے کہا کہ ''مسلمانوں کو آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ بابری مسجد کو بھول جائیں۔''

مولانا کا جواب تھا'' آپ تو جانتے ہیں ہم بے چارے مسجد کے ملا اسے بھول جائیں تو ہماری حیثیت ہی کیا رہے گی؟! ہاں آپ چاہیں تو امت میں مسجد کو بھولنے کی مہم چلا سکتے ہیں۔'' یہ ایسا کاری وار تھا کہ مجاز صاحب پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اس دن کا سیشن ختم ہوگیا۔ اگلا دن میرے لئے پھر حیرت انگیز تھا جب میں نے دیکھا کہ وہی مجاز صاحب ہیں اور بابری مسجد سے مسلمانوں کی اٹوٹ وابستگی کو ایمان کا جز اور ہندوستان میں ان کی شناخت کا مسئلہ ثابت کرنے کے لئے دلیل پر دلیل پیش کر رہے ہیں۔ جواب میں مولانا کی پھر وہی مسکراہٹ لیکن اب کی بار یہ مسکان قدرے گہری تھی اور اس میں کامیابی کا عنصر صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ مسجد کو بھلا دینے کی مہم کی کمان مجاز صاحب کے ہاتھ میں تھما کر مولانا نے انہیں مسجد سے وابستگی میں ایمان کی عافیت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا اصلاحی صاحب کی شخصیت کا یہی پہلو ہے جسے میں نے ''کم گوئی میں تکلم'' کی خصوصیت کے طور پر ابتدائے تحریر میں پیش کیا ہے۔

مولانا کی سوچ و فکر ہی تھی جس نے انہیں تحریک سے باہر نکالنے کے لئے ذمہ داران تحریک کو مجبور کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ رہے تو وہ تحریک کو اس رخ پر نہیں لے جا سکتے جہاں لے جانے کی تگ و دو میں موجودہ قیادتوں نے حتیٰ کہ بانی تحریک کے لٹریچر کو بھی ریفارم کا موضوع بنا دیا ہے۔ تحریک سے اخراج کے بعد مولانا بذات خود ایک تحریک بن گئے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کے ذریعہ امت میں فکر اسلامی کی جڑوں کو مضبوط کرتے رہے۔

میں نے نجی گفتگو میں بھی مولانا کی یہ کم گوئی اور محتاط اظہارِ خیال میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ اگر کوئی ان سے سوال کرے تو اسے غور سے سنتے، نگاہیں اٹھا کر سائل کو دیکھتے، زیر لب مسکراتے ......ادھر سائل بے چین......

کچھ تو کہیں...... کبھی کوئی بے صبرا یہ سوچتے ہوئے اپنے سوال کی مزید وضاحت کی کوشش کرتا کہ شاید مولانا اس کی بات کو سمجھ نہیں پائے ہیں...... تو ان کا تبسم اور بھی بسیط ہو جاتا جس میں مشفقانہ ہمدردی بھی پنہاں ہوتی۔ پھر اگر اثبات میں جواب دینا ہوتا تو کہتے: ''ہاں، یہ بات تو ہے'' یا اس طرح کے کوئی الفاظ جن سے سائل کی تائید ہوتی ہو۔ اگر نفی میں جواب ہو تو کہتے: ''ہاں، مگر ایسا تو نہیں ہے۔'' پھر اس کی وضاحت فرماتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی کم گوئی کبھی سامع کے لئے تفہیم مسئلہ میں رکاوٹ نہیں بنی بلکہ ان سے ملنے والوں کا یہ احساس ہوتا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس کے بولنے پر سننے کے مشتاق ان کی خاموشی پر پھر سے لب کشائی کے منتظر ہوتے تھے۔ نجی ملاقاتوں کا یہ معاملہ اور محفل و مجلس میں مولانا کا دبدبہ ایسا تھا کہ اکثر و بیشتر ''دانشور'' ان کے سامنے ''حکمت و مصلحت'' کے تانے بانے بننا تو درکنار اس کا معنی و مفہوم ہی بھول جاتے تھے۔ اس کی وجہ علم کی گہرائی، استدلال کی مضبوطی، ٹھوس تدبر اور نصوص پر ثابت قدمی تھی۔

دورِ حاضر کے خودساختہ دانشوروں کی حکمت و مصلحت کی قباء کو چاک کرنے میں مولانا اصلاحیؒ کی بے باکی حفیظ میرٹھی کے ان الفاظ کا مرقع نظر آتی ہے:

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

کوئی مرحلہ ہو کوئی معرکہ ہو، نظر عارفانہ قدم غازیانہ

فارس الاسلام، دہلی

ایک مسافر تھا کچھ دیر ٹھہرا یہاں
اپنی منزل کو آخر روانہ ہوا
بات کل کی ہے محسوس ہوتا ہے یوں
جیسے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا

میں کئی دن سے کوشش میں تھا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمہ اللہ کے لیے، ان کی خدمات وقربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کچھ لکھوں لیکن میں اس سے قاصر تھا کیوں کہ بار بار ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ مجھ جیسا ایک ادنیٰ شخص مولانا اصلاحیؒ کی دینی خدمات وقربانیوں پر کوئی تحریر لکھ کر کیسے حق ادا کر پائے گا؟!

بالآخر آج دل نے کسی طرح یہ جرأت کی ہے کہ اس شخصیت کے لیے کچھ الفاظ میں بھی رقم کروں جو ہند کی اسلامی تاریخ میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عکاسی کرتے ہیں۔ میں پہلی بار مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت سے روبرو اس وقت ہوا جب میں نے مولانا کی کتاب ''دارالاسلام اور دارالحرب'' پڑھی جو مجھے میرے ایک عزیز دوست نے پیش کی۔ پڑھنے کے بعد محسوس ہوا جیسے کہ ذہن کے کئی شبہات کچھ لمحوں میں دور ہو گئے ہوں۔

الحمدللہ! پھر مولانا کے حوالے سے مزید معلومات حاصل کیں تو جیسے دل باغ باغ ہو گیا۔ ہند میں علماءِ حق کی جو کمی محسوس ہوتی تھی جس سے دل ہمیشہ بے چین رہتا تھا ایسا لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کمی کو مولانا کی صورت میں پورا کر دیا ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ان علماءِ حق میں سے ایک تھے جنھوں نے حق کو حق کہا اور باطل کے

ساتھ ذرہ برابر بھی خلط ملط نہ کیا۔کلمۂ توحید کی پہلی شرط یعنی طاغوت سے انکار و برأت کی ایک طرف آپ نے ڈنکے کی چوٹ پر دعوت دی تو دوسری طرف آپ نے اس کا عملی مظاہرہ بھی پیش کیا اور اس پر جمے رہے۔کوئی رکاوٹ آپ کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی سب رکاوٹوں کو آپ نے عبور کیا۔آپ کے عملی مظاہرہ کی ایک شکل آپ کی کتابیں ہیں جو ہمیشہ نظامِ وقت کی نگاہوں میں کھٹکتی رہیں صرف یہی نہیں بلکہ ان کتابوں میں آپ کی اسلامی فکر اور نظریہ کی وجہ سے آپ کو''جماعتِ اسلامی ہند''(جسے اب جماعتِ غیر اسلامی ہند کہنا درست ہوگا) سے نکالا گیا۔ وہ کتاب جو آپ نے ملت کے دفاع کے مسئلہ پر لکھی تھی جس میں آپ نے مسلمانانِ ہند کو ان کے شرعی فریضہ سے آگاہ کرایا تھا، اس وجہ سے آپ جماعت کی نگاہوں میں مجرم ٹھہرے۔

آپ کے عملی مظاہرہ کی دوسری شکل اپنی اولاد کی خالص توحید و شریعت سے محبت و وفاداری کی بنیاد پر تربیت کرنا ہے جس کی مثال ہمیں آپ کے مجاہد نوجوان صاحبزادے مجاہد سلیم کی شہادت سے ملتی ہے جو ملت کے دفاع کی خاطر مشرکینِ ہند کی بندوقوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے رہے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔اللہ ان کی شہادت قبول فرمائے۔

مولاناؒ کا اپنے عزیز بیٹے کی شہادت پر رنج وغم کا اظہار نہ کرتے ہوئے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا طاغوت اور ان کے اولیاء کے سینوں کو چھلنی کرنے جیسا ثابت ہوا۔الحمدللہ! مزید یہ کہ آپؒ نے اپنے مدرسہ کے قیام کے ذریعے اپنی بیٹیوں و دیگر مسلم خواتین کی دینی تربیت کے ذریعہ خولہؓ و خنساؓ کی رونق و رمق اور قربانی و استقامت کے جذبے کو باقی رکھا جو آئے دن ہند میں ظاہر ہوتا رہتا ہے اور مسلم مردوں کی غیرتِ ایمانی کو جگاتا رہتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے سورۂ عصر یعنی "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کے تقاضے کو پورا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔اللہ رب العزت آپ کی ان نیک خدمات و دین کی خاطر دی گئی قربانیوں کو اپنی رحمت سے قبول فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین!

مولاناؒ نے ایک طرف اپنی کتابوں اور عمل کے ذریعہ دورِ حاضر کے باطل ادیان جیسے کہ جمہوریت، سیکولرزم، وطن پرستی جیسے غلیظ ترین شرک و کفر اور اس کے کفریہ نظام سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور اس سے برأت کا اعلان کیا تو وہیں دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان اسلام کا لبادہ اوڑھے منافقین اور گمراہ کرنے والے علماءِ سوء اور ان کی تنظیموں سے آگاہ کیا جو اسلامی پوشاک پہن کر مسلمانوں کو جمہوریت کے کفر کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جہاد و قتال سے مسلمانوں کو روکنے کے لیے اس کی غلط و من مانی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ان سارے طاغوتی و باطل افکار و عقائد کی دعوت دینے والی شخصیات و تنظیموں کے خلاف مولاناؒ ایک مضبوط قلعہ تھے جن کا

بدل تو ممکن نہیں لیکن آپ کی کتابیں اور خدمات مسلمانانِ ہند کی ضرور رہنمائی کرتی رہیں گی۔ انشاء اللہ! مولانا کی کتاب ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے کچھ صفحات کے اس کتابچہ میں سید قطب شہیدؒ اور شیخ عبداللہ عزام شہیدؒ کی کئی کتابوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پرودیا ہو۔ جہاں آپ نے ایک طرف دورِ حاضر کے جاہلی وطاغوتی عقائد سے برأت کا اظہار کیا ہے تو وہیں دوسری طرف اقامتِ دین واعلائے کلمۃ اللہ کے صحیح طریقہ یعنی نبوی منہج جس کی بنیاد نظامِ طاغوت کو جہاد وقتال کے ذریعے مسمار کرنے پر ہے، سے روبرو کرایا اور مسلمانوں کو ان کے سب سے اہم شرعی فریضہ یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی یاددہانی کرائی ہے۔

آپ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جن کے قول وعمل میں تضاد ہوتا ہے بلکہ آپ نے جس چیز کی دعوت دی اس پہ عمل پیرا ہوئے۔ آپ حق کو قبول کرنے والوں میں سے تھے چاہے اس کی صدا بہت دور اجنبی لوگوں سے ہی کیوں نہ آتی ہو۔ اس کی زندہ مثال یہ تھی کہ جس خلافت واقامتِ دین کی آپ زندگی بھر دعوت دیتے رہے، جب اس کے قیام کی خوشخبری سنائی دی تو نہ صرف آپ نے اس پر لبیک کہا بلکہ مسلمانوں کو خلافت وجہاد کی اہمیت یاد دلاتے ہوئے اس سے منسلک ہوجانے کی ترغیب بھی دی تاکہ آخرت میں اللہ کے حضور رسوا نہ ہوں۔

مولاناؒ کی زندگی پر نظر ڈالنے سے مجھے ''تحریکِ شہیدین'' کی یاد آتی ہے اور بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر شہید ہوئے ان تمام مجاہدین کی جنھوں نے ہند کی سرزمین کو شرک وکفر سے پاک کرنے اور توحید کے جھنڈے کو بلند کرنے کے لیے سید احمد شہیدؒ کی سرپرستی میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ شہید ہوگئے۔ اللہ ان کی شہادتوں کو قبول کرے۔ آمین!

مجھے امید ہے کہ اللہ رب العزت اُن شہداء کی قربانیوں اور مولانا اصلاحیؒ اور ایسے دیگر مؤمنین وغرباء کی محنتوں وقربانیوں کو رائیگاں نہ جانے دے گا اور ان کی برکتوں سے یہاں پھر سے ایسے مجاہدین ومؤحدین کو کھڑا کرے گا جو 'تحریکِ شہیدین' کی یاد کو تازہ کریں گے اور ہند کی سرزمین کو ہر طرح کے شرک وکفر کی غلاظت سے پاک کرکے اللہ کے کلمے کو بلند کریں گے۔ باذن اللہ تعالیٰ۔ اللہ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل کرے۔ آمین!

طبیعت بہت ناساز ہونے کے باوجود مولانا نے آخری ملاقات میں ہمارے شہر آنے کی خواہش ظاہر کی تھی تاکہ وہ پھر سے نوجوانوں سے ملاقات کریں اور ان کے اندر دینی غیرت وجرأت کو جھنجھوڑیں۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ رب العزت ہماری ملاقات جنت میں نصیب کردے اور ہم سب کو اپنی رحمت سے رسولِ اکرم ﷺ کے جھنڈے تلے جمع کردے۔ آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
ایک گوہر شہوار

عدیل اختر، علی گڑھ
سابق آفس سکریٹری ایس آئی ایم مرکز، دہلی

یہ غالباً 1999 کا رمضان تھا۔ ایس آئی ایم سینٹر (ذاکر نگر، دہلی) میں افطار کی سالانہ دعوت تھی۔ مولانا عبد العلیم اصلاحی صاحبؒ بھی آئے ہوئے تھے، بعد مغرب ان کی تذکیر رکھی گئی تھی۔ مولانا نے اپنے مخصوص سادہ سے انداز میں جو تذکیر کی تھی اس کا مرکزی نکتہ مجھے آج تک یاد ہے، اور جب کبھی بھی ان کا ذکر آیا، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مجھے وہی بات یاد آتی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ:

> ’’سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ‘، ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ‘ اور ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ‘ ایک ہی اسلوب میں اور تاکیدِ حکم کے ایک ہی زور کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے، لیکن آج کل ہمارے واعظین ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ‘ کا سبق تو دہراتے ہیں، جب کہ ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ‘ اور ’كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ‘ کا ذکر نہیں کرتے۔ اس طرح کی تعلیمات بیان بھی کی جاتی ہیں تو آدھی ادھوری۔‘‘

مولانا کو دیکھنے، ملنے اور سننے کا یہ سلسلہ مرکز ایس آئی ایم میں رہتے ہوئے ہی شروع ہوا تھا، اس وقت راقم کو آفس سکریٹری کی ذمہ داری ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ آنے والے مہمانوں سے ملاقات اور استفادے کا موقع

خوب ملتا تھا۔ مولانا کی میز بانی اور خدمت کا موقع بھی بہت بار ملا۔

مولانا کی سادگی، شفقت اور فکر اسلامی کے تئیں حساسیت نے مولانا کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔ عقیدت مندی کے معاملے میں اپنی طبیعت ذرا کچھ کنجوس واقع ہوئی ہے لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے عقیدت رکھنا طبیعت کا خود اپنا ایک تقاضا ہوتا ہے اور اس میں دخل ہوتا ہے ایسے افراد کی بے نفسی اور تصنع سے پاک شخصیت کا۔ اس لئے مولانا سے ایک سچی عقیدت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

مولانا کی قربت اور ان کی سرپرستی حاصل ہونے کا دوسرا موقع ہمیں قیام حیدرآباد کے دوران حاصل ہوا۔ 31 دسمبر 2003 کو ہمارا نکاح ہوا تھا رام پور میں، اور اس وقت میں ای ٹی وی نیوز کے لکھنؤ آفس میں علاقائی اردو خبروں کی ایڈیٹنگ اور پیکیجنگ کے کام پر مامور تھا۔ نکاح سے ایک ہفتہ پہلے ہی اچانک سے ہیڈ کوارٹر شفٹ ہونے کا آرڈر آ گیا تھا۔ چنانچہ نکاح کے فوراً بعد مجھے حیدرآباد میں ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ یہ ایک اچانک سی افتاد تھی۔ مگر یہ بات اطمینان کے لئے کافی تھی کہ مولانا تو وہاں ہیں ہی۔

مولانا کے ایک داماد جناب ابو عاصم صاحب بھی وہاں ای ٹی وی میں تھے تو میں مولانا کے عافیت کدے میں ہی پہنچا۔ مولانا نے بہت محبت اور شفقت سے استقبال کیا اور قیام کی اجازت و سہولت دی۔ مولانا کا گھر مجھے اپنے گھر جیسا ہی لگا۔ کیوں کہ صرف مولانا ہی نہیں بلکہ گھر کے سبھی افراد نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کسی بھی طرح سے غیریت کا کوئی احساس نہیں ہونے دیا۔ حیدرآباد میں ڈیوٹی جوائن کرنے کے بعد میں نے کچھ دن آفس کے ساتھیوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں گزارے۔ اب مجھے فکر تھی اپنی نئی نویلی شریکِ حیات کو ساتھ لانے کی۔ مولانا اور ان کی اہلیہ محترمہ چچی جان نے بڑی ڈھارس بندھائی اور کہا کہ آپ بے فکری سے لے آیئے کچھ دن ہمارے گھر ہی قیام رکھیں پھر کوئی مکان مل جائے گا ان شاء اللہ۔ تو اس طرح ہمارے نوخیز کنبے کی آبادکاری حیدرآباد میں علیم چچا میاں اور چچی جان کی سرپرستی میں اور ان کی مدد سے ہوئی۔ چچی نے ہماری اہلیہ کا استقبال اپنی بہو کی طرح کیا۔ چچی کی بیٹیاں گویا کہ نندیں تھیں۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اس دور دراز دیارِ غیر میں اپنے گھر جیسا ماحول اور پیار ملا۔ مولانا کے بیٹے مجاہد شہید اور معتصم سے بھی بالکل اپنے بھائیوں جیسی محبت اور بے تکلفی تھی۔ ہم لوگوں نے خود کو اس گھر کے افراد ہی سمجھا۔ چچی جان نے دوڑ دھوپ کر کے ہماری رہائش کا انتظام کیا اور گھر کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ میں فلیٹ دلوا دیا۔ پھر ہم لوگ تقریباً سال بھر تک حیدرآباد میں علیم چچا میاں اور چچی کی سرپرستی میں رہے۔ یہ ہمارے اوپر اس گھرانے کے وہ احسانات ہیں جنہیں ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔

مولانا کا پورا گھرانہ اسلامی معاشرت کا ایک نمونہ تھا۔ اخلاق، ہمدردی سچائی، مہمان نوازی، پردیسیوں کی مدد،

دین کی جملہ تعلیمات کو عملاً برتنا، عبادت اور حیا وتقدس کا ماحول، نظافت وشائستگی، سلیقہ مندی وآراستگی وغیرہ سب کچھ جامعیت کے ساتھ وہاں نظر آتا تھا اور کوئی بے اعتدالی یا عدم توازن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ مولانا عبدالعلیم اصلاحی چچا میاں کے علم وعمل کی ایک تعبیر تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کے گھرانے کا یہ سارا حسن ابھی بھی اسی آب وتاب کے ساتھ برقرار ہوگا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ اسلام کے سفیر اور نمونے کے طور پر دنیا میں رہنے کے لئے چنتا ہے۔ ان کی پوری زندگی بظاہر دین ہی دین، شریعت ہی شریعت اور عبادت ہی عبادت تھی۔ دین وشریعت کی تعلیم کے لئے انہوں نے مدرسہ جامعۃ البنات قائم کیا اور چلایا، اور بہت کامیابی نیز جدید طرزِ تعلیم کے ساتھ معیاری انداز میں چلایا، عوام الناس میں دین کی تعلیم وتبلیغ اور فکر اسلامی کی تحریک کے لئے وہ عام لوگوں کے درمیان سرگرم رہے اور ہر ضروری موقع پر ان کی رہنمائی اور نمائندگی کے لئے موجود رہتے تھے۔

مولانا نوجوانوں کے مربی اور مزکی تھے۔ اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سچے جذبات سے سرشار نوجوان دلوں کی دھڑکنوں کے لئے وہ تسکین وتسلی کا سامان تھے۔ ان کا علم وسیع تھا اور نظر گہری۔ وہ اسلام اور شریعت کے مقاصد کو دین کے اصل مصادر سے جانتے تھے، اور احیاءِ اسلام کی فکر کو ''تحریک اسلامی'' کے بانیوں کی شخصی صحبتوں اور ان کی فکری تصنیفات کے جامع مطالعہ سے خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسی لئے تحریک کی فکری تربیت پانے والے نوجوانوں کی بے چینیوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے جذبات سے ہم آہنگی برتتے ہوئے اپنی مشفقانہ صحبتوں سے انہیں بڑی فیاضی کے ساتھ نوازتے تھے اور اپنی مقدس اور مصلحانہ صحبت سے انہیں فیضیاب کرتے تھے۔ مولانا تحریک اسلامی کے ان بزرگوں میں سے تھے جو نوجوان جذبات کی ناقدری یا حوصلہ شکنی نہیں کرتے تھے بلکہ حکمت کے ساتھ صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ نوجوانوں کے فکر وجذبوں کی رعایت کرتے ہوئے انھوں نے کتابیں بھی لکھیں جن میں ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' ان کی سب سے نمایاں کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ملت کے معاملات ومسائل پر بھی ان کی کتابیں نوجوانوں میں خاص طور سے پڑھی گئیں۔

اللہ نے ان کا مرتبہ بلند کرنے کے لئے انہیں شہید کے والد ہونے کا بھی اعزاز عطا کیا۔ ان کے بیٹے اور بیٹیاں اسی طرح دین وملت کے لئے جاں نثاری کے جذبات سے سرشار ہوئے جس طرح مولانا خود تھے۔ اسی جذبۂ جاں نثاری میں پیارے بھائی مجاہد پولیس کی ظالمانہ کارروائی میں شہید ہوئے۔ لیکن مولانا کو ہم نے صبر کے

پہاڑ کی طرح ثابت وقائم دیکھا۔

''یہ چیز نہیں ملتی مگر ان لوگوں کو جو بہت نصیب والے ہیں۔'' (قرآن)

مولانا سے وابستہ یادیں بہت سی ہیں لیکن ان سب کو بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مولانا سے براہ راست رابطہ اب بہت عرصے سے نہیں تھا، لیکن ان سے تعلق کا احساس ہمیشہ رہا ہے۔ ان کی خیر خیریت بالواسطہ طریقے سے ملنے جلنے والے افراد سے ملتی رہتی تھی۔ جب بھی یاد آئی ہم نے ان کے لئے دعا کی کہ یہی کسی بھی انسان کے لئے سب سے بڑا نذرانہ ہے۔

مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا فیض کئی طرح سے جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ہم سب کی دعاؤں کو ان کے حق میں قبول کر کے ان کے درجات بلند کرتا رہے یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ صدیقین اور شہداء کو ایک جگہ جمع کرے تو اس مبارک جھرمٹ میں اللہ تعالیٰ ان کو بھی جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

اللہ سے دعا ہے کہ مولانا کے گھرانے میں خیر و برکت کے سلسلے کو جاری رکھے، چچی جان کو باقی تمام پسماندگان کے ساتھ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین!

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

بے باک نوجوانوں کے بے باک قائد

اعجاز احمد، جمیل احمد، محمد وجیہ القمر
سابق ذمہ داران اسلامک یوتھ فیڈریشن، دہلی

تحریک کی تقریباً تیس سالہ زندگی میں کئی لوگوں سے ہم سب کی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان میں الگ الگ میدان کے لوگ رہے ہیں۔ بعض سے تفصیلی اور بعض سے مختصر ملاقاتیں رہی ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی چھاپ آپ پر ایسے پڑ جاتی ہے کہ آپ ان سے جدا نہیں ہو پاتے، چاہے وہ آپ کے ساتھ ہوں، آپ کے پاس ہوں یا آپ سے دور ہی چلے جائیں۔ ایسے ہی کچھ لوگوں سے ہماری ملاقاتیں رہیں اور ان کی چھاپ ہم پر ایسی پڑی کہ ان سے جدا ہو پانا یا انہیں بھلا دینا ناممکن ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ علامہ اقبال کے ایک انقلابی ترانے کا مفہوم ایسے لوگوں سے ملنے کے بعد ہی سمجھ میں آیا تو یقیناً یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اَسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دُشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے!

سید علی شاہ گیلانی صاحب، ڈاکٹر رفعت صاحب، مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب، مولانا اشفاق رحمانی صاحب وغیرہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مختصر ہی سہی، وقتاً فوقتاً ہی سہی مگر ان لوگوں سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ ان کی صحبت عنایت فرمائی۔ ان ہی لوگوں سے ملنے کے بعد امام، رہبر، قائد اور لیڈر کیسے ہوتے ہیں سمجھ میں آیا۔

ان حالات میں جب کہ یہ چیزیں میں تحریر کر رہا ہوں، ڈر بھی لگ رہا ہے کہ ایک کے بعد ایک بڑے بڑے عالم دین کا صرف ایک سے ڈیڑھ سال کے عرصے میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملنا اور ان میں یہ مذکورہ نام بھی شامل ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق آخری دور میں علم اٹھا لیا جائے گا۔ ان کا اس دنیا سے چلے جانا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں جاہلوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ ان حضرات پر بڑی بڑی تحریریں لکھی جا سکتی ہیں اور لوگ ان کی زندگی پر تحریر لکھ بھی رہے ہیں۔ جو رہنمائی کرتی ہے ہم جیسے لوگوں کی جو اپنی کم علمی کی بنا پر بھٹک رہے ہیں۔

برادر اعجاز مولانا سے اپنی ملاقات اور صحبت کے بارے میں کہتے ہیں:

''مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے تعارف تو تھا مگر بنفس نفیس ملاقات کا، سننے کا، دیکھنے کا اور صحبت اختیار کرنے کا پہلا موقع سن 2000ء میں ناگپور کے ایک اجتماع میں ملا۔ آپ کو جو عنوان دیا گیا تھا اسے سننے کے بعد امامت کی حقیقت مجھ پر واضح ہوئی۔ پھر آپ کا ساتھیوں سے گھلنا ملنا، ساتھیوں کے بیچ رہ کر ساتھ میں کھانا وغیرہ کھانا، اس سے ایک انسیت سی پیدا ہوئی کہ اس پایہ کا عالم اور اتنا سادہ۔ سادگی جتنی آپ کے اخلاق میں تھی آپ اتنے ہی کٹھور باطل کے لیے نظر آتے تھے۔ مولانا امت کے حالات کو لے کر کافی پریشان رہا کرتے تھے۔ اور میں نے مولانا کو امت کی حالت پر آنسو بہاتے دیکھا۔ ایک درد تھا مولانا کو اور وہ آخری وقت تک رہا چنانچہ وہ ہر نوجوان کو جس کا تعارف تحریک سے ہوتا تھا اسے ایک امید کے ساتھ دیکھتے۔ مولانا اکثر تحریکی نوجوانوں سے یہ کہتے کہ امت کی آخری امید تم ہو۔ تم ہی پر سب دارو مدار ہے۔ مولانا بڑی بڑی جماعتوں، جو بھارت میں دین کا کام کر رہی ہیں، ان سے بارہا

بے زاری کا اظہار کرتے۔ یہاں تک کہ اس جماعت سے بھی جس سے ان کا تعلق رہا ہے، وہ پوری طرح بے زار ہو چکے تھے۔''

برادر اعجاز ایک سفر کی روداد یوں بیان کرتے ہیں:

''ایک بار جب ہم کچھ ساتھیوں کے ساتھ مولانا سے ملنے حیدرآباد گئے تھے ہم نے مولانا کا غصہ دیکھا۔ امت کے حالات کو لے کر جماعتوں اور تنظیموں کو لے کر مولانا سے بات ہوئی۔ مولانا شدید غصے کا اظہار کرنے لگے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ان کی تنقید کا نشانہ بنا۔ جماعت اسلامی ہند پر انہوں نے شدید غصے کا اظہار کیا اور ان کے یہ الفاظ ابھی تک کانوں میں گونجتے رہتے ہیں کہ ''یہ مردہ لاشیں ہیں، انہیں کب تک ڈھوتے رہو گے؟ ان کا بائیکاٹ کرو۔ جب ان کا کوئی بڑا پروگرام چل رہا ہو تو جاؤ جا کر احتجاج کرو۔ ان کے ختم ہونے کے بعد ہی کوئی نئی امنگ اور نئی لہر پیدا ہوگی، کوئی نیا کام ہو سکے گا۔''

اسی موقع سے مولانا نے یہ بھی کہا تھا کہ

''مجھے تیس پینتیس ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو سب کچھ اس راستے میں اسلام کے لئے، دین کے لئے، اللہ کے لئے لگانے کو تیار ہوں...... بھارت کا نقشہ ابھی بدل سکتا ہے۔ کیا آپ ایسے نوجوان ہیں؟ یا آپ ایسے نوجوان دے سکتے ہیں؟''

اس سوال پر ہم خاموش رہے۔ مولانا بھی پھر خاموش ہو گئے اور جتنی دیر تک ہم مولانا کے ساتھ بیٹھے رہے ہم نے مسلسل مولانا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

صحبت صالحین کے ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے برادر اعجاز کہتے ہیں:

''مولانا سے استفادہ کا ایک موقع، فلاح کے گولڈن جوبلی پروگرام میں جو غالباً 2012 میں ہوا تھا، ملا۔ ہم مولانا کی صحبت میں تھے مولانا کا وہی انداز ''حق بات بغیر کسی لچک کے''۔

تقریر کے دوران مولانا نے امت کا حال اور ہماری بے بسی اور تنظیموں و جماعتوں کے حال پر گفتگو فرمائی۔ جماعت اسلامی ہند کو لے کر مولانا بہت برہم ہوئے کہ جماعت جب چلی تھی تو حکومتِ الٰہیہ کا تصور تھا، دینِ مصطفیٰ کا قیام اس کا نعرہ تھا مگر جماعت آج جمہوریت کی بات کرتی ہے۔ مولانا نے کہا کہ ہمارا آج کا اول کام جماعت کی مخالفت ہونی چاہیے۔ جماعت نے جو رویہ اختیار کیا ہوا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم ہر سطح پر جماعت کی مخالفت کریں۔ اس موقع سے مولانا نے اس بات پر بھی اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کیا کہ وہ اب جس جماعت کے ممبر ہیں وہ کچھ الگ کرنے کے لئے بنی تھی کہ ہم جماعت اسلامی ہند سے الگ ہیں مگر دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ

وہ بھی وہی کچھ کررہی ہے جو جماعت کررہی ہے۔ مولانا نے یہ سوال کیا کہ اگر وہی کچھ کرنا تھا تو اسے بنایا ہی کیوں گیا؟ کچھ ساتھیوں نے اس پر ناراضگی جتائی تو کچھ سینئر ساتھیوں نے، یہ کہہ کر کہ مولانا جو کچھ کہہ رہے ہیں تجربے کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں، ساتھیوں کی شکایت دور کی۔

دین کے لیے ہم لوگوں نے مولانا کو ہمیشہ متحرک پایا۔ دہلی میں اسلامک یوتھ فیڈریشن (IYF) کے ایک پروگرام میں راقم السطور، برادر اعجاز اور برادر جمیل شامل تھے۔ اس پروگرام میں دہلی آنے کی دعوت مولانا کو بھی دی گئی تھی۔ پیرانہ سالی و بیماری کے باوجود آپ نے بلا تردد حامی بھر دی، ساتھیوں کی اور IYF کی محبت میں ایک لمبا سفر طے کر کے دہلی پہنچے اور ساتھیوں کے ساتھ ایک لمبا وقت بتایا، چنانچہ ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ نے تحریک کے نوجوانوں کے خون کو گرمایا اور ایک نیا حوصلہ وامنگ پیدا کی۔ بہت سارے سوالات کے تشفی بخش جوابات ساتھیوں کو اس پروگرام کے توسط سے ملے۔ ضعیف العمری، کمزوری اور طبیعت خراب ہونے کے باوجود مولانا کا وہی انداز اور وہی درد، شدید سردی کے موسم میں دیکھنے کو ملا کہ امت کے لئے کچھ ہونا چاہئے امت کے لیے کچھ کرنا چاہئے۔ اس موقع سے مولانا نے وہاں پر موجود کچھ ساتھیوں پر مشتمل ایک Delegation ترتیب دیا، جس میں ہم تینوں بھی شامل تھے اور کچھ لوگوں سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ اسی ارادہ کے ساتھ ہم مجلس مشاورت کی اوکھلا والی آفس، واقع ڈی بلاک، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر پہنچے۔ وہاں ملاقات اس وقت کے مشاورت کے صدر جناب نوید حامد صاحب سے ہوئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک ان سے گفتگو ہوئی۔ مولانا نے بابری مسجد کے ایشو پر، طلاق کے مسئلہ پر اور تحریکوں، تنظیموں اور مشاورت کی ان سنجیدہ مسائل پر بے حسی کے سلسلے میں بات کی اور صدر مشاورت کو بار بار امت کی خاطر کچھ کرنے کے لئے کہتے رہے۔ اس ملاقات سے مولانا بعد میں بہت ناراض دکھائی دیئے۔ ان کی سمجھ میں آرہا تھا کہ یہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔''

برادر جمیل مولانا سے وقتاً فوقتاً ہونے والی ملاقاتوں کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں:

> ''مولانا محترم سے تنظیمی کام کے سلسلے میں کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مولانا کو میں نے انتہائی کم سخن وسنجیدہ پایا۔ جب بھی بات کرتے تو بامقصد و معنی خیز کرتے۔ جب کبھی مولانا سے ملاقات ہوئی انہیں امت کے بارے میں فکر مند پایا۔ کوئی نہ کوئی موضوع زیر بحث ہوتا...... کبھی عوامی حالات تو کبھی ملت کی اور بڑی جماعتوں کی پست ہمتی تو کبھی عزیمت کے راہیوں کی کمی اور یہ سب مولانا کو تکلیف میں مبتلا کر دیتی...... جب کبھی کوئی ملی مسئلہ یا اہل ایمان سے منسلک معاملہ عروج پر ہوتا تو مولانا کا دوٹوک اور پرعزیمت موقف ہمارے سامنے آجاتا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی کارکردگی سے آپ بہت نالاں تھے کہ حالات اس قدر خراب ہوتے جارہے ہیں اور بورڈ صرف بیان بازی سے کام لے رہا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا نے ہم سے کہا کہ ''سودوسونو جوانوں کو لے کر جاؤ اور جہاں اجلاس چل رہا ہے
سامنے احتجاج کرو اور اسے تحلیل کردینے کی کوشش کرو۔'' ہم نے اختلاف کیا کہ بھارت میں
اس کسمپرسی کے حالات میں ایک ہی تو ایسا ادارہ باقی ہے جہاں تمام جماعتوں کا اتفاق ہے تب
آپ نے کہا تھا کہ ''کب تک یہ'لاشہ' ڈھوتے رہوگے؟ جب یہ تحلیل ہوجائے گا تو خود کوئی ایک
نیا ملّی پلیٹ فارم تیار ہوجائے گا۔''

مدرسۃ البنات الاصلاحیۃ کی فکر بھی دامن گیر ہوتی۔کبھی طالبات سے متعلق تو کبھی اس کے انتظامات سے متعلق اور اس کا اظہار ہر ملاقات میں ہوتا رہتا۔مولانا کی مہمان نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ اپنی علالت و کمزوری کے باوجود وہ خود جاکر گھر میں سے ہمارے لیے خورد ونوش کا انتظام کرتے۔''

برادر اعجاز مولانا سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے رہا ہوں جن سے مولانا کے آخری زمانہ میں ملاقات رہی
ہے۔مولانا کی وفات سے آٹھ دن پہلے ہم لوگ حضرت مولانا کی عیادت کے لئے حیدرآباد
گئے تھے۔مولانا سے ہماری ملاقات ہوئی مولانا نے دعاؤں سے نوازا۔ایک ساتھی، جو
حیدرآباد ہی کے ہیں، کہنے لگے کہ مولانا پچھلے دو مہینے سے اس طرح بستر پر ہیں، بیمار چل رہے
ہیں، کئی لوگ عیادت کے لئے آئے، مولانا نے ان سے بات نہیں کی اور اٹھ کر بیٹھے بھی نہیں
لیکن آپ لوگوں سے مولانا نے بیٹھ کر بات چیت کی۔مولانا کو نوجوانوں سے جو محبت اور امید
تھی گویا مولانا اپنے بستر مرگ پر بھی اس کے اظہار سے اپنے آپ کو نہ روک سکے۔''

بہت سارے پیچیدہ مسائل کا حل جن سے آج کے علماء یا قائدین کتراتے ہیں یا بتانے سے باز رہتے ہیں یا اس کو Bypass کر جاتے ہیں یا Compromise کر لیتے ہیں لیکن ان مسائل میں مولانا کا انداز ہمیشہ بالکل واضح رہا۔ ایک دم Clear رہا کوئی Confusion نہیں رہا۔ہمیشہ قرآن وسنت کی روشنی میں دوٹوک انداز میں بیان کیا۔

موجودہ حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کی تحریر وتقریر سے وہ تمام لوگ ضرور استفادہ کریں جو اس ملک میں صالح انقلاب لانا چاہتے ہیں اور خالص اسلام کی تصویر دوٹوک انداز میں تمام لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں خواہ وہ حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حزب الشیطان سے۔

مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کا بھارت میں اس وقت جانا تحریک کے لئے بلکہ امت کے لئے بڑا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تادمِ زیست حق پرست اماموں کے سایہ میں رکھے۔آمین!

اک ستارہ اور ٹوٹا آسمانِ فکر کا

ابوالفیض اعظمی، سرائے میر

27/ستمبر کی دوپہر کا ڈھلتا سورج اپنے غروب ہونے کی علامت ظاہر کر چکا تھا اسی وقت ایک جانکاہ خبر سوشل میڈیا کے ذریعہ بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی اس دارِفانی سے دارالبقاء کی طرف کوچ کر گئے ہیں۔ یہ خبر ہر خاص و عام لیے کسی بڑے حادثے سے کم نہ تھی کہ فکر آسماں کا ایک تابناک ستارہ ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں میں اکیلا ٹمٹماتا ہوا ماند پڑ گیا تھا۔ مولانا سے میری پہلی ملاقات 2011 میں مدرسۃ الاصلاح پر فجر کی نماز میں ہوئی تھی، جب میں عربی سوم کا طالب علم تھا۔ تحریری طور پر میری واقفیت 2006ء میں ہو چکی تھی۔ یہ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا اور آپ کی پر مغز گفتگو سے بھی مستفید ہوا۔ سلجھا ہوا انداز، بغیر لاگ لپیٹ کے بات کرنا اور دوسروں کے سوالات کا مدلل انداز میں جواب دینا آپ کا خاصہ تھا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ کا شمار ہندوستان کے قابل ذکر علماء میں ہوتا ہے۔ آپ بیک وقت مقرر، مصنف، فقیہ اور فکر اسلامی کے سچے نقیب تھے۔ آپ کی مقبولیت صرف تحریکی حلقوں تک محدود نہ تھی بلکہ ہر وہ شخص جس کے دل میں اسلام کی سچی تڑپ تھی اور جو ملک وملت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا ہے سب کے لیے آپ ہر دل عزیز تھے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ امتِ مسلمہ کو فکری گمراہی سے نکال کر اسلام کی حقیقی تعلیمات سے واقف کرانا ہے۔ اس کی زندہ و جاوید مثال آپ کے درجنوں مضامین، کتابیں اور ملک و بیرون ملک میں پھیلے آپ کے شاگرد ہیں۔ فکر تو فکر ہے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ اس پر باقی رہنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا پوری زندگی نہ صرف صحیح اسلامی فکر پر باقی رہے بلکہ اسے عام کرنے کے لیے تن من دھن سب کی بازی لگا دی اور

آخری وقت تک قال اللہ قال الرسول کا عملی نمونہ بن کر دکھایا۔ اپنوں کی سازشیں، غیروں کی بے اعتنائیاں، نوجوان بیٹے کا غم اور اوپر سے حکومتی جبر، حالات نے بہت سے تھپیڑے کھلائے لیکن آپ ہمیشہ صبر وشکر کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ کا قائم کردہ بچیوں کا مدرسہ جسے کئی مرتبہ بند کرنے کی بھی کوشش کی گئی، مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اس مردمجاہد کے عزم محکم میں ذرا برابر کمی نہیں آئی۔ آپ تمام طرح کی پریشانیوں کا دیوانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ زندگی کچھ اس طرح ہوگئی تھی کہ ......

ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اس وقت امتِ مسلمہ چہار جانب سے باطل کے نرغے میں ہے اور سام دام ڈنڈ بھید کا حربہ پوری طرح سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ساری دنیا میں کچھ ایسے مفکر اور دانشور پیدا ہو رہے ہیں جو نہ صرف اسلام کو بدنام کرنے پر تلے ہیں بلکہ اپنی فکری اپج سے امتِ مسلمہ کو احساسِ کمتری اور بزدلی کی طرف تیزی سے دھکیل رہے ہیں۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں میں بھی کچھ علماء و دانشور ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی شریعت میں نئی تعبیرات پیش کرنے کی کوششیں کیں اور اسلام پر اپنی سہولت کے اعتبار سے عمل کرنے پر زور دیا۔

مولانا نے نہ صرف ان کی نئی تعبیرات کو قرآن وحدیث سے دلائل دے کر رد کیا بلکہ اسلامی شریعت کے حقیقی ثمرات سے بھی امت مسلمہ کو واقف کرایا۔ آپ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور قرونِ اولیٰ کے علماء کی یاد تازہ کردی آپ کی رحلت امتِ مسلمہ کے لیے بڑا خسارہ ہے جس کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عالم کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے جسے بند نہیں کیا جا سکتا، جب تک رات ودن آتے جاتے رہتے ہیں۔

آج کے اس پرفتن دور میں جب کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا اور اس کی تعلیمات کو عام کرنا ہاتھوں میں انگارے لینے کے مترادف ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں مولانا ہمارے لیے سرپرست تھے۔

وما کان قیس هلکه هلک واحد

و لکنه بنیان قوم تهدما

"قیس اس کی ہلاکت ایک فرد کی ہلاکت نہیں ہے، بلکہ وہ قوم کی ایک بنیاد تھا جو ڈھ گئی۔"

مولانا نے اسلامی تعلیمات میں درآنے والی اکثر نئی تعبیرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ جہاد جیسی عظیم عبادت پر مدلل انداز میں گفتگو کی اور اسلام میں جہاد کی اصل حقیقت واہمیت کو واضح کیا۔ دو تین مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا ''تصورِ جہاد'' کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے جب کوئی ملک دار الحرب نہیں ہے تو جہاد کا بھی سوال ختم ہے اور جہاد و قتال سے متعلق قرآنی آیات و احادیث بے محل ہو کر رہ جائیں گی۔''

آگے مولانا لکھتے ہیں:

''ایک تو یہ ہے کہ ہمارے علماء اس دور میں زیرِ کفر و شرک رہنے کے لیے وجہِ جواز کے دلائل کتاب و سنت سے ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بڑا عالم وہ مانا جاتا ہے جو کتاب و سنت سے بھی ایسے مسائل ڈھونڈ نکالے جن سے کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرزم کے زیرِ اقتدار سکون سے رہنے کے لیے جواز نکل سکے۔'' (عصرِ حاضر اور نظریۂ جہاد، ص: ۷۹، ۸۰)

''مولانا عنایت اللہ سبحانی کے نظریۂ جہاد'' کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس لحاظ سے سوچا جائے تو سبحانی صاحب کی بات نہایت ہی سنگین بات بن جاتی ہے اس لیے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے کفر اور شرک کو قابلِ نفرت چیز قرار دیا ہے اور کفر و شرک سے بغض و عداوت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے اور قرآن نے کفر کے بطن سے نکلی ہوئی چیزوں کو گندگی اور اہلِ کفر کو ایسا نجس کہا کہ مسجدِ حرام کے قریب بھی انھیں آنے کی اجازت نہیں دی۔''

(عصرِ حاضر اور نظریۂ جہاد، ص ۱۱۲، ۱۱۳)

مولانا کی ایک اہم کتاب ''اسلامی فکر کیا ہے؟ ایک تنقیدی جائزہ'' کے نام سے ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں وحید الدین خان کے اسلامی فکر کے تعلق سے پھیلائے گئے پروپگنڈوں میں سے کچھ کا جو اُن کی کتاب ''فکرِ اسلامی'' میں درج ہیں تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور صحیح اسلامی فکر کی طرف امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔ مولانا محترم نے خان صاحب کے نظریات کا بہت ہی سلجھے ہوئے اور مدلل انداز میں جواب دیا ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ مولانا کی کتابوں کا ضرور مطالعہ کرے تاکہ وہ خود اسلام مخالف پروپگنڈوں کا شکار نہ ہو اور کبھی موقع آئے تو اسلام کی حقانیت بھی ثابت کر سکے۔ دو تین مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مسلمان کا مقام روزِ اول سے قائدانہ ہے وہ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے حکموں کو نافذ کرنے آیا ہے اور امامت و قیادت کی ذمہ داری اس کے سر ہے اور یہ منصب مسلمانوں کو خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ وحید الدین خاں کے مطابق یہ جو امامت و قیادت کا انقلابی نظریہ ہے اس کی کوئی دلیل قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ صرف ایک واقعہ خلیفہ دوم عمر فاروقؓ کے عہد کا ملتا ہے۔ جس وقت مسلمانوں کا ٹکراؤ ایرانی حکومت سے ہوا تھا۔

جب ربعی بن عامرؓ نے ایرانی حکومت کے سپہ سالار رستم سے پوچھا کہ

''تم کس لیے ہمارے ملک میں آئے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے اور ہم کو اللہ لے آیا ہے تا کہ وہ جسے چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔ صحابی کی اس تقریر سے مذکورہ سیاسی نظریہ نکالنا بلا شبہ ایک نامحمود جسارت ہے حتیٰ کہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے کے ہم معنی ہے''......

''......یہ صحیح ہے کہ اس وقت ایرانی حاکموں اور اہلِ اسلام کے درمیان جنگ پیش آئی، لیکن اس جنگ کی حیثیت پورے معاملے میں محض اضافی یا اتفاقی تھی وہ اس کا اصل مطلوب نہ تھی''۔

ان کے جواب میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''اوپر نقل کردہ اقتباس میں جو بات بڑے اونچے مقام سے برادر محترم نے فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا غلط، یہ جاننے کے لیے دو سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے:

① یہ نظریہ کہ مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں کیا دینی اعتبار سے صحیح ہے؟

② کیا اس نظریہ کا ماخذ عہد صحابہ کا محض ایک واقعہ ہے؟

اس موقع پر قرآن وسنت اور دینی دلائل سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر کے سوچئے، دنیا کی ہر قوم اور ہر گروہ کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات جان تک کی بازی لگا دیتا ہے یا کم از کم آرزو اور تمنا رکھتا ہے کہ وہ اقوامِ عالم کا قائد اور حاکم بنے اس کے لیے اپنی نئی نسل کے اندر ذہنی بیداری، ہمت اور حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی کمیونٹی ایسی نہیں ہے جس کے اندر اس طرح کی کوشش نہ ہو رہی ہو۔ سکھ قوم کی کیفیات کا مطالعہ کیجئے، ہزاروں برس سے دبائے مظلوم طبقوں کو دیکھیے ان کے اندر کس قدر جذبہ موجزن ہے۔ علاوہ ازیں ہندو قوم کا مجموعہ قائد اور حاکم بننے کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے، اس تناظر میں اپنی بے ہمتی، مرعوبیت اور ذہنی وفکری زوال کو دیکھیے کہ غلبہ اور عزت حاصل کرنے اور دنیا کی قیادت ورہنمائی کرنے کی سوچ بھی ذہن ودماغ سے نکال دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ باور کرایا جارہا ہے کہ یہ سوچ نہ صرف دنیا میں تمھیں تباہ وبرباد کر دے گی بلکہ آخرت میں اس غیر مطلوب اور ناجائز تصور اور عمل کو لے کر جاؤ گے تو نجات وفلاح سے محروم ہو جاؤ گے۔'' (ص: ۳۰)

مولانا دوسرے سوال صحابی کے قول کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اب آیئے ایک صحابی رسولؐ کے قول پر ہم گفتگو کریں حضرت ربعی بن عامرؓ کی بات سے خود یہ ثابت ہورہا ہے کہ اس وقت ایران میں اللہ کی عبادت کے بجائے انسانوں کی عبادت ہورہی تھی۔ ایک تو انسانوں کی عبادت سے مراد بتوں کی پوجا ہے تو اس صورت میں عام انسانوں کی بت پرستی سے روکنے کے لیے حکمرانوں کو زیر کرنا ضروری ہو تو اس کے لیے جنگ کے سوا دوسرا راستہ کیا ہوسکتا ہے؟'' (صفحہ 36)

خان صاحب مسلمانوں کو اسلام کا اصل مقصد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا، اسلام کا اصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا مقصد اقتدار نہیں......اسلام کا منشاء نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ محض سیاسی غلبہ، اسلام کا اصل مقصد جنت ہے، اسلام کا اصل مقصد حکومت نہیں۔''

خان صاحب کے جواب میں مولانا عبدالعلیم صاحب لکھتے ہیں:

''یہاں کھلے طور پر برادر محترم کی ذہنی بیماری ظاہر ہورہی ہے۔ اسلام کا مقصد دل کا بدلنا بھی ہے اور ہاتھ، پیر اور پورے اعضاء و جوارح کو بدلنا بھی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اس کا مقصد مکمل تبدیلی ہے۔ وہ پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ انسانی زندگی کا نجی شعبہ ہو یا خاندانی، معاشرتی ہو کہ سیاسی سب پر اسلام، اللہ اور رسول کی حکمرانی چاہتا ہے۔''

(ص:46-45)

خان صاحب اسلامی مشن کے تعلق سے کہتے ہیں:

''اہلِ اسلام کی آزادی یا اسلامی مشن کا نشانہ لوگوں کے اوپر اسلامی سسٹم کا نفاذ نہیں ہے بلکہ پُرامن حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو اسلام سے باخبر کرنا ہے۔ داعی اسلام کی ذمہ داری صرف اسلام پہنچانا ہے۔ اس کے بعد اب مدعو کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو مانے یا انکار کردے۔''

مولانا محترم ان کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اس عبارت کی روشنی میں ہجرت و جہاد، ایثار و قربانی کے متعلق ساری تعلیمات بلاوجہ کتاب وسنت اور تاریخ اسلام میں نظر آتی ہیں، پھر حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کا کوئی محل نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا الہ الا اللّٰہ ''یعنی مجھے حکم

دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیں۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو لوگ بھی ایمان نہیں لائے انہیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا گیا یا انہیں قتل کر دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہوش و حواس رکھنے والا آدمی اس امر کا انکار نہیں کر سکتا۔ جزیرۃ العرب کے باہر دنیا کو اتنی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ اسلام کا کلمہ نہیں پڑھتے ہیں تو نہ پڑھیں لیکن انہیں اسلام کا تابع بن کر رہنا ہوگا۔ نہیں معلوم اتنی بڑی حقیقتوں کا انکار کرنے کی برادر محترم کو کیسے جرأت ہوتی ہے۔'' (صفحہ 75)

کسی مکتبۂ فکر، جماعت یا ادارے کے عالم کے انتقال سے اس مکتبۂ فکر، جماعت یا ادارے کا ہی نقصان ہوتا ہے، لیکن مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ خاص اسلامی فکر کے حامل تھے اس وجہ سے آپ کے انتقال سے پوری ملت اسلامیہ کو نقصان ہوا ہے، جن کا نعم البدل ملنا مشکل ہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ
بھارت میں فکر اسلامی کے نقیب تھے

پروفیسر محمد الیاس خان، برہان پور

آزاد بھارت کی تاریخ میں ملی وتحریکی مسائل کے لئے دینی حمیت سے بھرپور حل تجویز کرنے والے علمائے کرام ودانشوران کی مختصر فہرست میں ایک اہم نام مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا ہے جو اپنے رب کے ذریعہ عطا کردہ مہلت عمل مکمل کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ جہاں قرآن کے مفاہیم سے گہرا ربط رکھتے تھے وہیں دوسری جانب بھارت میں فکر اسلامی کی آبیاری وتحفظ کرنے والے اہم علمائے کرام میں سے ایک تھے نیز آپ کی غیرتِ ایمانی، اظہارِ حق کا وصف اور آپ کی اسلاف سے وابستگی درجۂ کمال کو پہنچا دیتی تھی جو آپ کو بلاشبہ نمونہ سلف صالحین میں شامل کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایک اور وصف جو مولانا مرحوم کو انتہائی ممتاز کرتا ہے وہ مولانا کی اصابت رائے اور تفقہ فی الدین ہے جو واقعی تحریک اسلامی ہند کے کچھ ہی علماء وزعماء کا نصیب رہا ہے۔ مولانا مرحوم ومغفور جذبات کے غلبے سے آزاد (غیرت ایمانی سے لبریز) ایسے مؤثر نثر نگار تھے جنہوں نے اپنے نتائج فکر سے بڑی جرأت اور مضبوط علمی استدلال کے ساتھ ملت اسلامیہ ہند کو عزت اور غیرت سے رہنے کے لیے رہنمایانہ اصول مرتب فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ان مساعی جمیلہ کو آپ کے لئے صدقہ جاریہ بنادے۔ (آمین)

مولانا مرحوم سے ہمارا تعارف طلبہ تحریک کے زمانے میں ہی ہوا تھا پہلی ملاقات کا مکمل نقشہ تو ذہن میں نہیں ہے لیکن ایک ملاقات جو خاصی دلچسپ رہی ہے وہ آج تک ذہن پر مرتسم ہے۔ حیدرآباد میں طلبہ تحریک کے ایک تربیتی اجتماع میں، جو نئے طلباء نوجوانوں کے لیے منعقد کیا گیا تھا اور یہ زمانہ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے کا تھا جس میں اکثر طلبہ اور نوجوانوں کے ذہن میں بھارت میں امت کے جان و مال کے دفاع کے متعلق بہت سارے سوالات تھے، بس کسی صاحب نے شرکاء اجتماع کی یہ رہنمائی فرمادی کہ ان لوگوں کے سوالات کے لئے انتہائی موزوں شخصیت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کی ہے، جنہوں نے اس موضوع پر ایک کتابچہ لکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا دورانِ اجتماع کسی بھی عنوان پر جب مولانا مرحوم گفتگو کرتے طلبہ اور نوجوان آپ کی تقریر کے بعد ملت کے دفاع کے متعلق سوالات کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ مولانا کبھی سوالات پر مسکرا دیتے اور کبھی انتہائی متانت کے ساتھ ان کا مدلل جواب دیتے۔ وہ سوالات و جوابات کی نشستیں بڑی یادگار رہیں جو آج بھی مولانا مرحوم کا تذکرہ آتے ہی ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد طلباء تحریک کی ذمہ داریوں کے دوران مولانا مرحوم و مغفور سے کئی ایک ملاقاتیں رہیں جس میں کبھی قرآنی نکات پر اور کبھی بھارت میں تحریک اسلامی کے تب تک کے سفر پر استفادہ ہوتا رہا۔ مرحوم و مغفور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شخصیت کا پرعزیمت پہلو آپ کے فرزند شہید مجاہد سلیم کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ شہر حیدرآباد میں بہت سے غیرت مند مسلم نوجوانوں کو ظالموں کے ذریعے پابند سلاسل کیا گیا اور کئی ایک ہراساں کیے جاتے رہے۔

شہید مجاہد سلیم کو کم سنی میں سنت یوسفی کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور یہ سنت کی ادائیگی صرف ایک بار نہیں دو تین بار ادا کرنے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ گرفتاری کے بعد کافی قانونی کاوشوں کے ذریعے شہید مجاہد سلیم کو رہائی نصیب ہوئی۔ ہم سب ساتھی شہید مجاہد سلیم کو لے کر مولانا مرحوم کے پاس پہنچے سب کا اندازہ تھا مولانا گرم جوشی سے اٹھ کر اپنے فرزند کو گلے لگائیں گے، لیکن مولانا نے شہید مجاہد سلیم کو دیکھتے ہوئے پرسکون انداز میں فرمایا:

''مجاہد کیا جلدی تھی باہر آنے کی؟ پہلے ہی باہر کافی مہنگائی ہے۔''

تبصرے نے ماحول کو جذباتی ہونے کے بجائے خوشگوار بنادیا۔

مولانا مرحوم کے ذریعے حوصلہ، ہمت اور استقامت کا سبق سیکھنے والے کئی سارے واقعات ہیں جن کو ایک تحریر میں یکجا کرنا مشکل ہے بس مزید ایک اور واقعہ تحریر کر کے اپنی بات مکمل کریں گے۔

بابری مسجد کے حوالے سے ایک ملی خطاب عام کے بعد مقامی اور مرکزی سطح کے ذمہ داران کی گرفتاری عمل میں آئی جس میں راقم کو بھی سعادت حاصل ہوئی۔ دس دنوں کی حراست کے بعد ہم سب کو ضمانت مل گئی بعد ازاں سب ہی افراد اس کیس سے بری ہو گئے۔

اس وقت دس دنوں کی گرفتاری بہت بڑی نظر آتی تھی لیکن آج اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک معمولی سی خراش کے ذریعے بڑی سعادت عطا فرمائی تھی، رہائی کے بعد تمام ساتھیوں کو مولانا مرحوم نے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی تھی۔ گھر پہنچنے پر مولانا مرحوم نے کچھ سادہ سے جملوں میں ایسی حوصلے اور استقامت کی تذکیر فرمائی جس میں الفاظ تو بہت سادہ تھے لیکن اتنے مؤثر تھے کہ گزشتہ دس دنوں کی تکان یک لخت ختم کر گئے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ مرحوم مولانا عبدالعلیم اصلاحی کو اپنے جوارِ رحمت میں رکھے اور شہید مجاہد سلیم کو آپ کے لیے ذخیرہ آخرت بنادے۔ (آمین یارب العالمین)

مُرشدِ تحریک مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

ابوعوف، ممبئی
تحریک کا ایک ادنیٰ خادم

عالمی سطح پر علامہ یوسف القرضاوی رحمہ اللہ اور ہمارے محسن مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے مالکِ حقیقی کی طرف کوچ کرنے پر بروقت میں نے تعزیتی پیغام ارسال کیا تھا۔ مگر مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کی جانب سے یادداشت نامہ شائع کرنے کا فیصلہ ہوا اور اِذن عام ہوا تو یہ تعزیتی پیغام ارسال کرر ہا ہوں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

آہ مرشدِ تحریک......!! ایک اور علم وعمل کا داعی، شبِ دیجور میں قندیل رہبانی اور ہمارے سروں پر دست شفقت دراز کرنے والا، ہم کو چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ تحریکی سفر میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے خال خال ہی سہی مگر استفادہ کا موقع ملا ہے۔ الحمد للہ!

وہ پیکرِ اِلفت و ملنسار مسیحا
تھا اس کے تکلم میں بڑے پیار کا جذبہ
تھی اس کی طبیعت میں مروت کی حلاوت
اس سے کسی ساتھی کو نہ تھی کوئی شکایت
کرتا نہ تھا اسلام کے دشمن سے رعایت

محترم قارئین! طلبہ تنظیم کا وہ نازک دور جب جماعت اسلامی ہند نے تنظیم پر پابندی لگادی حتیٰ کہ تربیتی

اجتماعات تک کی شرکت پر قدغن لگادی گئی اور یہ تاثر دیا جانے لگا کہ درخت سے جو شاخ الگ کردی جاتی ہے، سوکھ کر قصۂ پارینہ ہوجاتی ہے۔ ایسے نازک دور میں جن اہلِ علم وکمال ہستیوں نے گلشنِ مودودیؒ کی اس انقلابی تحریک کی فکری ونظری رہنمائی فرمائی، ان میں حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سرفہرست تھے۔ مولانا عبداللطیف آئمی مالیگاؤں، مولانا اشفاق رحمانی اندور، مولانا عطاء الرحمن وجدی سہارنپور، مولانا غفران صدیقی جالنہ ودیگر بزرگوں نے اس موقع پر جس اہم ضرورت کو پورا کیا اسے وابستگان تحریک کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ آج ہند میں وحدتِ اسلامی کی شکل میں جو تحریکی سرمایہ موجود ہے اس میں ان جرأت مند علماء کا بڑا تعاون شامل ہے۔ اللہ تمام بزرگوں کو اپنی رحمت خاص سے نوازے۔ اکثر تحریکی تربیتی اجتماعات میں مجھے خود مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ سے استفادہ کا موقع ملا۔

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ ان کا سایہ بہت سے فتنوں کے لیے سدباب رہا۔ ان کا تبحر علمی بے مثال تھا۔ وہ تحریک اسلامی میں علم وعمل کے وارث تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے جو کام بھی شروع کیا، مستقل مزاجی کے ساتھ کیا اور ہمیشہ عزیمت پر عمل کیا۔ اپنی پوری زندگی دین حق کی حفاظت میں صرف کی اور جب بھی کسی اہلِ باطل نے اسلام کے مسلمہ اصولوں میں سے کسی ایک اصول کے خلاف قلم اٹھایا تو حضرت مولانا نے بطریقِ احسن اس کا تعاقب کیا۔ ''وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ'' کا عملی نمونہ پیش کیا اور دلائل کے میدان میں ہمیشہ سرفراز ہی رہے، نیز آپ نے اپنے قلم کے ذریعے اسلام کی نظریاتی سرحدوں کا پہرہ دیا، دارالحرب اور دارالاسلام، ملت کے دفاع کا مسئلہ اور دیگر تصنیفات آپ کی جرأت رندانہ کا عملی ثبوت ہیں۔

اسی طرح عملی تحریکات میں بھی شریک رہے۔ بالخصوص مولانا مودودیؒ کی تحریک پر لبیک کہا اور آپ نے جماعت اسلامی میں شامل ہوکر اسلامی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا اور جب تحریک اسلامی کو اپنی بنیادوں سے فکری انحراف کرتے دیکھا تو اپنی سکت بھر روکنے کی کوششیں کرتے رہے۔ اپنی محبوب جماعت کے فکری انحراف سے بے حد دل برداشتہ رہے، اور ہمیشہ نوجوانوں کی انقلابی طلبہ تنظیم کی فکری واخلاقی سرپرستی کرتے رہے۔ مولانا عبداللطیف آئمی، مولانا اشفاق رحمانی، مولانا عطاالرحمن وجدی ودیگر تحریکی بزرگوں کے ہمراہ ہمیشہ نوجوانانِ تحریک پر دست شفقت رکھا۔ اور اس سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی۔

وحدتِ اسلامی کے قیام کے بعد مولانا عطاء الرحمن وجدی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرکے اپنے تحریکی سفر کو تادم آخر جاری رکھا۔ آپ نے اپنے گھر کو بھی صبغۃ اللہ میں ڈھال دیا تھا۔ اولاد کی تربیت بھی اسی الٰہی نہج پر

کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے ایک فرزند کا نام مجاہد رکھا اور اس انداز میں تربیت فرمائی کہ بیٹا والدِ محترم کی فکر کا عملی ترجمان بن گیا۔

مجاہد مختصر سی زندگی میں کس قدر مصروف تھا
شہادت کی آرزو میں ہر گھڑی بے چین تھا

مجاہد اسم با مسمّٰی تھا۔ ظالم اقتدار کو مطلوب تھا، انھیں بہانے کی تلاش تھی۔ گجرات پولیس نے اسے اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیا۔ گولی چلی، مجاہد نے شہادت کے جام کو نوش کیا۔ آہ! باعزیمت باپ کا بہادر بیٹا...... اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا۔ اللہ شہادت کو قبول فرمائے، فردوس مکانی بنائے آمین!

آزمائش کی اس مشکل گھڑی میں مولانا صبر وعزیمت کا ہمالہ بن کر رب کے فیصلے پر راضی رہے۔ اہل حیدرآباد وہ منظر بھلا نہیں سکتے کہ کس شان سے شہید مجاہد کا جنازہ لے کر سوگوار باپ نکلا اور اپنے لختِ جگر کو ربِ کائنات کے حوالے کیا۔

وقت رخصت تیرے معصوم سے چہرے کی قسم
دل تو روتا رہا پر آنکھ کو رونے نہ دیا

یقیناً مولانا ایک عظیم کردار کے حامل تھے اور ان کے قول وعمل میں یکسانیت تھی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ وہ دین کا روشن چراغ تھے جن سے بے شمار دینی مشعلیں روشن ہوئیں۔ ان کو ایک عالم حق اور باعمل، بااخلاص ہونے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ ان کے اہلِ خانہ اور ہم سوگوارانِ تحریک کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اے اللہ! مولانا کی مغفرت فرما، جنت فردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما۔ ہند میں فکری ونظری رہنمائی کے خلا کو پُر فرما۔ آمین

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
تحریکِ اسلامی کا نظریہ ساز مینارۂ نور

مسعود محبوب خان، اورنگ آباد
رکن شوریٰ وحدتِ اسلامی ہند، مشرقی مہاراشٹر ا ریجن

عالم اسلام ہند کے معتبر و معتمد محقق، معروف و مقبول عالمِ دین، علمی و تحقیقی دنیا میں مرجع کی حیثیت رکھنے والے قدآور مذہبی رہنما اور علمی و فکری نظریہ ساز جناب مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کا علالت کے ساتھ اپنی عمر طبعی گزار کر اپنے ربّ حقیقی سے ملاقات کا رخت سفر باندھنا تحریکی، علمی و تحقیقی دنیا میں ایک عظیم خلاء پیدا کر گیا ہے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

حقیقت یہ ہے کہ مولانا محترم کا ۲۷ رستمبر ۲۰۲۲ء کو داغِ مفارقت دے جانا اُمتِ مسلمہ ہند کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور دوبارہ یہی بات دوہرار ہا ہوں کہ قلیل عرصے میں کثیر تعداد میں علماءِ حق کا ہم سے رخصت ہونا انتہائی سنگین حالات کا عندیہ دے رہا ہے۔

مولانا مرحوم خلوص وللّٰہیت، روحانیت وعزیمت اور حق وصداقت کا پیکر جمیل تھے۔ وہ خاموش مزاج، متواضع اور صاحبِ بصیرت شخص تھے۔ صبر و استقامت ان کی کتاب زندگی کے نمایاں ابواب رہے ہیں۔ مولانا محترم ابتداء سے ہی تحریکِ اسلامی ہند کا روشن مینارۂ نور رہے ہیں۔ مولانا سے مراسم و استفادہ کا سلسلہ طلبہ تنظیم کے زمانے ہی سے رہا ہے، طلبہ تنظیم سے انہیں بے انتہاء محبت رہی ہے۔ حضرت مولانا ایک عرصے تک جماعت اسلامی ہند سے وابستہ رہے، بعد میں فکری نظریہ کی بنیاد و اختلافات پر جماعت اسلامی سے اخراج عمل میں آیا۔ آپؒ نے مولانا عطاء الرحمن وجدی صاحب (امیر وحدتِ اسلامی ہند) کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ دار بقاء کی

طرف رحلت فرمانے تک وہ وحدتِ اسلامی ہند کے رفقاء کی تربیت وتزکیہ میں ایک اہم رول ادا کرتے رہے۔ آپؒ وحدتِ اسلامی کی سرگرمیوں میں فعال ہیئتی کی حیثیت سے شامل رہے۔

آپؒ نے کئی فکر ساز کتابیں اور کتابچے تحریر کئے ہیں۔آپ کی تحریروں نے تحریکِ اسلامی کے ایک وسیع حصہ پر اپنے دوررس اثرات مرتب کئے ہیں۔

حیدرآباد کے وہ یقینا بااثر مذہبی وفکری مسلم رہنما بھی تھے۔ان کی ہمہ جہتی تحریری و تصنیفی قیادت سے ملت اسلامیہ ہند مستفید ہوتی رہی۔امت کے مذہبی،فکری وعلمی مسائل ہوں یا تعلیمی،ہر شعبے میں وہ ایک دیدہ ور اور دوراندیش رہنما کا کردار ادا کرتے رہے اور اپنی پرُعزیمت اور مخلصانہ جدوجہد سے معاملات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سعی وجہد کرتے رہے۔ربّ کریم ان کی علمی وتحقیقی،دعوتی واصلاحی،زبانی وقلمی خدمات اور جملہ نیک اعمال کو قبول فرمائے۔

مولانا محترم کا تعلق گرچہ یوپی کے علمی ودینی شہر اعظم گڑھ سے رہا ہے،لیکن طالبات کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ حیدرآباد دکن میں گذارا۔جہاں انہوں نے طالبات کے معیاری دینی وعلمی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔جہاں طالبات کو عصری علوم سے بھی آراستہ کیا جاتا رہا ہے۔ان کے زیرِ سایہ بڑے قیمتی طلباء وطالبات اور متحرک افراد تیار ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو''ابوشہید'' کے عظیم منصب پر بھی فائز کیا۔جی ہاں! مولانا مجاہد شہید کے والد ہیں۔یہ مولانا مرحوم کی تربیت وپرورش کے ہی اثرات تھے جنہوں نے اپنے لختِ جگر کو دین اسلام کے لئے شہادت جیسے اعلیٰ مقام کو حاصل کرنے کے فن سکھائے۔شہید بیٹے کی نعش پر مولانا نے تاریخی سنہرے حرفوں سے لکھے جانے والے الفاظ کہے،آپ نے فرمایا:

''اگر اللہ کی راہ میں مزید بیٹوں کو قربان کرنے کا موقع ملا تو اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

دومختلف مواقع سے رکھے گئے سہ روزہ اجتماعات میں مہمان خانہ کے طور پر ہماری قیام گاہ کا انتخاب کیا گیا، جس کی وجہ سے مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحیؒ،مولانا محترم ابوظفر حسان ندوی ازہری،مولانا محترم عطاء الرحمن وجدی ودیگر علماء ومشائخ کا قیام ہمارے مسکن پر رہا۔واقعی یہ ہمارے لئے بہت ہی عظیم شرف وسعادت کا مقام رہا ہے۔تاہم اس لذیذ حکایت کو دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔بہت کم وقت میں بہت کچھ سیکھنے اور فیض پانے کا زریں موقع میسّر ہوا۔

ذہن میں گردش کرنے والے کئی سوالات میں سے چند سوالات پوچھنے کا زریں موقع بھی مہیا ہوا۔مولانا

سے ایک سوال کیا کہ تحریکِ اسلامی کی علمی وفکری تنزلی کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس تنزلی کا تدارک کیسے ہو؟ الحمدللہ! آپؒ نے بہت ہی اطمینان بخش جواب سے نوازا۔

مولانا سے مزید سوال کیا گیا کہ، ایسا محسوس ہورہا ہے تحریکِ اسلامی کی انقلابی فکر کہیں نہ کہیں منحرف ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے؟ اصل مقصد ونصب العین کو چھوڑ کر کہیں ہم دوسری جانب تونہیں بڑھ رہے ہیں۔ مولانا کا جواب تو کافی طویل تھا، مگر کچھ خاص باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا، آپؒ نے کہا تھا کہ

''انقلاب کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ختم ہوگا، بلکہ ابھی تو تحریکِ اسلامی کے اصل کام کا آغاز ہورہا ہے، لہٰذا اپنے اس سفینے کی لازماً حفاظت کرنا یہ آپ لوگوں کی ذمّہ داری ہے۔ اس کو ان نااہل ومنافقانہ روش رکھنے والے ہاتھوں بربادنہ ہونے دینا، جنہوں نے اپنا مکروہ چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے ہی آیا ہے اور وہ تو غالب ہی ہوگا۔ مگر ہمیں بطورِ مومن یہ طے کرنا ہوگا کہ غلبۂ دین کی اس سعی وجہد میں ہمارا کردار کیا ہوگا۔''

بابری مسجد کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ہے، بابری مسجد اللہ کا گھر ہے، پوری اُمت مسلمہ کا مقدس مقام ہے اس کا دفاع اور حفاظت امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

مولانا مسئلہ بابری مسجد کے ضمن میں کہتے تھے:

''انسانی جسم میں دل کا جو مقام ومرتبہ ہے، دین اسلام میں مساجد کا وہی مقام ہے۔ مسجد اللہ کے شعائر میں سے ہے۔ مسئلہ بابری مسجد اُمت مسلمہ ہند کے لئے زندگی اور موت کے مترادف ہے۔ مسجد کا مقام اللہ ربّ العالمین کی ملکیت ہے، اس پر مسلم یا غیر مسلم کا کوئی تصرف واختیار نہیں۔''

مولانا وحیدالدین خان صاحب نے بابری مسجد کے متعلق سہ نکاتی فارمولہ پیش کیا تھا۔ اس پر جو موقف اُمت مسلمہ کا تھا وہی دوٹوک موقف مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کا تھا۔

ایک بار کسی موقع سے جناب ضیاء الدین صدیقی صاحب، موجودہ امیر محترم وحدتِ اسلامی ہند نے کہا کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحبان سے ملاقات کی غرض سے حیدرآباد روانہ ہونا ہے۔ ضیاء صاحب جیسے بےلوث قائد کے ہمراہ سفر!! اور اس پر سونے پہ سہاگہ امت کی قدآور علمی وملی شخصیات سے ملاقات سبحان اللہ! برسوں سے نہاں خانۂ دل میں پوشیدہ وخوابیدہ حسرت دفعتاً بیدار ہو اٹھی اور میں نے سفر کی طوالت، موسم کی خنکی، طبیعت کی تساہلی کے باوجود شرکت کے لئے آمادگی ظاہر کردی۔ یقیناً وہ میرے لئے ایک

دلنشیں و یادگار سفر تھا۔

بہرحال حیدرآباد پہنچنے کے بعد میز بانی تحریکی ساتھیوں کے علاوہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے حصے میں ہی آئی۔ مسلسل ڈرائیونگ کے نتیجے میں تھکان اپنا احساس دلا رہی تھی، لیکن مولانا محترم کی ملاقات نے سفر کی تھکان کو کوسوں دور کر دیا۔ اپنا قیمتی وقت ہمارے ساتھ گزارا۔ زادِراہ کے طور پر آپ نے حوصلوں، عزائم و علمی و فکری اور عملی مشوروں سے ہمیں نوازا۔ حقیقتاً مولانا بے مثال فہم و فراست اور قوتِ عمل کی حامل جامع کمالات شخصیت رہے ہیں۔

بلاشبہ مولانا کی وفات اُمت مسلمہ کے لئے عمومی طور پر اور ملت اسلامیہ ہند اور ان کے تلامذہ کے لئے خصوصی طور پر ایک بہت بڑا خسارہ ہے۔ وفات سے جو زبردست خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا بیحد مشکل ہے۔ لیکن قضاوقدر کے فیصلے پر صبر وتحمل کے علاوہ چارہ کارنہیں۔

ہم حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے گھر والوں کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپؒ کی طالبات وتلامذہ کے ذریعے آپؒ کا فیض عام فرمائے اور اسی کے صدقہ طفیل میں آپؒ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اہلِ خانہ، متعلقین و منتسبین اور طلبہ و طالبات سمیت تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور اُمتِ مسلمہ کو آپؒ کا نعم البدل عطاء فرمائے۔

اِنَّ لِلہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطیٰ وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ۔

(آمین یاربّ العالمین)

یہ ہجرتیں ہیں زمین وزماں سے آگے کی

مولانا مشتاق فلاحی، دہلی
رکن مجلس ادارت، ماہنامہ ''وحدتِ اسلامی''

ایسے وقت میں جب کہ امتِ مسلمہ کو چہار سو پھیلے معرکہ حق و باطل میں راہِ حق کی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے، علماءِ حق کا کثرت سے انتقال کر جانا یقیناً مخدوش مستقبل کی جانب مشیر ہے۔ ادھر کچھ سالوں سے خاص کر برصغیر میں علماء و دانشوران جس تیزی سے رختِ سفر باندھ رہے ہیں، یہ خدشہ عملی روپ دھارتا جا رہا ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا۔ العیاذ باللہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

> اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا کرنے کے بعد اسے اٹھا نہیں لے گا، بلکہ یوں اٹھائے گا کہ علماء کو ان کے علم سمیت اٹھالے گا۔ پھر باقی جاہل لوگ رہ جائیں گے۔ (بخاری)

اہلِ حق کے اٹھا لیے جانے اور جہلاء کے باقی رہ جانے کا احساس شدت سے اس وقت ہوتا ہے، جب کفر کے سرغنہ نظامِ کفر کے تحفظ کے لیے علماءِ سو کو سروں پر بٹھا کرنا چتے ہیں۔ ان ہوش ربا حالات میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا ہمارے درمیان سے چلے جانا ایسا حادثہ ہے کہ اس کے نقصانات بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔

مولانا محترم ملتِ اسلامیہ ہند اور خاص کر تحریک اسلامی کے معتبر و معتمد محقق، معروف و مقبول عالم دین، علمی و تحقیقی دنیا میں مرجع کی حیثیت رکھنے والے قدآور رہنما اور غلبۂ دین کا عملی شوق رکھنے والے قائد تھے۔ کفر کے دباؤ

اور مسلسل دھمکیوں میں نہ کبھی جھکنا اور نہ ہی مداہنت کی راہ اختیار کرنا کوئی مولانا مرحوم سے سیکھے۔ مولانا کا وہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں شہد گھول جاتا ہے، جب آپ کے فرزند رشید مجاہد سلیم اسم بامسمّٰی کو شہید کیا گیا تو آپ نے کہا تھا کہ ''میں صرف اللہ سے انصاف کی امید کرتا ہوں۔'' جو لوگ نظامِ کفر کے خلاف کھڑے ہوں لیکن ذاتی ضروریات کے وقت اسی جاہلی نظام کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائیں، مولانا محترم کو ہمیشہ اس کے خلاف پایا ہے۔

طاغوتی نظام کے خلاف آپ کی محاذ آرائی قابلِ دید تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تقریباً ان تمام موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو فی زمانہ مسلمانانِ ہند کی اشد ضرورت تھی۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد جب ملک میں مساجد پر بحث چھڑی تو آپ نے ''مساجد اللہ'' کے ہی نام سے کتاب تحریر کی۔

فقہ اسلامی میں مسلم و غیر مسلم دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے ذریعہ احکام و مسائل بیان کیے گئے۔...... افسوس کہ آج کے متفقہین نے اس کی اتنی شاخیں ایجاد کر لیں کہ اصل مسئلہ ورہنمائی ہی دفن ہو کر رہ گئی ہے...... یعنی دارالاسلام اور دارالحرب، مولانا محترم نے اس مسئلہ میں بھی امت کی بہترین رہنمائی کی اور واضح کیا کہ قرآن و سنت میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

تحریکِ اسلامی جب اقامتِ دین کی بات کرتی ہے تو وہ یہ نعرہ بھی دیتی ہے کہ اسلامی نظام کے علاوہ دنیا میں پائے جانے والے بقیہ تمام نظام ہائے زندگی جاہلیت پر مبنی ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ حالات کے تھپیڑے خود تحریکِ اسلامی کو اپنے مقصد و نصب العین سے مداہنت پر مجبور کر رہے تھے، مولانا نے ''جاہلیت کے خلاف جنگ'' کے نام سے کتاب لکھی اور اس باب میں تحریک اسلامی کی اس فکر کو عام کیا کہ وہ جاہلیت سے کیا مراد لیتی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک اور کڑی ''نظام خلافت و امارت کی شرعی حیثیت'' کتاب ہے جو آپ نے تصنیف کی۔ ان معروف کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں آپ کے قلم سے وجود میں آئیں۔

ایک قائد اپنے لگائے پودے کی حفاظت اور اس کے تحفظ کے لیے کس قدر چوکنا اور مستعد رہتا ہے، اور اگر موسم خزاں اس پودے کو نقصان پہنچانے کے در پر ہو تو کس طرح اس کے تحفظ کے جتن کرتا ہے، کوئی مولانا مرحوم سے سیکھے۔ مولانا کی بے چینی قابلِ دید تھی جب آپ نے محسوس کیا کہ آپ جس اجتماعیت سے تعلق رکھتے ہیں وہ آہستہ آہستہ اپنے مقصد سے انحراف کر رہی ہے۔

طلبہ سے مولانا کو خاص انسیت تھی۔ جب بھی مولانا سے لوگ ملاقات کے لیے آتے انہیں یہی نصیحت کرتے کہ فکر کا سودا کسی قیمت پر نہ ہو۔ مولانا کی یہ بے چینی بالآخر جماعت سے انخلاء اور وحدتِ اسلامی میں

شمولیت پر منتج ہوئی اور آپ نے مولانا عطاء الرحمن وجدی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

وحدتِ اسلامی کے مرکزی اجتماعات میں جب میں سابق امیر محترم اور مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو ایک ساتھ دیکھتا تو یک گونہ خوشی کا احساس ہوتا تھا کہ الحمدللہ ہم ان معتبر حضرات کی نگرانی میں اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ دار بقاء کی طرف رحلت فرمانے تک مولانا وحدتِ اسلامی ہند کے رفقاء کی تربیت و تزکیہ میں ایک اہم رول ادا کرتے رہے۔ آپ وحدتِ اسلامی کی سرگرمیوں میں فعال بیعتی کی حیثیت سے شامل رہے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ آپ نے اشاعتِ علم کے لیے اپنے علاقہ سے ہجرت کی اور دکن کو آباد کیا۔ چونکہ ہر جمعیت اپنی بقا کے لیے نئی نسل کو ہدف بناتی ہے اور اس کے لیے تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس ضرورت کے تحت جماعتِ اسلامی نے بھی ملک کے طول و عرض میں اداروں کا جال پھیلایا۔ اس تسلسل کی ایک کڑی کے طور پر قبل از ایمر جنسی مولانا جلیل احسن ندویؒ کے کہنے پر آپ جامعہ دار الہدیٰ کریم نگر آندھرا پردیش تشریف لائے۔ یہ مدرسہ 1981 میں پہاڑی شریف منتقل ہوا تو مولانا بھی حیدرآباد آگئے اور پورے انہماک سے ترویج و اشاعت علم میں خود کو لگا دیا۔ بعد ازاں مولانا کی خواہش پر جامعۃ البنات سعید آباد کا قیام عمل میں آیا۔ جب جامعۃ البنات کا ذکر آتا ہے تو طالبات کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں مولانا کے گھرانے کا ذکر لازماً آتا ہے۔ مدرسہ کی طالبات کے تزکیہ و تربیت میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا گھرانہ ایسا لگا ہوا تھا گویا لوگ زندہ آنکھوں سے عہدِ رسالت کا مدنی معاشرہ دیکھ رہے ہوں۔ یہ تعلق خاطر محض تعلیم کے دورانیہ تک محدود نہ رہتا بلکہ بعد از فراغت بھی ان تعلقات کو نبھایا جاتا۔

یہ توصحیح بات ہے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ اس فانی دنیا میں ہر آنے والا جانے ہی کے لیے آتا ہے، لوگ چلے جاتے ہیں اور اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ مولانا جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے اور خود کو منوا کر چلے جاتے ہیں۔ اصل تو مشن ہے جو مولانا اپنے محبین و طلبہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں کہ ان پُرآشوب حالات میں کون اپنے سینہ میں ایسا جگر رکھتا ہے کہ آگے بڑھے اور مولانا کے اس مشن سے خود کو وابستہ کرے۔

توحید کے داعی

سیف فاروقی، دہرہ دون

ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: "ان من اعظم الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" کا عملی نمونہ حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب اصلاحی رحمہ اللہ۔

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب نور اللہ مرقدہ صحیح معنوں میں توحید اور حدید کے داعی تھے۔ حضرت مولانا تحریک اسلامی کے مزکی تھے اور مثل اسلاف جملہ مسائل کا ادراک توحید اور اظہارِ توحید یعنی ریاست سے جوڑ کر فرماتے تھے۔ حضرت مولانا سے میرا پہلا تعارف انڈین ایکسپریس کے ایک مضمون کے ذریعہ سے ہوا۔ تجزیہ نگار پروین سوامی نے مولانا پر People Who Sparked the Ideas کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں نامی کتابچے پر اس نے نوجوانوں میں جہادی روح بیدار کرنے کا الزام عائد کیا تھا۔

میری براہ راست ملاقات آج سے گیارہ سال پہلے حضرت مولانا سے تب ہوئی جب وہ سہارنپور کے تربیتی اجتماع میں تشریف لائے تھے۔ حضرت مولانا ایک کمرے میں تشریف فرما تھے اور میں بھی اسی کمرے میں تھا۔ مولانا نے بلایا اور دریافت فرمایا کہ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دہرادون۔ مولانا نے حضرت والد صاحب کا نام لیتے ہوئے فرمایا کہ اُن کے صاحبزادے ہیں؟ لیکن مجھے مولانا کی آواز سنائی نہیں دی اور میں نے نفی میں جواب دیا۔ اتنے میں مولانا جمیل صدیقی صاحب کمرے میں تشریف لائے اور ہم دونوں کو دیکھا اور مولانا سے فرمایا کہ آپ اس بچے کو جانتے ہیں؟ یہ حکیم صاحب کے بیٹے ہیں اور دہرادون سے آئے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ابھی تو میں نے ان سے پوچھا تو یہ منع کر رہے تھے۔ مجھے ندامت سی محسوس ہوئی۔ اس

وقت میرے ہاتھ میں بھٹے کے کرکرے کا ایک پیکٹ تھا جس کو میں نے مولانا کی طرف بڑھایا۔ مولانا نے نہایت شفقت کے ساتھ اسے قبول کیا اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا۔ پھر مولانا سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ مولانا مجھے اس واقعہ کے بعد سے اجتماع میں جہاں کہیں بھی ملتے تو حافظ صاحب کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا نے الگ الگ موضوعات پر کئی کتابچے رقم فرمائے۔ یہ رسالے ان کے درست عقیدہ اور مضبوط فکر کی کھلی دلیل ہیں۔ توحید اور اقامتِ دین کے تعلق سے منحرفین کی تلبیسات کا قلع قمع کرنا حضرت مولانا کا خاص امتیاز تھا۔ مولانا نے ہر اُس تحریف کا نوٹس لیا جو اقامتِ دین کی فرضیت ومعنویت اور شرعی وسائل و ذرائع کے استعمال سے تعلق رکھتی تھی۔ مولانا ملکی اور عالمی منظر نامہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور جرأت و جسارت کے ساتھ ہر مسئلے پر شرعی بنیادوں پر اپنا نقطہ نظر واضح فرماتے تھے۔ بامیان کے مسئلے پر مجسّموں کا مسئلہ اور مداہنت پرست دانشوران کی فقاہت کے محاکمہ کے سلسلے میں اسلامی فکر ایک تنقیدی جائزہ، طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں مولانا کی اہم خدمات میں سے ہیں۔ بابری مسجد کے حوالے سے مولانا نے دو رسالے رقم فرمائے اور امت پر واضح فرمایا کہ اس باب میں حضرات فقہاء کرام کا کیا موقف رہا ہے۔ خلافتِ اسلامیہ، تحریک اسلامی اور الیکشن، دار الاسلام اور دارالحرب، ہندوستان میں مسلم سیاست اور نظام زکوٰۃ کے تعلق سے بھی مولانا نے الگ الگ رسالے رقم فرمائے جو ان کے فکر ونظر کی سلامتی کا زندہ نمونہ ہیں۔ مولانا جہادی مزاج رکھتے تھے۔ مولانا نے نہایت ہوشمندی اور دقیق نظری سے کام لیتے ہوئے شریعت وسنت کی روشنی میں جاہلیت کے خلاف جنگ اور ملت کے دفاع کا مسئلہ نامی دو نہایت اہم کتابچے جہاد کے موضوع پر رقم فرمائے اور جو الجھنیں پیدا کی گئی تھیں ان کا محکم اور دلنشیں دلائل سے جواب دیا۔

لمبی بیماری، آزمائشیں اور یہاں تک کہ جوان بیٹے کی شہادت بھی مولانا کو بوڑھا نہ کرسکی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا محترم کی مغفرت فرمائے، حسنات وخدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین!

مولانا کی پوری زندگی والعصر کی تفسیر تھی

ابومصعب، حیدرآباد

علمائے حق باپ کے مانند ہوتے ہیں ان کا ساتھ رہنے پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسا کہ آپ پر ابھی چھت ہے جو آپ کو محفوظ رکھتی ہے فتنوں سے۔ ان کے جانے پر آپ اپنے آپ کو فتنوں سے محفوظ نہیں سمجھتے۔ یہی ہو بہو احساس مولانا کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر ہوا۔ علمائے حق انبیاء کے وارث ہوتے ہیں، تبھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے علمائے حق کے لیے لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب اور ان کی محبت ڈالی ہے جو صرف اور صرف علمائے حق کے لیے محسوس ہوتی ہے میں دیکھ پا رہا تھا، تدفین کے وقت کہ لوگوں کے چہروں پر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی تھی، غم تھا۔ یہی غم اور اداسی مجھے بھی محسوس ہوئی۔ ہاں یہ احساس نیا نہیں تھا پر بار بار بھی نہیں ہوا۔ ایک دفعہ یہ احساس ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے انتقال پر ہوا تھا اور تب سے جا کر اب یہ احساس مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے انتقال پر ہوا ہے۔

میں جب بھی مولانا کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ان کی زندگی، ان کی سیرت سورۃ العصر پر مبنی نظر آتی ہے۔ مولانا کو اس دور میں وقت کی جو قدر رہوئی اور پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ جس قدر انھوں نے خود کی اور لوگوں کی اصل فلاح کے لیے لگایا وہ ظاہر و عام ہے۔ انھوں نے خود کو بھی خسارے سے بچایا اور لوگوں کو بھی خسارے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ جس طرح آپ نے دورِ حاضر کے شرک اور کفر کو بے نقاب کیا، خود کے اور لوگوں کے ایمان کو توحید کو ہر طرح کے شرک اور کفر سے پاک رکھنے کی ایک مسلسل کوشش میں آپ ہمیشہ لگے رہے، خلافت کے لیے...... اللہ کی حاکیت اس زمین پر قائم ہو...... اس کا دین اس زمین پر نافذ ہو...... طاغوت کی غلامی ختم ہو...... اس کے لیے جو ان کی محنتیں رہیں وہ ہمارے لیے ایک نمونہ ہے اس اعتبار سے کہ یہاں پر ہم

ذہنوں کا یہی کہنا ہے کہ حق کا کام کرنا چاہتے ہیں پر وقت نہیں۔ تبھی ہماری نظر مولانا کی زندگی پر پڑتی ہے جو خود اسی زمانے میں پیدا ہوئے جہاں پر انھوں نے اپنی شادی شدہ زندگی بھی گزاری، بچوں کی تربیت بھی کی، رشتہ داری بھی نبھائی، دعوت و تبلیغ کے کام میں بھی مصروف رہے، مدرسہ کی ذمہ داری بھی نبھائی، یتیموں کا، بے سہاروں کا سہارا بھی بنے، لوگوں کی مدد پر ہمیشہ تیار رہے، چاہے اس وقت مدد کرنے کی استطاعت ہو یا نہ ہو، یہ سب کچھ مولانا نے اپنی اسی زمانے کی زندگی میں اللہ کے احسان سے کیا تو اب ہمارے اور آپ کے پاس کیا ہی بہانہ رہ جاتا ہے کہ وقت نہیں نکلتا......؟! خیر یہاں وقت کی برکات جو مولانا کو حاصل ہوئیں وہ ہر کسی کو حاصل بھی نہیں ہوتیں۔ وقت کی یہ برکات تو اللہ اپنے اُن بندوں کو نصیب کراتا ہے جن بندوں کی زندگی کا مقصد اللہ کی خاطر جینا اور مرنا ہوتا ہے۔

حق بات کو، حق کے کلمہ کو جس طرح اپنے زمانے کے سامنے رکھا، طاغوت کو طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلند آواز میں کہا اُس آواز کی گونج صدیوں تک اس ہندوستان کی زمین پر گونجتی رہے گی۔ انشاءاللہ!

سورۃ العصر میں جو ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' ہے اس کا حق ادا کرنے کی مسلسل کوشش مولانا کی زندگی میں نظر آتی ہے کہ مولانا نے دینِ اسلام کے معاملہ میں باطل کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ آپ نے جس قدر خلافت کو لے کر، شریعت کو لے کر، جہاد کو لے کر بابری مسجد کو لے کر کھلے عام بنا طاغوت کا خوف کیے، بات رکھی وہ ہم سب کے لیے واقعی نصیحت ہے کہ اپنی زندگیوں کو صرف اللہ کی خاطر جیو۔ آپ ''وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ'' کا بھی واقعی ایک چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ طاغوت نے اپنا خوف مولانا کے دل میں ڈالنے کی کوشش کی اور ان کے حق کی آواز کو خاموش کرنے اور مولانا کے چٹان جیسے فولادی ارادوں کو کمزور کرنے کے لیے ہر طرح کی اذیت دی جس میں سب سے بڑی اذیت آپ کے صاحبزادے کو شہید کر کے دی۔ لیکن مولانا کو اپنے صاحبزادے کے شہید ہونے کا رتی برابر غم نہ ہوا بلکہ انھوں نے فخر محسوس کیا کہ سنتِ ابراہیمی ادا ہوئی اور خود آپ کے صاحبزادے کی شہادت کے جام کو پینے کی خواہش بھی مکمل ہوئی الحمدللہ۔ اس اذیت کے بعد مولانا کے قدموں کی مضبوطی کو دیکھ کر طاغوت آج بھی تلملا اٹھتا ہے۔

ہمیں مولانا کی زندگی سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے کہ مولانا نے جس طرح اپنی زندگی پورے طور پر ''سورۃ العصر'' کے مطابق گزاری ہمیں بھی ہماری زندگی ''سورۃ العصر'' کے مطابق گزارنی چاہیے تبھی ہم خسارہ اٹھانے سے بچ سکتے ہیں۔ انشاءاللہ!

مولانا کی خصوصیت میں سے ایک خاصیت جس کو بار بار دیکھنے کا مجھے شرف حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ مولانا

انتہائی مہمان نواز تھے زندگی کے اپنے آخری دنوں میں بھی جب بیماری اور کمزوری کی وجہ سے بدن نے ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا تب بھی مولانا سے ملنے کوئی مہمان چلا آئے تو ان کے لیے اپنے درد کو درکنار رکھتے، پوری کوشش کرکے بیٹھتے، ان کے لیے وقت نکال لیتے، ان سے بات کرتے، پورے خلوص کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتے، ان کی مہمان نوازی کے لیے فکرمند رہتے کہ چائے جلدی آجائے ان کے سامنے کچھ پیش ہوجائے، واللہ اتنے درد میں بھی ایسی مہمان نوازی دیکھ کر مجھے اسلاف کی یاد آجاتی تھی کہ ان کا بھی رویہ مہمان کے لیے بچھ جانے جیسا تھا۔

اللہ مولانا کے اس عمل کو اور تمام اعمال کو قبول کرے۔ آمین!

مولانا کا صدقۂ جاریہ ان کی اولاد ہے، جن کی زندگی کا مقصد اپنے والد کی طرح اللہ کی خاطر جینا اور مرنا ہے۔ مولانا اپنے پیچھے نیک اولاد، علم اور صدقۂ جاریہ رکھ گئے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی فائدہ مند رہے گا۔ ان شاء اللہ!

اللہ مولانا کی قبر کو پُرنور کرے۔ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام اور جنت الفردوس عطا کرے۔ آپ کی محنتوں کو قبول کرے اور آپ کی محنتوں کا سلسلہ جاری رکھے۔ آمین!

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

محمد شریف معین الدین خان، حیدرآباد

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جب جب اقوامِ عالم ظلمت اور گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹک جاتی ہے تب اللہ تعالیٰ قوموں کی اصلاح اور ان کو طاغوت سے بچانے کے لیے انبیاء کو مبعوث فرماتا ہے۔ نبی آخر الزماں ہمارے پیارے نبی ﷺ کی بعثت اور وفات کے بعد یہ ذمہ داری علماء کے مضبوط کندھوں پر ڈالی گئی۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے "العلماء ورثة الانبیاء" علماء انبیا کے وارث ہیں۔

چونکہ آج امتِ مسلمہ گمراہی اور بے راہ روی کے اُسی پُرفتن دور سے گزر رہی ہے اور قربِ قیامت کی علامتیں بھی ظاہر ہو چکی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علم اٹھا لیا جائے گا، جس سے مراد علماءِ حق کا اس دارِ فانی سے کثرت سے وفات پانا ہے۔

جس طرح انبیاء کرام دین کی سربلندی اور انسانیت کو بے راہ روی اور طاغوت کے چنگل سے بچانے کے لیے اپنی جان و مال اور اولاد لگا دیتے ہیں اسی طرح علماءِ حق بھی امت کی فکر اور دین کی سربلندی کے لیے کمربستہ رہتے ہیں اور یہی علماءِ حق کی پہچان بھی ہے۔ اسی فکر اور جذبہ کے حامل ہمارے رفیق، مشفق، عالمِ دین مولانا

عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب بھی تھے، آپ علماء، مشائخین اور ملت کے جری مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کی تعلیم ایک پوری نسل کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا مولانا اصلاحیؒ لڑکیوں کی دینی تعلیم اور تربیت کے لیے، ان کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اور ان کو اور ملت کو اصلاحی فکر دینے کے لیے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وقف کر دیا۔ اپنی اولاد کو دینِ حق کی خاطر جان نچھاور کر دینے اور باطل کے خلاف بلا جھجک آواز اٹھانے کے قابل بنایا۔ اپنی جوان اولاد کی شہادت پر میں نے ان کو صبر اور ہمت کے ساتھ فخر کرتے ہوئے دیکھا۔

غرض میں اس بات کی گواہی دیتے ہوئے کہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ایک بہترین عالمِ حق اور جری رہنما تھے۔ تمام علماء اور ہر اس مسلمان سے گزارش کرتا ہوں جو اپنے اندر دین کی حمیت اور ایمان کی رمق رکھتا ہے کہ وہ مولانا کی اس فکر کو جو کہ انبیاء اور علماءِ حق کا بھی مقصود تھا کہ اللہ کی زمین سے ہر طاغوتی نظام کو مٹا کر دینِ اسلام کی سربلندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔ مدارس اور مساجد کے تحفظ کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں اور امت کی اصلاح کے لیے کمر باندھ لیں اور اس شعر کا مصداق بن جائیں:

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

شفیق و بزرگ مربی

عبدالواحد شیخ، وکرولی، ممبئی

مصنف ''بے گناہ قیدی''

آج ہم دار پر کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

یہ 1998-99 کا زمانہ تھا۔ طلبہ تحریک کے پروگراموں میں مجھے بلایا جاتا۔ اس میں ممبئی کے باہر پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا۔ ان پروگراموں میں دو بزرگ عالم دین سے ملاقات اور صحبتِ صالحین کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ ایک (ڈاکٹر سلمان فارسی کے والد محترم) نام یاد نہیں، مالیگاؤں اور دوسرے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ حیدرآباد۔ ان کی کتابیں بھی شوق سے پڑھتے رہے۔ بابری مسجد کے مسئلے پر جس بولڈ انداز میں اصلاحی صاحبؒ نے لکھا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ آج جب ان کتابوں کو پڑھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مولانا جس بڑے خسارے کی طرف ملت کی توجہ مبذول کراتے رہے، ہم نے اس کا ادراک ہی نہیں کیا۔

مولانا کی جتنی کتابیں منظرِ عام پر آتیں میری کوشش ہوتی کہ ان کو حاصل کر کے پڑھوں۔ پھر طلبہ تحریک پر پابندی کے بعد پروگراموں میں مولانا سے ملنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ 2020-21 میں کرونا کے دور میں ورک فرام ہوم چل رہا تھا۔ میں نے Ph.D میں داخلہ لے لیا۔ موضوع ''ادب زنداں: آزادی کے بعد'' طے پایا۔ لوگوں سے مشورہ کیا تو کسی نے بتایا کہ حیدرآباد چلے جایئے مولانا کے پاس، وہ آپ کو اس موضوع پر کتابیں بھی دیں گے اور رہنمائی بھی فرمائیں گے۔ یہ بھی پتا چلا کہ مولانا صاحبِ فراش ہیں۔ ہمت کر کے حیدرآباد چلا گیا کہ اگر موضوع پر بات نہ ہوئی تو عیادت کے ثواب سے محرومی نہ ہوگی۔ ویسے بھی مولانا کو دیکھے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا تھا۔

مولانا کے بیٹے معتصم باللہ کو فون کیا۔ پہلے تو وہاں کے حالات کی وجہ سے معتصم نے فون رسیو ہی نہیں کیا۔ لیکن بار بار کرنے پر فون پر بات ہوگئی۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ معتصم نے کہا والد صاحب کی طبیعت خراب چل رہی ہے۔ آپ گھر ضرور آیئے ملاقات کے لیے۔ بائیک لے کر معتصم مجھے لینے آ گئے۔ ہم گھر پہنچے، چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کی الماریوں کے درمیان ایک آرام کرسی پر مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ پیر اور پورے جسم میں سوجن تھی اور تکلیف کے آثار ان کے جسم اور چہرے سے نمایاں ہو رہے تھے۔ عشاء کی اذان ہونے کو تھی معتصم نے ایک پیالے میں Liquid Food لا کر چمچ سے مولانا کو کھلانے کی کوشش کی۔ تھوڑا سا کھانے کے بعد، مولانا کو کچھ قوت محسوس ہوئی تو مولانا نے میری طرف دیکھ کر چہرہ پہچاننے کی کوشش کی۔ معتصم نے تعارف کرایا۔ مگر مولانا کو یاد نہیں رہا کہ پہلے کب کہاں ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ایسی حالت میں بھی مجھ سے پوچھا کہ ''خیریت''۔ میں نے الحمدللہ کہا۔ بولے مجھ سے تو کوئی کام نہیں؟ میں نے ان کی حالت دیکھ کر 'ناں' کہہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور معتصم نماز کے لیے مسجد کی طرف جانے لگے۔ میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ مولانا سے دعا کرنے کو کہا اور ان کی صحت یابی کی دعا کرتے ہوئے، ان سے اجازت لے لی۔ معتصم نے بتایا کہ طبیعت stable نہیں، بس یہی کیفیت رہتی ہے۔

دوسرے دن معتصم مجھے مولانا کے مدرسہ لے گئے۔ کرونا کی وجہ سے مدرسہ میں کوئی نہیں تھا۔ سب بچیاں اپنے گھروں پر تھیں۔ اس نے بتایا کہ چند دنوں میں ہی مدرسہ پھر سے شروع ہونے کو ہے۔ میں نے مدرسہ دیکھ کر اس بارے میں مزید استفسار کیا۔ وہاں کی پڑھائی، نصاب، معیار مجھے اچھا لگا۔ میری بچی نے ابھی ابھی دسویں کلاس کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہماری بیگم بھی چاہتی تھیں کہ بچی کو کسی اچھے مدرسہ میں داخل کر کے عالمہ کا کورس کرایا جائے۔ میں نے اس خواہش کا اظہار معتصم سے کیا۔ اس نے بتایا کہ داخلہ میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہ دینی علوم کے ساتھ اگر بچی عصری تعلیم حاصل کرنا چاہے تو کیا انتظام ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ بھی ممکن ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ گھر آ کر میں نے اپنی بچی اور ہمارے قیدی سالے صاحب ساجد انصاری کی بچی کا داخلہ مولانا کے مدرسہ میں کرا دیا۔ تب سے ہمارے گھر والوں کا تعلق مولانا کے گھر والوں سے استوار ہوتا رہا۔ الحمدللہ!

ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں کسی کام سے حیدر آباد گیا تھا۔ اس وقت معتصم کافی چھوٹے تھے۔ مشکل سے 20-25 سال کے۔ مجھے صلاح الدین صاحب حیدر آباد کے گھر جانا تھا، کیونکہ کار حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں اس وقت مولانا سے ملنے گیا۔ مولانا اس وقت کافی تندرست تھے۔ ان سے گھر پر ملا اور الگ الگ موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں گہما گہمی تھی۔ ان کے گھر والے کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔ پھر

مولانا نے بتایا کہ گھر کی خواتین اُن خواتین سے ملنے جارہی ہیں جن کے بچوں کو پولیس نے انکاؤنٹر میں شہید کر دیا ہے۔شہید ہونے والوں کا نام پتہ مجھے یادنہیں رہالیکن خوشی اس بات کی ہوئی کہ مولانا نے ایسے وقت میں ان پریشان حال لوگوں کو یادرکھا جب کہ رشتے داراور سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ملت ایک جسم واحد کی مانند ہے کی جیتی جاگتی تصویر مولانا کا وطیرہ رہا ہے۔مولانا کا جماعت اسلامی سے تعلق اور پھر وہاں سے اختلاف ایک الگ موضوع ہے۔کاش کوئی مولانا کی حیات وخدمات پر ریسرچ کر کے ایک کتابی شکل میں محفوظ کرلے تو ملت کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔

ایک دن اچانک واٹس ایپ پر خبر گردش کرنے لگی کہ مولانا کی طبیعت serious ہے۔میں نے معتصم کو فون کیا مگر وہ اسپتال کی بھاگ دوڑ میں تھے شاید اس لیے فون نہیں اٹھا پائے۔پھر ایک دوروز بعد خبر آئی کہ مولانا اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

دکھ، رنج اور صدمہ ہوا۔ملت ایک صحیح فکر کے عالمِ دین سے محروم ہوگئی۔ہم پر سے ایک شفیق اور بزرگ مربی کا سایہ اٹھ گیا۔تحریکِ اسلامی نے ایک اور سپوت کو کھو دیا۔مگر آج بھی ان کے افکار، ان کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ان کی اولادیں ان کے صحیح اسلامی مشن کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ان کے مدرسہ سے سینکڑوں بچیاں علم کے زیور سے آراستہ ہوکر ملت کے تنِ مردہ میں روح پھونکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔یقیناً یہ سب ثوابِ جاریہ ہے جو قیامت تک انشاء اللہ جاری رہے گا۔امید ہے کہ ان کی بچیاں ان کے مدرسہ کو اسی اسپرٹ کے ساتھ جاری و ساری رکھیں گی اور ان کے لڑکے والد کے تحریکی موقف کو آگے لے کر چلیں گے۔

اللہ کی بارگاہ میں ایک بار پھر دعا ہے کہ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے درجات بلند کرتے ہوئے ان کے اہلِ خانہ کو ان کے نقشِ قدم پر ثابت قدم رہنے کی توفیق دے۔آمین!

کہا یہ عاشق نے بوالہوس سے کہ تیرا میداں نہیں محبت
یہاں جو گزرے گا جان و دل سے وہ میرا نورِ نگاہ ہوگا

گنج ہائے گراں مایہ
تعارف و تجزیۂ تصانیف

وہ گیت ازل کے گاتا تھا
اور اک پیغام سناتا تھا، جینے کے راز سکھاتا تھا
مرنے کے بھید بتاتا تھا، ایمان کی خو پھیلاتا تھا
حکمت کا رنگ جماتا تھا
قبروں سے مردے جی اُٹھیں، وہ ایسی مئے کا ساقی تھا
وہ ایسے جام لنڈھاتا تھا
تھا اس کا گناہِ پاک یہی، ہر کفر پہ اس کی یورش تھی
ہر باطل سے ٹکراتا تھا
جمہوری، وطنی، لادینی اور چانکیائی، مارکسی
سب حیلے اپنے کرتے تھے
ان کو چکر دے دے کر، وہ سخت پریشاں کرتا تھا
خود ان کے ہاتھ نہ آتا تھا
نظریوں کے تھے جال بہت، پل بھر میں توڑ دکھاتا تھا
اس دور کے ساحر جادو کے، جب سانپ بنا کر لاتے تھے
وہ مکر کا دشمن، سحر شکن، موسیٰ کا عصا بن جاتا تھا
نمرود چتا بھڑکاتے تھے، تو ابراہیم کا یہ بیٹا، ہر آذر کا یہ انکاری
بے باک بھڑکتے شعلوں کو، اور دہکے ہوئے انگاروں کو
رنگیں گلزار بناتا تھا
گھبراؤ نہیں، رکھو یہ یقیں
وہ شاہ بلوطِ انسانی، جو ظاہر میں کل ٹوٹ گرا
وہ سورج بن کر اُبھرے گا
مانو، وہ کل کا سویرا ہے

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں

ڈاکٹر محمد اسامہ عظیم فلاحی

ایڈیٹر ماہنامہ ''نقوش''

سال 2022 تحریک اسلامی کے لیے اندوہناک رہا۔ صف اول کے متعدد رہنما اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ ان رہنماؤں میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا نام بھارت کے پس منظر میں بہت اہم ہے۔ علمی گہرائی، فکری پختگی، صبر و استقامت، شجاعت و بہادری، حالات کی پرکھ اور اس میں شرعی رہنمائی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تحریک اسلامی کے حلقے میں آپ کا قد جہاں کافی اونچا تھا وہیں دوسرے حلقوں میں آپ کی قدردانی سے ہر کوئی واقف ہے۔ بنارس میں دیوبندی مکتبۂ فکر کے قدیم ادارہ مظہر العلوم میں بھی آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے اپنی خدمات موقوف کر کے جب آپ نے مدرسۃ الاصلاح پر تدریس کے فرائض انجام دینے کا فیصلہ کیا تو مظہــــر العلوم سے ایک وفد مولانا کے پاس آتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ آپ اپنا فیصلہ واپس لیں اور مظہر العلوم میں اپنی تدریسی خدمات جاری رکھیں۔

مولانا مرحوم نے مختلف اداروں میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد آخر میں چالیس سال سے زائد عمر کا حصہ حیدرآباد میں گزارا جہاں آپ نے نوجوانوں کی سرپرستی کی اور بچیوں کے لیے اعلیٰ دینی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا۔ آج اس مدرسہ کی اپنی ایک منفرد پہچان بن چکی ہے۔ وہاں کی فارغات دینی غیرت وحمیت سے سرشار ہوتی ہیں اور میدان عمل میں بھی نظر آتی ہیں۔

مولانا محترم کی بے شمار خدمات ہیں لیکن اس وقت ان کی تصانیف کے حوالے سے ان کی ملی اور فکری خدمات کا جائزہ لیں گے۔

مولانا نے اپنے پیچھے مقدار کے لحاظ سے بہت زیادہ لٹریچر نہیں چھوڑا لیکن جو کچھ بھی لکھا ہے وہ علمی اور فکری اعتبار سے اس لائق ہے کہ اہلِ علم اور دینی رجحان رکھنے والے نوجوانوں میں اس کو زیادہ سے زیادہ پیش کیا جائے۔ آپ نے تصنیف برائے تصنیف کا کام نہیں کیا۔ آپ نے ہمیشہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جس کی ملت کو اشد ضرورت تھی۔ مولانا کے تحریری کاموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

① ملی مسائل ② فکری مسائل

ملی مسائل

امارت وخلافت

بھارت میں تقسیم کے بعد مسلمان مختلف قسم کے ملی مسائل سے دوچار رہے ہیں جن کا ابھی کوئی مستقل حل سامنے نہیں آسکا ہے۔ مسائل کے حل کے لیے سب سے اہم ضرورت نظم امارت کا قیام ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی اجتماعی مسئلہ اسی وقت حل ہوتا ہے جب کچھ معتبر اور اہل لوگوں کے ہاتھوں میں سیادت وقیادت سونپی جاتی ہے۔

امارت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ان کی تدفین اس وقت تک نہیں کی گئی جب تک نائب رسول، خلیفہ کا انتخاب نہیں ہو گیا۔ آگے چل کر یہ اسلامی اجتماعیت کا ایک انتہائی اہم ادارہ بن گیا۔ مولانا نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا اور مسلمانانِ ہند کی بھرپور رہنمائی کی۔ مولانا نظام امارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت وامارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی خلافت کو ہم اسلامی حکومت یا حکومتِ الٰہیہ کہتے ہیں۔ یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمانوں کا مطمحِ نظر اور اس کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے اور اس کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا سے شر وفساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔''
>
> (نظامِ خلافت وامارت کی شرعی حیثیت، ص:10)

خلافت کا قیام امت کے نزدیک ایک متفقہ فرض ہے۔ ابنِ حزم لکھتے ہیں:

> ''تمام اہلِ سنت، مرجیہ، شیعہ، خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امامِ عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسول لائے ہیں۔'' (ص:18)

اصولی باتوں کے بعد مولانا مسلمانانِ ہند کی طرف رخ کرتے ہیں اور امارت کے قیام کی جدوجہد کی مختصر

تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بھارت میں بیسویں صدی کے ابتدائی دو دہوں تک انگریزوں کے خلاف جد و جہد کی بنیاد نظام اسلامی کا احیاء تھا۔ 1914 میں مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ نظم جماعت کے قیام کا اعلان بھارت میں کر دیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنا دیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بعد میں کئی جگہوں پر دار القضاء کے قیام کی کوششیں ہوئیں جس میں سب سے بڑی کامیابی امارتِ شرعیہ بہار کی شکل میں 1921 میں سامنے آئی۔ یہ ادارہ اب تک قائم ہے۔ کاش کہ دیگر صوبوں میں بھی اسی طرح کوششیں ہوتیں اور مسلمان ایک امارت کے تحت ہو جاتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر نصب امام، خلافت اسلامیہ اور امارتِ اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے اور نظامِ کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح اس کی ساری کوشش تیمم کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اصل کے لیے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا'' (ص:25)

''کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دار القضاء بھی قائم ہو سکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ بحالتِ مجبوری عبوری دور کے لیے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہیے۔ شاید اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہِ مجبوری اور عدمِ استطاعت بھی مقبول ہو جائے، لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارتِ اسلامیہ کے قیام کی تمنا اور حتیٰ الوسع کوشش سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہیں اسی پر قانع ہو کر رہ گئے ہیں اور اس سے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں جو انتہائی افسوس ناک واقعہ ہے۔ اس کے لیے عوام تو خدا کے پاس باز پرس سے شاید بچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاہ میں قرآن، حدیث وفقہ کے اصول وفروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔ اسی طرح جو لوگ خلافتِ اسلامیہ اور نظامِ اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہو سکتی ہے کہ تم نظامِ کفر وشرک کو ہٹا کر نظامِ شرع اگر قائم نہیں کر سکتے تو محدود پیمانے پر ہی سہی تم نے اپنی استطاعت کی حد تک حکم بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔ بہر حال دونوں کام کرنے کے ہیں، ہر کام کا دین میں ایک مقام اور اہمیت ہے۔'' (ص:26-27)

با قاعدہ اسلامی نظام کے قیام سے قبل کم از کم مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے جس سے وہ آخرت میں جوابدہی سے بچ سکتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:

''فی الحقیقت احکامِ شرعیہ کی رو سے مسلمانانِ ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں یا نظامِ جماعت قائم کر کے ادائے فرضِ ملت میں کوشاں ہوں۔ مولانا آزادؒ نے جن دوراہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب وسنت، تاریخ انبیاء، سیرتِ خاتم النّبیین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے۔ درحقیقت تیسری راہ یعنی اہلِ کفر وشرک کے مستقلاً اور بلا کراہیت ماتحت اور زیرِ نگیں ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' (ص:31-32)

بھارت میں مسلمانوں کی پوزیشن

بھارت میں غیر اسلامی نظام کے تحت رہتے ہوئے ان کی پوزیشن کیا ہوگی بھارت شرعی طور پر دارالحرب ہوگا یا دارالاسلام؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کے جواب پر بہت سارے معاملات کا انحصار ہے۔ فقہ اسلامی میں دار الاسلام اور دارالحرب میں تفریق نظام کی وجہ سے کی گئی ہے۔ اس کی بنیادیں قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ وہ ملک جہاں شریعت کا نظام قائم ہو وہ دارالاسلام ہے اور جہاں قائم نہ ہو وہ دارالحرب ہے۔ موجودہ دور میں بعض حضرات ایسے سامنے آئے ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جہاں مذہبی آزادی ہو یا اس میں مسلمان شریک ہوں تو وہ دارالاسلام یا دارالامن ہے۔

مولانا محترم نے اس سلگتے ہوئے مسئلہ پر قلم اٹھایا اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ اس بات کی شہادت مولانا عامر عثمانیؒ نے ماہنامہ 'تجلی' کے شمارے میں دی ہے۔ دارالحرب کی تعریف کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''دارالحرب وہ ملک ہے جہاں شرک فتنہ بننے کی پوزیشن میں موجود ہو اور دین کل کا کل اللہ کے لیے نہ ہو۔ کفر وشرک کی عملداری اور حکمرانی ہو اور حلت وحرمت کے اختیارات اہلِ کفر کو حاصل ہوں۔''

(دارالحرب اور دارالاسلام، ص:26)

درج ذیل دو شکلیں ہیں جس کو پیش کر کے مغالطہ دیا جاتا ہے کہ بھارت دارالاسلام ہے:

١. وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت ہیں لیکن اس کے دستور اور قانون کی بنیاد کتاب وسنت نہیں۔
٢. وہ ملک جہاں مسلمان شریکِ حکومت نہیں ہیں اور دستور وقانون کی بنیاد کتاب وسنت بھی نہیں ہے، البتہ انہیں کچھ مذہبی آزادی حاصل ہے۔

مولانا محترم ان دونوں قسموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ دونوں قسمیں قطعاً دارالاسلام نہیں ہوسکتیں کیونکہ جیسا کہ اوپر ہم نے بتایا ہے کہ کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے محض مسلمانوں کا شریکِ حکومت ہونا یا زیرِ سایۂ کفر مطلق تھوڑی مذہبی آزادی کا حاصل ہونا کسی طرح کافی نہیں ہے۔ آج جو لوگ اس طرح کے ممالک کو دارالاسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں

وہ یا تو جان بوجھ کر اپنی خاص حیثیات کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک حقیقت کو چھپا رہے ہیں یا وہ امتِ مسلمہ کو دوسری قوموں کے مثل نری ایک قوم اور اسلام کو اس کا ایک قومی مذہب سمجھتے ہیں اور انہیں پھر کتبِ فقہ میں غلبۂ مسلمین اور استیلاء کے لفظ سے دھوکا ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کا نرا غلبہ اسلام کی نظر میں انتہائی قبیح اور عظیم منکر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ائمہ اور فقہاء کے دور میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمان کہیں غالب ہوں اور وہاں مبنی بر کفر و شرک احکام جاری ہوں اور اسلامی احکام اپنے وجود اور بقاء کے لیے اجازت کے محتاج ہوں۔'' (دارالحرب اور دارالاسلام، ص:22)

دارالاسلام اور غیر اسلامی ریاست میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے؟ مولانا لکھتے ہیں:

''واضح رہنا چاہیے کہ دارالاسلام میں ایک مسلم کی ہر چیز محفوظ اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان کی جان و مال، عزت، آبرو کو اسلام نے محترم ٹھہرایا ہے اور اگر کسی غیر اسلامی اسٹیٹ میں ایک مسلمان کو امان ملتی ہے تو اس بنیاد پر کہ اس کے ساتھ ایک عہد ہے یا وہ ملک کا ایک شہری ہے۔''

(دارالحرب اور دارالاسلام، ص:35)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دارالحرب میں کیا جائز اور کیا ناجائز ہوگا؟ اس سوال کا جواب انتہائی تفصیل طلب ہے جس کا جواب مختصر سی کتاب میں ممکن نہیں اس وجہ سے مولانا اس جانب جانے کے بجائے مسلمانوں کی منصبی ذمہ داری کے ذیل میں درج ذیل نصیحت کرتے ہیں:

''ان بلا تنظیم و بلا امیر مسلمانوں کو دارالاسلام اور دارالحرب میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز کی بحثوں سے قطع نظر اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز، تمام جدوجہد کا محور اور پوری زندگی کا نصب العین اپنے کو مکمل جہادی پوزیشن میں لانے کو بنانا چاہیے اور جہاد کے جن جن شعبوں اور طریقوں کی شرائط موجود ہیں ان ان شعبوں میں، ان ان طریقوں سے جہادی عمل اپنانے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طور پر وہ اپنے اس فرض کو پورا کر سکیں گے جو ان کے اوپر غلبۂ اسلام، اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کے ناموں کے ساتھ عائد ہوتا ہے اور اس سلسلے میں انہیں اپنے پیش نظر خاص طور سے ملکی دور کو رکھنا ہوگا۔ اپنی اصلاح کریں، منظم ہوں، حقانیت و دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں اور پرانے اور نئے ہر طرح کے کافرانہ اور مادہ پرستانہ نظریات کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائیں اور اسی راہ میں ساری متاعِ زندگی لگا دیں، یہاں تک کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا منظر نصیب ہو یا پھر اپنے رب سے جا ملیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے کوئی صحیح راہ نہیں ہے۔'' (دارالحرب اور دارالاسلام، ص:47)

ملت کا دفاع

تقسیم ہند کے بعد ہی سے بھارت میں مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ فسادات منظم ہوتے تھے اور حکومت کی پشت پناہی میں ہوتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کسی بھی فساد کے مجرموں کو سزا نہیں ہوئی اور نہ ہی فسادات کے خلاف سخت قوانین ہی بنائے گئے۔ ایسے میں ملت اپنے جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کیسے کرے یہ ایک بڑا سوال ہے؟ لیکن بدقسمتی سے علماء نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ چنانچہ اس بات کا شکوہ مولانا مرحوم اپنی کتاب ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' نامی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں:

''بھارت میں علماء نے حالتِ جنگ کی حالت کو کبھی نگاہوں کے سامنے رکھا ہی نہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں جتنی فقہی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں جہاد کا باب عام طور سے ہوتا ہی نہیں جبکہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال سے پہلے کی کتابوں میں جہاد کا باب کتبِ فقہ میں برابر ملے گا۔ البتہ موجودہ دور میں جن علاقوں کے مسلمان دشمنانِ دین سے کشمکش کر رہے ہیں، ان کے یہاں جہاد موضوعِ گفتگو بنا ہے اور ان کی نظر اس عنوان پر زیادہ گہری پڑی ہے۔'' (ملت کے دفاع کا مسئلہ، ص:15)

اس ضمن میں دوسری بڑی غلطی ہم سے یہ ہو رہی ہے کہ ہم انہیں فرقہ وارانہ فسادات سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا سمجھنا نادانی ہے۔ یہ ایک منصوبہ بند طریقہ ہے جو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ مولانا کو اس کا بخوبی ادراک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے فرقہ وارانہ فساد کہنا اور سمجھنا ایک بہت بڑی نادانی ہوگی۔ اگر دوسرے لوگ اس کو فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں تو ان کی طرف سے ایک کھلی حقیقت کو جھٹلانے اور مسلمانوں کو دھوکہ میں رکھنے کے ہم معنی ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا اطلاق کسی وقتی اور جذباتی واقعہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی گڑبڑ پر ہوتا ہے جس کے پیچھے نہ کوئی سیاست ہوتی ہے اور نہ کوئی سازش بلکہ جیسے دو پڑوسیوں میں کسی بات پر ہاتھا پائی صبح کو ہوئی اور شام تک معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور بات آئی گئی ہو گئی، لیکن اس کے برخلاف اس وقت آل انڈیا پیمانے پر منظم کی گئی تنظیموں کے بنائے ہوئے منصوبوں کے تحت ایک خاص مقصد کے لیے بہت بڑے پیمانہ پر اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس مقصد کو ایک جملہ میں یوں ادا کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے دو ہی استھان، پاکستان یا قبرستان۔ یعنی مسلمانوں کو یا تو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا پھر انہیں زندہ دفن کر دیا جائے۔ مسلمان بن کر یا اپنے جملہ تشخصات کے ساتھ انہیں ہندوستان میں رہنے نہیں دیا جائے گا۔ یہ نعرہ کسی ایک بستی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں لگایا جا رہا ہے۔ اس نعرہ کو سن کر

کسی انتظامیہ کو حرکت میں آتے دیکھا گیا اور نہ کسی عدلیہ کے کان پر جوں رینگی۔ ان وجوہ کی بنا پر اس صورتحال کو فرقہ وارانہ فساد کے بجائے مسلمانوں کی نسل کشی کی مہم اور ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کی مسلط کی ہوئی جنگ قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا۔'' (ملت کے دفاع کا مسئلہ، ص:3)

جب ان فسادات پر قابو پانے یا شرپسندوں سے مقابلہ کی بات ہوتی ہے تو بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھارت میں ایک دستور ہے، ہمیں آزادی ہے کہ اس کے تحت اپنے حقوق کی لڑائی لڑیں۔ یہ بھی ایک قسم کا نادانی بھرا تجزیہ ہے۔ اس سوچ پر مولانا لکھتے ہیں:

''کہنے کے لیے ہندوستان کا ایک دستور ہے اور ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری سیکولر حکومت اس جنگ میں کیا رول ادا کر رہی ہے؟ مسلمانوں کے ساتھ، ان کی زبانوں کے ساتھ، ان کے بڑے بڑے اداروں جامعہ عثمانیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ عام سول اور فوجی شعبۂ جات میں مسلمانوں کے تعلق سے کیا رویہ اختیار کیا گیا۔ 9 ہزار سے زیادہ فسادات میں ہزاروں بچے یتیم ہوئے، ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں، ہزاروں ماں باپ نے اپنے بچوں کو خون میں لت پت اور آگ میں جھلسا ہوا دیکھا لیکن اس سیکولر حکومت نے دو چار مجرمین کو بھی سزائے موت دے کر انہیں کیفرِ کردار تک نہیں پہنچایا بلکہ اس کے برعکس یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ان جنگجوؤں کی صرف پشت پناہی ہی نہیں معاونت سرکاری مشینری نے کی ہے، اور مسلمانوں کے زبردست جانی و مالی نقصانات اسی وقت ہوئے ہیں جب پولیس اور نیم فوجی کمپنیوں نے بحالی امن وامان کے لیے کارروائی کی ہے۔''
(ایضا،4-5)

دراصل یہ دوقومی جنگ ہے اور ہم مستقل حالتِ جنگ میں ہیں۔ دشمن کسی بھی حال میں ہمیں امن سے نہیں رہنے دے گا۔ یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے کہ اہلِ ایمان کو امن سے رہنے دے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس حالت جنگ کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی حکمتِ عملی طے کریں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''پوری اسلامی تاریخ میں کہیں یکسانیت نہیں ملے گی اپنے ملک میں دیکھیے۔ ایک صدی کے اندر اندر کیسے کیسے حالات بدلے ہیں۔ اور علماء نے کس طرح مسائل پر سوچا ہے اور نتائج اخذ کیے ہیں اور اس کے مطابق حکمتِ عملی اپنائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز، مولانا اسماعیل شہید، سید احمد بریلوی، مولانا محمود الحسن، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے کو حالتِ جنگ میں سمجھ کر اقدامات کیے ہیں۔ آج فلسطین اور افغانستان میں علماء حق جو کچھ کر رہے ہیں اپنے کو حالتِ جنگ میں سمجھ کر کر رہے ہیں۔ جن کی جرأت اور پامردی کی آج ہم اپنی آرام گاہوں میں بیٹھ کر داد دیتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ہم کیوں نہ

سمجھیں کہ ہم جس حالتِ جنگ میں گھرے ہوئے ہیں وہ اپنی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ ہم کو اسی کو بنیاد بنا کر سوچنا ہے۔'' (ایضاً، ص:9)

حالتِ جنگ کے الگ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''حالتِ جنگ میں کسی کی جان اور مال محترم نہیں رہتے اور نہ یہ اصول باقی رہتا ہے کہ جس نے میرے بھائی کو مارا ہے اسی کو ماروں اور جس نے میرا مال لیا ہے اسی سے بدلہ لوں، بلکہ دشمن قوم کا ہر فرد دشمن ہے بالخصوص وہ فرد جو جنگجو ہو۔'' (ایضاً، ص:10)

اس حالتِ جنگ میں ضروری ہے کہ جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کو پروان چڑھایا جائے اور اپنی استطاعت کے بقدر دفاع کی حکمتِ عملی تیار کی جائے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''جس طرح حسبِ استطاعت پورے دین کو ماننا اور اپنانا ضروری ہے اسی طرح شرعی طور سے متعین کردہ حکمتِ عملی جہاد کو بھی استطاعت کے مطابق ضروری شرائط کی موجودگی میں اپنانا ضروری اور تقاضائے دین وایمان ہے۔'' (ایضاً، ص:14)

بھارت میں ہمارے اہلِ علم ان دفاع کی کوششوں کو مختلف بہانوں سے رد کرتے ہیں۔ ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے لیے جماعت اور امیر کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اس وقت بھارت میں ایسی جماعت اور امیر نہیں ہے اس وجہ سے یہ جائز نہ ہوگا۔

مولانا اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ جہاد کے لیے کسی شرعی بنیاد کی نفی جن مزعومات کے تحت کی جاتی ہے ان کو صحیح مان لیا جائے تو کسی کام کے لیے کوئی انجمن اور جماعت بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ساری انجمنیں اور جماعتیں اپنے اپنے کاموں کی اہمیت بتانے کے لیے اور اپنے کارکنوں میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لیے انہیں آیات اور احادیث اور انہیں مسلمات کو پیش کرتی ہیں جو صریح طور سے جہاد کے لیے قرآن وحدیث میں ہمیں ملتی ہیں۔ مگر جب جہاد کا نام لیا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے گنجائش نہیں ہے۔''

(ایضاً، ص:23)

شریعت میں جہاد کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں: اقدامی اور دفاعی۔ اقدامی جہاد کے سلسلے میں متعدد شرائط ہیں لیکن دفاع کے سلسلے میں اقدامی جہاد کی ساری شرطیں ختم ہوجاتی ہیں اور ہر کسی کے لیے دفاع فرضِ عین ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دفاع کا راستہ اختیار کرنا شرعی اعتبار سے درست اور مسلمانوں کے مفاد میں بھی ہوگا۔ مولانا کے سامنے دفاع کا یہی شرعی پہلو ہے جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو دفاع کی دعوت دیتے

ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''احکام اور شرائط کے اعتبار سے اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد میں آپ کو فرق ملے گا۔ اقدامی جہاد فرضِ کفایہ ہوتا ہے، لیکن دفاعی جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اقدامی جہاد میں تعداد کا، جنگی سامان اور وسائل کا لحاظ اور اعتبار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقدامی جہاد میں کئی اور لوگوں سے اجازت لینی ہوتی ہے مثلاً غلام کو اپنے آقا کی اجازت درکار ہوگی، لیکن دفاع کے موقع پر نہ تعداد کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وسائل جنگ کی کمی بیشی دیکھی جاتی ہے اور نہ کسی کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ہر ایک کو ہر حالت میں حسبِ استطاعت دفاعی جہاد میں شرکت کرنی ضروری ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص:23-24)

قضیہ بابری مسجد

تقسیمِ ہند کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا ملّی مسئلہ بابری مسجد کا رہا ہے۔ بابری مسجد ملّی غیرت و حمیت کا استعارہ بن گئی۔ دوسری طرف ہندتوا شدت پسند تنظیموں نے حکومت کے تعاون سے اس موضوع کو اپنے عروج کا مرکزی نکتہ بنالیا۔ قانونی، تاریخی اور شرعی لحاظ سے بابری مسجد ایک صاف وشفاف مقام پر تعمیر ہوئی لیکن ان تمام حقائق کو پرے رکھتے ہوئے ہمیشہ ہندو فریق کو نظام سے سپورٹ ملا اور بالآخر آستھا کی بنیاد پر ہندوؤں کے حوالے کر دی گئی۔

بابری مسجد کا قضیہ جب عروج پر پہنچا تو کئی دانشور اور علماء نے بابری مسجد کو ہندوؤں کے سپرد کرنے کی وکالت کی اور اس کے لیے کسی قسم کی جدوجہد کو خودکشی تک قرار دے دیا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے اس قضیہ پر قلم اٹھایا اور سارے اعتراضات کا دندان شکن جواب دے کر ملت کو سمجھوتہ سے بچانے کی راہ دکھائی۔ آپ نے نصوص سے ثابت کیا کہ دنیا کی ساری مساجد بشمول بابری مسجد اللہ کی امانت ہیں اور کوئی اس کو خرید وفروخت نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہدیہ کر سکتا ہے۔ اس کی جگہ بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

مولانا نے سب سے پہلے مسلمانوں کی حمیت کو بیدار کیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی کا حاصل کیا ہے۔ یہ اگر واضح رہے تو پسپائی کی ذہنیت سے انسان محفوظ رہے گا۔ لکھتے ہیں:

''زندگی میں اصل اللہ کے لیے اپنے آپ کو کھپانا اور حق کے لیے راہِ خدا میں شہید ہو جانا ہے۔''

(بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، ص:21)

جو لوگ بابری مسجد سے دستبرداری کی وکالت کرتے ہیں اگر ان کے پاس کوئی شرعی بنیاد ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن ہندوؤں کا ڈر اور خوف دلا کر دستبرداری ایک بزدلانہ اور مجموعی طور پر پسپائی والا عمل ہوگا۔ جبر کی بنیاد پر اگر وہ ہم سے چھین لی جاتی ہے تو یہ ایک دوسری بات ہوگی لیکن آگے بڑھ کر بغیر جدوجہد کیے حوالے کر دینا

کسی اعتبار سے درست نہ ہوگا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''حق یا باطل، صحیح یا غلط کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے کی تلقین کرنا اور ترغیب دینا الگ بات ہے لیکن خوف اور ڈر کی بنیاد پر کسی موقع پر مسلمانوں کو جھکانا نہایت خطرناک چیز ہے۔ جس گروہ کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی اس کو دنیا کی کوئی طاقت بھی عزت کے مقام پر نہیں بٹھا سکتی۔ عزت و وقار کا منبع ایمان و یقین کے ساتھ اعلیٰ ظرفی، بلند خیالی اور علوِہمتی ہے۔ مسلمانوں کو خیرامت اور اعلون ہونے کا اذعان دیا گیا کیونکہ ذہن و دماغ جس کے مرعوب ہوں گے وہ گروہ دوسروں کے مقابلے میں کیا کھڑا ہوگا۔''

(بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، ص:22-23)

مسجد کا احترام اور اس کی حفاظت ہمیشہ سے مسلمانوں کے نزدیک متفقہ مسئلہ رہا ہے۔ اگر اس کے لیے کھڑے نہ ہوسکے تو پھر کسی بھی چیز کے لیے استقامت بہت مشکل ہو جائے گی۔ مولانا اس کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسجد تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر مانی ہوئی اور قابلِ احترام چیز ہے۔ اگر مرعوبیت اور ڈر کی وجہ سے اس کے لیے بھی کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو وہ کسی چیز کے لیے اور کسی موقع پر بھی کھڑے نہیں ہوسکتے۔ ترشول اور تیر دیکھ کر ایک مسجد حوالے کریں گے تو دوسری اور تیسری مسجد محض ڈنڈا دیکھ کر ہی چھوڑ دیں گے۔ اور چوتھی کا جب مسئلہ پیش ہوگا تو ایک ڈانٹ اور ایک دھمکی ان کے لیے کافی ہوگی بلکہ اس کے بعد یہ نوبت آسکتی ہے کہ مسلمان اپنے ہاتھوں مسجد کو توڑیں گے اور اپنے پیسوں سے بت خانہ تعمیر کریں گے کیونکہ ان کے تصور میں اس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ ہوگا۔ بابری مسجد کے محاذ پر 20 کروڑ مسلمان ہار مان کر مرعوب ذہنیت کے ساتھ اپنی زندگی بچانے کے لیے مسجد کو بت خانہ بنانا برضا و رغبت قبول کرلیں تو صدیوں ان کے اندر زندگی اور بلند ہمتی پیدا ہونا مشکل ہے۔'' (بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، ص:24)

مجموعی طور پر اگر مسلمان اس محاذ پر ڈٹے رہتے ہیں تو اس کے کیا فوائد ہوں گے؟ مولانا لکھتے ہیں:

''اس کے برخلاف اس محاذ پر مسلمان اگر ڈٹے اور جمے رہتے ہیں تو دو امکان ہیں: ایک یہ کہ اس سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوگی اور ان کے حوصلے بلند ہوسکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ سامنے والے گھٹنے ٹیک دیں۔ اور اگر بالفرض یہ نہ ہوا تو اتنا ضرور ہوگا کہ مسلمانوں کی دوسری چیز پر ہاتھ اٹھانے کے لیے انہیں سو بار سوچنا پڑے گا اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس راہ میں مسلمان جان و مال کی جو قربانی دیں گے وہ رحمت خداوندی کو ان کی طرف متوجہ کرنے والی ہوگی۔'' (بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں، ص:25)

پوری اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کی کسی چیز کی خاطر قربان ہوجانا لوگوں نے گوارا کیا لیکن اس

کی بے حرمتی پر مداہنت اختیار نہیں کی۔ مولانا لکھتے ہیں:

''پوری اسلامی تاریخ میں کسی واقعہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں پوری ملت نے محض جان بچانے کے لیے کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہو یا شعائر اسلامی کے کسی جزء کی بے حرمتی کی قیمت پر اپنے آپ کو بچایا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ایک مضطر آدمی سور کا گوشت نہ کھائے اور مر جائے تو یہ خودکشی اور حرام موت ہوگی لیکن کسی اسلامی، قابل احترام چیز کی حفاظت میں کوئی شخص اپنی جان دے دیتا ہے تو وہ شہید ہوگا۔'' (ص:25)

غرض یہ کہ مولانا اس معاملے میں امت کو عزیمت اور عزت کی راہ دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ ملت کو لاچار بالکل نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملت اپنے شعائر کی حفاظت جان و مال سے کرے اور اس معاملہ میں اپنی تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھے۔

مسلم سیاست

تقسیم ہند کے بعد بھارت میں موجود مسلمانوں کا سیاسی لائحہ عمل کیا ہو، اس کا آج تک کوئی متفقہ حل نہیں نکل سکا ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ اس ملی قضیہ کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اب تک کی سیاست کا مجموعی جائزہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''جو گروہ بھی سیاست سے کنارہ کش رہے گا وہ بیل گھوڑے کے مانند ہوگا۔ ہندوستان میں مسلم قوم کا یہی حال ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب انہوں نے ایک بزرگ کے زیرِ صدارت یہ فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کی علیحدہ کوئی سیاسی تنظیم بنانا صحیح ہے نہ مفید، اسی وقت گویا یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ مسلمان اس ملک میں ہمیشہ کے لیے غیروں کے تابع بن کر رہیں گے اور وہ بحیثیت قوم و ملت کبھی بھی عزت کے مقام پر نہیں بیٹھیں گے۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:2)

''چنانچہ ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ان کا عقیدہ، ان کا دین حتی کہ ان کا پرسنل لا، ان کی کتاب، ان کی تہذیب اور زبان، ان کی عبادت گاہیں وغیرہ سب ہمہ جہت حملوں کی زد میں ہیں اور ان کا کام التجا اور گزارش کے سوا کچھ نہیں رہا۔ یہ جو کچھ ہوا وہ بالکل فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر ہوا۔ ہم میدان سیاست میں اگر اترے تو دوسروں کے دست نگر اور محتاج بن کر غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے سائل اور ایسے بھکاریوں کے روپ میں آئے جن کو ہر در سے نامراد واپس کیا گیا۔

سیاسی موضوع پر سوچتے وقت پہلا سوال یہ آنا چاہیے کہ سیاسی اعتبار سے وہ کیا مقصد ہے جسے ہمیں حاصل کرنا ہے اور وہ کونسی منزل ہے جس تک ملت اسلامیہ کو پہنچنا ہے۔ اس سوال کا جواب شریعت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ مگر اس رخ پر سوچا نہیں گیا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب ہماری موجودہ سیاسی سرگرمیوں کو

دیکھنے سے یہ ملتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح وہ حقوق حاصل کرسکیں جو انہیں دستور ہند نے دیئے ہیں۔ گویا مسلمانوں کی ساری سرگرمیوں کا محور حقوق طلبی اور دستور ہند کے چوکھٹے میں رہ کر ترقیوں کی منزلیں طے کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے متعدد فارمولوں کو گذشتہ پچاس سالوں میں اپنایا گیا ہے۔ سیاسی تنظیمیں قائم کرکے، جیسے مجلس اتحادالمسلمین، مسلم مجلس، مسلم لیگ۔ دوسرا یہ کہ مسلمان انفرادی طور پر جس سیاسی پارٹی میں چاہیں جائیں لیکن مسلم مفاد کے لیے کام کریں۔ ایک تیسرا فارمولا یہ کہ مسلمان دوسرے اقلیتی اور پس ماندہ طبقوں سے مل کر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ دیکھا جائے تو مسلمان مذکورہ بالا فارمولوں کے اردگرد گھوم رہے ہیں جس کی ایک بڑی مثال 1999 میں پانچ بڑی ملی جماعتوں کا تیارشدہ ایجنڈا ہے جو صرف ایجنڈا رہ گیا۔

مسلمانوں کی لاچاری کی آخر وجہ کیا ہے کہ پچاس سال کے دوران کوئی نسخہ کام نہ آیا اور کوئی دوا بھی ان کے درد کا درماں ثابت نہیں ہوئی جب کہ اسی سرزمین پر دوسری اکائیاں بھی ہیں جو اپنے مسائل کا حل نکال لیتی ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جمہوریت کو کما حقہ پہچانا نہیں۔ بحیثیت مجموعی انھوں نے سادہ لوحی کا ثبوت دیا۔ انہیں جمہوریت کے فریب میں صرف مبتلا ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہلا بہلا کر فریب میں رکھا گیا۔

مسلمانوں نے حاکمیتِ الٰہ کی بنیاد پر سیاست کو چھوڑ کر حاکمیتِ جمہور والی سیاست کو اپنایا۔ لیکن جمہوریت کو ماننے کا بھی حق ادا نہ کرکے خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ آخرت کا انجام روزِ قیامت معلوم ہوگا، دنیا کے خسران کا رونا تو ہر ایک رو رہا ہے۔ دین کے رمز شناس اور جدید دور کے باطل نظریات کے نباض نے کہا تھا کہ جمہوریت میں حقوق ملتے نہیں بلکہ چھینے جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں نے عام طور پر یہی سمجھا کہ جمہوریت نے آنسو بہانے اور رونے کا حق دیا ہے۔ اس کے بعد جس نے ہمدردی کا اظہار کیا اور حسین لفظوں میں حسین وعدے کیے اس کو الیکشن میں ووٹ دیا۔ اور جب وعدہ کرنے والوں نے وعدہ پورا نہیں کیا تو گلہ اور شکوہ کیا حالانکہ جمہوریت نے جہاں گلہ شکوہ کرنے، رونے دھونے اور مطالبات کی فہرست پیش کرنے کا حق دیا تھا، وہیں اس نے جدید ہتھیار بھی دیئے تھے لیکن مسلمانوں نے ان ہتھیاروں کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کی مثال اس گائے جیسی ہے جو صرف دودھ دینا جانتی ہے، نہ سینگ چلاتی ہے اور نہ لات مارتی ہے۔ مسلمان ووٹ دے کر کامیاب کرتے ہیں لیکن کامیاب ہونے والا اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے تو وعدے یاددلانے کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

جمہوریت کے جدید ہتھیاروں میں اسٹرائیک، دھرنا دینا، ریلی کرنا، پہیہ جام کرنا اور جیل بھرو کے پروگرام

ہیں۔قطع نظر اس میں کیا صحیح اور کیا غلط، جن لوگوں نے اپنی کوئی بات منوانے کے لیے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا ان کی بات کسی نہ کسی درجہ میں مانی گئی۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:24-25)

''مختصر یہ کہ مسلمانوں نے ایک غلط اور غیر مفید نسخہ دوا ساز سے بندھوایا مگر استعمال اس کو بھی پورا نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ان کا مرض کیسے ختم ہوتا اور ان کے دکھ درد کا کیسے مداوا ہوتا۔حکمراں طبقہ ہمیشہ طاقت کی زبان سمجھتا ہے۔طاقت خواہ کسی طرح کی ہو۔''

سوال یہ ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج کیا ہے؟

''اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج ایسے نسخے سے ہوگا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہو۔لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔''اس امت کے بعد والے لوگ اسی چیز سے درست ہوں گے جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔'' یہ صحیح اور سچی ایمان کی بات ایسے ہمارے دماغوں سے نکل گئی ہے کہ ہمارا بڑے سے بڑا آدمی بھی ملک وملت کے سدھار اور نجات کے موضوع پر بولتا ہے تو یہی بولتا ہے کہ ہمارے سارے امراض کا علاج جمہوریت اور سیکولرزم کی بقاء اور استحکام میں ہے۔یہ بولنے کی ہمت اور توفیق نہیں ہوتی کہ سارے جہاں کی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا اسلام میں ہے، قرآن میں ہے۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:27)

مسلمانوں سے ایک بڑی غلطی اپنے مقام کے تعین میں ہوتی ہے۔چنانچہ اس رویہ پر مولانا لکھتے ہیں:

''مسلمان اپنی حیثیت اور مقام کا تعین دستور ہند کی روشنی میں کرنے لگتا ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں نہیں۔ یعنی وہ دستور ہند کے ماتحت ہیں، قرآن وسنت کے ماتحت نہیں۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:28)

قرآن کے مطابق اپنے کو اقلیت اور بے مایہ تصور کرنا، پس ماندہ طبقات میں شمار کرنے کے لیے درخواست کرنا اور تحفظات کی بھیک مانگنا کسی طرح امت مسلمہ کو زیب نہیں دیتا۔اس جانب توجہ دلاتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو خیرِ امت اور اُمت وسط کا لقب دیا گیا ہے۔اس کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے سوالی بن کر نہ آئے بلکہ اللہ کے بندوں کو مادی اور روحانی ہر اعتبار سے دینے والا انھیں بننا ہے اور اونچے مقام پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو بتانا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؟ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ پھر اس کی حیثیت صرف واعظ اور ناصح کی بھی نہیں ہے، دنیا میں عدل وقسط قائم کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:31)

آخر میں مولانا مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ سابقہ فارمولوں کو چھوڑ دیں۔ان کو دوہرانا باعث نقصان ہی

ہوگا۔ اس کے بعد مولانا مسلمانوں کو ان کے منصبی ذمہ داری کے تناظر میں ایک فارمولا پیش کرتے ہیں:

''مسلمان اب تک کے استعمال شدہ فارمولوں کو چھوڑ دیں اور کوئی نیا فارمولا تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مشن غلبۂ دین کو چھوڑ کر حقوق طلبی کی سیاست نے ملک کی اکثریت کو جو ہمارا دشمن بنا دیا ہے ممکن ہے اس میں کچھ کمی ہوجائے اور فسطائی قوتوں کو غذا ملنی بند ہوجائے، یہ ایک عارضی فائدہ ہوسکتا ہے۔ سیاسی مفادات کی بنا پر جو اختلافات ہمارے اندر پیدا ہوگئے ہیں ان میں بھی کمی واقع ہوجائے گی۔ اقتدار و دولت میں حصہ داری اور دوسرے مطالبات، اسمبلیوں میں نمائندگی اور ملازمتوں کے لیے کشمکش ترک کردیں۔ یہ کوئی منفی کام نہیں ہے بلکہ غلط لائن چھوڑ کر صحیح لائن پر گاڑی ڈالنا ہے۔ وہ صحیح لائن یہ ہے:

① بلا کم و کاست پورے دین کی دعوت دی جائے۔ نہ کسی سے مرعوب ہوا جائے اور نہ کسی سے خوف کھایا جائے۔ مذاہب کی جانب سے عبادت میں پیدا کیے ہوئے شرک کے خلاف بھی آواز لگائی جائے اور اطاعت مطلقہ میں جدید نظریات کے شامل کیے ہوئے شرک کی بھی تردید کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ جس طرح بتوں کی پوجا انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اسی طرح انسان پر انسان کی حکومت بھی تباہی کا موجب ہے خواہ فسطائیت کی شکل میں ہو یا جمہوریت کی صورت میں۔ عبادت اور اطاعت دونوں کے سلسلے میں توحید کے کھرے کھرے تقاضے پیش کیے جائیں۔

② اپنے تحفظ اور حقوق کو ایشو بنانے کے بجائے پوری خلق خدا کی فلاح و بہبود کے لیے مہم چلائی جائے اور ہر موقع پر ان کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے۔ ظلم و ناانصافی جہاں بھی ہو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے اور نیکی و اچھائی کی تائید بلا کسی تعصب اور ذات اور برادری کے امتیاز کے بغیر کی جائے۔

③ دورِ جدید کے جدید ہتھیاروں مثلاً اسٹرائیک، مظاہرے، جلسے جلوس، دھرنا، پہیہ جام کرنا وغیرہ کو ان کی قباحتوں سے بچتے ہوئے منکرات کے مٹانے اور نیکی و بھلائی کی ترویج میں استعمال کیا جائے جبکہ دوسرے لوگ محض اپنے معاشی مفادات کے لیے یہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔

④ ملک کی اکثریت سے اگر کوئی مطالبہ کرنا ہے تو یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیتی گروہ نہیں بلکہ ایک صاحب عقیدہ نظریاتی گروہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور ایسی عدالتیں ہمارے لیے قائم کی جائیں جن میں مسلمانوں کے آپسی مسائل کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں کیا جائے اور ان کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت قبول کرے۔ اوقاف کا پورا نظم و انصرام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، عصری اور دینی دونوں تعلیم کا نظم بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔'' (ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟ ص:35)

بھارت کے تناظر میں میرے علم کے مطابق مولانا مودودیؒ کے بعد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ دوسرے ایسے

عالم دین ہیں جنہوں نے بھارت میں مسلمانوں کی سیاست کو انکی منصبی ذمہ داری کے تناظر میں اختیار کرنے کی صلاح دی ہے۔ مولانا مودودیؒ کے بتائے ہوئے طریقہ کو اب تک سنجیدگی سے اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ اب تو اس کے خلاف خود جماعت اسلامی کا رخ ہو چکا ہے۔ مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کے فارمولے پر ملت کب توجہ دے گی یہ مستقبل میں پتہ چلے گا۔ البتہ حالات جس طرح بگڑتے جا رہے ہیں، دیر یا سویر مسلمانوں کو اپنی منصبی ذمہ داری کے تناظر میں اپنے سیاسی رول کو ادا کرنا ہی پڑے گا۔

فکری مسائل

فکر اسلامی

تحریکِ اسلامی کا کبھی حصہ رہے وحید الدین خان صاحب بعد میں تحریک اسلامی کے فکری، نظریاتی اور عملی حریف بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہر اس اسلامی فکر اور مسلمانوں کے مقدمات کے خلاف انہوں نے جم کر لکھا جس سے انقلاب یا باطل سے کشمکش ظاہر ہو رہی ہو۔ اللہ نے انہیں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی تحریروں سے بہت سارے لوگ متاثر بھی ہوئے۔ اس وقت جماعت اسلامی ہند کا ایک قابل ذکر اور مؤثر طبقہ خان صاحب کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔

خان صاحب کی ایک کتاب 'فکر اسلامی' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ توقع کے مطابق تحریک اسلامی کے افکار کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ تحریکی حلقہ میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے اس کا پوسٹ مارٹم ضروری سمجھا اور ''اسلامی فکر کیا ہے'' کے عنوان سے مدلل اور مسکت جواب دے کر اس گمراہ کن کتاب کی اثر پذیری پر کامیابی سے بند باندھنے کی کوشش کی۔ ہم میں سے بہت سارے لوگوں کے سامنے جب اسلام پسند یا تحریک اسلامی کے افراد کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو سوال اٹھتا ہے کہ اس سے مراد کون ہیں؟

مولانا محترم اس کا جواب دیتے ہیں:

> ''اسلام پسند اور تحریکات اسلامی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دماغوں میں اسلام کو حکمراں بنانے، اسلام کو غالب کرنے اور اسلامی قوانین کو جاری و نافذ کرنے کی آرزوئیں اور نظریات پرورش پا رہے ہیں اور جو مخالف اسلام عقائد، خیالات اور افکار کا علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مقابلہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔'' (فکر اسلامی کیا ہے، ص:6)

خان صاحب نے مولانا مودودیؒ کے اوپر الزام لگایا کہ وہ انقلابی فکر کے حامل تھے جو کلمہ لا الہ الا اللہ کے سیاسی مفہوم کا نتیجہ نہیں بلکہ زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ نبی ﷺ کے زمانے میں کلمہ طیبہ کو برداشت نہیں کیا گیا

جب کہ آج کا دور رواداری کا ہے، اگر مودودیؒ صاحب کو یہ فہم ہوتا تو قطعاً انقلابی رخ اختیار نہ کرتے۔

مولانا محترم خان صاحب کے اعتراض کو ایک جملے میں یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ

''سید مودودیؒ اسلام کو محض انقلابی تحریک ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہر اعتبار سے اسلام کو مکمل سمجھتے تھے۔''

(فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:10)

خان صاحب بُعد زمانی کے عامل کو ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ صحابہ کو اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، وہ جبر کا دور تھا اب رواداری کا دور ہے۔ جماعت اسلامی تقسیم ہند تک دس سالوں تک سیاسی مفہوم میں کام کرتی رہی لیکن کوئی پریشانی نہیں آئی۔

مولانا محترم اس نادانی بھرے اعتراض کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان میں متعدد بار جماعت کے افراد جیل گئے ہیں، یہاں تک کہ سید مودودیؒ کو پھانسی کی سزا بھی تجویز کی گئی۔

مزید لکھتے ہیں:

''اب مذہبی آزادی کا دور ہے اور پہلے مذہبی جبر کا دور تھا۔ یہ تاریخ کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب بے لاگ لپیٹ اور غیر لچکدار انبیائی طریق دعوت اپنایا جائے گا تو کشمکش اور محاذ آرائی سے مفر نہیں ہوگا۔ اس دور میں ترقی یہ ہوئی ہے کہ مذہب اور سیاست کی قدیم لڑائی کو ختم کرنے کے لیے اہل سیاست نے صلح کی ایک راہ نکالی ہے۔ اہل مذہب کی طرف سے نہیں بلکہ اہل سیاست کی جانب سے کمپرومائز کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ اہل سیاست کے پاس سارے وسائل و ذرائع ہیں اس لیے انہوں نے یہ فضا پیدا کر دی ہے۔ سیکولر اہل سیاست کی جانب سے یہ پہلو تو بیان کیا جاتا ہے کہ سب کو مذہبی آزادی اور یکساں حقوق ملیں گے لیکن دوسرا پہلو غائب کر دیتے ہیں کہ اجتماعی اور سیاسی امور میں کسی مذہب کو دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ اس مقام پر پہنچ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جن مذاہب میں اجتماعی زندگی کے معاملات سے متعلق ہدایات نہیں ہیں ان کا اس فریب میں مبتلا ہونا قرین قیاس ہے لیکن جن کے پاس زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی موجود ہو وہ کیسے اس فریب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔''

(اسلامی فکر کیا ہے؟ ص:15)

خان صاحب کو اس بات پر بڑی تکلیف ہے کہ مسلمان امامت اقوام کے نظریہ کے اسیر ہیں۔ اس نام نہاد انقلابی نظریہ کے لیے قرآن یا حدیث رسولؐ میں کوئی دلیل نہیں۔ مولانا محترم خان صاحب کی مذکورہ بالا باتوں پر چند سوالات کھڑے کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں:

''دنیا کی کونسی قوم ہے جو اقوام عالم کی حاکم بننے کی تمنا نہیں رکھتی؟ ہمارے ملک میں ایک کمیونٹی اس کے لیے

کون کون سے حربے نہیں اپنا رہی ہے؟ اس تناظر میں اپنی پست ہمتی، مرعوبیت اور ذہنی وفکری زوال کو دیکھیے کہ غلبہ اور عزت کی سوچ بھی ذہن ودماغ سے نکال دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کیا یہ طرزِ فکر کسی قوم کو اپنے مقام پر باقی رکھ سکتا ہے، چہ جائیکہ عزت اور وقار سے ہمکنار کرے۔'' (فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:30)

پھر خیرِ امت، شہادتِ حق، عدل کے قیام، قتال کی مشروعیت کا کیا مطلب ہوا؟ جو فرد بھی ذرا سا غور کرے گا وہ جان لے گا کہ مذکورہ بالا ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے قائدانہ پوزیشن ضروری ہے۔ خان صاحب نظریۂ ملت کو بھی ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:

''انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی ضرورت کے تحت نہ کہ شرعی تقاضے کے تحت ساری مسلم دنیا میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ ذہن دیا کہ اسلام ایک عالمی قومیت ہے۔''

مولانا محترم اس پر سخت گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شرعی تقاضے اور سیاسی ضرورت میں کیا کوئی ایسا تضاد ہے کہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے؟ حالانکہ ایک ہی چیز سیاسی ضرورت بھی ہوسکتی ہے اور شرعی تقاضا بھی۔ جہاں تک عالمی اخوت اور قومیت کا تعلق ہے تو چودہ سو سال پرانے ذہن کی پیداوار ہے۔ یہ کوئی سو دو سو سال کا نظریہ نہیں ہے۔''

(فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:40-41)

''جو کوئی ملت اسلامیہ کو ایرانی، تورانی اور افغانی کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کو اپنے قلب ونظر کے سارے گوشوں پر خود ناقدانہ نظر ڈال کر جائزہ لینا چاہیے کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ جن کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں ان کی ہر بات کو لازماً لائق ملامت ٹھہرائیں۔'' (فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:42)

خان صاحب ایک مقام پر اسلام کا اصل مقصد بیان کرتے ہوئے ہر حد سے گزر گئے۔ لکھتے ہیں:

''اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا، اسلام کا اصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔''

خان صاحب کی ساری ذہنی اور فکری بیماری مذکورہ بالا جملوں میں سامنے آگئی ہے۔

مولانا محترم لکھتے ہیں:

''اسلام کا مقصد دل کا بدلنا بھی ہے اور ہاتھ پیر اور پورے اعضاء وجوارح کو بدلنا بھی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے، اس کا مقصد مکمل تبدیلی ہے اور وہ پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ انسانی زندگی کا نجی شعبہ ہو یا خاندانی، معاشرتی ہو کہ سیاسی سب پر اسلام اللہ اور اس کے رسول کی حکمرانی چاہتا ہے۔ ہر جگہ

سے منکرات اور منکرات کے ایجنٹوں کو نکالنا چاہتا ہے۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اصل مقصود حکومت ہے؟ مقصود حکومت نہیں ہے لیکن اصل مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ وضو مقصود نہیں ہے لیکن وضو کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی اس لیے وضو فرض ہے۔ معرکہ بدر و حنین مقصود نہیں تھے لیکن فتح مکہ کے لیے ضروری تھے، پھر فتح مکہ بھی مقصود نہیں تھا مگر تطہیر کعبہ کے لیے فتح مکہ لازمی تھا۔ نیز تطہیر کعبہ بھی مقصود نہیں لیکن رضائے الٰہی کے لیے کعبہ کو پاک کرنا لازمی تھا۔'' (فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:46)

خان صاحب یہی نہیں کہتے کہ مسلمان حاکم بننے کی ذہنیت سے باز آجائیں بلکہ وہ اس پر بھی گلہ کرتے ہیں کہ حالتِ محکومی میں زندگی گزارنے کے بارے میں ہماری فقہ رہنمائی کیوں نہیں کرتی؟

خان صاحب ہی کے الفاظ دیکھیں:

''موجودہ فقہ خلافت عباسی کے زمانے میں بنی۔ اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمران حیثیت میں ہوں تو ان کے لیے شرعی احکام کیا ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمراں حیثیت میں پائیں تو اس وقت ان کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ تو آپ کو اس کا واضح جواب مدون فقہ میں نہیں ملے گا۔''

مولانا محترم اس غلامانہ ذہنیت پر مجاہدانہ انداز میں قلم چلاتے ہیں:

''محترم کو یہ شکایت ہے کہ فقہ میں آداب غلامی نہیں سکھائے گئے ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ حاکم ہوں تو کیا کریں لیکن جب محکوم اور غلام ہوں تو کیا کریں نہیں بتایا گیا۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان غلام اور محکوم بن کر رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ مسلمان امت زمین پر اللہ کی نمائندہ ہے۔ اسے خیرِ امت کا لقب دے کر نیکیوں کا محافظ، بدیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، شیطان کے مقابلے میں وہ اللہ کا سپاہی ہے، اسے حزب اللہ کہا گیا ہے اور حزب اللہ کی صفت شیطان کے مقابلے میں اللہ کے لیے لڑنا ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا اسے کسی کا محکوم بننے کی تعلیم دی جاتی۔ اقبال نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(فکر اسلامی کیا ہے؟ ص:52)

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس قدر گمراہ کن باتیں خان صاحب نے لکھی ہیں۔ یہ تو چند نمونے بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ خان صاحب کی پوری کتاب اسی طرح کی گمراہ کن باتوں سے بھری پڑی ہے۔ چونکہ خان صاحب کا ایک حلقہ اثر ہے اور اللہ نے انہیں تحریر کی بے پناہ صلاحیت عطاء کی ہے اس وجہ سے بروقت ان کے

افکار پر گرفت وقت کی ضرورت تھی جس کا حق ادا کرنے کی مولانا محترم نے کامیاب کوشش کی ہے۔

جاہلیت

تحریکی حلقہ میں برصغیر کے علاوہ عالمی اسلامی تحریکات میں جاہلیت کی بھرپور بحث ملتی ہے۔مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے علاوہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی 'معرکہ اسلام وجاہلیت'، محمد قطبؒ کی جدید جاہلیت وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ نے قدیم وجدید جاہلیت پر زیادہ بحث نہ کرتے ہوئے اس کے مقابلے پر زیادہ توجہ دی اور اس کے مختلف گوشوں کو بیان کیا ہے۔مولانا بالکل سادے انداز میں جاہلیت کی تعریف کرتے ہیں:

''حق کے خلاف عقائد، خیالات، جذبات اور اعمال واخلاق کا نام جاہلیت ہے۔''

(جاہلیت کے خلاف جنگ،ص:4)

مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ غیر حق یعنی اسلام کے علاوہ جتنے بھی افکار وعقائد، اعمال، نظام ہوں گے وہ سب جاہلیت میں شمار ہوں گے جس سے اجتناب اور انکار مسلمانوں کے ایمان کا تقاضا ہوگا۔ بدقسمتی سے اس وقت مسلمانوں کے اندر یہ بیماری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق اسلامی احکام کو اختیار کرنے اور رد کرنے لگے ہیں۔مولانا اس رویہ پر افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

''جب ملت اسلامیہ کے علمی اور عملی حالات پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو کھلے طور پر نظر آتا ہے کہ یکساں انداز اور اہمیت کے ساتھ ان احکام کو نہیں لیا جاتا۔ بلکہ اکثر لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق کسی حکم کو اہمیت دیتے ہیں اور کسی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ایک بڑی تعداد میں لوگ اقامت صلوٰۃ کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن ایتائے زکوٰۃ کے حکم پر کوئی توجہ نہیں کرتے۔ کچھ لوگ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے پابند ہوتے ہیں، مگر دعوت و تبلیغ کے فریضہ کو ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔بعض حضرات نماز، روزہ کے ساتھ زندگی کے خاص شعبوں میں جائز، ناجائز، سنت اور بدعت، توحید اور شرک کے مسائل بہت چھیڑتے ہیں، مگر طاغوت سے اجتناب والے حکم کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔اسی طرح تبلیغ ودعوت کا نعرہ لگانے والوں کی بڑی تعداد اعداءِ اسلام کے مقابلے میں آ کھڑے ہونے یا کم ازکم تیاری کرنے کو بے دینی کا کام خیال کرتی ہے۔ وعظ ونصیحت، تقریر وخطابت، درس قرآن اور درس حدیث میں مشغول حضرات کے سامنے جہاد کا ذکر بھی کسی نے کر دیا تو ایسا بدک جاتے ہیں جیسے دینی اور روحانی محفل میں فتنہ وفساد پھیلانے کی بات کہہ دی جائے حالانکہ جہاد اسی طرح ایک شرعی اصطلاح ہے جس طرح صوم، صلوۃ، حج اور زکوۃ۔اس تنفر کی کیا وجہ ہے، سوچنے کی بات ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھی یہودیوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔'' (جاہلیت کے خلاف جنگ،ص:19)

بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ہیں جو اسلامی احکام کو اختیار کرنے اور ترک کرنے کے لیے مکی اور مدنی کا شوشہ چھوڑتے ہیں جبکہ یہ بالکل لغو بات ہے۔ ہمیں اسلام کی مکمل تعمیل کا حکم دیا گیا ہے۔ مولانا اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن میں احکام کی ترتیب مکی اور مدنی بنیادوں پر نہیں قائم کی گئی ہے، بلکہ مدنی سورتیں پہلے ہیں جن میں اجتماعی زندگی کے احکام ہیں۔ قرآنی تفاسیر، شروح احادیث اور فقہی کتب میں کہیں بھی مکی و مدنی بنیادوں پر احکام میں تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اگر اس کو کوئی بنیاد تسلیم کر لیا جائے تو ایک بڑے فتنہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ مکی دور کے نام پر اکثر معاشرتی اور اجتماعی احکام سے دامن چھڑایا جا سکتا ہے۔ جن چیزوں کی حرمت مدینہ میں نازل ہوئی ہے ان کو حلال ٹھہرانا ممکن ہو جائے گا۔ جو چیزیں مدنی دور میں فرض ہوئی ہیں ان کو بجا لانا ضروری نہ قرار دیا جائے گا۔ غرض واجبات کے ترک اور منہیات کے ارتکاب کے جواز کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس اعتبار سے مکی اور مدنی دور کی تقسیم کوئی چیز نہیں ہے بلکہ خدا اور رسول کی طرف سے جتنے احکام آئے ہیں، ان سب کا ماننا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے، بشرطیکہ متعلق شخص میں استطاعت پائی جائے اور حکم کے لاگو ہونے کی شرائط پائی جائیں۔'' (جاہلیت کے خلاف جنگ، ص:23)

بھارت میں مسلمانوں کو آئے دن اپنے دین وایمان کے سلسلے میں یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ انہیں اس سے محروم کرنے کی حکومتی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔ ایسے میں انہیں کیا رخ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ مولانا اس سلسلے میں استقامت کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں۔'' (جاہلیت کے خلاف جنگ، 44-45)

جاہلیت کے خلاف جنگ کے مختلف محاذ ہیں۔ بھارت میں دعوت وتبلیغ کی بات ہم خوب سنتے ہیں لیکن جاہلیت کے خلاف جنگ میں جو اہمیت تلوار کی ہے وہ سب پر بھاری ہے۔ بدقسمتی سے بھارت میں یہ پہلو تقریر وتحریر تک سے غائب ہے۔ مولانا اس ضمن میں کیا خوب لکھتے ہیں۔

''یہ بات نہایت ہی معقول اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ انذار، تبشیر، دعوت اور تبلیغ چاہے لسانی ہو کہ قلمی، ان میں سے کوئی چیز بھی معرکۂ اسلام و جاہلیت میں وہ کام نہیں کر سکتی جو سربکف مجاہد کی تلوار کرتی ہے۔ بدی کے دیو، برائیوں کے سرغنے اور شیطان کے ایجنٹ ابوجہل و ابولہب کو بے اثر بنانے کے لیے تلوار ہی ایک مؤثر

ذریعہ ہے۔ افہام وتفہیم اور دعوت وتبلیغ کے ذریعے سلیم الطبع، خیر پسند اور شریف لوگوں سے نپٹا جا سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہمیشہ انسانوں کی گردن ظالموں اور جابروں کے پنجہ میں ہوتی ہے جو کبھی سیدھی اور معقول بات نہ خود سمجھنے اور سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور نہ انہیں یہ پسند ہوتا ہے کہ دوسرے سنیں اور سنائیں۔ اس لیے وہ اپنی پوری کوشش سے حق کو اور حق وانصاف کی آواز لگانے والوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مقابلے میں وہی لوگ آ سکتے ہیں جو حق کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کا عزم رکھتے ہوں اور اپنی پوری متاعِ حیات لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ اگر سرفروشوں کا یہ گروہ نہ ہو تو برسوں کی دعوت وتبلیغ کے اثرات پل بھر میں ختم ہو سکتے ہیں۔ معرکہ بدر میں اللہ کے رسولؐ نے دعا فرمائی تھی۔ اے اللہ یہ مٹھی بھر گروہ اگر ختم ہو جائے گا تو زمین میں تیری عبادت کبھی نہ کی جائے گی۔''

(جاہلیت کے خلاف جنگ، ص:52)

تحریک اسلامی کا فکری انحراف

غلبہ دین، اقامت دین، انقلاب اسلامی کی جدوجہد کا نام تحریک اسلامی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں بھی سیکولر جمہوری نظام کو نہ صرف نظریاتی سطح پر رد کیا گیا بلکہ عملاً بھی حاکمیت جمہور کے نظریہ پر قائم اس نظام سے اجتناب کو عقیدہ کا حصہ مانا گیا اور اس کو بدل کر اسلامی نظام کے قیام کو شریعت کے دلائل کی بنیاد پر نصب العین بنایا گیا۔

ایک مدت گزر جانے کی بعد اس تحریک میں انحراف کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ویسے تو تقسیم ہند کے پندرہ سال بعد ہی یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ الیکشن اور سیکولر ڈیموکریسی کے بارے میں عملاً کیا رویہ اپنایا جائے۔ تقریباً 25 سالوں کے بحث ومباحثہ کے بعد جماعت اسلامی نے الیکشنی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور اب تو ایک سیاسی پارٹی بھی بنالی گئی ہے۔ ان سب چیزوں کو اضطرار مان کر کیا جاتا تو ایک لمحے کے لیے سوچنے کی گنجائش تھی لیکن اگر اس کو نظریاتی طور پر درست اور پہلے کے اصولوں کو غلط ثابت کیا جانے لگے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہوگی۔

جماعت اسلامی ہند کا ترجمان آرگن ماہنامہ 'زندگی نو' ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام پر جماعت اسلامی کے شوریٰ کے افراد اور کچھ دوسرے لوگوں کی ایسی تحریریں شائع ہوئیں جس نے انحراف کو دلیل فراہم کرنے کا کام کیا۔ مولانا مرحوم نے اس طرح کی تحریروں پر زبردست گرفت کی ہے۔ بطور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ جناب عمر حیات خاں غوری ''زندگی نو'' اپریل 1998 میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں انقلاب لانے کے چند ہی طریقے ہیں۔ زیرِ زمین سازشیں، لاقانونیت، مسلح بغاوت، جمہوری دستوری طریقے۔ ان چاروں میں سے پہلے تین کو تحریک اسلامی پہلے ہی رد کر چکی ہے۔ چوتھے کو اس لیے

نہیں اپناسکتی کہ اس سے عقیدہ توحید پر ضرب پڑتی ہے۔ پھر آخر وہ کونسا طریقہ ہوگا جس کے ذریعے انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا؟''

اپنے پورے مضمون میں غوری صاحب نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ الیکشنی سیاست میں شامل ہوا جائے، اس کے علاوہ انقلاب کا کوئی اور راستہ نہیں دکھائی دیتا۔ اس کے لیے کھینچ تان کر تاریخ و سیرت سے مختلف دلائل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے ان سب کا جائزہ لیا ہے اور سب سے پہلے انقلاب امامت کا انبیائی طریقہ بیان کیا ہے اور اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ جس تحریک کے پاس ''دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'' جیسی بنیادی کتاب موجود ہو آخر اس پر غور و فکر کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس سے گریز اور کترانے کی روش کیوں اختیار کی جاتی ہے۔

(سیکولر جمہوری نظام، الیکشن، تحریک اسلامی، ص:9)

مولانا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تحریک اسلامی کے علاوہ مسلمان قوم شروع ہی سے الیکشن میں حصہ لے رہی ہے، آخر پچاس سالوں میں کتنی کامیابی ملی ہے اور مسلم قوم کو کتنا فائدہ ہوا ہے؟ آخر کس بنیاد پر یہ انقلاب امامت کے لیے الیکشنی سیاست کو اختیار کرنے پر زور دے رہے ہیں؟

غوری صاحب الیکشن کے ذریعے اسلام دشمن طاقتوں کو روکنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر دوست اور دشمن کی تفریق کی جارہی ہے؟ جس کو دشمن کہہ رہے ہیں وہ تو ظاہر ہے لیکن جن کو دوست کہا جارہا ہے انہوں نے ہی ہزاروں فسادات کے ذریعے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔

> ''بی جے پی اپنی سوچ اور فکر کے اعتبار سے یقیناً ایک ظالم اور فسطائی گروہ ہے لیکن کانگریس کا ظلم اور فسطائیت ایک کھلی کتاب ہے۔ پچاس برس سے ہمیں اس سے سابقہ ہے۔ اس تجربہ کے بعد بھی ایک مسلمان کے لیے کیا یہ صحیح ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ کانگریسی اقتدار کے قیام و بقاء کے لیے بلکہ کانگریسی نظریات اور تصورات کے استحکام کے لیے جدوجہد کرے اور یہ نعرہ لگائے کہ اس کے بغیر ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہی موزوں ترین سسٹم ہے۔ آخر اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ یہ پالیسی اور یہ رویہ اختیار کرنے سے ہماری اصل دعوت یعنی اسلام کی نفی ہوجاتی ہے۔ اس لیے سیکولرزم کی جو تعریف بھی کی جائے اس کی تعریف میں یہ بات شامل ہے کہ اجتماعی اور سیاسی دائرہ میں کسی مذہب کو دخل دینے کا حق نہیں ہے اور جو گروہ مذہب کو سیاست میں داخل کرے گا اس کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔ اب آپ بتائیے کہ سیکولرزم کی تائید کر کے اپنی دعوت کو کالعدم کرنے کے لیے کیسے آپ تیار ہو گئے ہیں اور کیسے اپنی پالیسی کو اقامت دین کی جدوجہد کا ایک جزء کہتے ہیں؟!'' (سیکولر جمہوری نظام، ص:24)

غوری صاحب جمہوری نظام کی وکالت کرتے ہوئے اس کی سہولتوں کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ مولانا محترم کا ایمان افروز جواب پڑھنے اور سوچنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی مومن ایمانی غیرت میں ڈوب کر جواب دے رہا ہے:

''موجودہ ہندوستان میں جن سہولتوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی حیثیت درحقیقت نامراد بھکاریوں کو دیئے ہوئے چند ٹکڑوں کی ہے جو تن کو باقی رکھنے کا ذریعہ تو یقینا ہیں لیکن رفتہ رفتہ روح کا گلا گھونٹ دینے والے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ اس بات کی درخواست کر رہے ہیں کہ حضور والا ہمیں پسماندہ طبقہ میں شامل کر لیا جائے۔ یہ ذہنی پستی اور زوال اور بے حوصلگی کی کھلی علامت ہے۔ اس کے بعد کیا رہ جائے گا اور کس بنیاد پر ملت کی تعمیر کی جائے گی۔ ملت کے بڑے لوگ بس اسی کو غنیمت شمار کر رہے ہیں کہ جو چند ٹکڑے اکثریت کی جانب سے مل رہے ہیں ان کی سپلائی باقی رہے ورنہ ان سے بھی محروم کر دیئے جائیں گے تو زندہ کیسے باقی رہیں گے؟ اپنی قوت بازو سے کچھ حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کی حفاظت کی صورت ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ سیکولر قوتوں کی پناہ میں اپنے آپ کو دے دیا جائے۔ اپنے قدم پر کھڑے ہونا، اپنے بازو میں طاقت پیدا کرنا، اپنی الگ کوئی مستقل حیثیت بنانا اب خواب وخیال میں بھی نہیں آتا۔''

(سیکولر جمہوری نظام، ص: 17)

جماعت اسلامی ہند کے ایک بڑے رہنما ڈاکٹر عبدالحق انصاری کا مضمون 'زندگی نو' جون 1998 میں شائع ہوا ہے جو بعد میں کتابی شکل میں سیکولرزم، جمہوریت اور انتخابات کے نام سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ لادینی جمہوری نظام میں شرکت کے مخالف نہیں ہیں۔ مزید آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جماعت کی شوریٰ کی بحث یہ ہے کہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت کے لیے یا اسلام اور مسلمانوں کو غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لیے الیکشن میں حصہ لے سکیں یا انتخابی عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا باتوں پر بنیادی سوال کھڑا کرتے ہوئے مولانا محترم پوچھتے ہیں:

''کیا مفادات کی حفاظت اور نقصانات سے بچنے کے لیے بنیادی فکر کو چھوڑا جا سکتا ہے اور اپنے عقیدہ توحید کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔''

آخر میں مولانا محترم تمام باتوں کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں:

''ووٹ دینا عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس کی تائید میں مولانا مودودی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا سید حامد علی اور مولانا عروج قادری رحمہم اللہ کی رائیں موجود ہیں۔ ان کے مقابلے میں کسی قابل ذکر معتبر عالم رکن شوریٰ کی رائے اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔''

مولانا مرحوم کا اس کتاب کا اختتامی اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''یہ مانا کہ جمہوریت کے ایک نہیں لاکھ فوائد ہیں لیکن ان فوائد کے حصول کے واسطے اللہ کی حاکمیت کا انکار اور اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرنے والے نظام کے تحفظ، بقاء اور قیام کے لیے مہم چلا کر خدا کے سامنے کیسے منہ دکھائیں گے اور پھر خلق خدا کے روبرو کیسے یہ دعویٰ لے کر کھڑے ہوں گے کہ ہمارا نصب العین اقامت دین ہے اور ہم یہ سب کچھ زمین پر اللہ کی حاکمیت اور اللہ کا قانون نافذ اور جاری کرنے کے لیے کرتے ہیں، یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔ جس تضاد اور تناقض کو مسلمانوں کے اندر سے ختم کرنے کے لیے تحریک اسلامی وجود میں آئی تھی، افسوس ہے اسی تضاد اور تناقض کے ہم داعی بن گئے۔ عام مسلمان اپنی بے علمی اور بے شعوری کی بنا پر اور احساس گناہ کے ساتھ تناقض میں مبتلا تھا لیکن ہم ہیں جو پورے شعور کے ساتھ اس تناقض کو اپنا رہے ہیں اور اسی میں اپنی، سارے مسلمانوں کی اور پورے ملک کی نجات سمجھتے ہیں، اس سے بڑھ کر بیسویں صدی کا کوئی المیہ نہیں ہوگا۔'' (سیکولر جمہوری نظام، ص: 54)

طاقت کا استعمال

نائن الیون کے واقعے کے بعد سے اسلام کی روشنی میں طاقت کے استعمال پر شدید تنقیدیں ہوئی ہیں۔ مغرب کے حملوں کی وجہ سے نظریاتی سطح پر اچھے خاصے دانشور، نہ صرف دفاعی پوزیشن پر چلے گئے بلکہ طاقت کے استعمال کا انکار بھی شروع کر دیا۔

بڑے بڑے علماء کے ساتھ غلبۂ دین واقامت دین کی جدوجہد کی داعی تحریک اسلامی میں بھی بعض افراد اس سے متاثر ہوئے اور ان کے مضامین 'زندگی نو' جیسے تحریکی آرگن میں بھی شائع ہوئے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر بھارت میں تحریک اسلامی بھی متاثر ہوئی ہے۔ زندگی نو مارچ 2004 میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا مضمون تشدد اور اسلام کے نام سے شائع ہوا۔

اس مضمون کا خلاصہ مولانا محترم اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یا ماحصل یہ ہے کہ فی زمانہ امریکہ چاہے اس کی کارروائیاں اور اقدامات کچھ بھی ہوں اور خواہ اس کی سنگینی جیسی کچھ بھی ہو اس کے خلاف قدم اٹھانا نہ تو جائز ہے اور نہ مسلمانوں کے حق میں مفید اور سودمند ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندتوا کے علمبردار کچھ بھی کر ڈالیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جو قدم بھی قوت استعمال کرنے کے سلسلے میں اٹھایا جائے گا وہ شرعی اعتبار سے غلط اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ اور مضر ہوگا۔''

مولانا مرحوم دانشورانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے بہت صاف انداز میں لکھتے ہیں:

''لیکن اس بات کو ثابت کرنا بالخصوص شرعی اعتبار سے کہ مسلمانوں کو اس (امریکہ) اژدھے کے سامنے سپر ڈال دینی چاہیے، بہت مشکل ہے۔'' (طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:6)

آگے چل کر ایمان افروز جملے لکھتے ہیں:

''ایمان ویقین کی یہ چنگاری سینوں میں موجود ہو اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد جاری رہے تو اللہ تعالی مشکلات ومصائب کے بھنور سے اور غلامی سے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے اور عروج وعزت کا سامان غیب سے نمودار ہوتا ہے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں لیکن آج یہ کیوں سمجھا جارہا ہے کہ عصر حاضر کی امریکہ جیسی سپر طاقتیں زیر نہیں ہوسکتیں۔'' (طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:8)

ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون میں جرائم کی سزا کو لفظ تشدد سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تشدد کی اجازت صرف جرم کی سزا کے طور پر اور دفاع کے لیے دی جاسکتی ہے۔ مولانا محترم اس پر نکیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن وحدیث کی روشنی میں جرم کی سزا کو تشدد کہنا نہایت غلط اور غیر اسلامی بات ہے۔ درحقیقت مجرم کو جرم سے روکنے کے لیے جو سزا دی جاتی ہے وہ تشدد اور سختی نہیں ہے بلکہ سراسر نرمی اور باعث رحمت وبرکت ہے۔ بہرصورت تشدد کے جو بھی معنی ہوں ڈاکٹر صاحب کا تشدد کو صرف دوصورتوں میں منحصر بتانا بھی انتہائی غلط ہے اور دین حق کی آمد اور نبی ﷺ کے مقصد بعثت پر کاری ضرب لگانے کے مترادف ہے۔''
(طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:10)

''جس طرح اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا واجب اور فرض ہے اسی طرح ادیان باطلہ پر اسلام کو غالب کرنے اور اہل کفر وشرک کو ماتحت اور زیرنگیں بنانے کی جدوجہد کرنی بھی فرض ہے۔''
(طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:12)

آگے اپنے مضمون میں ڈاکٹر نجات اللہ صاحب قتال کی اجازت کی ذیلی ہیڈنگ لگاتے ہیں۔ اس ہیڈنگ سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اصل تو ہابیل کا نمونہ ہے جس پر عمل ہونا چاہیے، مگر قتال کی بھی اجازت ہے۔ یعنی کوئی فرض چیز نہیں رہی بلکہ اختیاری چیز ہے۔ (طاقت کا استعمال، ص:17) جبکہ قرآن اور درجنوں احادیث، فقہاء کی تصریحات اسے فرض قرار دیتی ہیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب تشدد (طاقت) کے استعمال کو بقاء وتحفظ اور انسانی حق واختیار کی بحالی تک محدود کردیتے ہیں۔

مولانا محترم نہایت نپے تلے انداز میں فکر جہاد سے انحراف پر تیشہ چلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیکھئے ''بقاء وتحفظ اور انسانی حق واختیار کی بحالی'' تک قوت استعمال کرنے کی بات کہہ کر قتال کو محدود کردیا گیا جبکہ قتال کی سب سے بڑی غرض فتنہ کو ختم کرنا اور دین اللہ کو کارفرما قوت بنانا ہے۔ یہ ایک طرح

سے دیکھا جائے تو فلسفہ جہاد کی شہ رگ کو کاٹ دیا گیا ہے اور غلبۂ اسلام کی غرض سے جہاد وقتال کو اعتداء اور عدوان کہا گیا ہے۔ اس سے سختی کے ساتھ منع کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ میں پورے یقین اور وثوق سے کہتا ہوں کہ بغرض اعلاءِ کلمۃ اللہ قتال کو نہ کہیں اعتداء اور عدوان کہا گیا ہے اور نہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جہاد وقتال کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے ترغیب اور تحریض اور تبشیر کتاب وسنت میں ایک ایسی عام بات ہے جو ناخواندہ مسلمان بھی جانتا ہے لیکن عصر حاضر کے دانشور اس کو جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں۔'' (طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:24)

طاقت کے استعمال کے سلسلے میں فکری انحراف کی دوسری بڑی دلیل فضل الرحمان فریدی صاحب کا مضمون 'زندگی نو' اگست 1997 میں شائع ہوتا ہے۔ یہ مضمون کم ایس آئی ایم (نام لیے بغیر) کے نوجوانوں پر غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار زیادہ ہے۔ اس اظہار میں فکر جہاد کی غیر شرعی تاویلات تک کر دی گئی ہیں۔ واضح رہے کہ موصوف جماعت کے رکن شوریٰ تھے۔ مولانا محترم نے شریعت کی روشنی میں ان کے مضمون کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مولانا محترم کا صرف ایک پیراگراف پیش کیا جاتا ہے:

''اسلام کے نزدیک صرف عقیدہ توحید مطلوب اور محمود ہے، اس کے علاوہ مشرکانہ عقائد نامطلوب اور غیر محمود ہیں۔ چونکہ بزور کسی کے عقیدہ کو نہیں بدلا جاسکتا اس لیے عقیدہ توحید کے علاوہ دوسرے عقائد کو بادل ناخواستہ گوارا اور برداشت کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک بات اور بھی واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کا پہلا مقصد مشرکانہ عقائد سے لوگوں کو پاک کرنا ہے جس کے لیے موعظہ حسنہ اور جدال احسن سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسرا مقصد مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کو زیر کرنا اور مغلوب کرنا ہے اور ان کی جگہ عقیدہ توحید کے حاملین کو غالب کرنا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں اقامت دین، اظہار دین اور تمکین فی الارض کہتے ہیں۔ کیا اس دوسرے مقصد کا آپ انکار کر سکتے ہیں؟ اگر انکار نہیں کر سکتے تو صرف رائے عامہ کی ہمواری کی بات ہی کو صحیح کیسے قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن نے اس کے علاوہ بھی راستہ بتایا ہے۔''
(طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں، ص:46)

ڈاکٹر پروفیسر عمر حیات خان غوری اور فضل الرحمان فریدی صاحب کے مضامین فکری انحراف، جھنجھلاہٹ اور باطل کے دباؤ کے عکاس ہیں جس کا تحریک اسلامی ہند کے لٹریچر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بروقت گرفت کر کے مولانا محترم نے تحریک اسلامی کے اندر فلسفۂ جہاد کے سلسلے میں فکری گمراہی پر بند باندھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

فکر جہاد

فکر جہاد پر تیشہ چلانے کا آغاز مرزا غلام احمد قادیانی سے ہوتا ہے۔ بعد میں کچھ اور لوگ انحراف کا شکار

ہوئے۔ جن علماء نے عصر حاضر کے نام پر جہاد جیسے محکم فریضہ کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک جناب مولانا یحییٰ نعمانی صاحب ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی کتاب ''جہاد کیا ہے؟'' میں جہادی تنظیموں پر تنقید کرتے ہوئے جہاد سے انکار تک پہنچ جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''یہ بات صحیح اور ہر ایک کے لیے واضح ہے کہ اس دور میں جہادی کوششوں سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کے بجائے نہایت پیچیدہ اور مشکل ہو گئے ہیں۔''

مولانا محترم، یحییٰ صاحب کے اس اعتراض پر متعدد سوالات کھڑے کرتے ہیں:

''1857 کے بعد مدارس کا جال بچھایا گیا، کیا مسائل کم ہو گئے؟ مسلم یونیورسٹی کا قیام مسلمانوں کے مسائل حل کر سکا؟ ہر کوئی جواب دے گا سارے مسائل حل نہیں ہو سکے بلکہ اور بڑھ گئے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ تقسیم ہند کے بعد ہزاروں فسادات ہوئے اور 2000 تک کوئی جہادی تنظیم نہیں تھی۔ غرض یہ کہ کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار نفع ونقصان نہیں بلکہ وہ کسوٹی ہے جو اللہ نے بتائی ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر نعمانی صاحب کا فیصلہ کرنا غلط ہے۔'' (عصر حاضر اور نظریۂ جہاد، ص: 31 تا 33)

نعمانی صاحب اپنی طرف سے جہاد کے لیے خودساختہ شرط لاتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

''جہاد کے جواز کے لیے حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کی توقع شرط ہے۔''

اس کے جواب میں مولانا محترم صاف صاف لکھتے ہیں:

''یہ شرط یحییٰ نعمانی صاحب کی اپنی خود ساختہ شرط ہے اور ان کے اپنے گمراہ ذہن کی اپج ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کی کوئی دلیل نہ قرآن وسنت سے نہ فقہ سے پیش کی ہے۔''

(عصر حاضر اور نظریہ جہاد، ص: 34)

نعمانی صاحب نے اپنی کتاب میں جہاد وقتال کی علت قتال کو بتایا ہے۔ یعنی جہاد انہیں سے کیا جائے گا جو مسلمانوں سے جنگ کریں۔ مولانا محترم اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات ایسی ہے جس سے جہاد کا آدھا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآنی آیات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاد وقتال کی علت کفر اور غلبۂ کفر ہے۔ حجاز میں کفر ہے یعنی حجاز میں کفر برداشت نہیں کیا جائے گا بقیہ ساری جگہوں میں کفر کے وجود کو برداشت کیا جائے گا غلبہ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔''

(عصر حاضر میں نظریہ جہاد، ص: 70)

مولانا اس کے بعد متعدد قرآنی آیات اور احادیث پیش کر کے علت جہاد کو ثابت کرتے ہیں۔

فکر جہاد کے سلسلے میں ان کی کتاب میں اس طرح کی بہت ساری چیزیں مل جائیں گی جس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ جہاد کے سلسلے میں کیسے کیسے انحرافات سامنے آرہے ہیں، حتی کہ اس کے لیے سیرت سے ادھورے واقعات نقل کردیے جاتے ہیں۔ یحییٰ نعمانی صاحب نے غزوۂ خندق کی مثال اس ضمن میں پیش کرکے غیر علمی طریقہ اپنایا۔

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی ایک نامور عالم دین ہیں۔ انہوں نے یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب پر مقدمہ لکھا ہے۔ فکر جہاد کے سلسلے میں جگہ جگہ یہ بھی انحراف کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''جو چیز خصوصیت اس کتاب کی ہے وہ اس فی سبیل اللہ ''جنگ'' کا مطالعہ اپنے اس زمانہ کے تناظر میں ہے، جس میں وہ نئے نئے مسائل حل طلب ہو گئے ہیں جن کا کوئی تصور اس وقت نہ تھا جب اسلامی نقطہ نظر سے دنیا دارالحرب (یا دارالکفر) اور دارالاسلام کے دو خانوں میں تقسیم تھی۔ اب ہر ملک کی رکنیت اقوام متحدہ کے بعد کوئی ملک نہیں رہ جاتا جسے دارالحرب کہا جاسکے۔ سارے ملک اب ایک عالمی برادری ہیں۔ مگر عالمی برادری کے نظام نے خواہی نہ خواہی سب کو اس نظام کے اصولوں کا پابند بنالیا ہے۔''

مولانا محترم مذکورہ بالا تحریر پر جارحانہ انداز میں تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عبارت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک اب اس زمانہ میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے تو جہاد کا بھی سوال ختم ہے اور جہاد وقتال سے متعلق آیات واحادیث بے محل ہوکر رہ جائیں گی اور بات وہی ہوئی جو قادیانیوں اور بہائیوں نے کہی تھی کہ انگریز بہادر کے قلمرو میں جہاد منسوخ ہے۔'' (عصر حاضر میں نظریہ جہاد، ص:79)

مولانا محترم آگے اس گمراہ کن بات کی وجوہات بھی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس گمراہی کی دو وجہ ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے علماء اس دور میں زیر کفر وشرک رہنے کے لیے وجہ جواز کے دلائل ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بڑا عالم وہ مانا جاتا ہے جو کتاب وسنت سے غلامی میں رہنے کے لیے جواز تلاش کرسکے۔ دوسری وجہ یہ خیال ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات حالات کے تناظر میں وضع کی گئی ہیں، یہ بات سراسر غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کچھ قرآنی حقائق کے اظہار کے لیے یہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔'' (حوالہ سابق، ص:80)

اس کے بعد مولانا محترم ان قرآنی حقائق کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس کے مطالعہ کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ فکر جہاد کے ضمن میں دارالاسلام اور دارالحرب پر مولانا کا بے لاگ تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

''دنیا کا کوئی ملک جو دارالاسلام نہیں ہے، یعنی جہاں اللہ کا حکم چلانے کے بجائے کفر کا حکم چلایا جارہا ہو،

اقتدارِاعلیٰ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کاتسلیم کیا جارہا ہو،قرآن وسنت کوقانون کا ماخذ نہ بنایا جارہا ہواس کو سورہ توبہ کی آیت 29 کے بموجب اسلام کے ماتحت بنانے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے۔فقہی زبان میں یہ کہا جائے گا کہ اس کو دارالاسلام بنانا فرض ہے اوراس کے واسطے حسبِ استطاعت جو کچھ کیا جاسکتا ہے اس میں جہاد بالسیف بھی داخل ہے۔مسلمانوں کی ذمہ داری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کسی دارالاسلام کو کفار نے دارالحرب بنالیا ہو۔قطع نظر اس سے کہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں۔'' (حوالہ سابق،ص:92)

مولانا یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب پر مولانا خالدسیف اللہ رحمانی نے پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔اس پیش لفظ میں جہاد کے سلسلے میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ جہاد اس دور میں منسوخ ہوگیا ہے یا معطل۔

رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام کی نظر میں امن وصلح اصل ہے۔''

مولانا اصلاحیؒ اس جملے پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا نے ایک نہایت ہی غلط بات لکھی ہے کہ صلح اور قتال میں صلح اصل ہے اور قتال عارضی ہے۔حالانکہ قتال کے بارے میں آیا ہے کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ جیسا کہ کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ آیا ہے۔گویا قتال ویسے ہی فرض ہے جیسے کہ صیام فرض ہے اور فقہ میں بھی قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور قتال کے وجوب کو کسی شرط اور قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے جب کہ صلح کو مشروط کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے ''وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا''صلح کے اس امر کو کسی نے وجوب کے لیے نہیں مانا ہے بلکہ صلح کرنے کا حکم دین وملت کی مصلحت پر موقوف ہے۔'' (حوالہ سابق،ص:98)

تفصیلات کے لیے کتاب کی طرف رجوع کریں۔رحمانی صاحب نے اس کے علاوہ اور قابل گرفت باتیں لکھی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

''غلط فہمی (جہاد کے سلسلے میں) اس لیے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے جو احکام بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں جس دور میں فقہی کتابیں مرتب کی گئیں۔''

''آج کی دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے۔''

''ملک میں اندرونی طور پر مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی جائے تب بھی قرآن مجید کہتا ہے کہ ہمیں اپنے معاہدے پر قائم رہنا چاہیے۔''

درج بالا عبارتوں پر مولانا اصلاحیؒ کے نقد کی روشنی میں دیکھیں اور غور کریں کہ ہمارے بڑے علماء کس طرح اس معاملے میں نقصان پہنچا رہے ہیں:

''یہ دعویٰ کہ زیادہ تر احکامات اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں، مولانا خالد صاحب کو زیب نہیں دیتا۔ یہ فقہاء پر الزام ہے اور پورے ذخیرے کو بے اعتبار بنانے والا ہے۔ اسلامی قانون زیادہ تر کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے ماخوذ اصولوں پر مشتمل ہے۔''

''آج کی دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ کی نہ درست ترجمانی ہے نہ حقیقت کی صحیح تعبیر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وقت کی جابر، ظالم اور استبدادی فرعونی طاقتوں نے ظلم کی ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ بڑی پانچ طاقتوں کا راج نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ قانون۔ پوری دنیا ان کے مفاد کے تحت اٹھتی بیٹھتی ہے۔''

''مسلمانوں کے ایک حلیف بنوخزاعہ پر بنی بکر نے زیادتی کی تو اللہ کے نبی ﷺ نے معاہدہ توڑ دیا۔ مگر مولانا رحمانی آج کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر زیادتی کی جائے تو قرآن کہتا ہے کہ معاہدہ کو باقی رکھنا چاہیے۔ قرآن نے یہ کہاں کہا ہے مولانا نے حوالہ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔'' (حوالہ سابق، ص: 101 تا 106، تلخیص)

مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب انکار حدیث اور کچھ نیا پیش کرنے کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ تحریک اسلامی کے رکن ہونے کی وجہ سے ان کا ایک حلقہ اثر ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''جہاد اور روح جہاد'' سامنے آئی ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب روح جہاد کو ہی مار دینے والی ہے۔ پوری کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاد صرف ظلم اور ظالموں کے خلاف ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ جتنا انوکھا ہے اتنا ہی بے وزن اور بودا ہے۔ یہ بات کہہ کر مولانا سبحانی نے جہاد کی پوری روح نکال دی ہے۔ انوکھا اس لیے ہے کہ یہ بات اسلام کی پوری تاریخ میں کسی مفسر، محدث اور فقیہ نے نہیں کہی ہے۔ اس کی تائید میں کسی آیت، کسی حدیث اور سیرت کا کوئی واقعہ موصوف پیش نہیں کرتے۔

سبحانی صاحب کی ایک گمراہ کن بات ملاحظہ فرمائیں:

''یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا کہ دنیا کی سب سے بڑی برائی ظلم و استبداد ہے۔ ظلم واستبداد کے علاوہ جتنی برائیاں ہیں وہ سب اسی کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔''

(جہاد اور روح جہاد، ص: 86)

مولانا اصلاحیؒ کا نقد ملاحظہ فرمائیں:

''سبحانی صاحب نے جس کو ایک حقیقت بتایا ہے اور جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا وہ

حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور کوئی بھی قرآن کا طالب علم پہلی نظر میں ضرور اختلاف کرے گا۔ اس لیے کہ قرآن کی نظر میں سب سے بڑی برائی شرک ہے اور جتنی بھی برائیاں ہیں وہ سب شرک اور کفر کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔'' (حوالہ سابق، ص:123)

جب چوطرفہ اسلام کے نظریۂ جہاد پر حملہ ہو رہا ہو، اہل علم اس کا جواب دینے کے بجائے مداہنت اختیار کرنے لگیں یا پھر دشمن کے نظریہ کو تقویت دینے لگیں تو یہ وقت بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں جو باطل کو منہ توڑ جواب دیتے اور اپنوں کے انحراف پر بند باندھتے ہیں وہ اللہ کے مخصوص بندے ہوتے ہیں۔ ایسے بندے مشکل حالات اور اندھیری رات کے چراغ ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمہ اللہ کو اللہ نے اپنے وقت میں فکر اسلامی کی نگہبانی کا کام سونپا جسے انہوں نے بڑی حد تک پورا کیا۔

خلاصہ بحث

محترم قارئین!

دور جدید کے فکری اور ملی مسائل میں انحرافات کی لمبی فہرست ہے۔ ایک عام قاری کے لیے صحیح فکر سے واقفیت دن بدن مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف حالات کا جبر اچھے خاصے لوگوں کو بہالے جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں فکری انحرافات سے بچنے اور ملت کے لیے مختلف مسائل میں صحیح موقف اختیار کرنے کے سلسلے میں مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی تحریریں قطب نما کے مثل ہیں۔ غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والے افراد کے درمیان افسوسناک حد تک فکری انحراف نظر آرہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مولانا کی تحریروں کو نئے سرے سے شائع کرکے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

آپ نے فکر اسلامی کی نگہبانی کا جو فریضہ انجام دیا ہے اس کی کم سے کم ہمارے اوپر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کی کتابوں کو اپنے تحریکی حلقوں میں عام کریں۔ ان کی کتابوں کو اجتماعی مطالعہ کا حصہ بنایا جائے، ملک کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہونے چاہئیں اور برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش تک اس کو پہنچایا جائے۔ مولانا کے لیے یہ سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کا تحریری سرمایہ

ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
شعبۂ عربی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

دنیا فانی ہے لہٰذا جو یہاں آئے گا اسے اپنی طبعی عمر پوری کرنے کے بعد یہاں سے جانا ہوگا۔اس الٰہی ضابطہ وقاعدہ سے کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا ہر شخص اپنی طبعی عمر گزار کر رخت سفر باندھ لیتا ہے اور اپنے رب کے حضور حاضر ہوجاتا ہے۔اس الٰہی قانون کے مطابق اربوں لوگ آئے اور چلے بھی گئے لیکن ان میں سے دنیا صرف ان ہی افراد کو اپنی یادداشت کا حصہ بناتی ہے جنھوں نے اس عارضی قیام گاہ میں کچھ نمایاں کام انجام دیئے ہوں۔وقت کی ضرورت ولحاظ کے مطابق نمایاں کاموں کی قدرومنزلت الگ الگ ہوتی ہے اور ایک عرصہ تک ہی ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے اس کے بعد وہ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں کہ جب کبھی بھی ان نمایاں کارناموں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کو انجام دینے والوں کا ذکر ناگزیر ہوجاتا ہے۔تاریخ کا حصہ بننے والی شخصیات میں مولانا عبدالعلیم اصلاحی علیہ الرحمہ بھی شامل ہیں کہ انھوں نے تعلیم وتربیت کے میدان میں اہم خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ کچھ تحریری سرمایہ رسائل کی شکل میں بطور یادگار چھوڑا ہے۔

مولانا محترم سے راقم ذاتی طور پر واقف نہیں ہے تاہم ان کا نام نامی مختلف مناسبتوں سے سنتا رہا ہے لیکن ان کی قدرومنزلت اور قدوقامت کا اندازہ اس وقت ہوا جب انھوں نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا اور ان کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر میرے بہت سینئر اور کرم فرما جناب خورشید انور صاحب، حیدرآباد نے اپنے جادو بیاں قلم سے ایک تأثراتی مضمون میں کیا جسے بجا طور پر ایک نئے قسم کے رثائی ادب کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ان کی یہ مختصر سی تحریر رنج وغم میں ڈوبی ہوئی ہے اور دل ودماغ پر براہ راست کچھ اس طرح اثر انداز ہوتی

ہے کہ مرحوم کی ساری زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے کہ ان کے شب وروز کیسے گزرتے تھے؟ انھوں نے زندگی کے سرد وگرم کو کیوں کر برداشت کیا تھا؟ پیش آنے والے مصائب سے کس طرح نبرد آزما ہوئے تھے؟ اور دین اسلام کو اپنی حقیقی شکل میں باقی رکھنے کے لیے وہ کس قدر متفکر اور مضطرب رہتے تھے؟

مولانا محترم کا شمار مدرسۃ الاصلاح کے نمایاں فارغین اور جماعت اسلامی کے ہراول دستے میں ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد جماعت اسلامی سے اصولی اختلافات کی وجہ سے ان کے راستے جماعت اسلامی کی مقررہ راہ سے الگ ہو گئے تاہم ذہنی اور فکری وابستگی آخری دم تک برقرار رہی۔ انھوں نے ایک عملی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ علمی و تصنیفی میدان میں بھی کسی قدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ 'کسی قدر سرمایہ' کا لاحقہ اس لیے لگایا ہے کہ ان کا حقیقی میدان عمل ''عملی میدان'' تھا تاہم جو کچھ سرمایہ موجود ہے وہ ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا مرحوم کا علمی سرمایہ چھوٹے بڑے چودہ رسائل پر مشتمل ہے لیکن ان کے بلاگ پر صرف بارہ رسائل ہی اپ لوڈ کیے گئے ہیں۔ منتظمین سے التماس ہے کہ باقی ماندہ دونوں رسالوں کو بھی اپ لوڈ کر دیا جائے۔ اس سرمایہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض رسائل وقت کی ضرورت یا مناسبت کے پیش نظر لکھے تھے جیسے بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ہے اور مجسّموں کا مسئلہ۔ ایک سیر حاصل بحث، یا کسی موضوع کے رد میں لکھے تھے۔ دوسری قسم کے ضمن میں ان کے زیادہ تر رسائل شامل ہیں جیسے الیکشن میں حصہ لینا، تشدد اور طاقت کا استعمال وغیرہ۔ دونوں قسم کے رسائل میں مولانا محترم نے اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ حسب ذیل سطور میں ان کے رسائل کا تعارف حروف تہجی کے اعتبار سے کرایا جارہا ہے۔

اسلامی فکر کیا ہے؟ ایک تنقیدی جائزہ

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدر آباد، ۹۳ رصفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

یہ رسالہ مولانا وحید الدین خاں کی ایک تحریر ''فکر اسلامی'' کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں ان کے دلائل وشواہد کا جائزہ لیتے ہوئے اور ان کے بیان کردہ نتائج سے اختلاف کرتے ہوئے صحیح نقطۂ نظر کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رسالہ کی تمہید میں موجودہ زمانہ میں اسلام اور مغرب کی کشمکش اور اسلامی تحریکات سے مغرب کی خوف زدگی کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اور نمونہ کے طور پر امریکہ میں مقیم ایک نابینا مصری عالم عمر عبدالرحمن کو عمر قید کی سزا سنانے کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلام پسند افراد اور تحریکات اسلامی کا مفہوم، ان کے طرز عمل سے ہونے والے

ظاہری نقصانات کے پیش نظر دانشوران کے ایک طبقہ کا انھیں لعن طعن کرنا، ان کے طرز عمل کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دینا اور دانشوران کا اسلام کی نئی توجیہ پیش کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا محترم نے اس رسالہ میں مولانا وحید الدین خاں مرحوم کی تحریر کے حسب ذیل دو بنیادی مباحث کا جائزہ لیا ہے:

☆ دعوت حق کی مخالفت

اس ضمن میں مولانا محترم نے مولانا مودودی علیہ الرحمہ کا ایک اقتباس ''فکر اسلامی'' سے نقل کرتے ہوئے مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بیان کردہ نتائج سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے ہر زمانہ میں حق کی مخالفت کی گئی ہے، اسے زمانہ کا فرق نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہد نبوی میں اذان سن کر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے جاتے تھے جب کہ موجودہ زمانہ میں ایسی کوئی بات نہیں پیش آتی ہے کہ یہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے اور وہ زمانہ مذہب دشمنی کا زمانہ تھا۔ اسی طرح اس بات کی بھی نفی کی ہے کہ مولانا مودودیؒ اسلام کو صرف سیاسی انقلاب نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اسے زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کا داعی قرار دیتے ہیں۔ مولانا علیہ الرحمہ نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت مولانا وحید الدین خان کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے اسے غلط بتایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حق کی دعوت کی مخالفت ہر زمانہ میں کی گئی ہے لہٰذا کسی بھی اسلامی تحریک کے مشن دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی دعوت کے مشن کو اس ڈر سے چھوڑا جاسکتا ہے کہ اس سے ظاہری طور پر حکومت سے ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی مثالوں سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔

☆ مسلمانوں کا قائدانہ کردار

جدید اسلامی فکر کے حوالہ سے مولانا وحید الدین خان صاحب نے مسلمانوں کی قیادت کو بھی موضوع بحث بناتے ہوئے لکھا ہے کہ 'امامت اقوام وہ جدید نظریہ ہے جو کچھ مسلم مفکرین نے اسلام کی انقلابی تعبیر کے طور پر پیش کیا ہے کہ مسلمان ہی ساری دنیا کے قائد اور حاکم ہیں اور انھیں بزور بازو انسانی حاکموں کو ہٹا کر اللہ کی حکومت قائم کرنی ہے جس کی کوئی شہادت قرآن وحدیث میں نہیں ملتی ہے اور حضرت ربعی بن عامرؓ اور ایرانی سپہ سالار کے درمیان ہونے والے مکالمہ سے استدلال کرنا بالکل غلط ہے۔

مولانا اصلاحیؒ نے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کا دلائل کی روشنی میں بہترین انداز میں جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دنیاوی اعتبار سے ہر قوم غلبہ واقتدار کی خواہاں ہوتی ہے تو اگر مسلمان اس کے خواہش مند ہیں تو کیا برائی ہے؟ اس پر مستزاد ان کی یہ خواہش تو ان کا عین فرض منصبی ہے جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے، اسی وجہ اور بنیاد کی بنا

پر پوری اسلامی تعلیمات کے ذخیرہ میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا ہے کہ مغلوب ہوکر زندگی گزاری جائے، اس کے مقابلہ میں جو لوگ قدرت بھر کفریہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں انھیں ان کے برے انجام سے ڈرایا گیا ہے لہذا دانشوری کے زعم میں کم ہمتی اور مرعوبیت پیدا کرنے کے بجائے مسلم قوم میں ہمت اور جوش پیدا کرنا زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا تاکہ مقصد وہدف کو آسانی کے ساتھ حاصل کیا جاسکے۔

مزید برآں مولانا اصلاحیؒ نے اس رسالہ میں مذکور مولانا وحید الدین خاں کے کئی افکار ونظریات کا تعاقب کرتے ہوئے انھیں غلط بتایا ہے جو انھوں نے مذکورہ بالاعنوان کے ضمن میں بیان کیا ہے جن میں ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال، گڈ انڈین اور گڈ مسلم کی صحیح تعبیر، ان کی حدود اور ان میں پائے جانے والا فرق، عالمی قومیت کا صحیح مفہوم، سیاست کی اہمیت وضرورت، صحیح یا غلط ہونے کا معیار کیا ہوگا؟ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے؟ مختلف مواقع کے اعتبار سے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرنا، اقوام متحدہ کی حقیقت، امام اور قائد کی بنیادی حیثیت اور اس میں فقہ کی رہنمائی، شاتم رسول اللہ ﷺ (سلمان رشدی وتسلیمہ نسرین) کی حیثیت، دینی لٹریچر کا مقام ومرتبہ، قدیم مسائل اور ان کے جدید دلائل، جدید علوم میں پچھڑنے کے نتائج، سیکولرزم اور اسلام اور ان کے درمیان پایا جانے والا فرق، جنگ وجدال وجہاد اسلامی، بنک کا سود، اسلامی مشن کی تعریف، سہل امر کا اختیار کرنا، اسلام کا سیاسی نظام، جنگ میں پہل کرنا، ملک کے دستور کی پابندی خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، اسلام کا امن پسند مذہب ہونا، مسلم وغیر مسلم حکمراں کے ساتھ برتاؤ، مولانا مودودی علیہ الرحمہ کی کتاب ''تنقیحات'' پر تنقید اور آیت قرآنی {وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ الخ} سے استدلال جیسے مباحث شامل ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ ان مباحث میں موجود غلطیوں کو عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں اجاگر کرنے سے قبل مولانا وحید الدین خان صاحب کی کتاب ''اسلامی فکر'' سے اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ قاری یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ سکے کہ انھوں نے کیسے کیسے غلط استدلال اور غلط نتائج برآمد کیے ہیں۔

بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں

بجواب مولانا وحید الدین خان، مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، ۳۲؍صفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

اس رسالہ میں مولانا وحید الدین خان صاحب کے اس خیال کا نقلی وعقلی دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے جس میں وہ مسلمانان ہند کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں بابری مسجد سے ان کی دستبرداری شرعاً درست ہے۔ انھوں نے اپنے اس خیال کو الرسالہ (مئی ۱۹۹۳ء) میں سہ نکاتی فارمولہ کی شکل میں پیش کیا تھا۔ مذکورہ رسالہ کا مقصد تحریر مولانا اصلاحیؒ نے اس سہ نکاتی فارمولہ کے حوالہ سے پیش کیے جانے

والے شرعی دلائل کا جائزہ لینا بتایا ہے۔اس ضمن میں مولانا اصلاحیؒ نے یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے کہ وہ خان صاحب کے افکار اور ان کے دلائل کو نمبروار بیان کرتے ہیں پھر ان دلائل پر اپنے اشکالات درج کرتے ہیں اور ان دلائل کا صحیح مفہوم و معنی بیان کرتے ہیں:

☆خان صاحب کے بقول ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد صورت حال کی تبدیلی کے نتیجہ میں کام کا ایک نیا نقشہ بنانے کی ضرورت ہے جو عین شریعت کی منشاء کے مطابق ہے کہ اضطراری حالت میں احکام بدل جاتے ہیں۔

اس دلیل کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا محترم نے لکھا ہے کہ خان صاحب بات تو نیا نقشہ بنانے کی کرتے ہیں لیکن دست بردار ہوجانے کی شکل میں نیا نقشہ بنانے کی کیا ضرورت باقی رہ جائے گی۔اسی طرح اضطراری حالات میں حکم کا بدلنا بالکل صحیح ہے لیکن اس کا اطلاق ہر جگہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ حکم کی وہ تبدیلی بہت محدود پیمانہ پر ہوتی ہے۔اس دلیل کو ماننے کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس شکل میں قرآن وحدیث مصدر و مآخذ نہ قرار پا کر حالات مصدر قرار پائیں گے اور صورت حال 'چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی' جیسی ہوجائے گی۔دوسری دلیل یہ ہے کہ منصوص امر میں حالات کی تبدیلی سے احکامات نہیں تبدیل ہوتے ہیں اور مساجد کو آباد کرنا منصوص امر ہے لہٰذا اس قاعدہ کا اطلاق یہاں نہیں کیا جاسکتا ہے۔مولانا اصلاحیؒ نے دیگر اور دلائل دیئے ہیں جس سے خان صاحب کا دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔مختلف مثالوں کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ 'مسجد ہر حال میں مسجد ہی رہے گی اور مسلمان اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے ہیں اور اس کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری ہر حال میں باقی رہے گی، یہ الگ بات ہے کہ ذمہ داری کی نوعیت میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہوجائے۔

خان صاحب کی دوسری دلیل کہ:

☆اسلام نتیجہ خیز اعمال پر ابھارتا ہے اور تلقین کرتا ہے لہٰذا جس عمل کا کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوسکے اسے چھوڑ نا ہی بہتر ہے اور اسے اسلامی عمل نہیں قرار دیا جاسکتا ہے لہٰذا مسجد سے دست برداری بالکل درست ہے کہ اس کے نتیجہ میں مسلمان محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں۔

اس دعویٰ کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا اصلاحیؒ نے فرمایا ہے کہ ان کا فرمانا بالکل بجا ہے لیکن ان جیسے صاحب علم کو اس بات کے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام نے کسی بھی عمل کی نتیجہ خیزی کا پیمانہ دنیا کو نہیں بلکہ آخرت کو قرار دیا ہے لہٰذا وہ عمل جس کا صحیح نتیجہ آخرت میں برآمد ہوگا تو اسے چھوڑا نہیں جاسکتا ہے چاہے دنیاوی اور ظاہری طور پر وہ فضول محسوس ہوتا ہو۔مسجد کا شمار شعائر اللہ میں ہوتا ہے اور اس سے دست بردار نہیں ہوا جاسکتا کہ اس کی حفاظت وصیانت کا نتیجہ آخرت میں ہی سامنے آئے گا۔

جہاں تک مسلمانوں کے محفوظ و مامون رہنے کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے ان کی حفاظت ہر زمانہ میں ضروری ہے اس کے لیے بابری مسجد کی شہادت سے پہلے اور اس کے بعد کا دور ہونا ضروری نہیں ہے کہ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے بھی مسلمان تاخت و تاراج کیے جاتے رہے ہیں تو اگر شہادت کے بعد بھی کیے جائیں گے تو بنیادی طور پر کیا فرق پڑے گا؟ لہٰذا اس اندیشہ کی بنیاد پر بھی مسجد سے دستبردار ہونے کی دعوت دینا بالکل بیکار ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے تحفظ کا قرآنی اصول {يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ} بیان کیا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر ہی مسلمان محفوظ و مامون ہو سکتے ہیں کہ اللہ کے گھر کی حفاظت کرنا اور بازیابی کے لیے کوشش کرنا بھی اللہ کی مدد کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی آیات قرآنیہ کو نقل کرتے ہوئے مسلمانوں کی حفاظت کے تین طریقے۔ صرف اللہ پر بھروسہ کرنا، غفلت کو چھوڑ کر باہوش ہو جانا اور امکان بھر طاقت حاصل کرنا۔ بیان کیے ہیں۔

خان صاحبؒ کا ایک اور دعویٰ:

☆ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت تھے لیکن قرآن کریم کا انھیں وہاں سے ہٹانے کے بجائے اخلاقی حالت کو درست کرنے کا حکم دینا اس بات پر شاہد ہے کہ حالات کے مطابق طریقۂ کار اختیار کیے جائیں گے۔

خان صاحب کے اس دعویٰ کو بھی مولانا اصلاحیؒ نے بے بنیاد بتایا ہے کیونکہ قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کی تعمیر خالص توحید کے لیے ہوئی تھی یعنی اسے ہر حال میں پاک رکھنا ہے اور جہاں تک {وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ} کا تعلق ہے تو اسے سیاق سے ہٹا کر نہیں دیکھا جا سکتا کہ اس سے پہلے {قُمْ فَاَنْذِرْ} ہے اور بعد میں {وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ} ہے جس کے ذریعہ اس کشمکش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عہد مکی میں درپیش تھی جس کی تائید {قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ} اور {قُلْ يَآاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ} سے ہوتی ہے۔ اسی طرح بت پرستی کے تعلق سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رویہ سے مشرکین مکہ کس قدر ڈرے ہوئے یا برہم تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس عمل سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بڑی سے بڑی پیشکش بھی ٹھکرا دی تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرز عمل کو صرف ''اخلاقی حالت'' سدھارنے پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ مولانا اصلاحیؒ نے مکہ میں مسلمانوں کے حالات کو ہندوستانی مسلمانوں کے مقابلہ میں ہزارہا درجہ بدتر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ کسی تائید و مدد کے نہ ہونے کے باوجود حالات کے سامنے ڈٹے رہے تو ہمارے لیے کیوں کر مناسب ہو سکتا ہے کہ حالات کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

☆ مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے ایک جگہ حضرت عبدالمطلب کے عمل سے بھی استدلال کیا ہے کہ مسجد سے دست بردار ہوا جا سکتا ہے۔

مرحوم کے اس استدلال کا جواب مولانا اصلاحیؒ نے یہ دیا ہے کہ کیا ان کے کسی عمل کو شرعی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ ان کا انتقال کفر کی حالت میں ہوا ہو؟ مولانا محترم نے حضرت عبدالمطلب اور ابرہہ کے واقعہ سے خان صاحب کے نتیجہ کے بالکل خلاف نتیجہ نکالا ہے کہ کفر و شرک کی حالت میں ہونے کے باوجود انھوں نے حرمت کعبہ کا سودا نہیں کیا تو ہمارے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ہم حالت توحید میں مساجد کا سودا کر لیں؟!

☆ مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے اپنے سہ نکاتی فارمولہ میں آیت کریم {لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا} سے بھی استدلال کیا ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ اس قدر گمبھیر ہو چکا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس کو حل کرنے اور اس کی حفاظت کے مکلف نہیں رہے۔

مولانا محترم نے اس دلیل کو بھی غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اب اللہ بابری مسجد کے حوالہ سے ان سے باز پرس نہیں کرے گا لیکن اس سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے انہدام کو قبول کر لیں اور کوئی راضی نامہ لکھ کر دے دیں اور اپنی جان کی امان پائیں۔ انھوں نے عقلی دلائل دیتے ہوئے مسجد سے دست برداری کو بالکل غلط اور اسے اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہونا قرار دیا ہے۔

☆ مولانا وحیدالدین خان صاحب نے بابری مسجد کی شہادت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال کو اضطراری قرار دیا ہے جس میں شرعی حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے انھوں لکھا ہے کہ کروڑہا مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے پیش نظر مسجد سے دست بردار ہونا ہی بہتر ہے۔

مولانا محترم نے مرحوم کے اس دعویٰ کو بھی دلائل کی روشنی میں غلط فیصلہ اور ایک باعزت موت کو بے عزتی کی زندگی سے بہتر قرار دیا ہے اور اپنی بات کی تائید میں قرآن کی کئی آیات کو نقل کیا ہے جن میں سے ایک {لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ} بھی ہے۔ اس آیت کے مشہور معنی و مطلب 'اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو' کے برخلاف ایک نیا معنی و مطلب بتایا ہے کہ اللہ کی راہ میں جان چرا کر اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ مولانا محترم نے اضطرار کے حوالہ سے خاں صاحب کے موقف کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان کے دعویٰ کو عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں غلط ثابت کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے جس میں مسلمانوں نے اجتماعی طور پر معصیت کا ارتکاب کیا ہو۔ مولانا مرحوم کی نظر میں بابری مسجد سے دست برداری اجتماعی معصیت کے مترادف ہے جس کی جواب دہی سے آخرت میں نہیں بچا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اضطرار کے حوالہ سے مولانا محترم نے اپنی بات کو رسالہ کے شروع میں ہی بیان کر دیا تھا تو اسے یہاں دوبارہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں انھوں نے اس کا ذکر ضمناً کیا تھا اور یہاں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

☆ مولانا وحید الدین خان صاحب نے اپنے سہ نکاتی فارمولہ میں آپ ﷺ کا دو امور میں سے سہل امر کو اختیار کرنے سے بھی استدلال کیا ہے۔

اس استدلال کو بھی مولانا محترم نے غلط ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کے اس عمل کا تعلق دو صحیح امور سے تھا نہ کہ ایک غلط اور ایک صحیح امر سے۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی غلط اور صحیح امر میں سے آسان کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے غلط اور صحیح امر کے درمیان ہمیشہ صحیح امر کو اختیار کیا تھا چاہے وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ آپ ﷺ کے جس طرز عمل سے استدلال کیا جا رہا ہے وہ دو صحیح امور میں سے آسان امر کو اختیار کرنے کے حوالہ سے ہے نہ کہ غلط اور صحیح امر میں سے آسان کو اختیار کرنا ہے۔ بابری مسجد کا مسئلہ بھی غلط اور صحیح کا مسئلہ ہے جس میں غلط مسئلہ۔ مسجد سے دست برداری۔ کو اختیار کرنے کے لیے آپ ﷺ کے طرز عمل کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

☆ مولانا وحید الدین خان صاحب نے آخری استدلال یہ کیا کہ بابری مسجد سے دست برداری کوئی نئی چیز نہیں ہے کیونکہ مسلمان پچھلے پچاس سالوں میں ہریانہ اور پنجاب کی کئی مساجد سے دست بردار ہو چکے ہیں اور انھوں نے اس ضمن میں نہ تو کوئی تحریک چلائی اور نہ ہی کوئی احتجاج کیا۔

مولانا محترم نے اس دلیل کو ظاہری طور پر خوشنما قرار دیتے ہوئے اسے بالکل بودا ثابت کیا ہے کہ کسی غلط نمونہ کو دوسرے غلط کام کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ ان مساجد کے حوالہ سے مسلمانوں نے کسی قسم کا احتجاج یا تحریک نہیں چلائی تو یہ بات غلط ہے کیونکہ اس حوالہ سے بھی احتجاجات درج کرائے جا چکے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے کہ بڑے پیمانہ پر اسے انجام نہیں دیا گیا ہے۔

رسالہ کے آخر میں مولانا وحید الدین خان صاحب کے سہ نکاتی فارمولہ کو اس لحاظ سے غلط قرار دیا گیا ہے کہ وہ انہدام مسجد اور تعمیر بت خانہ پر مسلمانوں کے اظہار رضامندی کا مطالبہ کرتا ہے جسے قبول کرنا غیرت خداوندی کو للکارنا اور اس کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

اس رسالہ کے نام میں بھی ان کی دیگر کتب کی فہرست میں مذکور عنوان میں جزوی اختلاف پایا جاتا ہے۔

جاہلیت کے خلاف جنگ

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدر آباد، ۸۸؍ صفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

اس رسالہ میں مولانا اصلاحیؒ نے جاہلیت کی مختلف شکلوں کو مختلف آیات کی روشنی میں اجاگر کرتے ہوئے ہر اس عمل کو جاہلی عمل قرار دیا ہے جس میں حق کے خلاف عقائد، جذبات، خیالات اور اعمال واخلاق پائے جاتے ہوں، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ اسلام کی مکمل ضد ہے کہ اول الذکر کی بنیاد علم پر اور ثانی الذکر کی بنیاد جہل پر ہے اور اس زمانہ کو زمانۂ جاہلیت سے اسی لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ انسان نے علم کے بغیر محض وہم وگمان، قیاس اور نفسانی خواہشات کے تحت زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا لہٰذا زندگی گزارنے کا یہ طریقہ جب بھی اور کہیں بھی اختیار کیا جائے گا اسے جاہلیت سے ہی موسوم کیا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے علم کی حیثیت 'جزوی علم' کی ہے جو انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہوسکتا ہے لہٰذا جزوی علم کے حصول کے باوجود علم الٰہی سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا اسے بھی جاہلیت سے ہی موسوم کیا جائے گا۔

مولانا مرحوم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت وبعثت کے بعد کی ۲۳؍سالہ زندگی کو جاہلیت سے برسرِ پیکار رہنے اور اس کے معمولی سے معمولی شاخسانہ سے بھی سمجھوتہ نہ کرنے سے تعبیر کیا ہے جس کی تاکید قرآن میں بار بار کی گئی ہے اور بصورت دیگر وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرز عمل کو حق وباطل کے لیے پیمانہ قرار دیتے ہوئے مولانا مرحوم نے یہ لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرز عمل سے حق وباطل کے قافلوں کی راہیں الگ ہوجاتی ہیں اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ کون حق پرست ومخلص ہے اور کون محض حق پرست ہونے کا دعویدار ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے قرآن میں مذکور اصحاب اخدود، حضرت خباب بن ارت، حضرت حبیب بن زید، حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود اور عثمان بن مظعون رضی االلہ عنہم (بالترتیب) کے واقعات کو نقل کیا ہے اور ان کے جذبۂ ایمانی اور ذوق شہادت کو سلام پیش کیا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں اپنے اسلام سے ایک انچ بھی نہیں کھسکے اور نہ ہی کبھی رخصت پر عمل کیا۔ ان واقعات کو نقل کر کے انھوں نے یہ بات کہی ہے کہ ان کے ان اعمال کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟ ان کے اس طرز عمل سے ہمارے دعوتی طرز عمل سے کوئی مناسبت ومشابہت نہیں ہے کہ ان کے یہاں حکمت کوشیاں نہیں تھیں اور ہمارے یاں صرف حکمت ہی حکمت پائی جاتی ہے اور ہم اس نام نہاد حکمت کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں، اگر ہمیں دعوت کے کام میں کامیاب ہونا ہے تو ہمیں سود وزیاں کی پرواہ کیے بغیر سلف کی ہی پیروی کرنی ہوگی کیونکہ ایمان اور یقین کا جہاں، عقل وخرد اور دانشوری کے جہاں سے بہت زیادہ آگے ہے۔

جاہلیت کی تعریف اور اسلاف کے طرز عمل کو بیان کرنے کے بعد مولانا مرحوم نے قرآن وحدیث کی روشنی

میں ’جاہلیت سے جنگ‘ کرنے کے طریقوں اوران کے لیے استعمال کی جانے والی مصطلحات کا ذکر کیا ہے جیسے اگر جاہلیت کو دل و دماغ کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے تو اسے تعلیم کتاب اور تزکیۂ نفس سے موسوم کیا جائے گا، اگر جاہلیت کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنا اوراس کے انجام بد سے بچانا مقصود ہو تو اسے انذار وتبشیر اور دعوت وتبلیغ کا نام دیا جائے گا اور اگر آگے بڑھ کر باطل کے پنجوں کو مروڑنے کی کوشش کی جائے تو اسے جہاد کہا جائے گا اور ان سب کو جاہلیت سے جنگ کرنے کے مختلف مراحل اور طریقے قرار دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ان اصطلاحات کی تکمیل بھی اسلامی شریعت کی طرح بتدریج ہوئی ہے جس کا جامع نام ’’جہاد‘‘ ہے کیونکہ قرآن وسنت میں جاہلیت کو بنیاد سے ختم کرنے کی جو اصطلاح ملتی ہے وہ جہاد ہی ہے جس کے دو بنیادی شعبہ جات ہیں: پہلا دعوت وتبلیغ اور دوسرا قتال۔

بنیادی قاعدہ کے مطابق آخری مرحلہ میں دیئے جانے والے احکامات کی پابندی کی جائے گی لہٰذا یہ کہنا کہ ابھی ہم دعوتی مرحلہ میں ہیں اور اس مرحلہ میں جہاد کی بات کرنا مناسب نہیں ہوگا، صحیح نہیں ہوگا۔ مولانا مرحوم نے اس کے بعد مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کیا ہے کہ قرآن میں جو بھی حکم دیا گیا ان سب پر عمل کرنا ہے، ان میں سے کسی پر عمل کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہوگا جیسے نماز قائم کرنے کے ساتھ زکوۃ دینے کا بھی حکم ہے لیکن ہماری ساری توجہ نماز کے قیام پر لگی ہوئی ہے اور زکوۃ کی ادائیگی کے تئیں نماز جیسی فکر نہیں ہے۔ دعوت وتبلیغ کے تو قائل ہیں لیکن جہاد کے نام سے بھڑک جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ حالانکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد پر عمل کرنا بالکل یکساں انداز میں کسی بھی مومن کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔

مولانا مرحوم نے جہاد کے حوالہ سے اس غلط فہمی کو بھی دور کیا ہے کہ جہاد کا حکم مدنی دور میں دیا گیا ہے اور ہمارے حالات مکی دور جیسے ہیں۔ ان کے مطابق قرآن میں احکام کی ترتیب مکی ومدنی دور کی بنا پر نہیں ہے بلکہ پہلے مدنی سورتیں ہیں جن میں اجتماعی احکام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کے احکام میں بھی مکی ومدنی سورتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر اس ترتیب کو بنیاد بنایا جائے گا تو انسان بہت سے اجتماعی احکامات کا انکار کر بیٹھے گا کہ ابھی ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں لہٰذا احکام پر عمل درآمد شرائط کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ مکی ومدنی دور میں پائے جانے والے فرق کی بنیاد پر۔ انھوں نے اس ضمن میں اس نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس طرح کسی حکم پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح اس حکم کی لازمی شرائط کی تکمیل کرنا بھی ضروری ہے جیسے نماز کے لیے طہارت ووضو ضروری ہے تو نماز پڑھنے والے کے لیے پانی کا بندوبست کرنا بھی ضروری ہے تو جہاد کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے اس کی شرائط بھی پوری کرنے کی فکر ہمیں کو کرنی ہوگی۔

اس کے بعد انھوں نے جہاد کی فرضیت کے اسباب وعلل کو قرآنی آیات اوراحادیث نبویہ کی روشنی میں بیان کیا ہے اوراس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جہاد فرض ہے، یہ الگ بات ہے کہ علماء کی اکثریت کے نزدیک وہ فرض عین کے بجائے فرض کفایہ ہے، بعض علماء اسے فرض عین اور بعض اسے مستحب قرار دیتے ہیں۔ مولانا مرحوم علماء وفقہاء کے اقوال کی روشنی میں تین صورتوں میں جہاد کو فرض عین مانتے ہیں اور فقہاء کے اقوال وغیرہ کو بیان کرنے کے بعد سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۲۹ کے معانی ومفاہیم کو مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی علیہم الرحمہ کی تفاسیر کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جزیرۃ العرب کی حد تک جہاد کی علت صرف کفر ہے جب کہ دیگر علاقوں کے لیے کفر تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن غلبۂ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا گویا جزیرۃ العرب کے علاوہ دیگر مقامات پر جہاد کی بنیادی علت ''غلبۂ کفر'' کو قرار دیا جائے گا۔ علت بیان کرنے کے بعد انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو آزاد، بالغ، صحت مند وطاقت ور اور عاقل ہونے کے ساتھ ساتھ کسی جسمانی عیب، ضعف اور مالی تنگ دستی سے دوچار نہ ہو لیکن اگر شہر کی مدافعت کا مرحلہ درپیش ہو تو ان میں سے بہت سی شرطیں ساقط ہوجائیں گی جیسے غلام کا اپنے مالک سے اور بیوی کا اپنے شوہر سے اجازت لینا وغیرہ۔

مولانا مرحوم کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے اس وقت ساری دنیا میں کفر کا غلبہ اور بول بالا ہے لہذا ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے جہاد کرنا فرض ہے چاہے کچھ شرائط نہ پائی جاتی ہوں جیسے امیر کا ہونا، نہ جہاد کی فرضیت کے لیے اور نہ ہی اس کی ادائیگی کے لیے شرط ہے، وہ صرف فرض کی ادائیگی کی صحت کے لیے شرط ہے۔ چونکہ وہ شرائط کے ساتھ ان کی حصولیابی کے لیے کوشش کرنے کے قائل ہیں لہٰذا ان کی نظروں میں امیر کی شرط کو پورا کرنے کی کوشش نہ کرنا گناہ ہے۔

اس کے بعد انھوں نے دو جواب طلب سوال کیے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے رسالہ ''ملت کے دفاع کا مسئلہ، شریعت کی روشنی میں'' کرچکے ہیں اور تقریباً انھیں باتوں کو یہاں بھی نقل کردیا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملت کے دفاع کا مسئلہ نامی رسالہ کے صفحہ نمبر ۱۵ تا ۲۹ کے مباحث اس رسالہ میں بہت معمولی فرق کے ساتھ نقل کردیئے گئے ہیں کہ اس رسالہ میں دفاع کی اہمیت کو قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ فقہی کتب کی روشنی میں بھی بیان کیا گیا ہے اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کو نقل کرتے ہوئے دفاع کی حکمت عملی کا ذکر کیا گیا ہے لہٰذا ان مباحث سے یہاں صرف نظر کیا جارہا ہے۔

بعد ازیں مولانا محترم نے جہاد کا لغوی اور شرعی مفہوم بیان کیا ہے اور اسے احادیث نبویہ سے مزین کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ جہاد کے زمرہ میں ہر وہ کام شامل ہے جو رضائے الٰہی کے لیے کیا جائے مگر جب قرآن وحدیث میں اس کا مطلقاً ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب کفار سے جنگ ہی ہوتا ہے اور اسی کی ترغیب دلانا مقصود ہوتا ہے اور جہاد کی یہی شکل کفر کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دعوت وتبلیغ اور انذار وتبشیر سے صرف صالح ارواح کو متاثر کیا جاسکتا ہے لیکن اشرار کی بیخ کنی صرف عملی جہاد سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک ضعیف روایت کا ذکر کرتے ہوئے قرآنی آیت {لَايَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ ...الخ} کے تفسیری نکات مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ کی تفسیر سے نقل کرتے ہوئے اپنی بات کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

لغوی اور شرعی مفہوم کو طے کرنے کے بعد جہاد کے فضائل، ترک جہاد کے رذائل کو قرآن وحدیث سے اجاگر کرتے ہوئے حکم جہاد کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ کن کن مراحل سے گذرا ہے۔ اس کے بعد جہاد کو دو خانوں میں منقسم کیا ہے اور دونوں قسم کے احکام اور جہاد کے مقاصد کو نقلی وعقلی دلائل سے مزین کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ رسالہ کا اختتام ''اشاعت دین میں جہاد کا اثر'' جیسے مبحث پر ہوتا ہے جس کا ذکر انھوں نے دلائل کی روشنی میں کیا ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، ۵۶ رصفحات، طبع سوم، نومبر ۲۰۰۵ء

مولانا مرحوم کا یہ رسالہ سب سے پہلے ایم بی مظہری مرحوم نے جامعہ مظہرالعلوم، بنارس سے شائع کیا تھا اور ۷۲ رصفحات پر مشتمل تھا۔ پچھلی صدی کی ساتویں دہائی میں چھپنے والے اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی علیہ الرحمہ، ایڈیٹر ''صدق جدید'' (شمارہ ۹ رفروری ۱۹۶۸ء) اور مولانا محمد عامر عثمانی علیہ الرحمہ، ایڈیٹر ''تجلی'' (شمارہ جولائی واگست ۱۹۶۸ء) نے اس پر عمدہ تبصرے شائع کیے تھے اور اسے موضوع پر ایک اچھا رسالہ قرار دیا ہے۔ ان تبصروں کو اس رسالہ کے تیسرے ایڈیشن کے پبلشر نے بطور 'تعارف' رسالہ کے شروع میں شامل اشاعت کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا عبدالرشید گنگوہی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا اعجاز احمد علیہم الرحمہ کی تحریریں بھی موضوع کی مناسبت کی وجہ سے رسالہ کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔

ظاہری طور پر یہ رسالہ کسی کے رد میں نہیں لکھا گیا ہے لیکن مولانا محمد عامر عثمانی علیہ الرحمہ نے اپنے تبصرہ میں اس امکان کا ذکر کیا ہے کہ وہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی علیہ الرحمہ کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن چونکہ انھیں اس بات کا مکمل یقین نہیں تھا لہٰذا انھوں نے مولانا اکبرآبادی علیہ الرحمہ کی تحریر کو ''محرک

خصوصی'' قرار دیا ہے۔

رسالہ کی ابتداء تمہید سے ہوتی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے مباحث مسلمانوں کی حکمرانی کے دور سے لے کر ماضی قریب تک زیر بحث رہے ہیں۔ مولانا مرحوم کی نظر میں آزادی کے بعد اس مبحث پر بھی دیگر مباحث جدیدہ جیسے سود وغیرہ کی طرح بحث ہونی چاہیے تاکہ موجودہ حالات میں کوئی منصوبہ بندی کی جاسکے۔ اس کی تالیف کا مقصد اور طریقۂ کار بیان کرتے ہوئے مولانا محترم نے لکھا ہے کہ ''تقسیم ہند کے بعد قومی وجمہوری نظام حکومت میں ملت اسلامیہ کی صحیح پوزیشن کو متعین کرنے کے لیے دارالاسلام ودارالحرب کی بحث چھڑنی ہی چاہیے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ مختصر کتابچہ تیار کیا گیا ہے جس کی تمام تر بنیاد اصل ماخذ پر رکھی گئی ہے، اسے ایک فتوی نہ سمجھا جائے، اس کے ذریعہ مسئلہ کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی ایک کوشش کی گئی ہے جس سے مسئلہ کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی، اگر ایسا ہوگیا تو ہمارا مقصد حاصل ہوجائے گا۔''

مولانا مرحوم نے مختصر سی تمہید کے بعد مسلمانان عالم کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے:

☆ وہ جو اسلامی اسٹیٹ میں شرعی امیر کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اور وہاں اسلام ہی بنیادی دستور ہو اور اللہ کی حاکمیت قائم ہو۔

☆ وہ جو غیر اسلامی اسٹیٹ میں غیر شرعی امیر -یعنی جمہوری حاکم یا ڈکٹیٹر وغیرہ- کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اور وہاں اسلام بنیادی دستور بھی نہ ہو، اس سے قطع نظر کہ وہ حکومت میں شریک ہوں یا نہ ہوں اور ان کو دوسروں کے مقابلہ میں حقوق مل رہے ہیں یا نہیں مل رہے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں شرعی احکامات الگ الگ ہوں گے کہ پہلی شکل میں جہاد بالسیف کیا جائے گا اور حدود وتعزیرات پر عمل ہوگا اور دوسری صورت میں مخصوص صورت حال جیسے دفاع وغیرہ کی شکل میں ہی جہاد ضروری ہوگا اور حدود وتعزیرات پر عمل شاذ ونادر ہی کیا جاسکتا ہے۔

اصل موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مولانا محترم نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دارالاسلام ودارالحرب سے متعلق جو بھی گفتگو کی جائے گی اس کا بنیادی تعلق مسلمانوں کی پہلی قسم سے ہے اور دوسری حیثیت سے رہنے والے مسلمانوں کے تعلق سے گفتگو ایک مستقل عنوان کے تحت آخر میں مختصر انداز میں کی جائے گی۔

اصل موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا علیہ الرحمہ نے دارالحرب کی اصطلاح پر ایک عمومی اشکال ظاہر کیا ہے کہ دارالاسلام کے مقابلہ میں دارالکفر کی اصطلاح کا استعمال ہونا چاہئے نہ کہ دارالحرب کا۔ اس کا جواب دیتے

ہوئے وہ کہتے ہیں کہ دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف ہیں کیونکہ متقدمین علماء نے دونوں اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ دارالحرب کی اصطلاح کو اس لحاظ سے فوقیت دی جاتی ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں سارے کفار و مشرکین محارب قرار دیئے جاتے ہیں۔ ضمناً مولانا محترم نے قتال کے فرضیت کی مختلف صورتیں، صلح کے جواز اور اس کی مختلف صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی بات کو دلائل سے مزین کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں ۔قتال اور صلح ۔ کے علاوہ کیا کوئی اور صورت بھی ہوسکتی ہے اور مشرکین کے ساتھ تعلقات کی بنیادیں کیا ہوں گی؟

اپنے سوال کا جواب دینے سے پہلے مولانا علیہ الرحمہ نے امام سرخسی کی کتاب المبسوط، الجزء العاشر سے ایک طویل عبارت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بیان سے دو حقیقت سامنے آتی ہے:

☆ مسلمانوں کے کفار سے باہمی تعلق کی صرف پانچ قسمیں ہوسکتی ہیں: اہل حرب، متامن، اہل عہد، ذمی اور مرتد۔ گویا یہ بات طے ہوگئی کہ مسلمانوں کے لیے کفار سے باہمی تعلق کے لیے ان پانچوں میں سے کوئی نہ کوئی شکل پائی جانی چاہیے، اس کے بغیر جو بھی فیصلہ کیا جائے گا وہ غلط اور غیر شرعی ہوگا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وطنیت و قومیت جیسے نئے تصورات و نظریات کی بنیاد پر ان کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، وہ غلط راہ پر چلتے ہوئے حقیقت کو فراموش کررہے ہیں کیونکہ اسلام کے علاوہ جتنے بھی نظریے پائے جائیں گے وہ سب کے سب کفر کے بطن سے پیدا ہوں گے، محض ان کا نیا ہونا انھیں اسلام سے قریب نہیں کرسکتا ہے اور نہ ہی اسلامی اقدار کسی بھی حال میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔

☆ مسلمانوں سے کفار کے باہمی تعلق کی صرف ایک شکل ہوسکتی ہے اور وہ جہاد ہے۔ بدرجہ مجبوری عارضی اور وقتی طور پر جہاد کے علاوہ کچھ اور نسبتیں قائم کی جاسکتی ہیں لیکن اس پر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی ہے۔ ضمناً انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جو مسلمان جہاد کے شعبۂ قتال میں شامل ہونے کی پوزیشن میں نہ ہو اس کے لیے جہاد کے شعبۂ دعوت میں لازماً شامل ہونا ہوگا۔

مسلمانوں کے کفار سے باہمی تعلق کے ضمن میں مولانا علیہ الرحمہ نے کچھ شبہات کا ذکر اور ان کا ازالہ دلائل کے ساتھ کیا ہے جیسے:

☆ اگر مسلمانوں کی کفار سے نسبت صرف جہاد کی ہے تو دعوت الی الدین کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس کا جواب مولانا محترم نے یہ دیا ہے کہ قتال کی طرح دعوت الی الدین بھی جہاد کا ایک شعبہ ہے گویا جہاد میں قتال اور دعوت دونوں شامل ہیں۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں صلح ومعاہدہ کے کیا معنی باقی رہ جائیں گے؟اس کا جواب مولانا مرحوم نے صاحب ہدایہ کا قول نقل کرتے ہوئے یہ دیا ہے کہ صلح بھی معنوی طور سے جہاد ہے کہ اس کا مقصد برائی کو دور کرنا ہے بصورت دیگر صلح جائز نہیں ہوگی۔

☆ جزیہ کی کیا حیثیت ہوگی؟۔اس حوالہ سے انھوں نے کئی جواب دیئے جن میں ایک یہ کہ اس کے ذریعہ انھیں اسلام کو سمجھنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ان کے علاوہ کچھ اور شبہات اور ان کے جوابات مولانا مرحوم نے نقل کیے ہیں۔

مسلمانوں کی کفار سے نسبت صرف جہاد کے ہونے کو ثابت کرنے کے بعد انھوں نے دارالاسلام کے معنی ومفہوم کو دلائل کے ساتھ اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں اسلام اور اس کے قوانین کا بول بالا ہوگا اسے ہی دارالاسلام قرار دیا جائے گا۔انھوں نے دارالاسلام کی دوقسمیں بتائی ہیں:

☆ جہاں شرک بالکل ناپید ہو اور وہاں صرف اسلام اور اس کے احکام کی عمل داری ہو جیسے حجاز، لہٰذا وہاں کسی مشرک کی گنجائش نہیں نکل سکتی ہے۔

☆ وہ ملک جہاں شرک کے وجود کو گوارا کیا جائے گا لیکن بالادستی دین حق کو حاصل ہوگی اور کفر وشرک کو کسی قسم کی قانون سازی کا اختیار نہیں ہوگا اور اہل شرک وکفر وہاں مکمل طور پر ماتحت بن کر رہیں گے۔

دارالاسلام کی مذکورہ بالا تقسیم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ملک جہاں مسلمان حکومت میں شریک ہوں لیکن قانون سازی کی بنیاد قرآن وسنت نہ ہو یا وہ ملک جہاں مسلمان حکومت میں شریک نہ ہوں اور نہ ہی قانون سازی کی بنیاد قرآن وسنت ہو لیکن کچھ مذہبی آزادی انھیں حاصل ہو انھیں دارالاسلام نہیں کہا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دلائل کی روشنی میں دور کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محض عیدین، جمعہ اور دیگر مذہبی امور پر عمل کرنے کی آزادی کی بنا پر کسی ملک کو دارالاسلام نہیں کہا جاسکتا ہے اور جو لوگ اس کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔وہ جن دلائل سے استدلال کرتے ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی ایک علامت مسلمان کا مامون ہونا بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں نکالا جائے گا کہ جہاں مسلمان مامون ہوگا وہ دارالاسلام ہی ہوگا کیونکہ دارالحرب میں بھی مسلمان بحیثیت مستامن مامون ہی ہوتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ مولانا علیہ الرحمہ نے امن وامان اور خوف کے مفہوم کو بھی واضح انداز میں اجاگر کیا ہے۔

دارالاسلام کے معنی ومفہوم کو متعین کرنے کے بعد مولانا محترم نے دارالحرب کے معنی ومفہوم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنی بات کو دلائل سے مزین کیا ہے۔ان کے مطابق دارالحرب ان ممالک کو کہا جائے گا

جہاں شرک فتنہ بننے کی پوزیشن میں ہو اور دین کل کا کل اللہ کا نہ ہو اور وہاں اسلام کو بالا دستی حاصل نہ ہو۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا مرحوم نے دارالاسلام اور دارالحرب کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) علیہم الرحمہ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کا جائزہ لیا ہے اور ان کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سے اجاگر کیا ہے جس سے دارالاسلام اور دارالحرب کا قضیہ دو دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے قضیہ کے ضمن میں انھوں نے دارالعہد اور دارالامن کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان اصطلاحات سے کیا مراد لیا جاتا ہے اور ان کے احکامات کیا کیا ہیں۔ اسی طرح مولانا محترم نے دارالحرب سے متعلق چند احکامات کا بھی ذکر کیا ہے جیسے دارالحرب میں مسلم قیدی کا کیا حکم ہوگا، دارالحرب پر کسی اور کافر ملک کے حملہ کے وقت مسلمانوں کا کیا رول ہوگا ؟ آیا وہ دفاع کی جنگ میں شامل ہوں گے کہ نہیں؟ دارالحرب میں کسی مسلمان کو دیگر مسلمانوں سے زبردستی جنگ میں حصہ لینے کے لیے کہا جائے گا تو اس وقت کے کیا احکامات ہوں گے؟

ان مباحث کے بعد انھوں نے اس قضیہ پر روشنی ڈالی ہے کہ بلا تنظیم اور بلا امیر رہنے والے مسلمانوں کے احکامات کیا ہوں گے اور وہ اپنی زندگی کیسے گزاریں گے؟ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان جیسے مسلمانوں کے لیے، اس بات سے قطع نظر کہ ان کے لیے ان ممالک میں کیا جائز اور کیا ناجائز ہے، اپنی زندگی کا بنیادی محور جہاد کو بنانا چاہیے اور اپنے آپ کو جہاد کی پوزیشن میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے اور جہاد کے جن جن شعبوں میں جہاد کی گنجائش نکلتی ہے، وہاں جہاد کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے فرض اعلاء کلمۃ اللہ سے سبک دوش ہو سکیں۔

رسالہ کے آخر میں انھوں نے بہت ہی مختصر انداز میں ہندوستانی مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی حیثیت دارالحرب کی ہے لیکن دارالحرب کے احکامات لاگو ہونے کے لیے مسلمانوں کا مکمل جہادی پوزیشن میں ہونا مشروط ہے جو یہاں مفقود ہے لہٰذا ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے باوجود مسلمانوں کی نسبت سے اس کے اکثر احکامات لاگو نہیں ہوں گے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔

راہِ سعادت

اس کتاب کا ذکر ان کی دیگر تصانیف کے اشتہار میں پایا جاتا ہے لیکن ان کے بلاگ پر موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، طبع دوم نومبر ۲۰۰۰ء، ۳۲رصفحات (طبع دوم)۔

اس رسالہ میں زکوٰۃ کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ رسالہ کی ابتداء چند نکات سے ہوتی ہے:

☆ زکوٰۃ کی ادائیگی اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے ادا کرنے والے کا دل مال ومتاع کی محبت سے پاک ہو چکا ہے۔ {خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا}۔

☆ زکوٰۃ کی ادائیگی اللہ اور بندہ کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی توثیق وتائید ہے {إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ}۔

☆ مال کی محبت انسان کی ساری بیماریوں کی جڑ ہے "حب الدنیا رأس کل خطیئة" اور "فتنة أمتي المال" لیکن جب مسلمان زکوٰۃ ادا کر دیتا ہے تو وہ بیماری اور فتنہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ان تمہیدی نکات کو بیان کرنے کے بعد زکوٰۃ کی اہمیت اور ہر نبی کی امت میں اس کے فرض ہونے کو قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے اور اسلام میں اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اکتیس آیات قرآنیہ میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے چند آیات کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کی اہمیت کو احادیث، اسوۂ صحابہ اور اسلامی قانون کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اہمیت اور فرضیت کو بیان کرنے کے بعد اس کے "ٹیکس ہونے" کی غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے اور اسے آقا اور بندہ کے درمیان ایک تعلق کی نشانی بتایا گیا ہے کہ بندہ اپنے آقا سے تعلق کی وجہ سے اپنے مال کا ایک حصہ اپنے رب کے حضور پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اس نکتہ کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ساری دولت کا حقیقی مالک اللہ ہے لہٰذا اس کے حکم سے اس میں تصرف کرنا، اللہ کے حق کو ادا کرنا ہے اور اسے ادا نہ کرنا اپنے مالک کی ناشکری کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ دینے سے مال میں کمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے اور وہ صحیح جگہ پر جمع ہو جاتا ہے کہ اس کی واپسی آخرت میں بہترین انداز میں ہوگی۔ اسی طرح اس کی ادائیگی کو جنت کے حصول اور مغفرت کا ذریعہ اور ادا کرنے والوں کے لیے اللہ کا ان کا حامی وناصر ہونا بھی بتایا گیا ہے اور اسے مصائب کو دور کرنے کا سبب بھی قرار دیا گیا ہے اور اس کو نہ ادا کرنا خسارہ کا سودا، مال کی ہلاکت، دردناک عذاب کا سبب قرار دیتے ہوئے اس کی ادائیگی کو منافع بخش تجارت کرنا بتایا گیا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کو مومن کی علامت اور عدم ادائیگی کو مشرک کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا تمام نکات کو مولانا علیہ الرحمہ نے قرآن واحادیث سے ماخوذ دلائل سے مدلل کیا ہے۔

براہِ راست زکوٰۃ کا ذکر نہ کرکے دیگر مواقع پر مال ودولت کے خرچ کرنے کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جیسے اللہ یہ فرماتا ہے کہ جو بندہ مجھے قرض دے گا وہ فائدہ میں رہے گا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو نیکی کی کنجی بتاتے ہوئے اس میں حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بات پر بھی ابھارا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا اچھا مال ہی خرچ کرنا چاہیے۔ اسلامی تعلیمات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرکے احسان جتانے سے منع کیا گیا ہے کہ ساری نیکیاں ضائع ہوجاتی ہیں۔

رسالہ کے آخر میں مصارف زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اور ہر مصرف کی مختصر تشریح کرتے ہوئے اس کا مفہوم متعین کیا گیا ہے۔ مبحث کے آخر میں ''چند ضروری مسائل'' کے عنوان کے تحت سونے چاندی کا نصاب، روپے کی زکوٰۃ، مال تجارت کی زکوٰۃ، غلہ کے نصاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم نے اس رسالہ کا اختتام ''زکوٰۃ کے مقاصد'' بیان کرتے ہوئے کیا ہے اور ضمناً اس کی اجتماعی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد آپ اور ہم ہر قسم کی خیر خیرات سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔

مولانا علیہ الرحمہ کا یہ واحد رسالہ ہے جو کسی موضوع کے رد میں نہیں لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے کہ پہلے زکوٰۃ سے متعلق تمام امور کو یکجا کردیا جائے پھر صدقہ وخیرات کا ذکر کیا جائے کیونکہ دونوں موضوعات ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے ہیں کہ زکوٰۃ پر گفتگو کے دوران صدقہ وخیرات کے فضائل شروع ہوجاتے ہیں اور پھر زکوٰۃ کو موضوع بحث بنالیا جاتا ہے۔

سیکولر جمہوری نظام، الیکشن، تحریک اسلامی

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، نومبر ۲۰۰۵ء، ۵۴ر صفحات (طبع دوم)۔

یہ رسالہ جماعت اسلامی کے الیکشن میں حصہ لینے کے فیصلہ کے ردعمل کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ میں حسب ذیل تین موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے:

☆ انقلاب امامت کا طریقہ کیا ہو؟۔ اس عنوان کے تحت مولانا علیہ الرحمہ نے پروفیسر عمر حیات غوری مرحوم کے اس مضمون کا جائزہ لیا ہے جو ''زندگی نو'' (اپریل ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوا تھا۔

☆ بنیادی فکر اور عقیدۂ توحید کے خلاف عمل۔ اس سرخی کے تحت مولانا علیہ الرحمہ نے ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم، سابق امیر جماعت اسلامی ہند کے اس مضمون کا جائزہ لیا ہے جو ''زندگی نو'' (جون ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوا تھا۔

☆ تحریک اسلامی کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس عنوان کے تحت جناب ریاض احمد صاحب مرحوم کے مضمون

''دعوت اسلامی کے مراحل'' کا جائزہ لیا گیا ہے جو''زندگی نو'' (جولائی ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوا تھا۔

رسالہ کی ابتداء اس سوال کے ساتھ ہوتی ہے کہ انقلاب امامت اور اسلامی انقلاب کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے جو اس وقت ایک عالمی سوال ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کا بھی ایک اہم موضوع بن گیا ہے۔ اس ضمن میں جماعت اسلامی کا نام لیے بغیر اس بات کی وضاحت کی گئی کہ ملک کا ایک بڑا طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ یہ مقصد الیکشن لڑکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں مولانا مرحوم نے''زندگی نو'' (اپریل ۱۹۹۸ء) میں شائع شدہ پروفیسر عمر حیات غوری مرحوم کے اس نقطۂ نظر کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے انقلاب برپا کرنے کے چار طریقوں۔ زیر زمین سازشیں، لاقانونیت، مسلح بغاوت اور جمہوری دستوری طریقے۔ کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں سے ابتدائی تین طریقوں کو یکلخت مسترد کردیا ہے اور چوتھے کو عقیدۂ توحید پر ضرب کا سبب قرار دیتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ انقلاب اسلامی کا کیا راستہ ہوسکتا ہے؟

مولانا مرحوم کا یہ رسالہ پروفیسر غوری کے نظریات کو غلط قرار دیتا ہے اور ان کے افکار وخیالات کا دلائل کی روشنی میں جائزہ پیش کرتا ہے۔ مولانا محترم نے رسالہ کے شروع میں مذکوران کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غوری صاحب نے اسلامی انقلاب کو دستوری وجمہوری طریقہ کے ساتھ گویا لازم وملزوم قرار دے دیا ہے اور انبیاء کے ذریعہ بپا کیے جانے والے انقلابات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ مولانا مرحوم نے الیکشن کو اسلام کی روح کے خلاف بتاتے ہوئے جماعت اسلامی کے اس دستور کا حوالہ دیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہوسکتا ہے۔ مولانا مرحوم نے ملک میں موجود جمہوری نظام کو طاغوتی نظام قرار دیا ہے اور اپنی بات کی تائید میں قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے اور اس بات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کا حصہ بننا قرآنی احکام کو پس پشت ڈالنا ہے۔ مولانا مرحوم نے صرف مرض کی تشخیص نہیں کی ہے بلکہ اس کا حل بھی پیش کیا ہے کہ اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کے جو طریقے قرآن میں اور انبیاء کرام کی تاریخ میں موجود ہیں ان پر عمل درآمد کرتے ہوئے اسلامی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالہ سے انھوں نے قرآن کریم کی متعدد آیات کے معانی ومفاہیم کو بیان کرتے ہوئے ووٹ دینے کو نہ صرف اسلام کی روح کے خلاف بتایا ہے بلکہ اسے غضب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف قرار دیتے ہوئے اس عمل کے مرتب ہونے والے غلط اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔

اسلامی انقلاب کے انبیائی طریقہ کار۔ دعوت، ہجرت اور جہاد۔ کا ذکر کرتے ہوئے ذمہ داران کو یہ بات یاد دلائی ہے کہ آپ کے خود کے لٹریچر میں۔ جیسے''دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار'' از مولانا امین احسن اصلاحیؒ۔

ان طریقوں کا ذکر بار بار ملتا ہے تو قرآن کی بتائی ہوئی اس صاف اور واضح شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں کی تلاش کیوں کی جارہی ہے اور دیگر راہیں اختیار کرنے پر کیوں زور دیا جارہا ہے؟

مولانا مرحوم نے اس ضمن میں ایک سوال اٹھایا ہے کہ کیا کسی طریقہ کو صرف اس لیے درست اور صحیح قرار دیا جائے گا کہ اس سے انقلاب امامت کی زیادہ توقع ہے؟ یہ سوال انھوں نے اس ضمن میں اٹھایا ہے کہ ووٹ کی سیاست کے قائلین کا کہنا ہے جمہوری طریقہ کو اختیار کیے بغیر اگر اسی فیصد افراد بھی تحریک اسلامی سے جڑ جائیں تب بھی انقلاب امامت کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس راستہ کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ مولانا مرحوم نے اس نقطۂ نظر کے حاملین کو غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی عمل کے درست وصحیح ہونے کا پیمانہ صرف قرآن وسنت ہے جسے آج کے جدید تعلیم یافتہ حضرات نظرانداز کرنے کی کوشش میں مبتلا ہیں جب کہ اس اصول کے قائلین میں مولانا مودودی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا عروج احمد قادری اور مولانا صدرالدین اصلاحی علیہم الرحمۃ جیسے اکابرین تحریک اسلامی شامل ہیں جن کے نزدیک ووٹ دینا عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ بعدازیں مولانا مرحوم نے اس بات کو دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ''ووٹ دینا کارگر نسخہ نہیں ہے'' کہ اس کے ذریعہ انقلاب امامت کا مقصد کسی بھی صورت میں حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے اور بطور مثال ان اسلامی ممالک کا ذکر کیا ہے جہاں جمہوری نظام کے باوجود اسلامی انقلاب بپا نہیں ہوسکا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک بہت اہم بات کا ذکر کیا ہے کہ اپنے اس عمل سے آپ 'ملک کی فلاح وبہبود کے لیے اسلام کے مقابلہ میں سیکولرزم کو ہندوستان کا مسیحا قرار دے رہے ہیں جو ہندوستان میں اسلام کا دروازہ بند کرنے کے مترادف ہے۔' مولانا مرحوم نے جمہوری نظام کی خامیوں کا ذکر ''الیکشن کے نقصانات'' کے عنوان کے تحت کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کا میعار دوستی کیا ہے؟ جن بنیادوں پر آپ جنھیں اپنا دوست بنا رہے ہیں یا سمجھ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ووٹ دینا بھی گناہ قرار دیا ہے کہ ارکان پارلیمان جو بھی غیر اسلامی قانون پاس کریں گے اس میں آپ کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہوگا۔ اسی طرح انھوں نے ووٹ دینے کے لیے صلح حدیبیہ سے استدلال کو بھی دلائل کے ذریعہ غلط قرار دیتے ہوئے حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سہولیات کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر امت اسی طرح مراعات کی عادی ہوتی چلی گئی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم خود ہی یہ کہنے پر مجبور ہوجائیں گے ہم پر رحم کرتے ہوئے ہمیں پسماندہ طبقات کی فہرست میں شامل کرلیجیے۔

جمہوری نظام اور الیکشن کی خامیوں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا محترم نے امت کی فلاح وبہبود کا واحد راستہ

’’انبیاء علیہم السلام کا اسوہ‘‘ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ’’حق رائے دہی، اقامت باطل کے لیے نہ کیجیے، حق کے لیے کیجیے، اگر اس کا موقع نہیں ہے تو انتظار کیجیے۔‘‘

رسالہ کے دوسرے مرکزی موضوع ’’بنیادی فکر اور عقیدۂ توحید کے خلاف عمل‘‘ کے تحت مولانا مرحوم نے الیکشن میں حصہ لینے کی بحث کو ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم، سابق امیر جماعت اسلامی ہند کے افکار وخیالات کی روشنی میں پیش کیا ہے اور ان کے نظریہ اور موقف کو بھی دلائل کی روشنی میں غلط قرار دیا ہے اور اسے جماعت اسلامی کی ’’بنیادی فکر‘‘ اور الیکشن میں حصہ لینے کو ’’عقیدۂ توحید کے خلاف عمل‘‘ ثابت کیا ہے۔

سابق امیر جماعت کے افکار وخیالات کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ تقریباً تیس برسوں سے چلنے والی اس بحث ۔الیکشن میں حصہ لینا اور ووٹ دینا۔ کو ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ایک مقام پر پہنچا دیا ہے اور اس عرصہ میں بہت سی باتیں متفقہ حقیقت بن کر سامنے آچکی ہیں جیسے جمہوری نظام کا ایک طاغوتی نظام ہونا وغیرہ۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ پروفیسر غوری اور ڈاکٹر انصاری علیہما الرحمہ الیکشن میں حصہ لینے کے قائل تھے اور دونوں نے اپنے اپنے نظریات وافکار کو تحریری شکل میں پیش کیا تھا۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب دونوں بزرگان کا مقصد ایک ہے تو ان کی تحریروں کا الگ الگ جواب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میری ناقص رائے میں مولانا مرحوم نے دونوں بزرگان کی تحریروں کا الگ الگ جواب اس لیے دیا تھا کہ اول الذکر تحریر الیکشن میں حصہ لینے کے اصولی مباحث پر مشتمل ہے لہٰذا مولانا مرحوم نے ان مباحث کی تردید عقلی ونقلی دلائل سے کی ہے، جب کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی تحریر سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مولانا مودودیؒ خود بھی الیکشن میں حصہ لینے کے قائل تھے لہٰذا مولانا مرحوم نے اپنی تحریر کے ذریعہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے مضمون سے پیدا ہونے والے غلط تأثر کو مولانا مودودیؒ کے فرمودات کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سیکولرزم اور جمہوریت کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے افکار وخیالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

رسالہ کی تیسری اور آخری سرخی ’’تحریک اسلامی کا نقطۂ نظر کیا ہے؟‘‘ ہے۔ مولانا مرحوم نے رسالہ کے اس حصہ میں جناب ریاض احمد صاحب کے مضمون ’’دعوت اسلامی کے مراحل‘‘ (زندگی نو، جولائی ۱۹۹۸ء) کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ’محترم مضمون نگار اپنے مقدمہ کو تو مضبوط نہ کر سکے بلکہ الٹے اپنے کئی ہم نواؤں کے خیالات کی تردید کر بیٹھے ہیں۔‘

مولانا مرحوم نے مضمون کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مضمون کے ذریعہ جماعت اسلامی کے دو فیصلوں ۔سیکولر گروپ کی تائید میں ووٹ ڈالنا اور فورم برائے قیام جمہوریت۔ کے لیے دلائل فراہم کیے

گئے ہیں۔ بقول مولانا مرحوم ان دونوں فیصلوں سے شدت کے ساتھ یہ تاثر ابھرا ہے کہ جماعت اسلامی ہند اپنے محور سے ہٹ چکی ہے۔اس تاثر کوختم کرنے کے لیے یہ مضمون لکھا گیا تھا لیکن وہ اس تاثر کوختم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

جناب ریاض احمد صاحب نے اپنے مضمون میں کئی آیات سے استشہاد کیا ہے،مولانا مرحوم نے ان کی جانب سے بطور استشہاد پیش کی جانے والی آیات میں سے ہر ایک کا الگ الگ جائزہ لیتے ہوئے ان کے اخذ کردہ نتائج کوغلط بتایا ہےاوران کی تحریر میں پائے جانے والے تضاد کواجاگر کیا ہےاوراس بات کا ذکر کیا ہے کہ ''فی نفسہٖ الیکشن میں حصہ لینے کا اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جوشکل فی الحال اختیار کی گئی ہے،کیاوہ صحیح ہےاورکیا کتاب وسنت اور خود دستور جماعت سے متصادم تونہیں ہے۔''

آخر میں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کتاب کے اندرونی صفحہ اور کتاب کی پشت پر،مصنف کی دیگر تصانیف کےتحت،اس کا نام ''سیکولر جمہوری نظام،الیکشن اورتحریک اسلامی'' درج کیا گیا ہے، جب کہ'' مجسّموں کا مسئلہ'' کی پشت پر مصنفؒ کی دیگر تصانیف کی فہرست کے ضمن میں اس کتاب کا نام ''سیکولر جمہوری نظام،انتخابات اوراسلام'' مذکور ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔

طاقت کا استعمال،قرآن کی روشنی میں

مکتبہ الاقصیٰ،سعید آباد،حیدرآباد،نومبر ۲۰۰۵ء،۴۶رصفحات۔

یہ رسالہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمن فریدیؒ کے دو مقالات کی تردید میں لکھا گیا ہے۔ رسالہ کا اکثر حصہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کے افکار وخیالات کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر صدیقی صاحب کا یہ مضمون زندگی نو(مارچ ۲۰۰۴ء) میں'' تشدد اور مسلمان'' کے نام سے شائع ہوا تھا جسے مضمون نگار نے اپنی کتاب ''اکیسویں صدی میں اسلام،مسلمان اور تحریک'' میں '' تشدد،اسلام اور تحریک اسلامی'' کے عنوان سے شائع کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالمی پیمانہ پر امریکہ کی اور قومی پیمانہ پر ہندوتو کے علم برداروں کے ظلم وستم یا ان کی کسی بھی قسم کی کارروائیوں کا جواب مسلمانوں کواس وقت عملی طور پر نہیں دینا چاہیے بلکہ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ مسلمانوں کے لیےابھی حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذاان کا ہرقدم ان کی مزید تباہی وبربادی پر منتج ہوگا۔مولانا مرحوم نے ان کے اس نقطۂ نظر کوقرآن واحادیث اور سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں غلط قرار دیتے ہوئے ایسانہ کرنے کو پوری قوم کی خودکشی کے مترادف قرار دیا ہے۔

رسالہ کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کو ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے کوئی اختلاف نہ ہوتا اگر وہ اپنے نقطۂ نظر کو قرآن وحدیث سے مدلل نہ فرماتے اور مسلمانوں کو اس بات کی دعوت نہ دیتے کہ ان ناسازگار حالات میں عالمی طاقت کے خلاف قدم اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ مولانا مرحوم نے طاقت کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دینے کو ہی غالباً اپنی اس تحریر کا سبب قرار دیا ہے کہ انھوں نے قرآن وسنت اور سیرت انبیاء کی روشنی میں جناب صدیقی صاحب کے نقطۂ نظر کو غلط قرار دیا ہے اور وقت وموقع پر طاقت کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

مولانا مرحوم نے جناب صدیقی مرحوم کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لینے سے پہلے ایک اہم پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ زندہ قومیں کسی بھی حال میں اپنا عزم وحوصلہ نہیں ہارتی ہیں اور وہ ہمیشہ حالات کے سامنے ڈٹی رہتی ہیں کہ انھیں قرآن وحدیث کے ذریعہ یہی سبق پڑھایا گیا ہے کہ سربلندی ان کا مقدر وقسمت ہے، اس شرط پر کہ وہ احکام خداوندی کی ہر حال میں پیروی کریں گے اور باطل کے سامنے کبھی بھی نہ جھکیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے اس مشورہ کو ان کے مقام ومرتبہ کے شایان شان نہیں قرار دیا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کو بے کسی اور مجبوری کی زندگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ اس کے بجائے اگر وہ یہ مشورہ دیتے کہ مسلمانو! بہت معمولی سی قربانی دینے کی ہمت کرو اور عزم وحوصلہ کے ساتھ ناسازگار حالات کے سامنے ڈٹے رہو تو زیادہ مناسب اور بہتر ہوتا۔

تمہیدی کلمات کے بعد مضمون کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا پورا مضمون ''اسلامی تشدد'' کی مخالفت پر محیط ہے۔ لہٰذا مولانا مرحوم نے مضمون کے مختلف اقتباسات کو نقل کر کے ان میں مذکور قابل اعتراض باتوں کا جواب دیا ہے جیسے تشدد کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ تشدد کسی بھی طرح روا نہیں ہے کہ تشدد کا مطلب ناحق، بے جا زور اور طاقت کے استعمال کو کہتے ہیں لہٰذا جرم کی سزا یا اپنے دفاع میں کی جانے والی کارروائی کو تشدد نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اگر جرم کی سزا یا اپنے دفاع میں کی جانے والی کارروائی کو تشدد قرار دیا جائے گا تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی زمانہ تشدد سے خالی نہیں رہا ہے اور دنیا ہمیشہ نہ صرف تشدد کی قائل بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والی رہی ہے۔ اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے تشدد کی تعریف کی گئی ہے اور اسے دلائل سے مزین کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس غلط فہمی کو بھی دور کیا گیا ہے کہ جہاد، تشدد نہیں ہے۔ مزید برآں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کرنا امت مسلمہ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا نکات کو مولانا مرحوم نے قرآن وحدیث سے مدلل کرتے ہوئے ڈاکٹر صدیقی کے غلط طرز استدلال، بے موقع بات اور تحریر میں پائی جانے والی افراط وتفریط وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے افکار وخیالات

میں پائی جانے والی خامیوں کو عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔

رسالہ کے آخری چند صفحات میں ڈاکٹر فضل الرحمن فریدیؒ، سابق مدیر ''زندگی نو'' کے اداریہ میں مذکور اسلامی نقطۂ نظر کے اعتبار سے قابل اعتراض باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔ جناب فریدیؒ کا یہ اداریہ زندگی نو (اگست ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ مولانا مرحوم کے بقول ''اشارات'' میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی توقع کسی عام مسلمان سے بھی نہیں کی جاسکتی ہے چہ جائیکہ اس کا کہنے والا جماعت کی شوری کا ایک معزز رکن ہو!

جناب فریدی صاحب اپنے اشارات میں نوجوانوں کے جذبۂ سرفروشی کو صحیح نہیں قرار دیتے ہیں اور انھوں نے ان کے دل ودماغ میں بیٹھے ہوئے ''جذبۂ سرفروشی'' کے مفہوم کو غلط بتایا ہے۔ اسی طرح فریدی صاحب نے اسلام کی سربلندی کے لیے نوجوانوں کی جانب سے اٹھائے جانے والے اقدامات کو بھی بے وقت کی راگنی قرار دیا ہے اور دلائل میں سوویت یونین اور ایران کے انقلابات کو پیش کیا ہے کہ طاقت کا استعمال کیے بغیر بھی مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مولانا مرحوم نے ان کے سارے افکار وخیالات کا جواب مدلل انداز میں دیا ہے۔

مساجد اللہ

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، ۶۴ رصفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

رسالہ کی تمہید میں اختصار کے ساتھ بابری مسجد کے قضیہ کو ابتداء تا انتہاء ذکر کیا گیا ہے اور اس کے حوالہ سے امت مسلمہ کے درمیان پائے جانے والے نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مجسموں کے توڑے جانے پر ہنگامہ کرنے والوں کے لبوں پر مسجد کی مسماری کے وقت تالے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بابری مسجد کے قضیہ کے تئیں مسلم قیادت کا رویہ صحیح نہیں تھا کہ ایک گروپ اس سے دست برداری پر مصر تھا۔ اس پس منظر میں یہ رسالہ لکھا گیا ہے اور مولانا مرحوم نے اس کی تالیف کا مقصد پسپائی قبول کرنے والوں کے دل ودماغ سے ذہنی اور فکری پسپائی کو نکالنا، بتایا ہے۔

نفسِ موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے بابری مسجد کے مسئلہ کی نوعیت کا ذکر کیا ہے کہ آج کا وہ سب سے زیادہ موضوع بحث بننے والا قضیہ اور مسئلہ ہے جس کے دوررس اثرات ہندوستان کی سیاست پر مرتب ہوئے ہیں مثلاً کانگریس کا اقتدار سے بے دخل ہونا اور بی جے پی کا مسند اقتدار پر قابض ہونا وغیرہ۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم قیادت ومعاشرہ پر بھی اس کے گہرے نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ہیں جیسے مسلم نوجوانوں میں ایک خاص قسم کی بیداری پیدا ہونا اور مسلم قیادت کا اس حد تک بے حوصلہ ہونا کہ مسجد سے دست برداری میں ہی انھیں عافیت نظر آتی ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ نے ان کی اس نفسیات کا بہت اچھے انداز میں تجزیہ کیا ہے اور مسجد کی بازیابی اور تعمیر نو کے

لیے ہر مشکل سے گزر جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تمہید کے بعد دین میں مسجد کی اہمیت کو عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں اجاگر کرتے ہوئے اسے انسانی جسم میں موجود دل کے مشابہ قرار دیا ہے اور اسے صرف اللہ کی ملکیت بتایا ہے کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص مقام کو کسی اور کو دے دے اور وہ بھی غیر اللہ کی عبادت کے لیے۔ اسی طرح اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ تمام مساجد یکساں اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی بنیادی حیثیت پر کسی بھی پیمانہ کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آتا ہے، اس کی حرمت بعینہ انسانی جان کی حرمت ہے لہٰذا چھوٹی سی چھوٹی مسجد کی بے حرمتی برداشت نہیں کی جاسکتی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے جرم میں مولانا محترم نے پوری امت مسلمہ کو برابر کا شریک قرار دیا ہے کہ اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص جگہ پر غیر اللہ کو پوجا جائے اور ہماری جبین نیاز پر شکن بھی نہ پڑے اور نہ کسی قسم کی جنبش پائی جائے کہ اس عمل کو روک دیا جائے۔ اس حوالہ سے انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے اور سب کو۔ بشمول خود کو۔ کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے اور اس بات کو ذکر کیا ہے کہ ان ظالموں سے بات کرنا مفید عمل نہیں ہوسکتا ہے جو کھڑے گھاٹ جھوٹ بولتے ہیں اور قانون کی ہر وقت دھجیاں بکھیرتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال میں مولانا تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق {اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ} کی دعوت دیتے ہیں اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ محاذ آرائی سے دعوت کا عمل کسی بھی طرح سے متاثر نہیں ہوسکتا ہے اور اپنے اس دعوی کو تاریخ کے مختلف ادوار سے ثابت بھی کیا ہے، ہاں ہمارے مادی اور دنیاوی فوائد ضرور متاثر ہوسکتے ہیں جن کی قربانی دین کی سربلندی کے لیے دینی ہوگی۔ انھوں نے مساجد کو شعائر اللہ قرار دیتے ہوئے ہر حال میں ان کی حفاظت کرنے کا داعیہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسلم خواص کی بے غیرتی کا ذکر کیا ہے کہ وہ کس دل سے کہہ رہے ہیں کہ ایک مسجد کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ان کی یہ بے غیرتی قوم کی تباہی و بربادی کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں قرآنی آیت {وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ} سے استدلال کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو مکمل واضح انداز میں پیش کیا ہے اور اپنی تائید میں مختلف تفاسیر سے دلائل دیئے ہیں۔ انھوں نے بابری مسجد کے قضیہ کو مسجد اقصی سے بڑا مسئلہ بتایا ہے کہ وہاں تو بہر حال یہودیوں کا قبضہ ہے اور یہاں مشرک و کافر قوم نے اسے نیست و نابود کر کے پوجا پاٹ شروع کر دی ہے اور نماز پڑھنا تو دور کی بات ہے، کسی مسلمان کو اس کے قریب جانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

مسئلہ کی سنگینی کا ذکر کرنے کے بعد مسلم قوم کے طرز عمل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کس خواب غفلت میں پڑی

ہوئی ہے اور حالات کی سنگینی کے باوجود اس کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگ رہی ہے۔انھوں نے اس طرز عمل کے باوجود رحمت ونصرت الٰہی کی امید رکھنے کو عبث ہی قرار دیا ہے۔ضمناً مسجد کو بسانے اور آباد کرنے کے فضائل اور ان کی صفات کا ذکر بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں کیا ہے کہ شاید کچھ جنبش پیدا ہوجائے۔اس ضمن میں انھوں نے مصادر کی روشنی میں یہ نقطہ بھی بیان کیا ہے کہ مساجد کی حفاظت بھی قتال کی مشروعیت کا ایک سبب ہے۔

رسالہ کے آخری چند صفحات میں مسجد سے تعلق رکھنے والے مختلف نوعیت کے فتاوے نقل کیے گئے ہیں۔انھیں غالباً اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ یہ بتایا جاسکے کہ مسجد ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، اسے نہ منتقل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کو دی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس کا استعمال کسی اور مقصد کے لیے کیا جاسکتا ہے۔جب اس فارمولہ پر عمل مختلف ادوار میں کیا جاتا رہا ہے اور چھوٹی سی چھوٹی مسجد کو ضرورت کے پیش نظر بھی منتقل نہیں کیا گیا ہے تو بابری مسجد کے تئیں ہماری خاموشی اور ہمارے طرز عمل کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟

رسالہ کے آخر میں انتباہ کے عنوان کے تحت بابری مسجد کے مسئلہ کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ ہند کے لیے زندگی اور موت کے مترادف قرار دیا ہے اور اسے بحیثیت مجموعی ملک کا ایک اہم مسئلہ بتاتے ہوئے ایک قومی جرم اور اجتماعی ظلم قرار دیا ہے جسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انفرادی گناہوں کو تو قدرت نظر انداز کرسکتی ہے لیکن اجتماعی گناہوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتی ہے لہٰذا انھوں نے گجرات کے زلزلہ اور ملک میں پیدا ہونے والے متعدد مسائل کو اسی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے یہ پیشن گوئی کی ہے کہ ''ہندوستان میں عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہمارے ملک کا نظام مسلسل عدم استحکام کا شکار ہوجائے اور اس کے نتیجہ میں فرقہ واریت، طبقہ واریت اور آپسی بے اعتمادی کا دور دورہ ہوجائے اور ملک مکمل نراج اور انتشار کے طوفان میں پھنس جائے۔''

یہاں مولانا مرحوم کی دور بینی کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کے کئی خدشات سامنے آچکے ہیں اور کوئی بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان کے دیگر خدشات بھی سامنے آجائیں۔انھوں نے اس انتباہ میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ کاش کوئی گروپ اٹھتا اور ان ظالموں کو اللہ کے عذاب سے آگاہ کرتا اور انھیں اجتماعی توبہ پر آمادہ کرتا اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو انھیں بزور طاقت اس پر مجبور کرتا!!

مجسّموں کا مسئلہ۔ایک سیر حاصل بحث

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد۔

یہ رسالہ افغانستان میں طالبان کے ذریعہ گوتم بدھا کے مجسمہ کی انہدامی کارروائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے

والے شور وشرابہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس شور وغوغا میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کا تعلق سیاست سے دور دور تک نہیں ہے اور ان کی بنیادی شناخت درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ سے وابستہ افراد میں شامل ہونا ہے۔

مولانا مرحوم نے اس رسالہ میں بتوں کی نجاست اور ان کے قریب نہ جانے کی قرآنی ہدایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں مجسمہ رکھنے، بنانے اور پوجنے کی سخت ممانعت ہے لیکن اس کے باوجود دین سے وابستہ افراد کی جانب سے طالبان کے اس قدم کی مذمت کرنا ناسمجھ میں آنے والی بات ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ان حضرات نے اپنے قول کی تائید میں قرآن وحدیث سے کوئی سند بھی نہیں پیش کی ہے اور نہ ہی انھوں نے اجماع اور قیاس صحیح سے کوئی استدلال کیا ہے۔ ان حضرات کے مقابلہ میں مولانا محترم نے عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ طالبان کے عمل کو صحیح قرار دیا ہے اور ان کے اس عمل کے مرتب ہونے والے نتائج کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس رسالہ کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس تقسیم کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے تاہم الگ صفحہ سے ایک نئی سرخی کے تحت شروع ہونے والے مباحث کی وجہ سے راقم نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے حالانکہ دوسرے حصہ میں بھی پہلے حصہ کے کچھ مباحث شامل ہیں:

☆ طالبان کی جانب سے مجسمہ کی انہدامی کارروائی پر درس وتدریس، دینی طبقہ اور دعوت وتبلیغ سے وابستہ اشخاص کے خیالات کا جائزہ۔

☆ طالبان کا عمل بین الاقوامی قوانین کے تناظر میں۔

پہلے حصہ میں مولانا مرحوم نے چند افراد کے مضامین، خیالات، اپیل اور بیان وغیرہ کا جائزہ لیا ہے اور ان کے مضامین وخیالات وبیانات کو محض ان کی دینی کمزوری اور غیروں سے مرعوبیت قرار دیتے ہوئے ان کے دلائل وشواہد کا جواب دیا ہے کہ اسلام میں بت شکنی کی ہی تعلیم دی گئی ہے، بت پرستی اور بت سازی سے ہر حال میں دور رہنے کی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کو قرآنی آیات سے مدلل کیا ہے۔

رسالہ کے اس حصہ میں مولانا علیہ الرحمہ نے کسی کا نام لیے بغیر اشاروں وکنایوں میں حسب ذیل افراد کے خیالات وافکار وبیانات کا جائزہ لیا ہے اور اپنی بات پوری طاقت وقوت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ان کے خیالات وافکار کو غلط اور گمراہ کن قرار دیا ہے۔ ان کی رواداری کو مرعوبیت گردانتے ہوئے علامہ اقبالؒ کے اشعار نقل کیے ہیں:

جو قوم کہ ہے غیرت وکردار سے خالی
وہ معرکۂ وقت میں بنتی ہے روادار
آجائے اگر ہاتھ میں شمشیر بھی اس کے
بن جائے گی اغیار کی عظمت کی وفادار

ملک کے ایک معروف فقیہ صاحب، ایک دینی بزرگ، دلی کے ایک قاسمی مولانا، بعض سادہ لوح حضرات، ایک دینی اور دعوتی اخبار۔ یہاں راقم ایک بات کہنا چاہے گا جس کے ناگوار خاطر ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے کہ میں آج تک اس بات کو نہیں سمجھ سکا ہوں کہ ہمارے اکابرین اشاروں وکنایوں میں کیوں بات کرتے ہیں جب کہ وہ اپنے طرز بیان سے ان اشاروں وکنایوں کو متعین بھی کر دیتے ہیں۔ اگر مقصود دل شکنی ہے تو کچھ لکھنا ہی نہیں چاہیے اور اگر مقصود اللہ کا دین ہے تو اپنی بات کو بلا خوف وخطر واضح اور صاف الفاظ میں ذکر کرنا چاہیے تا کہ اللہ کی نظروں میں سرخرو ہوسکیں، یقیناً اس کی نظر میں سرخرو ہونا ہی کسی بھی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ یہ صرف اس رسالہ کے حوالہ سے نہیں کہا جارہا ہے بلکہ یہ عمومی بات ہے جو بہت سے افراد پر صادق آتی ہے۔ مذکورہ بالا تمام اشاروں وکنایوں کے ہدف ومقصد سے اس زمانہ کے بہت سے قارئین واقف تھے اور ہیں لہٰذا اشاروں وکنایوں میں بات کرنے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ مذکورہ بالا افراد کے مضامین، اقوال وخیالات کا جب معروضی جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مذکورہ بالا افراد میں سے 'ملک کے ایک معروف فقیہ صاحب' کے خیالات وافکار کا رد کرنے میں سب سے زیادہ زور صرف کیا گیا ہے کہ رسالہ کا پہلا حصہ ۲۱/صفحات پر مشتمل ہے اور 'فقیہ صاحب' کے خیالات وافکار کا جائزہ تقریباً ۱۲/صفحات میں لیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے پہلے حصہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں سورہ کافرون کے پس منظر، اس کا موضوع ومضمون کا ذکر کرتے ہوئے آیت {لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ} کا مفہوم اچھی طرح سے اجاگر کیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس آیت کو 'آیت رواداری' بنا کر پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔

رسالہ کے دوسرے حصہ ''طالبان کا عمل بین الاقوامی قوانین کے تناظر میں'' کو بغیر کسی منطقی دلیل کے حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس میں مزید دو ذیلی عناوین پائے جاتے ہیں جنھیں درمیان صفحہ سے شروع کیا گیا ہے:

☆ طالبان کا عمل بین الاقوامی قوانین کے تناظر میں۔

☆ مصالحت کا سوال۔

☆ مولانا وحیدالدین خاں کے فرمودات پر ایک نظر۔

کتاب کا دوسرا حصہ راقم کی نظر میں زیادہ اہم ہے کہ اس میں طالبان کے اس عمل کی مخالفت کرنے والوں کا جواب انھیں کی زبان میں دیا گیا ہے۔اس حصہ میں مولانا مرحوم نے عالمی قوانین کا ذکر کرتے ہوئے ہر جگہ اسے بروئے کار لانے کی وکالت کی ہے اور اس بات کو انصاف سے بالکل پرے قرار دیا ہے کہ ان قوانین کا اطلاق الگ الگ ممالک میں یا مواقع پر الگ الگ ڈھنگ سے کیا جائے۔اس ضمن میں انھوں نے لینن اور ہٹلر کے مجسّموں اور بابری مسجد کے انہدام کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ ان پر بھی ان ہی قوانین کا اطلاق ہونا چاہیے تھا جن کا سہارا لے کر طالبان کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ریڈ انڈین کی تہذیب کو ختم کرنے اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کو بھی بطور مثال پیش کیا ہے کہ ان جیسے واقعات پر طالبان کے عمل پر واویلا مچانے والوں نے اتنی شد و مد کے ساتھ واویلا کیوں نہیں مچایا تھا۔مولانا مرحوم نے اس مبحث میں غالباعدنان فہد کے اس مقالہ سے استفادہ کیا ہے جو دعوت میں چھپا تھا کہ مبحث کے آخر میں اس کا حوالہ موجود ہے۔

''مصالحت کا سوال'' جیسی سرخی قائم کر کے اقبال احمد انجینئر کے افکار و خیالات کو پیش کیا ہے تاریخ انسانی میں سنت الٰہی ہمیشہ جاری اور بت پرستی ہر زمانہ وعہد میں ناپسندیدہ رہی ہے۔انبیاء کی بعثت اسی عمل سے بچانے کے لیے ہوتی رہی ہے اور انھوں نے اپنی ساری زندگی اسی میں صرف کر دی کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور کسی اور کے در پر سر نہ جھکائیں۔ساتھ ہی ساتھ اسلام کے اس خوبصورت اور مؤثر کردار کو اجاگر کیا ہے جو اس نے مفتوحہ ممالک میں پیش کیا تھا جس سے متاثر ہو کر بہت ساری قومیں اسلام میں داخل ہو گئیں تھیں۔اس کردار سے استدلال کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے طالبان کے طرز عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔

رسالہ کے اسی حصہ میں مولانا مرحوم نے طالبان کی بت شکنی کے حوالہ سے ''مولانا وحیدالدین خاں کے فرمودات پر ایک نظر'' کی سرخی کے تحت ان کے افکار و خیالات کا جائزہ لیا ہے اور انھیں عقلی و نقلی دلائل سے غلط قرار دیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم نے طالبان کے انہدامی عمل کے حوالہ سے مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے افکار و خیالات کا جائزہ رسالہ کے آخر میں کیوں لیا ہے جب کہ دیگر حضرات کے افکار و خیالات کا جائزہ رسالہ کے پہلے حصہ میں لیا ہے۔ظاہری طور پر اس کا کوئی خاص سبب میری سمجھ میں نہیں آتا ہے سوائے اس کے کہ اول الذکر کا مقصد ثانی الذکر کے افکار و خیالات کو نمایاں طور پر رد کرنا ہو۔مولانا علیہ الرحمہ نے دلائل کی روشنی میں مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے افکار و نظریات کو بے بنیاد بتاتے ہوئے انھیں غلط قرار دیا ہے۔

ملت کے دفاع کا مسئلہ، شریعت کی روشنی میں

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، ۳۲ر صفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

اس رسالہ میں موجودہ ہندوستان میں امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا شرعی حل بتایا گیا ہے۔ یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں پیش آنے والے واقعات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ان واقعات نے اس وقت کے سنجیدہ مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور ان کے سامنے یہ سوالیہ نشان کھڑا کر دیا تھا کہ مسلمان ان حالات میں کیا کریں؟ رسالہ کی شروعات اس وقت کے موجودہ حالات کے ذکر سے ہوتی ہے کہ فسادات کا گویا ایک سیلاب آیا ہوا ہے اور مسلم مخالف طاقتیں ہر حال میں مسلمانوں کا قافیہ تنگ کرنے پر آمادہ ہیں حتیٰ کہ وہ محض مسلمانوں کی منھ بھرائی کے الزام میں منتخب حکومتوں کو نہ صرف گرادیتے ہیں بلکہ موجودہ حکومت کو بھی یہ کھلی ہوئی دھمکی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر کسی قسم کا نرم رویہ اختیار کیا گیا تو آپ کی حکومت کا اللہ ہی حافظ ہے حالانکہ گرائی جانے والی حکومتوں نے ان کے من چاہے پروگرام پر ہی عمل کیا تھا۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ یہ بھی کہتے پھر رہے ہیں کہ اب اقلیت کی حفاظت کرنا حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، ان کی حفاظت تو صرف اکثریت ہی کر سکتی ہے گویا وہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ حکومت کی طرف دیکھنا بند کریں اور اکثریت کی مرضی ومنشاء کے مطابق ہندوستان میں جینا سیکھیں۔

اس تمہید کے بعد مولانا مرحوم نے فسادات کو ''فسادات'' کے بجائے دوقومی جنگ اور مسلمانوں کی نسل کشی قرار دیا ہے کہ اس کو برپا کرنے میں حکومت کہیں نہ کہیں ضرور شامل ہوتی ہے اگر فسادات کو فوری اشتعال کا نتیجہ قرار دیا جائے تو اشتعال جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہوجاتا ہے، فسادات کا دنوں بلکہ ہفتوں پر محیط ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حکومت کی شہ کے بغیر تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اس اشکال کا جواب بھی دیا ہے کہ ان فسادات میں ایک چھوٹی تعداد کا حصہ لینے والی بات کو بہت زیادہ معقول نہیں قرار دیا جاسکتا کہ حصہ تو مختصر تعداد ہی لیتی ہے لیکن اکثریت ان کی پشت پناہ بن کر ہمت افزائی کرتی رہتی ہے۔ فسادات کے ضمن میں انھوں نے حکومت کے کردار پر بھی سوال اٹھایا ہے کہ وہ ''سیکولر'' ہونے کے باوجود فسادات پر قابو پانے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کرتی ہے اور ہر مسلم کاز کو نقصان پہنچانے کے درپہ رہتی ہے۔

رسالہ کے پس منظر کو بطور تمہید بیان کرنے کے بعد مولانا علیہ الرحمہ نے پانچ سوال قائم کیے ہیں:

☆ اگر کسی مقام پر مسلمان کو نقصان پہنچایا جائے تو کیا کسی دوسرے مقام پر دوسرے فریق کو نقصان پہنچایا

جاسکتا ہے؟

☆ مارے جانے والے مسلمان کے بدلہ میں دوسرے فریق کے کسی فرد کو مارا جاسکتا ہے؟

☆ کیا موجودہ آئین اور قانون کی مخالفت کی شرعی گنجائش ہے؟

☆ کیا کوئی خفیہ کارروائی کی جاسکتی ہے؟

☆ کیا اس جنگ کو جہاد کہا جاسکتا ہے؟

مولانا علیہ الرحمہ نے ان سوالات کے جوابات، دو نقطۂ نظر کے حساب سے دیئے ہیں:

پہلے نقطۂ نظر کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ مذکورہ بالا تمام سوالات کے جوابات نفی میں ہیں کہ ازروئے شریعت ان میں سے کسی پر عمل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اسلام میں ہر جان محترم ہے اور اسے کسی اور کے بدلہ میں ۔قصاص کے علاوہ۔ جان سے نہیں مارا جاسکتا ہے، اسی طرح ظلم کا بدلہ ظلم کرنے والے سے ظلم کے بقدر ہی لیا جاسکتا ہے، اس میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے، کسی کے مال کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا ہے، خفیہ کارروائی تو دور کی بات ہے، کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت سے سرگوشی کرنا بھی اسلام میں منع ہے اور جہاد کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے کہ اس کے لیے امیر المؤمنین کی موجودگی ایک شرط ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق ان سوالات کے جوابات یوں دیئے جاسکتے ہیں کہ حالات اس سے زیادہ بھیانک اور خوفناک ہیں جتنا کے بیان کیے جارہے ہیں تو اس صورت میں کیا اس بات کا انتظار کیا جائے گا کہ سارے ہندوستان کی مسلم آبادی کو بھاگل پور اور کرنیل گنج میں تبدیل کر دیا جائے اور شرعی نقطۂ نظر سے اس وقت حالات کا جائزہ لیا جائے گا جب حالات بالکل ہاتھ سے نکل چکے ہوں گے۔ مولانا مرحوم نے کسی کی زبان حال سے حالت جنگ کے بندھے ٹکے مفہوم ومطلب سے اختلاف کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ ہر ملک کے حالات الگ الگ ہوتے ہیں، اسی اعتبار سے حالت جنگ کا مفہوم ومعنی متعین کیا جائے گا لہٰذا ہمیں بھی اپنے موجودہ حالات کے پیش نظر حالات جنگ کے معنی ومفہوم کو طے کرلینا چاہیے۔ اس ضمن میں مولانا مرحوم نے حالات جنگ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حالات جنگ میں ان امور کی اجازت ہوتی ہے جس کی ممانعت حالات امن میں ہوتی ہے کہ اول الذکر صورت میں فریق مخالف کا ہر فرد دشمن ہوتا ہے اور اس سے دیگر افراد کا بدلہ لیا جاسکتا ہے خاص طور سے جب وہ جنگجو ہو۔

ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو بیان کرنے کے بعد مولانا مرحوم نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اس صورت میں کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔ اس سوال کے انھوں نے تین ممکنہ جوابات بیان کیے ہیں:

☆مسلمان کچھ نہ کریں اور اکثریتی طبقہ پر بھروسہ کرتے ہوئے حالات کے بہتر ہونے کا انتظار کریں کیونکہ ہمارے ردعمل سے حالات مزید ابتر ہو سکتے ہیں۔

مولانا مرحوم اس جواب سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ان کے بقول ماضی کے حالات سے سبق سیکھنا چاہیے، بصورت دیگر ایک ہی جگہ سے آپ بار بار ڈسے جاتے رہیں گے۔اس حکمت عملی کو نہ ہی اللہ معاف کرے گا اور نہ ہی ہماری نسلیں۔

☆سب کچھ برداشت کرتے ہوئے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا جائے اور دفاع کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ اس سے مزید تصادم پیدا ہوگا جو قوم کے لیے خطرناک ہوگا۔

مولانا مرحوم اس طرز عمل سے بھی متفق نہیں نظر آتے ہیں کہ حالات جس تیزی سے بگڑ رہے ہیں اس میں اس بات کو بعید از قیاس نہیں قرار دیا جا سکتا کہ کل دعوت وتبلیغ کے کام پر پابندی لگا دی جائے۔یہاں مولانا کی دور اندیشی اور دور بینی کا اعتراف کرنا ہوگا کہ دعوت وتبلیغ پر پابندی لگانے کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اس ذمہ داری کو انجام دینے والوں کے لیے دارورسن کی آزمائش کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆ تیسرے جواب کو مولانا مرحوم نے صحیح جواب قرار دیا ہے کہ مکمل دفاع کرتے ہوئے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا جائے اور {أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم} کا تقاضا پورا کیا جائے۔اس ضمن میں مولانا مرحوم نے جہاد کے لیے امیر المؤمنین کی موجودگی کو شرط بتانے والے بیانیہ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کلیہ عام حالات کے لیے ہے،خصوصی حالات میں وہ شرط باقی نہیں رہ جاتی ہے۔اس وضاحت کے بعد انھوں نے دو سوال اٹھائے ہیں:

☆امیر المؤمنین کی اجازت کے بغیر جہاد کرنے کا کیا شرعی حکم ہے؟

اس کا جواب انھوں نے فقہ کی روشنی میں دیا ہے کہ امیر المؤمنین کی اجازت کے بغیر بھی جہاد کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بعض فقہی جزئیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ حضرت ابوالبصیر ثقفی رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے اس طرز عمل کو آج کے زمانہ میں نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔

☆امیر المؤمنین کی غیر موجودگی میں جہاد کرنے کی صورت کیا ہوگی؟

اس سوال کا جواب انھوں نے پہلے سوال کے جواب کو ہی قرار دیا ہے اور اس ضمن میں جہاد کے لیے ایک تنظیم بنانے کی ضرورت کا اقرار کیا ہے کہ دین کے مختلف امور پر کام کرنے والی جماعتیں انھیں آیات سے استدلال کرتی ہیں جن میں جہاد کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جب حقیقی اور عملی جہاد کی بات کی جاتی ہے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے

کہ اس کی گنجائش نہیں ہے۔اس سوال کے ضمن میں مولانا مرحوم نے اقدام اور دفاع میں پائے جانے والے فرق کو بھی اجاگر کیا ہے کہ اقدامی جہاد فرض کفایہ ہے جب کہ دفاعی جہاد فرض عین ہے اور مثالوں کے ذریعہ اس فرق کو واضح کرتے ہوئے قرآن وحدیث میں موجود ان آیات واحادیث سے استدلال کیا ہے جن میں دفاع کرنے کا ذکر ہے۔ساتھ ہی ساتھ مولانا مودودیؒ کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے دفاع کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ''ظالموں اور قاتلوں سے چشم پوشی کرنے والے حکمراں'' کی شرعی حیثیت کا ذکر فتاوی عالمگیری کی روشنی میں کرتے ہوئے ''غیر جانب داروں کا مسئلہ'' اور ''قصور وار اور بے قصور'' کا حل ''الجہاد فی الاسلام'' کا ایک اقتباس نقل کر کے بیان کیا ہے کہ ان کے ساتھ حالت دفاع میں کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا کیونکہ اگر وہ عملاً حصہ نہیں لے رہے ہیں تو کیا ہوا، تائید اور ہمت افزائی تو کر ہی رہے ہیں۔

مجسّموں کا مسئلہ کے کور پیج کی پشت پر مصنف علیہ الرحمہ کی مذکور دیگر تصانیف کی فہرست میں اس کتاب کا نام صرف ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' لکھا گیا ہے۔

نظام خلافت وامارت کی شرعی حیثیت

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی، ۲۳۲ر صفحات، طبع سوم، ۲۰۰۹ء۔

اس رسالہ میں خلافت وامارت کی ضرورت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی شرعی حیثیت کو عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔رسالہ کی ابتداء تمہید سے ہوتی ہے۔یہ تمہید صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے دو اقوال پر مشتمل ہے جنھیں سیرت سید احمد شہید (۱/۵۱۵) اور تاریخ دعوت وعزیمت (۵/۲۵۹) سے یہ کہتے ہوئے نقل کیا گیا ہے کہ ''نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر گفتگو کے لیے بطور تمہید موجودہ عالم اسلام کے ایک عالم باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔''

تمہید کے بعد ''تین مسلمات'' کے عنوان کے تحت حسب ذیل ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں:

- ☆ اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے۔
- ☆ اللہ تعالی حاکم علی الاطلاق ہے۔
- ☆ اصول شریعت۔

پہلی سرخی کے تحت قرآن وحدیث اور کتب فقہ کی روشنی میں اسلام کی ہمہ گیری اور اس کی جامعیت کو بیان کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اسلام کے دائرۂ کار میں شامل نہیں ہے، اسی

وجہ سے اسلام اپنے ماننے والوں سے مکمل دین میں داخل ہونے کا مطالبہ کرتا ہے بصورت دیگر مآل صرف بربادی اور تباہی ہے۔ اسلام کی جامعیت کو بیان کرتے ہوئے ان کی یہ دلیل بہت مستند قرار دی جاسکتی ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں علمائے اسلام نے 'فقہ' کے نام سے ایک جامع قانون مرتب کیا ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور حیات انسانی سے تعلق رکھنے والی معمولی سی معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے فقہی تصریحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے 'ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں کو معاشی مسئلہ، حکومتی مسائل اور دنیاوی معاملات قرار دے کر انھیں دین سے خارج کردینا کہ ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوس پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد'۔ مولانا محترم نے اسلام کی ہمہ گیری کو کتب فقہ کی روشنی میں بہت بہتر انداز میں پیش کیا ہے اور علامہ ابن نجیم کی کتاب ''البحر الرائق'' کے حوالہ سے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ تمام امور دین پانچ حصوں ۔ اعتقادات، عبادات، معاملات، حدود وتعزیرات اور آداب ۔ پر مشتمل ہیں اور ان میں سے ابتدائی چار امور دین بھی پانچ حصوں میں منقسم ہوتے ہیں، صرف ''آداب'' کا پہلو چار حصوں پر مشتمل ہے۔

دوسرے مبحث ''اللہ تعالی حاکم علی الاطلاق ہے'' میں مولانا محترم نے اللہ تعالی کو مطلقاً حاکم قرار دیا ہے۔ اس مبحث میں بھی عقلی ونقلی دلائل کو پیش کرتے ہوئے اللہ کی حاکمیت کو ثابت کیا گیا ہے اور اللہ کے مقابلہ میں 'مجرد عقل وتجربہ' کے حاکم ہونے کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'بہت سارے امور کا عقل وتجربہ سے ثابت ہونا، اللہ کے مطلق حاکم ہونے کی نفی نہیں ہے، اسی وجہ سے فقہی تصریحات میں عقل کی حاکمیت کا انکار کیا گیا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ عقل کے حاکم نہ ہونے کی وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابلہ میں پیش آئی تھی اب اس کی وضاحت مسلمانوں کے سامنے کرنی پڑ رہی ہے'۔

تیسرے مبحث ''اصول شریعت'' میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے ''اصول شریعت'' صرف وہی قرار پائیں گے جو قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کی روشنی میں مرتب ہوں گے۔ مولانا محترم نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ مذکورہ ان چار ذرائع کی روشنی میں مرتب ہونے والے اصول ہی ''اصول شریعت'' کیوں قرار پائیں گے۔ ان کے علاوہ دیگر ذرائع کی مدد سے مرتب کیے جانے والے اصول 'اللہ کی تشریعی حاکمیت کا انکار کرنا ہے چاہے اس کا بنانے والا کوئی بھی فرد ہو، کوئی بھی قوم ہو یا کسی بھی ملک کی جمہور'۔

مذکورہ بالا تینوں مسلمات کا مختصراً ذکر کرنے کے بعد مولانا محترم نے لکھا ہے کہ دین کی ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہے کہ انسان سراپا دین میں گم ہوجائے اور زندگی کے تمام مسائل کو دین کی بنیاد قرار دے اور انسانی فطرت کے لحاظ

سے دین پر مکمل عمل کرنے کے لیے خلافت وامارت کی ضرورت پیش آتی ہے۔مولانا مرحوم نے اجتماعی نظم کے قیام کو ہی خلافت یا حکومت کے نام سے موسوم کرتے ہوئے متعدد سوالات جیسے حکومت کی بنیاد دین پر کیوں نہ ہو، اور کس دلیل کی بنا پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کر دیا جائے؟ وغیرہ اٹھائے ہیں اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں قائم ہونے والی حکومت کو اسلام کے زیر سایہ اور خدائی احکامات کے ماتحت ہونا چاہیے۔انھوں نے اپنے اس اصول کو قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے مدلل کیا ہے۔مزید برآں ''اسلامی خلافت'' کے مفہوم ومراد کو ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ علیہما الرحمۃ کے اقوال کی روشنی میں متعین کیا ہے۔

اسلامی خلافت یا حکومت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا علیہ الرحمۃ نے ''اقامت خلافت کی دینی حیثیت'' کے موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی جن پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہوجاتی ہیں جیسے وضو کی فرضیت کے ضمن میں حتی الامکان پانی کے حصول کا فرض ہوجانا۔اس اصول کے پیش نظر ان کی نگاہوں میں اسلامی خلافت یا امارت کا قیام فرض ہوجاتا ہے کہ بہت سے دینی امور حکومت پر ہی موقوف ہوتے ہیں لہٰذا اس کا قیام مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔بعد ازیں انھوں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے لہٰذا اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

رسالہ کے آخر میں ''مسئلہ خلافت وامارت ہندوستان میں'' کے عنوان کے تحت انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اوپر کے مباحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امارت وحکومت کا قیام مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے اور ان کے لیے کسی امام یا امیر کی اطاعت کے بغیر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔اسی وجہ سے ہندوستانی علماء کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں سے نبرد آزما رہے۔۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ نے مولانا محمود الحسن علیہ الرحمۃ کو امیر الہند بنانے کا منصوبہ بنایا تھا جو کسی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔بعد ازیں انھوں نے صوبوں کے حساب سے امارت کے اس نظم کو قائم کرنا چاہا تھا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں بھی پوری طرح سے کامیاب نہ ہوسکے، اسی وجہ سے جب بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو انھوں نے اپنی خوشی کا اظہار تحریری شکل میں کیا تھا۔

مؤلف رسالہ علیہ الرحمۃ ہندوستان میں موجود نظام قضاء اور امارت شرعیہ کو امارت عمومی کا بدل نہیں قرار دیتے ہیں اور ہر حال میں امارت کے قائم کرنے کے خواہاں ہیں کہ موجودہ نظام کے دائرہ میں صرف نکاح وطلاق اور اس جیسے دیگر مسائل کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے جسے عدالتوں کے ذریعہ کالعدم بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔انھوں نے

اس حوالہ سے اس بات کے خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ امارت کے عدم قیام کی جواب دہی سے شاید عوام تو بچ جائیں لیکن خواص یعنی علماء کا بچنا آسان نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس رسالہ کا اختتام مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ایک اقتباس پر کیا ہے جس میں انھوں نے امارت کے قیام کی ضرورت واہمیت کو بیان کیا تھا۔ مولانا محترم اس بات کے قائل ہیں اس بیان میں مذکور راستے ہی آج بھی قابل عمل ہیں۔

مجسّموں کا مسئلہ کے کور پیج کی پشت پر مصنف کی دیگر تصانیف کی فہرست نقل کی گئی ہے۔ اس فہرست میں اس کتاب کا نام ''نظام امارت وخلافت کی شرعی حیثیت'' مذکور ہے۔

وسائل تربیت

اس رسالہ کا ذکر ان کی فہرست کتب میں تو ملتا ہے لیکن ان کے بلاگ پر موجود نہیں ہے لہٰذا اس کا تعارف نہیں کرا سکتا ہوں۔

ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟

مکتبہ الاقصیٰ، سعید آباد، حیدرآباد، ۴۰ رصفحات، سنہ اشاعت غیر مذکور۔

اس رسالہ میں مولانا محترم نے مسلمانوں کے سیاست سے الگ تھلگ رہنے کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اپنا سیاسی کردار کیسے ادا کر سکتے ہیں؟

رسالہ کی ابتداء میں سیاست کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جو لوگ سیاست سے الگ ہوجاتے ہیں ان کی کوئی شناخت نہیں ہوتی ہے اور وہ کسی بھی معاشرہ اور ملک میں مغلوب رہ کر ہی زندگی گزار سکتے ہیں اور ان کی حیثیت ان جانوروں جیسی ہوجاتی ہے جن سے بیگار کا کام لیا جاتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے کچھ چارہ ڈال دیا جاتا ہے، نہ تہذیب وتمدن میں ان کا کوئی حصہ ہوتا ہے اور نہ ہی ملکی وقومی معاملات میں ان کی رائے کی کوئی اہمیت ہوتی ہے اور انھیں ہر حال میں حکمراں جماعت کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ مسلم قوم کے لیے یہ صورت حال اور بدتر ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں ایک مخصوص عقیدہ ونظریہ اور ایک مکمل نظام رکھنے کے باوجود اگر سیاست سے الگ رہتی ہے یا ایسی سیاست کا حصہ بن جاتی ہے جو اس کے عقیدہ اور نظریہ سے متصادم ہو تو یہ صورتحال گویا اپنی قبر خود ہی کھودنا اور اپنی عزت اور خودداری کو ہمیشہ کے لیے کھود دینا ہے۔ عملاً ہندوستانی مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں کہ آزادی کے وقت کسی بزرگ (نام مذکور نہیں ہے، اگر یہیں وضاحت کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ آگے چل کر انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کا صراحتاً ذکر کیا ہے) کے کہنے پر اپنی سیاسی پارٹی اور جماعت کو نہ بنانے کا جس دن فیصلہ کیا گیا تھا اسی دن ہندوستان میں بسنے والی مسلم

قوم کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا تھا اور اسی فیصلہ کے ساتھ ان کی بے وزنی اور مغلوبیت پر مہر ثبت ہو چکی تھی اور انھوں نے طے کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ غیروں کے تابع رہیں گے اور ان کا عقیدۂ توحید، شرک والحاد کے ماتحت رہے گا، ان کی تہذیب وثقافت، دیومالائی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب رہے گی، ان کا کوئی تشخص نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ خطروں کی زد میں رہیں گے حتی کہ ان کا عقیدہ اور پرسنل لاء بھی محفوظ نہیں ہوگا جس کی شہادت آزادی کے بعد گزرے ہوئے شب وروز پر جا بجا ثبت ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کا بنیادی سبب مولانا محترم کے الفاظ میں سیاست سے کنارہ کشی ہے کہ جب انھوں نے اپنے ذہنوں سے یہ بات ہی نکال دی کہ اب اس ملک میں ہم اقتدار پر قابض ہی نہیں ہوسکتے تو ایسی جدوجہد کرنے کا کیا فائدہ؟ ذہنی طور پر شکست خوردہ افراد کا مستقبل صرف خواری ہوتا ہے۔ مولانا محترم نے اس رسالہ میں اس بات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے کہ جب اسلام ایک مکمل نظریۂ حیات رکھتا ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں تو سیاست سے بے رخی کیونکر کی جاسکتی ہے۔ مذہبی طبقہ سیاست میں حصہ لینے کو دینداری کے خلاف سمجھتا ہے اور جو لوگ حصہ لے بھی لیتے ہیں تو وہ سیاست اور دین کی دوئی کے قائل ہوتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے بالکل برخلاف ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی دین سے خارج نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ جس چیز سے آخرت بنے گی اسی سے دنیا بھی بنے گی لہٰذا مسلمانوں کا سیاسی فارمولہ لازمی طور پر ایسا ہونا چاہیے جس پر عمل پیرا ہوکر دنیا وآخرت میں سرخرو ہوسکیں لہٰذا جب بھی زندگی کے مختلف امور کو دین ودنیا کے خانوں میں بانٹا جائے گا تو ناکامی ہی ہاتھ آئے گی۔ سیاست کے میدان میں مسلم قوم کی ناکامی کا ایک سبب مولانا محترم نے یہ بتایا ہے کہ جب بھی سیاست کی بات ہوتی ہے تو اس کا لائحہ عمل بنانے کے لیے قرآن وحدیث اور قانون سازی کے دیگر اسلامی طریقوں کو نظر انداز کر کے کفار ومشرکین، مذہب بیزار افراد کے بنائے ہوئے قانون کا سہارا لیا جاتا ہے نتیجتاً وہ ان کے نظریاتی گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور کسی قسم کا لائحہ عمل طے نہیں کر پاتے ہیں۔

مولانا محترم نے مسلم سیاست کے تئیں حسب ذیل امور کا ذکر اس رسالہ میں کیا ہے:

☆ سیاست سے کن مقاصد کا حصول مقصود ہے؟

مولانا محترم کے بقول اس کا جواب شریعت کی روشنی میں مرتب کرنا ہوگا حالانکہ اب تک اس حوالہ سے کچھ بھی نہیں ہوسکا ہے جب کہ موجودہ مسلم سیاست کا مقصد صرف دستور میں دیے گئے حقوق کا حصول ہے۔

سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اب تک چار فارمولوں پر عمل کیا جاچکا ہے:

☆ مسلم سیاسی پارٹیوں کا قیام جیسے مسلم لیگ اور مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد اور مسلم مجلس لکھنؤ وغیرہ۔ ان پارٹیوں نے بھی اپنے آپ کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے محدود پیمانہ پر ہی سہی غیر مسلموں کے لیے بھی اپنے دروازے کھول رکھے ہیں۔

☆ انفرادی طور پر کسی بھی پارٹی سے جڑ کر مسلم مسائل کا حل تلاش کرنا۔ اس فارمولہ کے تحت مسلمانوں کا تقریباً تمام پارٹیوں سے جڑے رہنے کے باوجود متعدد مسلم مسائل اب تک حل نہیں ہو سکے ہیں۔

☆ تیسرے فارمولہ کا ذکر نہ کر کے مولانا محترم نے چوتھا فارمولہ ''مسلمانوں کا دیگر اقلیتوں سے مل کر مسائل کو حل کرنا'' بتایا ہے جس پر بعض افراد عمل پیرا بھی ہیں تاہم انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

مولانا محترم کے بقول مسلم سیاست ان ہی فارمولوں کے اردگرد گھومتی ہے جس کی بہترین مثال پانچ مذہبی جماعتوں کا مل کر مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی منشور تیار کرنا اور اسے ملک کی سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش کرنا ہے کہ جو پارٹی اس منشور کو قبول کرتی ہے، الیکشن میں اس کی حمایت کی جا سکے۔

مولانا محترم نے سہ روزہ دعوت، نئی دہلی (۱۳؍جولائی ۱۹۹۹ء) میں شائع ہونے والے اس مسلم سیاسی منشور کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس پر شائع ہونے والے چار تبصروں (سہ روزہ دعوت، جولائی ۱۹۹۹ء، ہفت روزہ اخبار نو، دہلی، ۲۱ تا ۲۷ جولائی ۱۹۹۹ء، روزنامہ منصف، حیدرآباد، ۱۱ اور ۱۳؍ اگست ۱۹۹۹ء) کا بھی ذکر کیا ہے جن میں اس کے قابل عمل ہونے پر سوالیہ نشان لگایا گیا ہے۔ مولانا محترم نے ان تبصروں کو نقل کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا منشور پر کئی بار عمل کیا جا چکا ہے تو ایک بار مزید اس کا تجربہ کیوں کیا جائے اور کیوں نہ کوئی دوسری سبیل اختیار کی جائے، جب کہ سیاست میں روز بروز سکڑتی ہوئی مسلم قیادت کی بنیادی ذمہ دار بھی یہی سیکولر سیاسی پارٹیاں ہیں۔

مولانا محترم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں دیگر اقلیتوں کا اپنے اپنے مسائل کو حل کر لینے کا سبب یہ بتایا ہے کہ مسلمان جمہوریت کا مقصد اور مطلب ہی نہیں سمجھ سکے اور بحیثیت مجموعی اپنی سادہ لوحی کا ثبوت پیش کرتے رہے اور وہ بار بار جمہوریت کے فریب کا شکار ہوتے رہے اور حاکمیت الٰہ کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کو چھوڑنے کا نتیجہ بھگتتے رہے۔ انھوں نے جمہوری سیاست کے کارآمد نسخوں۔ ان کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر۔ پر عمل پیرا نہ ہونے کو بھی مسلم قیادت و سیاست کی ناکامی کا ایک سبب بتایا ہے کہ نہ انھوں نے کبھی بھرپور احتجاج کیا اور نہ اسٹرائیک کی اور نہ ہی جیل بھری لہٰذا ہر پارٹی ان سے اپنا کام نکالتی رہی اور انھیں وعدۂ فردا پر ٹالتی رہی۔ مسلمانوں کی سیاسی ناقدری کا ذکر کر کے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کامیابی کا حصول کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس

کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اسلامی اصول ''لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح أولھا'' پر عمل کر کے ہی کامیابی مل سکتی ہے یعنی آج ہم اپنے مسائل کا حل جمہوریت کو گردانتے ہیں اور بنیادی حل ''قرآن'' کو بھول جاتے ہیں تو کامیابی ہمارے قدم کیسے چوم سکتی ہے؟۔ اس وقت کی مسلم سیاست، اسلامی سیاست نہیں ہے کیونکہ اسلامی سیاست کے کچھ اصول ہیں جن پر نہ تو مسلم سیاست عمل کر رہی ہے اور نہ ہی ان اصولوں کے ساتھ کوئی پارٹی مسلمانوں کو قبول کر سکتی ہے، ہر پارٹی انھیں صرف اتنے ہی حقوق دینے کی بات کرتی ہے جتنے حقوق ''آئین ہند'' نے دیئے ہیں کہ وہ اس کے ہی پابند ہیں نہ کہ شرعی اور اسلامی آئین کے۔ مولانا محترم کے بقول آئین ہند میں منقول حقوق پر راضی برضا ہو جانا نہ تو عقلی طور پر درست ہے اور نہ ہی دینی طور پر کیونکہ اس کا نتیجہ غیر اسلامی تہذیب میں ضم ہو جانا ہے۔

مولانا محترم نے اس وقت کی مسلم سیاست کے غلط راستہ پر گامزن ہونے کے کئی دلائل دیئے ہیں اور اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ خیر امت ہونے کی وجہ سے انھیں دنیا کے سامنے سوالی بن کر نہیں جانا چاہیے بلکہ انھیں دینے والا بن کر جانا ہوگا اور خیر امت ہونے کا مطلوبہ کردار ادا کرنا ہوگا یعنی بدی سے روکنا اور بھلائی کی دعوت دینا، عدل وانصاف کو مہیا کرانا، انھیں مذکورہ بالا فارمولوں کو چھوڑ کر نیا فارمولا آزمانا ہوگا اور وہ فارمولہ صرف قرآن وسنت کی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ مولانا محترم نے کچھ اور نکات بھی بیان کیے ہیں۔

اس رسالہ کا اختتام مولانا حمید الدین عاقل حسامی علیہ الرحمہ کے اس بیان پر ہوتا ہے جس میں انھوں نے اگست ۱۹۹۹ء میں کسی پارٹی کو ووٹ دینا حرام قرار دیا تھا جس پر کافی لے دے ہوئی تھی۔ مولانا محترم نے اس ضمن میں ایک اصولی بات کہی ہے کہ وضو اور اس جیسے دیگر مسائل پر تو علماء فقہی انداز میں گفتگو کرتے ہیں لیکن جب اجتماعی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو عمومی روش اختیار کر لیتے ہیں اور بغیر کسی شرعی دلیل کے گفتگو کرتے ہیں۔

ظاہری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ایک عمومی موضوع کے تحت مرتب کیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر مولانا محترم جب کسی مسئلہ کی تردید کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی وضاحت بالکل ابتداء میں ہی کر دیتے ہیں لیکن اندرونی صفحات سے اس بات کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ جولائی ۱۹۹۹ء میں پانچ جماعتوں کی جانب سے پیش کیے جانے والے مسلم سیاسی منشور کے مالہ وماعلیہ پر گفتگو کرنے کے لیے اسے مرتب کیا گیا ہو۔

مجسّموں کا مسئلہ کے کور پیج کی پشت پر مصنف کی دیگر تصانیف کی فہرست نقل کی گئی ہے۔ اس فہرست میں اس کتاب کا نام ''ہندوستان میں مسلم سیاست'' مذکور ہے۔

نتائج بحث

☆ مولانا علیہ الرحمہ کا اکثر تحریری سرمایہ کسی نہ کسی مسئلہ کی تردید کرتا ہے۔

☆ کچھ مباحث یا دلائل کو دیگر رسائل میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

☆ مسجد کے حوالہ سے دو رسائل پائے جاتے ہیں جن کا پس منظر ایک ہی ہے یعنی بابری مسجد کا انہدام۔

☆ کتابوں کے عناوین کو مصنف کی دیگر کتابوں کی فہرست میں جزوی اختلاف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

☆ لا اکرہ فی الدین، راہ سعادت اور وسائل تربیت نامی رسالے مولانا مرحوم کے بلاگ پر موجود نہیں ہیں۔

☆ پروف ریڈنگ کی کچھ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

آموزاریاں
حکایات عنادلِ گلستانِ اصلاحیؒ

اندھیری رُت ہے، اے چاند تارو! تم اپنا دامن اُجال رکھنا
نہ ماند ہو پائیں کہکشائیں، یہ نور ہالے سنبھال رکھنا

اک اضطراب دروں نے ہر سو، سکونِ انسانیت ہے چھینا
بچا کے گوشِ و نگاہ اپنے، جمعیتِ دل بحال رکھنا

جدید تعلیم کے یہ فتنے، بھنور ترے بحر میں ہیں کتنے!
ڈبو نہ دینا سفینۂ دل، خیالِ روزِ زوال رکھنا

خشیتِ حق کلید تیری، کشادِ ہر دو جہاں اسی سے
سمیٹ کر طاقِ دل میں اپنے، یہ نعمتِ ذوالجلال رکھنا

تلاش کرنا وہ صحبتیں جو، دلوں کی مٹی کو نرم کردیں
کہ سنگ و خاشاک چھانٹ دینا، نہ کوئی اس کا ملال رکھنا

ملے اگر اہلِ دل کی بستی، سنور سکے جس جگہ یہ ہستی
تو ڈھونڈنا پھر مقامِ احساں، یہی معیارِ کمال رکھنا

جو میں نے الماس سے یہ پوچھا، ہے تیری قسمت میں تاج کیوں کر؟
کہا کہ رفعت ہے خاکساری میں! پس یہ جاں پائمال رکھنا

ہیں عظمتیں بس اُسی کو زیبا، جو مالکِ ہست و بود ٹھہرا
جو مشتِ خاکی ہو کیا اُسے پھر، غرورِ جاہ و جلال رکھنا

وہ ہوا کے رخ پہ رہے مگر کبھی جھلملا کے نہ بجھ سکے

امۃ المعبود بنت محمد اعظم غوری، حیدرآباد

اس گلشن ہستی میں انسان جب آنکھیں کھولتا ہے تو اپنے اطراف و اکناف میں ہزاروں افراد سے اس کا ربط وضبط ہوتا ہے، بے شمار لوگوں سے اس کا سابقہ پڑتا ہے، کچھ لوگوں سے بالواسطہ اور کچھ لوگوں سے بلاواسطہ واقفیت ہوتی ہے، کچھ شخصیات، افراد، ادارے مل کر اس کی شخصیت کو پروان چڑھاتے اور نشوونما اور ترقی میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ میری شخصیت کی تعمیر میں کلیدی رول کی حامل شخصیت میرے استاذِ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی ہے۔ مولانا نے ہماری سرپرستی و رہنمائی کی ذمہ داری اسی وقت سے لے لی تھی جب ہم ابھی شعور کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ میرے والد محترم طاغوتی طاقتوں سے برسرِ پیکار، گھر بار، آل اولاد، رشتوں ناطوں کو چھوڑ کر صحراؤں، بیابانوں کی خاک چھانتے ہوئے جب شہادت کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے تو میری عمر محض سات سال تھی۔

ہم والد محترم کی شہادت سے پہلے اور شہادت کے بعد اس طرح کے تمام حالات سے دوچار ہوئے جو راہِ حق کے راہیوں کے اہلِ خانہ کو درپیش آتی ہیں۔ اس دشوار گزار سفر میں ہم نے جن کو اپنا ہمرکاب پایا وہ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ہیں۔ مولانا نے ہماری سرپرستی و رہنمائی کب قبول کی اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن جب سے میری یادداشت میرا ساتھ دیتی ہے تب سے میں نے مولانا کو اپنے سرپرست اور مربی کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ میں ابھی ساتویں درجہ میں ہی تھی کہ مولانا نے میرا داخلہ اپنے مدرسہ جامعۃ البنات حیدرآباد میں کرا دیا۔ مولانا کی حسین اور خوبصورت یادوں کا اتنا قیمتی سرمایہ میرے پاس موجود ہے کہ ان کو ان کی خوبصورتی سمیت ضبطِ تحریر میں لانا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ مولانا نے میری اور میری بہنوں کی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت ایک ایسے باپ کی طرح کی جس کا جوان بیٹا جوانی میں داغِ مفارقت دے کر تین بیٹیوں کی ذمہ داری بھی سونپ گیا ہو۔ ایک زمانے تک ہم مولانا کو دادا کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ مولانا کہنے کی عادت مدرسہ میں داخلہ کے بعد ہوئی۔

مولانا نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر دینی شعور بھی پروان چڑھایا۔ مولانا نے نہ صرف ہمیں ایک اچھا مسلمان بنایا بلکہ ہمیں امتِ وسط کا، خیر امت کا ایک متحرک کارکن بنانے کی تگ ودو میں زندگی صرف کردی۔ مولانا نے ہمیں سکھایا کہ امت کے اس بگاڑ کے زمانے میں امت کی اصلاح کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر قبول کرنا اور آنے والی آزمائشوں پر صبر کرنا عنداللہ ترقی درجات کا سبب ہوگا۔ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام، حبیب اللہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو اپنا مشن بنا کر زندگیوں کو اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ فتنوں کے زمانے میں امت کی اصلاح کے بارِ گراں کو محسوس کرتے ہوئے مولانا نے ملت کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خود کو وقف کردیا تھا تاکہ ملت کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں رہے کہ نونہالوں کی پرورش اور تربیت اور ملت کا مستقبل ملت کی انہی بیٹیوں سے وابستہ ہے۔ مولانا کی کوششیں ثمر آور ہوئیں۔ مولانا کی طالبات معاشرے کی اصلاح کے لیے کمربستہ نظر آتی ہیں۔ کہیں چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں دین کی مشعل کو تھامے ہوئے تو کہیں بڑے بڑے جامعات اور کالجس میں اپنے افکار کی روشنی بکھیرتے ہوئے۔ نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بکھرے موتیوں کے مانند مولانا سے تحصیل شدہ علم اور شعور سے اپنے اپنے علاقوں کو منور کررہی ہیں۔

مولانا اپنے عمل سے ہمیں یہ پیغام دیتے تھے کہ یہ دور اگرچہ باطل سے مرعوبیت کا دور ہے لیکن وارثانِ انبیاءؑ کبھی باطل طاقتوں اور ان کے غلبہ سے مرعوب نہیں ہوتے، وہ تو اپنی آستینوں میں یدِ بیضا لیے بیٹھے ہوتے ہیں اور عصائے کلیمی سے ساحروں کی ساحری کا طلسم توڑ دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ باطل کا پہرا سخت ہے، اندھیرا بہت ہی گہرا ہے، لیکن جہدِ مسلسل کرنا، رکنا نہیں، تھکنا نہیں، تھمنا نہیں۔ اپنے اپنے دائرہ میں اپنی اپنی بساط کے مطابق اقامتِ دین کی کوشش جاری رکھنا۔ حق کا علم تھامے رکھنا، غلبۂ اسلام کا خواب آنکھوں میں سجائے اور دل میں بسائے رکھنا، خالص اللہ کی رضا کے لیے کام کرنا، اللہ اعمال و افعال میں برکت عطا کرے گا۔

مولانا نے ہمارے اندر دین کی عظمت اور اللہ اور رسولؐ سے محبت پروان چڑھائی۔ مولانا کی روشن اور تابناک زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو مولانا عظمت کے مینار پر پہنچے ہوئے بہت بلند نظر آتے ہیں۔ مولانا کی وہ

امتیازی خصوصیات جس کا ہر خاص و عام مشاہدہ کیا کرتے تھے یہ تھیں۔

☆ مولانا قرآنی آیتوں اور احکامِ الٰہی کے محافظ تھے، قرآنی آیتوں کی معنوی تحریف یا غلط تاویل پر غضبناک ہوجاتے اور علماءِ سو کی سازشوں کو بے نقاب کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی زندگی احکامِ قرآن کی پہرہ داری کرتے ہوئے گزاری۔

☆ آپ اُن علماءِ ربانیین میں شامل تھے جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آجائے، جن کے پاس بیٹھنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوجائے۔ مولانا میں استغناء و توکّل تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے خاص تعلق تھا، آپ کی روشن آنکھوں میں قیامِ خلافت کی امید کے روشن دیے جگمگاتے رہتے تھے۔

☆ مولانا کے نزدیک مدارس دینیہ کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ مولانا زندگی بھر مدارس کی خدمت میں لگے رہے۔ اللہ نے علم دین کی جس دولت سے نوازا تھا، اسے تقسیم کرنے میں دن رات جٹے رہے۔ ہندوستان کے کئی مدارس کا وجود مولانا کا رہینِ منت ہے۔ حیدرآباد میں بھی بہت سے مدارس آپ کی ترغیب اور آپ کے تعاون سے وجود میں آئے ہیں۔

☆ مسئلہ بابری مسجد سے مولانا روزِ اول سے تا دمِ مرگ جڑے رہے۔ ہندوستان میں تحریکِ بازیابیٔ بابری مسجد کو زندہ و جاوداں رکھنے والے واحد عالمِ دین مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ ہی ہیں۔ اس راہ میں مولانا کی قربانیوں کے نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

☆ مولانا کے اسلامی افکار پر اگر عمل کیا جائے تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا رخ تبدیل ہوسکتا ہے۔ مولانا نے ملتِ اسلامیہ ہند کو ایک لائحۂ عمل عطا کیا ہے، خبر نہیں وہ وقت کب آئے گا مگر پختہ یقین ہے کہ وہ وقت آئے گا جب مولانا کے افکار سنگِ میل اور نقشِ راہ قرار پائیں گے۔

مولانا ایسے وقت میں ہم سے جدا ہوئے جب مولانا کی ملت اسلامیہ کو سخت ضرورت تھی:

وہ جدا ایسے موسموں میں ہوئے
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے
آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود
ایسے بے مثل عکس گر تھے وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتے تھے
ایسے انمول ہم سفر تھے وہ

اپنے دل میں سنبھال کر ان کو
اپنے ہاتھوں سے کھو رہے ہیں انھیں

ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینہ خانے رو رہے ہیں انھیں

وہ جو خوشبو میں ڈھل گئے یارو
ان کو کس پھول کا کفن ہم دیں

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس عظیم مردِ مجاہد کے درجات کو بلند فرمائے۔ اللہ ہمارے مولانا کی قبر کو نور سے منور فرمائے اور ہمیں جنت الفردوس میں آپ کا ساتھ نصیب فرمائے۔ آمین!

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر سیدہ آمنہ بنت سید احمد، حیدر آباد

میرے ہر دل عزیز، مشفق و مخلص استاذ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت میرے ذہن و دل کے لیے ایک نا قابلِ قبول حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جسے دل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مولانا محترم صرف میرے استاد اور میرے مربی ہی نہیں بلکہ اسلامیانِ ہند کے محسن و رہنما بھی تھے۔ اسلامیانِ ہند کو اپنے دورِ غلامی میں جن جن محاذوں پر جہد و عمل کی سخت ضرورت تھی مثلاً شریعت و شعائرِ اسلام کا دفاع، صحیح فکر اسلامی کی حفاظت، مسلمانوں کی فوز و فلاح کی تدابیر و کوششیں، ملتِ اسلامیہ کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی دینی تعلیم و تربیت، عوام الناس کی اصلاح کے اقدامات اور اقامتِ دین اور احیائے کلمۃ اللہ کے کاز کو جاری رکھنے کے لیے مختلف تحریکاتِ اسلامی کے ساتھ تعاون...... مولانا نے ان تمام میدانوں میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

ہم نے ہر منزل امکاں پہ جلائے ہیں چراغ
ورنہ ہر قافلہ راہوں میں بھٹکتا ہوتا

مولانا محترم عام معنوں میں ایک مصلح ہی نہیں بلکہ اپنی ذات میں سراپا اصلاح تھے۔ مولانا محترم کے اوصاف اور اخلاق و کردار کا ذکر کروں تو مجھے یہ احادیث یاد آتی ہیں جو مولانا کی شخصیت کا خاصہ تھیں:

- ☆ بہترین لوگ وہ ہیں جنھیں دیکھ کر خدا یاد آئے۔ (ابن ماجہ)
- ☆ اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو میری اس سنت کی اصلاح و احیاء کریں گے جسے لوگوں نے میرے بعد خراب کر دیا ہوگا۔
- ☆ بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء درہم و دینار نہیں چھوڑ کر جاتے ہیں بلکہ وہ تو صرف علم چھوڑ کر جاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

☆ اللہ اس شخص کے چہرے کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی چیز سنی تو اس نے جیسے اسے سنا تھا ویسے ہی اسے آگے پہنچا دیا۔ (ترمذی)

☆ جس شخص کو احیائے اسلام کے لیے علم حاصل کرتے ہوئے موت آجائے تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے مابین صرف نبوت کا ایک درجہ ہوگا۔ (الدارمی)

☆ میرے بعد سب سے بڑا سخی شخص وہ ہے جس نے علم حاصل کیا اور اسے فروغ دیا۔ روزِ قیامت وہ اس حیثیت سے آئے گا کہ وہ اکیلا ہی امیر ہوگا۔ اکیلا ہی ایک امت ہوگا۔ (بیہقی)

میرے مشفق مولانا کی زندگی کا مقصد اللہ کی سرزمین پر اللہ کے نظام کے نفاذ و قیام کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ جس کے روزِ قیامت ہم شاہد ہوں گے۔

مولانا اکثر و بیشتر طالبات کو نصیحت کرتے رہتے تھے کہ ''اپنے علم سے اپنے دل و دماغ کو منور کر دو تا کہ غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو اور حالات کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے بروقت عملی اقدام کے قابل بنو۔'' میری جب بھی مولانا سے ملاقات ہوتی مولانا بڑی شفقت و محبت سے خیر خیریت دریافت کرتے اور خوش ہو جاتے۔ مولانا کا وہ پُرشفقت لہجہ اور پر تپاک انداز میری آنکھوں کو ہمیشہ نمناک کر جاتا ہے کہ جب اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا تو مولانا بڑے خوش ہوئے۔ بچے کا نام تجویز کیا اور برکت کی دعا دی۔ میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ میرے تمام بچوں کے نام مولانا نے تجویز کیے۔ محبت کی حد یہ ہے کہ دعا کے ساتھ ساتھ ہر عید پر میرے بچوں کیلئے تحائف بھی بھجواتے تھے اور جب بھی میں بچوں کے ساتھ آتی بچوں کو ضرور اپنے پاس سے پیسے بھی دیتے تھے۔

تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں ہمیشہ مولانا محترم نے میری ہمت افزائی اور رہنمائی فرمائی۔ پی۔ایچ۔ڈی کے وائیوا کا دن تھا اور گھبراہٹ اپنے عروج پر تھی، میں صبح سویرے مولانا کے پاس پہنچ گئی اور اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی تو مولانا نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ ''پریشان نہ ہو جی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' یہ الفاظ میرے لیے اکسیر بن گئے اور میں مطمئن ہو کر یونیورسٹی روانہ ہوگئی۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ میں داخلہ میں نے مولانا کی تحریک پر ہی لیا تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ ہم کبھی اپنے تعلیمی سلسلہ کو منقطع نہ کریں، چنانچہ گاہے بہ گاہے جب بھی میں مولانا سے ملاقات کے لیے آتی مولانا مجھ سے تعلیمی و تدریسی مصروفیات کے سلسلہ میں ضرور سوال کرتے۔

ایک مرتبہ مولانا نے مجھ سے کہا کہ ''آمنہ! تم ٹولی چوکی میں ایک مدرسہ قائم کرو۔'' میں اپنی ذاتی مصروفیات اور عزم میں کمی کی وجہ سے مولانا کی زندگی میں تو یہ خواہش پوری نہ کر سکی جس کی کسک تا عمر مجھے بے چین رکھے گی لیکن میرا یہ عزم مصمم ہے کہ مولانا کی اس خواہش کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گی۔ مولانا کی یہی

خواہش رہا کرتی تھی کہ ہم طالبات دین کے کاموں میں مصروف رہیں۔ الحمدللہ اپنی بساط بھر میں نے مولانا کی اس خواہش کا احترام کرنے کی کوشش کی ہے اور جماعت اسلامی کی جانب سے چلائے جانے والے ادارے ''اُمومت انسٹی ٹیوٹ'' کا اس کے بالکل ابتدائی زمانہ سے حصہ رہی ہوں۔ مولانا نے ہمارے اندر وہ جذبہ اور جوش بھر دیا ہے کہ ہم اپنی گھریلو مصروفیات سے وقت چرا لیا کرتے ہیں اور دین وملت کی خدمت ہماری اولین ترجیح ہوا کرتی ہے۔ یہ مولانا کا اخلاص ہے جو مجھ جیسی ہزاروں طالبات میں منتقل ہوا ہے کہ ہم تمام طالبات ہی اپنی اپنی جگہ پر اپنی بساط کے مطابق عملی میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ اور کوئی طالبہ بیکار بیٹھی ہوئی نہیں ہے۔

مولانا نے تعلیمی تحریک کی جو بنیاد ڈالی ہے وہ تحریک نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ تلنگانہ وآندھرا پردیش، مہاراشٹرا اور راجستھان، اڑیسہ، یوپی، دہلی وبہار، جھارکھنڈ، آسام، بنگال بلکہ اندرون وبیرون ملک بھی پھیل گئی ہے اور اپنے نتیجہ خیز اثرات مرتب کر رہی ہے۔ ہماری کلاس میں آندھرا سے تعلق رکھنے والی ایک طالبہ ایک ایسے گاؤں سے آئی تھی جہاں ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بول چال سے لے کر اخلاق وعادات اور لباس تک ہندوانہ تھا۔ مسلم گھروں میں سائی بابا کی تصویر لگی ہوتی۔ جس پر پھول مالا چڑھائے جاتے تھے۔ کفروشرک کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ جب مولانا سے ایڈمیشن کے وقت اس کے والد نے یہ سب باتیں بیان کیں تو مولانا کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور مولانا نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ''پچاس سالوں سے ہم نے مسلمانوں کی اصلاح کے بڑے کام کیے ہیں، لیکن اب پتہ چل رہا ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔'' مولانا جب بھی ہماری کلاس میں آتے خصوصیت سے اس طالبہ کو نصیحتیں کرتے۔ الحمدللہ! وہاں سے جتنی طالبات جامعہ آئیں سب نے اس علاقہ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ انشاءاللہ ہم طالبات کی یہ محنت مولانا کے لیے بہترین صدقہ جاریہ ہوگی۔

دورِ طالب علمی کی کچھ یادیں سپرد قرطاس کرتے ہوئے آنکھیں نم ہو رہی ہیں۔

صبح سویرے ہشاش بشاش جب ہم سب مدرسے میں قدم رکھتے تو اسمبلی کا روح پرور ماحول طبیعت خوش کر دیتا تھا۔ بڑے ہی پر جوش انداز سے ترانہ گنگناتے اور دل کی گہرائیوں سے ''رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا'' کہتے تھے۔ اور اس جوش وخروش کو خراج اس وقت ملتا جب استادِ محترم ناظم جامعہ محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی طرف سے حکم جاری ہوتا کہ ''عالمہ اول کی طالبات روک دی جائیں۔ بقیہ تمام اپنی جماعتوں میں چلی جائیں۔'' پھر کیا تھا ہمارے پُرمسرت چہروں پر خوف وفکر کی لہر دوڑ جاتی تھی اور صف اول کی لڑکیاں بڑی تیزی سے حذف ہو جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عالمہ اول کی طالبات اکٹھا ہو جاتی تھیں۔ مولانا کی طرف سے اچانک ملنے والی یہ انوکھی تربیت ناگہانی آفت لگا کرتی تھی مگر پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنی ثمر آور ہوگی۔ مولانا کی تربیت کا ایک انوکھا انداز تھا۔

آپ سوال پوچھتے کہ ''کتاب الصرف'' پڑھنے والی لڑکیاں ہیں یہ بتاؤ تو سہی ماضی کی گردان پر کتنا عبور حاصل ہے؟ مختلف مادوں سے گردان ایک سانس میں سنائیں۔ خود عملی طور پر گردان پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم طالبات سے اپنی کم علمی کا خوف دور ہو جاتا تھا۔ مولانا دوسرا سوال کرتے کہ ''چلو جی! اب صیغوں کی پہچان کا اندازہ کرتے ہیں، چلئے جملہ بنایئے، ہم دو لڑکیاں کل چار مینار گئیں۔''

مولانا کے اس منفرد طرزِ تدریس نے ہم تمام طالبات کی صلاحیتوں کو ایسی جلا بخشی ہے کہ جس سے ہماری علم وحکمت کی راہیں ہمیشہ منور رہیں گی اور ذخیرہ آخرت بنیں گی اور آپ کی شفقت اور آپ کی نصیحتیں ہمیشہ ہمارے لیے مشعل راہ بنیں گی......انشاءاللہ

مولانا کی نباض شخصیت ہمیشہ حالات کی نزاکت اور سنگینی پر اپنی گرفت رکھا کرتی تھی۔ مولانا کی ہمیشہ یہ کوشش رہا کرتی تھی کہ ہم طالبات کے اندر صرف تعلیمی صلاحیت ہی پیدا نہ ہو بلکہ ہم عزم وہمت کا پیکر بھی بنیں اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کی حامل ہوں۔ مولانا کئی مرتبہ ہمارے لئے بہترین مقررین کو مدعو کرتے تھے اور اکثر ایسے انعامی مقابلے کرواتے جس کے ذریعہ ہم سیرت صحابیاتؓ سے اچھی طرح واقف ہوجاتے۔ ان مقابلوں کے ذریعہ مولانا ہم طالبات کے اندر صحابیاتؓ کے اوصاف پیدا کرنا چاہتے تھے اور ہمارے پیکر کو وہ رنگ دینا چاہتے تھے جو صحابیات وصالحات کے مضبوط ایمانی پیکر کا مظہر ہو۔ بظاہر نیچی نظر آنے والی نگاہوں میں ہمیشہ طالبات کے ایمانی مستقبل کی فکر رہا کرتی تھی۔ اور ہلتے ہونٹوں میں یہ دعا:

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

مولانا کی رحلت سے نہ صرف علمی خسارہ ہوا ہے بلکہ کفر وباطل، ظلم وستم کے خلاف مولانا کی جو حساس نظر تھی اور حالات کی سنگینی کی جو پرکھ تھی اور اس کے مطابق بروقت جو رہنمائی ہوا کرتی تھی......آہ! اب ملت اسلامیہ اس سے محروم ہوگئی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استاذِ محترم کے درجات کو بلند کرے اور ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین!

''چراغ ایسے جلا چلے ہم''

نور عائشہ، بنگلور

رب العالمین سے التجا ہے کہ یارب! میرے محترم معلم، مجاہد، مفکر اسلام اور میرے محسن سیدی استاذی مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کو شہداء صدیقین اور صالحین میں شامل فرما۔ آمین!

میرا تعلق بنگلور سے ہے۔ بنگلور کے بہت سارے مدرسوں کو چھوڑ کر میرے بڑے بھائی نے میرا داخلہ مولانا کے مدرسہ جامعۃ البنات حیدرآباد میں کروایا۔ رشتہ داروں کے استفسار پر کہا کہ اس مدرسہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت کا بھی نظم ہے۔ میری بہن کو وہاں صحیح اسلامی فکر ملے گی اور ایمانی جذبہ پروان چڑھے گا۔

میرے بھائی کا یہ خیال سچ ثابت ہوا۔ الحمدللہ ہمارا مدرسہ باقی مدرسوں سے واقعی مختلف تھا، یہاں ہمیں مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ گھر کی محبت، خلوص اور اپنائیت بھی ملی۔ میں جو کہ بچپن سے محبتوں کو ترسی ہوئی تھی کہ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے جدا ہو گیا تھا۔ میرے صرف دو بھائی تھے کوئی بہن نہیں تھی۔ اس مدرسہ میں آ کر چاچی کی شکل میں ماں، مولانا کی صورت میں باپ اور بہنوں کی صورت مولانا کی صاحبزادیاں اور ہاسٹل کی طالبات خاص طور سے ہاسٹل میں ہماری تربیت کی ذمہ دار عفیف باجی مل گئیں کہ ان لوگوں کی محبت اور حسنِ سلوک میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتی۔ یہاں وہ خلوص و اپنائیت ملی کہ میں زندگی کے سارے غم بھول گئی، ہاسٹل میں مولانا کے زیرِ تربیت گزارے ہوئے یہ ماہ و سال ہی میری زندگی کا حاصل ہیں۔

مدرسہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر جرأت ایمانی بھی پروان چڑھی۔ حق اور باطل میں فرق کرنا

سکھایا گیا۔ باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت اور باطل کے سامنے ڈٹ جانے کا ہنر سکھایا گیا۔ مولانا کے زیر سایہ یہ جامعہ حق کا ایک مضبوط قلعہ اور فکر اسلامی کا گہوارہ تھا جہاں سے ہمیں یہ درس ملا کہ

حق بات کہیں اور ڈٹ جائیں پھر چاہے گردن کٹ جائے
جب خون بہے دشمن بھی کہے کردار معلم زندہ ہے

یہ فکر، یہ جرأت، یہ بہادری، یہ جذبہ مولانا سے ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں مولانا کی شاگرد رہی ہوں اور یہ میرے لیے بڑے ہی اعزاز کی بات ہے۔

مولانا صبر کی چٹان تھے، مولانا نے اپنی زندگی میں بہت سے غم اٹھائے مگر کبھی کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔ مولانا اپنی فکر کرنے والے نہ تھے بلکہ دوسروں کی فکر میں گھلنے والے، دوسروں کے غم میں تڑپنے والے تھے۔ میرے مولانا کو دنیا والوں نے بہت ستایا مگر میرے مولانا نے کسی تکلیف کا اظہار کبھی نہ کیا، کبھی کسی سے کوئی شکوہ شکایت نہ کی بلکہ سراپا شفقت ومحبت بن کر ہم طالبات میں علم اور محبت بانٹتے رہے

تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

مولانا کے ساتھ اس راہ میں آپ کا پورا گھرانہ بھی شریکِ سفر رہا۔ چاچی (مولانا کی اہلیہ) ہاسٹل کی بچیوں کا ماں کی طرح خیال رکھتیں، کھانے کا، صحت کا، ضرورتوں کا، بچیوں کا ہر طرح خیال رکھنا چاچی اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ہم بچیاں بھی چاچی سے بے حد محبت کرتیں، بلکہ ہم کہتیں کہ چاچی بھی کسی مجاہدہ سے کم نہیں ہیں۔ چاچی کی جرأت، ان کا جذبہ بھی مولانا ہی کی طرح تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ چاچی کو عافیت سے رکھے اور ان کا پر شفقت سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

میرے مولانا اس دنیا کے نرالے آدمی تھے، ہم نے دنیا میں ایسے لوگ دیکھے ہی نہیں، جب آدمی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اسے اپنے اہل وعیال کی فکر ہوتی ہے۔ مولانا یہاں بھی بازی لے گئے کہ مولانا کو مدرسہ کی فکر ......قوم کے مستقبل کی فکر......شعائر اسلام کے تحفظ کی فکر...... بابری مسجد کی تعمیر نو کی فکر......مسلمانانِ ہند کو درپیش چیلنجز کی فکر...... کتنی فکریں اپنے دل میں لیے مولانا دنیا سے رخصت ہوئے یہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔

مولانا کے اس دنیا سے چلے جانے سے مسلمانانِ ہند ایک مردِ مجاہد، امام برحق اور عالمِ حق کی قیادت سے

محروم ہوگئے ہیں اور امت مسلمہ کے تحریکی نوجوان یتیم ہوگئے ہیں۔

آج محض مولانا کے گھر والوں سے ہی نہیں بلکہ ہمارے سروں سے بھی ایک مشفق باپ اور استاذ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ مولانا کی زندگی کو اگر بیان کرنا ہو تو میرے نزدیک یہ آیت کافی ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

میری دعا ہے کہ استاذ محترم کو اللہ غریقِ رحمت کرے، شہداء اور صدیقین میں شامل فرمالے اور ہمیں مولانا کے مشن کو پورا کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

بجھا سکے گی نہ جس کو آندھی
چراغ ایسے جلا چلے ہم

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی

اسماء امین بنت نعمت علی، راجستھان

کیا کہیں......؟ کیسے کہیں......؟ زبانیں گنگ ہیں اور قلم ساکت...... یہ سانحہ ہمارے لیے قیامت سے کم نہیں...... کہ مولانا اب ہم میں نہیں رہے...... انا للہ وانا الیہ راجعون...... مولانا محترم کا سانحہ ارتحال سوہان روح ہے لیکن ہم کبھی وہ بات نہیں کہیں گے جو اللہ رب العزت کو ناپسند ہو...... کیونکہ صبر محبت کے قرینوں میں سب سے اہم قرینہ ہے......

معزز قارئین! آپ نے مولانا سے متعلق کئی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ ان تحریروں کے آئینہ میں مولانا کی شخصیت کے ان تین نمایاں پہلوؤں کو دیکھا ہوگا کہ مولانا محترم محسن تھے، مربی تھے اور بہترین قائد و رہنما تھے۔ مولانا ہمارے بھی محسن ہیں۔ مولانا کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں۔ شاید میں ایک تحریر میں ان کا احاطہ نہ کرسکوں۔

میرا تعلق راجستھان کی راجپوتانہ تہذیب سے ہے...... ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ غیر اسلامی عقائد، غیر اسلامی رسوم و رواج اور غیر اسلامی طور طریقہ پر مشتمل ہے...... پتہ نہیں کب سے مسلمان اسی ماحول میں بے دینی کی زندگی گزار رہے ہیں! جہاں لڑکیوں کی تعلیم سرے سے ناپید ہے...... اگر کسی کسی گھرانے میں تعلیم کا رواج ہے بھی تو صرف دسویں تک۔ دینی تعلیم کا تصور تو دور کی بات ہے...... تعلیم کے نام پر لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا ایک انہونی بات، اپنی روایتوں سے انحراف اور بغاوت کے مترادف ہے...... دینی تعلیم کا بھی کوئی نظم نہیں ہے۔ اس ماحول میں بہت کم ہی عورتوں کو قرآن پڑھنا آتا ہے۔ نماز کی چند چیزیں انھیں یاد ہوتی ہیں اور بس۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ فرق کرنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ مسلمان کون ہیں اور غیر مسلم کون..؟!

مولانا محترمؒ نے نہ صرف میری زندگی اور میرے ساتھیوں کی زندگی بدل دی بلکہ ہمیں وہ ہنر سکھائے...... وہ گن بتائے جس کی مدد سے ایک تہذیب کو بدلا جاسکتا ہے......اور معاشرہ میں صالح انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

جب ہم بہت چھوٹے تھے (ہم سے مراد میں اور میری بہنیں) تب سے ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے ابو اپنے معاشرے کے رسم ورواج سے بیزار نظر آتے......اپنی برادری کی کئی مسائل میں مخالفت کرتے نظر آتے...... جاہلانہ سوچ وفکر سے کوسوں دور نظر آتے......عموماً ہر خراب اور بگڑے معاشرے میں دو قسم کے اچھے لوگ ضرور ہوتے ہیں۔ایک تو وہ گروہ جو اپنے آپ کو سدھار لیتے ہیں، برائیوں سے خود کو دور کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر اپنے معاشرے کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے اور اپنی نیکیوں میں مگن رہتے ہیں۔اور دوسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے برے ماحول اور اپنے معاشرے کی جہالت کے باغی ہوتے ہیں۔ اس کو بدلنے، اس کو سدھارنے کے لیے صرف باتوں کی حد تک محدود نہیں رہتے بلکہ نارِ جہالت کو بجھانے کے لیے اپنے حصہ کا قطرہ آب ضرور ڈالتے ہیں۔ بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اپنے معاشرے کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علمِ حق کے اجالوں کی طرف لے آئیں......الحمدللہ! میرے ابو دوسری قسم کے نیک لوگوں میں شامل ہیں کہ جو ہر قسم کی جہالت کے باغی ہیں۔اور جو صرف باتیں نہیں بناتے بلکہ عمل کے میدان میں اترتے ہیں۔ ماشاءاللہ! اللہ ابو کی کوششیں قبول فرمائے آمین!

میرے ابو کو اللہ نے چھ بیٹیوں کی شکل میں جنت نوازی ہے......ابو کو دن رات اپنی جنت کو سنوارنے اور نکھارنے کی فکر لگی رہتی تھی اور انھوں نے اندر ہی اندر یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ بیٹیوں سے متعلق تمام روایتوں کو توڑتے ہوئے انھیں نہ صرف دنیوی تعلیم سے بلکہ دینی تعلیم سے بھی ضرور آراستہ کریں گے۔ کیونکہ ابو یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ محض دنیاوی تعلیم کسی صالح انقلاب کا پیش خیمہ نہیں بن سکتی۔ ہمارے علاقے کی بدقسمتی تھی کہ دور دور تک کوئی چھوٹا بڑا مدرسہ وجود نہیں رکھتا تھا، کیونکہ باڈری علاقہ ہے یا تو دین سے دوری کی وجہ سے یا علاقے کی حساسیت کے پیش نظر کسی نے لڑکوں یا لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

ہماری پیدائش کے بعد سے ہی ابو مدرسوں کی تلاش میں تھے......اس تلاش کو منزل اس وقت ملی جب ابو کے ایک ساتھی نے حیدرآباد میں مقیم ایک عالم دین مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے بارے میں بتایا کہ حیدرآباد میں لڑکیوں کا سب سے پہلا مدرسہ کھولنے کا سہرا ان کے سر ہے اور ہاسٹل کی بھی سہولت ہے......اس اطلاع کے ملتے ہی ابو نے اپنا من بنا لیا کہ اپنی بیٹیوں کو حیدرآباد تعلیم کے لیے ضرور بالضرور لے جائیں گے ابو کو اس بات کا اندازہ بخوبی تھا کہ اس کام کے لیے ایک مسلسل اور ناختم ہونے والی جدوجہد درکار ہے...ابو اپنے والدین کی اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی ذہن سازی میں لگے رہے......

جب میری عمر نو سال ہوئی تو ابو نے اپنے گھر میں بانگ دہل یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنی دو بیٹیوں کو حیدرآباد دینی تعلیم کے لیے لے جا رہا ہوں......سب حیرت زدہ رہ گئے......مخالفتیں شروع ہوگئیں اتنی چھوٹی بچیوں کو اتنی دور؟ بچیاں گھر سے باہر جا کر تعلیم حاصل کریں گی تو باغی ہو جائیں گی......ہمارا کلچر ایسا نہیں......ہمارا سماج اس بات کی اجازت نہیں دیتا......آس پڑوس کیا کہیں گے؟ برادری میں ناک کٹ جائے گی......نام خراب ہوگا......اور تو اور بچیوں کی شادیاں نہیں ہوں گی......؟!! سب سے زیادہ پریشان تو دادی تھیں کہ گھر سے اتنی دور لڑکیوں کو چھوڑنا بڑا کام تھا جس کا تصور میرے گھر والوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

غرض مخالفتوں اور اعتراضات کا ایک طوفان امڈ آیا......میرے ابو کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا......بہت کچھ برداشت کرنا پڑا لیکن ابو ڈٹے رہے اور اپنے فیصلے سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ ہوئے۔ ابو نے اپنی برادری کے خلاف قدم اٹھا کر بہت بڑا جہاد کیا تھا۔ ابو کے پختہ ارادے کو دیکھتے ہوئے گھر والے خاموش ہو گئے۔ ابو نے دادا، دادی کو اپنے ساتھ حیدرآباد چلنے کے لیے یہ کہہ کر تیار کر لیا کہ اگر آپ لوگ مطمئن نہ ہوں تو واپس آجائیں گے۔

میرے ابو، امی، دادا، دادی ہم دونوں بہنوں کو لیکر تین دن کا تھکا دینے والا سفر کرتے ہوئے حیدرآباد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے مدرسہ پہنچے...... یہ 2004ء کا واقعہ ہے۔

یہاں میں اپنے سارے معاونین اور خیر خواہوں کے لیے اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ ہمارے علم اور عمل کو قبول فرما کر ان تمام لوگوں کے لیے ہمیں ثوابِ جاریہ بنا دیجیے جو ہماری دینی تعلیم کا ذریعہ بنے ہیں۔ آمین!

ہم لوگوں نے چونکہ سارا ماحول اور کشمکش دیکھ رکھی تھی اس لیے ہم بہت پریشان اور سہمے ہوئے تھے۔ جب ہم نے مدرسہ میں قدم رکھا اور مولانا پر نظر پڑی تو جو پہلا تصور آیا وہ یہ تھا کہ روشن آنکھوں والے، کشادہ پیشانی والے یہ انسان میرے ابو کی طرح شفیق اور دادا کی طرح بچوں سے محبت کرنے والے ہیں......ٹیچر اور استاد کا تصور کہیں نہیں تھا......مولانا سے مل کر بات کر کے جہاں میرے دادا، دادی مطمئن ہوئے وہیں میرے ابو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا......ابو کی مسلسل کوشش، سچی لگن، نیت کی درستگی اور انتھک محنت رنگ لائی تھی۔

محترم مولانا اور مولانا کے گھر کے افراد ہمارے لیے اللہ کی رحمت ثابت ہوئے۔ دو دن قیام کے بعد ابو اور دیگر اپنے شہر روانہ ہو گئے اور ہم دونوں بہنیں کچھ گھبرائی ہوئیں اور کچھ خوفزدہ تھیں...لیکن مولانا کی اہلیہ نے ہماری امی اور دادی کی طرح ہماری ذمہ داری اپنے سر لے لی، مولانا کی دختران ہماری دل جوئی میں لگی رہتیں کہ یہ طالبات گھبرا کر واپس نہ چلی جائیں۔ انھوں نے ہمیشہ ہمیں یہ یاد دلائے رکھا کہ تمہیں پڑھ لکھ کر ایک دن اپنے ابو کا نام روشن کرنا ہے......اپنے سماج سے برائیوں کا خاتمہ کرنا ہے......اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے

...... ہم دل لگا کر اردو سیکھنے کی کوشش کرتے ...... اور جب دل اداس ہوتا ...... گھر کی یاد آتی تو چاچی کے پاس آجاتے، مولانا کے آنگن میں کھیلا کرتے تو دل بہل جاتا۔ چاچی نے ہماری ہر طرح سے تربیت فرمائی۔ ہم نے پڑھائی کے علاوہ گھریلو کام کاج کی بہت ساری چیزیں انھی سے سیکھی ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب گجرات فسادات کو دو تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور حیدرآباد کا ماحول بھی پرسکون نہیں تھا۔ اور شہر میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وقت ہم تو ابتدائی درجہ میں تھے لیکن ہماری تربیت اس ماحول میں اس طرح ہونے لگی جیسے ہم کسی تحریک کے رکن ہوں ہمیں چھوٹی چھوٹی کتابیں مطالعہ کے لیے دی جاتیں ...... ہم ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہی ہجے کر کے اس کی ریڈنگ کرتیں۔ مولانا نے بھی کئی کتابیں ہمیں اس نصیحت کے ساتھ دی تھیں کہ ''انھیں اس طرح پڑھو کہ یاد ہو جائیں ......'' مولانا چھوٹے بچوں کو کبھی چھوٹا نہ سمجھتے۔ جب خطاب فرماتے بہترین اردو میں خطاب فرماتے۔ مولانا رک رک کر اتنے دل نشین انداز میں الفاظ کی ادائیگی کرتے کہ مولانا کے الفاظ ذہن نشین ہو جاتے اور تحریر و تقریر کے موقع پر خود بخود وہ الفاظ ہماری زبان و قلم پر رواں ہو جاتے۔ مولانا محترم کبھی ہم کو چھوٹے بچے سمجھ کر حقائق سے دور نہیں رکھتے تھے بلکہ طالبات کے سامنے ہندوستان اور عالم اسلام کے سارے حالات گاہے بہ گاہے کھول کھول کر بیان فرماتے۔ اپنی رائے اور اپنا تجزیہ بھی ساتھ میں ضرور پیش کرتے۔ آنے والے حالات سے باخبر فرماتے ...... مولانا کی دوررس نگاہیں مستقبل کے جو مناظر دیکھتیں مولانا وہ سارا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ دیتے ...... پھر ساتھ ہی ہمیں ہمت و حوصلہ کی تلقین کرتے کہ چاہے کیسے ہی حالات کیوں نہ آجائیں ...... ڈرنا نہیں ...... خوفزدہ نہیں ہونا ...... صبر و استقامت کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی مت چھوڑنا ...... ہمیشہ دعا کرنا کہ اللہ جب تک ہمیں زندہ رکھنا ایمان پر زندہ رکھنا اور جب ہمیں موت دینا تو ایمان پر موت دینا۔

مولانا کے یہ الفاظ جب بھی ہم سنتے تو ہمیں حوصلہ ہوتا ...... ڈر اور خوف کے اثرات زائل ہونے لگتے ...... کیسے حالات؟ کیسی مصیبتیں ......؟ اس وقت اس کا صحیح ادراک تو نہیں ہوتا ...... لیکن ہم اپنے آپ میں متحرک ہو جاتیں ...... بالکل یہ اسی طرح کی تربیت تھی جس طرح جنگِ آزادی کے موقع پر گھر گھر ہر بچہ کی تربیت ہوا کرتی تھی۔ بہت ساری پیش گوئیاں جو مولانا کرتے رہتے تھے وہ ہو بہو وقفہ وقفہ سے ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔

پھر چار ماہ بعد جب ہم رمضان کی چھٹیوں میں وطن گئے تو وہاں ہمیں مجاہد بھائی کی شہادت کی خبر ملی۔ اور یہ بھی کہ حالات بہت خراب ہیں ...... لیکن ہمارے ابو ہمیں بلا تاخیر ہاسٹل لے آئے۔ جب ہم واپس آئے تو ماحول بہت سوگوار تھا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ہر ایک کا حوصلہ برقرار ہے۔ مولانا تو صبر اور ہمت کا ایک پہاڑ لگ

رہے تھے۔ بہر حال سرد اور گرم ہر موسم میں ہمارا تعلیمی سفر اسی طرح چلتا رہا......ہم مولاناؒ کی تربیت میں تعلیمی مدارج طے کرتے جا رہے تھے...... ہمارے ابو کے کئی ساتھیوں نے اپنی بیٹیوں کو مولانا کے مدرسہ میں بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا......ابو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا......اس طرح ہمارے علاقے سے ہر سال چند لڑکیوں کا داخلہ مدرسہ میں ہونے لگا...... جب ہم عالمہ دوم میں زیرِ تعلیم تھیں اس وقت ہمارے علاقے کی تقریباً دس لڑکیاں مدرسہ میں داخلہ لے چکی تھیں۔

لیکن اس وقت میرے گھر میں یہ بات اٹھائی گئی کہ حیدرآباد ہمارے شہر سے بہت دور ہے اور سفر بہت طویل ہے......راجستھان اور حیدرآباد کا درمیانی فاصلہ 1900 کیلومیٹر ہے۔ چونکہ اب بچیوں کی ابتدائی تعلیم اور تربیت ہو چکی ہے جو مقصد حیدرآباد جانے کا تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔لہٰذا کسی قریبی شہر کے مدرسہ میں بچیوں کو داخلہ دلانا چاہیے......تاکہ لانے لے جانے میں آسانی ہو۔ابو بھی اس چیز کے لیے راضی نہیں تھے لیکن مجبوراً خاموش تھے اور ہم بھی اس پر راضی نہیں تھے مگر ہماری ناراضگی کے باوجود ابو نے ہمیں دہلی کے قریب ایک علاقے میں واقع لڑکیوں کے ایک بہت بڑے مدرسہ میں داخل کروا دیا...... یہ مدرسہ صرف 700 کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔ جو حیدرآباد کے مدرسہ کے مقابلہ میں بہت شاندار تھا......تعمیراتی لحاظ سے بھی، سہولیات کے لحاظ سے بھی۔ یہ مدرسہ ہمارے مدرسے سے بہتر ضرور تھا، لیکن یہاں ہمیں دو دن گزارنا دشوار لگ رہا تھا...... کیونکہ خلوص واپنائیت کی وہ خوشبو یہاں ناپید تھی، جو ہم نے مولانا کے مدرسے میں پہلے دن سے پائی تھی......اس کے بعد ہم نے ابو کو اس بات سے آگاہ کیا کہ جس تحریک، جس شعور، جس دینی فکر کی ہمیں ضرورت ہے وہ مولاناؒ کی سرپرستی میں ہی حاصل ہو سکتی ہے......ہم سفر کی ان صعوبتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں......لیکن اپنی تعلیم کے سلسلہ میں Compromise کرنے کیلئے تیار نہیں......پھر دادی نے بھی ابو سے کہا کہ میں یہاں کے ماحول سے مطمئن نہیں ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ بچیوں نے حیدرآباد سے حاصل کیا ہے، وہ اسے یہاں گنوا بیٹھیں گی۔ دادی کی بات سن کر ابو ہمیں واپس حیدرآباد لے آئے اور ہم نے اپنی تعلیم یہیں سے مکمل کی۔ ہم نے یہاں اپنی زندگی کے بہترین سات سال مولانا، چاچی اور باجیوں کی شفقتوں و محبتوں کے سایے میں گزارے اور اللہ گواہ ہے کہ کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جو تعلیم و تربیت سے خالی ہو۔ رب کی رضا ہی زندگی کا اولین مقصد ہونا چاہیے۔ اس نصب العین کا ہمیں خوگر بنایا گیا۔ مولانا نے ہمیں سکون واطمینان سے آرام و آسائش سے جینا نہیں سکھایا بلکہ ایک ایسی زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا کہ جس میں دین وایمان کے لیے بے چینی و بے قراری ہو...اسلام کی فکر میں اپنا آپ بھلا دینے کا جذبہ ہو۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مولانا نے اپنے درس وتدریس کے ذریعہ ہمارا تعلق ہمارے رب سے جوڑ دیا۔ معرفت الی اللہ کے درجوں تک رسائی کے گر سکھا دیئے۔ ایسی زندگی کا درس دیا کہ جس میں زندگی کی چاہ نہ ہو بلکہ موت کی تمنا ہو...... پیارے رسولؐ کا سچا عاشق کیسا ہونا چاہیے عملاً نمونہ پیش کر کے دکھا دیا۔ مولانا نے صرف ذہن سازی ہی نہیں کی بلکہ ہمیں عمل کا میدان بھی فراہم کیا۔ ہاسٹل کی شکل میں ہمارے لیے وہ پلیٹ فارم مہیا کیا کہ جہاں ہم اپنی سیکھی ہوئی چیزوں پر عمل کرنے کے لیے آزاد تھے۔ اٹھنے بیٹھنے کے آداب، کھانے پینے کے اسلامی آداب، میل جول، دوستی اور دشمنی کے آداب، درس وتدریس کے آداب، ہر ایک کی مشق کرتے تھے۔ جہاں کوئی غلطی ہوئی فوراً اصلاح کر دی جاتی تھی Watch and Ward کا ایسا انتظام تھا کہ ہر طالبہ پر گہری نظر ہوتی۔ کسی کی بال برابر برائی بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول کی مقامی طالبات کے مقابلہ ہاسٹل کی طالبات پڑھائی میں بھی اچھی ہوتیں اور عمل میں بھی پختہ ہوتیں۔

مولانا کی طرف سے ہفتہ واری سطح پر اخلاقیات پر مہمیں چلائی جاتیں۔ مثلاً جھوٹ کے خلاف مہم، غیبت اور چغلی کے خلاف مہم، ان مہموں کے ذریعہ ہمارے اندر سے چھوٹی چھوٹی برائیاں بھی ختم کر دی جاتی تھیں... ان کے ذریعہ ہمیں اپنی برائیوں کو خود دور کرنے اور شعوری طور پر اپنے اعمال کی نگرانی کرنے کی تربیت ہوتی۔

مولانا کی تربیت کا انداز ناصحانہ، مدبرانہ اور محبت وخلوص سے لبریز ہوتا۔ جب بھی نصیحت کرتے مختصر کرتے۔ لمبی چوڑی بات کرنا آپ کی عادت نہیں تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہر بات دل ودماغ میں بیٹھ جاتی تھی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت سازی کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ مولانا نے ہم طالبات کو اپنی نظریاتی تحریک کا حصہ بنالیا۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے قابل بنا دیا۔ داعیانہ مشن کی تکمیل کیلئے تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ ظلم کے خلاف ڈٹنے اور حق کا کلمہ بلند کرنے کا داعیہ ہمارے اندر پیدا کیا۔ خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام تک مسلسل جدوجہد کا جنون ہم میں پیدا کیا۔ عصر حاضر کے طواغیت کی پہچان کروائی۔ توحید پر قائم رہنے کا جذبہ پروان چڑھایا اور سب سے بڑھ کر رضائے الٰہی کے حصول کا خوگر بنایا اس طرح مولانا نے اپنی طالبات میں وہ روح پھونک دی کہ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی رہیں گی اسلامی شعور کے ساتھ اسلام کے غلبہ کیلئے، اسلامی تشخص کی بقا کیلئے سرگرم عمل ہوں گی۔

مولانا کے زیرِ سرپرستی مطالعۂ قرآن ہوا کرتے تھے اس میں ہم ضرور شریک ہوتے تھے ہم مولانا کے تفسیری نکات لکھ لیا کرتے تھے۔ مولانا کے یہ نکات آج بھی ہمارے ذہنوں، دلوں اور ڈائریوں کی زینت بنے

ہوئے ہیں جس سے ہم رہنمائی لیتے رہتے ہیں۔ راجستھان آنے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ طالبات اور خواتین کو جوڑنے اور ان کی تعلیم و تربیت کیلئے ہفتہ واری مطالعۂ قرآن کے پروگرام کا آغاز کیا الحمدللہ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ان تمام اوصاف کے باوصف مولانا کی طالبات مولانا کے اعلیٰ کردار کی جس خوبی سے سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں وہ ہے مولانا کا ''صبر و تحمل''۔ اپنی ذات پر ہونے والی زیادتیوں، اعتراضات اور حق تلفیوں کو صبر و سکون سے برداشت کرنا اور احسن طریقہ سے ان کا جواب دینا، لیکن جب بات اصولوں کی ہوتی...... اسلام کی ہوتی...... اسلامی شعائر اور شریعت کی ہوتی...... تو پھر مولانا بپھر جاتے...... چہرے کا رنگ بدل جاتا...... اپنی پوری طاقت کے ساتھ بھر پور مدافعت کرتے...... اور ہر ظلم و زیادتی کے خلاف ڈٹ جاتے...... کسی قسم کا کمپرومائز نہ کرتے۔ یہ مولانا کی وہ خوبی ہے جس کو اپنانے کا عہد ہر طالبہ ضرور کرتی ہے۔

پھر ہم مولانا کے چراغ کی کچھ روشنی لیے اپنے وطن لوٹ گئے۔ اور تب سے اپنے معاشرہ کو اس روشنی سے روشن کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ ہم بھر پور محنت کر رہے ہیں کہ اپنے بے دین ماحول کو دینی ماحول میں تبدیل کریں۔ الحمدللہ راجستھان کی بے پردہ تہذیب میں ہمارے خاندان اور جان پہچان کی خواتین باپردہ ہو چکی ہیں۔ اور اسکولس اور کالجس کی لڑکیاں بھی پردہ کی نعمت سے سرفراز ہو رہی ہیں۔ ہم نے پہلا ہدف یہی بنایا تھا کہ قرآن سکھائیں اور خواتین و طالبات کو ساتر لباس اور پردہ کا پابند بنائیں۔ الحمدللہ ہم اپنے اس ہدف کو پانے میں کسی حد تک ضرور ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی کوشش کی ایک کڑی وہ اسلامک اسکول بھی ہے جسے ہم نے اپنے شہر میں قائم کیا ہے۔ جہاں ہم نے نصاب ایسا ترتیب دیا ہے کہ دسویں میں آنے تک بچوں کو قرآن کے ساتھ ساتھ بنیادی عربی زبان اور اہم دینی معلومات ازبر ہو جائیں۔ یہ اسکول اس علاقہ کیلئے ایک تحفہ ہے۔ یہ میرے مولانا کی دعاؤں اور محنتوں کا ہی ثمرہ ہے کہ جس علاقہ میں دین کے نام پر کوئی مدرسہ اور اسکول نہ تھا۔ آج وہاں دینی تعلیم کا ایک اسکول قائم ہے۔ یہ میرے ابو کے خوابوں کی تعبیر بھی ہے...... ان کے بہترین فیصلہ...... اقدام...... اور صبر و استقامت کی جزاء بھی ہے۔ اللہ اس اسکول کو مولانا اور میرے خاندان کے لیے ثوابِ جاریہ بنادے آمین!

مولانا اپنی تمام فکروں سمیت ہمارے اسکول کے متعلق بھی فکر مند رہتے تھے اور اکثر پوچھا کرتے کہ ''اسکول کیسا چل رہا ہے۔'' اور نصیحت کرتے کہ ''خوب محنت کرو۔ اور جو بھی کرو اخلاص سے کرو۔ اخلاص سے کیے جانے والے چھوٹے کاموں کا اثر بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور ثواب بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور اللہ اس کام میں خوب برکت بھی ڈال دیتا ہے۔''

نہ صرف ہم مولانا کے احسان مند ہیں بلکہ ہمارے علاقے کی نسلیں بھی مولانا کی احسان مند رہیں گی۔

انشاءاللہ

ایک بات اور بھی بتانا چاہوں گی کہ جب ہم طالبات اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن لوٹیں تو ہمارے سماج کے دور اندیش لوگوں نے یہ پیش گوئی کی کہ ''ان پردہ کرنے والی لڑکیوں سے، اپنی ذات برادری کی روایات سے انحراف کرنے والی لڑکیوں سے اور اسطرح دینی تعلیم حاصل کرنے والی پڑھی لکھی لڑکیوں سے کون رشتہ کرے گا......؟ ان کے رشتے نہیں آئیں گے۔''

لیکن وقت نے یہ بات غلط ثابت کردی۔ ساری دور اندیشی اور پیش گوئیاں رد ہوگئیں...... کیونکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسی لڑکیاں جو حیدرآباد میں مولانا کے مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں قدم رکھ کر واپس آ گئی ہوں، ان کے بھی بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آرہے ہیں۔ یہ ساکھ اور یہ امیج اللہ کے فضل و احسان سے ہے۔

چھٹیوں میں جب ہم اپنے وطن واپس آ جاتے تو مولانا ہمارے لیے فکرمند رہتے کہ آیا راجستھان کا یہ قافلہ اپنے تعلیمی سفر کے لیے واپس آئے گا بھی یا نہیں۔ ہمارے آنے تک مولانا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہتے تھے۔

آہ! ہمارے لیے فکرمند رہنے والے...... ہمارا انتظار کرنے والے ہمارے محسن چل بسے...... ہمیں تا زندگی اس بات کا غم اور ملال رہے گا کہ ہم مولانا کے آخری دیدار سے محروم رہ گئے۔ آخری ملاقات سے محروم رہ گئے...... میری زندگی کا یہ سب سے بڑا غم ہے۔ مولانا سے ہماری عقیدت و محبت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا...... نہ اس کا اندازہ لگا سکتا ہے...... مولانا کو یاد کر کے اکثر آنکھیں بھیگ جاتی ہیں...... آنسو چھپانے پڑتے ہیں۔ حیدرآباد آ کر مولانا کے افرادِ خاندان سے مل کر بھی دل ہلکا نہیں ہوا ہے۔

بس اب یہی دعا ہے کہ اللہ! مولانا کے اس چراغ کی لو کو کبھی مدہم نہ کرنا، اسے سدا سلامت رکھنا، جس کی روشنی کفر و شرک کی تاریکیوں ...... جہالت و گمراہی کے اندھیروں کو ہر سطح پر شکست دے رہی ہے۔ انشاءاللہ ہم بھی اس روشنی کو اپنے اندر کبھی بھی ماند نہ پڑنے دیں گے اور جو فکر مولانا نے ہمارے اندر پروان چڑھائی ہے اسے کبھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ مولانا کے مشن کو جاری رکھے...... آپ کی بامقصد تحریک ساری دنیا میں پھیلا دے...... آپ کی فکر عام کردے اور آپ کی تمام حسنات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔

جہاں میں تیغِ علم کو، عمل کی آب جس نے دی

صفورہ کوثر بنت راج محمد صاحب، عادل آباد

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے مسلمان بنایا اور مجھے صحیح غلط کی پہچان کروانے، علم سے بہرہ ور کرنے کے لیے اور میری ہدایت کے لیے اس مدرسے کو ذریعہ بنایا جس کے ناظم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ تھے۔ یقیناً مولانا کی شخصیت زندہ وجاوید ہے، جو ہمارے دلوں میں اور دینی وعلمی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

اس وقت جب میں نے اپنے احساسات لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے تو دل اور دماغ دونوں الفاظ سے خالی ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک دل نے یہ یقین نہیں کیا اور نہ دماغ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ مولانا نے اس دارِ فانی کو الوداع کہہ دیا ہے۔ اس وقت میرے لئے الفاظ کا انتخاب کرنا بڑا ہی مشکل ہو رہا ہے اور سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں اپنے مرشد ومربی ناظم جامعہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت کو کس طرح بیان کروں جنہوں نے مجھے اور مجھ جیسی ہزاروں علم سے نابلد لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے باکمال بنا دیا۔ ہمیں شعور کی پختگی عطا کی، ہمارے اندر حق و باطل، جھوٹ اور سچ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کی، ہمیں قرآن وحدیث کے سانچے میں ڈھال کر ''المرأۃ الصالحۃ'' بنا دیا۔

انھوں نے کتنے تراشے ہیں علم کے موتی
وہ جوہری ہیں، ہنر بے مثال رکھتے ہیں

وہ بخش دیتے ہیں ہر بے کمال کو دولت
عطائے علم کا ایسا کمال رکھتے ہیں

مولانا کی شخصیت اور ان کی سیرت کا خاکہ پیش کرنا میرے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ انھوں نے نہ صرف مجھے اور طالباتِ جامعہ کو دین اسلام کی طرف دعوت دی بلکہ ساری امت کو اپنی تحریری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قلم کی قوت سے "اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً" کی دعوت دی۔ جب بھی باطل نے دینِ اسلام پر حملہ کیا مولانا نے اپنے قلم کی تلوار سے اس کا جواب دیا۔ آپ کے قلم کی کاٹ، تلوار سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہر دور میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں لیکن اس قلمی سرمایہ میں سے بہت ہی کم حصہ ایسا ہے جو انسان کے قلب و دماغ پر انقلاب آفریں اثر ڈالتا ہو، جس سے اخلاق و کردار کی کایا پلٹ جاتی ہو۔ ایسے خوش قسمت قلم نگاروں میں سے ایک ہمارے استاذ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے قلم سے دلوں کی دنیا بدل دی، جن کی تحریریں براہِ راست دل میں اتر جاتی ہیں۔ آج ان کا اس دارِفانی کو الوداع کہنا ساری امت کا دکھ بن گیا ہے۔

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

فکری گمراہیوں کے اس زمانے میں جبکہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت پر چہار جانب سے حملے ہو رہے ہیں۔ مفکرِ اسلام مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے تمام بندگانِ خدا، خاص کر لڑکیوں تک اسلام کا سیدھا سچا پیغام پہنچانے اور ان کے دلوں میں عقیدۂ توحید کو راسخ کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور اس کو اپنا نصب العین بنا کر جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کی صورت میں جاری رکھا۔ جس کی بنیاد صحیح عقیدہ پر قائم ہے، یہاں مجھے موحدّہ، داعیہ اور مصلحہ بننے کی ٹریننگ ملتی رہی۔ یہاں میرے ایمان وعقیدہ کی جڑوں کو مولانا کے چشمہ علم وعرفان سے مضبوطی ملتی رہی۔ حقیقت میں مولانا کے اخلاص وللّٰہیت اور جہد وعمل نے ہمارے جامعہ کو ان اشعار کا مصداق بنا دیا تھا۔

یہ گلشن دین و دانش ہے یہ علم کی روشن وادی ہے
یہ بادہ کدہ ہے خدیجہ کا اور عرفانی آبادی ہے

ہم طالبات روز آنہ اس ترانۂ جامعہ کو پڑھتیں اور اس چیز کا احساس اپنے اندر پیدا کرتیں کہ

تعلیم و تعلّم سے ہوگا الحاد کا پردہ چاک یہاں
یوں جوش عمل ہے ہوش ربا کہ باطل ہوگا خاک یہاں

اور روز آنہ مولانا کے مقصد اور نصب العین کے حصول کا عہد کرتیں۔

ہم دین محمد کو رسوا ہرگز نہ کبھی ہونے دیں گے
اسلام کے پرچم کو نیچا پل بھر نہ کبھی ہونے دینگے

میں نے جامعہ میں بہت سال گزارے لیکن مولانا سے باقاعدہ پڑھنے کا موقع آخری سالوں میں ملا، عالمہ سوم میں پہلی بار باضابطہ طور پر تفسیر اور ادب کی کلاس شروع ہوئی تو میں اور میری ہم جماعت بہنیں بہت خوش تھیں کہ اب ہمیں راست طور پر مولانا سے تفسیر اور ادب (کلیلہ ودمنہ) پڑھنے کا موقع ملے گا۔ جب بھی ہم مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تو پہلے ہی سے مطالعہ کر کے اور تیاری کے ساتھ جاتے کیونکہ مولانا ہمیشہ آیت کی تفسیر پوچھتے اور صرف ونحو کے سوالات کرتے تھے۔ فاضلہ دوم میں ہم نے مولانا سے حجت پڑھی ہے۔ پہلا سبق (ابداع، خلق، تدبیر) مولانا نے اتنے عام فہم انداز میں سمجھایا کہ اس کے بعد ہم سب میں شریعت کے اسرار و رموز جاننے کا شوق بڑھتا چلا گیا اور ہمارے دل ودماغ کی دنیا وسیع ہونے لگی۔ سبق کے اختتام پر مولانا ہمیشہ ہم سے کہتے کہ کچھ شبہ اور سوال ہو تو پوچھو...... مولانا سبق اتنے اچھے انداز سے سمجھاتے تھے کہ کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور جب کبھی ہم سوال کرتے تو مولانا بہت خوش ہوتے اور اس کا تسلی بخش جواب دیتے، مولانا کا جواب ہمیشہ مختصر اور جامع ہوتا تھا......

مشکل سے مشکل مضامین بھی مولانا کے لہجہ کی شگفتگی، اسلوب کی ندرت، منفرد طرزِ تدریس اور دلچسپ اندازِ بیان سے طالبات کو آسان لگتے اور ان کے اندر علم کا شوق اور سیکھنے کی جستجو ولگن پیدا ہو جاتی تھی۔ مولانا ہمیشہ سنتِ رسولؐ کے مطابق صرف مسکرایا کرتے کبھی مولانا کو قہقہہ لگاتے شاید ہی کسی شاگردہ نے دیکھا ہو۔ مولانا کبھی ناراض اور غصہ نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کسی کو ڈانٹتے اور سزا دیتے تھے۔

مولانا ایک متاثر کن شخصیت کے حامل تھے۔ قدرت نے مولانا کو علم وفضل، فکر ونظر، استقامت وعزیمت، اخلاق وکردار، اخلاص وللّٰہیت، غرض ظاہر وباطن کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مولانا کی سب سے ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ مولانا کی ایک اور نمایاں صفت یہ تھی کہ آپ بہت ہی مشفق اور نرم دل انسان تھے۔ ہم جب بھی مولانا کے پاس تفسیر پڑھنے کے لئے جاتے تو سبق شروع کرنے سے پہلے ہر کسی کا نام لے کر خیریت دریافت کرتے اور خاص کر ہاسٹل کی لڑکیوں سے کھانے اور طبیعت کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ مولانا ہمیں حالاتِ حاضرہ سے باخبر کرتے اور اخبارات کے مختلف تراشے پڑھ

پڑھ کر سناتے۔ اس طرح مولانا نے ہمیں مختلف علوم وفنون سے آراستہ کر کے با کمال بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آج مولانا کی انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ جامعہ کی ہر طالبہ اس قابل بن پائی ہے کہ وہ دنیا کے مختلف گوشوں میں دعوتِ حق کا فریضہ انجام دے سکے۔ مولانا نے جامعہ کی صورت میں ایسا بیج بویا ہے جس کے درخت کے ذائقہ دار پھل سے ملتِ اسلامیہ مستفید ہو رہی ہے اور انشاء اللہ مولانا کا لگایا ہوا یہ درخت پھلتا پھولتا اور سرسبز و شاداب لہلہاتا ہوا برگ و بار لاتا رہے گا اور ملتِ اسلامیہ کو فیض پہنچاتا رہے گا۔

دلیلِ راہ بن کے جو ستارۂ سحر رہا
بجھا تو روشنی کی کائنات دل میں بھر گیا

جہاں میں تیغِ علم کو، عمل کی آب جس نے دی
سروشِ غیب اس کی بات بات دل میں بھر گیا

اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، مولانا سے راضی ہو جائے، ان کے درجات کو بلند کرے اور مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز فرمائے۔ آمین!

مِنۡ بَیۡتِ الشَّہِیۡد

مریم بنت اعظم شہید، حیدر آباد

قلم لرزیدہ ہے، ہم اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں پاتے کہ دورِ حاضر کی مشہور شخصیت اور اپنے محسن و مربی شیخ الجہاد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کی سیرت اور احسانات پر روشنی ڈالیں لیکن میں یہاں مولانا کی ایک ایسی صفت کے متعلق ضرور بیان کرنا چاہوں گی جس سے اکثر لوگ ناواقف ہوں گے۔ الحمدللہ! جمیع اوصاف کے ساتھ ساتھ مولانا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ نے کبھی بھی شہداء یا اسیروں کے گھروں سے غفلت کا معاملہ اختیار نہیں کیا بلکہ ان کی وقفہ وقفہ سے خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ یہ پیارے نبی ﷺ کا اسوہ اور صحابہ کرامؓ کی سنت ہے کہ وہ شہداء و مجاہدین کے گھروں کے کفیل بن جاتے تھے۔ مولانا نے اس سنت کو جاری رکھا۔

شہداء کے گھرانوں کی بات کی جائے تو ہم اللہ کے الف الآف شکر گزار ہیں کہ اللہ نے ہمارے ابو کی شہادت کے بعد ہمیں مولانا کی سرپرستی نصیب فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے والد کو شہادت کے مرتبہ سے نوازا اور ان کا نعم البدل مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی شکل میں عطا کیا۔ ابو کی شہادت کے وقت میں بمشکل چار سال کی تھی یہ اور بات ہے کہ ابو کو میرے دنیا میں آنے کی خبر ہی نہ تھی۔ میں نے ایک مرتبہ بھی ان کی آغوش میں نہ آنکھیں کھولیں نہ ان کی گود ہی مجھے نصیب ہوئی۔ لیکن میں اس پر راضی برضا ہوں تو شاید اس لیے کہ مولانا کے قائم کردہ مدرسے ہی میں مولانا کی سرپرستی و نگرانی میں ہماری تعلیم و تربیت ہوئی جن کی تعلیم و تربیت پر ہم نازاں ہیں کہ انھوں نے ہمیں ہمارے مقام و مرتبہ سے واقف کرایا۔

جب بھی شہداء اوران کے لواحقین کا تذکرہ آتا میں نے مولاناؒ کو ہمیشہ پرنم پایا۔ مولانا محترم نے ایک مرتبہ اس واقعہ کا ذکر کیا کہ اچانک صحن کعبہ میں مولانا سے میرے ابو کی ملاقات ہوگئی۔ میرے والد مولانا سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اس وقت مولانا نے میرے ابو کے مالی مسائل حل کرنے کیلئے کہیں برسر روزگار کرنے کی کوشش کی تو میرے ابو نے جواباً کہا کہ مولانا! میں یہاں دنیا کمانے نہیں آیا ہوں، میرے لئے ہندوستان ہی میں بہت سے کام ہیں جو پورے کرنے ہیں۔ اس ملاقات اور اس جواب کی خوشی میں نے مولانا کے چہرے پر واضح انداز میں محسوس کی۔

میرے ابو نے شہادت سے چند دن قبل مولانا سے رابطہ کر کے اپنی بیٹیوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں فکر مندی کا اظہار کیا......

چنانچہ یہ ان کی فکرِ خیر کا نتیجہ ہی ہے جس کی بناء پر ہم مولانا اور ان کے اہل وعیال سے متعارف ہوئے۔ اے اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ مولانا نے اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کیا، ہمیں دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، ہماری سوچ وفکر کو صحیح اسلامی رخ پر گامزن کیا، ہماری نظر کو وسعت بخشی اور ہر طرح سے ہماری خبر گیـــری کی۔

اے اللہ! ہمارے محسن ومربی کو ہمنشین مصطفیٰؐ کر، صحبت صحابہؓ ورفاقت شہداء عطا کر، ان کے مرقد کو اپنے پاک انوار سے بھر دے، ان کی آرام گاہ کو تاحدِ نگاہ کشادگی عطا کردے اور ان پر باغِ بہشت کے دروازے وا کردے۔

فاستجب یا محب المحسنین ویا مضیف الشهداء

◆

ہمارے مولانا، ہمارے استاد: مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

سمیہ شاہین بنت علاء الدین شیخ، پاچورہ
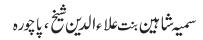
آہ! جب دل کے ہیروشیما پر الفاظ کے ایٹم بم گرے......مولانا کا انتقال ہوگیا......کچھ دیر تک تو ذہن و دماغ پر بے یقینی کی کیفیت طاری رہی۔ پھر اللہ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی جانب سے تحریکاتِ اسلامی کے مشاہیر و چنندہ شخصیات یکے بعد دیگرے اس متاعِ غرور سے دنیائے باقی وحیات ابدی میں بلائی جارہی ہیں۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ سادگی و شرافت، متانت و سنجیدگی اور تواضع وانکساری کا مرقع تھے۔ متقی و پرہیزگار، عابد و زاہد اور کارگاہِ خیر و شر کے مجاہد تھے۔ قلندرانہ مزاج، درویشانہ صفات، خانہ بدوشوں سی زندگی گزارنے والے، عزم و حوصلے کا بحرِ بیکراں، اقامتِ دین کی راہ کے بے سروسامان مسافر، فکرِ مودودیؒ کے علمبردار اور جامعۃ البنات کے حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم، لیکن رزمِ حق و باطل میں فولاد تھے۔

مہاراشٹرا کی ایک معروف شخصیت محترم غلام رسول دیشمکھ صاحب کے بارہا اصرار اور تقاضے پر ہمارے والد صاحب ہمیں جامعۃ البنات میں پڑھانے کو راضی ہوئے اور انہی کو ساتھ لے کر پہلی بار جامعۃ البنات پہنچے اور داخلہ کروایا۔ تب مولانا سے پہلی ملاقات و پہلی واقفیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد تو ہم ان کے گھر کے فرد بن گئے۔ مولانا نہ صرف ہمارے مدرسہ کے مہتمم و ناظم تھے بلکہ ہمارے سرپرست تھے اور ہمارے لیے ایک مشفق باپ کی طرح تھے۔ ہماری تعلیم و تربیت، طعام و قیام، نشست و برخاست کا بالواسطہ بے حد خیال رکھتے۔ مولانا ہی نہیں بلکہ مولانا کا گھرانہ چاچی، شہید/مجاہد بھائی، ظِل ہما باجی، مثل الربی باجی، یہ تمام بھی۔

مولانا کے پاس جب ہم مسائل لے کر پہنچتے اور شکایات کا پٹارا کھولتے تو مولانا ہمیں تکلیف کو برداشت کرنے کی تلقین کرتے، صبر کی نصیحت کرتے، علم کی راہ میں آنے والے مصائب ومشکلات یاددلاتے، صحابیاتؓ کی قربانیوں کے واقعات اس طرح سناتے کہ ہم طالبات اپنی اپنی شکایتیں بھول کر پرعزم ہوکر قیام گاہ کولوٹ آتیں، تعلیم کی جستجو میں لگ جاتیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ مدرسہ میں کئی طالبات ایسی تھیں جن کی کفالت مولانا نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ لیکن ان کی عزتِ نفس کا اتنا خیال رکھا کرتے تھے کہ نہ ان طالبات کو احساس ہوتا اور نہ ہی ہمیں علم ہوتا کہ وہ طالبات کون ہیں جن کی تعلیمی فیس معاف ہے یا طعام وقیام فری ہے۔ یہ بھی مولانا کی شخصیت کا ایسا پہلو تھا جو صیغۂ راز میں تھا۔ ہم طالبات مولانا کی بیٹیوں کی عمر سے بھی چھوٹی تھیں لیکن ہم سے بات کرتے وقت مولانا کی نگاہیں نیچی رہتیں۔ آنکھیں زمین پر گڑی ہوتیں پر پوری توجہ ہماری باتوں اور ہمارے مسائل پر ہوتی۔ ایک بار بھی کبھی ایسا دیکھنے میں نہ آیا کہ انہوں نے ہماری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بات کی ہو یا ہماری طرف نظر اٹھائی ہو۔ جب ہم مولانا کے گھر میں جاتے تو آپؒ کو تحریکی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے اور جب جامعہ کے دفتر میں دیکھتے تو تدبرِ قرآن کی ورق گردانی کرتے پاتے۔ ان کے ٹیبل پر تدبر قرآن، ماہنامہ زندگی نو، تحقیقات اسلامی و دیگر رسائل رکھے ہوتے۔ اپنے دیگر کاموں کے ہمراہ مطالعہ بھی جاری رکھتے۔ ہمیں تفاسیر قرآن و دینی کتب کے مطالعہ کی تلقین کرتے۔ مولانا اور ان کے گھرانے نے اپنی دنیا بنانے سے بے نیاز ہوکر، مال ومتاع سے بے فکر ہوکر جامعۃ البنات کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ہمیشہ ملت کی بچیوں کی تعلیم و تربیت کی فکر و کاوش ان کا مقصد ومحور رہی۔ جامعہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اپنے دنیاوی مستقبل سے قطعِ نظر جامعۃ البنات کے مستقبل کی بہتری کی جدوجہد میں لگے رہتے۔ فارغ ہونے والی طالبات کو دین کا کام کرنے کی تلقین کرتے، اقامتِ دین کو اپنا مشن بنانے کا زادِراہ دیتے۔ یہ مولانا کی تربیت ہے کہ جامعۃ البنات کی طالبات ملک میں یا بیرونِ ممالک جہاں بھی ہیں دینی و تحریکی کاموں میں سرگرم ہیں۔ یہ مولانا کی تحریک ہی تھی کہ ہم اپنی ازدواجی زندگی اور امورِ خانہ داری کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ دینی و تحریکی سرگرمیوں میں خود کو لگائے ہوئے ہیں۔ عرصہ پہلے مدرسہ سے فراغت کے باوجود ہمارا لگاؤ اب بھی قائم ہے۔

مولانا کی فکر اور نظریہ کے عملی پیکر آپ کے فرزند مجاہد بھائی تھے۔ ہمیشہ خیر وفلاح کے کاموں میں پیش پیش، ملی کاموں اور نوجوانوں کے درمیان احیائے اسلام کے جذبہ کو پروان چڑھانے کے لیے ہمہ تن مصروف۔ ہم نے جب بھی انھیں دیکھا ہمیشہ متحرک دیکھا، انھیں باطل کی آنکھوں میں خار کی طرح چبھتے دیکھا۔ اپنے مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے بالآخر ظالموں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ہم نے دیکھا کہ مجاہد بھائی نے خوشی خوشی جامِ شہادت نوش کیا۔

یہ مولانا کا فیضانِ نظر تھا جس نے مجاہد بھائی کو آدابِ مجاہدانہ سکھائے تھے۔ مولانا کو اپنے جواں سال بیٹے

کی جدائی کا گہرا صدمہ پہنچا لیکن آپ کے عزم وحوصلہ کی چٹان میں کوئی دراڑ نہ آئی۔ نہ کوئی کمی پیدا ہوئی۔ یہ تو وہ صدمہ تھا جو غیروں کے ہاتھوں مولانا کو پہنچا ایک دوسرا صدمہ بھی تھا جو اپنوں کے ہاتھوں مولانا کو پہنچایا گیا۔ جس باغ بنات کی آبیاری مولانا نے اپنے خون جگر سے کی تھی۔ جس کے لیے مولانا نے اپنے 24 قیمتی سال صرف کیے تھے۔ چند مفاد پرست اس کو اجاڑنے کے درپہ ہو گئے۔ باغ کا یہ مالی اپنے باغ کو اجڑنے اور ویران ہونے سے بچانے کے لیے اس باغ سے خالی ہاتھ اس طرح نکل گیا جیسے کوئی مہاجر نکلتا ہو۔ اس طرح مولانا کی چوبیس سالہ محنتوں کا خون کر دیا گیا۔ اس موقع پر مولانا نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا، جو ایثار وقربانی کی مثال پیش کی شاید ہی اس دور میں کوئی دوسرا پیش کر سکے۔ ہمیں اس واقعہ سے بے حد رنج وملال ہوا۔ ہمارا یہ غم دوہرا اس طرح سے ہے کہ یہ زخم مولانا کو اس شخص نے دیا جس کا خیرخواہ مولانا سے بڑھ کر اس بھری پری دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اتنی دور رہ کر بھی یہ غم ہمارے دلوں کو چیر رہا تھا، تو مولانا کی کیا حالت ہو گی؟ یہ سوچ کر ہمارے کلیجے پھٹے جا رہے تھے لیکن مولانا نے نہ صرف اس غم کو برداشت کر لیا بلکہ اس پیرانہ سالی میں بھی اپنی ہمتوں کو مجتمع کر کے دخترانِ ملت کی تعلیم وتربیت کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک کرایہ کی عمارت لے کر جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے تعلیم کا آغاز کر دیا، یہ فیصلہ مولانا کے عزم بالجزم کی تازہ مثال ہے۔ الحمدللہ طالبات، فارغات اور دیگر بہی خواہوں کا تعاون مولانا کو حاصل رہا۔

مولانا اس اعتبار سے بھی قابلِ رشک ہیں کہ اپنی بیماریوں اور دیگر آزمائشوں کے باوجود اپنے مشن سے اپنی آخری سانس تک جڑے رہے۔ یہ سعادت بہت کم لوگوں کا نصیب بنتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مولانا کی بیٹیاں اور آپ کی فارغات اس محاذ پر ڈٹی رہیں گی۔ چند سال قبل جب حیدرآباد جانا ہوا تھا تو ہم اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر مولانا کے گھر گئے تھے۔ مولانا مجھے دیکھ کر اتنا خوش ہوئے جیسے ان کی اپنی بیٹی برسوں بعد سسرال سے مائیکہ آئی ہو۔ اپنے سامنے بٹھا کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دینی وتحریکی کاموں سے متعلق ترجیحاً دریافت کرتے رہے۔ وہی غضِ بصر، وہی فطرت راہبانہ، وہی اندازِ زاہدانہ، ضربتِ غازیانہ، صفاتِ درویشانہ۔ وہی نرم دم گفتگو وہی گرم دم جستجو۔

واپسی میں ڈھیر ساری کتابیں مجھے تحفتاً دیں کہ میرے دونوں ہاتھوں سے سنبھالے نہیں جا رہی تھیں۔ کہا کہ: ''ان سب کو پڑھنا اور خوب پڑھنا اور دین کا کام عمر بھر کرتے رہنا۔''

اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ اللہ انہیں صدیقین، صالحین اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ رکھے اور انہیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین!

گر سکھائے ہیں بادشاہی کے، میرے استاذ محترم نے مجھے

ناصرہ محمدی، بنت جمیل الرحمن، حیدرآباد

اے استاذ تیری عظمت کو سلام!
تیری محبت بھری شفقت کو سلام!
تو تھا تو تھا قوم میں تعلیم میں زور
تیری کی ہوئی ہر جد و جہد کو سلام!

سلام ہو ایسے استاذ پر! کہ جس نے دین کے پیچھے محنت و مشقت کو اپنا آرام بنالیا تھا۔ جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک بھی ملت کی بیٹیوں کی فکر کی۔

میری مراد ایک ایسی شخصیت سے ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں جس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، صرف اس فکر میں تھا کہ کیسے امت کی بیٹیوں کو جہالت، بدعت اور گمراہیوں کے اندھیروں سے نکال کر علمِ قرآن وسنت کے نور کی طرف لایا جائے، کیسے ان کو زیورِ علم سے آراستہ کیا جائے، کیسے ان پتھروں کو تراش کر ہیرا بنایا جائے اور کیسے انھیں تربیت وتزکیہ کی بھٹیوں میں تپا کر کندن بنایا جائے، کیسے ان خاکی ذروں کو چمکا کر مہتاب کیا جائے، کیسے انھیں پستیوں سے اٹھا کر رفعتوں تک پہنچایا جائے، کیسے ان کی بے مقصد، بے شعور اور جمود وتعطل کی شکار زندگی کو غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کا اعلیٰ مقصد ونصب العین عطا کر کے متحرک وفعال بنا دیا جائے!!! ہم نے آپؒ کو ہمیشہ اسی فکر میں پریشان اور اسی سوچ میں غلطاں دیکھا۔

ویسے تو ہر استاذ اپنے شاگرد کے حق میں اچھا ہوتا ہے لیکن اگر کوئی استاذ شاگردوں کی ہمہ جہت نشو نما کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیتا رہے تو ایسے استاذ کو مثالی استاذ کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے مولانا بھی ایک مثالی استاد تھے۔

میرے ذہن میں کئی واقعات ہیں ہر ایک کو میں بیان نہیں کر سکتی ورنہ مجلہ میں کسی اور مضمون کے لیے جگہ نہ ہوگی۔ مولاناؒ ہر شاگرد کے لیے سراپا محبت وشفقت تھے آج بھی وہ لمحات اسی طرح میرے ذہن پر نقش ہیں جب مولانا اسمبلی کے بعد اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کئے ہوئے اپنے کاندھوں پر رومال ڈالے ہوئے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے آفس کا پردہ ہٹا کر یہ کہتے تھے کہ آج اعدادیہ والے نیچے ہی رک جائیں اور پھر مولانا کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ یہ طالبات جو تعلیم کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہیں صرف اچھی طرح سیکھ لیں آپؒ تمام سیکشن والوں کو نیچے جمع کر کے گردان سکھاتے اور صیغہ وغیرہ پوچھتے تھے۔ مولانا کے اس طرزِ تدریس سے ہمیں احساس ہوتا تھا کہ جیسے ہم بہت بڑے ہیں اور نہایت اہم ہیں۔ صرف بڑی جماعتوں کی طالبات کی ہی نہیں ہماری بھی اہمیت ہے۔ اس طرح ایک احساسِ برتری ہمارے اندر پیدا ہوتا تھا جس دن بھی مولانا ہمیں صبح روکتے سارا دن ہم اترا اترا کر جامعہ میں گھومتے اور زبان حال سے یہ کہہ رہے ہوتے:

ذرّے نہ ہمیں سمجھو خورشید بنیں گے کل
امروز کی رونق ہیں، معمار ہیں فردا کے

مولانا کے ساتھ اگر میں ان کی دختران اور اہلیہ چاچی جان کا تذکرہ نہ کروں تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ مولانا کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی مدرسہ کو آگے بڑھانے کے لیے بہت محنت کی، چاہے وہ طالبات کی پڑھائی کا معاملہ ہو یا ان کی تقریری اور تحریری صلاحیتوں کو ابھارنے کا، ہر معاملے میں ان کا تعاون ہمیں حاصل ہوتا، خاص طور سے ہاسٹل کی طالبات کو جن کے والدین اپنی لڑکیوں کو ان روحانی والدین کے حوالے کر جاتے ہیں۔ یہ ان کا بھی ہر لحاظ سے خیال کرتے تھے۔ ایک دن میرا ہاسٹل میں جانے کا اتفاق ہوا شاید وہ اتوار کا دن تھا، ساری طالبات ہاسٹل ہی میں تھیں اور چاچی جان ساری ہاسٹل کی بچیوں کے لیے روٹی پکانے میں بڑھ چڑھ کر مدد کر رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ چاچی اپنی عمر کے اس حصے میں جس میں خود اپنا کام کرنا دشوار ہوتا ہے بیٹھ کر روٹی بنا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے سمجھ آئی کہ اصل زندگی کیا ہے اور جینا کسے کہتے ہیں، ''دراصل دوسروں کے لیے جینا ہی اصل زندگی ہے'' کے مصداق انہوں نے جینا سیکھ لیا تھا۔ ایک اور بات کا ذکر میں کرنا چاہوں گی کہ جب بھی میری والدہ مولانا کو دیکھتیں تو یہی کہتیں کہ ''ناصرہ! مولانا ایک چلتے پھرتے جنتی آدمی ہیں ان کے چہرے پر ایسا نور ہے کہ مجھے ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر بس جنت ہی یاد آتی ہے۔''

ہماری درسگاہوں میں جو یہ استاد ہوتے ہیں
حقیقت میں یہی تو قوم کی بنیاد ہوتے ہیں

سنیں روداد ہم جب بھی کسی کی کامیابی کی
ہر اک روداد میں یہ مرکزِ روداد ہوتے ہیں

یہی رکھتے ہیں شہرِ علم کی ہر راہ کو روشن
ہمیں منزل پر پہنچا کر یہ کتنا شاد ہوتے ہیں

پستی کو بلندی بخشتے ہیں اپنے کاندھوں کی
انھیں کی کھوج سے سب نامور ایجاد ہوتے ہیں

مولانا نے ہمیں جس جذبِ دروں سے نوازا ہے جس عزم ویقین کا امین بنایا ہے ہم تازندگی اس امانت کے حق کو ادا کرتے رہیں گے اور اپنی نسل نو میں اس کو منتقل کرتے رہیں گے۔ اس طرح مولانا ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہیں گے۔ انشاءاللہ

میں تو ایک عزم ہوں دبتا ہوں ابھر آتا ہوں
میں تو وہ نور ہوں بجھتا ہوں تو بڑھ جاتا ہوں

میں ہی وہ جذب سبک خیز وشفق ریز ہوں جو
ہر نئی نسل کے سینے میں اتر جاتا ہوں

اس موقع پر میں یہ کہوں گی کہ ہم میں سے ہر کوئی عزم کرے کہ مولانا کے اس مشن کو، امت کی بیٹیوں کے لیے دیکھے گئے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ہم جامعہ کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ چاہے مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دے کر یا مالی واخلاقی تعاون کر کے، چاہے مدرسہ کی تعمیر وترقی اور اس کے استحکام کے لیے دعائیں کر کے۔

اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ استاذِ محترم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی محنتوں اور مشقتوں کو ان کے لیے ثوابِ جاریہ بنائے۔ آمین!

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر!

ڈاکٹر خان مبشرہ فردوس
بنت محمد ابراہیم خان، اورنگ آباد

بعض زندگیاں ہماری زندگی کا زندہ کردار بن جاتی ہیں......جن کے احسان کے سبب ہم انہیں ہر لمحہ یاد کرتے ہیں......ان کے اندازہائے تعلیم وتربیت کے اثرات ان مٹ نقوش کے مانند ذہن ودل پر قبضہ کرلیتے ہیں...... یہ وہ شخصیات ہوتی ہیں جو انسانی کردار کی تعمیر کرتی ہیں۔ان کی زندگیاں بعد از موت بھی اس شعر کی مصداق ہوا کرتی ہیں:

موت التقی حیاۃٌ لا فناء لها
قد مات قوم و هم فی الناس أحياء

ترجمہ:''پرہیزگار آدمی کی موت بھی ایسی زندگی ہے جسے فنا نہیں، جبکہ بعض لوگ مردہ ہوتے ہیں اگرچہ وہ لوگوں کے درمیان زندہ ہیں۔''

افراد کی تربیت کرنے والی شخصیات اپنی پرہیزگاری وتدین کے باعث ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، اس کے برعکس بےفیض افراد زندہ ہوتے ہوئے بھی لاشئ کے درجے میں ہوتے ہیں۔

عزیمت کی راہ پر چلنے والے دو طرح کے افراد ہیں: ایک وہ جو اہلِ شہادت ہیں، دوسرے وہ جو محسن ہیں۔ شہید دوسروں کے لیے جان کی قربانی دیتے ہیں اور محسن دوسروں کو زندگی کا نذرانہ دیتے ہیں۔ یہاں ذکر اپنے محسن استاذ کا ہے جن کے احسان کو ہم نے اس تناظر میں محسوس کیا جس کا نقشہ قرآن نے یوں کھینچا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

ترجمہ: ''خدا کی محبت اہلِ احسان کے لیے خاص ہے۔''

جن کی شخصیت کا تاثر آج سترہ سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود نہ صرف باقی، بلکہ اپنی مکمل حلاوتوں کے ساتھ زندہ و پائندہ ہے۔ دل تو ان کی عظمت و کمال کا اس وقت سے ہی قائل ہے جب اپنے اسکول کے زمانے میں جامعۃ البنات حیدرآباد میں ہم نے طالبِ علمی اختیار کی تھی۔ امی، ابو، بہن عمارہ اور ایک ماموں زاد بہن صحیفہ؛ ہم لوگ ساتھ مدرسہ پہنچے۔ والدہ نے پوچھا کہ اس مدرسے کے ناظم کون ہیں؟ جواب ملا: مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب ہیں۔

رفتہ رفتہ جانا کہ مولانا محترم کی شخصیت اس جامعہ میں شجرِ سایہ دار و ثمر بار کی ہے۔ بردباری و تحمل سے متصف نہایت مشفق و محترم انسان، انتہائی متحرک، مستقل فکرمندی جن کا شعار تھا، طالبات کی خیریت دریافت کریں تو مشفق والد کا گمان ہوتا، ہر طالبہ کی فکر میں غلطاں، کس بچی کی سبق میں دلچسپی کتنی ہے، کس بچی کی کیا صلاحیت ہے، کون اچھی مقررہ ہے، کس کی تحریر عمدہ ہے؛ مولانا ہر بات سے باخبر ہوتے۔ کسی اسٹوڈنٹ کی چھوٹی سی خوبی بھی مولانا جان لیں تو پذیرائی کا جداگانہ انداز ہوتا، طالبات کے کھانے کے لیے فکرمندی غالب رہتی۔ طالبات کے امتحانات کے نتائج پر استفسار کے انداز سے احساس ہوتا کہ مولانا ہر ایک کے علمی نتائج کے لیے فکرمند ہیں۔ مولانا اس علم کے باغ کو لہلہاتے دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔

مولانا کی زبان سے تعریفی کلمات حاصل ہو جائیں تو جامعہ کی سبھی طالبات اسے اپنے لیے سندِ اعزاز سمجھا کرتی تھیں۔ تربیت کا انداز انتہائی مشفقانہ۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کال کرنے کا بل زیادہ ہوا کرتا تھا، گھر سے کال آتا تو مولانا کے افرادِ خانہ اور خود مولانا بھی بڑی تحقیق کے بعد اطمینان کر لیتے کہ والدین ہی کال پر ہیں۔ طالبہ کو بلا لیتے تھے، بہت دیر بات ہونے لگتی تو فرماتے:

''کتنی طویل گفتگو کرتی ہو جی، بل نہیں آتا؟''

ہم مہاراشٹرین کو روٹی کھانے کی عادت تھی، صرف چاول پر گزارا مشکل تھا، اسی ایک وجہ سے مہاراشٹرا سے آنے والی کئی طالبات درمیان سے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ہم مہاراشٹرا سے ہیں، اور اکثر روٹی نہ ملنے پر دشواری رہتی ہے، یہ بات ہماری امی کے خط سے مولانا کے علم میں آئی تھی، خط میں امی کا لکھا حرف حرف یاد ہے۔ امی نے لکھا تھا:

''میری پیاری بیٹیو! جانتی ہوں، ہاسٹل میں آپ کو کھانے کی شکایت ہے، لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ اسی مادرِ علمی سے محبت ہو جائے تو گھر کی پرتعیش زندگی اور لذیذ کھانے بھی اس ہاسٹل کی زندگی سے بہتر نہیں لگیں گے۔

آپ علمِ دین حاصل کرنے کے لیے مولانا کی سرپرستی میں ہو۔ایک عظیم انسان کی سرپرستی کا میسر آنا بھی نعمتِ خداوندی ہے، ایسے طالب علم کے لیے جو علمِ دین کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے، سمندر کی مچھلیاں اور آسمان پر اُڑنے والے طیور بھی دعائے خیر کرتے ہیں۔

بیٹا! زندگی سخت مشقت سے تعبیر ہے، زبان کی لذت انسان کو دنیا کا بندہ اور علم کی لذت انسان کو آخرت کا طلب گار بناتی ہے۔اب فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔''

مولانا نے امی کی اجازت سے یہ خط تمام ہاسٹل کی طالبات کو پڑھ کر سنوایا تھا، تاہم اس دن کے بعد سے مولانا کا معمول تھا کہ اپنے ناشتے کی پلیٹ جس میں خصوصاً روٹی ہوتی، ہم مہاراشٹرا کی طالبات کے لیے پہلے بھجواتے، تب خود ناشتہ کرتے۔

مولانا کے اس عمل نے دل میں ایسی محبت پیدا کی کہ آج تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو اپنی امی مرحوم اور والد محترم کے ساتھ مولانا کی تندرستی کی دعا کبھی لبوں سے جدا نہ ہوئی۔

ہم نے ہاسٹل میں عید الاضحیٰ بھی منائی ہے، اور مولانا اور مولانا کی اہلیہ محترمہ جنہیں ہم چاچی کہا کرتے، ان کی محبتوں کے زیرِ سایہ وقت گزارا ہے۔ان سے اتنی محبت ملی کہ کبھی اپنے افرادِ خاندان سے انہیں جدا نہ سمجھا۔

ایک مرتبہ رمضان میں فجر کے بعد مطالعہ کے لیے بیٹھی تھی کہ فاطمہ نامی ایک لڑکی جو تیلگو زبان سے زیادہ قریب تھی، ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتانے لگی: آپ جانتی ہیں، مولانا ہمیں اس ہاسٹل میں کہاں سے لائے ہیں؟ کہاں سے؟ ہم لوگ فلاں گاؤں سے ہیں اور بچپن سے ہی قادیانیوں کے مکتب میں پڑھتے ہوئے ان کے مدرسے کے طالب علم بن گئے تھے، مولانا ایک وفد کے ساتھ آئے اور ہمارے والدین کو سمجھا کر ہمیں یہاں لے آئے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ بھی جانا کہ یہ مولانا کا مشن ہے کہ وہ اس طرح گاؤں دیہات کی طالبات کو عقیدے کی تصحیح کے لیے لے آتے اور ان کی تربیت کرتے۔تربیت کے اس گہوارے میں نہ جانے کتنی ایسی کہانیاں تھیں جن کے واحد سرپرست مولانا تھے۔کتنی عائشہ، فاطمہ، ام سلمٰی مولانا کی خاکستر کی وہ چنگاریاں تھیں جن کو پدرانہ شفقت صرف مولانا کی ذات سے ملی۔آج ان سطور کو لکھتے ہوئے میری اپنی ذات سے جڑا ہر واقعہ یاد آرہا ہے۔مولانا کی کتاب ''بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں'' کا مسودہ دیتے ہوئے مولانا نے اپنی بیٹی ظل ہما سے کہا تھا: ''ہما! مبشرہ سے کہو جی، کہ اس کتاب کو پڑھ کر پروف ریڈنگ کرے۔''

کتاب میں شعائر اللہ کی حفاظت کی بحث بھی پڑھوا دی، پروف ریڈنگ کا شعور بھی پیدا کیا اور اس سوال پر

بھی توجہ مرکوز کی کہ ''زمین پر جو اللہ کا گھر ہے تا قیامت وہ جگہ اللہ ہی کا گھر رہے گا۔'' مولانا کا یہی طریقہ تھا، بہت غیر محسوس طریقے سے بہت کچھ وقتِ واحد میں سکھا دیا کرتے تھے۔

آج جب خواتین کے نیشنل میگزین کی ایڈیٹر ہوں تو ہر وقت مولانا کے لیے دعا نکلتی ہے کہ جن کی ترغیب پر لکھنا سیکھا، پروف ریڈنگ کا شوق بھی آپ نے دلوایا، مطالعے کا شوق بھی آپ سے ملا۔

تقریری مقابلے کے لیے تیاری کرنے کا مرحلہ ہو کہ انٹر اسکول مقابلے میں شرکت کا، مولانا کی فیملی کا یہ احسان تاحیات بھولنا ناممکن ہے۔ اپنے محسنین کو بھول جانا دراصل ذہنی قلاشی ہے اور اللہ اس قباحت سے محفوظ رکھے۔ ہمیں یاد ہے کہ تحریری مقابلے میں پہلی کتاب ''اسلام اور اجتماعیت'' مولانا کے ہاتھ سے انعام میں ملی تھی اور وہ آج تک اسی عظمت کے ساتھ، اپنے جی سے لگا رکھی ہے۔

اب جب پختہ شعور کے ساتھ اپنے استاد کو چشمِ تصور سے دیکھتی ہوں تو دل قائل ہوتا ہے کہ وہ استاد کے ساتھ ایک مربی تھے، جن کی معیت میں ہم نے شعور پایا تھا۔ تحریکِ اسلامی کے کام کا جنون بھی وہیں سے ملا۔ فراغت کے بعد مولانا کو جب جب خبر ملی کہ مبشرہ تحریکِ اسلامی کا کام کر رہی ہے، فلاں ذمہ داری پر۔ مولانا کی دختران سے پتہ چلا کہ مولانا نے کہا کہ مبشرہ سے کہو کہ متحرک رہنا بھی خوش آئند ہے۔ شگوفہ آپا کا جملہ آج بھی یاد ہے، کہا تھا: ''مبشرہ! ابا بہت خوش ہیں کہ بنات کی بچیاں تحریک کا اثاثہ ہیں، وہ متحرک رہیں اور خوب کام کریں۔''

مولانا کے یہ الفاظ ہمارے لیے الفاظ نہیں بلکہ محرک تھے، اور ساری زندگی محرک بنے رہیں گے۔

نیما یوشیج کے اشعار کی مانند مربی تو اخفاء میں رہے:

افروخت کہ افروختنم آموزد
آموخت کہ آموختنم آموزد
چوں ایں ہمہ کرد، روی بنہفت و برفت
تا در غم خود سوختنم آموزد

ترجمہ: ''اس نے مجھے روشن کیا کہ مجھے روشن رہنا اور روشن کرنا سکھایا اس نے مجھے سکھایا کہ میں سیکھنا اور سکھانا سیکھ لوں۔ جب اس نے یہ سب کچھ مکمل کر لیا تو اپنا چہرہ چھپا کے چل بسا کہ مجھے اپنے غم میں جلنا سکھا دیا۔''

محسن کی زندگی تعمیر انسان پر فنا کی دلیل ہے اور یہ روشن دلیل اور مستند حوالہ مربئ محترم کی ذات ہے۔

مولانا درس کے دوران میں تذکیر فرماتے، جو الفاظ یاد رہے وہ خاکساری کی تلقین تھی:

''پھل دار درخت بنو، پھل دار درخت پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتا ہے۔ یاد رہے! علم آپ میں تفاخر پیدا نہ کرے، خاکساری عاجزی پیدا کرے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حق کے لیے ثابت قدمی بھی آپ کا شعار ہو۔''

مولانا کی ترجمہ کی گئی ایک کتاب ''وسائل تربیت: اخوان المسلمون کا طریقۂ تربیت'' مولانا نے ہمیں دی تھی، آج تک ہمارے پاس ہے۔ مولانا بنات میں طالبات کو مطالعے کی تلقین کرتے تھے۔ لائبریری میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا، مولانا لائبریری سے استفادہ کرنے والی طالبات کی تعریف کر کے مطالعہ کی ترغیب دلاتے تھے۔ افکارِ ملی، اسلامک مومنٹ، رفیق منزل، دعوت کے خصوصی شمارے؛ بچیوں کو دیا کرتے تھے کہ اس کا مطالعہ کرو۔

ایک مرتبہ جامعۃ البنات کے آفس میں کسی کام سے ہم لوگ گئے۔ مولانا نے بلایا اور رفیق منزل کا خصوصی شمارہ پکڑاتے ہوئے کہا کہ اس کو پڑھو جی اور دوسری بچیوں کو سناؤ پڑھ کر۔ مولانا کا دیا ہوا رسالہ تھا۔ تبرک کے بطور اپنے پاس رکھ لیا جو آج تک میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

عزیمت کے اس راہی، معمارِ انسانیت کے مرتبے پر فائز اپنے مربی محترم کو ہم نے انتہائی ثابت قدم اور حوصلے میں مضبوط چٹان پایا، تب بھی جب ان کا عزیز بیٹا شہید کر دیا گیا، تب بھی جب ان سے ان کا جرعہ جرعہ سینچا ہوا باغ چھین لیا گیا۔ مسافر فی سبیل اللہ نے اف تک نہ کی۔ ہم نے اپنی جاگتی آنکھوں سے انتہائی مختصر اسباب میں گزارتی ہوئی ان کی زہد و تقویٰ کی زندگی کا خود مشاہدہ کیا، سادہ لباس، سادہ کھانے، مختصر اسبابِ زیست، بلا کی قناعت پسندی، انتہائی استقامت واللہ! اہل خانہ بھی مولانا کے اس مشن میں ہم قدم تھے اور بڑی خوش دلی کے ساتھ تھے۔

ہم نے اپنے دور میں مولانا کو متحرک دیکھا ہے۔ ہاسٹل کی طالبات کے سرپرست بچیوں سے ملنے آتے تو جب تک قیام رہتا مولانا ہی کے دسترخوان پر مہمان کی ضیافت رہتی۔ مہمان کے قیام تک مولانا بہ نفس نفیس خود دریافت کرتے کہ مہمان کا کھانا ہو چکا؟ جواب آنے کے بعد ہی خود کھانا کھاتے۔

ایک مرتبہ ہمارے ابو ہم سے ملنے آئے تھے۔ باہر تفریح کے لیے باغِ عام لے گئے۔ عصر کا وقت قریب تھا ابو نے ہمیں باغِ عام میں بٹھایا اور خود مسجد تشریف لے گئے۔ تاخیر سے واپسی ہوئی۔ تاخیر کی وجہ بتاتے ہوئے کہا مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب کا درس تھا عصر میں۔ اتنی دیر میں مولانا تیز گام چلتے ہوئے گزر گئے۔ ابو نے بتایا مولانا کا یہاں مستقل ہر ہفتے درس ہوتا ہے اور مولانا اتنی دور سے چلے آتے ہیں۔ عزیمت کی راہ کا سفر ہم نے آپ کی تحریک پر چُنا۔ دائرہ حق میں ثابت قدمی، باطل کے سامنے سینہ سپری، زندگی کے گزران میں سادگی، یہ

آپ کا اثاثہ ہے جسے ہم نے جی سے لگا رکھا ہے۔ آپ کے بالمقابل اوروں پر نظر ڈالیں تو لگتا ہے کہ آج بے شمار افراد مدارس کو عصری علوم سے جوڑنے کی بات کرتے ہیں، مدارس کے طلبہ کو عصری علوم میں علمی استعداد حاصل کرنے پر اکساتے ہیں تا کہ مدارس کے طلبہ بھی زمانے سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ مولانا کے پاس یہ تصور پہلے ہی سے موجود تھا، جسے جامعۃ البنات کے نصاب میں شامل رکھا۔ ہر درجے میں عصری کتب کو لازم کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا ہاسٹل کی طالبات کو عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈگری کورس میں ایڈمیشن کرواتے عالمیت کے ساتھ گریجویشن کرنے کی ترغیب بھی دیتے۔ ہمیں یاد ہے مولانا کے دور میں مدرسے کی فارغات نے انٹر فرسٹ ایئر اور انٹر سیکنڈ ایئر کے امتحان کو امتیازی نمبرات سے کامیاب کیا اور کئی طالبات نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی، بعض نے مختلف علوم میں ماسٹرز کیا ہے اور عالمیت کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تدریس میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ یہ وژن بھی ہم نے مولانا ہی سے پایا۔

تقاریر اور تحریروں کے امتحانات نہ صرف نصاب کا حصہ تھے، بلکہ ہاسٹل کی طالبات کی تقریر، تحریر، حمد، نعت اور بیت بازی کے مقابلوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شرکت کروائی جاتی تھی۔ آج جب ایجوکیشن میں ہم پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکے تب جانا کہ واقعی مولانا کے یہاں طلبہ کی صلاحیتوں کے ارتقاء کے جدید نظریات روبہ عمل لائے جاتے تھے۔

زندگی کے ہر شعبے میں شعوری طور پر احکامِ اسلامی کو نافذ کرنے کا شعور ہم نے اپنے مربی محترم سے پایا ہے۔ دنیا کی زندگی تو آپ کی بتائی راہ پر گزار رہے ہیں، اللہ رب العالمین سے استدعا ہے کہ بارِالٰہ! ہمارے مربی محترم کو میدانِ حشر میں بھی سر بلند و سرخرو رکھیے۔ خداوند متعال آپ کی قبر کو نور سے بھر دیجئے، آپ کے درجات بلند فرمایئے، جس استغنا کے ساتھ دنیا کے باغ کے چھن جانے پر آپ کی خندہ پیشانی باقی رہی، اللہ اس کے عوض میں جنت الفردوس کے باغ عطا فرمایئے، آمین!

مردِ سپاہی تھا وہ اس کی زرہ 'لا الٰہ'

نفیسہ فاطمہ
بنت مولانا منصور احمد قاسمی، حیدرآباد

موت اس کائنات کی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، خدا کے سوا ہر کسی کو موت آنی ہے، كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔(القصص:88) اللہ کے سوا یہاں ہر کمال کو زوال، ہر عروج کو سقوط اور ہر بقا کو فنا ہے، ہر جاندار کو بے جان لاش میں تبدیل ہونا ہے، ہر کسی کو موت سے دوچار ہونا ہے:

رعب فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

یوں تو کسی بھی شخص کا دنیا سے چلا جانا موجبِ غم اور باعثِ الم ہے، لیکن جانے والا اگر ملت کا محسن و کرم فرما اور قوم کا مخلص و رہنما ہو تو دل پر حزن و غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اور خرمنِ قلب پر رنج والم کی بجلیاں برستی ہیں اور پھر ملت کا کوئی محسن اور قوم کا کوئی مخلص ایسے وقت میں جائے جبکہ ملت و قوم کو مخلصین و محسنین کی سخت ضرورت ہو تو پھر حزن وغم اور رنج والم کی شدت ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے۔

آج جب کہ مسلمان ہر طرف مصائب و آلام، حوادث و فتن کا شکار ہیں، ایسے حالات میں اسے ایسے علماء کی سخت ضرورت ہے جو ان مشکل حالات کا مقابلہ اور اسلام کا دفاع کرسکیں، اور ملت اسلامیہ کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دے سکیں؛ مگر انتہائی افسوس، نہایت قلق و حسرت اور نہایت اضطراب و پریشانی کا وقت ہے کہ ان نمونۂ اسلاف

بزرگانِ دین سے دنیا خالی ہوتی جارہی ہے۔ انہی بزرگوں میں سے ایک جلیل القدر و مایہ ناز عالمِ دین، ولیِ کامل، قوم و ملت کا درد رکھنے والے ہمارے محسن و مربی و استاذی مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہ ہیں، جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے، افسوس کہ یہ روشن آفتاب بھی پردۂ شب میں روپوش ہوگیا۔ ہمارے مولانا کا انتقال پُر ملال ملتِ اسلامیہ کے لیے عظیم خسارہ اور سفینۂ اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی حادثہ ہے۔

طالبانِ علومِ نبوت کے لیے جب کہ ملائکہ پر بچھاتے ہیں اور زمین و آسمان کی مخلوقات حتیٰ کہ دریا کی مچھلیاں استغفار کرتی ہیں تو بلا شبہ مولانا جو کہ طالباتِ علومِ نبوت کے مربی تھے، کی وفات پر زمین و آسمان کے جن و انس، حیوانات و نباتات اور عالم کا ہر ذرہ نوحہ گری اور دعائے مغفرت کرے تو ان کا ایسا کرنا بالکل حق بجانب ہے۔ آپ کا عالم سے اٹھ جانا یقینا عالم کے لیے یکساں مذہبی و اسلامی حادثہ ہے۔

مولانا اسلام کے سپاہی تھے، آپ صحابہ کرامؓ کے سچے جانشین اور انبیاءؑ کرام کے حقیقی وارث تھے، مولانا علوم و معارف کا بحرِ ذخار تھے، جامعہ کے لیے ابر نیساں، معرکۂ حق و باطل کے شیر نیستاں اور اسلامی افق کے نیر درخشاں تھے، حق کے طرفدار و علمبردار اور ظلم و ظالم کے خلاف آواز بلند کرنے والے مجاہد کارزار تھے، باطل اور طاغوتی نظام کے خلاف زندگی بھر جہدِ مسلسل کرتے رہے، اپنی تقریر و تحریر اور زبان و بیان کے ذریعہ طاغوتی نظام کے سقوط اور اسلامی نظام کے استحکام کی کوشش کرتے رہے:

وہی مومن ہے جس کو دیکھ کر باطل پکار اٹھے
کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

مولانا ہمیشہ ہم طالبات کو مخاطب کر کے اپنے بیانات میں کہا کرتے تھے کہ بچیو! ہمیں دنیا میں امن قائم کرنا ہے، ہمیں طاغوتی نظام کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کرنا ہے اور خلافت اسلامیہ کا قیام عمل میں لانا ہے:

جب نہ لے کوئی خبر اسلام کی
جب نہ ہو کوئی حمایت کو کھڑا
ایسے وقتوں میں تھا وہ اے دوستو!
حامئ دین محمد مصطفی ﷺ

مولانا ناظم جامعہ تھے، لیکن کبھی بھی اپنے رویہ میں تکبر و سختی نہ رکھی۔ مولانا بے انتہا اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک، عمدہ اخلاق کے حامل، خوش مزاج، نرم خو، نرم گفتار و بلند کردار تھے:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

مولانا کا اندازِ معاشرت اتنا سادہ اور خلقِ خدا سے تعلق اتنا بے لوث تھا کہ انسان ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور ملاقات کرنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے کہ

بہت دل خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولانا کی زندگی زاہدانہ تھی، آپ حق گو اور حق پسند تھے، آپ اکثر خاموش رہتے، مگر جب اسلام یا نظامِ اسلام پر کوئی بات آتی تو خاموشی کو جرم سمجھتے، مولانا کا مزاج نرمی اور نرم خوئی سے عبارت تھا، مگر جب بات اسلامی نظام کے استحکام اور طاغوتی نظام کے انہدام کی آتی تو مولانا کی یہ نرمی سختی سے بدل جاتی، یعنی مولانا اپنی ذات کے لیے نرم اور اسلامی نظامِ حیات کے لیے سخت تھے:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مولانا کی زندگی اقبال کی اس نصیحت پر پوری اترتی تھی:

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

وہ پوری زندگی ملتِ اسلامیہ سے یہ کہتے رہے:

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

مولانا کے مزاج میں نفاست و نظافت اعلیٰ درجہ کی تھی، یہ نفاست و نظافت فطری تھی، تصنع اور بناوٹ سے پاک تھی، آپ کا رہن سہن، رکھ رکھاؤ، لباس و پوشاک، آرام گاہ و رہائش گاہ ہر ایک چیز اور ہر ادا ان کی طبعِ نفیس کی آئینہ دار تھی۔

اللہ نے آپ کو جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا ان میں ایک اہم خوبی قرآنِ مجید سے عقیدت ومحبت اور والہانہ تعلق تھا، ان کی زندگی پر بس قرآن مجید ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا، کیوں نہ ہو کہ ایک مومن کی یہی شان ہونی چاہیے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

مولانا سے ہم نے تفسیرِ بیضاوی پڑھی ہے، درس تفسیر میں دریا کی پرسکون روانی ہوتی، مگر یہ پُرسکون روانی بھی اپنے اندر طغیانی اور جولانی لیے ہوتی۔ لہجہ کی شائستگی و روانی، فکر کی گہرائی وتابانی سے درس کی اہمیت دو چند ہوتی، اور گہر ہائے معانی کی فراوانی اس کے سوا ہوتی:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

مولانا کے درس کی خاص بات یہ تھی کہ آپ علمی وفکری مضامین کو بھی آسان پیرائے میں بیان کرتے جس سے معمولی استعداد والی طالبات کو بھی بات سمجھ میں آجاتی، آپ کے اسباق و بیانات ہم طالبات کے لیے بارانِ رحمت ہوتے جس سے ہمارے مردہ دلوں کو زندگی اور خشک دماغوں کو تازگی ملتی، اور دلوں کو توکل علی اللہ کی خوئے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہوتی۔ مولانا اپنے بیانات کے ذریعہ ہمارے اندر ایمانی جذبہ کو ابھارتے اور اکثر ہمیں اپنی عملی زندگی سنوارنے اور مستقبل میں اس تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کی ترغیب دیتے۔

چھوٹوں پر شفقت کرنا مولانا کی ایک خاص صفت تھی، اس سلسلہ میں میں اپنے ساتھ پیش آئے ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔ ۲۰۰۳ء کی بات ہے کہ میرے والد محترم داخلہ کی غرض سے مجھے جامعۃ البنات سعید آباد لے کر گئے۔ اس وقت میری عمر صرف ۹؍سال تھی، اس وقت اتنی کم عمر لڑکی کا جامعہ میں اقامتی داخلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے مولانا نے میرا داخلہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے والد نے داخلہ پر اصرار کیا تو مولانا نے مجھ سے کہا کہ ہاسٹل میں سب کام خود سے کرنے ہوتے ہیں، تم یہ سب کام کرلوگی؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مسکراتے ہوئے مشفقانہ اور احسان مندانہ سلوک کرتے ہوئے میرا داخلہ منظور کرلیا:

تو دائم پیکر انس و محبت بن کے قائم ہو!
تو فانی بن کے باقی ہو تو باقی ہو کے دائم ہو!

مولانا سراپا پیکر اخلاص وللّٰہیت تھے، اللہ کا بڑا کرم رہا کہ ہمیں ایسے استاذ سے شرف شاگردی حاصل ہوا جو خلوص و بے لوثی کا مجموعہ اور کمال ادب و کمال شفقت میں یکتا تھے، مولانا کی علمی وفکری میراث ایک تو طالبات کی شکل میں ملک و بیرونِ ملک موجود ہے، دوسرے تصنیفات کی شکل میں دستیاب ہے۔

اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آسان نہیں ہے، اس کے لیے جوشِ جنوں اور جذبِ دروں کی فراوانی درکار ہے؛ یہ وہ کوچۂ چاک گریباں ہے جہاں تن آسانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

مولانا جس قافلۂ سخت جاں کے رہرو بلکہ رہبر تھے اسے آبلہ پائی سے پیار ہے، اور یہ قافلہ جس راہ پر گامزن ہے وہ راہ رخصت کی نہیں عزیمت کی اور سہولت کی نہیں اذیت کی ہے۔ مولانا کی ایمانی حمیت سے لبریز خطر پسند طبیعت کو سہولت ورخصت کی راہ سازگار نہ تھی، اسی لیے مولانا نے اقامتِ دین کے بلند و پاکیزہ مقصد کی خاطر عزیمت واذیت کی راہ کو ترجیح دی:

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اقامتِ دین اور نفاذِ نظامِ اسلامی کی راہ پر چلنے کی وجہ سے مولانا اور مولانا کے ارکانِ خاندان کو بہت ساری اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ آپ نے اپنے بیٹے کی شہادت کا سعادت مندانہ غم بھی صبر وتحمل سے قبول کیا۔ جوان بیٹے کی جدائی سے بوڑھے باپ کی بے کلی و بے چینی کی کیا کیفیت ہوتی ہے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کے سینے میں دل ہے۔ اذیتوں، آزمائشوں اور خلاف مزاج حالات وحادثات کے باوجود مولانا کبھی ٹوٹے نہیں اور نہ ہی اپنے مشن کو چھوڑا، بلکہ اخیر وقت تک حق پر قائم رہے، اور تا دمِ واپسیں نہ صرف دماغی طور پر صحت مند رہے، بلکہ پرُعزم و بلند حوصلہ رہے۔ ایسے سنگین حالات اور دل شکن حادثات سے گزرنے کے باوجود مولانا کا استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنا اور کسی طرح کی نفسیاتی بیماری یا ڈپریشن کا شکار نہ ہونا مولانا کے ارادے کی بلندی، فکر کی پختگی اور عمل کی صالحیت کی دلیل ہے۔

علم وعمل کا مہر درخشاں نہیں رہا
اب مومنوں کے کیف کا ساماں نہیں رہا
عالم کی موت اصل میں عالم کی موت ہے
ہم میں وہ اک مفسر قرآن نہیں رہا

حق گو تھا، حق نگار تھا، حق جو تھا، حق بیاں
ارباب حق کے درد کا درماں نہیں رہا
سب تھے رفیق جسکے، خدا جس کا تھا رفیق
اک مخلص اور صاحب احساں نہیں رہا

مولانا کے ادارے میں گزرا میرا آٹھ سالہ تعلیمی سفر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مولانا کی زندگی اس شعر کا مصداق تھی:

سارا جہاں خلاف ہو پروا نا چاہیے
مدِ نظــر تو مرضی جاناناں چاہیے

نیــز:

تو اکیلا تیرے دشمن سینکڑوں یہ بھی نہ دیکھ
قدرت حق پر نظر رکھ اپنی کمزوری نہ دیکھ

اقبال کا یہ شعر بھی مولانا کی زندگی اور مولانا کے مشن پر حرف بحرف صادق آتا ہے کہ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اللہ رب العزت سے میں دعا گو ہوں کہ مولانا کے ناصحانہ کلمات پر عمل کرنے اور مولانا کی طرح خدا پر توکل اور مصیبت پر صبر کرنے والا بنائے اور مولانا کے درجات بلند فرمائے۔ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

وہ اک شجر تھا مثل طوبیٰ

عمارہ فردوس بنت محمد ابراہیم خان، جالنہ

آہ! میرے مربی، میرے مشفق ومحسن استاد! آپ کے رخصت ہونے کی خبر سے قلب وجگر میں بہت ہی گہرے گھاؤ پڑ گئے ہیں۔ ہمارے پگھلتے دلوں کی بے قراری کہہ رہی ہے کہ ایک گھنے اور سایہ دار درخت کی چھاؤں سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ ہر شاگردہ کی تحریر کا عکس واضح کر رہا ہے کہ ہم سے ایک نقیب راستی جدا ہو گیا ہے۔ الفاظ کو پرو کر تحریر بنتی ہے، غم کی اس حالت میں میرے لیے الفاظ کو یکجا کرنا بڑا ہی مشکل امر ہے۔

آج مرے قلم کی روح ستم زدہ ہے
مرے ساز کا نغمہ بھی غمزدہ ہے

شجر ہائے سایہ دار

مولانا جامعہ کے ناظم ہونے کے ساتھ ہاسٹل کے سرپرست بھی تھے اسی لیے ہاسٹل کی طالبات کے لیے مولانا کی سرپرستی ایک مشفق باپ کی طرح تھی۔ میں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ ہاسٹل میں گزارا ہے کیونکہ مجھ کو بچپن سے ہی مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ عالمیت، فضیلت اور تدریب کرنے کے بعد میں نے حفظ قرآن کے لیے شعبۂ حفظ میں داخلہ لیا تو مولانا بہت خوش ہوئے اور پھر مجھ کو پابند کر دیا کہ میں بجائے ہاسٹل کے کھانے کے تینوں وقت مولانا کے گھر کا کھانا کھاؤں اور مولانا کی اہلیہ جنھیں ہم چاچی کہتے ہیں وہ پورے اہتمام کے ساتھ مجھ کو ناشتہ کرواتیں یہ کہہ کر کہ بیٹا حفظ کے لیے بہت محنت لگتی ہے ذرا اچھا کھاؤ۔ وہ اپنی بیٹی کی طرح اپنائیت اور خلوص سے پیش آتی تھیں۔ یہ نہ صرف ہماری یادیں ہیں بلکہ وہ بہترین نقوش ہیں جو بچپن میں بہت ہی گہرے ثبت ہوتے ہیں۔ ابھی اسی ماہ مولانا کے انتقال سے بیس دن پہلے پانچ ستمبر کو مولانا کی نواسی کا فون آیا

کہنے لگی عمارہ آپی! نانا ابو آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ نانا ابو کہہ رہے ہیں کہ عمارہ کو فون لگاؤ جی، ہمیں بات کرنی ہے۔ میں نے مولانا سے بات کی تو بڑی نحیف اور کمزور آواز آرہی تھی لیکن اس کے باوجود مولانا میری خیریت دریافت کررہے تھے اور دعادے رہے تھے۔ اپنے شاگردوں سے اس طرح لگاؤ اور ان کو یاد کرنا، ان کی خیریت دریافت کرنا عمر کے ایسے حصہ میں جب اکثریت چڑچڑاہٹ کا شکار ہوجاتی ہے، یہ میرے مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا خاص امتیاز تھا کہ وہ اپنی 89 برس کی عمر کے باوجود انتہائی شفیق اور نرم خو تھے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ہمہ جہت شخصیت

مولانا کی شخصیت کا ہر پہلو مسلسل اور جہد مسلسل جیسا تھا۔ ستیزہ گاہوں میں جان لڑادینے اور قربانی دینے والا روشنی کا تیز دھارا جو کبھی ماند نہ ہو...... کتابوں کے اوراق پر ایسی تحریر جو جذبوں کی صداقت اور ایمان کی حرارت کو زندہ کردینے والی ہو...... شفقت اور سرپرستی کا حق ادا کرنے میں وہ مثلِ شجر طوبیٰ، جس کی چھاؤں میں ہر کوئی بیٹھ جائے...... درس وتدریس میں ایسے مفکر و مدبر جن کا فکر فراہیؒ وفکر مودودیؒ آج شرق وغرب میں پھیلے ہوئے ہزاروں دماغوں میں جھلک رہا ہے...... خدا کی آیات کا ایسا مفسر، جو دماغوں کا تجزیہ اور قلوب کا تزکیہ کرنے کی خوب مہارت رکھتا ہو۔

ایک عظیم استاذ

مولانا کی تدریس کا ایک خاص طرز یہ تھا کہ جتنا مواد پڑھاتے اس پر دورانِ تدریس ایسا ماحول تیار کرتے کہ طالبات بحث ومباحثہ کریں۔ اس طرح طالبات سارا سبق اپنے ذہنوں میں انڈیل لیتیں کہ دوبارہ کوئی بھولتا ہی نہیں۔ مولانا یک طرفہ تدریس کے قائل نہیں تھے بلکہ سوالات و جوابات کے ذریعہ ہی سبق پڑھاتے۔ تفسیر بیضاوی، حجۃ اللہ البالغۃ، بلاغت، جن طالبات کو یہ سبجیکٹ خشک محسوس ہوتے ان کی یہ کیفیت مولانا کے دو چار درس کے بعد ہی ختم ہوجاتی اور وہ بھی بحث میں اس طرح حصہ لیتیں کہ پھر پینتالیس منٹ کا پیریڈ بھی کم ہی لگتا۔ ایک ایک نکتہ اور ایک ایک بحث ایسا ازبر کروایا کہ کئی سال گزر جانے کے بعد بھی کس صفحہ پر کیا خاص کہا تھا سب یاد ہے ... مولانا اپنی طالبات کو دورانِ سبق خوش ہوکر انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اشعار سناتے تو اکثر مسدس حالی پڑھنا شروع کردیتے۔ روزانہ اخبار کے تعلق سے پوچھتے کہ آج کا اخبار کس کس نے دیکھا ہے؟ اور درس سے پہلے اس پر کچھ گفتگو کرتے اور بگڑتے حالات پر تشویش مولانا کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی۔

ایک دردمند دل

مجھ کو یاد ہے گجرات فسادات کے وقت تین چار مرتبہ دورانِ درس مولانا محترم جماعت میں زار و قطار رو پڑے تھے۔ شعائرِ اسلام کی بے حرمتی پر ہم نے مولانا کو بہت ہی غمزدہ پایا ہے۔ مولانا اتنے رنجیدہ نظر آتے جیسے یہ غم مولانا نے اپنے اندر اتار لیا ہو۔ مولانا کی بہت سی کتابیں اس تڑپ کی عکاس ہیں۔ غلبۂ اسلام کی راہ میں مطلوب قربانیوں کا ذکر تو لوگ اپنی تحریروں وتقریروں میں خوب کرتے ہیں، لیکن مولانا نے اپنے جواں سال فرزند کو اس راہ میں لٹا کر یہ رسمِ شبیری ادا کی۔ ایک مرتبہ فضیلت کے سال اول میں مولانا جماعت میں تشریف لائے لیکن طبیعت خراب تھی اور ہاسٹل کی بچیاں جانتی تھیں کہ ان دنوں مولانا بیمار ہیں، اس لیے ایک طالبہ نے کہا مولانا! آپ آرام کریں ہم لوگ خود سبق دہرا لیتے ہیں۔ مولانا کہنے لگے: ''ہمیں رکنا کسی حال میں نہیں ہے جی۔ ایسے موقعوں پر ہم اور تیزی دکھائیں، آخر آزمائش وامتحان اسی کا نام ہے۔'' میں نے مولانا کی زبان سے نکلے ہوئے جملوں کو اپنی اسی درسی کتاب پر قلم سے محفوظ کر لیا کہ واقعی زندگی کو برتنا اور اس ڈھنگ سے گزارنا اہم ہے جو ہر لمحہ بامقصد اور اللہ کی راہ میں سرگرم گزرے۔

یقیں محکم، عمل پیہم

کئی دینی جامعات کا قیام مولانا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ غیروں کی سازشوں پر مولانا صبر کی چٹان پائے گئے۔ لیکن جس چیز نے مولانا کو توڑ دیا تھا وہ اپنوں کی سازشیں تھیں، یہ صدمہ مولانا کو کمزور کر گیا تھا، کیونکہ جس راستہ میں خلوص، بے لوث خدمات اور قربانیاں گواہ تھیں اس پر سازشوں کا جال دیکھ کر وہاں سے خاموشی سے ہٹ جانا ایک دردمند دل اور ایک مخلص انسان کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا ہے۔ لیکن مولانا نے اس کے باوجود کسی سے بدلہ نہیں لیا اور نہ ہی شکوہ شکایات کیں، بلکہ اپنی فکر کی روشنی کو جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے نام سے جاری کر دیا۔ مولانا کا یہ انداز قرآنی تعلیمات کا آئینہ دار ہے، ''وافوض امری الی اللہ'' کی بہترین تعبیر ہے اور شرافت وعظمت کا بلند معیار ہے۔ آپ کی فکری وعلمی کاوشوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جذبے سچے اور تڑپ خالص ہو تو تنگ وتاریک راستے بھی کشادہ ہو جاتے ہیں اور اخلاص کی خوشبو چہار سو پھیل جاتی ہے۔

بیرون ملک اور ہندوستان کی کئی ریاستوں میں مولانا کی طالبات پھیلی ہوئی ہیں اور ہر جگہ تحریکِ اسلامی کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان شاء اللہ یہ طالبات نہ صرف مولانا کے لیے بہترین صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی بلکہ ملتِ اسلامیہ کے لیے عظیم سرمایہ ثابت ہوں گی اور امتِ مسلمہ کی سربلندی وسرفرازی کا ذریعہ بنیں گی۔

میں شاعر نعیم صدیقی کے یہ اشعار بطور خراج اپنے استاد محترم کے لیے پیش کرتی ہوں:

یا استاذی! چمن کو سجائیں گے تیرے بعد
جذبوں کے تازہ پھول کھلائیں گے تیرے بعد

تو نے جسے کشید کیا الکتاب سے
وہ بادۂ طہور لنڈھائیں گے تیرے بعد

اسلام کے نظام کو کردیں گے استوار
اس طرح تیری یاد منائیں گے تیرے بعد

یا اللہ! محترم استاد کی قبر کو منور کردے اور ان کو انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ شامل فرمادے۔
آمین!

مومنانہ اوصاف کا چلتا پھرتا نمونہ

عامرہ بیگم
بنت خواجہ سلیم الدین، حیدرآباد

آج قلم ہاتھ میں لیے ماضی کی یادوں کے سمندر میں غوطہ لگائے بیٹھی ہوں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ استاد محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحی مرحوم کی شخصیت ہمارے تعلیمی و تربیتی سفر کی رہنما ہے...... مولاناؒ کی محبت، شفقت اور خدمت کی بنا پر آج ہم اتنے قابل ہوئے ہیں۔ بہت ہی خوش نصیب ہیں ہم لوگ جنھوں نے اپنا تعلیمی سفر، مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کی نظامت میں طے کیا۔ مدرسہ کا ماحول ہر طرح کی رنجشوں اور کینوں سے پاک تھا... ہر طرف محبت ہی محبت تھی... ہر کوئی پڑھنے، پڑھانے میں لگا رہتا... اور تعلیم و تعلّم میں مصروف نظر آتا۔

ہم جب اعدادیہ میں تھے اُس وقت سے ہی ہماری تعلیم پر مولاناؒ کی خاص توجہ تھی۔ ہمیں مدرسہ کے صحن میں اسمبلی کے بعد روک کر کہا جاتا کہ اعدادیہ میں کون طالبہ سب سے پہلے گردان یاد کر کے سنائے گی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری کلاس جب پہلی بار روکی گئی تو سب سے پہلے میں نے ماضی کی گردان یاد کر کے سنائی تھی جس پر مولاناؒ نے مسکرا کر شاباش کہا تھا... پھر یہ روز کا معمول بن گیا...... ہم ہر دن اسمبلی کے بعد ایک سانس میں تین مرتبہ گردان سنانے کی مشق کرتے... اسی وجہ سے ہمیں گردان پختہ یاد کرنے کی عادت ہوئی۔

جامعہ میں جب بھی ہمیں کوئی پریشانی ہوتی اور یہ خواہش ہوتی کہ کوئی ہماری پریشانی کو سمجھے اور اسے حل کرے تو ہم مولانا محترمؒ کے پاس چلے جاتے۔ ایک مرتبہ ایگزام کے ٹائم ٹیبل میں مشکل سبجیکٹ ایک ساتھ رکھ دیئے گئے تھے، جس کی وجہ سے ہم بہت پریشان تھے کہ کیسے پڑھائی کریں گے... اس وقت ہم مولانا کے پاس گئے اور مولانا سے اپنی مشکل بیان کی مولانا نے فوراً ٹائم ٹیبل میں ردو بدل کر کے ہماری پریشانی کو دور کر دیا۔

اس طرح مولانا کا رویہ طالبات کے ساتھ اتنا ہمدردانہ ہوتا کہ طالبات بنا کسی ہچکچاہٹ کے اپنا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی مولانا کے سامنے رکھنے میں تأمل نہ کرتیں۔ طالبات کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مولانا ہمیشہ مستعد رہتے۔ ہمارا تعلیمی سفر صرف ایک تعلیمی سفر نہ تھا بلکہ تعمیر سیرت و کردار کا بھی سفر تھا۔ تعلیم

کے پہلو بہ پہلو سیرت کی تعمیر مولانا کا خاص ہدف ہوا کرتا تھا۔ ہمارا یہ تعلیمی وتربیتی سفر مولانا کی نگرانی میں چلتا رہا ... جہاں ہم نے مولانا کے مختلف اوصاف کا مشاہدہ کیا...... مولانا کبھی کسی پر غصہ نہ ہوتے...... کبھی غصہ کرتے تو بھی آواز بالکل دھیمی ہوتی...... محسوس ہی نہیں ہوتا کہ غصہ کر رہے ہیں۔ ہم جب بھی مولاناؒ سے بات کرتے تو دیکھتے کہ مولانا کی نگاہیں نیچے ہوتیں...... مولانا کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ شاید جنتی لوگ ایسے ہی ہوتے ہوں گے...... سفید رنگ والے، انتہائی نیک، نیچی نگاہیں رکھے ہوئے، نرم آواز سے بات کرنے والے، انتہائی مشفق اور رحم دل...... ماشاءاللہ! چھ سال کا طویل عرصہ ہم نے مولانا کی سرپرستی میں گزارا اور ہم نے جانا کہ مولانا کی زندگی مومنانہ اوصاف کا چلتا پھرتا نمونہ ہے۔ اللہ ہمیں بھی ان صفات کو اپنانے والا بنائے آمین! مولانا ہمارے لیے ایک مشفق باپ کی حیثیت رکھتے تھے...... ہمارے وہ ساتھی جو مولانا کی زندگی تک آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں رہے وہ بہت خوش نصیب ہیں۔

مولانا ہر علم میں ماہر تھے، مولانا ایک علم دوست شخصیت تھے اور علم والوں سے محبت کرتے تھے...... مولانا کی کوشش ہوتی کہ طالبات علم میں پختہ ہوجائیں...... عربی گرامر پر عبور حاصل کرلیں...... قرآن وحدیث میں تدبر وتفکر کی صلاحیت کی حامل ہوجائیں...... شعبۂ فضیلت میں مولانا نے ہمیں تفسیر بیضاوی پڑھائی تھی، تو آپ کا اندازِ درس ایسا ہوتا تھا کہ ہر بات نہ صرف اچھی طرح سمجھ آجاتی بلکہ دل ودماغ میں پوری طرح پیوست ہوجاتی۔ جب بھی میں کسی سوال کا جواب دیتی تو کہتے کہ ''عامرہ کیا سارے جواب تم ہی دوگی؟ دوسروں کو بھی موقع دو...... تم خاموش رہو۔''

مدرسہ سے فراغت کے بعد بھی مولانا مجھے بہت یاد کرتے تھے...... میری عربی گرامر میں مہارت سے بہت خوش ہوا کرتے تھے...... مولانا اپنے امتحانی پرچے جانچ کے لیے مجھے دیا کرتے تھے...... مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد بھی تحریری پرچے اور دیگر مضامین کے پرچے جانچ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ فراغت کے بعد مولانا سے ملاقات کے لیے میرا آنا ہوا تو مولانا نے مجھ سے کہا کہ ''کیا جی عامرہ! تم نے تو ہمارے مدرسہ کا بہت نام کردیا، M.A انٹرنس میں 98٪ مارکس لائی ہو تم۔'' میں حیران تھی کہ مولانا کیسے جانتے ہیں؟ پھر مولانا نے صدر معلمہ صاحبہ سے انٹرکام پر ربط کیا اور بولے کہ عامرہ کو ''اسٹاف روم میں پارٹی دو......'' اور پھر مجھے سارے اسٹاف نے پارٹی دی ...... اس واقعہ سے مجھے یہ پتا چلا کہ مولانا اپنی طالبات سے بے خبر نہ تھے...... ان کے حال احوال سے واقفیت رکھتے تھے...... ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے...... اور طالبات کو اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھا کرتے تھے...... انہی پاک اور پرُخلوص دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں الحمدللہ کامیابی کے مدارج طے کرتے جارہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ مولانا کی مغفرت فرمائے...... اور جلد سے جلد ملت کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک

تسنیم بانو
بنت سید داؤد صاحب، حیدرآباد

اللہ رب العزت کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم سب کو ایمان کی نعمت سے نوازا اور دینی تعلیم سے آراستہ کیا۔ خدایا! تیرے دین کے نام پر قائم ہونے والے رشتہ میں تو نے ایک ایسی اپنائیت رکھ دی ہے کہ تیرے دین کے نام پر جد وجہد کرنے والا ہر فرد اپنوں سے بھی بڑھ کر اپنا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نمناک آنکھیں جو مدت ہوئی سوکھ چکی تھیں، آج تیرے ایک نیک بندے کی رحلت پر اُبل پڑی ہیں۔ ہم تو بالکل ہی دین سے بے خبر تھے ہم تو دنیا کی تعلیم کو ہی تعلیم سمجھتے تھے مگر جب ہم پر اللہ کا فضل ہوا اور اس مدرسہ سے آشنا ہوئے تو اس نے ہمیں ایک خوشبودار پھول کی طرح کھلا دیا جو اپنی خوشبو سے پورے گلستان کو مہکا دے:

منزل علم کے ہم لوگ مسافر ہیں مگر
راستہ ہم کو دکھاتے ہیں ہمارے استاذ

ہمارے مولانا نے ہمیشہ ہمارے ذہنوں کو امتِ مسلمہ کی فکر میں مشغول رکھنے کی تاکید کی اور آپؒ خود بھی ہر لمحہ اسی فکر میں مشغول رہتے کہ نوجوانوں کو گمراہ ہونے سے کیسے بچایا جائے؟ کبھی اپنے قلم سے تو کبھی اپنے وعظ و نصیحت سے۔ آپ کا سب سے اہم وصف یہ تھا کہ ہمیشہ باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور ہر حال میں حق کا ساتھ دیتے۔ آپ ہمیں ہمیشہ نماز کی پابندی کا حکم دیتے، اپنے وقت کو قرآن وحدیث سمجھنے، دینی کتب کے مطالعہ کرنے میں صرف کرنے پر زور دیتے۔ سنتِ رسولؐ کو زندہ رکھنے اور ہمیشہ توحید پر قائم رہنے کی تاکید کرتے، عدل وانصاف کو قائم کرنے اور حق پر جم جانے کی تلقین کرتے، صبر وثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی

نصیحت کرتے۔

جب میں فضیلت کے سالِ آخر میں تھی اس وقت ملک میں NRC اور CAA کا مسئلہ چل رہا تھا اور ملک کے مسلمان اپنی شہریت کے مسئلہ کو لے کر بے حد مضطرب اور پریشان تھے اور احتجاج کا سلسلہ ملک بھر میں بڑھتا جارہا تھا۔ دورانِ درس ہم نے بھی اپنی بے چینی اور اضطراب کا اظہار کیا تو مولانا نے ہمیں سمجھایا کہ ''ایمان والوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔آپ انبیاءؑ کی پوری تاریخ پڑھ جایئے آپ کو ملے گا کہ ان کی قوم کے لوگ ان کی شہریت کے در پے ہو گئے تھے۔جیسے قومِ شعیبؑ نے شعیبؑ سے کہا کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا۔

قوم لوط نے کہا کہ أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ۔

اسی طرح مولانا نے کئی آیتیں پیش کیں۔''کسی ملک سے بے دخلی کیا بڑی بات ہے؟!'' ہمارے نبیوں نے بھی اپنے اپنے ملکوں کو چھوڑ کر ہجرت کی ہے اصل چیز ایمان کی حفاظت ہے۔'' اس پر ہم نے کہا کہ لوگ تو احتجاج کے دوران لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے نعرے لگانے سے بھی گریز کر رہے ہیں اور کچھ ایسی حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں جس سے ایمان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، تو مولانا نے کہا کہ ''ہمیں ہر حال میں ایمان کی حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ اس معاملہ میں اصل آزمائش ہمارے ایمان کی ہی ہے، شہریت کی نہیں۔'' اس طرح مولانا ہمیں تدبیر اور تدبر دونوں کی تاکید کرتے۔مولانا صرف ایک معلّم ہی نہیں بلکہ ایک رہنما، ایک مبلغ، ایک مجاہد، ایک قائد اور ایک اسوہ تھے۔مولانا کی زندگی ہمارے لئے قابلِ عمل نمونہ ہے۔آپ کا پڑھایا ہوا ہر سبق، آپ کی کی گئی ہر نصیحت، آپ کی کہی ہوئی ہر بات ہمارے لیے ایک بہت ہی عمدہ، بہترین اور قیمتی ذخیرہ ہے۔انشاءاللہ ہم مولانا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے مشن کو جاری رکھیں گے اور آپ کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

میرے استاذ......میرے مربی

عذریٰ سید
بنت سید مرابط الدین زاہد، دبئی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، میرے دل میں مولانا کا جو مقام ومرتبہ ہے اور میری زندگی میں آپ کی جو اہمیت ہے۔ شاید الفاظ اس کا حق ادا نہ کرسکیں، لیکن اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات ضرور آپ سے شیئر کرنا چاہوں گی۔

سب سے پہلے تو میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مولانا جیسے عظیم استاد کی سرپرستی میں علم حاصل کرنے والوں میں شامل فرمایا۔ آج میں جو کچھ ہوں اور تھوڑا بہت جو دین کا جذبہ میرے اندر موجود ہے وہ سب مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کے فیضانِ تربیت ہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ہمارے لیے ایک رہنما کی شکل میں بھیجا تھا۔ مولانا کی زندگی سے میں بہت متاثر تھی اور میں ان کی زندگی سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ مولانا میرے لیے آئیڈیل تھے۔ میں جب بھی مولانا سے ملاقات کرتی تو بڑے رشک سے دیکھا کرتی کہ اس مادہ پرستانہ زمانے میں دنیا میں ایسے بھی اللہ تعالیٰ کے بندے موجود ہیں جن کی زندگی کا واحد مقصد بس اس کی رضا اور اس کے دین کی خدمت ہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صرف میرے استاذ ہی نہیں بلکہ میرے راہبر ورہنما تھے جنھوں نے مجھے زندگی کا مقصد بتایا۔ مقصدِ حیات سے ناواقف جب میں نے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولانا کی سرپرستی میں زندگی کا ایک اہم حصہ گزارا تو مجھے زندگی کی حقیقت پتہ چلی۔ مولانا کی باعمل زندگی اور بے پناہ محبت وشفقت کے زیرِ سایہ

میری تعلیم وتربیت میرے لیے حیاتِ جاوداں کا سامان بن گئی۔ جامعہ میں گزارے ہوئے دن میری زندگی کے بہترین دنوں میں سے ہیں۔

مولانا نظامِ کفر وشرک کے زیرِ سایہ گزرنے والی زندگی پہ بےچین اور مضطرب رہتے اور چاہتے کہ ہماری زندگی کا ہر لمحہ نظامِ کفر وشرک کے خلاف برسرِ پیکار رہنے میں گزرے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میں فضیلت میں تھی تقریری امتحان کے لیے عنوان تھا۔ ''جمہوری نظام میں شرکت عقیدۂ توحید کے منافی ہے''۔

اس تقریری امتحان میں میں نے پہلا مقام حاصل کیا تو مولانا نے مجھے بلایا اور میری تقریر سنی، اس کے بعد جامعہ تشریف لانے والے ہر مہمان کو میری تقریر سنوایا کرتے۔ میں پردے کے پیچھے کھڑی ہوجاتی اور تقریر کرتی اور ہر مرتبہ میں نے دیکھا کہ مولانا کی آنکھیں نم ہیں، مولانا اس جمہوری اور سیکولر نظام میں شرکت کی قباحتوں کو میری تقریر میں سنتے اور چاہتے کہ اس کو سب لوگ سنیں۔ مولانا نے مجھ سے کہا تھا کہ ''یہ تقریر زیراکس کرواکر تقسیم کرو۔''

مولانا نے ایک ایسی بامقصد زندگی گزاری جو پوری امت کے لیے قابلِ رشک ہے۔ مولاناؒ کی سادگی، زہد وتقویٰ ہمارے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ مولانا کے اندر جو دینی جذبہ، جوش اور ولولہ تھا وہ مولانا کی محنت اور کاوشوں سے ظاہر ہوتا تھا۔

مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کا قیام بھی مولانا کی انہیں کاوشوں کی ایک زندہ مثال ہے نہ جانے میرے جیسی کتنی لڑکیوں کو اس مدرسہ کے ذریعہ مولانا نے ایک بامقصد زندگی سے آگاہ کیا۔ مولانا کا مقصدِ حیات توحید کے نور کو گھر گھر پہنچانا تھا۔ اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے آپ نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کو ایک ذریعہ کے طور پر اختیار کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ حق کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہے اور قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند کرتے رہے۔

آپؒ نے ہمیشہ حق کے لیے اپنی آواز بلند کی، آپؒ کج روی اور حق سے کنارہ کشی کرنے والوں کو حق کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتے۔ حق بات کہنے سے کبھی گھبراتے نہیں۔ جب بھی دینِ اسلام کو ٹھیس پہنچائی جاتی آپ برابر اس مسئلہ پر آواز اٹھاتے اور اس راہ میں آنے والی مصیبتوں اور مشکلات کو بڑے صبر وتحمل سے برداشت کرتے۔ آپؒ کی زندگی لوگوں کے لیے مشعلِ راہ تھی، جب آپؒ بات کرتے تو آپؒ کی گفتگو سچ کی قیادت کرتی اور آپؒ کی خاموشی رعب دار ظاہر ہوتی۔ آپؒ کے مواعظ دلوں کے زنگ کو ایسے دور کرتے جیسے صبح کی روشنی اندھیروں کو دور کرتی ہے۔ آپؒ بلند اور پاکیزہ اخلاق کا مجموعہ تھے۔ جو کوئی آپؒ سے ملتا اس قدر متاثر

ہوتا کہ دوبارہ ملنے کا خواہشمند ہوتا۔ آپؒ کی بہت سی خوبیوں میں آپ کے سادہ پن اور نرم دلی کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ مولانا کے وجود سے مستفید ہونے والے ہزاروں طلبہ وطالبات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کی زندگی قرآن وسنت کی عکاس تھی۔ اپنے علم کے ذریعہ آپؒ نے ہزاروں مردہ دلوں کو ایک بامقصد زندگی کی رہنمائی سے زندہ کردیا۔

مولانا آپؒ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے پتہ نہیں اس صدمے کو ہم کیسے برداشت کریں گے؟! جب بھی آپؒ کی یاد آتی ہے آنکھیں نم ہوجاتی ہیں، لیکن زندگی کی یہی حقیقت ہے، یہی رضائے الٰہی ہے۔ آپؒ کا سایہ تو ہمارے سروں سے اٹھ گیا لیکن آپؒ کی تعلیم وتربیت اور رہنمائی آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپؒ کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی کو پوری دنیا میں پھیلائیں اور آپ کے مشن کو آگے بڑھائیں۔

یااللہ! ہمارے مولانا سے راضی ہوجایئے۔ ان کی محنتوں کو قبول کرلیجیے۔ انھیں جنت الفردوس میں صالحین، صدیقین اور شہداء کا ہم نشین بنادیجیے۔ میرے مولانا زندگی بھر انبیاءؑ کی میراث کے امین رہے، آپ انھیں انبیاءؑ کے وارث کے طور پر انبیاء کا رفیق بنادیجیے۔ اور مولاناؒ کے تمام شاگردوں سے دین کا وہ کام لے لیجئے جو مولانا کے لیے ثوابِ جاریہ بن جائے۔ آمین!

جب تک آپؒ ہمارے درمیان موجود تھے ہماری زندگیوں کی زینت تھے اور جب آپؒ یہاں سے چلے گئے تو ہماری یاد، ہماری تحریر اور ہمارے تذکرہ کی زینت بن گئے۔

میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

قدسیہ رعنا
بنت خالد احمد باگ، گلبرگہ

27 ستمبر بروز منگل واٹس ایپ کے ذریعہ ایک جانکاہ خبر موصول ہوئی کہ استاذِ محترم فضیلۃ الشیخ مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمہ اللہ اب ہم میں نہیں رہے۔

خبر پر یقین کر پانا نہایت ہی مشکل امر تھا، خبر کی تصدیق کی تو مثبت جواب ملا۔ سن کر بہت دکھ ہوا، چند منٹوں کے لیے بالکل اندھیرا چھا گیا، ہاتھ کانپنے لگے، آنکھوں پر قابو نہ پاسکی آنسو نکل پڑے، اس جانکاہ خبر نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جب میری یہ کیفیت تھی تو پتہ نہیں استاذ محترم کے اہلِ خانہ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی! اللہ اعلم! مگر صبر و ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا اور قضا و قدر کے فیصلے پر راضی برضا ہوگئی۔ کیونکہ موت ایک اٹل اور نا قابلِ انکار حقیقت ہے جس کا تلخ جام ہر متنفس کو پینا ہے۔ سچ ہے **كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ** کا قانون ہر ایک پر لاگو ہوتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ رب العالمین شیخ محترم کے اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین یارب العالمین!

دنیا میں کچھ ایسی علمی شخصیات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ان کی یادیں، خدمات اور کارنامے فراموش نہیں کیے جاسکتے کیونکہ ان کے اندر کچھ ایسی اعلیٰ صفات و کردار ہوتے ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ ان کے عزم و استقلال کی داستانیں ہمیں مایوس کن حالات میں ہمت اور حوصلے فراہم کرتی ہیں۔ انہی سرفہرست علماء میں فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی تھے۔

مولانا ایک متحرک عالمِ دین تھے، کتاب و سنت کے آئینہ دار، علم و عمل کے علمبردار، صدق و صفا، محبت و شفقت کے پیکر، پرُ وقار، نرم لب و لہجہ، تحمل و بردباری سے پرُ، زندہ ضمیر اور حق گو انسان تھے......

مولانا ایک مایہ ناز عالمِ دین اور بلند پایہ مصنف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ غلبۂ اسلام کے لیے زبان و بیاں،

قرطاس وقلم اور جہد وعمل کے ہتھیاروں کا استعمال کیا کرتے تھے...... اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میدانوں کا عظیم شہسوار بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعوتی، تبلیغی، اصلاحی اور تعلیمی جہود کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور میزانِ حسنات میں شامل فرمائے آمین! یارب العالمین!

آپ امتِ مسلمہ کی خیر خواہی، کامیابی وکامرانی اور غلبہ وحکمرانی کے متلاشی تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؒ ہمیشہ ملتِ اسلامیہ کی حالت دیکھ کر بے چین اور بے قرار رہتے تھے آپ اس شعر کے مصداق تھے:

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

نعمتوں پر شکر گزاری، تکالیف ومصائب پر صبر وتحمل آپ کا شیوہ تھا۔ آپ کی حیات میں کئی مصیبتیں اور تکلیف دہ موڑ آئے، لیکن "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کو ذہن میں رکھ کر بڑے ہی صبر وتحمل اور ثابت قدمی سے آپ نے ان کا سامنا کیا۔

جامعۃ البنات کے لیے آپ کی خدمات مثالی اور نا قابلِ فراموش ہیں۔ ہمیشہ جامعہ کی تعلیم وترقی کے لیے فکر مند اور کوشاں رہتے تھے۔ ہاسٹل کی طالبات کی بڑی فکر کرتے تھے اپنے کھانے سے پہلے بچیوں کے کھانے کی فکر کرتے تھے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ چاچی بھی ہم طالبات کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

آپ نے اپنی اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت کی، جس کی وجہ سے وہ آپ کے ساتھ ہر موقع پر شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ خاص طور پر آپ کی ہمرکاب آپ کی دختر اور میری معلمہ 'ظل ہما' جو اپنے والد محترم کی طرح بلند حوصلہ رکھنے والی اور غلبۂ اسلام کے لئے جد وجہد کرنے والی دلیر مجاہدہ ہیں، مولانا سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی تو آپ ہمیں اچھے اخلاق وکردار کو اپنانے، توحید پر قائم ودائم رہنے اور دعوت وتبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کی وصیت کرتے تھے جو ہمارے دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ جامعہ کی اکثر وبیشتر طالبات مولانا کی اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دعوت وتبلیغ کے کام کو اللہ کی توفیق سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور مولانا کے مشن کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

مولانا سے ملنے کی خواہش تو بہت تھی لیکن میری بدنصیبی کہ مشفق مولانا سے مل نہ سکی، جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آپ کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم طالبات کو اور اہلِ خانہ کو صدقۂ جاریہ بنائے اور سبھوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

آہ! گلستانِ اصلاحیہ کے باغبان

فوزیہ ثنا کوثر
بنت محمد یوسف احمد قاسمی، بھاگلپور
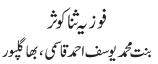
استاذ الاساتذہ، مشفق ومربی، استاذی ناظم جامعۃ البنات الاصلاحیہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کی شخصیت کالقمر بین النجوم اور کالشمس فی الضیاء ہے۔ آپ علمی میدان میں بلند قامت رجال میں سے تھے آپ دینی وعلمی، معروف ومشہور شخصیت تھے۔ اکابر علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ذہانت وفطانت اور ذکاوت کے ساتھ ساتھ ملت کے مسائل کے حل کا ملکہ بھی عطا فرمایا تھا۔ آپ ملت کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ آپ نے قوم وملت کی فلاح وصلاح کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، ان کے مسائل کے حل میں اپنے آپ کو گھلاتے رہتے تھے اور ان کی کامرانی کے لیے راہیں تلاش کرتے رہتے تھے۔

آپؒ کا تعلق ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ سے تھا جو فی زمانہ علم کا گڑھ ہے۔ جہاں بڑے بڑے جبال العلم اشخاص پیدا ہوئے۔ مولانا محترم بڑی متانت اور متحمل مزاج اور بڑی عاجزی، انکساری اور فروتنی اختیار کرنے والے تھے۔ اپنی ذات کو دوسروں پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ اپنے کو ایک عام شخص گردانتے تھے حالانکہ بڑے دقیق العلم اور بلیغ العلم تھے۔ اور بڑے باریک بین اور علم میں بڑی گہرائی، گیرائی اور عمق رکھتے تھے۔ بہت سے کمالات وجمالات سے آپ کی ذات مزین اور مرصع تھی۔ تصنع کاری، ملمع سازی سے کوسوں دور تھے۔ آپ انسان ساز تھے آپ کو لوگوں کی کردار سازی میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ آپ کی دینی وملی خدمات کئی دہوں پر محیط ہیں۔ آپ اپنی علمی اور فکری، خدمات وکمالات سے پوری ملتِ اسلامیہ کو خاص کر

شہریانِ حیدرآباد کو فیض یاب کرتے رہے۔ اپنے علم کے موتی لٹاتے رہے اور اپنے دریائے علم سے سیراب کرتے رہے۔ آپ ایک عدیم المثال مصنف بھی تھے۔ آپ کی تحریریں لوگوں کی علمی تشنگی کو بجھانے اور فکری ژولیدگی کو صحیح اسلامی نہج پر استوار کرنے کا باعث بنیں۔ مزید براں آپ قوم وملت کی خدمت کے لیے ہمیشہ کوشاں اور پیش پیش رہے اور اس کے ساتھ ساتھ کئی تحریکوں کے روح رواں بھی رہے۔ آپ بڑے بے باک، حق گو اور باطل شکن تھے، آخری دم تک حق کی سربلندی کے لیے جہد مسلسل اور سعی پیہم کرتے رہے۔

ملت کے لیے آپ کی خدمات بےلوث و بےمثال تھیں۔ چار دہوں سے دخترانِ ملت کی دینی اور اخلاقی تعلیم کے لیے آپ نے جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی۔ الحمدللہ مجھے مولانا سے عربی ادب، تفسیر بیضاوی اور حجۃ اللہ البالغۃ پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔

27ر ستمبر کی دوپہر بڑی غمناک اور اندوہ ناک رنج والم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب یہ آفتابِ علم افقِ عالم پر اپنے علمی کمالات وجمالات کی چمک دمک کو چھوڑ کر اپنی زندگی کے نوّے خوشنما و دلکش سال گزار کر غروب ہوگیا۔

آپ اپنے علم کی روشنی اور اپنے اخلاق کی خوشبو بکھیر کر، ہم سبھوں کو روتا بلکتا آہیں بھرتا چھوڑ کر، اپنے پیچھے لاکھوں غمزدوں کو بےقرار کر کے اور گلستانِ اصلاحیہ کو سنسان کر کے سوئے آخرت چل پڑے۔

بارِ الٰہ! ہمارے مولانا کی قبر پر گل افشانی فرما، انہیں غریقِ رحمت فرما اور ہمیں صبرِ جمیل اور بہترین نعم البدل عطا فرما۔ آمین!

آسمانِ علم کا اک روشن ستارہ غروب ہو گیا

نصرت فاطمہ
بنت محمد اسحاق قاسمی، جھارکھنڈ

اس عالم آب وگل میں جو بھی آتا ہے جانے کے لیے ہی آتا ہے اور ہر جانے والا اپنے پیچھے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کو سوگوار چھوڑ جاتا ہے لیکن جانے والوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے جانے سے صرف رشتہ دار اور تعلق والے ہی اشک بار اور مغموم نہیں ہوتے، بلکہ ان کی رحلت ہر خاص وعام کلمہ گو انسان کے لیے ایک عظیم صدمہ اور حادثہ فاجعہ بن جاتی ہے۔ ایسے ہی جانے والوں میں حیدرآباد کے مشہور ومعروف عالم دین، عظیم داعی اور میرے مربی واستاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نور اللہ مرقدہ بانی وناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کی ذات گرامی بھی ہے۔ بلاشبہ حضرت مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات ملت اسلامیہ کے لیے ایک بہت ہی بڑا خسارہ اور علمی حلقوں کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ آپؒ کی وفات سے پوری علمی دنیا ایک تناور شجر سایہ دار سے محروم ہو گئی ہے۔ مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ ایک قابل قدر ومنزلت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بہت ہی خوش مزاج، نرم طبیعت اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ اپنے ذاتی اوصاف اور امتیازات کی بناء پر بہت ہی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

آپ کا مزاج اعتدال وسلامتی والا، گفتگو بے حد متین اور لب ولہجہ بہت شیریں تھا۔ آپ خدا ترس، ولی صفت، نیک سیرت انسان تھے۔ صبر وشکر اور تسلیم ورضاء کے پیکر تھے، قلب وجگر میں ملت کا درد رکھتے تھے۔ دل ہمیشہ خشیتِ الٰہی سے موجزن اور زبان ذکرِ خدا سے معمور رہتی تھی۔

مولاناؒ مرحوم کی زندگی قابلِ رشک تھی آپؒ ساری زندگی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف سے وابستہ رہے اور دعوت واصلاح کے کام انجام دیتے رہے۔ کبھی کوئی چیز اس راہ میں مزاحم نہ ہو سکی......غرض اقامتِ دین،

دعوتِ دین اور خدمتِ دین کے لیے آپؒ کی شبانہ روز محنت اور لگن، آپ کی استقامت اور بہادری نئی نسل کے لیے ایک منارۂ نور اور مشعلِ راہ بنی رہے گی۔ آپؒ کی شخصیت اپنی پون صدی پر مشتمل جہدِ مسلسل اور علمی اشتغال کے باعث اسلاف کی یادگار کی حیثیت سے ہمیشہ ملت کے دلوں میں زندہ رہے گی۔

وہ ایک تھے مگر کارواں لگتے تھے
وہ تھے خاک نشیں مگر آسماں لگتے تھے
پیکرِ عشق و وفا، مجسمۂ صبر و رضا
وہ استقامت کے کوہِ گراں لگتے تھے

قدرت نے آپؒ کے اندر عجب کشش رکھی تھی اگرچہ کہ آپ کم گو تھے، مگر آپ کی شخصیت اور آپ کے چہرے پر تقدس کا جو نور تھا وہ مخاطب کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ آپ کی باتیں مخاطب کے دل میں پیوست ہوجاتی تھیں۔ لوگ آپ کے اخلاص اور للّٰہیت سے بے حد متاثر ہوجاتے تھے۔ آپ حق گوئی اور بے باکی میں بے مثال تھے۔ اس باب میں آپ کسی شخصیت، ادارے، جماعت اور نظام سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ مولانا مرحوم ہم طالبات کے ساتھ بڑے ہی مشفقانہ انداز سے پیش آتے تھے۔ کبھی بھی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں لیتے تھے۔ دورانِ اسباق بڑی محبت سے نصیحتیں فرماتے تھے کہ ''نماز ہمیشہ وقت پر ادا کریں، اپنے بڑوں کا ادب واحترام کریں، اپنی زبان کو بڑی احتیاط سے استعمال کریں، کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائیں، ہمیشہ پردے کا اہتمام کریں، اپنے اندر وہ خوبی اور کمال پیدا کریں کہ ''المرأۃ الصالحۃ'' کا مصداق بن سکیں۔''

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

انشاءاللہ! مولانا کے پڑھائے گئے اسباق اور نصیحتیں ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے اور زندگی کے ہر موڑ پر ان سے رہنمائی لیتے رہیں گے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ، وادخلہ جنۃ الفردوس الاعلیٰ مع الابرار والصدیقین وعباداللہ الصالحین آمین!

تری لحد پہ خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہنچے

ادیبہ کونین
بنت انیس احمد، مہاراشٹرا

میرا تعلق مہاراشٹرا سے ہے...... جہاں جماعت اسلامی کا جال بچھا ہوا ہے...... ہمارے خاندان میں کئی لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں میرے بزرگوں نے میرا ایڈمیشن 2014ء میں ملک کے نامور عالمِ دین مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد میں کروایا۔ یہ سال میری زندگی کا بہت ہی قیمتی سال ثابت ہوا...... میں اپنے محسنین کی بے حد شکر گزار ہوں، خاص طور سے جماعت اسلامی کے فعال رکن جناب ابراہیم خان صاحب اور محترم کی صاحبزادی عمارہ فردوس صاحبہ کی......جن کی کوششوں سے میرا داخلہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ میں ممکن ہوا......اللہ ان حضرات کو جزائے خیر سے نوازے آمین!

ہمارے تعلیمی دور میں ہمارے علاقہ سے ہم تین لڑکیاں تھیں......مولانا محترم اکثر ہماری خیر خیریت پوچھا کرتے اور تعلیم سے متعلق جانکاری حاصل کرتے...... پوچھتے کہ پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ ہاسٹل میں ناشتہ کیا یا نہیں؟ آپ نے خاص ہمارے لیے روٹی پکوانے کا انتظام کیا تھا...... ہمیشہ پوچھا کرتے کہ ہاسٹل میں کوئی پریشانی تو نہیں......اچھا پڑھنے کی نصیحت فرماتے کہ ''تم لوگ اتنی دور سے آئی ہو اچھا پڑھ کر جانا......''

مولانا کی اولین ترجیح جامعہ تھا آپ کی زندگی میں جامعہ کو اولین حیثیت حاصل تھی......مولانا ہاسٹل کی طالبات کے لیے بہت فکر مند رہا کرتے تھے......ان کے کھانے کے تعلق سے نگران باجیوں سے ہمیشہ پوچھا کرتے تھے......آپؒ ہاسٹل کی طالبات کی تعلیم کے لیے اس قدر فکر مند ہوتے کہ اکثر اتوار کو صبح سویرے ہاسٹل آجایا کرتے اور ہماری کلاس لیتے......اور چھٹی کے دن بھی آرام نہیں کرتے تھے۔

مولانا اپنی اُس طالبہ سے بے حد خوش ہوتے تھے جس کے بارے میں سنتے کہ وہ دینی و علمی کاموں میں سرگرم عمل ہے......اُسے دعاؤں سے نوازتے اور ہم طالبات کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے۔اس دارِفانی سے مولانا کے کوچ کر جانے کی خبر سنی تو ایسا لگا جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہو جب بھی ہمیں مدرسہ کا خیال آتا، مولانا آفس میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے مسکراتے نظر آتے، جامعہ کے نام سے پہلا تصور ہمارے ذہنوں میں یہی آتا ہے لیکن اب مولانا کی مخصوص کرسی کے خالی ہو جانے کا تصور کر کے دل درد سے بھر جاتا ہے......ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مولاناؒ اپنے گلستاں کو یوں ویران کر کے چلے جائیں گے.....انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ نے مولانا کو انبیاء و رسلؑ کا حقیقی وارث بنایا تھا جیسا کہ انبیاءؑ اپنی قوموں کے معلّم بنا کر بھیجے گئے تھے......مولانا نے نبیوں ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو معلمی کے پیشے سے وابستہ کر لیا تھا۔ ہر نبی کا جو مقصد اور نصب العین تھا مولانا نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا...... أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ، يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ"

ہر نبی نے اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت اور طاغوت سے اجتناب کی دعوت دی۔

مولانا کی ساری زندگی دعوت کے اس فریضہ کی ادائیگی میں گزری، مولانا نے نہ صرف اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ قوم کو یہ دعوت دی بلکہ آپ نے عملی جدوجہد کے ذریعہ ایک ایسی ٹیم تیار کرنے کی کوشش کی جو اس دعوت اور پیغام کی حامل ہو، اس کے لیے مولانا نے قوم کی بیٹیوں کو منتخب کیا۔ مولانا نے قوم کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اسی نہج پر کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کر دیا۔ مولانا نے اس انبیائی فریضہ کا امین انھیں بنایا تاکہ وہ اپنی نسلوں کی اس نہج پر تربیت کر سکیں لہٰذا آپ دیکھیں کہ ملک کے طول و عرض میں مولانا کی طالبات بے شمار خاندانوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اپنے خاندانوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز میں کر رہی ہیں کہ ان کے اندر صحیح غلط اور حق و باطل کا شعور پروان چڑھے۔

برستے ہیں یہ ساون کی طرح پیاسی زمینوں پر
انھیں کے فیض سے اجڑے چمن آباد ہوتے ہیں

مولانا کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو جو مجھے نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

مولانا نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں بہت ہی مشکل حالات کو نہایت صبر و سکون سے برداشت کیا......آپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ اپنے کردار سے، اپنے اخلاقِ کریمانہ سے سنتِ اسلاف کو زندہ کیا۔ مولانا کی شخصیت کی خوبصورتی مولانا کی شفقت، نرم کلامی اور اعلیٰ ظرفی ہے جس کا تذکرہ آج ہر کوئی کر رہا ہے......اس اعتبار سے

ہم طالبات بہت زیادہ خوش قسمت ہیں کہ الحمدللہ ہماری تعلیم وتربیت ایک ایسی ہستی کے ہاتھوں ہوئی جو آسمانِ علم کے سورج تھے، علمِ دین کے بہترین شہسوار تھے اور اخلاق وکردار کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے......

مولانا کی بے مثال شخصیت اور آپ کے کارناموں کا احاطہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے نہ مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ میں آپؒ کی حیات وخدمات اور صفات وکمالات کو بیان کرسکوں۔ میں نے بس اپنے محسن، اپنے مربی، اپنے معلم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور آپؒ کی روح سے یہ عہد کرنے کے لیے قلم اٹھایا ہے کہ ہم آپؒ کی دی ہوئی تعلیم وتربیت کو ضائع نہیں کریں گے......آپ نے جو قرآنی، فکری، نظریاتی روح ہم میں پھونکی تھی، ہم اسے باقی رکھیں گے۔ آپ جس راہ کے راہی تھے ہم بھی اسی راہ پر چلیں گے......دین کی خاطر آپ نے جو مشقتیں، تکالیف اور پریشانیاں برداشت کی تھیں اگر دین کی خاطر ہماری زندگیاں بھی ان سب سے دوچار ہوں تو ہم آپ کی طرح انھیں خندہ پیشانی اور صبر وسکون سے برداشت کریں گے، لیکن دینِ حق کی راہ سے سرِمو انحراف نہیں کریں گے۔ ہم بھی آپ کی طرح کبھی ہمت نہیں ہاریں گے۔ ان شاءاللہ

اے اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے مولانا نے پورے اخلاص، للّٰہیت، محنت، لگن، محبت اور پیار سے اپنے فریضہ کو ادا کیا۔

اے اللہ! مولاناؒ کی اس جہدِ مسلسل کو اپنے یہاں شرفِ قبولیت عطا فرمائیے اور انھیں انبیاء، صدیقین، صالحین اور شہداء کی معیت نصیب فرمائیے۔ (آمین)

استاذِ محترم کی شخصیت میری نظر میں

امروز فاطمہ
بنت محمد امتیاز، حیدرآباد

"كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" (ہرنفس، ہرجاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔) یہ ایسی تلخ حقیقت ہے جسے ہر جاندار کو تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ اللہ کے بندوں میں بعض پاکیزہ نفوس ایسے ہوتے ہیں جو دنیا سے تو رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے مولانا محترم کی شخصیت انہی نفوسِ قدسیہ میں سے ایک ہے۔

میں 2019ء میں مولانا کی شاگردہ رہ چکی ہوں ...... میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مولانا حضرتؒ کو ہی "مولانا" کہہ کر مخاطب کیا تھا...... میرے مولانا علم کا سمندر تھے، جب ہم درس لینے جاتے تو مولانا ہمیں علمی بحث کے علاوہ حکمت کی باتیں بتایا کرتے تھے...... آپ کی باتوں سے یہ واضح تھا کہ آپ بہت دور اندیش شخص ہیں...... امت پہ جو حالات آنے والے ہیں اپنے علم وبصیرت سے اس کی پیشین گوئی کیا کرتے تھے...... کچھ ہی دن بعد ہم حالات کو بالکل ویسے ہی پاتے جیسے کہ مولانا کے الفاظ ہوتے۔

میں عربی زبان سے بالکل نابلد تھی، عربی تو دور کی بات تھی مجھے اردو زبان بھی ڈھنگ سے نہ آتی تھی۔ میں نے مولانا کے مدرسہ جامعۃ البنات الاصلاحیۃ (ملک پیٹ) میں جب ایڈمیشن لیا تو تب اُردو زبان کی کئی غلطیوں کی اصلاح ہوئی اور عربی زبان سے بھی واقفیت ہوئی...... حتیٰ کہ آج میں نے جو قلم اٹھایا ہے وہ بھی مولانا ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ہم نے یقیناً ایک علم کے بادشاہ کو کھو دیا ہے لیکن آپ کا مشن ہم نہیں بھول سکتے...... آپ کا مدرسہ

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ ہمیں اس مشن کی ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا...... کہ مولانا کو ہم طالبات سے کیا توقعات تھیں......

مولانا تادمِ آخر اسی فکر میں رہے کہ کیسے امت کی بچیوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کریں...... آپؒ نے امت کی بچیوں کو ہی نہیں بلکہ اپنی بیٹیوں کو بھی اس طرح علم سے آراستہ کیا ہے کہ علم کے میدان میں ملت کی بچیاں ان سے ہمیشہ فائدہ حاصل کرتی رہیں گی...... انشاء اللہ!

میرا ذاتی مشاہدہ مولانا کے تعلق سے یہ تھا کہ میں نے مولانا کو مدرسہ میں اپنے فرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں اس قدر مستعد پایا کہ آپ کی روٹین پر کسی موسم کا کوئی اثر کبھی نہیں ہوتا تھا...... موسم سرما ہو یا موسم گرما...... کسی موسم کی سختی مولانا کو مدرسہ آنے اور اپنی طالبات کو پڑھانے سے روک نہیں سکتی تھی...... اس کے علاوہ بارش کا موسم جب آتا تو ہم طالبات اس کا بہانہ بنا کر مدرسہ سے غیر حاضر ہونے کا موقع ڈھونڈتی تھیں، لیکن مولانا حضرتؒ ہم سے پہلے مدرسہ حاضر ہوجاتے...... یہ دیکھ کر میں حیرت میں مبتلا ہوجاتی کہ ماشاء اللہ! ہمارے مولانا اس ضعیفی میں بھی اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کتنے چاق و چوبند ہیں، جبکہ میں نے اپنے خاندان کے ضعیف حضرات کا بھی مشاہدہ کیا ہوا ہے میں دونوں کا موازنہ کرنے لگتی تھی کہ میرے ابو، میرے نانا، دادا کی اس عمر میں کیا ترجیحات ہیں اور مولانا کی ترجیحات کیا ہیں؟! میرے ابو کو دنیا کمانے کی فکر گھیرے ہوئے تھی تو دادا، نانا کو وقت پر کھانے، وقت پر سونے، وقت پر دوائی اور اپنی بیماریوں سے پریشانی اور ان سے نجات کی فکر نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ میں اپنے گھر لوٹتی تو اپنے ان بزرگوں کو حوصلہ دلاتی اور ان کو مولانا کی کیفیت سے آگاہ کرتی کہ کس طرح مولانا اپنے ناتواں، بوڑھے جسم کے ساتھ مدرسہ آتے ہیں اور قوم و ملت کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت میں اپنے دل دماغ، قوت، سوچ و فکر کو لگاتے ہیں...... میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ہم میں کا ہر بوڑھا، ہر جوان مولانا کے اوصاف سے متصف ہوجائے تو مسلمانانِ ہند کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ انشاء اللہ!

اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ ہمیں مولانا کے مشن کو آگے بڑھانے کی صلاحیت عطا فرمائے اور ہماری مدد فرمائے، مولانا کے درجات کو بلند کرتے ہوئے ہمیں مولانا کے حق میں بہترین صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین!

روحانی والد

عرفانہ نمازی، گلبرگہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃُ. (التوبۃ)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔''

مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ جامعہ کی طالبات اور ہاسٹل کی طالبات کے لیے ایک سرپرست، ایک استاد اور روحانی والد کی حیثیت رکھتے تھے......مولانا محترم کے انتقال کی خبر سنتے ہی دل غم سے نڈھال ہوگیا......کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت نہ رہی......اور ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے قدرت نے ہمیں ایک بار پھر یتیمی کے اندھیرے سے دوچار کردیا ہے......

میں عرفانہ نمازی ہوں......میرا نام پڑھ کر آپ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی ہوگی......جی ہاں، میرا نام عرفانہ نمازی ہے جسے سن کر میرے مولانا بھی مسکرایا کرتے تھے...... مجھے میرے نام پر فخر ہوتا تھا...... جب مولانا مسکرایا کرتے تو اُس فخر میں مزید اضافہ ہوجاتا......مولانا کی پدرانہ شفقت ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مدرسہ میں داخلہ کے وقت ہم اپنے سایۂ پدری سے محروم ہوچکے تھے جس کا بہت زیادہ غم محسوس ہوتا تھا لیکن مولانا کی سرپرستی اور شفقت میں آنے کے بعد ہمارا غم کم ہوگیا......مولانا ہمارے روحانی والد تھے......نہ صرف میرے بلکہ مجھ جیسی کئی طالبات کے۔

میں مدرسہ سے دور ہونے کے باوجود اپنی ہم جماعت ساتھیوں سے مولانا کی خیریت دریافت کرتی...... آپ کی صحت کا سُن کر فکر مند رہتی تھی......جب سنتی کہ مولانا خیروعافیت سے ہیں تو اطمینان ہوتا اور دعاء کرتی کہ

اللہ مولانا کو ہمارے لیے صحیح سلامت رکھیے...... عافیت سے رکھیے کہ ہم جیسی بہت سی طالبات کو ابھی آپ کی سرپرستی کی سخت ضرورت ہے۔

الحمدللہ! آج مجھے اور مجھ جیسی بہت سی طالبات کو بحیثیت عالمہ جو مقام و مرتبہ اور عزت و احترام دنیا میں حاصل ہو رہا ہے وہ مولانا کی ریاضتوں اور محنتوں کا ہی ثمرہ ہے۔ مولانا کی محنتوں کی وجہ سے ہی ہم دنیا کی آسانیاں اور خوشیاں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے ہیں ورنہ ہماری حیثیت ہی کیا تھی؟! انشاءاللہ مولانا کی یہی محنت آخرت میں بھی ہمارے کام آئے گی اور وہاں بھی ہم فیض اٹھائیں گے۔

مولانا نے اپنے ثواب جاریہ کے لیے جہاں بہت سی چیزیں چھوڑی ہیں ان میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں ایک مولانا کی علمی جیتی جاگتی تصنیفات یعنی طالبات اور دوسری آپ کی قلمی تصنیفات یعنی کتابیں۔ انشاءاللہ یہ دونوں چیزیں تاقیامت مولانا کے ذخیرۂ حسنات میں اضافہ کرتی رہیں گی۔

مولانا محترم کی علمی قابلیت، تصنیفی صلاحیت اور قرآن وحدیث کے علم میں مہارت کے بیان سے قلم قاصر ہے۔ لیکن مولانا کی شخصیت کی دلکشی کا نقشہ اگر ایک جملہ میں کھینچوں تو وہ یہ ہوگا کہ مولانا محترم ایک سنجیدہ، باوقار، پرسکون، مصیبتوں پر صبر کرنے والے، صابر و شاکر شخص تھے...... جن کی زندگی مذکورہ بالا آیت کے مصداق تھی...... آپ نے اپنی صلاحیت، مال واولاد اور اپنی تمام عمر کو اللہ کی راہ میں کھپا دیا...... اور دنیا کی عارضی زندگی کے بجائے، آخرت کی ابدی فوز وفلاح کو خرید لیا...... جنت کے حقدار بنے...... نحسبہ کذالک۔

ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ اے اللہ مولانا کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمایئے...... آپ کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دیجئے...... اور ہمیں مولانا کے لیے ثوابِ جاریہ بنا دیجئے......

آمین یارب العالمین!

جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے

الدکتورۃ عطیہ کریم
بنت خواجہ سلیم الدین، حیدرآباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ اور جامعۃ البنات ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں...... جامعہ کا نام لوتو مولانا یاد آتے ہیں اور مولانا کا نام لوتو جامعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مولانا ایک معروف شخصیت ہیں...... رعب دار اور نورانی چہرے والے...... سنت کے مطابق لباس زیب تن کرنے والے کہ جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے...... مولانا ہم سب طالبات کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے...... باپ کی طرح مشفق، رحم دل تھے ...... طالبات میں علمی قابلیت کو پروان چڑھانے میں مولانا کا بہت بڑا حصہ ہے...... مولانا عربی ادب پڑھاتے وقت ہم طالبات کو اعراب لگانے اور ترجمہ کرنے کی مشق اس طرح کراتے کہ اس کا اثر آج تک باقی ہے...... ہم سے عربی گرامر کی باریکیاں سبق کے دوران پوچھا کرتے جس سے ہمارا شوق مزید بڑھ جاتا تھا، جوابات دینے والی طالبات کو سراہتے تھے...... مولانا محترم کا مجھ پر بہت بڑا احسان یہ ہے کہ دورانِ تعلیم ہی میری شادی ہوگئی جبکہ میں نے اپنا عالمہ کا دوسرا سال مکمل کیا تھا...... اور مدرسہ کے اوقات میں آکر تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا...... تب میں نے مولانا سے درخواست کی تھی کہ مجھے تعلیم جاری رکھنے کے لیے صبح گیارہ بجے آنے کی اجازت دیں...... مولانا نے میری مشکل کو دور کرتے ہوئے مجھے اجازت دی اور میں نے اپنا عالمیت مکمل کیا...... مولانا اسی طرح ہم طالبات کی مشکلات دور کرتے اور آسانیاں فراہم کرتے تھے۔ اللہ قبول فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا کی آخرت کی مشکلات کو آسانیوں میں بدل دے۔ اپنے نیک بندوں میں شامل کرلے اور ہم سب کو مولانا کے لیے ثوابِ جاریہ بنادے۔ (آمین)

آہ مولانا چل بسے!

رخشندہ کوکب ارجمند، حیدرآباد

مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ہمارے ''علیم مولانا'' بے انتہا قابل، جید، مشفق، نرم خو نرم گفتار، معاملہ شناس غرض کیا کیا لکھوں......مولانا چل بسے......مگر دل چاہ رہا ہے کہ مولانا ابھی اور ہم میں ہوتے تا کہ یہ لفظ ''انتقال'' سننے کو نہ ملتا......دل اتنا مغموم ہے کہ نا قابلِ بیان ہے۔ مولانا ناظم جامعہ تھے مگر انداز اتنا سادہ اور بے لوث تھا کہ انسان آپ کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے......الفاظ جو آپ کی زبان سے ادا ہوتے مثلِ موتی ہوتے...... تقویٰ و پاکیزگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی......کبھی نظر اٹھا کر بات نہ کی...... ہمیشہ نظریں یا تو نیچی رہتیں یا ادھر ادھر......ربِ کریم مولانا کی حسنات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ انھیں اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، جنت الفردوس کے وارثین میں شامل فرمادے، آمین۔

چونکہ والدین سے بہت قریبی روابط رہے ہیں تو میری ازدواجی زندگی کے لیے بھی مولانا کا بہت ہی خیرخواہانہ مشورہ رہا۔ الحمدللہ! جو بارہا مولانا کی یاد دلاتا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

رہبرملت: مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فاطمۃ الزہراء
بنت فاروق خان، جودھپور

استاذ محترم ومکرم مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب ۲۷ر ستمبر ۲۰۲۲ء کو اس دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی یادِ فرقت کچھ اس قدر شدید ہے کہ قلم اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہورہی ہے۔ دنیا سے ایک روشن ستارہ چلا گیا، ایک ایسا درخشاں سورج چلا گیا جس کی اس دورِ ظلمت میں شدید ضرورت تھی۔

مولانا ایک ایسی ہستی تھے جنھوں نے بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھائی۔ بے کسوں کو سہارا دیا، مظلوموں کا ساتھ دیا، ہر ظلم کے آگے ڈٹ کر ظلم کا دھارا موڑ دیا، کئی نوجوانوں کو دین کا بے باک اور نڈر سپاہی بنادیا اور لڑکیوں کی قائدانہ ومجاہدانہ صلاحیت کی حامل ایک ٹیم تیار کردی۔

آج جب کہ میں آپ کی سیرت وکردار کا خاکہ سپردِ قرطاس کرنا چاہ رہی ہوں تو سمجھ نہیں آرہی ہے کہ آپ کی سیرت کے کن کن پہلوؤں کو بیان کروں!! میں صرف چند نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گی۔

☆......آپؒ کی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو آپؒ کی مربیانہ صفت ہے۔ آپؒ نے لاکھوں لوگوں کی تربیت کی۔ یہ آپ کے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کے شاگرد دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے کام میں جٹ گئے اور شہر شہر، قریہ قریہ لوگوں کی اصلاح کا کام کررہے ہیں۔ رات کی تاریکیوں اور دن کے اجالوں میں آپ پر سلامتی ہو۔

☆...... ہمارے مولانا ومربی عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ کا اندازِ گفتگو اتنا مؤثر اور قرآن وسنت اور سیرت کے واقعات سے مزین ہوا کرتا تھا کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ آپؒ کے وعظ ونصیحت میں ایک ایسا جادو تھا جس کو سننے کے بعد لوگوں میں عمل کرنے کا جذبہ خود بہ خود بیدار ہوجاتا تھا۔

☆......مولانا بڑے ہی مہمان نواز، خوش اخلاق، جرأت مند، شیریں مقال، مونس وغم خوار تھے۔ آپؒ بڑے ہی نیک اور متقی انسان تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہادر اور نڈر بھی تھے۔ اپنے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ اسلام کی سربلندی کے لیے ہر لحہ کوشاں رہتے، آپؒ اقبالؒ کے اس شعر کا حقیقی مصداق تھے کہ

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

☆......استاذ الاساتذہ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کے اندر طلبہ کے تئیں مخلصانہ وخیر خواہانہ شفقت کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے کبھی بھی کسی کے ساتھ غیر مشفقانہ رویہ اپنایا ہو۔

☆......آج سے دو تین سال قبل کی بات ہے میں عربی سوم میں تھی، مولانا ہمیں 'عربی ادب' پڑھاتے تھے، مولانا ہم تمام طالبات کے سب سے زیادہ پسندیدہ استاذ تھے۔ ہر طالبہ عربی ادب کا مضمون بہت ہی محنت سے پڑھتی تھی اور کلاس میں بھر پور تیاری سے بیٹھتی تھی۔ میری کوشش یہ ہوتی کہ مولانا کے ہر سوال کا جواب سب سے پہلے دوں جس پر مولانا خوش ہو جاتے۔ ایک دن اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر میں جوابات دینے سے قاصر تھی، جس پر مولانا نے میری خیریت دریافت کی اور میرے لیے نماز کے بعد خصوصی دعاء کی۔

آپ اس واقعہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا کس قدر مشفق اور ہمدرد استاد تھے اور آپ کی ہمدردی ہر طالبہ خاص کر محنتی طالبات کے لیے عام تھی۔ وہ اکثر ذہین وفطین بچوں کی تلاش میں رہتے تھے اگر کوئی ذہین طالبہ آپ کی نظر سے گزرتی تو اس کی ہر طرح سے خبر گیری کرتے کہ کہیں تعلیم چھوڑ کر وہ مدرسہ سے واپس نہ لوٹ جائے۔ مولانا کی یہ کوشش ہوتی کہ ذہین بچے کی ذہانت اور صلاحیت قوم وملت کے کام آئے، ختم تعلیم تک وہ مدرسہ سے فیض یاب ہو اور علم قرآن وحدیث کی دولت سے مالا مال ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھے اور جہاں پر بھی رہے اسلام کا چراغ روشن کرے۔

لڑکیوں کی تعلیم وتربیت سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام کو پورے شعور کے ساتھ سمجھ سکیں اس کے مطابق اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی سدھارنے کی کوشش کریں۔ ہمارے عزیز تر استاذ الاساتذہ نے ہمیں جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے دلوں میں تادمِ مرگ زندہ وجاوید رہے گی۔ انشاء اللہ! اور اس کا اجالا ہر سمت پھیلے گا اور لوگوں کی نجات کا باعث بنے گا۔

☆......مولانا نے اس پُرفتن دور میں نہ جانے کتنی رکاوٹوں کا سامنا کیا، نہ جانے کتنی تکلیفوں اور مصائب کا سامنا کیا لیکن آپؒ نے پورے عزم واستقلال سے اسے برداشت کیا، کبھی بھی بے حوصلہ ہوئے نہ کبھی ہمت ہاری

بلکہ صبر وتحمل سے اس کا سامنا کیا اور اپنی دینی سرگرمیوں سے کبھی دست بردار نہ ہوئے۔ آپؒ کی زندگی میں کئی کٹھن آزمائشیں آئیں مگر پھر بھی کبھی اللہ سے شکوہ کناں نہ ہوئے بلکہ صبر وہمت سے اس کا سامنا کیا۔

☆...... خدا کے خوف کا تو یہ عالم تھا کہ جب بھی تفسیر پڑھاتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے اور خشیت الٰہی ہر وقت آپ پر طاری رہتی۔ جب ہم عالمہ سوم میں تھے ایک دفعہ مدرسہ میں ہی مولانا کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی، بمشکل ہی کھڑے ہو پا رہے تھے لیکن دوسرے دن مدرسہ آ گئے اور پڑھانے کے لیے کلاس میں تشریف لے آئے۔ ہم نے مولانا کی خیریت دریافت کی اس کے جواب میں مولانا نے کہا کہ ''کل عصر اور مغرب کی نمازیں میں نے بے ہوشی کے عالم میں پڑھی ہیں، نمازیں کیسے ادا کیں اور کیا پڑھا کچھ یاد نہیں ہے۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ نمازیں دہرانے کی ہمت نہیں ہورہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، خشیت الٰہی سے آواز کانپ رہی تھی اور ہاتھ اور ہونٹ لرز رہے تھے پھر کہنے لگے ضرور دعا کرنا کہ مرنے تک ایک نماز بھی قضا نہ ہونے پائے۔

وہ خدا کے نیک بندے، جو بچھڑ گئے ہیں ہم سے
کوئی ان کو جا کے ڈھونڈے، کوئی اُن کو جا کے لائے

☆...... اگر مولانا کی کتب کی، تصانیف کی بات کی جائے ......مولانا کی تصانیف زیادہ سے زیادہ سَو صفحات پر مشتمل ہوتیں۔ گفتگو کی طرح آپ کی تحریر بھی مختصر ہوتی، اس لیے کہ آپ کی زبان وقلم سے جو نکلتا قرآن وسنت کی روشنی میں نکلتا۔ اپنی طرف سے تبصروں، تاویلوں اور رایوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے۔ اس لیے شاید کتابوں کا حجم نہ بڑھ پاتا۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا۔ قاری کو پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس نہ ہوتا۔ یہی آپ کی تحریروں کا خاص وصف ہے۔

☆......مولانا ہمیشہ بابری مسجد کے معاملے کو لے کر انتہائی مضطرب رہتے تھے اس موضوع پر مولانا نے دو کتابچے بھی تحریر کیے۔ ایک ''بابری مسجد سے دست برداری شرعاً جائز نہیں'' کے عنوان سے اور دوسرا ''مساجد اللہ'' کے عنوان سے۔ آپ بابری مسجد اور اس جیسی دوسری مساجد کی باطل کے پنجۂ جبر سے بازیابی کے لیے ہمیشہ متفکر ومتحرک رہتے۔

☆......مولانا محترم اس پُرفتن دور میں دین کے سچے داعی اور مجاہد تھے۔ آپؒ کا شمار ان علمائے حق میں ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کی ان مخصوص اصطلاحات کو واضح کیا جن پر وقت کی گرد وغبار کی تہہ چڑھ گئی تھی۔

☆......آپؒ کی نظر ہمیشہ آخرت پر رہتی۔ اور اکثر اپنے طلباء وطالبات کو نصیحت کرتے کہ ''جب بھی عمل

کے میدان میں اترو تو قرآن وحدیث کو مضبوطی سے تھام لینا کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور جب بھی مصیبتیں آئیں تو صبر سے کام لینا، ہمت نہیں ہارو گے انشاء اللہ۔ عملی دعوت زبانی دعوت سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔ اچھے اخلاق اور سیرت و کردار کی بلندی سے تم اپنے دین اور عقیدے کا زیادہ مؤثر دفاع کر سکتے ہو۔ تمہارا وقت بہت قیمتی ہے اس لیے اپنے وقت کو فضول اور بے فائدہ کاموں میں ضائع نہ کرو۔ اور دین کے کام صرف اللہ کی رضا کی خاطر کرو۔''

☆......ریاکاری، شہرت اور نام ونمود کے کاموں سے مولانا ہمیشہ دور رہتے تھے۔ کبھی بھی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی منہ پر تعریف کر بھی دے تو فوراً کہتے کہ مجھ جیسے ناچیز کی کیا اوقات؟ یہ تو اللہ کا فضل ہے۔ آپؒ نے کبھی لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ ہمیشہ رضائے الٰہی کو مقدم رکھا اور اسی کے طلبگار رہے:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

☆......مولانا قومیت، وطنیت، لسانیت اور فرقہ واریت کے بتوں کو پاش پاش کرنے والے تھے۔ وقت کے طاغوتی نظاموں سیکولرزم، نیشنلزم، کمیونزم کی حقیقت امت کے سامنے پیش کرنے والے تھے اور ان سے برأت کا اظہار کرنے والے تھے۔ عقیدۂ البراء والولاء کی اہمیت کا شعور امت میں عام کرنے والے تھے۔ آپ نے انتہائی مشکل حالات میں ظلم وستم کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا۔ آپؒ نظام جمہوریت میں کسی بھی قسم کی شرکت کو شرک سمجھتے تھے اس لیے ووٹ کی شرعی حیثیت ہر ایک کو سمجھاتے رہتے تھے۔

آپؒ کی زندگی کا یہی مشن تھا کہ جب تک زندہ رہیں بندگانِ خدا کو اللہ کے دین کی صحیح دعوت دیتے رہیں، توحید خالص کی طرف بلاتے رہیں شرک اور مظاہرِ شرک سے انھیں آگاہ کرتے رہیں اور غلبۂ اسلام کی راہیں روشن کرتے رہیں۔ اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے آپ ہمہ وقت سرگرداں رہتے تھے اور چٹان کی طرح مضبوط اور ثابت قدم رہتے تھے۔ آپ مضبوط ایمان والے تھے ایسا ایمان جس پر کسی بھی ضرب سے چوٹ نہیں لگائی جا سکی۔

☆......مولانا کی ساری زندگی ایثار وقربانی سے عبارت رہی اور یقینا قربانیوں اور سرفروشیوں سے مرتب ہونے والی تاریخ ہی قوموں کو زندہ رکھ سکتی ہے اور اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے مہمیز دے سکتی ہے۔ انشاء اللہ جادۂ حق پر گامزن حق کے راہی مولانا کی زندگی کے روشن نقوش سے اپنی منزل کا پتہ پاتے رہیں گے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہیں گے۔

میں نے مولانا سے جب اپنی کتاب ''حجاب ایک اسلامی فریضہ'' کے مرتب کرنے کا تذکرہ کیا تو مولانا بہت خوش ہو گئے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں اپنی پہلی کتاب کی تقریظ مولانا سے لکھواؤں گی اور مولانا کی صحت بہتر رہی تو نظر ثانی کی درخواست بھی کروں گی لیکن یہ خواہش ایک خواہش ہی رہ گئی، اور خواب خواب۔ افسوس کہ میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ کرسکی۔ کتاب تیار ہے مگر اب اس کو دیکھ کر خوش ہونے والے، حوصلہ افزائی کرنے والے، ہمت بندھانے والے اور رہنمائی کرنے والے استاد ہی نہیں ہیں۔ مولانا کی جدائی کا زخم اتنا گہرا ہے کہ کب تک رستا رہے گا ہم نہیں جانتے۔ لیکن ہم عہد کرتے ہیں کہ جب تک زندہ رہیں گے آپ کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔

اللہ سے امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مولانا کو روزِ جزا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔

اے اللہ! ہمارے مولانا نے دنیا میں جتنی تکلیفیں سہی ہیں ان کا بہترین اجر عطا فرما، ان کی ہر چھوٹی چھوٹی نیکی کو قبولیت کا شرف عطا کر، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان سے بحیثیت بشر جو بھی گناہ سرزد ہوئے ہوں اسے اپنے فضل سے معاف فرما، ان کے طلباء و وارثین کو صدقۂ جاریہ بنا اور ان کے مشن کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین!

کڑے سفر کا تھکا مسافر
تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں
ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

مولانا ایک باکمال کیمیا گر تھے

اسماء خانم، آسیہ خانم
بنت محمد فیروز خان، حیدرآباد

ہمارے مولانا محترم عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ ایسی عظیم اور نایاب ہستیوں میں سے ایک تھے جو اللہ کی طرف سے انسانیت کے لیے ایک انعام اور تحفہ ہوا کرتی ہیں۔ مولانا بھی ہمارے لئے اللہ کا ایسا ہی ایک انعام اور تحفہ تھے۔ مولانا نے اپنی زندگی ملت کے بیٹوں اور بیٹیوں کیلئے وقف کر دی تھی۔ آپ کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں کی وجہ سے آج ملک کے کونے کونے میں آپ کے تربیت یافتہ شاگرد و شاگردات موجود ہیں جو دینی وملّی خدمات میں مصروف ہیں۔ مولانا باکمال ہستی تھے۔ ریگزاروں کو نخلستان میں تبدیل کر دینا، خاروں کو گلوں کی شکل دے دینا اور پتھروں کو تراش کر ہیرا بنا دینا یہ ہمارے مولانا کا کمال تھا۔ آپ حقیقت میں ایک کیمیا گر تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ عالم (حق) کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے جسے بند نہیں کیا جاسکتا جب تک رات و دن آتے جاتے رہیں گے۔

مولانا ایک عالم برحق تھے۔ آپ کی رحلت ملتِ اسلامیہ ہند کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ آپ ملت اسلامیہ ہند کے نگہبان اور ہندوستان میں فکر اسلامی کے پشتیبان تھے۔ اب دور دور تک آپ جیسا باکمال

کیمیا گر، حق گو عالم ربانی اور امام ورہنما ہندوستان میں دکھائی نہیں دیتا۔

مولانا ہم دونوں بہنوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ہمارے والد چونکہ نومسلم تھے، اس لئے مولانا ہماری تعلیم وتربیت کے لیے کافی فکرمند رہتے تھے۔ ہماری ساری ضروریات جامعہ ہی سے پوری ہوتی تھیں۔ ہمارے والدین اگرچہ حیدرآباد میں رہائش پذیر تھے اس کے باوجود بھی ہم دینی واسلامی ماحول میں تربیت پانے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھے۔

الحمدللہ! مولانا کی سرپرستی میں دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کی اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کا ہم پر فضل خاص اور ہمارے مولانا کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے جس محبت اور محنت سے ہماری تعلیم وتربیت کی ہم اس کا حق صرف اس صورت میں ادا کر سکتے ہیں کہ ہم مولانا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک بامقصد زندگی گزاریں اور اپنے آپ کو دعوت دین کے لیے تج دیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ مولانا نے جس طرح ہم طالبات کے اندر شریعتِ اسلامی پر عمل اور اس کے تحفظ اور نفاذ کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا انشاء اللہ ہم طالبات ہندوستان میں شریعت اسلامی کو لاحق خطرات کے آگے ایک بند ثابت ہوں گی، ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت اختیار کریں گی اور مولانا کی امیدوں اور خوابوں کی تکمیل کریں گی۔ اللہ پاک! مولانا کی قبر کو نور سے بھر دیجئے اور ہمیں مولانا کے حق میں بہترین صدقۂ جاریہ بنا دیجئے۔ (آمین)

ہمارے ناظم صاحبؒ
سربکف مجاہد، مربی ورہنما

مہ جبیں بنت محمد ارشد، حیدرآباد

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ (الفاطر:۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔''

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللّٰہ عنہ قال سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد و لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتیٰ اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤوسا جھالا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔ (بخاری)

''عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو بندوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ وہ علماء کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا یہاں تک کہ جب اللہ کوئی عالم نہیں چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا قائد بنالیں گے پس وہ ان کو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

یہ علماء ہی کا مقام ومرتبہ ہے کہ ان کے دم سے علم کا وجود ہے جب اللہ تعالیٰ اس دنیا سے علماء کو اٹھالیں گے تو علم بھی اٹھ جائے گا اور علم کے اٹھ جانے کے سبب ہر طرف تاریکی پھیل جائے گی کوئی صحیح راہ دکھانے والا نہ ہوگا ہر شخص گمراہی کے غارِ عمیق میں سرتا پیر غرق ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے کہ چودھویں رات کے چاند کو تمام تاروں

پر فضیلت حاصل ہے۔ کائنات میں سب سے عزیز ترین ہستی عالم دین کی ہستی ہے۔ اللہ نے عالم دین کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کے لیے ساری کائنات کو لگا رکھا ہے اور میدانِ حشر میں انہیں ایسے ایسے انعامات سے سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جن کو سن کر فرشتے تک رشک کرتے ہیں۔ اسی لیے علماء کے وجود کو ہر دور میں باعث خیر و برکت سمجھ کر ان سے حتی المقدور استفادہ کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور ان سے محبت رکھنے کو اپنے لیے سعادت خیال کیا جاتا رہا ہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں ہمارے مرکزِ محبت، ہمارے مربی و رہنما، حق کے علمبردار، گرتوں کو تھامنے والے ساقی جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے ناظم و بانی ابوشہید مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ صاحب کی ہستی ہے۔ مولانا ایک ایسے عالم ربانی تھے جن کے زیرِ سایہ ہزاروں ایسے طلبہ و طالبات کی تعلیم و تربیت ہوئی جن کی تربیت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔

بے شک اللہ نے مولانا کو اس عظیم مشن کے لیے چن لیا تھا جس کے لیے وہ انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرماتا ہے، مولانا نے اس عظیم مشن کی تکمیل میں اپنی پوری زندگی کھپادی، اپنی زندگی کے ستر سال اس عظیم مشن پر کاربند رہے۔ مولانا جہاں ایک مربی و مدرس تھے وہیں ایک سربکف مجاہد بھی تھے چنانچہ بابری مسجد کے مسئلہ پر پورے ہندوستان میں وہ واحد عالم دین نظر آتے ہیں جن کی تحریریں، تقریریں امت کو جھنجھوڑنے والی اور ہر حال میں بابری مسجد کو اس کے اصل مقام پر دوبارہ تعمیر پر ابھارنے والی ہیں۔ مولانا نے جہاد، فریضۂ جہاد، خلافت و امارت کی شرعی حیثیت، دارالاسلام دارالحرب، ملت کے دفاع جیسے مسائل پر کھل کر بلکہ سر پر کفن باندھ کر گفتگو کی ہے۔ ہندوستان جیسے دارالحرب میں مولانا کی ان کوششوں کی حیثیت اس فرضِ کفایہ کو ادا کرنے کی طرح ہے جسے ساری امت ترک کر کے بیٹھی ہے۔ یقیناً مولانا کا شمار ”من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهيد“ (بیہقی) والی صف میں ہوگا۔ مولانا کی تصانیف میں اس دورِ ذلت و نکبت میں سربلندی و سرفرازی کے راستے پر گامزن ہوجانے کی دعوت ہے۔ پتہ نہیں امت کب آپؒ کی اس دردمندانہ صدا پر کان دھرے گی؟ اور کب ذلت و غلامی کا خاتمہ ہوگا؟!!

مولانا سے میری واقفیت بچپن ہی سے تھی کیونکہ میری سکونت اسی محلہ میں تھی جہاں مولانا رہائش پذیر تھے۔ میری گلی میں ایک مسجد ہے مسجد بخاری شاہؒ، مولانا اسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے آیا کرتے تھے، میں اکثر گلی میں مولانا کو دیکھتی تھی، میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل میں مگن رہتی، مولانا کو دیکھ کر ہم ٹھہر جاتے اور مولانا کو سلام کرتے۔ مولانا ہم سے ہمارا نام پوچھتے اور خیریت بھی دریافت کرتے تھے۔ ہم مولانا سے بہت زیادہ انسیت محسوس کرتے تھے اور دل میں ڈر بھی محسوس کرتے تھے۔ مولانا کی شخصیت میں عجیب مقناطیسیت تھی

جو دیکھتا کھنچا چلا آتا۔ ہم جو کہ مولانا سے واقف بھی نہیں تھے لیکن گلی میں کھیل کے دوران آپ کو سلام کرنا ہمیں بہت اچھا لگتا تھا، ہم جانتے تھے کہ یہ انکل کوئی بہت بڑے بزرگ ہیں جو ہمارے ہی محلہ میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم مولانا کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ اتفاق سے میرا داخلہ مدرسہ میں ہوا۔ داخلہ کے کئی روز بعد میں نے دیکھا کہ مولانا مدرسہ میں تقریر کررہے ہیں مجھے یک گونہ مسرت ہوئی کہ یہ مسجد والے انکل یہاں بھی ہیں، پھر معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہی ہمارے مدرسہ کے ناظم صاحب ہیں۔ میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ اب مولانا سے روز ملاقات ہوسکے گی۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ہمیں اعلیٰ درجات میں مولانا سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مولانا عربی سوم میں تفسیر اورادب پڑھاتے تھے اگر چہ اس سے پہلے گاہے بہ گاہے مولانا ہمیں نیچے بلوایا کرتے، ہم سے صرف ونحو کے قواعد پوچھتے، گردانیں سنا کرتے تھے۔

مولانا کی جب بھی گھنٹی ہوتی میری جان پر بنی رہتی کیونکہ مولانا ہر وقت ترکیب پوچھتے اور میں اپنی شریر طبیعت اور لاپرواہی کی وجہ سے جواب دینے سے قاصر رہتی۔ مولانا نے جواب نہ دینے پر کبھی مجھے ڈانٹا نہیں لیکن مجھے شرمندگی ہوتی کہ مولانا نے سوال پوچھا اور میں جواب نہ دے سکی۔ پھر میں نے عزم مصمم کیا کہ اب میں مولانا کی کلاس میں تیاری کرکے جایا کروں گی لہٰذا میں اچھی تیاری کے ساتھ مولانا کے مضامین پڑھنے لگی۔ مولانا جو سوالات بھی پوچھتے میں اس کے جوابات دیتی۔ مولانا بہت خوش ہوتے۔

ہم نے دیکھا کہ مولانا کی طبیعت ٹھیک نہ رہنے کے باوجود ایک کلاس کا بھی ناغہ نہیں کرتے اور مدرسہ وقت پر آتے ہیں، اگر کسی دن معلوم ہوتا کہ آج مولانا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ہم کہتے کہ ''مولانا! آج ہم نہیں پڑھیں گے بلکہ اعادہ کرلیں گے، آپ آرام کرلیجیے۔'' تو مولانا بہت ناراض ہوتے۔ مولانا کہتے کہ ''آرام کا کیا ہے جی؟ میں تو تم لوگوں کو پڑھانے آیا ہوں آرام کرنے نہیں۔'' ضعیفی میں مولانا کا یہ عزم ہمیں مہمیز دیتا کہ ہم بھی آرام کو تج دیں اور دین کی خدمت میں لگ جائیں۔ مولانا ہماری تعلیم کے لیے اپنا سکون وآرام قربان کرکے ہمیں دین کی خدمت کے لیے تیار کررہے تھے۔

مولانا ہمیشہ طالبات سے شفقت سے پیش آتے۔ ہمیں مطالعہ کی تلقین کرتے اور عبادات میں سب سے زیادہ نماز کی پابندی کی نصیحت فرماتے۔ مولانا نے ہمارے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ہمیں جو نصیحتیں فرمائی تھیں اس کا خلاصہ یہ ہے:

☆......نماز پابندی سے وقت پر ادا کرنا

☆......اسلامی طرزِ زندگی کو اختیار کرنا رہن سہن اسلامی ہو۔

☆......حق کی حمایت ہر حال میں کرنا۔

☆......دین کو غالب کرنے کی اپنے دل میں تمنا رکھنا۔

☆...... جہاد ایک اسلامی فریضہ ہے اس سے جی چرانا اور کترانا نفاق کی علامت ہے۔

☆......مدارس اسلامیہ کی مدد اور ان کا تعاون، ان کی حفاظت پوری امت کی ذمہ داری ہے۔

مولانا نے ہمیں یہ نصیحتیں کیں اور ہم نے دیکھا کہ مولانا کی پوری زندگی انہیں فرائض کی تکمیل میں گزری۔ مولانا نے اپنی ذمہ داریوں کو آخری سانس تک ادا کیا۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا ہماری تعلیم وترقی اور تربیت کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے۔ ہماری صلاحیتوں میں اضافہ کے لیے سیرت کوئز، صرف ونحو کوئز، بیت بازی کے مقابلے، تقریری، تحریری مقابلے، جلسۂ استقبال رمضان، جلسہ یوم عربی، جلسہ تحفظ ختم نبوت، معاشرے کی اصلاح کے لیے 'الاصلاحیۃ' اخبار کا اجراء، اسلامی پینٹنگ نمائش غرض کیا کچھ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت ہیں ہم 'جامعۃ البنات الاصلاحیۃ' کی طالبات کہ ہم کو ایسے مخلص مربی ومعلم کی سرپرستی ورہنمائی حاصل رہی!!

مولانا ستمبر کی پانچ تاریخ کو مدرسہ آئے تمام طالبات سے ملاقات کی۔ معلمین ومعلمات کے ساتھ آپ کی میٹنگ ہوئی۔ کیا پتہ تھا کہ مولانا سے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ پھر دو ہفتہ بعد ہم نے سنا کہ مولانا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر ۲۷ ستمبر کا وہ دن آیا جس دن ہمارے سروں سے وہ سایۂ شفقت چھن گیا جس کی چھاؤں میں ہم بڑے اطمینان سے تعلیم وتربیت کے مراحل طئے کر رہے تھے۔ یہ ہم متعلقین الاصلاحیۃ اور پوری امت اسلامیہ ہند کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے افق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تری جدائی میں مرنے والے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ! ہمیں مولانا کے سکھائے ہوئے علم کو عام کرنے کی توفیق دے۔ مولانا کے نقش قدم پر چلاتے ہوئے ہم کو بھی جہد مسلسل کی تفسیر بنادے۔ اللہ! مولانا کی تمام خدمات کو قبول فرما کر خوب خوب اجر سے نوازیئے۔ اے اللہ! ہم گواہ ہیں کہ ہمارے مولانا نے تیرے دین کے لیے خوب محنت کی۔ اے اللہ! ہمارے مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمایئے اور ہمیں مولانا کے لیے صدقۂ جاریہ بنادیجیے۔ آمین!

استاذ محترم، ایک متبع سنت شیخ کامل

عائشہ صدیقہ
بنت محمد فضل اللہ خان، حیدرآباد

تعلق مع اللہ کے لئے دو چیزیں از حد ضروری ہیں۔ ایک 'تزکیۃ النفس، یعنی نفس کو رزائل سے پاک وصاف کرنا اور دوسری 'تحلیۃ النفس، یعنی نفس کو خصائل حمیدہ سے سنوارنا۔ ان دونوں کے حصول کے لیے کسی متبع سنت شیخ کامل کی سرپرستی ضروری ہے، جس کی نگرانی میں طالب حق راہ سلوک طۓ کرے اور بفضل الٰہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ الحمدللہ! استاذ محترم ناظم جامعہ مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحبؒ جیسے متبع سنت شیخ کامل کی سرپرستی ہمیں حاصل رہی جنھیں اللہ نے ہمارا بہترین رہنما بنایا۔ مولانا محترم کو دین کے ہر شعبہ میں مہارت حاصل تھی اور ساتھ ہی ساتھ اخلاق عالیہ اور اعمالِ صالحہ میں بھی فضیلت حاصل تھی۔ آپ نرم خو، نیچی نگاہ رکھنے والے، مخلص اللہ کے نیک بندے تھے۔ آپ کا طرزِ زندگی نہایت سادہ تھا۔ آپ دنیا اور اغراضِ دنیا سے بے نیاز تھے، صرف عقبیٰ پر نگاہ رکھتے تھے۔ آپ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کے پیکر تھے۔

مولانا محترم کی شاگردہ ہونے کی وجہ سے میں مولانا کے علم وتقویٰ اور اخلاقِ عالیہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئی کہ آپ ایک بلند مرتبہ عالمِ دین ہونے کے باوجود بھی ہر کس و ناکس کو بھرپور توجہ دیا کرتے تھے۔ اور ہر ایک سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کسی نے آپ کی اونچی آواز نہیں سنی۔ آپ ہر ایک کی بات غور سے سنتے اور اس وقت تک نہ بولتے جب تک کہ بولنے والا خاموش نہ ہو جاتا۔ آپ محمد عربیؐ سے بے لوث محبت کرنے والے تھے اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا جب آپ کے سامنے کوئی نعت پڑھی جاتی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔

آپ ایک شفیق استاذ تھے، آپ جب بھی کسی درجہ میں جاتے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی۔ آپ کسی وحشت کی وجہ نہ بنتے۔ طالبات آپ کی بے حد عزت اور ادب کرتیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ آپ سے اپنے مسائل وغیرہ پر بلا جھجک بات کرلیتیں۔ آپ کبھی تنقید کرتے تو برائے تعمیر کرتے۔ اس میں عصبیت یا کسی اور جذبہ کی جھلک بھی نہ ہوتی۔ آپ کی سب سے نمایاں خوبی جس سے ہم طالبات بڑی متاثر تھیں وہ یہ کہ آپ نے اشاعتِ دین اور غلبۂ دین کو اپنا مقصد بنالیا تھا۔ آپ کی ساری جدوجہد کا مرکز ومحور یہی مقصد تھا جس کے لیے آپ نے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ یہ جذبہ اللہ کی جانب سے ایک بڑا دنیاوی اعزاز ہے جو یقیناً اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کو ہی ملتا ہے۔ ورنہ دنیا تو دنیادار لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

مولانا محترم کی بعض نصیحتیں اور تاکیدیں جو وہ وقتاً فوقتاً طالبات کو کرتے رہتے تھے، میں ان کو یہاں اس لیے دہرانا چاہتی ہوں تاکہ یہ بتا سکوں کہ مولانا محترم کبھی کوئی لمبی چوڑی نصیحت نہیں کرتے تھے بلکہ کوئی چھوٹا سا جملہ کہتے تھے اور طالبات اس جملہ کو اپنے دل ودماغ میں بٹھا لیتی تھیں، گو سننے میں تو یہ چند الفاظ پر مشتمل نصیحت آمیز جملہ ہوتا لیکن یہی ایک جملہ سننے والوں کی دل کی دنیا اور زندگی بدل دیتا۔

☆...... ہمیشہ توحید خالص پر قائم رہنا۔

☆......ادنیٰ سے شرک سے بھی آپ اپنے کو بچائے رکھنا۔

☆......اپنے ہر کام میں اخلاص کو شامل کرنا۔

☆......سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرلو۔

☆...... ہمیشہ علم سیکھنے اور سکھانے میں لگی رہنا۔

☆......عالم اسلام کے حالات سے باخبر رہنا اور امت کے مظلوم طبقہ کے لیے دعا کرنا۔

☆...... بڑوں سے ہمیشہ ادب سے پیش آنا اور ان کی عزت کرنا۔

☆...... ہمیشہ سادہ زندگی کو ترجیح دینا تبھی آپ اپنا پیسہ اللہ کی راہ میں لگا سکوگی۔

☆......مکروفریب، دکھاوا اور شہرت سے ہمیشہ دور رہنا۔

☆...... ہمیشہ باطل کے خلاف کھڑے رہنا اور حق کا ساتھ دینا۔

☆......اسلام کے لیے مال، دولت، جان، اولاد ہر چیز کی قربانی کے لیے تیار رہنا۔

مولانا محترم کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ جب تک نظام اسلامی قائم نہیں ہوجاتا تب تک ہندوستان میں دین اسلام اور اس کی تعلیمات کی حفاظت کرنی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے مضبوط قلعے مدارس ہیں۔ لہٰذا مولانا کی تمنا تھی کہ ہندوستان کے ہر گلی کوچہ میں مدارسِ دینیہ کا جال بچھا دیا جائے۔ لہٰذا جامعۃ البنات اور جامعۃ البنات الاصلاحیۃ کے علاوہ کئی دوسرے مدارس بھی مولانا کی سرپرستی میں قائم ہوئے اور ترقی پائے۔ الحمدللہ!

مولانا محترم کی بامقصد زندگی میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کا جذبہ رکھنے والے ہر شخص کے لیے یہ پیغام ہے کہ اپنی زندگی، اپنی صلاحیتیں، اپنے روز وشب، اپنی اولاد اور اپنی جان و مال سب کچھ اللہ کے حوالے کردیں اور مولانا محترم کی طرح ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کے مصداق بن جائیں۔ مولانا محترم ستر سال بلاتوقف امت کی اصلاحِ حال کی کوششوں میں لگے رہے، کئی نسلوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے ذریعہ امت کے مقدر کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اور دین اسلام کے غلبہ کی جدوجہد پر اپنی زندگی کا اختتام کیا۔ یہ سعادت بڑے خوش نصیبوں کو عطا ہوتی ہے۔ مولانا کی زندگی بھی قابلِ رشک رہی اور موت بھی۔ وللّٰہ الحمد۔

اللہ! ہمیں مولانا محترم کی جدائی کے غم کو سہارنے کی ہمت دے، مولانا محترم کی زندگی کے پیغام کو عام کرنے کی توفیق دے اور مولانا کو اپنے اس انعام خاص سے نواز جس کا تو نے انبیاء، صدیقین، صلحاء، اور شہداء سے وعدہ کیا ہے۔ آمین!

جذبِ دروں

منظوم تاثرات

استاذ محترم کی یاد میں

ڈاکٹر عریشہ تنظیم، بنت اوصاف احمد فلاحی، حیدرآباد

ہر طرف چھایا ہے اب غم کا کہر تیرے بغیر
کیسے بے نور ہیں یہ شمس و قمر تیرے بغیر

میرے قائد، میرے مرشد، مرے استاذ عزیز
کچھ نہیں آتا ہے اب مجھ کو نظر تیرے بغیر

مرے رہبر، مرے محسن، مرے مشفق استاذ
منزل عشق ہو کس طرح سے سر تیرے بغیر

ظلمتِ شب میں تری ذات تھی مانندِ سحر
کیسے اب آئے گی ظلمت میں سحر تیرے بغیر

تجھ سے مشکل میں بھی جینے کا ہنر سیکھا تھا
جیسے اب بھول گیا ہو وہ ہنر تیرے بغیر

کون سمجھائے گا قرآن کے اسرار و رموز
اب تو بیضاوی پہ مشکل ہے نظر تیرے بغیر

مثل کردار براہیمی تھا باطل کے لیے
ہند میں کیسے ہو یہ فکر و نظر تیرے بغیر

تیری بے باک صداقت کے تھے چرچے ہر سو
سونا سونا ہوا اسلام کا گھر تیرے بغیر

تو شجاعت و عزیمت کا تھا اک کوہِ گراں
کیسے مضبوط ہو سامانِ سفر تیرے بغیر

تو شمع تھا ترے پروانے تھے سارے شاگرد
بن شمع جائیں کہاں جائیں کدھر تیرے بغیر

اب یہ مقصد ہے کہ ہم تیرا علم اونچا رکھیں
ورنہ جینے کا نہ یارا ہے اِدھر تیرے بغیر

روشنی تجھ سے جو پائی ہے وہ کام آئے گی
اسی امید پہ طے ہوگا سفر تیرے بغیر

غم کی اب اور کوئی حد نہ رہی اے تنظیمؔ
غم زمانے کے جو تھے سب ہیں صفر تیرے بغیر

تَقَبَّلْ دُعَائِیْ لَہٗ ذَا الْجَلَالِ

ماجدہ تحسین، بنت محمد شریف معین الدین، حیدرآباد

عزیزو! تمھیں کچھ بتاتی چلوں میں
اک ہستی سے تم کو ملاتی چلوں میں

معلم وہ رتبہ میں اعلیٰ و عالی
حیات سعیدہ تھی جن کی مثالی
خدا نے انھیں دیں کی خاطر چنا تھا
انھیں علمِ حق سے منور کیا تھا
سپاہی خدا کے خدا اُن کا حامی
کہ عبدالعلیم ان کا اسمِ گرامی
مدارس کے شیدا اصلاحی لقب تھا
کہ خدمت کا دیں کی وہ جذبہ عجب تھا

تَقَبَّلْ دُعَائِیْ لَہٗ ذَا الْجَلَالِ
تکن جنۃُ الخلدِ خیرَ المنالِ

خدا سے مجھے یہ عنایت ملی تھی
تلمذ کی ان سے سعادت ملی تھی

وہ استاذِ عالی میں تلمیذِ ادنیٰ
مجھے یاد ہے وہ حسیں دور اپنا
قرآں میں تدبر کی رہ ہم نے جانی
سنی ان سے تفسیر شیریں زبانی
کلام خدا کو سمجھنا سکھایا
ہر آیت کی روح میں اُترنا سکھایا
پڑھا ہم نے ان سے جو مضمون حجت
تو وَا ہوگئے ہم پہ سب راز قدرت
وہ حسنِ کمالی تھے عربی زباں میں
تھے عربوں سے آگے وہ عجمی جہاں میں
وہ پہروں کھڑے ہم کو مشقیں کرانا
قواعد، روانی سے گرداں سنانا
کہ محنت کا ان کی تو حاصل یہی ہے
ہر ادنیٰ سی شاگرد قابل ہوئی ہے

تَقَبَّلْ دُعَائِیْ لَہُ ذَا الْجَلَالِ
تکن جنۃُ الخلدِ خیرَ المنالِ

وہ ہمت سراپا امن کے پیامی
صبر ان کی چوکھٹ پہ دیتا سلامی
نہ اشکوں کی دھاریں نہ کل کی فکر کی
جو دیکھی شہادت مجاہد پسر کی
جھلکتا تھا وصفِ شجاعت نظر سے
مہکتی ہے جرأت کی بو ان کے گھر سے

جب اولاد کو قید زنداں میں پایا
دیا ان کو درس عزیمت سکھایا
نظام صدارت کے در فشاں تھے
وہ حکمت کے پیکر جری رہنما تھے
خلا ان کی کوئی نہ پُر کرسکے گا
جو جذبہ ملا ہے وہ آگے بڑھے گا

تَقَبَّلْ دُعَائِیْ لَهُ ذَا الْجَلَالِ
تکن جنةُ الخلدِ خیرَ المنالِ

خدایا ترا ہر قدم پہ فضل ہو
بنادے مجاہد تو ان کی نسل کو
ہوں جنت میں شاداں معلّم ہمارے
ہوں نیکی کی راہوں پہ شاگرد سارے
فرشتے ادب سے کھڑے ہوں گے آکر
کہ قدموں میں ان کے پروں کو بچھا کر
شہید اپنے بیٹے سے ملنے کی خاطر
کہ آئے ہیں والد یہ عقبیٰ سجا کر

تَقَبَّلْ دُعَائِیْ لَهُ ذَا الْجَلَالِ
تکن جنةُ الخلدِ خیرَ المنالِ

محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کے نام

نکہت فاطمہ
بنت سید عبدالکریم مرحوم، حیدرآباد

ترے وجود سے تھی جامعہ کی مینائی
ہزار جام بھرے پھر بھی تشنگی پائی!
تمہارے دم سے رواں تھی حیاتِ علم و ادب
بجھا بجھا ہے سماں، دل پہ تیرگی چھائی
علوم دین کی تعلیم و تربیت دے کر
ہمیں عروج دیا اب سمجھ میں بات آئی
ثوابِ جاریہ ہم کو بنائے راہِ بقا
وہ چل دیئے لیے عقبیٰ کی آج رعنائی
یوں سادگی میں گزاری ہے زندگی اپنی
کہ آخرت ہی تھی منزل، اسی کے وہ راہی
خدا بنائے لحد کو تری گل و گلزار
دعا ہے دل سے یہ نکہتؔ کی اےئ مرے باری

حضرت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی یاد میں

فاطمۃ الزہرا
بنت فاروق خان، جودھپور

دین کے وہ داعی تھے اور اسلام کے وہ شیدائی تھے
حق کے علمبردار ہمارے مولانا اصلاحی تھے
لخت جگر بھی حق کے لیے اور سب کچھ بھی قربان کیا
مردِ مجاہد، حق گو ہر دم، راہِ خدا کے راہی تھے
نرم طبیعت سادہ دلی مسکان لیے ان کا چہرہ
بات شعائر کی ہوتی تو پھر وہ قہر الٰہی تھے
اشک رواں ہے آنکھوں سے اور دل بھی لرزتا جاتا ہے
کیوں کہ ہوئے جو ہم سے جدا وہ مولانا اصلاحی تھے
بے کس کے، لاوراث کے، مجبور کے وہ غم خوار رہے
اسوہ نبی کو اپنانے میں سب کے لیے وہ مثالی تھے
محفلِ دنیا چھوڑ چلے جو امت کے اک رہبر تھے
معرکۂ باطل میں حق کے، وہ جانباز سپاہی تھے
لاکھوں کے استاذ تھے وہ اور دیں کے محافظ تھے پیہم
نام میں علم کا عکس لیے وہ ملت کے اصلاحی تھے
فاطمہؔ ہے یوں محوِ دعا کہ جنت ہو مسکن ان کا
علم و عمل کے پیکر تھے وہ جنت کے شیدائی تھے

عزم ویقیں کی شمع جلا کر چلے گئے

ڈاکٹر عریشہ تنظیم
بنت اوصاف احمد فلاحی، حیدرآباد

عزم و یقیں کی شمع جلا کر چلے گئے
ہم کو اسیر اپنا بنا کر چلے گئے

ظلم و ستم کی رات کو سیماب کر دیا
تاریکیوں کو دور بھگا کر چلے گئے

رہنے کو کون آیا ہے دنیا میں یوں مگر
حصے کا اپنے دیپ جلا کر چلے گئے

اصلاحیہ کا باغ رہے گا ہرا بھرا
حق کے شجر میں پھول کھلا کر چلے گئے

روشن حیات تازہ کا اک اک ورق رہا
وہ زندگی کی جوت جگا کر چلے گئے

کٹھنائیاں تھیں راہ میں منزل بھی دور تھی
منزل کے سنگ میل بتا کر چلے گئے

دنیا کی دلفریبیاں آئیں نہ راہ میں
دامن کو خار و خس سے بچا کر چلے گئے

طاغوتی طاقتوں سے نہ خائف ہوئے ذرا
بنیادِ کفر و شرک ہلا کر چلے گئے

ہمدرد ایسا دوسرا تنظیمؔ اب کہاں
ملت کے غم میں خود کو گھلا کر چلے گئے

قطب تارہ

عائشہ حبیب
بنت محمد حبیب، حیدر آباد

الٰہی تیرا تھا، تیرا رہا وہ
ترے ہی علم کا عالم رہا وہ

خدایا! تیرا بن کر تیرا داعی
ترا مطلوب جو بندہ، بنا وہ

عظیم الشان ہے اس کی کہانی
سناؤں میں، کہ کیا سے کیا رہا وہ

نہ دنیا کی طلب میں عمر کاٹی
تجھی سے تھی وفا، تھا باوفا وہ

نہ تھی دنیا کی اس کو کوئی خواہش
فقط عقبیٰ کی دُھن میں ہی لگا وہ

ترا پروانہ بن کر، میرے اللہ
ترے ہی گِرد گھوما اور جلا وہ

ترے بندوں پہ تھا رحمٰن کی رحمت
کریمانہ صفت میں تھا ڈھلا وہ

مجاہد فی سبیل اللہ تھا وہ
اسی اک راہ کا راہی رہا وہ

شہادت ہی رہی مطلوب اس کو
دمِ آخر گیا روتا ہوا وہ

نہ اس کو خوف تھا جھوٹے خدا کا
دیا حق کی گواہی برملا وہ

جلاتا ہی رہا حق کا دیا وہ
مصائب سے کبھی خائف نہ تھا وہ

تری خاطر ملا جس سے ملا وہ
ترا باغی تھا جو، اس سے کٹا وہ

مرے مولا! تو اُس پہ فضل کردے
ہمیشہ قوم کے غم میں گھلا وہ

الٰہی پوری کردے اُس کی منشا
ہمیشہ چاہتا سب کا بھلا وہ

سنور جائے مری ملت کی قسمت
رہا تا عمر مصروفِ دعا وہ

بچالے شرک سے سب کو الٰہی
شمعِ توحید روشن کرگیا وہ

کہ اس کا راستہ تھا حق پہ مبنی
چلادے قوم کو جس پر چلا وہ

کہاں سے پائیں اب اُس جیسا رہبر
دکھا کر راہ حق کی چل بسا وہ

رہا نبیوںؑ کا وارث اور خادم
کہ جنت میں بھی، ہو ساتھی بنا وہ

رہیں گے گامزن اُس کے مشن پر
قطب تارہ ہے، منزل کا پتا وہ

کتاب ''جادۂ حق'' مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ کی تمام کتابوں اور بعض اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ، اسلام مخالف نظریات، مسلم مخالف تحریکوں، ریشہ دوانیوں، مسلمانوں کے گرد تنگ ہوتے دائرے اور شریعت اور شعائر کو لاحق خطرات پر گہری نظر رکھتے تھے، آپ کی بیشتر تصانیف کا محرک یہی صورتحال تھی۔ فکری انحرافات سے بچنے اور ملّت کے لئے مختلف مسائل میں صحیح موقف اختیار کرنے کے سلسلہ میں آپ کی تحریریں قطب نما کے مثل ہیں۔

ان شاء اللہ اس مجموعہ ''جادۂ حق'' کے مطالعہ کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش سیاسی و دینی مسائل کے ادراک اور ان کے حل میں فکری رہنمائی ملے گی اور جادۂ حق پر گامزن ہونے والوں کے لئے یہ کتاب بہترین زادِ سفر بنے گی۔